وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا عِنۡدَنَا خَزَآئِنُہٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُہٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعۡلُوۡمٍ (الحجر: ۲۲)

تفسیرِ کبیر

مصنفہ

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

جلد ہفتم

سورۃ مریم، سورۃ طٰہٰ

تفسیرِ کبیر

از حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد

خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ

(جلد ہفتم۔ مشتمل بر سورۃ مریم، سورۃ طٰہٰ)

Tafsir-e-Kabir **(The Grand Exegesis)**

by Hazrat Mirza Bashir-ud-Deen Mahmood Ahmad,
Khalifatul-Masih II, al-Muslih al-Mauood (1889-1965),
may Allah be pleased with him.
Volume 7
(Sūrah Maryam, Ṭā Hā)

(Complete Set – Volumes 1-15)

© Islam International Publications Ltd.

First published in India and Pakistan between 1940-1962 (11 Volume Set)
Second edition printed in Pakistan and the UK between 1986-1994 (10 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2004 (5 Volume Set)
Reprinted in Qadian, 2010 (10 Volume Set)
Digitally typeset edition published in UK, 2023 (15 Volume Set)

Published by:
Islam International Publications Limited
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, Surrey UK, GU9 9PS

Printed in the UK at:

No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopy, recording or any information storage and retrieval system, without prior written permission from the Publisher.

For further information, please visit www.alislam.org

ISBN: 978-1-84880-274-2 (Set Vol. 1-15)
10 9 8 7 6 5 4 3 2 1

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم　　　　وعلی عبدہ المسیح الموعود

پیش لفظ

اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ کے مامور حضرت اقدس مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عظیم الشان رحمت کے نشان کے طور پر پسر موعود کی بشارت عطا فرمائی جو حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی المصلح الموعود رضی اللہ عنہ کے وجود میں پوری ہوئی اور کلمات الہامیہ آپ کے وجود مسعود میں جلوہ گر ہوئے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ 'اسے علوم ظاہری و باطنی سے پُر کیا جائے گا۔' قرآن مجید فرقانِ حمید کے وہ علوم و معارف بھی آپ کو سکھائے گئے جو اس سے پہلے منکشف نہ تھے۔ چنانچہ آپؓ نے تحریر فرمایا ہے کہ 'اس تفسیر کا بہت سا مضمون غور کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔' آپؓ نے قرآن کریم کی تفسیر تحریر فرمائی اور اس کے مطالب و معانی اور نکاتِ عجیبہ کو ظاہر و باطن میں پھر زندہ فرما دیا۔ یہ تصنیف لطیف موسوم بہ تفسیرِ کبیر اس مذکورہ بالا بشارت کی صداقت کا ایک زندہ ثبوت اور شاہد ناطق ہے اور لاریب قرآنی علوم و معارف کا ایک بیش بہا خزانہ ہے جو خدا تعالیٰ نے موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ظاہر فرمایا ہے۔

تفسیر کبیر کی پہلی جلد ۱۹۴۰ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ بعدہٗ مختلف وقتوں میں اس کی کل ۱۱ جلدیں شائع ہوئی تھیں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اوائل خلافت میں ہی ارشاد فرمایا کہ تفسیر کبیر کی صد سالہ جوبلی کے تحت دوبارہ اشاعت کی جائے۔ چنانچہ اس کے پازیٹو بنوا کر گیارہ کی بجائے دس جلدوں میں شائع کیا گیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے اس علمی خزینہ کی اشاعت کا تازہ ایڈیشن طبع کروانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی طباعت کتابت ہو کر شائع ہوئی تھی اور باریک قلم سے لکھائی کی وجہ سے پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ ہر صفحہ پر دو کالم تھے۔ چنانچہ یہ نیا ایڈیشن حسب ارشاد حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کمپوز کروایا گیا ہے، اس کا فونٹ سائز ۱۴ مقرر کیا گیا ہے اور دو کالموں کی بجائے عبارت کو ایک ہی سطر میں مسلسل کر دیا گیا ہے۔ نیز حضور انور کی ہدایت تھی کہ جلدوں کی ضخامت کو بھی متوازن اور ہلکا

رکھا جائے تاکہ پڑھتے ہوئے ہاتھوں میں پکڑ کر سنبھالنے میں دقت نہ ہو۔ اس ہدایت پر عملدرآمد کے نتیجہ میں تفسیر کبیر کی جلدوں کی تعداد دس سے بڑھ کر پندرہ ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے حلِ لغات کے مقامات میں بھی ادل بدل کرنا پڑا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت کے مطابق تفسیرِ کبیر عربی ایڈیشن کی طرز پر حوالہ جات کی تخریج کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں تفسیرِ کبیر عربی ترجمہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ عربی عبارات بالخصوص حلِ لغات کے مواقع پر عربی عبارات جہاں اعراب کا اہتمام نہ تھا وہاں اعراب لگائے گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزانہ دعا ہے کہ اس تفسیر کی اشاعت کو 'دینِ اسلام کا شرف اور کلام اللہ کا مرتبہ لوگوں پر ظاہر کرنے کا موجب بنائے۔'

اس ترتیب و طباعت کے مختلف مراحل پر جن احباب کو خدمت قرآن کا موقع نصیب ہوا، ان کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی توفیق میں برکت بخشے۔ آمین

خاکسار

منیر الدین شمس

ایڈیشنل وکیل التصنیف

اپریل ۲۰۲۳ء

سُوْرَۃُ مَرْیَمَ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ مریم۔ یہ سورۃ مکی ہے۔

وَ ھِیَ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ اٰیَۃً مَعَ الْبَسْمَلَۃِ

اور بسم اللہ سمیت اس کی ننانوے آیات ہیں۔ ۱؎

سورۃ مریم کی وجہ تسمیہ ۱؎ اس سورۃ کا نام اس مناسبت سے مریم رکھا گیا ہے کہ اس میں جو بڑا اور مہتم بالشان واقعہ بیان ہوا ہے اور جس کے گرد دوسرے تمام واقعات چکر لگاتے ہیں وہ حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ ہے۔ یوں تو حضرت مریم علیہا السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہونے کے باوجود بہر حال ایک غیر نبیہ عورت تھیں اور حضرت زکریا اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو ان پر فضیلت حاصل تھی لیکن ہر شخص اپنے اپنے مقام کے لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً جب ہم نے اس بات کا ذکر کرنا ہو کہ کوئی شخص کسی کے اعلیٰ درجہ کے کیریکٹر کو دیکھ کر اپنی ذہانت اور تقویٰ کی وجہ سے کس طرح جلد سے جلد اس پر ایمان لے آتا ہے۔ تو صاف ظاہر ہے کہ ہم اس کی مثال میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نہیں پیش کر سکتے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال آپ کے مقام کی بلندی کے لحاظ سے یہاں چسپاں نہیں ہوتی۔ ایسے موقعہ پر لازماً ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام لیں گے اور انہی کے وجود کو بطور مثال پیش کریں گے۔ اسی طرح خواہ ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت علیؓ سے اپنے درجہ اور مقام میں بڑا سمجھتے ہوں لیکن اگر یہ ذکر ہو کہ کس طرح بعض ذہین اور ہوشیار لڑکے چھوٹی عمر میں ہی صداقت کو پالیتے ہیں اور اس کے لئے قربانی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو اس امر کی مثال کے طور پر ہم حضرت ابوبکرؓ کا نام نہیں لیں گے جب بھی نام لیں گے حضرت علیؓ کا لیں گے۔ تو چونکہ اس سورۃ میں زیادہ تر ایسے امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مریم اور مریمی صفات والے وجودوں کی طرف انسان کی توجہ کو منعطف کرتے ہیں۔ اس لئے باوجود اس کے کہ اس سورۃ میں حضرت ابراہیمؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت اسحاقؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت اسماعیلؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت ادریسؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت زکریاؑ کا بھی ذکر ہے۔ حضرت یحییٰؑ کا بھی ذکر ہے۔ اس سورۃ کا نام مریم رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ سورۃ ہم کو مریم اور مریمی صفات والے وجودوں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

سورۃ مریم مکی ہے یہ سورۃ مکی ہے اور وہ تمام صحابہؓ جنہوں نے اس بارہ میں اپنی رائے ظاہر کی ہے اس کو مکی ہی

قرار دیتے ہیں (دلائل النبوۃ للبیھقی باب ذکر سور التی نزلت بمکۃ والتی نزلت بمدینۃ)۔مغربی مصنف بھی اس سورۃ کو مکی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ راڈول، وہیری اور میور یہ تینوں مستشرق اس کے مکی ہونے کے قائل ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس کے زمانہ نزول کو ذرا آگے پیچھے بیان کرتے ہیں۔مثلاً میور کے نزدیک اس کا وقت نزول قبل از ہجرت زندگی کے آخری زمانہ کے ساتھ ملتا ہے یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم طائف کے لوگوں کو تبلیغ کرنے کے لئے گئے اور ان کی سنگدلی اور بدسلوکی کی وجہ سے واپس آ گئے تو میور کے نزدیک اس وقت یہ سورۃ آپ پر نازل ہوئی تھی (Life of Mohammad page 148) اور یہ واقعہ دسویں سال نبوت کا ہے گویا وہ اس سورۃ کو آخری مکی زندگی کی قرار دیتا ہے۔ راڈویل اس کو مکی ہی قرار دیتا ہے لیکن کوئی خاص وقت اس کے لئے معین نہیں کرتا (ترجمہ القرآن از راڈول)۔ اور وہیری جیسا کہ اس کی عام طور پر عادت ہے بات وہی کہہ دیتا ہے جو ہماری تاریخوں میں ہوتی ہے لیکن کوشش کرتا ہے کہ نیش زنی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دے۔اس نے بھی یہی قرار دیا ہے کہ یہ سورۃ مکی ہے لیکن ابتدائی زمانہ کی ہے۔صرف اپنی علمیت جتانے کے لئے اتنا فرق بتاتا ہے کہ یہ سورۃ اتنی ابتدائی نہیں جتنی صحابہؓ کہتے ہیں بلکہ اس سے سال بھر پیچھے کی ہے۔ حالانکہ کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تیرہ سو سال بعد پیدا ہو کر اس کو یہ کس طرح پتہ لگ گیا کہ یہ سال بھر پہلے کی ہے یا بعد کی۔اس قسم کا قول محض تمسخر ہوتا ہے۔وہ کہتا ہے اسلام کا جو دوسرا دور تھا یعنی ہجرت حبشہ کا۔اس کے ابتداء میں یہ نازل ہوئی اور پھر کچھ عرصہ تک نازل ہوتی چلی گئی۔ گویا وہ اس کو پانچویں یا چھٹے سال کی قرار دیتا ہے۔لیکن سند کوئی نہیں بیان کرتا۔(کمنٹری اون دی قرآن وہیری جلد سوم)

اس بارہ میں حدیثوں سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اور درحقیقت وہی اصل روایات ہیں جن پر اس مسئلہ کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور جنہوں نے اس زمانہ کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہی صحیح گواہی دے سکتے ہیں کہ یہ سورۃ کب نازل ہوئی۔ وہ یہی ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کی سورۃ ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت ابتدائی صحابہؓ میں سے تھے وہ اس سورۃ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ میرے ابتدائی اموال میں سے ہے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق آتا ہے کہ قَالَ: فِي بَنِيْٓ اِسْرَائِيْلَ وَالْكَهْفِ وَمَرْيَمَ: اِنَّهُنَّ مِنَ الْعِتَاقِ الْاُوَلِ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِيْ (بخاری کتاب التفسیر باب وقولہ: و منکم من یرد الی۔۔۔) یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف اور سورۂ مریم یہ ابتدائی زمانہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہیں۔ وَهُنَّ مِنْ تِلَادِيْ اور یہ میرے پرانے اموال میں سے ہیں۔ یعنی جب میں ابتداء میں اسلام لایا تو اس

وقت جو سورتیں میں نے حفظ کیں۔ ان میں یہ سورتیں بھی شامل تھیں۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص ابتداء میں اسلام لایا اور جس نے یہ سورتیں یاد کیں ہم اس کی بات مانیں گے یا اس پادری کی بات مانیں گے جو تیرہ سو سال بعد پیدا ہوا۔

یہ تو مذہبی ثبوت ہے۔ تاریخی ثبوت اس بات کا کہ یہ سورۃ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جب دشمنی کا زور بڑھ گیا اور دشمنوں نے اسلام کو اپنی پوری طاقت اور قوت سے کچلنا چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو بلا کر فرمایا کہ تم لوگ یہاں سے ہجرت کر جاؤ۔ صحابہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ آپ ہمیں ہجرت کے لئے فرماتے ہیں تو کیا آپ بھی ہجرت کر کے تشریف لے جائیں گے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں میں اس وقت تک انتظار کروں گا۔ جب تک کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھے ہجرت کا واضح حکم نہ مل جائے لیکن تم پر جو مظالم ہو رہے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے میرا دل یہی چاہتا ہے کہ تم ہجرت کر جاؤ انہوں نے کہا یا رسول اللہ کونسا ملک ہے جہاں ہمیں امن میسر آ سکتا ہے۔ آپ نے مغرب کی طرف ہاتھ اٹھا کر فرمایا ادھر ایک ملک ہے جس کا بادشاہ عادل اور منصف ہے۔ تم اگر وہاں چلے جاؤ تو تم کو امن میسر آ جائے گا۔ وہ اشارہ آپ کا ایبے سینیا کی طرف تھا جس کو حبشہ کہتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے ارشاد پر صحابہؓ کی ایک جماعت ادھر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ جو لوگ ادھر ہجرت کر کے گئے۔ ان میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ بھی تھے جو حضرت علیؓ کے سگے بھائی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے۔ جب یہ لوگ مکہ سے حبشہ چلے گئے تو پہلے تو کفار نے خیال کیا کہ اچھا ہوا مسلمان مکہ سے نکل گئے اور ہماری کوششیں کامیاب ہو گئیں لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے وفادار خادم حضرت ابوبکر، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور کئی اور بڑے بڑے خاندانوں کے نوجوان اطمینان سے مکہ میں بیٹھے ہیں اور مکہ کی تبلیغ اسی پرانے جوش و خروش سے جاری ہے تو انہیں خیال آیا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو مکہ سے نکال دینا ہماری کامیابی نہیں کہلا سکتا بلکہ یہ ہماری شکست کی علامت ہے۔ کیونکہ اس طرح اسلام کے دو مرکز قائم ہو گئے اور مکہ سے نکل کر تبلیغ ایک قوم کی جگہ دو قوموں یعنی اہل مکہ اور مسیحیوں میں ہونی شروع ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جب انہیں یہ اطلاعات بھی ملنی شروع ہو گئیں کہ ان لوگوں کو امن میسر آ گیا ہے اور نہ کوئی انہیں مارتا ہے نہ پیٹتا ہے اور نہ کسی قسم کا دکھ دیتا ہے بلکہ وہ آرام سے عبادتیں اور ذکر الٰہی کرتے اور محنت کر کے اپنے لئے روزی پیدا کرتے ہیں۔ تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ تو ہم سے بڑی غلطی ہوئی کہ ہم نے سختی کی اور مسلمان بھاگ گئے۔ اگر وہ اپنے ملک میں ہی رہتے تو ہم جب چاہتے ان کو مار سکتے تھے۔ مگر اب جو غیر ملک میں چلے گئے ہیں تو ہمارے قبضہ سے نکل گئے ہیں اور بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو

ضعف پہنچتا ان کو ایسا ٹھکانا میسر آ گیا ہے کہ اب وہ ہمارے خلاف بڑی آسانی کے ساتھ پروپیگنڈا کریں گے اور ہماری ہمسایہ حکومت کو ہمارے خلاف اکسائیں گے۔ چنانچہ اس کے انسداد کے لئے انہوں نے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ ایک وفد حبشہ جائے اور اس کے ساتھ مختلف قسم کے تحائف بھیجے جائیں جو بادشاہ اور اس کے امراء اور پادریوں وغیرہ کے لئے ہوں۔ یہ وفد بادشاہ کے سامنے پیش ہو اور اسے کہے کہ تم ہمارے ہمسایہ ہو اور تمہارے ساتھ ہمارے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ لیکن اب ہماری قوم کے کچھ باغی تمہارے ملک میں آ کر پناہ گزیں ہو گئے ہیں ان لوگوں کو اپنے ملک سے نکال دو اور واپس مکہ میں بھجوا دو اور تجویز کی کہ اسی موقعہ پر بادشاہ اور اس کے درباریوں کو تحائف دیئے جائیں تا کہ ان کے دل میں نرمی پیدا ہو اور وہ ان لوگوں کو واپس کر دیں۔

چنانچہ یہ وفد حبشہ گیا۔ اس وفد میں حضرت عمرو بن العاص بھی جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے شامل تھے۔ عمرو بن العاص بڑے لسّان آدمی تھے اور عام طور پر حکومت کی طرف سے جو ڈیپوٹیشن جاتے تھے ان میں عمرو بن العاص ضرور شامل ہوتے تھے۔ چنانچہ بعض اور جگہوں پر بھی مکہ والوں نے ان کو بھیجا ہے۔ انہوں نے نجاشی بادشاہ حبشہ کے سامنے بڑی عمدہ تقریر کی اور کہا بادشاہ سلامت آپ ہمارے ہمسائے ہیں۔ یمن میں آپ کی حکومت ہے اور یمن اور حجاز ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اس وجہ سے ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے۔ مگر اب یہ ایک نیا فتنہ پیدا ہو گیا ہے کہ ہمارے ملک کے کچھ بھگوڑے آپ کے ملک میں آ گئے ہیں اور آپ نے ان کو پناہ دے دی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ آپ نے ہمارا ہمسایہ اور تعلق دار ہو کر ہمارے دشمنوں کو پناہ کس طرح دے دی ہے۔ آپ انہیں مکہ میں واپس بھجوا دیں تا کہ ہمارے تعلقات آپ سے بدستور اچھے رہیں۔ اور ان میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو۔ بادشاہ نے کہا میں ان لوگوں کو بلوا کر اور ان سے پوچھ کر فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ مسلمان مہاجرین کو بلوایا گیا اور بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا جھگڑا ہے صحابہؓ نے کہا ہمارا ان سے کوئی سیاسی جھگڑا نہیں صرف مذہبی اختلاف ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے شہر میں خدا تعالیٰ کا ایک نبی آیا جسے ہم نے قبول کر لیا۔ اب یہ لوگ ہمیں ہمارے مذہب کے مطابق عبادت کرنے نہیں دیتے اور مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے رنگ میں خدا تعالیٰ کی عبادت کریں اور یہ کہتے ہیں کہ جس طرح ہم عبادت کرتے ہیں اس طرح عبادت کرو اور چونکہ ہم ایسا نہیں کرتے اس لئے یہ برا مناتے اور ہمیں دکھ دیتے ہیں۔ جس سے مجبور ہو کر ہمیں اپنا ملک اور اپنی قوم چھوڑنے پڑے۔ بادشاہ پر اس کا نیک اثر ہوا اور اس نے کہا عقائد میں اختلاف تو ہوا ہی کرتا ہے اس بنیاد پر ہم مسلمانوں کو واپس نہیں کر سکتے (تاریخ کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۳۲) اور اس نے مسلمانوں سے کہا کہ تم میرے ملک میں آزادی

سے رہو اور اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرو۔ جب یہ جواب ممبران وفد نے سنا تو انہوں نے وہ تحائف استعمال کئے جو مکہ والوں نے انہیں دیئے تھے چنانچہ بڑے بڑے بطریقوں اور پادریوں کو انہوں نے تحفے دیئے (بطریق درحقیقت Patriarch کا عربی تلفظ ہے جو ایک بڑے پادری کو جو اپنے حلقہ میں قریباً پوپ کی حیثیت رکھتا ہے کہا جاتا ہے) اور انہیں اکسایا کہ یہ دراصل تمہارے بھی دشمن ہیں اور ہمارے بھی۔ کیونکہ ان کے خیالات اور عقائد عیسائیت کے سخت خلاف ہیں۔ اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ کی ہتک کرتے ہیں۔ اگر تم ان لوگوں کو حبشہ میں رہنے کا موقع دو گے تو تم عیسائیت سے دشمنی کرو گے۔ اس اشتعال انگیزی کے نتیجہ میں جیسا کہ آج کل ہمارے خلاف لوگوں کو جوش آجاتا ہے ان کا بھی مشتعل ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ چنانچہ انہیں غصہ آیا اور انہوں نے تجویز کی کہ دوسرے دن پھر بادشاہ کے سامنے یہ معاملہ رکھا جائے۔ چنانچہ دوسرے دن جب دربار لگا تو بڑے بڑے پادریوں نے پھر اس سوال کو اٹھایا اور انہوں نے نجاشی سے کہا کہ یہ معاملہ خالی سیاسی ہی نہیں بلکہ مذہبی بھی ہے کیونکہ یہ لوگ مذہباً مکہ والوں کے ہی خلاف نہیں بلکہ ہمارے بھی خلاف ہیں اور مسیح اور ان کی والدہ کی ہتک کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اپنے ملک میں نہیں رکھنا چاہیے۔

بادشاہ نے ان کو پھر بلوایا اور پوچھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی ہتک کرتے ہو۔ کیا یہ درست ہے؟ اس پر حضرت جعفرؓ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور حضرت علیؓ کے سگے بھائی تھے مسلمانوں کی طرف سے آگے بڑھے اور انہوں نے کہا۔ اے بادشاہ! میں آپ کو اپنی مذہبی کتاب کی چند آیتیں سنا دیتا ہوں ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کا ذکر ہے۔ آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ ہم ان کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سورۂ مریم کی چند ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ جب انہوں نے یہ آیتیں سنائیں۔ تو چونکہ عام طور پر عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے اور ان کی والدہ کے متعلق خدا کی والدہ ہونے کا خیال پایا جاتا تھا اور ایبے سینیا میں یہ مشرکانہ خیالات زیادہ تھے اس لئے پادریوں نے شور مچا دیا کہ ہمارے مسیح کی ہتک کی گئی ہے۔ مگر بادشاہ کا یہ مذہب نہیں تھا۔ وہ یونیٹیرین خیالات کا تھا جو خدا تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں اور روایات سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بعد میں مسلمان بھی ہو گیا تھا۔ اس نے کہا مسلمان جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک ہے۔ بلکہ تاریخوں میں لکھا ہے اس نے ایک تنکا اٹھا کر کہا خدا کی قسم جو کچھ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے میں مسیح اور اس کی والدہ کو اس سے ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس پر پادری اور زیادہ جوش میں آ گئے اور انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی تو ملک میں بغاوت ہو جائے گی

اور آپ کے خلاف لوگوں میں جوش پیدا ہو جائے گا۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ اگر مسلمانوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی تو ملک میں بغاوت ہو جائے گی تو نجاشی کو غصہ آ گیا اور اس نے کہا میں چھوٹا تھا کہ تم نے میرے چچا سے مل کر مجھے بادشاہت سے محروم کرنا چاہا۔ مگر میرے خدا نے میری مدد کی اور اس نے مجھے حکومت عطا فرمائی۔ پس میں اگر بادشاہ بنا ہوں تو اس خدا کے فضل سے جس نے میرے مقابلہ میں تمہیں شکست دی اور مجھے کامیاب فرمایا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس خدا نے میرے بچپن میں میری مدد فرمائی تھی اس خدا کو میں اب جوان ہو کر چھوڑ دوں گا۔ جاؤ جو تمہارے جی میں آتا ہے کر لو۔ میں انصاف کے معاملہ میں تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں اور اس نے مکہ کے وفد کو واپس لوٹا دیا اور مسلمانوں کو عزت کے ساتھ دربار سے رخصت کیا۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ہجرت حبشہ جو دعویٰ نبوت کے پانچویں سال کے نصف اول میں ہوئی۔ اس سے پہلے سورۂ مریم نازل ہو چکی تھی اور مسلمانوں میں پھیل بھی چکی تھی تبھی تو مہاجرین نے شاہ حبشہ کے سامنے اپنے عقیدہ کی توضیح کے لئے اسے پڑھا پس یہ ابتدائی زمانہ کی نازل شدہ سورۃ ہے اور ہجرت حبشہ سے پہلے کی ہے (یہ روایت جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے محمد بن اسحاق نے ام سلمہؓ سے اپنی سیرۃ میں اور امام احمد بن حنبل نے ابن مسعودؓ سے اپنی مسند میں بیان کی ہے) مقاتل کے نزدیک سورۂ مریم کی صرف آیت سجدہ مدنی ہے باقی ساری سورۃ مکی ہے (روح المعانی جلد ۶ صفحہ ۳۷۷)۔ راڈول کا خیال ہے کہ اس سورۃ کی آیت ۱ تا ۳۷ کی عبارت سورۂ آل عمران کی آیت ۳۵ تا ۵۷ سے فرق رکھتی ہے (اس سورۃ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے) وہ کہتا ہے کہ یہ فرق اس اعتراض سے بچنے کے لئے کیا گیا ہے کہ لوگ شاعر کہیں گے گویا اس کے نزدیک اہل عرب کے اعتراض سے ڈر کر ان آیات کے طرز بیان کو بدل دیا گیا ہے (ترجمہ القرآن راڈول) حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ دنیا میں ہر شخص جانتا ہے کہ شعر کس چیز کا نام ہے اور اہل عرب تو خاص طور پر شعر گوئی میں مشہور تھے۔ وہ قرآن کریم کی نثر کو شعر کس طرح کہہ سکتے تھے حقیقت یہ ہے کہ ان یوروپین مستشرقین نے قرآن تو کیا سمجھنا تھا انہوں نے دشمنوں کا اعتراض بھی نہیں سمجھا ان کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ یہ کوئی باوزن کلام ہے بلکہ اصل اعتراض ان کا یہ تھا کہ یہ کلام اپنے اندر شاعرانہ روح رکھتا ہے۔ مستشرقین یورپ نے یہ سمجھ لیا کہ اس سورۃ میں چونکہ نَدِيًّا اور رَضِيًّا وغیرہ الفاظ آتے تھے اس لئے شاید ان الفاظ کی وجہ سے مشرکین مکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہا کرتے تھے حالانکہ ان کا اعتراض روح شاعری کے متعلق تھا یعنی جس طرح شاعر اپنے مضمون کو مختلف پیرایوں میں بدل بدل کر بیان کرتا ہے اسی طرح قرآن کریم مختلف رنگوں میں بات کو پھیر پھیر کر بیان کرتا ہے۔ ورنہ ان میں خود بڑے بڑے شاعر موجود تھے وہ بھلا کہہ سکتے تھے کہ یہ کلام شعر ہے۔ مگر یوروپین

مستشرقین نے یہ خیال کر کے کہ انہوں نے نَدِیًّا اور رَضِیًّا کی وجہ سے آپ کو شاعر قرار دیا تھا یہ اعتراض کر دیا کہ آل عمران میں اس طرز کو بدل دیا گیا ہے۔

میرے نزدیک اس سورۃ کا وقت نزول چوتھے سال نبوت کا آخر یا پانچویں سال نبوت کا شروع ہے کیونکہ تاریخوں سے صاف طور پر ثابت ہے کہ مکی وفد جب مسلمان مہاجرین کو حبشہ سے واپس لانے کے لئے گیا اور بادشاہ نے انہیں واپس کرنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے پادریوں کو اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں پر ہتک مسیح کا لزام لگا دیا۔ اس پر حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات پڑھ کر حضرت مسیحؑ کے متعلق اسلامی عقیدہ بتایا جس پر بادشاہ کی تسلی ہوگئی اور وہ اپنے جواب پر پختہ ہو گیا اور ہجرت حبشہ رجب سنہ ۵ میں ہوئی تھی یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ پر جب ساڑھے چار سال گزر چکے تھے۔ اگر ہم سال کو ابتداء یعنی محرم سے شمار کریں تو یہ عرصہ ساڑھے چار سال کا بنتا ہے اور اگر درمیان سے شمار کریں تو اور بھی چھوٹا ہو جاتا ہے کیونکہ وحی نبوت کا آغاز رمضان میں ہوا ہے میں اس وقت پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جب مؤرخین نبوت کے سال شمار کرتے ہیں تو پہلے سال کا شمار محرم سے کرتے ہیں یا رمضان سے۔ اگر وہ ابتدائی مہینہ سے شمار کرتے ہوں تب تو یہ ساڑھے چار سال کا عرصہ بنتا ہے اور اگر وہ رمضان سے شمار کرتے ہیں تو اس صورت میں یہ عرصہ تین سال دس ماہ کا بن جائے گا۔ بہرحال یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہجرت حبشہ سے پہلے یہ سورۃ نازل ہوئی اور اتنا عرصہ پہلے نازل ہوئی کہ صحابہؓ نے اس کو یاد کر لیا۔ اس غرض کے لئے ہمیں کم از کم پانچ چھ ماہ کا عرصہ ضرور نکالنا پڑے گا۔ جس میں یہ سورت اتنی معروف ہوگئی کہ صحابہؓ نے اس کو حفظ کر لیا۔ ان امور کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ چوتھے سال کا آخری حصہ اس کے نزول کا وقت تھا اس سے پہلے تین سال تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر برابر الہامات نازل ہوتے رہے لیکن عیسائیت کو مخاطب نہیں کیا گیا تین سال کے بعد یکدم عیسائیت کو مخاطب کیا گیا اور تفصیلی طور پر مخاطب کیا گیا۔ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے ذکر کے علاوہ جن پیشگوئیوں پر عیسائیوں کے نزدیک ان کے دعویٰ کی بنیاد تھی ان سب کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اسی طرح مسیحیوں کے عقائد کو بیان کیا گیا اور ان کو دلائل کے ساتھ ردّ کیا گیا اس کے چار پانچ ماہ کے بعد حبشہ کی طرف ہجرت ہو جاتی ہے جہاں عیسائی بادشاہت ہوتی ہے اور عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے متاثر ہو کر ایک صحابی عبید اللہ بن جحش جو مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے وہاں مرتد ہو کر عیسائی ہو گئے۔ (شرح زرقانی الهجرة الثانية الی الحبشة)

اس سورۃ کا ایسے وقت میں نازل ہونا صاف طور پر بتاتا ہے کہ اس کے نزول میں ایک بہت بڑی حکمت

پوشیدہ تھی۔ جو قرآن کریم کی صداقت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے جہاں عیسائیت کا کوئی زور نہیں تھا۔ آپ کی مخالفت کرنے والے وہ لوگ تھے جن کا عیسائیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ تین چار عیسائی غلام تھے مگر ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور پھر تین سال تک آپ پر وحی ہوتی رہتی ہے مگر اس میں عیسائیت کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہوتا۔ لیکن یکدم چوتھے سال کے آخر یا پانچویں سال کے شروع میں تفصیلی طور پر عیسائیت کو مقابل میں رکھ کر بحث شروع کر دی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ عیسائیت کیوں پیدا ہوئی۔ مسیحؑ کے متعلق کیا کیا پیشگوئیاں تھیں اور اسلام کے مقابلہ میں عیسائیت کی کیا حیثیت ہے اور پھر اس کے فوراً بعد ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ماننے والوں کو حکم دیتے ہیں کہ تم حبشہ کی طرف ہجرت کر کے چلے جاؤ جہاں ایک عیسائی حکومت ہے یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ اس کلام کا نازل کرنے والا ایک عالم الغیب خدا ہے جب تک اسلام اور عیسائیت کے ٹکراؤ کی کوئی صورت نہیں تھی اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ قبل از وقت عیسائیت کا کوئی ذکر کیا جائے۔ لیکن جونہی وہ وقت قریب آ گیا جب مسلمانوں نے ایک عیسائی ملک میں جانا تھا تو مسلمانوں کو بیدار رکھنے اور ان کو ہوشیار کرنے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے کہ اب عیسائیوں سے تمہارا مقابلہ ہو گا تمہیں ان کے مقابلہ میں کونسا پہلو اپنے سامنے رکھنا چاہیے یکدم ایک سورۃ نازل ہو جاتی ہے جس میں عیسائی عقائد اور عیسائی تعلیمات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ مسیحیت کی کیا غرض ہے اور اس کا اصل مقصد کیا ہے۔ اس میں صاف طور پر اس امر کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اب تم کو مسیحیوں سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ اس لئے ان کے مذہب کے بارہ میں تم کو ہوشیار کیا جاتا ہے۔ پس سورۂ مریم کے نزول میں قطعی اور یقینی طور پر ہجرت حبشہ کی پیشگوئی مخفی تھی اور قبل از وقت مسلمانوں کو بتا دیا گیا تھا کہ اب تم ایک ایسی جگہ جانے والے ہو جہاں عیسائیت سے تمہارا واسطہ پڑے گا۔ اس لئے ان کے عقائد کے متعلق ہوشیار رہو۔ یہ ایک غیر معمولی اشارہ تھا جس کو مسلمانوں نے تو نہیں سمجھا مگر عیسائیوں نے سمجھ لیا کیونکہ ریورنڈ وہیری اور سر میور کا سارا زور اس امر کے ثابت کرنے کے لئے صرف ہوتا ہے کہ اس سورۃ کو کسی اور سال کی نازل شدہ قرار دیں۔ حالانکہ سورۂ مریم چوتھے سال میں نازل ہو یا آٹھویں سال میں عیسائیوں کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اگر اس کا مضمون عیسائیت کو ردّ کر دیتا ہے تو خواہ یہ چوتھے سال کے آخر میں نازل ہو یا دسویں سال میں عیسائیوں کے لئے برابر ہے مگر انہوں نے بڑا زور صرف کیا ہے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ سورۃ ہجرت حبشہ سے پہلے کی نہیں کیونکہ ان کا ذہن اس طرف چلا گیا ہے کہ اگر یہ ہجرت حبشہ سے پہلے کی نازل شدہ ثابت ہو جائے تو یہ اس امر کا ایک صریح اور واضح ثبوت ہو گا کہ اس میں ہجرت حبشہ کی

پیشگوئی کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ اسلام اب عیسائی ممالک میں جانے والا ہے۔ پس یہ اعتراض ان کے دل کو کھٹکا۔ اور چونکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ قرآن کریم میں کوئی پیشگوئی نہیں اس لئے انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس کا کوئی حل تلاش کریں ورنہ مسلمان مجبور کریں گے کہ بتاؤ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ تین سال تک مشرکین مکہ کے سامنے عیسائیوں کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ نہ ان کی تعلیم کا نہ تاریخ کا۔ نہ غلط عقائد کا۔ مگر پھر یکدم ایک پوری کی پوری سورۃ اتاری جاتی ہے اور توجہ دلائی جاتی ہے کہ اب ایسے واقعات رونما ہونے والے ہیں کہ مسلمانوں کو عیسائیوں سے واسطہ پڑے گا اور ان ممالک میں بھی جہاں عیسائیوں کا زور ہوگا۔ اسلام کو ان کے مقابلہ کے لئے نکلنا پڑے گا۔ کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ اسلام اور عیسائیت کا جو ٹکراؤ ہونے والا تھا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قبل از وقت اس کی خبر دے دی تھی اور چونکہ یہ ایسی چیز ہے جس کو برداشت کرنا ان کی طاقت سے بالکل باہر ہے اس لئے قرآنی نشان کو باطل کرنے کے لئے انہوں نے کوشش کی کہ اس سورۃ کو ہجرت حبشہ سے بعد کی قرار دیں۔ مگر اس عظیم الشان نشان پر پردہ ڈالنے کے لئے انہیں اور تو کچھ نہ سوجھا اپنے آپ کو بڑا ادیب ظاہر کرنے کے لئے انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اس سورۃ کے الفاظ اور اس کا سٹائل بتا رہا ہے کہ یہ سورۃ بعد میں نازل ہوئی تھی (تفسیر القرآن وہیری جلد ۳) حالانکہ عربی سٹائل کو وہ جانتے ہی نہیں۔ بلکہ عربی تو الگ رہی اگر شیکسپیئر کے ڈرامے ہی ہم ان کے سامنے رکھ دیں اور ان سے دریافت کریں کہ بتاؤ یہ کون سے سال کا ہے اور وہ کون سے سال کا۔ تو وہ سخت ذلیل ہو کر شرمندہ اور لاجواب ہو جائیں گے اور یہ ہرگز نہیں بتا سکیں گے کہ یہ کس سال کا ہے اور وہ کس سال کا۔ زبان کا سٹائل پہچان کر یہ بتانا کہ یہ عبارت کس سن کی ہے ایک لمبی تاریخ پر عبور کا متقاضی ہوتا ہے جس میں کوئی زبان تدریجاً ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور پھر اس میں بھی ہزاروں قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ بعض شاعر ایسے گزرے ہیں جنہوں نے پچاس ساٹھ سال زندگی بسر کی ہے انہوں نے ابتدائی ایام میں بعض الفاظ اپنے شعروں میں استعمال کئے ہیں جن کو آخری ایام میں انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ ایسے شخص کی کسی نظم کو اگر ہم دیکھیں گے تو ان الفاظ کو مدنظر رکھتے ہوئے کہہ سکیں گے کہ یہ آخری زمانہ کی نظم ہے یا ابتدائی زمانہ کی مگر اس قسم کا اظہار خیال بھی صرف چند الفاظ کی بناء پر ہوگا۔ یہ نہیں کہ شعر کی بناوٹ دیکھ کر کوئی شخص کہہ سکے کہ یہ فلاں زمانہ کی ہے اور وہ فلاں زمانہ کی۔ غالب بہت بڑا شاعر گزرا ہے مگر اس کے کلام پر بھی جرح کرنے والے کہتے ہیں کہ جیسے بعض سہل سے سہل شعر ہم اس کے آخری زمانہ کے کلام میں دکھا سکتے ہیں ویسے ہی بعض آسان شعر ہم اس کے ابتدائی زمانہ کے کلام میں بھی دکھا سکتے ہیں۔ پس یہ کہنا کہ غالب کے کلام میں بعد میں امپروومنٹ ہو گئی تھی غلط بات ہے اسی طرح ریورنڈ وہیری اور سر میور کا یہ

ایک فرضی ڈھکونسلہ ہے جس سے ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہم اتنے بڑے ماہر فن اور ادیب ہیں کہ ہم کلام کا سٹائل دیکھ کر ہی پہچان لیتے ہیں کہ یہ کون سے زمانہ کی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ماہر فن بھی اس قسم کی بات نہیں بتا سکتا۔ اس زمانہ میں ہی اگر جرمنی، فرانس، امریکہ اور انگلستان کے ادیبوں سے دریافت کیا جائے کہ فلاں فلاں قومی شاعر جو تم میں گزرے ہیں ان کی فلاں فلاں نظمیں کس سن کی ہیں تو وہ یہی کہیں گے کہ کیا ہم منجم ہیں کہ اس قسم کی بات بتا سکیں۔ سوائے اس کے کہ کسی کو ذاتی طور پر علم ہو کہ فلاں نظم کس سن میں کہی گئی تھی کوئی شخص نظموں کو دیکھ کر ان کے سن کی تعیین نہیں کر سکتا لیکن قرآن کریم کے متعلق وہ یہ اندازہ لگانے بیٹھ جاتے ہیں کہ یہ آیتیں فلاں سن کی ہیں اور یہ فلاں سن کی۔ اس سے ان کی غرض محض اتنی ہوتی ہے کہ جو پیشگوئی ثابت ہوتی ہو اس میں رخنہ ڈال دیں اور اسلام کی صداقت پر پردہ ڈال دیں۔

غرض وہیری اور میور کا فعل خود دلالت کرتا ہے کہ وہ دونوں اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ اس سورۃ کا نزول ایسے وقت میں ہوا ہے کہ یہ آئندہ کے حالات کے متعلق بڑی بھاری پیشگوئی بن جاتی ہے پس انہوں نے چاہا کہ اس پر پردہ ڈال دیں اور اسے بعد کے زمانہ کی قرار دے دیں۔ غرض یہ ایک عجیب نشان ہے کہ تین سال تک متواتر کلام الٰہی نازل ہوتا رہتا ہے مگر اس میں عیسائیت کا کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہوتا۔ لیکن جونہی عیسائیت سے ٹکراؤ کا زمانہ قریب آتا ہے ایک سورۃ نازل ہو جاتی ہے اور پھر چھ ماہ یا سال کے بعد مسلمان ہجرت کر کے ایک عیسائی ملک میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں عیسائیوں سے ان کی بحثیں ہوتی ہیں جس کے نتیجہ میں عیسائی ایک مسلمان کا شکار کر لیتے ہیں اور اسے عیسائی بنا لیتے ہیں لیکن مسلمانوں نے ان کے بادشاہ کا شکار کر لیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ پس قبل از وقت اس سورۃ کا نازل ہونا اور اس کے معاً بعد ایسے حالات کا پیدا ہو جانا جن کے نتیجہ میں اسلام اور عیسائیت کا ٹکراؤ ہو گیا اسلام کی صداقت کا ایک بہت بڑا نشان ہے۔

اس سورۃ کے نزول کے بعد عیسائیت کا ذکر زمانۂ قبل از ہجرت میں ختم ہو جاتا ہے پھر مدینہ میں جا کر عیسائیت کا ذکر شروع ہوا ہے درمیان میں عیسائیت کی طرف اشارے ضرور کئے گئے ہیں لیکن تفصیل کے ساتھ عیسائیت کا ذکر پھر سورۂ آل عمران میں ہوا ہے جو ہجرت کے بعد دوسرے یا تیسرے سال مدینہ میں نازل ہوئی۔ خود اس سورۃ کا مضمون بھی اس کے مدنی ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں جنگ احد اور اس کے متعلقہ واقعات کا ذکر ہے اور یا پھر عیسائیت کا ذکر سورۂ نساء میں آتا ہے کہ وہ بھی مدنی سورۃ ہے بلکہ سورۂ آل عمران کے بعد چوتھے سال سے اس کا نزول شروع ہوا ہے اور کچھ حصہ چوتھے سال کے بعد بھی نازل ہوا ہے سورۂ نساء کے علاوہ کسی حد تک تفصیل سے

عیسائیت کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے اور یہ سورۃ بھی سورۃ نساء کے بعد مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور اکثر حصہ اس کا پانچویں اور چھٹے سال ہجری میں نازل ہوا ہے بلکہ اس کی کچھ آیتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب بھی نازل ہوئیں۔ پس قبل از ہجرت کی سورتوں میں سے جس سورۃ میں عیسائیت کو براہ راست بیان کیا گیا ہے اور کھلے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے وہ سورۂ مریم ہے اور جیسا کہ قیاس کیا جاسکتا ہے یہ سورۃ چوتھے سال نبوت کے آخر یا پانچویں سال نبوت کے شروع میں نازل ہوئی ہے تبھی صحابہؓ نے اس کو ہجرت حبشہ سے پہلے یاد کر لیا اور حبش کے بادشاہ کے سامنے اسے پڑھ کر سنایا۔ اس سورۃ کا یہ وقت نزول صاف طور پر بتا تا ہے کہ اس سورۃ میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ اب عیسائیت کے ساتھ بھی تعلقات کی بنیاد رکھی جانے والی ہے اور آنے والی حبشہ کی ہجرت کی طرف اس میں واضح طور پر اشارہ کیا گیا تھا جس سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کا نزول ایک عالم الغیب ہستی کی طرف سے ہوا ہے جو واقعات اور حالات مسلمانوں کو پیش آنے والے ہوتے تھے۔ ان کو قریب زمانہ میں بیان کر دیا جاتا تھا تا کہ وقت پر اللہ تعالیٰ کا کلام پورا ہو کر مومنوں کے لئے ان کے ایمانوں کی زیادتی کا موجب ثابت ہو میں سمجھتا ہوں ریورنڈ وہیری اور میور کے دل پر بھی اسی بات کا اثر ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے باوجود تاریخی اور حدیثی شہادتوں کے اس سورۃ کو بعد از ہجرت حبشہ یا قریب ہجرت مدینہ کے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کے دل کی یہ دھڑکن بتاتی ہے کہ اس سورۃ کے نزول کا وقت ایک ایسا بیّن اشارہ تھا کہ اس کے سمجھنے سے ریورنڈ وہیری اور میور بھی نہیں بچ سکے اور انہیں اس کے نزول کا وقت بدلنے کی ناکام کوشش کرنی پڑی۔ آخری تاریخی شہادت کی موجودگی میں وہ کیا بات تھی جس سے مجبور ہو کر ان کو اس کا وقت نزول بعد میں ثابت کرنا پڑا۔ صرف یہی کہ اگر اس کا وقت نزول وہی تھا جو تاریخ بتاتی ہے تو یہ اسلام کی سچائی کا ایک بہت بڑا ثبوت تھا۔

یہاں کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم یہ کس طرح مان لیں کہ خدا تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل کی ہے کیوں نہ یہ سمجھ لیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بخود سوچ لیا ہوگا کہ مکہ میں مخالفت زیادہ ہے اب لازماً ہمیں ہجرت کرنی پڑے گی اور یہ بھی سوچ لیا ہوگا کہ حبشہ کی طرف ہجرت کریں اس لئے انہوں نے عیسائیت کا قرآن کریم میں ذکر کر دیا اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک عقلی طور پر یہ ممکن ہے لیکن ساتھ ہی عقل اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ اگر عیسائیت کا ذکر کیا جاتا تو اس کی تعریف کی جاتی نہ کہ تردید۔ مگر اس سورۃ میں تو عیسائیوں کی شروع سے لے کر آخر تک تردید کی گئی ہے۔ دوسرے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تو سوچ سکتے تھے کہ وہ اپنے متبعین کو حبشہ بھجوا دیں گے مگر انہیں یہ کس نے بتا دیا کہ وہ ایک لمبے عرصہ تک وہاں رہیں گے ان کے عیسائیوں سے مباحثات ہوں گے اور اس

لئے ضروری ہے کہ عیسائیت کے متعلق انہیں تفصیلاً واقفیت ہو کیونکہ اس سورۃ کے ذریعہ صرف یہی نہیں بتایا گیا تھا کہ ہجرت ہوگی بلکہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ایک لمبے عرصہ تک عیسائیوں سے مقابلہ ہوگا اور ایک دوسرے کی تردید کے لئے مختلف قسم کے دلائل استعمال کئے جائیں گے پس یہ وسوسہ محض بے بنیاد ہے حقیقت یہی ہے کہ عیسائیوں نے چونکہ اس قرآنی معجزہ کو محسوس کر لیا تھا اس لئے انہوں نے پورا زور لگایا کہ اس سورۃ کو ہجرت حبشہ کے بعد کی نازل شدہ سورۃ قرار دیں چنانچہ میور کہتا ہے کہ اس میں ہجرت کی طرف تو اشارہ ہے مگر ہجرت حبشہ کی طرف نہیں بلکہ ہجرت طائف کی طرف۔ گویا وہ اسے ان آخری ایام مکی کی جو طائف میں گزرے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طائف میں بھی بعض عیسائی غلام تھے اور واقعہ طائف میں ایک عیسائی غلام عداس نامی کا ذکر بھی آتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا اور اس نے آپ سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا۔ مگر اس قسم کے عیسائی غلام خود مکہ میں بھی تھے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ لوہا کوٹا کرتے تھے یا اسی قسم کے بعض اور کام کیا کرتے تھے۔ سفر طائف میں جس عیسائی غلام کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق تاریخ میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے کہا نینوہ کا۔ آپ نے فرمایا کیا وہی نینوہ جس میں میرا بھائی یونسؑ آیا تھا؟ اور پھر آپ نے اسے تبلیغ کی جس سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے آپ کے ہاتھ چوم لئے (السیرۃ النبویۃ لابن ھشام باب قصۃ عداس النصرانی معہ)۔ پس بے شک طائف میں بھی کچھ عیسائی تھے مگر ان کے ساتھ کوئی مذہبی مقابلہ پیش نہیں آیا کہ اس سورۃ کو طائف کے واقعہ پر چسپاں کیا جائے۔ وہیری نے بھی اسے دبے لفظوں میں ہجرت حبشہ کے بعد کی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے یہ سورۃ اتنی دور تو نازل نہیں ہوئی جتنی دور میور بتاتا ہے مگر اتنی قریب بھی نازل نہیں ہوئی جتنی قریب مسلمان بتاتے ہیں اس نے اس سورۃ کو بعد از ہجرت حبشہ پانچویں یا چھٹے سال کی قرار دیا ہے اور میور نے اسے گیارھویں سال میں نازل ہونے والی قرار دیا ہے۔ وہیری کہتا ہے اس میں بیان کردہ واقعات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کتاب مقدس کا بہت کم علم تھا اور جن لوگوں نے اسے بتایا وہ بھی بہت کم جانتے تھے اس کا جواب ہم اگلی آیتوں کی تفسیر میں دیں گے۔

ترتیب سورۃ اس سورۃ کا تعلق پہلی سورتوں سے یہ ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل میں اس سوال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ اسلام کس طرح ترقی کرے گا یہ بتایا گیا تھا کہ سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے مشابہ ہے جس طرح موسوی سلسلہ نے ترقی کی تھی اسی طرح اسلام بھی ترقی کرے گا۔

سلسلہ محمدیہ کی سلسلہ موسویہ سے تشبیہ چنانچہ سورۃ بنی اسرائیل میں موسوی سلسلہ کے کچھ واقعات بیان کر کے بتایا گیا تھا کہ موسوی سلسلہ کے متعلق یہ مقدر تھا کہ اس پر زمانہ موسیٰؑ کے بعد دو۲ تباہیاں آئیں گی اور اسی طرح پر دو۲ ترقیوں کا زمانہ بھی آئے گا اور چونکہ اسلام کی ترقی موسوی سلسلہ کے مشابہ ہے اس لئے مسلمانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوگا یعنی جس طرح وہاں زمانہ موسیٰؑ کے بعد دو۲ تباہیاں اور دو۲ ترقیاں مقدر تھیں۔ اسی طرح یہاں بھی زمانہ نبوی کے بعد مسلمانوں کے لئے دو۲ تباہیاں اور دو۲ ترقیاں مقدر ہیں۔ چنانچہ جیسا کہ بنی اسرائیل کی پہلی تباہی حضرت داؤدؑ کے زمانہ کے بعد ہوئی جو بڑی ترقی کا دور تھا اور اس میں یروشلم تباہ ہوا جو یہود کا مرکز تھا (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا زیر لفظ جیوز)۔ اسی طرح زمانہ نبوی کے بعد بنو عباس کے زمانہ میں جو بڑی ترقی کا دور تھا۔ پہلی تباہی آئی اور بغداد جو اسلامی حکومت کا مرکز تھا وہ تباہ ہو گیا اور مسلمان علماء بغداد سے بھاگ کر ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور مرکز پر غیروں کا قبضہ ہو گیا (تاریخ ابن خلدون زیر عنوان وفاۃ المستنصر و خلافۃ المستعین اخر من العباس للبغداد)۔ پھر جس طرح وہاں جو پہلی تباہی آئی وہ زیادہ تر حکومت کے مرکز کی تباہی تھی۔ یعنی نبوکدنضر نے یروشلم کو تباہ کیا اور وہاں کا تمام قیمتی سامان اپنے ساتھ لے گیا اور یہود جلاوطنی پر مجبور ہوئے۔ اسی طرح یہاں جو پہلی تباہی آئی وہ بھی زیادہ تر اسلامی حکومت کے مرکز کی تباہی تھی اور زمانہ بھی قریباً قریباً وہی تھا۔ یعنی جتنے عرصہ بعد یروشلم پر تباہی آئی اتنے عرصہ بعد ہی بغداد پر تباہی آئی۔ اس کے بعد دوسری تباہی جو ٹائٹس کے زمانہ میں یہود پر آئی وہ ایسی تھی جس کے بعد یہودی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور ان میں سے کچھ ایران کے علاقہ میں چلے گئے۔ کچھ مصر کی طرف نکل گئے اور انہیں اپنا وطن بالکل چھوڑ دینا پڑا (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ جیوئش)۔ اسی طرح کی ایک دوسری تباہی مسلمانوں کے لئے بھی مقدر تھی۔ چنانچہ جس طرح بنی اسرائیل کی دوسری تباہی ظہور مسیح سے پہلے شروع ہوئی اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ اسی طرح زمانہ اسلام میں بھی ہوا۔ چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دعویٰ کیا تو اس سے کچھ عرصہ پہلے سے ہی مسلمانوں پر یہ عمومی تباہی مغربی مسیحی طاقتوں کے ذریعہ سے جو رومن ایمپائر کے قائم مقام تھیں آنی شروع ہوئی اور وہ ہر جگہ کمزور ہوتے چلے گئے ان کی حکومتیں تباہ ہو گئیں اور اسلام کو پھر ایک سخت دھکا لگا اور ساری دنیا سے اسلامی حکومت کا نشان مٹ گیا۔ یہ تباہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بھی رہی اور بعد میں بھی جاری رہی لیکن جیسا کہ پیشگوئیوں سے معلوم ہوتا ہے مقدر یہی ہے کہ ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کی یہ تباہی ترقی کی صورت میں بدل جائے گی اور انہیں دنیا میں پھر عروج حاصل ہو جائے گا۔

پہلی موسوی تباہی کے بعد یہود کو دوبارہ زندگی اس طرح حاصل ہوئی تھی کہ جو دشمن قوم تھی اس نے ان کو دوبارہ

یروشلم بنانے میں مدددی اوراس نے انہیں اپنے مرکز میں لاکر بسا دیا(انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ Cyrus)۔اسی طرح مسلمانوں کی پہلی تباہی کے موقعہ پر بھی ایسا ہی نشان ظاہر ہوا بلکہ یہ نشان مسلمانوں کے حق میں زیادہ مکمل صورت میں ظاہر ہوا۔اور وہ اس طرح کہ فارس اور میدکا بادشاہ جس نے یہود کو یروشلم کے آباد کرنے میں مدددی تھی یہودی نہیں ہوا تھا صرف ان کا ہمدرد اور خیر خواہ تھا۔لیکن وہ ترک بادشاہ جنہوں نے اسلامی حکومت کو تباہ کیا تھا خود مسلمان ہو گئے اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کی تباہی میں حصہ لیتے وہ ان کی ترقی اور احیاء میں حصہ لینے لگے(البدایہ و النہائیہ لابن کثیر۔السلطان برکة کان بن تولیة بن چنگیز خان)۔اور اسلام پھر دوبارہ ان کے ہاتھوں سے عروج کے ایک نئے دور میں سے گزرنے لگا۔اس کے مقابلہ میں دوسری تباہی جو بنی اسرائیل پر آئی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم قوم خود مسیحی ہوگئی اور یہودی مذہب سے اس کی اس حد تک دلچسپی ہوگئی کہ مسیحی روایتوں کے ساتھ ساتھ تورات کا ادب اور احترام اور اسرائیلی انبیاء کا ادب اور احترام بھی ان میں قائم ہو گیا(انسائیکلو پیڈیا برٹینکا زیر لفظ جیوز)۔ مسلمانوں کے لئے بھی یہی مقدر ہے کہ وہ حاکم قومیں جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کیا ہے وہی ایک دن اسلام قبول کریں گی اور پھر دوبارہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل ہوگی۔اس کے بعد سورۂ کہف میں اسی مضمون کو اور کھول کر بیان کیا گیا اور یہ واضح کیا گیا کہ دوسری تباہی کے بعد جو ذریعہ خدا تعالیٰ نے موسوی سلسلہ کو ترقی دینے کا اختیار کیا تھا وہی اب بھی اختیار کیا جائے گا۔یہ کیا ذریعہ تھا جو اختیار کیا گیا اور موسوی سلسلہ کی یہ تباہی کس طرح ترقی میں تبدیل ہوئی۔مسیحی دنیا اس سے خوب واقف ہے وہ رنگ جو اس وقت تک موسوی سلسلہ کا چلا جاتا تھا اسے یکسر بدل دیا گیا اور مسیح ناصری جنہوں نے یہ کہا تھا کہ میں قانون کو بدلنے نہیں آیا بلکہ اسے پورا کرنے آیا ہوں (متی باب ۵ آیت ۱۷۔۱۸) ان کی جماعت کو خدا تعالیٰ نے تبلیغ دین کی ایسی توفیق دی کہ ان کے ذریعہ سے پھر تورات کی حکومت ایک نئے رنگ میں دنیا میں قائم ہوگئی اور وہی قوم جو مردہ ہو چکی تھی پھر موسوی سلسلہ کے آخری خلیفہ مسیح ناصری پر ایمان لاکر دنیا میں ترقی کر گئی اور موسوی سلسلہ پھیل گیا ایسا ہی بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں سے بھی ہوگا۔

سورۃ کہف کے بعد سورۃ مریم کو رکھنے کی حکمت چنانچہ یہ بتانے کے لئے کہ مسلمانوں کی دوبارہ ترقی بھی ایک مسیح کے ذریعہ سے ہوگی سورۂ مریم کو سورۂ کہف کے بعد رکھا گیا اور اس میں مسیح علیہ السلام کے واقعات بیان کر کے توجہ دلائی گئی کہ ایک ایسا ہی نشان مسلمانوں میں بھی ظاہر ہوگا اور مسلمان پھر اس نشان کے ذریعہ سے ترقی کریں گے۔چنانچہ جس طرح موسوی سلسلہ کی ترقی ایک مسیحؑ کے ساتھ وابستہ تھی اسی طرح اسلام کی ترقی ایک مسیح کے ساتھ

وابستہ ہوگی جس طرح وہاں اصحاب کہف یعنی مسیح ناصری کے اتباع کے ذریعہ سے وہ غلبہ ملا تھا اسی طرح یہاں آنے والے مسیح کے لئے نئے اصحاب کہف پیدا ہوں گے اوران کے ذریعہ سے دوبارہ اسلام غالب آئے گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں معراج موسوی کا ذکر کیا اور بتایا کہ معراج موسوی کے اندر ہی اسلام کی ترقی کی خبر دی گئی تھی مگر ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس معراج کے نتیجہ میں موسوی اور محمدی سلسلہ میں شدید رقابت پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ جب محمدی سلسلہ ترقی کرے گا۔ موسوی سلسلہ اسے رقابت کی نظروں سے دیکھے گا اور اس رقابت کے نتیجہ میں جیسا کہ عام طور پر قاعدہ ہے کہ جب دو رقیب ہوں اوران میں سے ایک ذرا بھی غافل ہوتو وہ مارا جاتا ہے۔ مسلمان غفلت کریں گے اور موسوی سلسلہ کے علمبردار یعنی مسیح ناصری کے پیرو ان پر غالب آ جائیں گے اور مسلمانوں کو مغلوب کرلیں گے۔

پھر اس مشابہت کے لئے سورۂ کہف میں ایک پرانا واقعہ بنی اسرائیل کی قوم کا بیان کیا اور بتایا کہ بنی اسرائیل میں ذوالقرنین کا ایک واقعہ گزرا ہے تم دیکھو کہ کس طرح ذوالقرنین کے ذریعہ تباہ شدہ یہودیوں کو دوبارہ حکومت ملی۔ وہ واقعہ بھی اس موقعہ پر ظاہر کیا جائے گا اور مسلمان جو تباہ ہو چکے ہوں گے اللہ تعالیٰ انہیں پھر ایک دوسرے ذوالقرنین کے ذریعہ سے تباہی سے بچائے گا اور پھر ان کی ترقی اور حفاظت کے سامان پیدا فرمائے گا۔

اس کے بعد سورۂ مریم کو شروع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں پہلی سورتوں کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی ترقی اور اس کے تنزل کا دور موسوی سلسلہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح موسوی سلسلہ کے ٹوٹنے پر اس کا احیاء مسیح ناصریؑ کے ذریعہ سے ہوا جو موسوی سلسلہ کا آخری نقطہ تھا اسی طرح اسلام کی طاقت اور اس کی شوکت کے ٹوٹنے پر اس کا دوبارہ احیاء مسیح محمدی کے ذریعہ سے ہوگا جو محمدیؐ سلسلہ کا آخری نقطہ ہوگا مگر چونکہ محمدیؐ سلسلہ کا اصل مقابلہ مسیح ناصری کی قوم کے ساتھ ہوگا اور اسلام کا ٹوٹنا مسیح ناصری کی قوم کی وجہ سے ہوگا جو موسوی سلسلہ کا آخری نقطہ تھا۔ اس لئے محمدی سلسلہ جب ترقی کرے گا تو اسے اصل مقابلہ مسیح ناصریؑ کی قوم سے ہی پیش آئے گا۔ اس لئے اگر ہم تاریخی طور پر غور کرنا چاہیں تو ہمیں بجائے موسوی سلسلہ پر غور کرنے کے مسیحی سلسلہ پر غور کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اسلام کے اصل دشمن وہی ہیں۔ اس مناسبت کے لحاظ سے سورۂ کہف کی تشریحات کے بعد اب وہ اس قوم کے حالات کی طرف آتا ہے جن سے مسلمانوں کا اصل مقابلہ تھا اور بتاتا ہے کہ مسلمانوں پر مسیح کے ذریعہ سے ہی تباہی آئی یعنی مسیح ناصری کی قوم کے ذریعہ سے اور مسلمانوں نے اگر تباہی سے بچنا ہے تب بھی مسیح کے ذریعہ سے ہی یعنی مسیح موعودؑ پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اب عیسائیت کی تاریخ بیان کرتا ہے اور

بتاتا ہے کہ یہ تاریخ تمہارے لئے شمع راہ ہوگی اور تمہیں مدنظر رکھنا پڑے گا کہ اس اس طرح عیسائیت کی بنیاد پڑی اور اس اس رنگ میں تمہارے احیاء کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ گویا سورۂ مریم، سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ کہف کی تیسری کڑی ہے اور یہ تینوں سورتیں ایک ہی مضمون کی حامل اور ایک ہی طریق پر چل رہی ہیں۔

پھر اس سورۃ کا ایک قریبی تعلق سورۂ کہف سے یہ بھی ہے کہ سورۂ کہف کے آخر میں شریعت اور توحید پر زور دیا گیا تھا اور اس سورۃ میں مسیح کے ذکر سے کلام شروع کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے شریعت اور توحید میں دو خطرناک ابہام پیدا ہونے والے تھے اور اس طرح بات صاف کر دی گئی۔

پھر ان دونوں سورتوں کا ایک یہ تعلق بھی ہے کہ سورۂ کہف میں مسیحیوں کی انتہاء بیان کی گئی تھی اور اس میں ان کی ابتداء بیان کی گئی ہے۔ بظاہر اس کے الٹ ہونا چاہیے تھا۔ مگر بیج چونکہ مخفی ہوتا ہے اور کسی چیز کے ظاہر ہونے کے بعد ہی اس کی حقیقت کھلتی ہے اس لئے اسے بعد میں رکھا تا کہ مسیحیوں اور غیروں پر ظاہر ہو کہ کہاں سے بات شروع ہوئی تھی اور ختم کس شکل میں جا کر ہوئی۔

خلاصہ سورۃ اس سورۃ کے شروع کے مقطعات میں جو صفات الٰہیہ کا اختصار ہیں مسیحیت اور اسلام کے عقائد کا مقابلہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ گو مسیحیت کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن اس میں خلاف صداقت عقائد داخل ہو گئے ہیں اور وہ عقائد صفات الٰہیہ کے بھی خلاف ہیں (خلاصہ مفہوم کٓھٰیٰعٓصٓ)

اس کے بعد مسیح کا واقعہ حضرت زکریا کے ذکر سے شروع کیا۔ کیونکہ مسیح علیہ السلام کی بہت بڑی علامت جو یہود میں مشہور تھی وہ مسیح سے پہلے ایلیا نبی کا آسمان سے اترنا تھا (ملاکی باب ۴ آیت ۵) چنانچہ مسیح کے نزول کے بعد سب سے اہم سوال ان سے یہی کیا جاتا تھا۔ اور اسی سوال کے حل کرنے کی طرف انجیل نے غیر معمولی توجہ دی ہے اور بتایا ہے کہ ایلیا سے مراد یوحنا ہے (متی باب ۱۱ آیت ۱۵ و باب ۱۷ آیت ۱۲ و مرقس ۹ آیت ۱۳) اور یہ کہ ایلیا نے آسمان سے نہیں آنا تھا بلکہ زمین سے ہی نکلنا اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا تھا (متی باب ۱۱ آیت ۱۱ و لوقا باب ۷ آیت ۲۸) (ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا سے يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا تک)

ایلیا کے ذکر کے بعد مسیح کا ذکر کیا لیکن مسیحؑ کے دعویٰ کے ذکر کی بجائے اس کی والدہ کے ذکر سے اس کا ذکر شروع کیا۔ کیونکہ مسیحؑ کی پیدائش سے ہی بعثت محمدیہؐ کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے ان کی دو بیویوں سے تھے۔ یعنی حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق۔ حضرت اسماعیلؑ پلوٹھے تھے اور حضرت اسحاقؑ آپ کے دوسرے بیٹے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان دونوں کے بارہ

میں وعدے تھے۔

حضرت اسماعیلؑ کے متعلق پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۰ تا ۱۲ و باب ۱۷ آیت ۸ تا ۱۴ و آیت ۱۸ و ۲۰ و باب ۲۱ آیت ۱۳، ۱۷ و ۱۸ تا ۲۱ میں وعدے موجود ہیں۔

اور حضرت اسحاقؑ کے متعلق جو پیشگوئیاں تھیں ان کا پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹ و ۲۱ میں ذکر ہے۔

پھر ان دونوں بیٹوں کے لئے مجموعی پیشگوئی پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۷ و ۱۸ میں کی گئی۔ ان حوالہ جات کو جب پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۱ سے ملایا جائے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عہد ابراہیمی حضرت اسحاقؑ کے ذریعہ سے شروع ہونا تھا مگر پورا دونوں بیٹوں کے ذریعہ سے ہونا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد ابراہیمی کا آخری ظہور نسلِ اسماعیل سے ہونا تھا لیکن جب عہد کو اسحاق سے بدل کر اسماعیل کی طرف پھیرا جاتا تو لازماً نسلِ اسحاق کو ایک بڑا دھکا لگنا تھا اور ان پر گراں بھی گزرنا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس تبدیلی کو تدریجی طور پر ظاہر کیا جائے اور مدلل طور پر قائم کیا جائے۔

ان آیات میں اس مضمون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بار بار اور متواتر عہد کے توڑنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اب اسحاق کی نسل کی جگہ اسماعیل کی نسل کے ذریعہ سے عہد ابراہیمی کو پورا کیا جائے۔ لیکن بنو اسحاق کو آخری تنبیہ کرتے ہوئے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک کنواری کے ہاں بیٹا پیدا کیا جائے اور اسے موسیٰ کا خلیفہ مقرر کیا جائے اس خلیفہ موسوی کی وجہ سے بنو اسرائیل کے ذریعہ سے پورا ہونے والا عہد آدھا رہ گیا یعنی باپ کا تعلق بنو اسرائیل سے کٹ گیا اور صرف ماں کا تعلق رہ گیا جو بنی اسرائیل سے تھیں۔

پہلے لوگ سمجھتے تھے کہ بن باپ کے بچہ ہونا ناممکن ہے گو خدا کے لئے سب کچھ ممکن ہے مگر پھر بھی لوگ اس کو سنت اللہ کے خلاف کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر تازہ تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہ بات سنت اللہ کے خلاف نہیں بلکہ قانون قدرت کے اندر ہے چنانچہ ہم ذیل میں ایک تازہ شہادت پیش کرتے ہیں:۔

Dr. Helen Spurway یونیورسٹی کالج لنڈن کی یہ تھیوری ہے کہ پیدائش کے لئے ہمیشہ ضروری نہیں کہ نر کی ضرورت ہو چنانچہ Lancet لنڈن کے ایک ہفتہ واری میگزین میں اس کے تجربات شائع ہوتے ہیں۔ پھر Sunday Pictorial لنڈن ۶؍ نومبر ۱۹۵۵ء میں اسی تھیوری کے متعلق ایک شائع شدہ مضمون کے جواب میں ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۳؍ نومبر کو شائع ہونے والے رسالہ میں تین ایسی عورتوں کی شہادات بھی شائع ہوئی ہیں جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ان کا یہ بچہ خود بخود ہوا ہے اس کی پیدائش میں کسی مرد کا دخل نہیں۔ اس کے بعد ۲۸؍ دسمبر کے رسالہ

میں یہ لکھا ہے کہ انیس عورتوں نے اس امر کی مزید شہادت دی ہے۔

بہر حال چونکہ قرآن کریم کا اصل منشاء یہ تھا کہ ابراہیمی وعدہ اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے پورا ہوا ہے جو کہ بنواسماعیل میں سے ہیں اس لئے حضرت مسیح ناصری کے بن باپ پیدا ہونے کے واقعہ کا ذکر تفصیلی طور پر کیا اور اس طرف اشارہ کیا کہ خود پیدائش مسیح ہی اس طرف اشارہ کر رہی تھی کہ بنواسحاق کے ذریعہ سے ابراہیمی عہد کے پورا ہونے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ تبھی خدا تعالیٰ نے مسیح کے ذریعہ سے عہد کی آدھی اہمیت ختم کر دی۔ باقی آدھی خود مسیح ناصری کے پیروؤں نے کم کر دی کیونکہ انہوں نے ختنہ کو جو عہد کی علامت تھا موقوف کر دیا اور اس طرح عہد کو بنواسحاق سے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا (قاموس الکتاب از ایف ایس خیر اللہ زیر لفظ ختنہ)۔ حالانکہ ختنہ ابراہیمی عہد کی خاص شرط تھی۔ چنانچہ بائبل میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ

”میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔“ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۰ و ۱۱)

اسی طرح لکھا ہے۔

”میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی عہد ہوگا اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا“ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۳، ۱۴) (وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ سے وَمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا تک)

پھر حضرت مسیح کے واقعات بتائے اور ان کی صداقت کی دلیلوں کے ساتھ ان جھوٹے دعووں کا بھی ازالہ کیا جو ان کے متبعین ان کی نسبت کرتے ہیں (فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ سے اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ تک)

اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کو چھیڑا کہ ان گزشتہ واقعات میں اور مسیح کی آمد میں ایک اسماعیلی موعود کی خبر دی گئی تھی سو وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن لوگ ان کے مخالف ہیں اور ان کی مخالفت کی بڑی وجہ ان کی کثرت ہے جو دلیل نہیں اور ان کے جھوٹا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ خود ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی کثرت فائدہ نہ دے گی اور آخر وہ سب تباہ ہوں گے۔ (وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ سے فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ تک)

پھر فرمایا آج تو یہ لوگ خوب باتیں بناتے ہیں اور اسلام کے متعلق بات سننا تک پسند نہیں کرتے لیکن ایک

دن عذاب کو دیکھ کر خوب دیکھنے اور سننے لگ جائیں گے اور زمین مسلمانوں کے سپرد ہو جائے گی (اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ سے اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ تک)

اس کے بعد اس وعدہ ابراہیمی کو تفصیل سے بیان کرتا ہے جس کا ذکر پہلے اشارۃً آیا تھا اور بتاتا ہے کہ کس طرح ابراہیم سے ایک وعدہ ہوا جو اسحاق ؑ اور موسیٰ ؑ کے ذریعہ سے پورا ہوا۔(وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ سے وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا تک)

اس کے بعد اسماعیلؑ کا ذکر کرتا ہے کیونکہ اس جگہ یہ بتانا مقصود تھا کہ اسحاق ؑ کے وعدہ کے بعد اسماعیلؑ کا وعدہ پورا ہونا تھا ورنہ زمانہ کے لحاظ سے حضرت موسیٰ ؑ حضرت اسماعیلؑ کے بعد تھے ان کا ذکر حضرت اسماعیلؑ سے پہلے اس لئے کیا گیا کہ وہ اسحاق کے وعدہ کا حصہ تھے جو اسماعیلی وعدہ سے پہلے پورا ہونا ضروری تھا۔(وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ سے وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا تک)

اس کے بعد حضرت ادریس ؑ کا ذکر کیا جن کے بارہ میں رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کا ذکر فرما کر بتایا کہ ان کو بھی حضرت مسیح سے رفع روحانی میں ایک مشابہت ہے چنانچہ عہد نامہ قدیم پیدائش باب ۵ آیت ۲۴ میں لکھا ہے کہ حنوک (جسے عرب لوگ ادریس کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کی باتیں لوگوں کو سناتا تھا۔ بائبل میں بھی لکھا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ چلتا تھا۔ پیدائش باب ۵ آیت ۲۲ اور اس سے مراد بھی خدا تعالیٰ کی صفات کا علم حاصل کرنے کے ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا ایک اعلیٰ ظہور تھا اور خدا تعالیٰ کی صفات کو ظاہر کرتا تھا) غائب ہو گیا۔اس لئے کہ خدا نے اسے لے لیا (پیدائش باب ۵ آیت ۲۴) ’’غائب ہو گیا کہ خدا نے اسے لے لیا‘‘ کا ترجمہ قرآن کریم میں رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا سے کیا گیا ہے اور ایسے ہی الفاظ حضرت مسیح ؑ ناصری کے متعلق ہیں۔لیکن باوجود اس کے مسیحی حنوک کو خدا نہیں کہتے۔ بلکہ انسان ہی سمجھتے ہیں۔ پھر ان لفظوں سے مسیح ؑ کو کیوں خدا سمجھنے لگ گئے ہیں بلکہ بقول بائبل حنوک کو یہ فضیلت حاصل تھی کہ وہ موت کے بغیر ہی آسمان پر چلا گیا اور خدا باپ کی طرح اس نے کبھی موت نہ چکھی۔(وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ سے وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا تک)

پھر بتاتا ہے کہ یہ سب لوگ آدمؑ سے لے کر نوح ؑ تک اور نوح ؑ سے اسرائیل کے آخری نبیوں تک انسان تھے اور خدا تعالیٰ کے فرمانبردار، پھر کیا وجہ ہے کہ ان میں سے مسیح کو خدائی کا عہدہ دیا جاتا ہے۔(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ سے خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا تک)

اس کے بعد بتایا کہ لوگوں نے تعلیمات سماوی کو بھلا کر لہو ولعب کو اختیار کر لیا ہے لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

نتیجہ انہی کے لئے اچھا ہوگا جو ان امور سے توبہ کر کے خدا تعالیٰ کی باتوں کو سنیں گے۔(فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ سے هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا تک)

پھر بعد الموت کا چونکہ اس زمانہ میں سب سے زیادہ انکار ہونا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا اور پھر ان کے انکار کا ذکر کر کے دلیل دی کہ مابعد الموت زندگی کوئی عجیب شئے نہیں ایسا ضرور ہوگا اور مجرم ضرور سزا پائیں گے اور نیک نجات حاصل کریں گے(وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ سے نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا تک)

پھر سچائی کے دشمنوں کا ایک حربہ بیان کرتا ہے کہ جب اخروی سزا کا ذکر کیا جاتا ہے تو منکر کہتے ہیں کہ قیامت کی بات تو قیامت کو دیکھی جائے گی اب کس کا حال اچھا ہے، کس کی دولت زیادہ ہے، کس کے افراد زیادہ ہیں۔ فرماتا ہے ہمیشہ سے سچائی آہستہ آہستہ ترقی کرتی رہی ہے جب تک وہ وقت نہ آئے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ دلیل کس کے ساتھ ہے اور قربانی اور نیک نمونہ کس کے ساتھ ہے جس کے ساتھ دلیل ہو اور جس کے ساتھ نیک نمونہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اس دنیا میں بھی آخر وہی جیتے گا۔(وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ سے وَ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا تک)

اس کے بعد فرماتا ہے منکرین صداقت ہمیشہ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں اور شرک کو تقویت کا موجب سمجھتے ہیں مگر شرک ہمیشہ ذلت اور شکست کا موجب ہوتا ہے۔ وہی چیزیں جن کو لوگ تقویت کا موجب بتاتے ہیں ان کی کمزوری کا موجب ثابت ہوتی ہیں۔(وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً سے يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا تک)

پھر فرماتا ہے کہ جب دلائل سے کافر عاجز آ جاتا ہے تو دھینگا مشتی پر اتر آتا ہے مگر اس کی پروا نہ کر آخر یہ دھینگا مشتی ہی تو دنیوی غلبہ کا سبب بنے گی۔ دشمن دھینگا مشتی نہ کرے تو اسلام کو دنیوی غلبہ کس طرح حاصل ہوگا (یعنی اسلام جارحانہ لڑائی کی اجازت نہیں دیتا۔ پس اس کے غلبہ کا ذریعہ یہی بن سکتا ہے کہ دشمن ظلم پر اتر آئے) جب وہ ظلم پر اترے گا تو مسلمانوں کو بھی لڑنے کی اجازت ہوگی۔ اور چونکہ دشمن خدا تعالیٰ کو عقیدۃً بھی ناراض کر چکا ہوگا خدا تعالیٰ کی مدد سے مسلمان جیت جائیں گے(اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ سے سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا تک)

پھر فرماتا ہے کہ یہود پر کلام عبرانی زبان میں نازل ہوتا تھا لوگ یہ نہ اعتراض کریں کہ اب عربی زبان میں کلام کیوں اترا ہے۔ ہر قوم سے اس کی زبان میں کلام ہونا چاہیے تا کہ آسانی سے تبلیغ ہو سکے اور دوست دشمن سمجھ سکیں اور کفار پر حجت تمام ہو۔ ہماری طرف سے سزا حجت کے بعد ہی دی جاتی ہے اور وہی سزا عبرتناک ہوتی ہے (فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ سے تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا تک)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ①

(میں) اللہ کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

كٓهٰيٰعٓصٓ ۚ ②

كٓهٰيٰعٓصٓ

كٓهٰيٰعٓصٓ کی تشریح كٓهٰيٰعٓصٓ میں نے متعدد بار بیان کیا ہے کہ حروف مقطعات کے متعلق مختلف ائمہ اسلام میں اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اگر کوئی تشریح ایسی ہو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی جاتی ہو تو بہر حال وہ دوسرے لوگوں کے خیالات سے مقدم سمجھی جائے گی۔ اس نقطہ نگاہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مقطعات کے متعلق دو ہی معنے منسوب ہیں۔ بعض روایتوں میں تو یہ آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہودیوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ یہ حروف اعداد کے حروف ہیں۔ مثلاً الم ہے اس میں الف کا ایک لام کے تیس اور م کے چالیس اعداد ہیں۔ گویا الٓمٓ کے اکہتر عدد ہوئے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معنوں کو رد نہیں کیا (طبری زیر آیت الم)۔ پس بوجہ ان معنوں کو رد نہ کرنے کے وہ معنے بھی ہمارے نزدیک قابل قبول ہوں گے۔ کیونکہ اگر وہ غلط ہوتے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو رد فرما دیتے۔ اور قرآن کریم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معنے بھی اپنے اندر بعض پیشگوئیاں رکھتے ہیں جو وقت پر پوری ہوئیں۔

اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسے معنے بھی منسوب ہیں جن میں صفات الٰہیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مثلاً یہی كٓهٰيٰعٓصٓ ہے حضرت ام ہانی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چچا زاد بہن تھیں وہ کہتی ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے معنے كَافٍ۔ هَادٍ۔ عَالِمٌ اَوْ عَلِيْمٌ اور صَادِقٌ کے ہیں یعنی ك قائم مقام صفت كافی کا ہے۔ ھاد قائم مقام صفت ھادی کی ہے ع قائم مقام صفت عالم یا علیم کی ہے اور ص قائم مقام صفت صادق کی ہے (فتح البیان سورة مریم زیر آیت کھیعص) گویا ان مقطعات میں خدا تعالیٰ کی صفت کافی صفت ہادی صفت عالم یا علیم اور صفت صادق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت علیؓ کی بھی ان الفاظ کے متعلق ایک روایت آتی ہے جو ان معنوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی كٓهٰيٰعٓصٓ میں صفات الٰہیہ کی طرف ہی اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ

حضرت علیؓ کو جب کوئی بڑی مصیبت پیش آتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرتے تھے۔ کہ یَا کٓھٰیٰعٓصٓ اِغْفِرْلِیْ (فتح البیان سورۃ مریم زیر آیت کھیعص)۔ یعنی اے کٓھٰیٰعٓصٓ مجھے معاف فرما دے اور چونکہ دعا کا صفات الٰہیہ سے خاص تعلق ہوتا ہے اس لئے یہ روایت بتاتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کٓھٰیٰعٓصٓ کو صفات الٰہیہ کا قائم مقام سمجھتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ نے بھی ان حروف مقطعات سے صفات الٰہیہ ہی مراد لی ہیں مگر انہوں نے ام ہانیؓ والی روایت سے کچھ اختلاف کیا ہے وہ کہتے ہیں ك كَبِيْرٌ کا ہے ھاء ھَادٍ کی ہے یاء اَمِيْنٌ کی ہے ع سے عَزِيْزٌ مراد ہے اور ص سے صَادِقٌ مراد ہے (فتح البیان سورۃ مریم زیر آیت کھیعص) گویا حضرت ابن عباسؓ یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں صفات الٰہیہ کا ذکر کیا گیا ہے مگر وہ اس کی تشریح میں کچھ اختلاف کرتے ہیں۔ ام ہانیؓ کی روایت میں ك سے كَافٍ مراد لیا گیا تھا مگر ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اس سے كَبِيْرٌ مراد لیا ہے دوسرے ع سے انہوں نے عَالِمٌ یا عَلِيْمٌ مراد لیا تھا مگر ابن عباسؓ اس سے عَزِيْزٌ مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح ام ہانی کی روایت میں یاء کو چھوڑ دیا گیا تھا مگر ابن عباسؓ یاء سے اَمِيْنٌ مراد لیتے ہیں۔

ابن مسعودؓ اور بعض اور صحابہؓ کہتے ہیں کہ ك سے اَلْمُلْكُ مراد ہے ھاء سے اَلْاِلٰهُ مراد ہے یاء اور ع سے الْعَزِيْزُ مراد ہے اور ص سے الْمُصَوِّرُ مراد ہے۔ (فتح البیان سورۃ مریم زیر آیت کھیعص)

یہ روایتیں گو مختلف ہیں مگر ہم ان سے اتنا نتیجہ نکالنے میں ضرور حق بجانب ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہؓ نے بالاتفاق ان حروف سے صفات الٰہیہ مراد لی ہیں گو ان کی تعیین میں بعض صحابہؓ نے اختلاف کیا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ جو تعیین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی وہی مقدم ہے اور صحابہؓ کی تعیین رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعیین کے مقابلہ میں محض ظنی سمجھی جائے گی اگر ابن مسعودؓ کچھ اور معنے کرتے ابن عباسؓ کچھ اور معنی کرتے حضرت علیؓ کچھ اور معنی کرتے تو ہم کہہ سکتے تھے کہ سب نے اپنے اپنے پاس سے معنے بنا لئے ہیں۔ مگر حضرت علیؓ بھی ان سے صفات الٰہیہ مراد لیتے ہیں حضرت ابن عباسؓ بھی صفات الٰہیہ مراد لیتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ان سے صفات الٰہیہ مراد لیتے ہیں۔ پس ان روایات سے اتنا تو پتہ لگ گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ حروف صفات الٰہیہ کے قائم مقام ہیں۔ باقی ہر شخص کا اپنی اپنی عقل کے مطابق کچھ صفات الٰہیہ تجویز کر لینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ اس اصولی امر میں ہمیں سب متفق نظر آتے ہیں۔ کہ ان حروف میں صفات الٰہیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے رہا یہ کہ ان حروف میں کونسی صفات بیان کی گئی ہیں اس کو سورۃ کا

مضمون خود واضح کر دیتا ہے۔ اگر کوئی غلط معنے کرتا ہے تو ہمارے پاس صداقت کو معلوم کرنے کا ایک ذریعہ موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ساری سورۃ پر نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ اس میں کن صفات الٰہیہ کا ذکر آتا ہے اگر ان صفات کا ذکر موجود نہیں ہوگا تو ہم ان معنوں کو غلط قرار دے دیں گے اور اگر موجود ہوگا تو ہم ان معنوں کو درست قرار دے دیں گے لیکن اور سورتوں کو جانے دو اس سورۃ میں جو صفات الٰہیہ بیان کی گئی ہیں چونکہ ان کی تعیین خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اس لئے اس بارہ میں کسی اور تشریح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب سورتوں کے مقطعات کے معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ لیکن اس سورۃ کے مقطعات کے معنے خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور ام ہانیؓ کہتی ہیں کہ میں نے یہ معنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہیں اور دوسرے صحابہؓ اپنے علم کے مطابق اس کی تشریح کرتے ہیں اور چونکہ یہ مسلمہ اصل ہے کہ جو تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو وہ ہر دوسری تشریح پر مقدم سمجھی جائے گی۔ اس لئے بہرحال ام ہانیؓ کے بیان کردہ معنوں کو ہی ترجیح دی جائے گی یعنی ك کے معنے كَافِي کے ہیں ہ کے معنی هَادِي کے ہیں ع کے معنے عَالِمٌ یا عَلِيْمٌ کے ہیں اور ص کے معنے صَادِق کے ہیں اور میرے نزدیک یہی معنے اس سورۃ کی کنجی ہیں۔

اس جگہ ایک اور بات بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ حروف پانچ ہیں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو صفات الٰہیہ بیان فرمائی ہیں وہ چار ہیں۔ حروف ہیں ك ھا یا ع اور ص مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صفات بیان فرماتے ہیں ك، ھا، ع اور ص کی۔ یاء کو چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ بات کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ یاء صرف نداء کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ یاء کو حرف نداہی قرار دیا ہے اور پہلی دو صفات بعد کی دو صفات کا نتیجہ قرار دی گئی ہیں۔ گویا ان حروف کو اگر کھولا جائے تو عبارت یوں بنے گی کہ اَنْتَ كَافٍ، اَنْتَ هَادٍ، يَا عَالِمُ، يَا صَادِقُ اے علیم اور اے صادق خدا تو کافی اور ہادی ہے۔

ان معنوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفات کافی اور ہادی جو ظہور ہیں عالم یا علیم اور صادق کا وہ مسیحیت اور اسلام میں فیصلہ کن ہیں کیونکہ جب ہم یہ کہیں کہ اے ع اور ص تم کاف اور ھاء ہو۔ تو اس کے صاف معنے یہ ہوں گے کہ ع اور ص منبع ہیں کاف اور ھاء کا۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جو عقلی طور پر بھی ثابت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک صفات تو وہ ہوتی ہیں جو اپنا لازمی نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔ لیکن بعض صفات ایسی ہیں جن کا لازمی نتیجہ پیدا ہوتا ہے گویا وہ صفات بعض دوسری صفات کے لئے بطور منبع ہوتی ہیں۔ مثلاً خدا مطعم ہے مگر کھلانے کی صفت پیدا کرنے کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر اگر رزق ہی موجود نہ ہو تو وہ کھلائے گا کیا؟ پس اس کا

مطعم ہونا تقاضا کرتا ہے کہ وہ رازق بھی ہو۔ تو بعض صفات ابتدائی اور منبع کے طور پر ہوتی ہیں اور بعض تابع صفات ہوتی ہیں۔ یہاں ك اور ھاء کی صفات تابع ہیں اور ع اور ص کی صفات منبع کے طور پر ہیں اور کٓھٰیٰعٓصٓ کے یہ معنے ہیں کہ یَا عَلِیْمُ یَا صَادِقُ اَنْتَ کَافٍ وَ اَنْتَ ھَادٍ اے علیم اور صادق خدا تو کافی اور ہادی ہے۔ گویا کافی اور ہادی تابع صفات ہیں اور علیم اور صادق اصل صفات ہیں یعنی خدا تعالیٰ کے علیم اور صادق ہونے کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کافی بھی ہو اور خدا ہادی بھی ہو۔ گویا اس جگہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں سے یہ کہتا ہے کہ تم خدا سے یہ کہو کہ کٓھٰیٰعٓصٓ اے میرے علیم اور صادق خدا میں مانتا ہوں کہ تو علیم ہونے کی وجہ سے کافی ہے اور صادق ہونے کی وجہ سے ہادی ہے جب تو علیم ہے تو ضروری ہے کہ تو کافی بھی ہو اور جب تو صادق ہے تو ضروری ہے کہ تو ہادی بھی ہو اور یہ بات عقلی طور پر بھی ظاہر ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص عالم ہوگا تو لازماً وہ کافی بھی ہوگا جیسے علاج کے لئے تشخیص کامل کی ضرورت ہوتی ہے اور تشخیص کامل کے لئے علم کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس شخص کو معالجات سے تعلق رکھنے والی ساری باتیں معلوم نہیں وہ علاج نہیں کر سکتا اور جس کو معلوم ہوں وہ لازماً صحیح علاج بھی کر سکے گا۔ پس یہ ایک واضح امر ہے کہ جو علیم ہوگا وہ کافی بھی ہوگا کیونکہ علم ہی کفایت کرتا ہے نہ کہ جہالت۔

دنیا میں دو ہی قانون جاری ہیں۔ ایک قانون قدرت اور دوسرا قانون شریعت، قانون قدرت میں بھی کامل راہنمائی وہی کر سکتا ہے جو علیم ہو۔ جیسے وہی ڈاکٹر کامیاب ہو سکتا ہے جو بڑا جاننے والا ہو اور قانون شریعت میں بھی وہی وجود کامل راہنمائی کر سکتا ہے جو علیم ہو جو وجود ہماری جسمانی ضرورتوں کا علم نہیں رکھتا یا ہماری روحانی ضرورتوں کا علم نہیں رکھتا وہ ہمیں صحیح نسخہ بھی نہیں بتا سکتا۔ پس علیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ کافی ہو۔ اسی طرح جو صادق ہوگا وہی صحیح ہادی بھی ہوگا کیونکہ جھوٹ اور غلطی گمراہ کرنے والی چیزیں ہیں اور ہادی کے لئے ضروری ہے کہ وہ صادق ہو۔ پس وہی ہادی ہو سکتا ہے جو صادق ہو بلکہ تمام صداقتوں کا منبع ہو۔ اس کے سوا ہر جگہ کی ہدایت مشتبہ اور ناقابل قبول ہوگی۔

غرض جب کوئی شخص یہ مانے گا کہ کوئی ہستی علیم ہے تو اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صفت کافی بھی اس میں پائی جاتی ہے اور جب کوئی شخص یہ مانے گا کہ کوئی ہستی صادق ہے تو اسے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ صفت ہادی بھی اس میں پائی جاتی ہے اور اگر یہ دو اصول درست ہیں اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہودی مذہب جو بنیاد ہے عیسائیت کی وہ خدا تعالیٰ کو علیم بھی سمجھتا ہے اور صادق بھی سمجھتا ہے تو لازماً ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کافی بھی ہے اور خدا تعالیٰ ہادی بھی ہے اب ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل اس بارہ میں کیا کہتی ہے۔

پہلے ہم خدا تعالیٰ کی صفت علم کو لیتے ہیں انجیل میں لکھا ہے۔

’’لیکن اس دن اور اس گھڑی کو میرے باپ کے سوا آسمان کے فرشتوں تک کوئی نہیں جانتا۔‘‘

(متی باب ۲۴ آیت ۳۶)

یہ حوالہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں علم کی مختلف مقداریں ہیں کوئی مقدار علم ایسی ہے جسے انسان جانتا ہے۔ کوئی مقدار علم ایسی ہے جسے فرشتے جانتے ہیں اور کوئی مقدار علم ایسی ہے جسے نہ انسان جانتا ہے نہ فرشتے جانتے ہیں صرف خدا جانتا ہے۔ گویا علم کامل صرف خدا تعالیٰ کی ذات سے مختص ہے اور جب علم کامل اسی میں ہو تو لازماً اسے کافی بھی ماننا پڑا۔ پھر لکھا ہے۔

’’خداوند نے دانائی سے زمین کی بنیاد کی اور عقلمندی سے آسمان آراستہ کیا۔ اس کی دانش سے گہرائیاں پھوٹ نکلیں اور آسمان سے اوس کی بوندیں ٹپکیں۔ (امثال باب ۳ آیت ۱۹ و ۲۰)

یعنی خدا نے علم پر قانون قدرت کی بنیاد رکھی اور اسے آراستہ کیا اور پھر اس کے بعد جو بھی علم پیدا ہوتا ہے خواہ وہ روحانی یا جسمانی اس کے علم سے نکلتا ہے کیونکہ لکھا ہے ’’اس کی دانش سے گہرائیاں پھوٹ نکلیں‘‘ اس کے بعد ’’آسمان سے اوس کی بوندیں ٹپکیں‘‘ یعنی خدا تعالیٰ نے علم کو اتنا کامل کیا کہ آسمان بھی انسان کی ہدایت کے لئے ٹپک پڑا یعنی الہام اور کلام الٰہی نازل ہوا اور اس نے علم کو ہر رنگ میں مکمل کر دیا۔ یہ حوالہ بتاتا ہے کہ ہدایت ہمیشہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور وہی کامل ہدایت ہوتی ہے کیونکہ ایک علیم ہستی اس کے پیچھے ہوتی ہے انسان اپنی طرف سے کچھ نہیں کر سکتا۔

پھر صدق کے متعلق لکھا ہے۔

’’اے خداوند سچائی کے خدا تو نے مجھے مخلصی دی ہے۔‘‘ (زبور باب ۳۱ آیت ۵)

اس سے ظاہر ہے کہ مخلصی یعنی نجات کا واسطہ ’’خداوند سچائی‘‘ کے خدا کے ساتھ ہے جس طرح شریعت کا واسطہ ایک علیم ہستی کے ساتھ ہے پھر لکھا ہے۔

’’تیری صداقت ابدی صداقت ہے اور تیری شریعت حق ہے‘‘ (زبور باب ۱۱۹ آیت ۱۴۲)

گویا بائبل اور انجیل دونوں سے یہ ثابت ہے کہ علم کامل صرف خدا تعالیٰ کو حاصل ہے اور صداقت کاملہ بھی اسی کو حاصل ہے اور جب بائبل کے نزدیک علیم اور صادق صرف خدا تعالیٰ کا ہی وجود ہے تو عیسائیوں کے لئے اس امر کے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔ کہ سوائے علیم کے کوئی کافی نہیں ہو سکتا اور سوائے صادق کے کوئی نجات

نہیں دے سکتا۔ اور اگر یہ دونوں باتیں درست ہیں تو پھر خدا تعالیٰ کی صفت علیم اور اس کا ظہور کافی یہ کفارہ کے خلاف ہیں اور خدا تعالیٰ کی صفت صادق اور اس کا ظہور ہادی شریعت کے لعنت ہونے اور مسیحی مسئلہ نجات کے خلاف ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ عالم یا علیم ہے تو مذہب میں کفارہ کی کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ کفارہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سکیم کے ماتحت اس دنیا کو چلایا اور اپنے انبیاء لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجے مگر آخر وہ سکیم ناکام ہوئی اور پھر واپس لوٹ کر خدا تعالیٰ کو اپنے بیٹے کی قربانی دینی پڑی۔ اگر یہ درست ہے تو پھر نہ وہ علیم ہوا اور نہ کافی۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی صفت صادق اور اس کا ظہور ہادی اگر درست ہے تو عیسائیوں کا شریعت کو لعنت قرار دینا اور نجات کے لئے کفارہ کا مسئلہ ایجاد کر لینا بالکل غلط ہے۔

کٓھٰیٰعٓصٓ میں عیسائیت کے مقابلہ کے لئے ایک بنیادی اصول غرض کٓھٰیٰعٓصٓ میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیت کے مقابلہ کے لئے ایک بنیادی اصول بیان فرما دیا ہے اور بتایا ہے کہ عیسائیوں سے صفات الٰہیہ کو مدنظر رکھ کر بحث کیا کرو اس کے نتیجہ میں ان کے تمام عقائد باطل ثابت ہو جائیں گے اگر خدا کافی ہے تو پھر یہ کہنا کہ شریعت میں انسان خود رستہ تجویز کر سکتا ہے یا شریعت لعنت ہے بیوقوفی کی بات ہے جو کافی ہے وہ رحمت ہے اور جو غیر کافی ہے وہ لعنت ہے۔ اسی طرح جو صادق ہے اور جس کے اندر تمام سچائیاں پائی جاتی ہیں اگر اس کا وجود نجات نہیں دلا سکتا تو پھر کسی غیر صادق کا وجود کس طرح نجات دلا سکتا ہے۔ نجات تو وہی دلائے گا جو صادق ہوگا جیسے حضرت داؤدؑ نے کہا کہ

''اے خداوند سچائی کے خدا تو نے مجھے مخلصی دی ہے۔'' (زبور باب ۳۱ آیت ۵)

غرض کٓھٰیٰعٓصٓ میں عیسائیت اور اسلام کے مباحثات کا صحیح طریق بتایا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ تم اگر عیسائیوں سے مقابلہ کرو تو صفات الٰہیہ کی بناء پر کرو اور ان پر یہ امر واضح کر دو کہ تمہارے عقیدہ کو تسلیم کر لینے سے صفات باری باقی نہیں رہتیں اور جب عیسائیت کو ماننے سے صفات باری پر ہی زد پڑتی ہے تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا خدا نہ رہا اور یہ واضح بات ہے کہ سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے جو خدا تعالیٰ کا وجود لوگوں سے منوائے اور اس کی صفات پر ان کا ایمان قائم کرے۔ جو مذہب خدا تعالیٰ کو ہی ختم کرتا اور اس کی صفات پر تبر رکھ دیتا ہے وہ سچا کس طرح ہو سکتا ہے۔ غرض کافی اور ہادی یہ دو صفات ایسی ہیں جن کو اگر مدنظر رکھا جائے تو اسلامی تعلیم اور عیسائی تعلیم دونوں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں اور صاف طور پر پتہ لگ جاتا ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور اسلام کیا کہتا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے وجود کو کس رنگ میں پیش کرتے ہیں اور اسلام خدا تعالیٰ کے وجود کو کس رنگ میں

پیش کرتا ہے پس ع اور ص وہ صفات منبع ہیں جن کو اگر مانا جائے تو لازماً اسے کافی اور ہادی بھی ماننا پڑتا ہے۔ اگر اسے ہادی نہ مانا جائے تو خدا تعالیٰ کا صادق ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ اور اگر اسے کافی نہ مانا جائے تو خدا تعالیٰ کا علیم ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔ غرض ان مقطعات میں خدا تعالیٰ کی صفت کافی کو کفارہ کے مقابلہ میں اور صفت ہادی کو عیسائی نظریہ نجات کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے اور درحقیقت عیسائیوں کے یہی دو بنیادی مسئلے ہیں جن میں اسلام کے ساتھ ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ تثلیث ان مسائل کے تابع ہے۔ اصل مسئلہ جس پر اسلام اور عیسائیت آپس میں ٹکراتے ہیں وہ کفارہ اور عدم نجات کا ہے۔ عیسائیت نجات کو بالکل نہیں مانتی اور عیسائیت کفارہ کے بغیر کوئی روحانی ترقی تسلیم نہیں کرتی۔ ان دو عقیدوں سے خدا تعالیٰ کی صفت کافی اور خدا تعالیٰ کی صفت ہادی باطل ہوجاتی ہیں۔ اور ان دونوں صفات کے باطل ہونے سے اس کا علیم اور صادق ہونا بھی باطل ہوجاتا ہے گویا عیسائیت کے ان ہر دو عقائد کو مان لینے سے خدا تعالیٰ کی خدائی باطل ہوجاتی ہے اور جب کسی مذہب کی تعلیم کے نتیجہ میں خدا کی خدائی باطل ہوجائے تو ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ وہ مذہب خود باطل ہے کیونکہ مذہب خدا تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانے کے ساتھ ہی وابستہ ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے تثلیث بھی ایک اہم عقیدہ ہے لیکن ان کا یہ عقیدہ کفارہ اور نجات کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ اگر کفارہ اور عدم نجات باطل ہوجائیں تو ساتھ ہی تثلیث بھی باطل ہوجاتی ہے اور اگر تثلیث کو الگ کرلیا جائے تو کفارہ اور عدم نجات باطل ہوجاتے ہیں چنانچہ دیکھو عیسائیت کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کو نجات دلانے کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے مسیح کو دنیا میں کفارہ کے لئے بھیجا۔ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرسکتا کیونکہ یہ اس کے عدل کے خلاف ہے اگر وہ انسان کے گناہ معاف کردیتا تو وہ عادل نہ رہتا لیکن چونکہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ بنی نوع انسان نجات پائیں اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں اس غرض کے لئے بھیجا کہ وہ پھانسی پر لٹک جائے اور اس کے پھانسی پر لٹک کر مرجانے کے نتیجہ میں وہ لوگ جو اس پر ایمان لائیں روحانی سزا سے بچ جائیں اور اس کا پھانسی پر لٹک کر مرجانا لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوجائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کفارہ بغیر تثلیث کے نہیں ہوسکتا کیونکہ کفارہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو پھانسی دی اور تین دن کے بعد اس کو زندہ کیا۔ یہ چیز تبھی تسلیم کی جاسکتی ہے جب ایک سے زیادہ خدا ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ خدا نہ ہوں تو یہ بات ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو نعوذ باللہ پھانسی دے کر تین دن کے بعد اپنے آپ کو زندہ نہیں کرسکتا۔ مگر تین خداؤں کو تسلیم کرنے کی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ

تینوں برابر کی طاقت رکھتے ہیں یا ان میں کم وبیش طاقت ہے اگر ایک کم طاقت رکھتا ہے اور دوسرا زیادہ۔ تو خدا تعالیٰ میں نقص ثابت ہوا اور ناقص چیز تمام مذاہب کے متفقہ عقیدہ کے مطابق خدا نہیں ہو سکتی۔ اس پر کسی لمبی بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک منطقی نظریہ ہے کہ ناقص چیز ازلی ابدی نہیں ہو سکتی اور جو ہستی ازلی ابدی نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتی۔ اس پر تمام مذاہب متفق ہیں بلکہ عیسائیت کو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ناقص چیز ازلی ابدی نہیں ہو سکتی اور خدا تعالیٰ کے لئے ازلی ابدی ہونا ضروری ہے۔

میں ابھی نوجوان تھا قریباً بیس سال کی عمر تھی کہ میں تبدیلی آب و ہوا کے لئے ڈلہوزی گیا وہاں ایک مشہور پادری آئے ہوئے تھے جن کا نام غالباً فرگوسن تھا۔ انہوں نے سینکڑوں عیسائی بنا لئے تھے اور وہ پہاڑ پر بھی اپنے ٹریکٹ تقسیم کرتے اور عیسائیت کی تعلیم پھیلاتے رہتے تھے۔ کچھ مسلمان جو غیرت مند تھے وہ مولویوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اس فتنہ کا مقابلہ کریں مگر انہوں نے جواب دیا کہ ہم سے تو مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ آخر وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ آپ چلیں اور ان سے بات کریں ہم لوگ بڑے شرمندہ ہیں۔ میں ابھی چھوٹی عمر کا ہی تھا اور میری دینی تعلیم ایسی نہ تھی لیکن میں ان کے کہنے پر تیار ہو گیا اور ہم چند آدمی مل کر ان کی کوٹھی کی طرف چل پڑے وہاں جا کر میں نے ان سے کہا کہ پادری صاحب میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہم میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور میرے سامنے ایک پنسل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کہا فرمایئے اگر یہ پنسل اٹھانے کی ضرورت ہو اور آپ اس وقت مجھے بھی آواز دیں کہ آؤ اور میری مدد کرو۔ اپنے ساتھیوں کو بھی آوازیں دینی شروع کر دیں۔ اپنے بہرے کو بھی بلائیں۔ اپنے باورچی کو بھی بلائیں۔ اپنے اردگرد کے ہمسایوں کو بھی بلائیں اور جب سارا محلہ اکٹھا ہو جائے تو آپ ان سے یہ کہیں کہ یہ پنسل میز پر سے اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دو تو وہ آپ کے متعلق کیا خیال کریں گے؟ کہنے لگا! اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے کہا مطلب خود بخود آ جائے گا آپ صرف یہ بتائیں کہ آیا یہ بات معقول ہوگی اور اگر آپ ایسا کریں تو لوگ آپ کے متعلق کیا سمجھیں گے؟ کہنے لگا پاگل سمجھیں گے۔ میں نے کہا اب یہ بتایئے کہ باپ خدا میں اکیلے دنیا کو پیدا کرنے کی طاقت تھی یا نہیں؟ کہنے لگا تھی میں نے کہا بیٹے خدا میں اکیلے دنیا کو پیدا کرنے کی طاقت تھی یا نہیں؟ کہنے لگا تھی۔ میں نے کہا روح القدس خدا میں اکیلے دنیا کو پیدا کرنے کی طاقت تھی یا نہیں؟ کہنے لگا تھی میں نے کہا پھر یہ وہی پنسل والی بات ہو گئی کہ تینوں میں ایک جیسی طاقت ہے اور اس کام کے کرنے کے قابل ہیں مگر تینوں بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہیں حالانکہ وہ اکیلے اکیلے بھی دنیا کو پیدا کر سکتے تھے۔ میں نے کہا آپ یہ بتائیں کیا دنیا میں کوئی کام ایسا ہے جس کو باپ خدا کر سکتا ہے اور بیٹا خدا نہیں کر سکتا یا بیٹا خدا کر سکتا ہے

اور روح القدس خدا نہیں کر سکتا یا روح القدس خدا کر سکتا ہے اور باپ خدا نہیں کر سکتا یا بیٹا خدا کر سکتا ہے اور باپ خدا نہیں کر سکتا؟ کہنے لگا کوئی نہیں۔ میں نے کہا پھر جھگڑا کیا ہے اگر دو خدا فارغ بیٹھے رہتے ہیں تو یہ بڑی مصیبت ہے کہ وہ کام تو کر سکتے ہیں مگر فارغ بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہیں اور اگر ایک کام کو تینوں مل کر کرتے ہیں حالانکہ ان تینوں میں سے ہر ایک اکیلا اکیلا بھی وہ کام کر سکتا ہے تو یہ جنون کی علامت ہے اس پر وہ گھبرا کر کہنے لگا کہ عیسائیت کی اصل بنیاد کفارہ کے مسئلہ پر ہے تثلیث کا مسئلہ تو ایمان کے بعد سمجھ میں آتا ہے میں نے کہا کہ جب تک تثلیث سمجھ میں نہ آئے انسان ایمان نہیں لا سکتا اور جب تک ایمان نہ لائے تثلیث سمجھ میں نہیں آسکتی تو یہ تو دور تسلسل ہو گیا جس کو تمام منطقی ناممکن قرار دیتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ آپ مجھے معاف کریں کفارے پر بات کریں۔

پس درحقیقت کفارہ تعلق رکھتا ہے تثلیث کے ساتھ اگر کفارہ باطل ہو جائے تو تثلیث خود بخود باطل ہو جاتی ہے اور چونکہ یہ عقیدہ صریح مشرکانہ ہے اس لئے اس جگہ عالم کی صفت کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا گیا ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں اس بات پر بڑی بحث کی ہے کہ جس چیز کا انسان عالم کامل ہو اسے وہ بنا بھی سکتا ہے (سرمہ چشمہ آریہ روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۲۲۶)۔ مثلاً انسان کو علم ہے کہ اینٹیں جوڑنے سے مکان بن جاتا ہے تو اس علم کے نتیجہ میں وہ مکان بنا لیتا ہے یا اسے علم ہے کہ مٹی گھول کر لکڑی کے سانچوں میں ڈھالو تو کچی اینٹ بن جاتی ہے اور پھر اسے آگ میں ڈال دیا جائے تو پختہ ہو جاتی ہے تو اس علم کے نتیجہ میں وہ پختہ اینٹ بنا لیتا ہے اسی طرح اگر کسی کو یہ پتہ لگ جائے کہ مٹی کس طرح بنتی ہے تو مٹی بھی بنا سکتا ہے۔ غرض خلق علم کے تابع ہے جب کسی چیز کا کامل علم حاصل ہو جائے تو اسے انسان بھی بنا سکتا ہے۔ اگر کسی کو گھڑی بنانے کا پورا علم حاصل ہو جائے تو وہ گھڑی بنا لے گا۔ جسے افعال الاعضاء کا پورا علم حاصل ہو جائے وہ ڈاکٹر بن جائے گا۔ غرض کسی چیز کا علم کامل خلق پر قدرت دے دیتا ہے اور جب کوئی ہستی کامل علم والی ہو تو لازماً اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ کامل خلق بھی کر سکتی ہے اور کامل تدبیر بھی کر سکتی ہے اور یہ کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مدبر کی ضرورت نہیں۔ جیسے فرگوسن کے سامنے میں نے یہی دلیل پیش کی کہ جب تینوں خدا کامل ہیں تو پھر ایک کی موجودگی میں باقیوں کی کیا ضرورت ہے خدا باپ کو لے لو۔ خدا بیٹے کو لے لو۔ خدا روح القدس کو لے لو۔ جب باپ خدا بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو بیٹا خدا کر سکتا ہے اور بیٹا خدا بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو روح القدس خدا کر سکتا ہے تو پھر ایک خدا ہی کافی ہے باقی دو کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ **کاف** میں صفت کافی کی طرف اشارہ کر کے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کافی ہے بندوں کی پیدائش کے لئے بھی اور ان کے نظام کے لئے بھی اور ان کی تدبیر کے لئے بھی اس میں نہ کسی کفارہ کی ضرورت ہے اور نہ بیٹے

اور روح القدس کی مدد کی ضرورت ہے۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ باوجود خدا تعالیٰ کو کافی سمجھنے کے تم بھی تو فرشتوں کے قائل ہو۔ اسی طرح تم اس دنیا میں ہواؤں کے اور بجلیوں کے اور مادہ کے قائل ہو یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کو ہم تابع حیثیت دیتے ہیں اور تابع حیثیت اور ہوتی ہے اور برابر کی حیثیت اور ہوتی ہے تابع چیز ایسی ہی ہوتی ہے جیسے خادم ہوتے ہیں وہ خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو پس پردہ رکھنے کے لئے ایک قانون بنایا ہوا ہے اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا کوئی نیک نتیجہ نکلنا تھا اور ہمیں اس کے بدلہ میں انعامات ملنے تھے تو ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی پس پردہ رہتی۔ کیونکہ جو ظاہر چیزیں ہیں ان پر ایمان لانا کسی ثواب کا موجب نہیں ہوتا۔ سورج ہمیں نظر آتا ہے اور ہم اس کا وجود مانتے ہیں مگر اس کے ماننے سے ہمیں انعام نہیں ملتا۔ اسی طرح پہاڑ نظر آتے ہیں اور ہم ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں مگر ہمیں ان پہاڑوں کو ماننے سے ثواب نہیں ملتا۔ چونکہ انسانی پیدائش کی غرض تکمیل روحانیت تھی اور تکمیل روحانیت ثواب کے ساتھ تعلق رکھتی تھی اور روحانی نظر کی تیزی کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔ اس لئے جب کسی چیز کی تیزی اور اس کے ارتقاء کا سوال آئے گا لازماً امتحان اور آزمائش کا بھی سوال آجائے گا اور امتحان اور آزمائشیں زیادہ تر اسی چیز کے متعلق ہوتی ہیں جس کے حصول میں مشکلات حائل ہوں پس ضروری تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود مخفی رہے ورنہ بنی نوع انسان کی ترقی کی سکیم بالکل بے کار چلی جاتی اور جب خدا نے پوشیدہ رہنا تھا تو یہ لازمی بات تھی کہ کچھ روحانی سامان پیدا کئے جاتے اور کچھ جسمانی سامان پیدا کئے جاتے۔ روحانی اسباب میں فطرت صحیحہ اور فرشتے شامل ہیں اور جسمانی اسباب میں مادہ اور اس کو حرکت دینے والا قانون شامل ہے پس فرشتوں کا وجود یا مادہ کا وجود کسی اعتراض کا موجب نہیں عیسائی برابر کے خدا پیش کرتے ہیں اور ہم خادم اور تابع چیزیں پیش کرتے ہیں اور خادم اور تابع چیزوں کی ضرورت اس لئے ہے تا اللہ تعالیٰ کی ہستی وراء الوراء رہے اور خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ایسا پردہ حائل رہے جس کو مجاہد اور محنت سے کام لینے والا انسان ہی پھاڑ سکے، ہر انسان نہیں۔ غرض علم مبداء اور علم موجودات کا جو واقف ہوگا لازماً قادر مطلق وجود ہوگا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا صادق ہونا بھی ایک مجاہد کی نجات کا ضامن ہوتا ہے۔ اگر انسان بغیر کفارہ کے نجات نہیں پا سکتا تھا تو تمام سابق انبیاء جھوٹے قرار پاتے ہیں اور ان کو بھیجنے والا بھی جھوٹا قرار پاتا ہے۔ کیونکہ آدم آیا اور اس نے یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ نوحؑ آیا اور اس نے یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ آدم کا واقعہ تو تورات میں تفصیل کے ساتھ موجود نہیں۔ نوحؑ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور بائبل بتاتی ہے کہ نوحؑ نے آکر یہی کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔ اگر انسان بغیر کفارہ کے نجات نہیں پا سکتا تو نوحؑ جھوٹا تھا اور نوح کو بھیجنے والا

بھی جھوٹا تھا۔ پھر ابراہیم آئے انہوں نے بھی بنی نوع انسان سے یہی کہا کہ جو صداقتیں میں پیش کرتا ہوں۔ ان کو مانو۔ گو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی بائبل میں ادھورا ہے جیسے آدم کا ذکر ادھورا ہے لیکن اس کے بعد موسیٰ ؑ کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور بائبل بتاتی ہے کہ انہوں نے دنیا کے سامنے اپنی تعلیم پیش کی اور ان سے یہی کہا کہ اگر تم اس تعلیم کو نہیں مانو گے تو تم خدا تعالیٰ کے غضب کے نیچے آ جاؤ گے اور اگر مانو گے تو نجات پا جاؤ گے۔ انہوں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ میں تعلیم تو دیتا ہوں مگر تم اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ جیسے عیسائی کہتے ہیں کہ شریعت پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ موسیٰ ؑ نے یہی کہا کہ اگر تم عمل کرو گے تو نجات پا جاؤ گے۔ پس عیسائی عقیدہ اگر سچا ہے اور نجات ناممکن ہے تو موسیٰ ؑ جھوٹا تھا اور اس نے نعوذ باللہ بڑا فریب کیا کہ اپنی تعلیم کے متعلق لوگوں سے یہ کہا کہ اگر تم اس پر عمل کرو گے تو نجات پا جاؤ گے اور اگر وہ نبی تھا جیسے بائبل کہتی ہے کہ وہ نبی تھا تو پھر خدا بھی نعوذ باللہ جھوٹا قرار پاتا ہے جس نے اسے اس تعلیم کے ساتھ بھیجا۔ اسی طرح موسیٰ ؑ کے بعد آنے والے باقی تمام انبیاء بھی جھوٹے ماننے پڑتے ہیں کیونکہ ہر ایک نے یہی کہا کہ میری تعلیم پر چلو گے تو نجات پاؤ گے چنانچہ زبور میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا کہ

''تیری شریعت حق ہے'' (زبور باب ۱۱۹ آیت ۱۴۲)

اگر شریعت پر عمل نہیں ہو سکتا جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ شریعت لعنت ہے تو پھر یہی کہنا پڑے گا کہ سچائی پر عمل نہیں ہو سکتا صرف جھوٹ پر عمل ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہنا پڑے گا کہ سچائی سے نجات نہیں مل سکتی صرف جھوٹ سے مل سکتی ہے۔ غرض اگر ہم یہ مان لیں کہ انسان شریعت پر عمل کرنے سے نجات نہیں پا سکتا اور نبیوں کی اتباع نہیں کر سکتا تو سارے انبیاء کا سلسلہ جھوٹا ماننا پڑتا ہے لیکن اگر وہ صادق خدا ہے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نجات ہے کیونکہ خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے تمام نبیوں نے یہی کہا کہ اگر تم ہماری باتوں کو مانو گے تو نجات پا جاؤ گے۔

دوسرے عربی زبان میں صدق کے لفظ میں دوام کے معنے بھی پائے جاتے ہیں خالی سچائی کے معنے نہیں (تاج العروس)۔ بلکہ وہ چیز جو قائم رہنے والی ہوتی ہے اس پر بھی صدق کا لفظ حاوی ہوتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے صادق ہونے کے یہ معنے بھی ہیں کہ اس کا وجود اور اس کی تعلیم ہمیشہ قائم رہنے والی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ خدا تعالیٰ کا قول اور خدا تعالیٰ کا فعل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کا قول اور اس کا فعل تبھی قائم رہنے والے ہو سکتے ہیں جب بنی نوع انسان بھی قائم رہنے والے ہوں۔ اگر مخلوق نے نجات نہیں پانی اور ہلاک ہو جانا ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کے قول نے بھی قائم نہیں رہنا اور اس کے فعل نے بھی قائم نہیں رہنا کیونکہ اس کا

قول اور اس کا فعل مخلوق کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کا قول اور فعل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں تو معلوم ہوا کہ انسان قائم رہے گا اور وہ نجات پا سکتا ہے اگر اس نے فنا ہو جانا تھا تو خدا تعالیٰ کا ہمیشہ قائم رہنے والا قول اور فعل باطل ہو جاتا ہے۔ غرض صدق کامل اپنے ظلّی صدق کا بھی مطالبہ کرتا ہے کیونکہ صدق دوام پر دلالت کرتا ہے اور دوام صفات بغیر دائمی موہبت صفات کے نہیں ہوسکتا۔ خود بائبل بھی ہماری اس بات کی تصدیق کرتی ہے۔ بائبل میں آتا ہے خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا (پیدائش باب ۱ آیت ۲۶و۲۷) اب خدا تعالیٰ کی شکل کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ خدا تعالیٰ کے بھی نعوذ باللہ ہماری طرح ناک، کان، آنکھیں اور منہ ہیں۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اندر جو صفات پائی جاتی ہیں وہ انسان کے اندر بھی پائی جاسکتی ہیں اور اگر یہ درست ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ کی شکل پر بنایا گیا اور خدا تعالیٰ صادق ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انسان اپنے اندر تقویٰ اور راستبازی اور طہارت بھی پیدا کرسکتا ہے ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ جو صادق ہے اس کا ارادہ اور فعل غلط نکلے اور انسان بوجہ گندی سرشت کے شیطان بن گیا۔ پس جو مذہب یہ کہتا ہے کہ انسان گندی سرشت کے ساتھ دنیا میں آیا دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ارادہ کیا مگر کوئی وجود بھی وہ اپنی شکل پر پیدا نہ کرسکا اس نے آدمؑ کو اپنی شکل پر پیدا کیا لیکن وہ گنہگار ہو گیا یعنی یا تو خدا تعالیٰ کی شکل ناقص ہے یا وہ اپنے ارادہ میں ناکام رہا اور شیطان خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ پہلے پھل کو بھی لے گیا اور اس کے اگلے پھلوں کو بھی چرا کر لے گیا بلکہ اس کے آخری پھل مسیح کی بھی آزمائش کے لئے آ گیا۔ کیا یہ خدا تعالیٰ کی ہتک نہیں اور کیا یہ عقیدہ خدا تعالیٰ کی صداقت پر حرف لانے والا نہیں؟ خدا تو یہ کہتا ہے کہ میں نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا مگر ہوتا یہ ہے کہ پہلا انسان بھی شیطان کی شکل پر بن جاتا ہے یعنی اس کی بات ماننے لگ جاتا ہے اور اس کی آئندہ نسل بھی ورثہ کے گناہ میں ہمیشہ کے لئے مبتلا ہو جاتی ہے اور شیطان کے نقش قدم پر چلنے لگ جاتی ہے حتیٰ کہ مسیح جو نجات دہندہ کے طور پر آیا تھا وہ بھی اتنا کمزور ثابت ہوتا ہے کہ شیطان اس کی آزمائش کے لئے آجاتا ہے۔ (متی باب ۴ آیت ۱ تا ۱۱)

مگر اس کے مقابلہ میں قرآن کریم جو تعلیم دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نجات دینے کے لئے کسی کفارہ کا محتاج نہیں۔ اس نے اپنے بندوں کو ہدایت کے لئے ہی بنایا ہے اور ان کی پیدائش میں فطری طور پر اس نے نیکی کا مادہ رکھا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں شیطان کے اس دعویٰ کا ذکر کرتے ہوئے کہ وہ انسان کو خراب کرے گا فرماتا ہے۔

قَالَ اَرَءَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ٘ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا۔ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا۔ وَ اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ اَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكْهُمْ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا۔ رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا (بنی اسرائیل: ۶۳ تا ۶۷)

یعنی جب آدم پیدا ہوئے اوران کی عدم اطاعت اور نافرمانی کی وجہ سے شیطان پر غضب نازل ہوا تو اس نے کہا یہ آدمی جس کو مجھ پر فضیلت بخشی گئی ہے اس کے مقابلہ میں اگر آپ مجھے قیامت تک موقعہ دیں۔ تو میں اس کی اولاد پر غالب آجاؤں گا سوائے کچھ لوگوں کے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کے رو سے (یہ عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ کہہ دیں یہ غلط بات ہے) شیطان بھی کہنے کی طاقت نہیں رکھتا کہ سارے انسان خراب ہیں جو عیسائیوں کا عقیدہ ہے اور شیطان نے بھی یہ جرأت نہیں کہ سب کو خراب قرار دے بلکہ اس نے تسلیم کیا کہ کچھ انسان پھر بھی بچ جائیں گے لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّیَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلًا نہایت واضح آیت ہے اور بتا رہی ہے کہ یہ مسئلہ اتنا غلط ہے کہ شیطان کو بھی یہ جرأت نہیں ہوسکی کہ وہ کہے کہ ہر انسان خراب ہے وہ بھی اقرار کرتا ہے کچھ انسان میرے حملہ سے ضرور بچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا جاؤ ان میں سے جو اپنی مرضی سے تمہارے پیچھے چلے گا اس کو سزا دی جائے گی اور تو ان کو ڈرا یا بلا جس کو چاہے اپنی آواز سے اوران پر اپنے سوار اور پیادے لے جا اوران کو اموال اور اولاد میں شریک کر اور انہیں وعدے دے وَ مَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا اور شیطان تو ہمیشہ جھوٹے وعدے دیا کرتا ہے۔ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ لیکن میں یہ بتا دیتا ہوں کہ تو نے تو یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں بندوں کو چھین کر لے جاؤں گا مگر میرا دعویٰ یہ ہے کہ جو شخص میری طرف آنا چاہے گا تو اسے کبھی اپنی طرف نہیں لے جا سکے گا۔ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا اور وہ انسان جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اس سے زیادہ حفاظت میں اور کون ہوسکتا ہے۔ رَبُّكُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا اور تمہارا رب وہ ہے جو تمہاری کشتی کو آرام سے سمندر میں لے جاتا ہے تا کہ تم اس کے فضل کی تلاش کرو اور اللہ تعالیٰ بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انسانی فطرت پاک ہے اور اگر فطرت پاک ہے تو پھر یقیناً اس کو بدی پر غالب آنے کی طاقت بھی حاصل ہے اور اگر انسان بدی پر غالب آ سکتا ہے تو پھر کسی کفارہ

کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ صحیح فطرت کی کوشش اور توبہ اور اس کے نتیجہ میں خدا کا رحم نجات کے لئے کافی ہیں۔

چنانچہ ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:۔

اول۔شیطان نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ وہ اکثر بنی نوع انسان کو اپنے قابو میں لے آئے گا۔گویا قرآن کریم بنی نوع انسان کی خرابی کے عقیدہ کو شیطان کی طرف منسوب کرتا ہے یہی نہیں کہ اسلام اس کو رد کرتا ہے رد کرنا اور چیز ہوتی ہے اور کسی عقیدہ کو اتنا گندہ قرار دینا کہ اس کو شیطانی فعل کہنا بالکل اور بات ہوتی ہے اس عقیدہ کے متعلق قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ یہ شیطان کا عقیدہ ہے اور شیطان کے متعلق بھی فرماتا ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ سارے انسان خراب ہو جائیں گے بلکہ اس نے بھی یہ کہا کہ اکثر انسانوں کو میں خراب کرلوں گا۔

دوسری بات قرآن کریم یہ بیان فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کہا کہ تم کوشش کرو ہم تمہیں روکتے نہیں۔ہم نے انسان کو بنایا ہی اسی لئے ہے کہ وہ تمہارا مقابلہ کرے اور اپنے اندر نیکی پیدا کرنے کی کوشش کرے لیکن فرماتا ہے تم صرف بیرونی اثرات سے ہی اس پر اپنا اثر ڈال سکو گے ورنہ فطرتاً ہم نے اسے پاک بنایا ہے۔عیسائیت تو یہ کہتی ہے کہ گناہ انسان کے دل میں گھس گیا اور ورثہ کے طور پر نسل انسانی میں چل پڑا (رومیوں کے نام خط باب ۵ آیت ۱۲ تا ۲۱)۔حالانکہ اگر یہ درست ہے تو شیطان کے پیچھے چلنے کی تحریک خود انسان کے دل سے پیدا ہونی چاہیے۔لیکن اسلام اس کے دل کو پاک قرار دیتا ہے۔بلکہ اس انسان کے دل کو بھی پاک قرار دیتا ہے جو شیطان کے قبضہ میں چلا جاتا ہے فرماتا ہے

وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ وَ اَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ بِخَيۡلِكَ وَ رَجِلِكَ وَ شَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ وَعِدۡهُمۡ یعنی جس کو چاہے تو اپنی آواز سے ورغلانے کی کوشش کر اور جس پر چاہے اپنے گھوڑے چڑھا کرلے جا یعنی اپنا لاؤ لشکر اس پر لے جا اور جس پر چاہے اپنے پیادے لے جا یعنی خواہ جو غالب لوگ ہیں ان کے ذریعہ ان کو ورغلا یا جو ماتحت ہیں ان کے ذریعہ ورغلا اور خواہ تو انہیں مال کی لالچ دے یا اولاد کی ترقی کی لالچ دے بہرحال میرے بندوں پر تیرا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اس آیت میں بنی نوع انسان کو خراب کرنے والی جن تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو دل سے پیدا ہوتی ہو بلکہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو باہر سے آتی ہیں اور انسان کو خراب کر دیتی ہیں۔ مثلاً فرمایا کہ تم گانے بجانے سے انسان کو خراب کرو گے۔تم دھمکیوں سے اسے خراب کرو گے یعنی یہ کہ اگر سچ بولا تو پھانسی پر لٹک جاؤ گے یا تم نے سچ بولا تو قید ہو جاؤ گے پھر فرمایا وَ شَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ تم اس کو لالچیں دو گے کہ اگر تم

نے حرام مال نہ کھایا تو ہمیشہ غریب رہو گے اگر تم نے ترقی کرنی ہے تو حرام مال کھاؤ وَ الْاَوْلَادِ اسی طرح جتھے بنانے کے لئے اور پارٹی بازی کے لئے تم اسے اکساؤ گے اور کہو گے کہ جب تک تم فریب نہ کرو گے کامیاب نہیں ہوسکو گے وَعِدْهُمْ اور پھر ہر قسم کی ترقیات کے وعدے دو گے کہ اگر تم جھوٹ اور فریب اور مکر اور دغا بازی سے کام لو گے تو خوب ترقی کرو گے یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو خارجی ہیں اگر انسان کا دل ناپاک تھا تو پھر ان چیزوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اللہ تعالیٰ فرما دیتا کہ چونکہ آدم نے گناہ کیا تھا اس لئے انسان گنہگار ہو گیا مگر جتنی چیزیں قرآن کریم نے انسان کو بگاڑنے اور خرابی میں مبتلا کرنے والی بیان کی ہیں وہ ساری کی ساری ایسی ہیں جو خارجی ہیں یعنی (۱) گانا بجانا (۲) دھمکیاں مثلاً یہی کہ کہیں انبیاء کے ماننے والے ترقی نہ کر جائیں اس لئے ان پر خوب ظلم کرو (۳) حرص اور لالچ۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان کی خرابی کے لئے تمہیں بیرونی ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ اندرونی طور پر وہ محفوظ ہے۔ مگر ورثہ کا گناہ اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ باہر سے نہیں آتا جیسے کسی شخص کی والدہ کو سل کا مرض ہو اور وہ بچپن میں اپنی والدہ کا دودھ پیتا رہا ہو جس سے سل کا مادہ اس کے اندر داخل ہو گیا ہو تو ایسے شخص کو جب سل کا مرض ہو گا تو یہ اس کی اندرونی بیماری کہلائے گی لیکن ایک اور انسان ایسا ہوتا ہے جو کسی مسلول کی تیمارداری میں مشغول رہا اور اس کے کپڑوں اور سانس وغیرہ کے ذریعہ سے سل کے کیڑے اور اس کے اندر چلے گئے اور وہ بیمار ہو گیا اب گو سل کا مرض اس کو بھی ہوا ہے مگر اس کی بیماری باہر سے آئی ہے اور اس کی بیماری اندر سے پیدا ہوئی تھی۔ اسی طرح اور کئی بیماریاں ہیں جو ماں باپ سے ورثہ میں اولاد کو ملتی ہیں۔ مثلاً مرگی کا مرض ہے۔ عموماً جن بچوں کے ماں باپ کو مرگی ہوتی ہے انہیں بھی مرگی کے دورے شروع ہو جاتے ہیں۔ یا جنون ہے یہ بھی ورثہ میں چلتا ہے ہم نے بعض دفعہ تین تین پشتوں میں جنون کا مرض منتقل ہوتے دیکھا ہے۔ چونکہ انسان زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے اس بارہ میں لمبا تجربہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن ممکن ہے اگر کوئی سوسائٹی بن جائے اور وہ اس کی تحقیق کرے تو شاید سات سات آٹھ آٹھ پشتوں تک یہ مرض ظاہر ہوتی چلی جائے۔ آتشک کی ایک صورت تو یقیناً ایسی ہے جو سات سات پشتوں تک چلی جاتی ہے بلکہ یورپ کے تازہ لٹریچر میں میں نے پڑھا ہے کہ بعض دفعہ پندرہ پندرہ بیس بیس پشت تک بھی اس مرض کے نشان ملتے ہیں گو اس کی شکل اس شکل سے بدل جاتی ہے جو ابتدائی حالت میں مرض کی ہوتی ہے لیکن بہرحال آئندہ نسل میں یہ مرض چلتی چلی جاتی ہے اب یہ مرض کہیں باہر سے نہیں آتی خود انسان کے اندر اس مرض کا مادہ ہوتا ہے جب نفس پر ضعف اور کمزوری غالب آتی ہے تو کبھی ناک کی ہڈی

بیٹھنی شروع ہو جائے گی اور کبھی کوئی اور علامت ظاہر ہو جائے گی جس سے معلوم ہوگا کہ آتشک کا مادہ اس کے اندر تھا لیکن اگر یہ مرض باہر سے آئے۔مثلاً فرض کرو باپ کو آتشک نہیں تھی لیکن بچہ آگے آتشک والے مریض سے چھو گیا اور ایسی طرز پر چھوا کہ اسے آتشک ہو گئی تو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ مرض اسے باپ سے ملی ہے بلکہ ہم کہیں گے کہ یہ مرض باہر سے آئی ہے۔اسی طرح قرآن کریم نے یہاں بگاڑ کے جتنے ذرائع بتائے ہیں وہ سب کے سب خارجی ہیں یہ نہیں کہا کہ چونکہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا اس لئے انسان کو تم خراب کرلو گے بلکہ فرمایا کہ تم اسے لالچیں دو گے اس کے اندر ڈر اور خوف پیدا کرو گے۔اسے گانے بجانے کی طرف توجہ دلاؤ گے اور اس طرح تم اسے خراب کر دو گے گویا خرابی کے تمام اسباب خارجی ہوں گے اندرونی نہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بیان فرمائی ہے جس میں صاف طور پر ان معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو میں نے مقطعات میں کٓ کے بیان کئے تھے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ جو میرے ساتھ تعلق رکھنے والے بندے ہیں ان پر تیرا قبضہ کبھی نہیں ہو سکتا اور نہ ان پر لالچ اور ڈر اور خوف وغیرہ کا کوئی اثر ہو سکتا ہے۔وَ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا اور تیرا رب اپنے بندے کا وکیل یعنی نگران ہونے کے لحاظ سے کافی ہے جب کوئی شخص خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجائے گا تو شیطان اس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔کیونکہ وہ اپنا معاملہ خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے یہاں کَفٰی کا لفظ استعمال کر کے صاف پوران معنوں کی طرف اشارہ کر دیا جو میں نے بیان کئے تھے میں نے بتایا تھا کہ کٓ اس جگہ کافی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یہی بات اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ظاہر کر دی اور کَفٰی کا لفظ استعمال کر کے بتا دیا کہ اس سورۃ میں خدا تعالیٰ کے کافی ہونے کا ذکر ہے جب کوئی شخص اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے تو پھر کارساز ہونے کے لحاظ سے خدا تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوتا ہے اور شیطان اس پر قبضہ نہیں کر سکتا۔اگر ورثہ کے گناہ کی وجہ سے ہر انسان پیدائشی طور پر ناپاک ہوتا۔جیسے عیسائی کہتے ہیں تو ایسے لوگ خواہ تقویٰ اختیار کرتے۔خواہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ضرور تباہ ہو جاتے مگر ایسا نہیں ہوتا جس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ گناہ بیرونی اثرات کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔فطرت اپنی ذات میں پاکیزہ ہے۔آگے اس کی دلیل دیتا ہے اور فرماتا ہے رَبُّکُمُ الَّذِیْ یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ فِی الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا تم گناہ کو ایک خطرناک طوفان سمجھتے ہو۔ایک ایسی آفت خیال کرتے ہو جو تباہ کر دینے والی ہوتی ہے اور تم گناہ کو دیکھ کر سمجھتے ہو کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس نے انسان کے اندر ڈیرہ ڈال لیا ہے اور اب یہ اس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔مگر فرماتا ہے گناہ اپنی ذات میں کوئی چیز ہی نہیں یہ سارا وہم ہے اس کی موٹی مثال سمندر ہے تم دیکھتے ہو کہ سمندر میں کشتیاں چلتی ہیں

دخانی کشتیاں تو اب بھی چلتی ہیں جو ایک ملک سے دوسرے ملک میں سودے لے جاتی ہیں لیکن پہلے زمانہ میں بادبانی کشتیوں کا رواج تھا جو ہوا کے زور پر چلتی تھیں۔ فرماتا ہے کشتیوں کا انحصار ہی ہوا پر ہے لیکن کبھی ہوا طوفان بھی بن جاتی ہے جب وہ حد سے بڑھ جاتی ہے تو طوفان کہلاتی ہے لیکن باوجود اس کے کہ کبھی کبھی ہوا طوفان بن جاتی ہے۔ جب دنیا میں ہواؤں سے کشتیاں چلا کرتی تھیں اگر دنیا سے کہا جاتا کہ ہوائیں بند کی جائیں یا طوفان بند کئے جائیں تو ساری دنیا پکار اٹھتی کہ طوفان کا کیا ہے یہ تو کبھی کبھی آتا ہے اگر ہوائیں بند ہو گئیں تو ہماری تجارتیں ماری جائیں گی اور ہماری روزی کا سارا سامان جاتا رہے گا۔ اگر طوفان کے نتیجہ میں ہزاروں کشتیوں میں سے کوئی ایک ڈوب بھی جاتی ہے تو کیا ہوا یہ مثال بیان فرما کر اللہ تعالیٰ اس امر کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ تم گناہ گناہ کرتے ہو حالانکہ وہ تو ایک اعتداء کا نام ہے جس طرح وہی ہوا جو جہازوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جاتی ہے بعض دفعہ طوفان بن جاتی ہے اسی طرح وہی قوتیں جو انسان کی ترقی اور اس کے فائدہ کے لئے اس کے اندر رکھی گئی ہیں جب بگڑ جاتی ہیں تو انہی کا نام گناہ بن جاتا ہے۔ گویا گناہ ایک طوفان ہے جذبات کا۔ مگر طوفان ہوا کے حد سے بڑھنے کا نام ہوتا ہے اس کے نیچے اس کی سب حرکت نیک ہوتی اور نیک نتائج پیدا کرتی ہے۔ مثلاً انسان کو خدا تعالیٰ نے آنکھیں دیکھنے کے لئے دی ہیں جن سے وہ دن رات کام لیتا ہے ایک بدمعاش سے بدمعاش انسان کے بھی سارے دن کے اعمال کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنی آنکھوں کا کتنا ناجائز استعمال کیا ہے تو پتہ لگے گا کہ دوسو دفعہ اس نے اپنی آنکھوں کا جائز استعمال کیا ہے اور ۱/۲۰۰ دفعہ ناجائز استعمال کیا ہے کہیں اس نے گھر کی صفائی کی ہوگی کہیں اس نے دوستوں سے ملاقات کی ہوگی۔ کہیں اس نے محنت اور مزدوری کی ہوگی اور یہ سارے کام اس نے آنکھ سے کئے ہوں گے جو آنکھوں کا جائز استعمال ہے۔ لیکن ایک دفعہ اس نے کسی غیر عورت کو بھی دیکھ لیا ہوگا۔ اگر اس کی آنکھ ماری جاتی تو بیشک ناجائز فعل اس سے نہ ہوتا۔ مگر جائز فعل بھی وہ نہ کر سکتا پس فرماتا ہے۔ گناہ کی تعریف جو تم نے سمجھی ہے وہ غلط ہے۔ تم گناہ کو اپنی ذات میں بری چیز سمجھتے ہو حالانکہ وہ قوتیں جو انسان کی ترقی اور اس کے فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں انہی میں افراط اور تفریط کا نام گناہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسراف صدقہ کی زیادتی کا نام ہے اور بخل مال کی حفاظت میں شدت پکڑنے کا نام ہے اور صدقہ اور حفاظت مال کے بغیر دنیا چل ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح زنا رجولیت کے بے موقعہ استعمال کا نام ہے اور رہبانیت اس کے عدم استعمال کا نام ہے اگر رجولیت کا استعمال نہ ہو تو دنیا کیونکر چلے اور اگر اس پر ضبط نہ رکھا جائے تو انسان کی صحت کس طرح قائم رہے۔

غرض ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے گناہ کا فلسفہ بیان فرمایا ہے۔ اور بتایا ہے کہ انسان کی پیدائش نیک ہے

بدی باہر سے آتی ہے اور یہ دعویٰ کہ انسان کی اکثریت گناہ میں مبتلا ہوگی ایک شیطانی خیال ہے۔

(۲) دوسری آیت جو اس مضمون کو واضح کرتی ہے وہ یہ ہے کہ

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (التین: ۵ تا ۷)

فرماتا ہے ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر قوتیں دے کر پیدا کیا ہے۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ مگر اس کے بعد ہم اس کو بعض دفعہ نیچے ہی نیچے لے جاتے ہیں۔ یہاں ایک عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک ہے میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ پہلے آدم آیا اور اس نے ترقی کی مگر اس کے گناہ کی وجہ سے نسل انسانی گر گئی۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ میں سارے انسان نہیں جاتے بلکہ وہ حصہ جو اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ والا تھا وہ تو اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ پر قائم رہا۔ صرف دوسرا حصہ جس نے اس راستہ کو چھوڑ دیا تھا وہ سزا میں مبتلا ہوا اور نبیوں کی جماعت سے الگ ہو گیا۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ نبیوں کی جماعت سے تعلق رکھنے والے ہیں اور ان کی نیکی بھی کسبی ہے اور گناہ بھی کسبی ہے نہ نیکی ورثہ کی ہے نہ گناہ ورثہ کا ہے اور عیسائیوں سے ہماری بحث ہی یہی ہے کہ تم بتاؤ آیا نبیوں کی جماعتیں بھی کفارہ پر ایمان لائے بغیر بچ سکتی ہیں یا نہیں؟ وہ کہتے ہیں نہیں لیکن قرآن کہتا ہے کہ مومن اور عمل صالح کرنے والوں یعنی نبی کی تعلیم کے مطابق عمل کرنے والے لوگوں کے لئے ایک غیر مقطوع اجر ہوگا۔ پس یہ خیال کہ گناہ انسان کی پیدائش میں رکھا گیا ہے بالکل غلط ہے۔

یہاں عیسائی اعتراض کر سکتے ہیں کہ ہمارا تو یہی دعویٰ ہے کہ انسان کی فطرت میں چونکہ بدی ہے وہ نیک عمل کر ہی نہیں سکتا اور اسی لئے ہم شریعت کو لعنت قرار دیتے ہیں۔ اس کا جواب قرآن کریم مندرجہ ذیل آیت میں دیتا ہے۔ فرماتا ہے۔

وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا

(الشمس: ۷ تا ۱۱)

ہم شہادت کے طور پر نفس انسانی کو اور اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ قوتوں کے ساتھ پیدا کرنے کے واقعہ پیش کرتے ہیں۔ سوّٰی کے معنے ہوتے ہیں جس میں کوئی کجی نہ ہو اور تسویہ کے معنے ہوتے ہیں برابر کر دینا جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔ وَ نَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا میں ما مصدریہ ہے اور اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم شہادت کے طور پر پیش کرتے

ہیں نفس کو اور اس کے بغیر افراط وتفریط کے اعلیٰ درجہ کی قوتوں کے ساتھ پیدا کئے جانے کو۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا جب ہم نے اسے پیدا کر دیا تو اس کے بعد ہم نے اس نفس کو الہام کیا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا کہ فجور کیا ہے یعنی کن باتوں سے تو راستہ سے ادھر ہو سکتا ہے وَ تَقْوٰىهَا اور کون سے ایسے راستے ہیں جن پر چل کر تو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے اس آیت سے ایک تو یہ پتہ لگا کہ اللہ تعالیٰ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسانی نفس میں تسویہ پایا جاتا ہے کجی نہیں پائی جاتی نیکی پائی جاتی ہے بدی نہیں پائی جاتی۔

دوسرے نہ صرف اپنی ذات میں اس میں درستی پائی جاتی ہے بلکہ اس میں نیکی اور بدی کا ایک احساس بھی پایا جاتا ہے یعنی ہم نے اس کے اندر ایک کانشنس رکھی ہے جو پہچانتی ہے کہ کونسا اچھا راستہ ہے اور کونسا برا۔ مثلاً ایک سوٹی جسے چھیل کر صاف کر لیا گیا ہو اسے یہ پتہ نہیں ہوتا کہ میں صاف ہوں۔ لیکن انسان کو پتہ ہوتا ہے کہ میرے اندر فلاں خوبی پائی جاتی ہے یا مثلاً یوں سمجھ لو کہ ایک انسان جس کی جیب میں روپیہ ہو ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ آدمی بے پیسہ کے نہیں لیکن اگر اس کو پتہ نہیں کہ میری جیب میں روپیہ پڑا ہوا ہے تو وہ اس کو استعمال نہیں کر سکے گا۔

یہاں بھی دو باتیں بیان کی گئی ہیں اول یہ کہ ہم نے انسان کو ہر قسم کی کجی سے پاک بنایا ہے اور دوسرے یہ کہ صرف پاک ہی نہیں بنایا بلکہ اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ تیرے اندر یہ یہ باتیں خرابی کی ہوں گی اور یہ یہ باتیں نیکی کی ہوں گی۔ گویا وہ صرف پاک ہی نہیں بلکہ وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ میرے اندر جو قوتیں پائی جاتی ہیں میں نے ان کو اس اس طرح استعمال کرنا ہے اور اس کے اندر ایک کانشنس ہے جو پہچانتی ہے کہ اگر میں نے اس طرح کیا تو میرا یہ فعل بدی ہوگا اور اگر اس طرح کیا تو میرا فعل نیکی ہوگا۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا کی آیت میں مضمون کو اور بھی واضح کر دیا۔ کہ وہ شخص کامیاب ہو گیا جس نے اس کو پاک رکھا یعنی اس کے اندر خدا تعالیٰ نے خرابیاں پیدا نہیں کیں۔ پس جو شخص اس کے تزکیہ کو قائم رکھتا ہے اور اسے خراب نہیں ہونے دیتا وہ بڑا کامیاب انسان ہے۔ وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا اور جو اس کی پاکیزگی کو مسل ڈالتا اور اس کی نیکی کو اپنے پاؤں سے کچل ڈالتا ہے وہ سخت ناکام اور نامراد ہوگا۔

(۴) پھر فرماتا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى۔ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى۔ وَ الَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى۔ وَ الَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى۔ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَ مَا يَخْفٰى۔ وَ نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى۔ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى۔ وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى۔ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى (الاعلیٰ: ۲ تا ۱۳)

یعنی اے انسان تو اپنے اعلیٰ رب کی تسبیح کر۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیونکر معلوم ہوا کہ تیرا رب اعلیٰ ہے۔اس کے جواب میں فرماتا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی اس نے انسان کو پیدا کیا اور پھر اسے ہر قسم کے عیب سے پاک بنایا وَ الَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی پھر اس نے انسان کی طاقتوں کا ایک معیار مقرر فرمایا کیا کہ اس حد تک انسان ترقی کر سکتا ہے فَھَدٰی اور پھر بتایا کہ اس اس مقام تک پہنچنے کی یہ یہ ترکیب ہے۔یعنی اگر ادنیٰ مومن بننا چاہتے ہو تو یہ یہ تدبیر ہے اعلیٰ مومن بننا چاہتے ہو تو یہ یہ کام کرو شہید اور صدیق بننا چاہتے ہو تو اس اس طرح کرو۔گویا قَدَّرَ فَھَدٰی میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے مختلف روحانی گریڈ مقرر کر کے ساتھ ہی طریقے بھی بتا دیئے کہ اس اس طرح عمل کرو گے تو ان گریڈوں کو حاصل کر لو گے۔

درحقیقت اَلَّذِیْ خَلَقَ کے معنے اَلَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ کے ہیں۔کیونکہ آگے ساری باتیں وہ بیان کی گئی ہیں جو انسان سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً ہدایت کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ واضح بات ہے کہ ہدایت درختوں کے لئے نہیں ہوتی۔ جانوروں کے لئے نہیں بلکہ انسانوں کے لئے ہوتی ہے پس فرماتا ہے تم اپنے اندازہ سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ خدا تعالیٰ کا قانون انسان کے متعلق کیا ہے اور دوسری مخلوق کے متعلق کیا ہے۔تم کھیتیوں اور سبزیوں ترکاریوں کو دیکھو وَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی۔ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی۔تمہیں دکھائی دے گا کہ ایک وقت کے بعد وہ بالکل بے کار اور سیاہ ہو جاتی ہیں اور ان کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی لیکن اس کے مقابلہ میں انسان آتا ہے تو انسانوں کی اچھی چیزیں یعنی ان کا مغز اور روحانیت قائم رہتی ہے۔پچھلے سال کے پھل سے ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے لیکن آدم کی تعلیم آج تک قائم ہے نوح کی تعلیم آج تک قائم ہے ابراہیم کی تعلیم آج تک قائم ہے۔موسیٰؑ کی تعلیم آج تک قائم ہے معلوم ہوا کہ اس جگہ اور قانون ہے اور اس جگہ اور قانون ہے اگر یہ گندی چیز ہوتی تو اس کے قائم رکھنے کے معنے کیا تھے اور ضرورت کیا تھی کہ اسے ہزاروں تک زندہ رکھا جاتا؟ پھر فرماتا ہے سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی۔آدمؑ اور نوحؑ اور ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کی تعلیم کے متعلق تو لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کیا پتہ انہوں نے یہی تعلیم دی تھی یا کچھ اور دی تھی اب ہم تجھے بتاتے ہیں کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی ہم تجھ کو ایک سبق پڑھائیں گے جو تو کبھی نہیں بھولے گا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ سوائے اس کے کہ کسی حکم کے متعلق خدا تعالیٰ خود کہہ دے کہ یہ عارضی ہے اور اسے بعد میں منسوخ کر دے جیسے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جاتی تھی۔لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیا (بخاری کتاب الصلوۃ باب التوجہ نحو القبلۃ) اس قسم کے عارضی احکام کے سوا ہم تجھ کو ایک ایسی تعلیم دینے والے ہیں فَلَا تَنْسٰٓی جسے تو بھولے گا نہیں۔اس جگہ مخاطب صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ تمام

انسان مخاطب ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ بتاتا ہے کہ انسان جتنا بھی زور لگالے اس تعلیم کو تو بھلا نہیں سکتا۔ یعنی ہم اسے قائم رکھیں گے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں انسان کے مخفی سے مخفی خیالات کا بھی ذکر ہے اور ان بیرونی حوادث کا بھی ذکر ہے جو اس کے اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں وَ نُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى اور ہم اس تعلیم کے پھیلانے میں تمہارے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور یہ تعلیم پھیلتی چلی جائے گی اگر شریعت لعنت ہے تو ہم ایک تعلیم بھیجنے والے ہیں ہم دیکھیں گے کہ اس پر عمل ہوتا ہے یا نہیں۔ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى یہ جو ہم نے دلیلیں دی ہیں ان سے پتہ لگتا ہے کہ انسانی قلوب کی اصلاح شریعت اور اس سے متعلقہ چیزوں سے ہو جاتی ہے پس انہی طریقوں کو تم بھی استعمال کرو۔ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى جب تم اس تعلیم کو پیش کرو گے تو جو لوگ اپنے دل میں خوف خدا رکھنے والے ہوں گے وہ اس سے ضرور فائدہ اٹھالیں گے۔ اس میں بھی اشارہ کیا ہے کہ نیکی ورثہ کی چیز ہے نہ کہ بدی۔ کیونکہ خشیت دل میں پیدا ہوتی ہے وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى اور اس سے وہ شخص بچنے کی کوشش کرے گا جو اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال چکا ہو۔ آیت کا یہ دوسرا حصہ بھی بتاتا ہے کہ شقاوت خود انسان کی پیدا کردہ ہوتی ہے ورنہ ہر انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے پاک ہے۔

(۵) پھر فرماتا ہے اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ۔ وَ لِسَانًا وَّ شَفَتَيْنِ۔ وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد:۹ تا ۱۱) کیا انسان یہ نہیں سوچتا کہ ہم نے اسے آنکھیں دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان گنہگار رہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان نے گناہ کو ورثہ میں لیا ہے کیا ہم نے اسے آنکھیں نہیں دیں کیا ہم نے اسے زبان نہیں دی۔ کیا ہم نے اسے ہونٹ نہیں دیئے اگر انسان فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کی نجات کفارہ پر ہی منحصر تھی تو ہم نے اسے آنکھیں کیوں دی تھیں اور وہ دیکھتا کیوں ہے اور اگر اس کا دل گندا تھا اور وہ کسی واقف انسان سے تبادلہ خیالات کر کے اپنے گند کو دور نہیں کر سکتا تھا تو ہم نے اسے زبان کیوں دی تھی اور اس کے ہونٹ کیوں بنائے تھے وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ پھر ہر انسان کے اندر خدا تعالیٰ نے ایک کانشنس رکھی ہے جو نیکی اور بدی کا موازنہ کرتی ہے۔ اگر یہ نیکی اور بدی کا موازنہ کر ہی نہیں سکتا تو اس کانشنس کی کیا ضرورت تھی۔ کفارہ تو ایسا ہی ہے جیسے گڑھے میں پتھر ڈال کر کوئی شخص یہ سمجھ لے کہ اس طرح اس کا پیٹ بھر جائے گا چیز وہ ہوتی ہے جس کا کوئی منطقی نتیجہ نکلتا ہو۔ جب اس کا کوئی منطقی نتیجہ نکلتا ہی نہیں اور انسان دیکھتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تو اسے سوچنا چاہیے کہ پھر اس کی ضرورت کیا ہے اگر کفارہ پر ہی بنی نوع انسان کی نجات منحصر تھی تو کیا ضرورت تھی آنکھ کی۔ کیا ضرورت تھی زبان کی۔ کیا ضرورت تھی ہونٹوں کی۔ اس کے بعد فرماتا ہے وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ پھر ہم نے اس کو دونوں راستے بتا دیئے۔

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بعض دفعہ چھوٹے سے چھوٹے لفظ میں بڑی بھاری بات بیان کر دیتا ہے۔ قرآن کریم میں رستہ کا ذکر کئی دوسرے مقامات پر بھی آتا ہے مگر کسی جگہ اس کے لئے سبیل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور کسی جگہ طریق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے نجد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سبیل اور طریق کے الفاظ چھوڑ دیئے ہیں۔ اس اختلاف سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں مضمون کے ساتھ نجد کا ہی تعلق ہے سبیل اور طریق کا تعلق نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لغت میں نجد کے معنے اونچے راستے کے ہیں۔ جو چڑھائی والا ہو (اقرب)۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ یہ مضمون بیان کیا ہے کہ چڑھائی والے راستہ پر جب انسان چلتا ہے تو اسے تکلیف ہوتی ہے سانس پھولتا ہے اور اس کے پاؤں وغیرہ میں کھلیاں پڑ جاتی ہیں۔ اسی حالت کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ یہ تو سیدھی بات ہے کہ جیسے فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ میں تشریح کر دی گئی ہے اس سے دنیوی رستہ مراد نہیں۔ کیونکہ آگے یہ مضمون آتا ہے کہ اس نے صدقہ نہیں دیا۔ خیرات نہیں دی یتامیٰ اور مساکین کا خیال نہیں رکھا پس صاف پتہ لگتا ہے کہ اس جگہ ظاہری رستہ مراد نہیں بلکہ دو راستوں سے مراد نیکی اور بدی کا راستہ ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جو چیز انسان کے اندر ورثہ سے آجائے اس کے لئے اسے محنت نہیں کرنی پڑتی۔ مثلاً آنکھیں ہیں یہ ہمیں ورثہ میں ملی ہیں ان میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے آنکھوں سے دیکھنے کے لئے ہمیں نہ کسی مشق کی ضرورت ہوتی ہے نہ محنت اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے آپ ہی آپ ہم دیکھنے لگ جاتے ہیں اسی طرح زبان میں ہمیں ورثہ میں ملی ہے اور ہم آپ ہی آپ بولنے لگ جاتے ہیں یا ہاتھ اور پاؤں ہیں یہ بھی آپ ہی آپ چلنے لگ جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہمیں ورثہ کے طور پر ملے ہیں۔ اگر گناہ بھی ورثہ میں ملا ہوتا۔ تو اس کے لئے کسی مشق کی ضرورت نہیں تھی اور گناہ کا راستہ چڑھائی والا راستہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جیسے ہاتھ اور پاؤں ہمیں ورثہ میں ملے ہیں۔ ہم نے اپنے ماں باپ سے لئے۔ انہوں نے اپنے ماں باپ سے لئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ان کے ہلانے جلانے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسی طرح گناہ بھی اگر ورثہ میں ملا ہے تو اس کے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہیے تھی۔ کیونکہ وہ طاقتیں جو ورثہ کے ساتھ آتی ہیں ان کے استعمال میں انسان کو محنت نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن فرماتا ہے ہم نے نجدین بنائے ہیں یعنی اگر تم نیکی میں بڑھنا چاہو تو تمہیں اس کے لئے بھی کوشش کرنی پڑے گی اور اگر تم بدی میں بڑھنا چاہو تو تمہیں اس کے لئے بھی کوشش کرنی پڑے گی۔ پس نہ نیکی ورثہ میں ملی ہے نہ بدی ورثہ میں ملی ہے۔ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ گویا ہر چیز Self acquired ہے۔ بدی میں ترقی کرنا چاہو تو تمہیں محنت کرنی پڑے گی نیکی میں ترقی کرنا چاہو تو تمہیں محنت کرنی پڑے گی اگر گناہ ورثہ میں ملا ہوتا تو پہلے جھوٹ اور پہلی چوری کے لئے کوئی محنت نہ کرنی پڑتی۔

مگر جب کوئی پہلا جھوٹ بولتا ہے تو اس کا رنگ فق ہو جاتا ہے اور جب کوئی پہلی چوری کرتا ہے وہ آپ ہی بھاگا پھرتا ہے اور بعض دفعہ تو ایسی حرکات کرتا ہے کہ لوگوں کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے ہمارے ملک میں مشہور ہے کہ ایک برہمن سے گائے ماری گئی اس زمانہ میں یہ قانون تھا کہ اگر برہمن گائے مارے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ وہ گائے کو اپنے مکان میں ہی بند کر کے بھاگا۔ راستہ میں جب بھی وہ دو آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتا دیکھتا۔ فوراً ان کے پاس پہنچتا اور کہتا کہ آپ گائے گائے کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہم تو گائے کا کوئی ذکر نہیں کر رہے وہ کہتا نہیں نہیں تم مجھ سے چھپاتے ہو۔ ضرور تم گائے کا ذکر کر رہے ہو پھر آگے چلتا اور جب پھر دو تین آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتے دیکھتا تو ان کے پاس پہنچتا اور کہتا یہ آپ بچھڑا بچھڑا کیا کہہ رہے ہیں وہ کہتے ہم تو کوئی ذکر نہیں کر رہے وہ کہتا نہیں کوئی بات ضرور ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی بازار ختم نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کو شبہ پڑ گیا اور انہوں نے اسے پکڑ لیا۔ گھر گئے تو مری ہوئی گائے نکل آئی تو جب انسان کسی قسم کا بھی گناہ کرتا ہے پہلی مرتبہ اس کا نفس اسے ملامت کرتا ہے اور وہ شرمندہ ہوتا ہے۔ چور چوری کرنے کے بعد گھبرایا پھرتا ہے ڈاکو ڈاکہ مارنے کے بعد گھبرایا پھرتا ہے اگر گناہ ورثہ میں آیا ہوتا تو گناہ کا راستہ نجد کیوں ہوتا اور اس کے لئے چڑھائی کیوں چڑھنی پڑتی۔

(۶) پھر فرماتا ہے قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰهٰ:۵۱) حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے کہتے ہیں کہ ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی طاقت کے مطابق قوتیں دی ہیں اور پھر یہ بتایا ہے کہ وہ اس اس طرح ترقی کر سکتی ہے۔ اس جگہ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ میں انسان کی خلق بھی شامل ہے اور بائبل خود مانتی ہے کہ انسان اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کا خدا سے تعلق ہو۔ اور وہی انسان مبارک ہے جو اس کے احکام کو سنتا اور ان پر عمل کرتا ہے (امثال باب ۸ آیت ۳۴)

(۷) اسی طرح فرماتا ہے وَ لَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (السجدة:۱۴)

اگر ہم چاہتے تو ہر جان کو اس کی ہدایت دے دیتے اس جگہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا مضمون پہلی آیتوں کے مضمون کے خلاف ہے لیکن حقیقتاً خلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وَ لَوْ شِئْنَا لَهَدَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ۔ اگر یہ الفاظ ہوتے تب بھی اس کا مضمون پہلے مضامین کے خلاف نہ ہوتا لیکن یہاں هُدٰىهَا کے الفاظ ہیں یعنی ہر نفس جو ہم نے پیدا کیا ہے اس کے اندر اس کی ہدایت کا بھی سامان رکھا ہے بعض لوگ اس ہدایت کو نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں اگر ہم چاہتے تو مجبور کر کے انہیں ہدایت واپس دے دیتے۔ مگر جبر سے چونکہ پیدائش انسانی کی غرض

باطل ہو جاتی تھی اس لئے ہم نے جبر نہیں کیا۔ یہ بھی اسی بات کی دلیل ہے کہ انسان کا نفس پاک پیدا کیا گیا ہے اور ہر انسان ہدایت کے ساتھ بھیجا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اپنی حماقت اور بیوقوفی سے اپنے اندر سے ہدایت نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں فرماتا ہے اگر ہم چاہتے تو ہم ان کے نفس کی اندرونی ہدایت انہیں پھر واپس دے دیتے یعنی ان کو ہدایت رد کرنے کی توفیق نہ ملتی۔ مگر جو لوگ اپنے دل کی ہدایت کو چھوڑ گئے ہمارا فیصلہ ان کے بارہ میں یہی ہے کہ ان کو ہم ان کے عمل کی سزا دیتے ہیں ورنہ ہمارا دل یہی چاہتا تھا کہ ان کو بھی ہدایت دیتے چنانچہ اسی مضمون کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ یعنی ہم نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ اپنے اعمال کی وجہ سے دوزخ میں چلا جاتا ہے ورنہ ہماری طرف سے تو اس کی ہدایت کے سامان موجود تھے۔

(۸) اسی طرح فرماتا ہے وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الشعراء:۹۱) ہم نے متقیوں کے لئے جنت کو قریب کر دیا ہے یعنی ایک طرف ان کی فطرت انہیں جنت کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری طرف خدا تعالیٰ کی مدد ان کو جنت کی طرف لے جاتی ہے اس طرح اندرونی اور بیرونی ہدایتیں ان کو جنت کی طرف راغب کرتی ہیں۔

(۹) اسی طرح فرماتا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات:۵۷) میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میرے عبد بنیں۔ یعنی تمام بنی نوع انسان کے پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ وہ عبد بنیں اور عبد کے متعلق دوسری جگہ قرآن کریم میں یہ تشریح آئی ہے کہ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ۔ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر:۲۸ تا ۳۱) یعنی اے نفس مطمئنہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھنے پر راضی ہو گیا تو اپنے رب کی طرف ایسی حالت میں لوٹ آ کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے "تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی ہے" کے معنے یہ ہیں کہ وہ پاک ہے اور اس کا دل اس قدر صفائی اختیار کر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن گیا ہے فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ اس کے بعد فرماتا ہے جب یہ مقام کسی انسان کو میسر آ جائے کہ وہ خدا تعالیٰ سے راضی ہو جائے اور خدا تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے تو اس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کا عبد بن جاتا ہے گویا وہ جو فرمایا تھا کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ میں نے جن اور انس کو صرف اپنا عبد بننے کے لئے پیدا کیا ہے اس مقصد پیدائش کو وہ پالیتا ہے اور جو شخص اپنی پیدائش کے مقصد کو حاصل کر لے لازماً وہ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ کا مستحق ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش کی غرض یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عبد بن جائیں اور جو غرض پیدائش انسانی کی اللہ تعالیٰ قرار دے اسے کون باطل کر سکتا ہے۔ پھر نہ صرف اس نے پیدائش انسانی کی

یہ غرض قرار دی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ انسانوں میں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کو وہ خوشخبری دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ۔ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۔ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔

یہاں ایک اور لطیف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ نفس مطمئنہ کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً جن سے خدا راضی ہو گیا اور جو اپنے خدا سے راضی ہو گئے۔ ادھر خدا تعالیٰ صحابہؓ کے متعلق فرماتا ہے رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (التوبة:۱۰۰) اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو گئے۔ اب اس آیت کو سامنے رکھتے ہوئے یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ۔ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ۔ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ پر غور کرو۔ تو دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یَا اَیَّتُهَا الْجَمَاعَةُ الصَّحَابَةُ اِرْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ گویا قرآن کریم کی ان آیتوں نے شہادت دے دی کہ صحابہ کرامؓ اس مقام تک پہنچ چکے تھے جس پر پہنچ کر انسان خدا تعالیٰ کے عباد میں داخل ہو جاتا اور اس کی جنت کا وارث ہو کر اپنے مقصد حیات کو پالیتا ہے۔

(۱۰) ایک اور آیت جو اس مضمون کو واضح کرتی ہے وہ قرآن کریم میں اسی واقعہ کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ گزرا۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدم کے متعلق فرماتا ہے لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰهٰ:۱۱۶) یعنی حضرت آدم سے جو غلطی ہوئی تھی وہ اجتہادی تھی اس میں ان کے عزم کا کوئی دخل نہیں تھا۔ غلطیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک اجتہادی غلطیاں اور ایک عزم کے ساتھ تعلق رکھنے والی غلطیاں آگے اجتہادی غلطیوں کی کئی قسمیں ہیں اور عزم والی غلطیوں کی بھی کئی قسمیں ہیں بہر حال اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ غلطی اجتہادی قسم کی تھی عزم والی غلطیوں میں سے نہیں تھی۔ ارادہ آدم نہیں تھا کہ غلطی کرے مگر ہو گئی اور یہ صاف بات ہے کہ گناہ کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک گناہ کا ظاہری حصہ ہوتا ہے اور ایک اس کا باطنی حصہ ہوتا ہے جو چیز انسان کو نجات سے محروم کرتی ہے وہ گناہ کا باطنی حصہ ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گناہ کی ظاہری سزا محض لوگوں کو مل جاتی ہے مگر نجات سے محروم کرنے والا صرف باطنی حصہ ہوتا ہے ظاہری نہیں۔ مثلاً چوری ہے چوری کہتے ہیں کسی کا مال اٹھا کر لے جانے کو۔ اب بیسیوں دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلطی سے دوسرے کی چیز اٹھا کر لے جاتا ہے مثلاً بعض لوگوں کے پیروں میں حس کم ہوتی ہے اور وہ دوسرے کی جوتی پہن کر چلے جاتے ہیں۔ فرض کرو ایسا شخص پکڑا جائے۔ اس کا مقدمہ عدالت میں جائے اور وہ قید ہو جائے تو گناہ کی ایک ظاہری سزا تو اسے مل جائے گی مگر اس کا دل سیاہ نہیں ہو گا کیونکہ اس نے جوتی ارادۃً نہیں اٹھائی تھی۔

حیدر آباد کے جو نظام تھے ان کے ایک پھوپھی زاد بھائی کا بیٹا مجھے ملنے کے لئے قادیان آیا۔ اس نے کسی

مقصد کے لئے مجھ سے دعا کروائی تھی میرے دل میں خیال آیا کہ ایسے لوگ روز روز کہاں قابو آتے ہیں انہیں اچھی طرح نصیحت کرنی چاہیے۔ چنانچہ شام کا کھانا میں نے ان کو اپنے ساتھ ہی کھلایا اور پھر میں نے انہیں نصیحتیں کرنی شروع کر دیں اور گیارہ بارہ بجے تک انہیں سمجھتا تا رہا۔ میں نے کہا بتاؤ تم نماز پڑھتے ہو وہ کہنے لگا گھر پر تو کبھی پڑھ ہی لیتے ہیں مگر سفر میں صفائی وغیرہ کا چونکہ پورا اہتمام نہیں رہتا اس لئے نماز نہیں پڑھی جاتی۔ میں نے کہا تم لاکھوں روپے کے مالک ہو اور اب بھی تم آئے ہو تو پانچ سات نوکر تمہارے ساتھ ہیں اگر تمہارا یہ حال ہے تو غرباء کا کیا حال ہوتا ہوگا حالانکہ غرباء پر نماز زیادہ فرض نہیں جیسے تم پر فرض ہے ویسے ہی ان پر فرض ہے مگر تمہیں ان کے مقابلہ میں بیسیوں سہولتیں حاصل ہوتی ہیں تم نے گاڑی کے کمرے ریزرو کرائے ہوتے ہیں اور تم مزے سے ان میں لیٹے ہوئے آتے ہو۔ تم خدا تعالیٰ کو کیا جواب دو گے اور نمازیں نہ پڑھنے کا کیا عذر پیش کرو گے ایک غریب تو کہہ دے گا کہ اللہ میاں پر مجھے غصہ آ گیا کہ میرے خدا نے مجھے نہیں پوچھا تو میں اس کی عبادت کیوں کروں اس کا یہ جواب چاہے پاگلانہ ہو مگر بہرحال کچھ نہ کچھ جواب تو ہے لیکن تمہارے پاس کیا جواب ہوگا؟ میں نے دیکھا جس طرح کسی پر پورا اثر ہو جاتا ہے ویسی ہی کیفیت اس کی ہوگئی اس کی رونے والی حالت ہوگئی اور اس نے کہا کہ اب میں باقاعدہ نماز پڑھا کروں گا گیارہ بارہ بجے کے قریب ہم فارغ ہوئے اور وہ اپنی قیام گاہ پر چلے گئے گھر پہنچے تو انہوں نے اپنے نوکروں سے کہا۔ کہ صبح نماز کے لئے مجھے ضرور جگا دینا آج میں سخت شرمندہ ہوا ہوں اگر کل انہوں نے پھر مجھ سے پوچھ لیا کہ نماز پڑھی تھی یا نہیں تو میں کیا جواب دوں گا نوکروں نے کہا کہ آپ بارہ بجے سونے لگے ہیں نو بجے سو کر بھی آپ صبح نہیں اٹھتے اور اب تو بہت رات گذر چکی ہے آپ صبح اٹھیں گے کس طرح؟ انہوں نے کہا کچھ ہو مجھے ضرور جگا دینا۔ اگر تم نے مجھے نہ جگایا تو میں تمہیں سزا دوں گا چنانچہ صبح ہوئی تو نوکروں نے جگا دیا۔ اب وہ بیچارا نماز پڑھنے کا عادی تو نہیں تھا نوکروں کے جگانے پر اٹھ تو بیٹھا مگر اسی طرح سوئے ہوئے مسجد کی طرف چل پڑا راستہ میں کہیں ٹھوکر لگتی تو نوکر دوڑ کر اسے پکڑ لیتے۔ آخر اسی طرح مسجد پہنچے اور پھر سوئے سوئے ہی انہوں نے نماز پڑھی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو نیند کے غلبہ میں آتے وقت اپنا بوٹ تو وہیں چھوڑ گئے اور کسی کی پھٹی پرانی جوتی پہن کر چل پڑے نصف راہ تک پہنچے تو کسی نوکر کی نظر پڑ گئی اور اس نے کہا نواب صاحب یہ کیا؟ آپ تو کسی کی جوتی پہن کر آ گئے ہیں اس پر نواب صاحب کی بھی آنکھ کھلی اور وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھ کر کہنے لگے بھئی جلدی جاؤ اور یہ جوتی بدل لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص یہ کہے کہ میں اس کی جوتی چرا لایا ہوں اس واقعہ کی وجہ سے صبح مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے میری نصیحت پر عمل کرتے ہوئے آج مسجد میں جا کر نماز پڑھی تھی مگر نیند کے غلبہ کی وجہ سے وہ اپنا نرم اور نازک

اور ملائم بوٹ تو وہیں چھوڑ آئے اور کسی کی پھٹی پرانی جوتی پہن کر آ گئے اب دیکھو کسی نواب کے منہ پر تو یہ نہیں لکھا ہوتا کہ یہ نواب ہے فرض کرو جوتی کا مالک وہاں پہنچ جاتا اور ان کی گردن میں ہاتھ ڈال کر کہتا کہ چل تجھے پولیس کے حوالے کروں تو تو چور ہے تو بظاہر انہیں سزا مل جاتی مگر یہ غلطی انہیں نجات سے محروم کرنے والی نہیں تھی کیونکہ اس میں ان کے عزم کا دخل نہیں تھا۔ اسی طرح آتشک اور سوزاک یہ دو مرضیں بظاہر گناہ کا پھل سمجھی جاتی ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ گناہ اس کا نہ ہو بلکہ اس کے باپ یا دادا کا ہو۔ فرض کرو ایک شخص کسی بیوہ سے شادی کرتا ہے اس کے پہلے خاوند کو آتشک کا مرض تھا جس سے اسے بھی آتشک ہوگئی۔ اب جب یہ اپنی بیوی کے پاس جائے گا اسے بھی آتشک ہو جائے گی اور یہ بھی اس سزا میں مبتلا ہو جائے گا۔ اب بظاہر یہ ہے تو زنا کی سزا مگر اس کی وجہ سے وہ جہنم میں نہیں جائے گا اور نہ اس کا دل سیاہ ہوگا بلکہ شاید اس کا دل اس کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ صاف ہو جائے تو اصل چیز جو دل کو سیاہ کرنے والی ہے وہ گناہ کا باطنی حصہ ہوتا ہے اس کے ظاہری حصہ کی وجہ سے اگر کوئی نقصان پہنچ بھی جائے تو وہ عارضی ہوتا ہے مستقل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس جگہ آدمؑ کے متعلق فرماتا ہے کہ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ آدم کے اندر ہم نے عزم نہیں پایا۔ یعنی اس سے جو غلطی ہوئی وہ اجتہاداً ہوئی جیسے بائبل کے حوالجات سے ثابت ہے کہ شیطان نے کہا یہ بڑا نیک کام ہے اس کے نتیجہ میں تمہیں نیک اور بد کے پہچاننے کی طاقت حاصل ہو جائے گی اور آدم نے سمجھا کہ یہ بات درست ہے اور وہ غلطی میں مبتلا ہو گئے پس ان کی غلطی اجتہادی غلطی تھی عزم والی غلطی نہیں تھی۔

(۱۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر: ۵۶) یعنی سچی توبہ سے انسان کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عیسائیت کہتی ہے کہ گناہ معاف نہیں ہوتے (متی باب ۱۲ آیت ۳۲) مگر ہم یہاں یہ بحث نہیں کر رہے کہ انجیل کا بیان درست ہے یا قرآن کریم کا بیان درست ہے ہم صرف یہ بحث کر رہے ہیں کہ اس بارہ میں قرآن کریم کیا کہتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جب معاف ہو جاتے ہیں تو لازماً سزا بھی معاف ہو جاتی ہے۔

(۱۲) اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (الرحمٰن: ۴۷) جو شخص خدا تعالیٰ کے مقام کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے اسے دو جنتیں ملتی ہیں۔ ایک اس دنیا میں اور ایک اگلے جہان میں۔ اب یہ واضح بات ہے کہ یہاں جنت ملنے سے مراد دنیوی اموال نہیں ہوسکتے۔ اگر دنیوی اموال مراد لئے جائیں تو خدا تعالیٰ کے کئی نیک بندے ایسے گزرے ہیں جن کے دنیوی حالات کفار سے بہت ہی ادنیٰ تھے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی لے لو۔ آج یورپ کا مزدور آپ سے زیادہ اچھا کھانا کھاتا اور زیادہ اچھے کپڑے پہنتا ہے پس اگر اس جگہ

جنت سے دنیوی نعماء مراد لی جائیں تو یقیناً یورپ کا مزدور جنت میں ہے اور بڑے بڑے صلحاء اور اولیاء نعوذ باللہ جنت میں نہیں تھے پس اس جگہ جنت سے مراد روحانی امن ہی ہوسکتا ہے اور جنت ملنے سے مراد خدا تعالیٰ کے قرب کا حصول ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ جو شخص خدا تعالیٰ کا خوف اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اس جہان میں بھی خدا تعالیٰ کا مقرب ہے اور اگلے جہان میں بھی خدا تعالیٰ کے قرب میں جگہ حاصل کرے گا اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ہر انسان میں خدا تعالیٰ کا مقرب بننے کی قابلیت موجود ہے اگر گناہ انسان کو ورثہ میں ملا ہوا ہوتا تو اس کا قرب اسے کہاں حاصل ہوسکتا تھا۔

(۱۳) اسی طرح فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (بنی اسرائیل: ۷۳) جو شخص اس دنیا میں اندھا ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ اب اس کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ جو شخص اس دنیا میں جسمانی لحاظ سے اندھا ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اندھا ہوگا یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ ایک شخص اس جہان میں بھی اندھا ہو اور اسے اگلے جہان میں بھی اندھا رکھا جائے۔ اس کے معنے بھی درحقیقت خدا تعالیٰ کو اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھنے والے کے ہیں اور اندھے سے مراد وہ ہے جس نے خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھا۔ پس مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى سے وہ معنے نکلتے ہیں ایک منفی صورت میں اور ایک مثبت صورت میں ایک وہ ہیں جو اعمیٰ ہیں اور ایک وہ ہیں جو اعمیٰ نہیں کیونکہ فرماتا ہے جو اس دنیا میں اعمیٰ ہوگا وہ اگلے جہان میں بھی اعمیٰ رہے گا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کچھ لوگ اعمیٰ ہوں گے اور کچھ اعمیٰ نہیں ہوں گے پس یہ آیت بھی بتا رہی ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک بعض کا دل پاک بھی ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس جگہ یہی مضمون بیان فرماتا ہے کہ اس دنیا میں جس شخص کا قلب خراب ہو گیا (معلوم ہوا کہ ساری دنیا کا قلب خراب نہیں) وہ اگلے جہان میں بھی خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی قابلیت نہیں رکھے گا۔

(۱۴) اسی طرح حدیث میں آتا ہے كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ (بخاری کتاب الجنائز باب ما قیل فی اولاد المشرکین) ہر بچہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور نیکی کی روح اپنے اندر رکھتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ اسے سکھا کر کبھی یہودی بنا دیتے ہیں کبھی نصرانی بنا دیتے ہیں اور کبھی مجوسی بنا دیتے ہیں اس سے بھی پتہ لگا کہ انسان جو پیدا ہوتا ہے فطرت صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے اور بدی پیدائش کے بعد اردگرد کے اثرات کے نتیجہ میں آتی ہے۔

(۱۵) اسی طرح ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ہر انسان کا دل خدا تعالیٰ نے صاف بنایا ہے پھر وہ دنیا میں آ کر یا نیکی کرتا ہے یا بدی کرتا ہے جب وہ کوئی نیکی کرتا ہے تو ایک سفید نقطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے اور جب کوئی

بدی کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے دل پر لگ جاتا ہے۔ پھر جوں جوں وہ نیکیاں یا بدیاں کرتا چلا جاتا ہے۔ ان سفید یا سیاہ نقطوں کی تعداد بڑھنی شروع ہوجاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن اس کا سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے یا اس کا سارا دل سفید ہوجاتا ہے اگر اس کا سارا دل سفید ہوجاتا ہے تو وہ بدی سے محفوظ ہوجاتا ہے اور اگر اس کا سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے تو وہ نیکی سے محروم ہوجاتا ہے (تفسیر ابن جریر زیر آیت کلا بل ران علی قلوبھم۔ تطفیف: ۱۵) اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ انسان فطرت صحیحہ لے کر دنیا میں آتا ہے اور ایک لمبے عرصے تک اس کی فطرت صحیحہ قائم رہتی ہے جب اس کا سارا دل سفید ہوجاتا ہے اور نیکی اس پر غالب آجاتی ہے تو بغیر کفارہ کے نجات پا جاتا ہے اور جب اس کا سارا دل سیاہ ہوجاتا ہے اور بدی اس پر غالب آجاتی ہے تو پھر کوئی کفارہ اسے فائدہ نہیں دے سکتا۔ اس کے برخلاف مسیحیت یہ کہتی ہے کہ آدمؑ نے گناہ کیا اور اس کی وجہ سے اسے سزا دی گئی پھر اس کا گناہ ورثہ میں اس کی اولاد کو ملا۔ اب انسان گناہ سے خودبخود نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ یہ اسے ورثہ میں ملا ہے۔ اس کے لئے کفارہ کی ضرورت تھی جو مسیح نے پیش کیا۔ اور انسان کا تمام گناہ اس نے اپنے سر پر اٹھالیا۔ گویا مسیحی تعلیم کے مطابق انسان شیطان کا غلام بن کر پیدا ہوتا ہے اور پھر مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے کے نتیجہ میں شیطان کے پنجہ سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ مسیحیت کے اس عقیدہ سے تعلق رکھنے والے تمام امور کا قرآن کریم نے انکار کر دیا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک نہ گناہ ورثہ میں ملا نہ انسان پیدائشی لحاظ سے گنہگار ہے اور نہ اس کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت ہے۔ انسان کی فطرت پاکیزہ بنائی گئی ہے اور اس میں ترقی کی قابلیت رکھی گئی ہے یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کا محبوب بھی ہوسکتا ہے اور اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اس کی توبہ بھی قبول ہوسکتی ہے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے تو اس عقیدہ کا رد کیا ہے کیا خود بائبل بھی اس کی تصدیق کرتی ہے؟ اگر بائبل بھی اس عقیدہ کی تصدیق نہیں کرتی تو پھر عیسائیوں کے لئے بھی اس عقیدہ کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ اس بارہ میں اگر ہم غور کریں تو چار مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ یہ مسئلہ کہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا۔

۲۔ یہ مسئلہ کہ چونکہ انسان کو ورثہ میں گناہ ملا اس لئے وہ پاک نہیں ہوسکتا۔

۳۔ یہ مسئلہ کہ انسان پاک نہیں ہوسکتا تھا لیکن چونکہ خدا تعالیٰ رحیم و کریم بھی ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے رحم و کرم کے ماتحت اس کے لئے کسی قربانی کی ضرورت تھی۔

۴۔ یہ مسئلہ کہ اس قربانی سے انسان حقیقتہً پاک ہوگیا؟

یہ چار مسائل ہیں جو اس امر پر غور کرتے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ آدمؑ نے گناہ کیا تھا اس لئے تمام نسل انسانی گنہگار ہوگئی کیونکہ اسے آدم سے ورثہ میں گناہ ملا ہے اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا آدمؑ نے واقعہ میں گناہ کیا تھا اور آیا بائبل اور انجیل اس کی تصدیق کرتی ہے؟ اگر بائبل کے رو سے آدمؑ نے گناہ ہی نہیں کیا تو یہ سارا مسئلہ ختم ہوجاتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں بائبل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمؑ نے گناہ نہیں کیا بلکہ بائبل سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے بھی گناہ نہیں کیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر میں نے جب بائبل کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ گناہ نہ آدم نے کیا تھا نہ شیطان نے بلکہ نعوذ باللہ گناہ خالص خدا تعالیٰ کا تھا اس کا ثبوت میں ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

آدمؑ کا واقعہ پیدائش کی کتاب میں بیان ہے (یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ بائبل سے مراد وہ مجموعہ کتب ہے جو حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کے حالات پر مشتمل ہے حضرت موسیٰؑ سے ملا کی نبی تک کے حالات کا جو حصہ ہے وہ پرانا عہد نامہ کہلاتا ہے اور حضرت مسیح اور ان کے حواریوں کے حالات پر جو حصہ مشتمل ہے وہ نیا عہد نامہ کہلاتا ہے یہودیوں کے نزدیک صرف پرانا عہد نامہ واجب العمل ہے لیکن عیسائیوں کے نزدیک پرانا اور نیا دونوں عہد نامے واجب العمل ہیں۔ پرانے عہد نامہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچ کتابیں شامل ہیں۔ ان میں سے پہلی کتاب پیدائش ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام کا بھی ذکر ہے)

پیدائش باب ۲ آیت ۸ تا ۱۰ میں لکھا ہے:۔

> ’’اور خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں ایک باغ لگایا اور انسان کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔ اور خداوند خدا نے ہر درخت کو جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اگایا اور باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔‘‘

اس جگہ بائبل یہ بتاتی ہے کہ آدمؑ کی پیدائش کے بعد خدا تعالیٰ نے عدن میں ایک باغ لگایا جس میں ہر قسم کے درخت اگائے اور اس باغ کے عین وسط میں حیات اور نیک و بد کی پہچان کا درخت لگایا یہ میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ نیک و بد کی پہچان کا درخت الگ تھا اور حیات کا درخت الگ۔ یا دونوں ایک ہی تھے میرے نزدیک یہ دونوں ایک تھے لیکن بائبل اس بارہ میں مضطرب اور متردد ہے کہیں وہ ان دونوں کو ایک درخت بتاتی ہے اور کہیں دو بتاتی ہے۔

آگے لکھا ہے۔

''اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا۔ کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔'' (پیدائش باب ۲ آیت ۱۶ و ۱۷)

گویا خدا نے عدن کے باغ میں ہر قسم کے درخت لگائے اور درمیان میں حیات اور نیک و بد کی پہچان کا درخت لگایا اور آدمؑ سے کہا کہ تجھے اور تو تمام درختوں کے پھل کھانے کی اجازت ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے کچھ نہ کھانا اگر کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔ آگے حوا کی روایت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے کہا

''جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مرجاؤ گے۔'' (پیداش باب ۳ آیت ۳)

غرض پہلے تو بائبل کی اپنی روایت ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم سے یہ کہا کہ اس نیک و بد کی پہچان کے درخت میں سے کچھ نہ کھانا ورنہ مرجاؤ گے اور پھر حوا کی روایت نے بھی اس کی تصدیق کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا تھا کہ نہ اس درخت کے پھل کو کھانا اور نہ اسے چھونا ورنہ مرجاؤ گے۔

اب آدم کے پاس شیطان آتا ہے (شیطان کے لئے بائبل نے سانپ کا لفظ استعمال کیا ہے) وہ آکر کیا کہتا ہے بائبل کہتی ہے کہ:۔

''سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔''

(پیدائش باب ۳ آیت ۵)

ان روایتوں پر غور کر کے دیکھیں تو نہ آدم کا گناہ نظر آتا ہے نہ شیطان کا۔ بلکہ سارا گناہ نعوذ باللہ خدا کا نظر آتا ہے ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درخت زندگی کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا یعنی اس درخت سے زندگی حاصل ہوتی تھی اور اس درخت سے نیک و بد کے پہچاننے کی طاقت حاصل ہوتی تھی مگر بائبل کہتی ہے کہ خدا نے آدم سے یہ کہا کہ:۔

''جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا'' (پیدائش باب ۲ آیت ۱۷)

گویا خدا نے آدمؑ سے جھوٹ بولا۔ درخت تو وہ زندگی کا تھا درخت تو وہ علم کی ترقی کا تھا۔ مگر خدا تعالیٰ نے یہ

کہا کہ جس روز تو نے اس میں سے کچھ کھایا تو مر جائے گا۔ مرنے کے معنے جسمانی بھی ہو سکتے ہیں اور روحانی بھی۔ لیکن کوئی معنے لے لئے جائیں دونوں صورتوں میں خدا تعالیٰ کی یہ بات بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ اگر روحانی موت مراد لو تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ کیونکہ نیک و بد کی پہچان سے انسان کی روحانی موت نہیں ہوتی بلکہ اسے روحانی زندگی ملتی ہے اور اگر جسمانی موت مراد لو تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کا درخت تھا۔ جس کے کھانے سے موت نہیں آ سکتی تھی۔ غرض بائبل کے خدا نے آدم کو دھوکا دیا کہ وہ درخت جو زندگی بخشنے والا تھا۔ وہ درخت جو عقل پیدا کرنے والا تھا اس کے متعلق یہ کہا کہ اس کا پھل نہ کھاؤ۔ ورنہ مر جاؤ گے اور حوا بھی یہی کہتی ہیں کہ خدا تعالیٰ نے کہا کہ

''تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے'' (پیدائش باب ۳ آیت ۳)

صاف پتہ لگتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے نعوذ باللہ من ذالک غلط بیانی کی اور آدم کو دھوکا دیا اس کے مقابلہ میں جب شیطان نے کہا کہ

''تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۵)

تو اس میں کوئی جھوٹ نہیں تھا۔ دونوں باتیں وہی تھیں جو اس درخت کے خواص میں شامل تھیں۔ وہ حیات کا درخت تھا اور وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا یعنی اس کے کھانے سے زندگی بھی ملتی تھی اور اس کے کھانے سے نیک و بد کے پہچاننے کی قابلیت بھی پیدا ہوتی تھی۔ پس شیطان نے آدم کو دھوکا نہیں دیا بلکہ بائبل کی رو سے خود خدا نے نعوذ باللہ آدم کو دھوکا دیا پھر اور آگے دیکھو جب آدم اور حوا نے اس درخت کا پھل کھا لیا تو کیا وہ مر گئے؟ وہ مرے نہیں بلکہ زندہ رہے اور شیطان کی بات ہی سچی نکلی کہ ''تم ہرگز نہ مرو گے'' خدا تعالیٰ کی یہ بات کہ ''جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا'' غلط نکلی۔ اسی طرح وہ اس درخت کو کھا کر جیسا کہ بائبل میں آگے ذکر آتا ہے نیک و بد کو بھی پہچاننے لگ گئے۔ پس بائبل کے رو سے آدم اور شیطان کا کوئی قصور نہیں خود خدا نے ان کو دھوکا دیا آدمؑ نے کوشش کی کہ وہ نیک و بد کو پہچاننے لگے اور آدمی بن جائے اور اس کو دنیا کا کوئی شخص بدی نہیں کہہ سکتا۔ آدم نے نیکی کے راستہ میں ترقی کرنے کی کوشش کی اور شیطان نے کہا کہ خدا تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ کہتا ہے اس کے کھانے سے تم مر جاؤ گے حالانکہ تم مرو گے نہیں بلکہ زندہ رہو گے اور پھر اس کے کھانے سے تمہارے اندر عقل پیدا ہو جائے گی اور تمہیں سمجھ آ جائے گی کہ نیکی کیا چیز ہے اور بدی کیا چیز ہے اور بائبل خود مانتی ہے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے ان کے اندر عقل پیدا ہو گئی اور وہ نیک و بد کو پہچاننے لگ گئے۔ پس نہ آدم نے گناہ کیا اور نہ شیطان نے۔ گناہ کا مرتکب

صرف ایک ہی ہے اور وہ بائبل کا خدا ہے جس نے حیات کے درخت کو جھوٹ بول کر موت کا درخت ظاہر کیا اور کہا کہ اس کے کھانے سے تم مر جاؤ گے۔ اور یہ مرنا یا جسمانی ہو سکتا تھا یا روحانی مگر دونوں باتیں غلط تھیں جسمانی لحاظ سے بھی وہ مر نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ حیات کا درخت تھا اور روحانی لحاظ سے بھی وہ مر نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا یعنی انسان کو ایک نئی روحانی زندگی بخشنے والا تھا۔ پس اگر گناہ کیا تو آدم نے نہیں کیا بلکہ نعوذ باللہ خدا نے کیا اور آدم کو دھوکا دیا۔

یہاں عیسائیت یہ نہیں کہہ سکتی کہ خدا باپ نے جھوٹ بولا ہے خدا بیٹے نے جھوٹ نہیں بولا۔ کیونکہ عیسائیت میں جب خدا تعالیٰ کا ذکر ہو تو اس سے مراد اقانیم ثلاثہ ہوتے ہیں باپ خدا بیٹے سے جدا نہیں۔ اور بیٹا روح القدس سے جدا نہیں۔ پس جب باپ خدا نے جھوٹ بولا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ بیٹے نے بھی جھوٹ بولا اور روح القدس نے بھی جھوٹ بولا۔

پس اگر گناہ ورثہ میں آیا ہے تو بائبل کی رو سے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آدم گنہگار نہ تھا بلکہ خدا یا دوسرے لفظوں میں یسوع گنہگار تھا جس نے نعوذ باللہ من ذالک جھوٹ بولا اور اسی پر سارا الزام آتا ہے۔ بہرحال بائبل نے خدا تعالیٰ کو ایسی بھیانک شکل میں پیش کیا ہے جو نہایت خطرناک اور افسوسناک ہے اور ان حوالجات کی موجوگی میں یسوع ہرگز نجات دہندہ نہیں کہلا سکتا یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جھوٹ بولنے والا اور دوسرے کو دھوکا اور فریب دینے والا نجات دہندہ ہو سکے۔ بائبل بتاتی ہے کہ خدا نے جھوٹ بول کر آدم سے کہا کہ تم اس درخت کا پھل کھانے سے مر جاؤ گے اور تمہیں نقصان پہنچے گا۔ حالانکہ وہ زندگی کا درخت تھا وہ نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا اس کے کھانے سے نہ جسمانی لحاظ سے آدم مر سکتا تھا اور نہ روحانی لحاظ سے مر سکتا تھا۔

پھر آدم کے گنہگار نہ ہونے کی یہ بھی دلیل ہے کہ اسے جو غلطی لگی وہ محض اجتہادی تھی قرآن کریم نے بھی یہی بتایا ہے کہ آدم سے اجتہادی غلطی ہوگئی اور اگر ہم بائبل کے واقعہ کو صحیح مانیں تب بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ آدم سے اجتہادی غلطی ہوئی۔ پیدائش باب ۱ آیت ۲۷، ۲۸ میں لکھا ہے۔

''خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔ نر و ناری ان کو پیدا کیا۔''

یعنی انسان جس کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اس میں مرد بھی شامل ہے اور عورت بھی۔ انسان مرد بھی خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے اور انسان عورت بھی خدا کی صورت پر بنائی گئی ہے اب خدا کی صورت پر بنانے کے یہ

معنے تو نہیں ہو سکتے کہ خدا تعالیٰ کے بھی اسی طرح ناک، کان، آنکھ اور منہ وغیرہ ہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کی صفات آدم میں آ گئیں اور جب خدا تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور بتایا کہ تمہیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ تم میری صفات کے مظہر بنو۔ تو یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ نیک و بد کے پہچاننے کی صفت آدم میں نہ آتی۔ پس شیطان نے آدم سے کہا کہ تمہیں خدا تعالیٰ نے اپنی صفات کا مظہر بنایا ہے اور اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ نیک و بد کو پہچاننے کی طاقت رکھتا ہے پس جس طرح خدا نیک و بد کو پہچانتا ہے تمہیں بھی نیک و بد کو پہچاننا چاہیے اور اس کا طریق یہی ہے کہ اس نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھا لو۔ اگر تم اسے کھاؤ گے نہیں تو نیک اور بد کی پہچان کس طرح کرو گے۔ اور جب نیک اور بد کو پہچاننے کی قابلیت تم میں پیدا نہ ہو گی تو تم خدا تعالیٰ کی صفات کے کامل مظہر نہیں بن سکو گے پس ضروری ہے کہ تم اس درخت کا پھل کھاؤ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ اس درخت کا پھل کھا کر خدا تعالیٰ کی طرح ہو جاؤ یا تیسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ اگر تم اس درخت کا پھل کھا لو گے تو تم اس مقصد کو حاصل کر لو گے جس کے لئے خدا نے تم کو پیدا کیا ہے۔

فرض کرو تمام واقعہ اسی طرح ہوا ہو تو اس کے بعد آدم کو اگر اجتہادی غلطی لگ گئی تو اس میں اس کا قصور کیا تھا۔ ایک شخص آدم کے پاس آتا ہے اور آ کر کہتا ہے کہ تم کو معلوم ہے کہ تمہیں خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا ہے اور تم کو معلوم ہے کہ اس کے معنے صرف اتنے ہیں کہ تم خدا تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہو اور تم کو پتہ ہے کہ اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ نیک و بد کو پہچانتا ہے پس اگر تم نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھا لو گے تو تم اپنے مقصد پیدائش کو حاصل کر لو گے اور خدا تعالیٰ کی صفات کے مظہر بن جاؤ گے۔ یہ اتنی زبردست دلیل تھی کہ آدم اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گیا اور اس نے سمجھا کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے بالکل درست ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں آدم کے ایک دفعہ دھوکا کھانے کے باوجود اگر آج بھی اسی رنگ میں لوگوں کے سامنے دلیل پیش کی جائے تو کئی لوگ آج بھی دھوکا کھا جائیں گے اور سمجھیں گے کہ خدا تعالیٰ کا منشاء یہی تھا کہ اس درخت کا پھل کھا لیا جائے یہ منشاء نہیں تھا کہ اسے نہ کھایا جائے۔

غرض آدم کو غلطی لگنے کا امکان بائبل کے رو سے موجود ہے خود بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ نیک و بد کو پہچاننا خدا تعالیٰ اپنی صفت قرار دیتا ہے۔ پیدائش باب ۳ آیت ۲۲ میں لکھا ہے:۔

''اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا''

اس جگہ ''ہم'' سے عیسائیوں کے نزدیک اقانیم ثلاثہ مراد ہیں یعنی ہم اقانیم ثلاثہ میں سے ایک کی مانند اور یہودیوں کے نزدیک ''ہم'' سے خدا اور اس کے فرشتے مراد ہیں کیونکہ جیسے خدا نیک و بد کو پہچانتا ہے اسی طرح فرشتے

بھی نیک اور بد کو پہچانتے ہیں پس یہودیوں کے نزدیک تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جیسے خدا اور اس کے فرشتے نیکی اور بدی کو پہچانتے ہیں اسی طرح آدم بھی نیکی اور بدی کو پہچاننے لگ گیا اور عیسائیوں کے نزدیک اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جیسے باپ خدا اور بیٹا خدا اور روح القدس خدا نیکی اور بدی کو پہچانتے ہیں۔اسی طرح آدم بھی نیکی اور بدی کو پہچاننے لگ گیا۔

اس حوالہ سے صاف پتہ لگ گیا کہ نیک اور بد کو پہچاننا خدا تعالیٰ کی صفت ہے اور جو اسے پہچانتا ہے وہ خدا جیسا ہو جاتا ہے یا خدا کی صورت پر ہو جاتا ہے یا بائبل کی رو سے اس صورت پر ہو جاتا ہے جس صورت پر اسے خدا نے پیدا کیا۔

ضمناً میں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ حیات کے درخت کے بارہ میں بائبل کا خیال عجیب مضحکہ خیز ہے پیدائش باب ۲ آیت ۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخت ایک ہی تھا لکھا ہے خدا نے

’’باغ کے بیچ میں حیات کا درخت اور نیک و بد کی پہچان کا درخت بھی لگایا۔‘‘

یہاں مفرد لفظ ’’لگایا‘‘ استعمال کیا گیا ہے ’’لگائے‘‘ جو جمع کا لفظ ہے وہ یہاں استعمال نہیں کیا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی درخت میں یہ دونوں صفات تھیں۔اس کے کھانے سے حیات بھی ملتی تھی اور اس کے کھانے سے نیک و بد کے پہچاننے کی طاقت بھی پیدا ہوتی تھی۔

اس کے بعد آیت ۱۶، ۱۷ میں لکھا ہے۔

’’خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا اور کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل بے روک ٹوک کھا سکتا ہے لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت کا کبھی نہ کھانا کیونکہ جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا۔‘‘

یہاں سے بھی پتہ لگتا ہے کہ ایک درخت ہے اور ایک درخت سے ہی آدم کو روکا گیا۔اگر دو درخت ہوتے تو دونوں سے روکنا چاہیے تھا مگر وہ منع کرتا ہے ایک درخت سے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی حیات کا درخت تھا۔اور وہی نیک و بد کی پہچان کا درخت تھا لیکن پیدائش باب ۳ آیت ۲۲، ۲۳ میں لکھا ہے۔

’’اور خداوند خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ لے کر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے۔اس لئے خداوند خدا نے اس کو باغ عدن سے باہر کر دیا۔‘‘

یہاں دو درخت ہو گئے نیک و بد کی پہچان کا درخت الگ ہو گیا اور حیات کا درخت الگ ہو گیا۔چونکہ آدم نے

نیک وبد کی پہچان کے درخت میں سے کھا کر نیک وبد کو پہچاننے کی قابلیت پیدا کر لی تھی اس لئے خدا نے اسے باغ عدن سے باہر نکال دیا کہ کہیں وہ حیات کے درخت کا پھل بھی نہ کھالے اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث نہ ہوجائے۔

پھر پیدائش باب ۲ آیت ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ سے پہلے آدم کے لئے موت مقرر نہ تھی کیونکہ لکھا ہے۔

''جس روز تو نے اس میں سے کھایا تو مرا''

جس کے معنے یہ ہیں کہ اگر آدم اور حوا اس میں سے نہیں کھائیں گے تو وہ نہیں مریں گے پس موت اس درخت میں سے کھانے کا نتیجہ تھی اگر نہ کھاتے تو وہ کبھی نہ مرتے۔اسی طرح پیدائش باب ۳ آیت ۴ میں آتا ہے کہ

''تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مرجاؤ گے''

اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ موت کو اس درخت کا پھل کھانے کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔اسی طرح رومیوں باب ۵ آیت ۱۲ میں لکھا ہے کہ

''گناہ کے سبب سے موت آئی۔''

پھر یعقوب باب ۱ آیت ۱۵ میں لکھا ہے:۔

''گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے۔''

ان حوالجات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بائبل ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ اگر تم نے اس درخت میں سے کچھ کھایا تو مرجاؤ گے۔حالانکہ تھا وہ درخت حیات کا اور حیات کے درخت میں سے کھا کر انسان مرتا نہیں جیتا ہے۔ دوسری طرف رومیوں اور یعقوب میں لکھا ہے کہ موت گناہ کے نتیجہ میں آئی یعنی اگر وہ گناہ نہ کرتے تو نہ مرتے۔اب ہم اس کے ساتھ پیدائش باب ۳ آیت ۲۳ کو ملاتے ہیں تو حیرت آتی ہے اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آدم کو باغ عدن میں سے نکال دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ حیات کے درخت میں سے کچھ کھا کر ہمیشہ زندہ رہے۔حالانکہ جب گناہ کا نتیجہ موت تھا تو چونکہ وہ پہلے نیک وبد کے درخت میں سے کھا کے گنہگار بن چکا تھا اس لئے خواہ دس ہزار دفعہ بھی وہ اس درخت میں سے کھاتا وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

پس یا تو یہ کہنا چاہیے کہ گناہ کا نتیجہ موت نہیں اس درخت کے کھانے کا نتیجہ زندگی ہے لیکن ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ گناہ کا نتیجہ موت ہے اور دوسری طرف بائبل یہ کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو باغ عدن میں سے نکال دیا تا ایسا نہ ہو کہ وہ درخت میں سے کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے معلوم ہوا کہ گناہ کا نتیجہ موت نہیں بلکہ اس درخت کا پھل کھانے کے نتیجہ میں گناہ کے باوجود انسان زندہ رہ سکتا تھا۔

پھر یہ سوال ہے کہ آدم کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے گناہ کیا۔ حالانکہ آدم کے باپ نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا نہ آدم کی ماں نے کوئی گناہ کیا تھا۔ اگر بغیر اس کے کہ ماں باپ نے کوئی گناہ کیا ہو بیٹا گناہ کر سکتا ہے تو بغیر اس کے کہ ماں باپ نے کوئی نیکی کی ہو بیٹا نیکی بھی کر سکتا ہے اور اگر آدم نیکی کر سکتا تھا تو باقی لوگ کیوں نہیں کر سکتے؟ معلوم ہوا کہ اس میں ورثہ کا کوئی سوال نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ وہ ترقی بھی کر سکتا ہے اور تنزل بھی کر سکتا ہے آدم کا باپ گنہگار نہیں تھا بلکہ اس کا تو کوئی باپ تھا ہی نہیں۔ مگر آدم نے گناہ کر لیا۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ گناہ اور نیکی دونوں خاص حالات میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور ان چیزوں میں ورثہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔

پس کفارہ ایک بلا ضرورت شئے ہے۔

پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آدم کا گناہ کس طرح بخشا گیا؟ اگر توبہ سے بخشا گیا تو اسی طرح اولاد کا گناہ بھی بخشا جا سکتا ہے اور کفارہ کی کوئی ضرورت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔

غرض وہ ساری بنیاد جس پر کفارہ کی عمارت کھڑی کی گئی ہے اور جس کو مدنظر رکھتے ہوئے عیسائیت کہتی ہے کہ چونکہ انسان گناہ سے خود بخود نجات نہیں پا سکتا اس لئے کفارہ پر ایمان لانا ضروری ہے بائبل اور خود انجیل کی گواہی سے باطل ثابت ہوتی ہے۔

پھر بائبل سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدم کا سارا واقعہ تمثیلی ہے اور اس پر کسی عقیدہ کی بنیاد رکھنا عقل کے سراسر خلاف ہے کیونکہ بائبل میں لکھا ہے کہ جب حوا نے درخت کا پھل کھا لیا اور پھر آدمؑ کو بھی دیا۔

''تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۷)

درخت کا پھل کھانے سے ننگا ہو جانا یہ صاف بتاتا ہے کہ اس واقعہ میں تمثیلی زبان اختیار کی گئی ہے۔

پھر لکھا ہے:۔

''اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۷و۸)

یہ الفاظ بھی اس واقعہ کے تمثیلی ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ ٹھنڈک اور گرمی پیدا کرنے والا خود خدا ہے اور اسے ان چیزوں کی کوئی احتیاج نہیں۔ یہ نہیں کہ جس طرح لوگ گرمی کے موسم میں کوئٹہ اور مری چلے جاتے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ کو بھی ضرورت ہے کہ وہ ٹھنڈے وقت باہر نکلا کرے اور گرمی سے اپنے آپ کو بچائے مگر بائبل بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ٹھنڈا وقت دیکھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ ابھی سورج نہیں نکلا باغ میں پھرنا شروع کر دیا تاکہ گرمی سے اسے

تکلیف نہ ہو صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ تمثیلی زبان ہے اور جو کچھ بیان کیا گیا ہے استعارہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح لکھا ہے:۔

''اور آدم اور اس کی بیوی نے اپنے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۸)

یہ بھی تمثیلی زبان ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے تو کوئی چیز پوشیدہ نہیں قرآن کریم میں بھی ذکر آتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ سے مخفی ہو۔ خواہ زمین کی سطح پر کوئی چیز ہو یا تحت الثریٰ میں سب اس کے علم میں ہیں مگر بائبل بتاتی ہے کہ آدم اور حوا باغ کے درختوں میں چھپ گئے تا کہ خدا تعالیٰ انہیں دیکھ نہ سکے۔ یہ الفاظ بھی اس واقعہ کے تمثیلی ہونے کا ثبوت ہیں۔

پھر ایک اور بات لکھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کے علم کی محدودیت کا پتہ چلتا ہے لکھا ہے۔

''تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس سے کہا کہ تو کہاں ہے۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۹)

گویا وہ خدا جو زمین و آسمان کے ذرہ ذرہ کو جانتا ہے جس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں اس نے آوازیں دینی شروع کر دیں کہ ارے آدم تو کہاں ہے۔ ارے آدم تو کہاں ہے صاف پتہ لگتا ہے کہ یہ تمثیلی زبان ہے ورنہ وہ تو عرش پر بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اور اگر وہ دیکھ نہیں رہا تو مخلوق کی نگرانی کس طرح کر رہا ہے؟ غرض بائبل بتاتی ہے کہ جب وہ باغ میں چھپ گئے تو خدا تعالیٰ نے انہیں آوازیں دینی شروع کر دیں کہ اے آدم تو کہاں ہے۔

''اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۱۰)

کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے آدم کا یہ خیال کر لینا کہ میں باغ میں چھپ کر خدا تعالیٰ کی نظروں سے پوشیدہ ہو جاؤں گا یہ بھی عقل کے بالکل خلاف ہے۔

غرض یہ حوالہ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ اس جگہ ظاہری واقعہ مراد نہیں بلکہ تمثیلی رنگ میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور استعارہ کی زبان اس کے اظہار کے لئے اختیار کی گئی ہے اور تمثیلی کلام اور استعارات ہمیشہ تعبیر طلب ہوتے ہیں اس لحاظ سے یہ بھی ایک تعبیر طلب کلام ہے نہ کہ حقیقی واقعہ۔

پس جس کلام پر اس عقیدہ کی بنیاد رکھی گئی ہے کہ آدم نے گناہ کیا اور اس کا دل سیاہ ہو گیا ہم کہتے ہیں کہ وہ سارا کلام ہی تمثیلی ہے جیسے خدا تعالیٰ کا باغ میں پھرنا اس کا ٹھنڈے وقت سیر کے لئے آنا۔ آدم کا اسے نظر نہ آنا اور پھر

اللہ تعالیٰ کا آدم کو آوازیں دینا اور کہنا اے آدم تو کہاں ہے۔ یہ سب تمثیلی کلام ہے۔ اسی طرح باقی واقعہ بھی تمثیلی ہے پس اس پر کسی مذہبی عقیدہ کی بنیاد رکھنا عقل کے خلاف ہے۔

پھر جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں آدم کا گناہ کر لینا حالانکہ اس کا نہ باپ تھا نہ ماں یہ بھی بتاتا ہے کہ گناہ اور نیکی دونوں خاص حالات میں ظاہر بھی ہو سکتے ہیں اور مٹ بھی سکتے ہیں۔ پس کفارہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر باہر سے نیکی نہیں آ سکتی تو باہر سے گناہ بھی نہیں آ سکتا۔ اور اگر گناہ باہر سے آ سکتا ہے تو نیکی بھی آ سکتی ہے۔ اگر آدم جس کا نہ باپ تھا نہ ماں اس کے اندر باہر سے گناہ آ گیا تو اولاد میں باہر سے نیکی بھی آ سکتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں مساوی سمجھی جائیں گی۔

پھر بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ آدم گناہ کے باوجود خدا تعالیٰ کا مقدس رہا ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب عیسائیوں کی طرف سے یہی دیا جاتا ہے کہ آدم کا گناہ بخشا گیا ہم کہتے ہیں اسی طرح اولاد کا گناہ بھی بخشا جا سکتا ہے ان کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

کفارہ کے مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے یا انسان کے نفس کے ایسے خراب ہو جانے کے لئے کہ اس کی درستی اور اصلاح ناممکن ہو یہ ثابت کرنا بھی ضروری ہے کہ آدم کے گناہ کے بعد انسان خراب ہو گیا اور وہ نیکی پر قائم نہیں رہ سکا۔ اگر بائبل سے یہ ثابت ہو کہ انسان آدم کے گناہ کے بعد نیکی پر قائم نہیں رہ سکا تو پھر بائبل کے مطابق کفارہ کو درست تسلیم کرنا پڑے گا لیکن اگر بائبل سے ہی پتہ لگے کہ آدم کے گناہ کے بعد (جسے قرآن کریم گناہ قرار نہیں دیتا) انسان خراب نہیں ہوا بلکہ وہ نیکی پر قائم رہا تو پھر کفارے کی بنیاد ہی باطل ہو جاتی ہے جب کفارہ کے بغیر انسان نیک بھی ہو سکتا تھا اور گناہ سے بھی بچ سکتا تھا تو اس کی نجات کے لئے کسی نئی چیز کی ضرورت نہ رہی۔ اس بارہ میں ہم انجیل ہی کی تعلیم لے لیتے ہیں۔ رومیوں باب ۵ آیت ۱۴ میں لکھا ہے:۔

> ’’آدم سے لے کر موسیٰ تک موت نے ان پر بھی بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا۔‘‘

اس جگہ آنے والے سے مراد مسیحؑ ہے اور آنے والے کا مثیل آدم کو قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ آدمؑ سے لے کر موسیٰؑ تک موت نے ان پر بھی بادشاہت کی جنہوں نے آدم کی طرح (جو مسیح کا مثیل تھا) **گناہ نہیں کیا تھا** گویا پولوس مانتا ہے کہ آدمؑ سے لے کر موسیٰؑ تک بہت سے لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیا تھا اور جب انہوں نے گناہ نہیں کیا تھا تو یہ ثابت ہوا کہ انسان گناہ سے بچ سکتا ہے بہرحال انجیل مانتی ہے کہ آدم کے

بعد ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا لیکن لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ یہ مسئلہ حضرت مسیح کی صلیب کے واقعہ کے بعد جب لوگوں کی طرف سے اعتراضات ہوئے تو گھبراہٹ میں جلدی سے بنا لیا گیا تھا۔ اسی لئے حواری کبھی کچھ کہہ دیتے تھے اور کبھی کچھ مثلاً یہی فقرہ جس کو اوپر درج کیا گیا ہے صاف طور پر بتاتا ہے کہ آدم سے لے کر موسیٰ تک ایسے کئی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے گناہ نہیں کیا گویا آدم کے گناہ کرنے کے باوجود اس کی اولاد کو ورثہ میں گناہ نہیں ملا۔ لیکن اسی کتاب کے اسی باب کی بارھویں آیت میں لکھا ہے کہ

''یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی اس لئے کہ سب نے گناہ کیا''

یعنی آدم کو گناہ کی سزا موت ملی۔ اور آدم کی وجہ سے موت سب آدمیوں میں پھیل گئی۔ اس لئے کہ سب نے گناہ کیا۔

''کیونکہ شریعت کے دیئے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا۔'' (رومیوں باب ۵ آیت ۱۳)

گویا پولوس ایک ہی باب میں دو آیتیں لکھتا ہے پہلے تو یہ لکھتا ہے کہ چونکہ سب نے گناہ کیا اس لئے موت سب آدمیوں میں پھیل گئی (کیونکہ موت کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ گناہ کے نتیجہ میں آئی ہے) لیکن آیت ۱۴ میں جا کر کہہ دیا کہ

''موت نے ان پر بھی بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا۔''

لیکن اب انہیں ایک اور مشکل پیش آ گئی اور وہ یہ کہ مسیحیوں کے نزدیک حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شریعت شروع ہوئی ہے پہلے نہیں۔ جب پہلے کوئی شریعت ہی نہیں تھی تو گناہ کہاں تھا؟ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ

''شریعت کے دیئے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا۔'' (رومیوں باب ۵ آیت ۱۳)

گویا ان کے نزدیک شریعت اور گناہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور یہ بالکل درست ہے اس میں ہم بھی ان سے متفق ہیں شریعت الفاظ میں بیان کرتی ہے کہ اس اس طرح نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہو جائے گا اور گناہ تب ہوتا ہے جب کوئی شخص کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتا ہے جس سے شریعت نے بنی نوع انسان کو بصراحت روکا ہو ورنہ شریعت کے نزول سے پہلے گناہ محسوب نہیں ہوتا پس اتنی بات تو درست ہے۔ لیکن خواہ شریعت موجود نہ ہو جو چیز

بری ہے وہ بہر حال بری ہوگی ۔مثلاً قرآن کریم نازل ہوااوراس نے کہا کہ ظلم نہ کرو۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے اور ہم نے سمجھ لیا کہ ظلم کرنا اچھانہیں لیکن اگر قرآن کریم میں یہ حکم نازل نہ ہوتا اور یہ نہ کہا جاتا کہ ظلم نہ کرو۔تو پھر بھی ظلم کرنے والا ایک برے فعل کا مرتکب ہوتا۔یہی حال اور برائیوں کا ہے شریعت نازل نہ ہوتی تو پھر بھی برائیاں، برائیاں ہی رہتیں ۔فرق صرف اتنا ہوتا کہ ایک فعل کو دس بیس آدمی برا کہتے اور دس بیس آدمی برا نہ کہتے ۔ پچاس ساٹھ کہتے کہ یہ نیکی ہے اور پچاس ساٹھ کہتے یہ نیکی نہیں ۔ بہرحال احساس برائی کا اور احساس نیکی کا یہ شریعت کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا فطرت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔یہی چیز پولوس پیش کرتا ہے کہ دنیا میں گناہ تھا لیکن جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا تھا اور یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ وہ گناہ ہے ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر کسی موقعہ پر شریعت نہ ہو تو ہر برا فعل گناہ تو ہوگا لیکن وہ گناہ شریعت کے مطابق محسوب نہیں ہوگا۔مثلاً ایک جگہ پر شریعت موجود نہیں اور لوگ نمازیں نہیں پڑھتے ۔فرض کرو وہ جنگلوں میں رہتے ہیں یا دور پہاڑوں پر رہتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو چکے ہیں تو خدا تعالیٰ ان سے یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے اسلام کی بتائی ہوئی نماز کیوں نہیں پڑھی یا تم نے اسلام کا بتایا ہوا روزہ کیوں نہیں رکھا۔کیونکہ اس نماز اور روزہ کا تو انہیں کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ حدیثوں میں صاف طور پر آتا ہے کہ قیامت کے دن چار قسم کے لوگ شرعی مؤاخذہ سے محفوظ ہوں گے۔ اول مادرزاد بہرے ۔دوم پاگل ۔سوم پیر فرتوت ۔ چہارم وہ لوگ جن تک اسلام کی تبلیغ نہیں پہنچی اور وہ اسی حالت میں فوت ہو گئے ۔ ایسے لوگوں کے امتحان کے لئے ان کی طرف کوئی اور رسول مبعوث کیا جائے گا اگر وہ اسے مان لیں گے تو نجات پا جائیں گے اور اگر نہیں مانیں گے تو سزا پائیں گے (روح المعانی جلد ۴ زیر آیت و ما کنا معذبین حتی نبعث رسولا) اس کے علاوہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کریم سے استدلال کر کے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ بعض لوگوں کا محاسبہ فطرت کے مطابق ہوگا (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۸۶) یعنی قرآن کریم کی شریعت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا محاسبہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت کے اندر جو باتیں رکھی ہیں ان کے ماتحت ان کا محاسبہ ہوگا۔ انسانی فطرت بھی بعض چیزوں کو گناہ قرار دیتی ہے بغیر اس کے کہ شریعت انسان کی راہنمائی کرے ۔حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک چور آپ کے پاس علاج کے لئے آیا۔آپ نے اسے نصیحت کی کہ تم لوگوں کا مال لوٹ لیتے ہو یہ بہت بری بات ہے تمہیں اس قسم کی حرام کمائی سے بچنا چاہیے۔اس نصیحت کو سن کر وہ کہنے لگا واہ مولوی صاحب آپ نے بھی مولویوں والی ہی بات کی ۔ بھلا ہمارے جیسا بھی کوئی حلال مال کماتا ہے آپ تھوڑی دیر نبض پر ہاتھ رکھ کر فیس وصول کر لیتے ہیں اور ہم سردی کے موسم میں ٹھٹھرتے ہوئے اور

اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے جاتے ہیں۔ کس طرح ہمیں پولیس کا ڈر ہوتا ہے کس طرح قدم قدم پر ہمیں پکڑے جانے کا خوف ہوتا ہے مگر ہم تمام مصیبتوں کو برداشت کرنے کے بعد جاتے ہیں اور اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال کر روپیہ لاتے ہیں۔ بھلا ہم سے زیادہ حلال کمائی اور کسی کی ہو سکتی ہے؟ آپ فرماتے تھے یہ سن کر میں نے جھٹ اسے اور باتوں میں لگا دیا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس سے پوچھا کہ تم چوری کس طرح کرتے ہو؟ وہ کہنے لگا ہم سات آٹھ آدمی مل کر چوری کرتے ہیں ایک گھر کی ٹوہ لگانے والا ہوتا ہے جو بتاتا ہے کہ فلاں گھر میں اتنا مال ہے ایک سینڈھ لگانے کا مشاق ہوتا ہے ایک باہر کھڑا پہرہ دیتا رہتا ہے دو آدمی گلی کے سروں پر کھڑے رہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ادھر آئے تو وہ فوراً بتا دیں۔ ایک آدمی اندر جانے والا ہوتا ہے اور ایک آدمی اچھا لباس پہن کر دور کھڑا ہوتا ہے جس کے پاس چوری کا تمام مال ہم جمع کرتے جاتے ہیں تا کہ اگر کوئی دیکھ بھی لے تو شبہ نہ کرے بلکہ سمجھے کہ یہ کوئی شریف آدمی ہے جو اپنا مال لئے کھڑا ہے باقیوں نے اپنے جسم پر تیل ملا ہوا ہوتا ہے اور وہ لنگوٹ باندھ کر اپنی اپنی ڈیوٹی ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ پھر ایک سنار ہوتا ہے جس کو ہم تمام زیورات دے دیتے ہیں وہ سونا گلا کر ہمیں دے دیتا ہے اور ہم سب آپس میں مل کر تقسیم کر لیتے ہیں۔ جب وہ یہاں تک پہنچا تو حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرماتے تھے میں نے کہا اگر وہ سنار سارا مال لے جائے اور تمہیں کچھ نہ دے تو پھر تم کیا کرو؟ اس پر وہ بے اختیار کہنے لگا۔ کیا وہ اتنا بے ایمان ہو جائے گا کہ دوسروں کا مال کھا جائے؟ میں نے کہا معلوم ہوتا ہے تمہاری نگاہ میں بھی ایمان اور بے ایمانی میں کچھ فرق ضرور ہے اور تمہاری فطرت سمجھتی ہے کہ فلاں فعل بے ایمانی ہے اور فلاں فعل نیکی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی یہی فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی فطرت پر امتحان ہو جائے گا اللہ تعالیٰ یہ نہیں کہے گا کہ تم نے وہ نماز کیوں نہیں پڑھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ یہ کہے گا کہ تمہاری فطرت میں کسی نہ کسی ہستی کی عبادت کا مادہ رکھا گیا تھا تم یہ بتاؤ کہ اس فطرت کی آواز کے مطابق تم نے عبادت کی تھی یا نہیں؟ یا مثلاً جھوٹ ہے، چوری ہے، ڈاکہ ہے۔ دوسرے کا مال تو انسان کھا لیتا ہے لیکن جب اس کا اپنا مال کوئی شخص اٹھا لیتا ہے تو کہتا ہے فلاں بڑا بے ایمان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کی چیز کھانا یہ بھی بے ایمانی سمجھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شریعت کے مطابق اس کو مجرم نہیں کہا جائے گا لیکن فطرت کے مطابق وہ مجرم ہوگا اور اسے سزا دی جائے گی پس یہ مسئلہ تو ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ مسئلہ درست ہے تو پھر کفارہ کہاں رہا؟

انجیل اگر یہ کہتی کہ فطرت انسانی لعنت ہے تو پھر یہ مسئلہ قائم رہ جاتا لیکن انجیل یہ کہتی ہے کہ شریعت لعنت ہے (گلتیوں باب ۳ آیت ۱۳) یعنی وہ جو انسان کا نفس کسی فعل کو گناہ قرار دیتا ہے انجیل اس کے خلاف نہیں بلکہ انجیل یہ کہتی

ہے کہ شریعت لعنت ہے یعنی شریعت میں ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن پر لوگ عمل نہیں کر سکتے اور وہ کہتی ہے کہ اسی وجہ سے مسیح نے شریعت اڑا دی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موسیٰ ؑ سے پہلے بھی شریعت اڑی ہوئی تھی اور انسان کی نجات کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت نہیں تھی بلکہ فطرت کے مطابق عمل کر کے وہ نجات پا جاتا تھا یا فطرت کے خلاف عمل کر کے سزا پا لیتا تھا۔ پھر اب کسی کفارہ کی کیا ضرورت ہے؟ گویا اصل مسئلہ صرف اتنا بنا کہ موسیٰ ؑ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے شریعت بھیج کر لوگوں کو مصیبت میں ڈال دیا۔ مگر اس کا علاج کفارہ نہیں تھا۔ اصل علاج صرف اتنا تھا کہ شریعت کو منسوخ کر دیا جاتا۔ یہ چاہے کتنی ہی بیوقوفی کی بات ہوتی مگر بہر حال جہاں تک علاج کا سوال ہے اصل علاج صرف اتنا تھا۔ کیونکہ رومیوں کے حوالہ سے صاف ماننا پڑتا ہے کہ موسیٰ ؑ سے پہلے شریعت نہیں تھی اور بوجہ شریعت نہ ہونے کے لوگوں کو شریعت کے ماتحت گنہگار نہیں قرار دیا جا سکتا تھا اور جب شریعت کے مطابق وہ گنہگار نہیں تھے تو شریعت انہیں سزا بھی نہیں دلا سکتی تھی اور پھر رومیوں کے حوالہ کے مطابق ایسے لوگ بھی تھے جو گنہگار نہیں تھے یعنی فطرت کے گنہگار بھی نہیں تھے۔

ان سارے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو خرابی پیدا ہوئی وہ آدم ؑ کے گناہ کی وجہ سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ نعوذ باللہ! خدا تعالیٰ کی اس غلطی سے ہوئی کہ اس نے موسیٰ ؑ کے ذریعہ ایک شریعت نازل کر دی جب لوگ اس پر عمل نہ کر سکے اور ان کی سزا کا سوال آیا تو اللہ تعالیٰ نے یسوع مسیح کو بھیج کر شریعت کو ہمیشہ کے لئے اڑا دیا۔ حالانکہ اس کے لئے یسوع مسیح کو بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی جس خدا نے موسیٰ ؑ کو شریعت دی تھی وہی یوشع ؑ کو کہہ دیتا کہ چونکہ لوگ اس پر عمل نہیں کر سکتے اس لئے میں اسے منسوخ کرتا ہوں۔

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر گناہ ہوتا ہے مگر محسوب نہیں ہوتا تو پھر خدا تعالیٰ کا عدل کہاں رہا۔ کفارہ کی دوسری بنیاد عدل پر رکھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر خدا تعالیٰ بنی نوع انسان کو گناہوں کی سزا نہ دے تو وہ عادل نہیں رہتا مگر سوال یہ ہے کہ صرف نام بدل دینے سے تو کوئی چیز اپنی ماہیت سے الگ نہیں ہو سکتی۔ ایک چور چوری کر رہا ہے اور ہم کہتے ہیں اس کو کوئی سزا نہیں ملے گی کیونکہ ابھی موسیٰ ؑ کی شریعت نازل نہیں ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں ایک اور شخص چوری کرتا ہے اور ہم کہتے ہیں یہ دائمی جہنم میں جائے گا کیونکہ موسیٰ ؑ کی شریعت اس کو گنہگار قرار دیتی ہے۔ حالانکہ چیز ایک ہے اس نے بھی اسی طرح مال اٹھایا ہے جس طرح پہلے نے اٹھایا ہے۔ مگر ایک کے فعل کو ہم اس لئے جرم قرار نہیں دیتے۔ کہ موسیٰ ؑ کی شریعت ابھی نازل نہیں ہوئی۔ اور ایک کو ہم اس لئے جرم قرار دے دیتے ہیں کہ موسیٰ ؑ کی شریعت نازل ہو چکی ہے۔ ایک کو ہم چھوڑ دیتے ہیں اور دوسرے کو ہم پکڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ دونوں سے

ایک ہی فعل سرزد ہوا ہے یہ کہاں کا عدل ہے اور کونسا انصاف اس کی اجازت دیتا ہے۔ بہر حال عدل تو پھر بھی نہ رہا۔ یا مثلاً جھوٹ بولنا یا لوگوں پر ظلم کرنا ہے اگر اس سے ہم لوگوں کو منع نہیں کرتے یا یہ نہیں کہتے کہ فلاں شخص نے جھوٹ بول کر یا ظلم کر کے گناہ کیا۔ تو ان فعلوں کا مرتکب متقی اور پاک دل کس طرح ہوسکتا ہے؟ محض ہمارے نہ روکنے کی وجہ سے۔ محض ہمارے جھوٹے کو گنہگار نہ کہنے کی وجہ سے یا ظالم کو گنہگار نہ کہنے کی وجہ سے یا چور کو گنہگار نہ کہنے کی وجہ سے وہ متقی کس طرح بن سکتا ہے؟ اور اگر وہ گنہگار نہیں اور ایک دوسرا شخص انہی افعال کی وجہ سے گنہگار کہلاتا ہے تو عدل تو پھر بھی قائم نہ رہا۔

یہاں تک تو اصولی اور فلسفیانہ طور پر میں نے بحث کی ہے اب میں یہ بتاتا ہوں کہ عملاً بھی بائبل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں نیک لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں حنوک جو حضرت آدم کے پڑپوتے اور نوح کے پردادا تھے ان کے متعلق لکھا ہے۔

> ''حنوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں اور حنوک کی کل عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور وہ غائب ہو گیا کیونکہ خدا نے اسے اٹھا لیا۔'' (پیدائش باب ۵ آیت ۲۲ تا ۲۴)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حنوک خدا تعالیٰ کے ساتھ چلتے رہے۔ اس کے یہ معنے تو ہو نہیں سکتے کہ حنوک اور خدا دونوں سفر پر اکٹھے رہے اور جس طرح لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ چلو امریکہ دیکھ آئیں یا کسی اور ملک کی سیر کر آئیں۔ اسی طرح وہ تین سو سال تک خدا تعالیٰ کے ساتھ سیریں کرتے رہے۔ یہ بائبل کا ایک محاورہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ حنوک نیک انسان تھا اور خدائی صفات اس نے اپنے اندر پیدا کر لی تھیں یعنی جو کام خدا تعالیٰ کرتا ہے وہی کام حنوک کیا کرتا تھا۔ وہ بڑا رحم کرنے والا تھا، وہ بڑا احسن سلوک کرنے والا تھا، وہ ظلم نہیں کرتا تھا، وہ ہر شخص سے پیار اور محبت سے پیش آتا تھا، وہ عدل اور انصاف سے کام لیتا تھا، وہ غرباء کی خبر گیری کیا کرتا تھا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کی یہ صفات کہ وہ رب ہے رحمٰن ہے رحیم ہے مالک ہے غفور ہے یہ ساری صفات اس میں بھی پائی جاتی تھیں اور پھر وہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ گویا مسیح کے ساتھ اسے کلی مشابہت تھی اور ویسا ہی مقام حنوک کو حاصل تھا جیسے مسیحؑ کو حاصل ہوا بلکہ مسیح کو تو ساری زندگی تیس سال ملی مگر حنوک ۳۶۵ سال تک زندہ رہا اور تمام عمر اس نے نیکی اور تقویٰ میں بسر کی۔ اس سے پتہ لگا۔ کہ حنوک جو آدم کا پڑپوتا اور نوح کا پڑدادا تھا وہ اتنا نیک تھا کہ گویا خدا کی مثال تھا اور پھر وہ زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ اس کے ساتھ جب ہم حضرت مسیح کا یہ حوالہ ملاتے ہیں کہ

''آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوا اس کے جو آسمان سے اترا'' (یوحنا باب ۳ آیت ۱۳)

تو حنوک کا مقام اور بھی واضح ہو جاتا ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حنوک کا آنا بھی آسمان سے ہی تھا تبھی وہ آسمان پر چلا گیا۔

درحقیقت اس کے معنے بھی یہی ہیں کہ آسمان پر جانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر بچپن سے ہی اللہ تعالیٰ اپنا تصرف رکھتا ہے اور انہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے حنوک بھی تھے جنہوں نے بچپن سے ہی خدا تعالیٰ کے فضل اور اس کے رحم کے سایہ کے نیچے پرورش پائی اور بقول بائبل وہ بھی آسمان پر اٹھا لئے گئے۔

پھر حنوک سے بھی زیادہ شاندار ذکر بائبل میں ملک صدق سالم کا موجود ہے اور انجیل بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب عراق میں ظلم ہوئے اور ان کے چچا اور بھائیوں نے انہیں دکھ دیا تو خدا تعالیٰ نے ان سے کہا کہ یہاں سے ہجرت کر کے فلسطین چلے جائیں صرف حضرت لوطؑ آپ پر ایمان لائے تھے وہ لوط کو ساتھ لے کر چلے۔ آپ کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ راستہ میں مصر سے ہوتے ہوئے اور حضرت ہاجرہؓ سے شادی کرتے ہوئے فلسطین پہنچے۔ اس ملک کے متعلق آپ کو بشارت مل چکی تھی کہ یہاں آپ کو جگہ دی جائے گی اور آپ کو ماننے والے یہاں پیدا ہو جائیں گے۔ جب آپ فلسطین میں آ کر بس گئے اور ارد گرد کے بادشاہوں نے دیکھا کہ ابراہیمؑ لوگوں میں مقبول ہو رہا ہے تو انہوں نے آپ سے لڑائی کی۔ آپ بھی ان کے مقابلہ میں نکلے اور انہیں شکست دی۔ جب آپ انہیں شکست دے کر واپس آ رہے تھے تو ملک صدق سالم ایک بادشاہ آپ سے ملا۔ وہ اپنے زمانہ میں بہت بڑا نیک اور بزرگ اور ولی اللہ سمجھا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غنیمت کے اموال کا دسواں حصہ ملک صدق سالم کی خدمت میں پیش کیا۔ ملک صدق سالم نے اس روپیہ کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ روپیہ کی مجھے ضرورت نہیں جو آدمی آپ پکڑ لائے ہیں صرف وہ دے دیئے جائیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں یہ مال آپ کو ضرور دوں گا تا ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ کہیں کہ ملک صدق سالم کی وجہ سے میں دولت مند ہوا ہوں گو یا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو قبول کیا۔ (پیدائش باب ۱۴ آیت ۱۸ تا ۲۴)

انجیل میں اس واقعہ کو زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لکھا ہے:۔

''یسوع ہمیشہ کے لئے ملک صدق کے طریقہ کا سردار کاہن بن کر ہماری خاطر پیشرو کے طور پر داخل ہوا ہے۔'' (عبرانیوں باب ۶ آیت ۲۰)

اس جگہ پولوس اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یسوع مسیح ہمیشہ کے لئے ملک صدق سالم کے طریقہ کا سردار کاہن بن کر ہماری خاطر پیشرو کے طور پر داخل ہوا ہے یعنی باقی لوگ تو مر جاتے ہیں۔موسیٰؑ آئے اور فوت گئے۔داؤدؑ آئے اور فوت ہو گئے،سلیمانؑ آئے اور فوت ہو گئے لیکن ملک صدق سالم نہیں مرا۔اسی طرح مسیحؑ بھی نہیں مرا۔

پھر آگے لکھا ہے:۔

''اور یہ ملک صدق،سالم کا بادشاہ خدا تعالیٰ کا کاہن ہمیشہ کاہن رہتا ہے'' (عبرانیوں باب ۷ آیت ۱)

یعنی ملک صدق سالم پر کبھی موت نہیں آتی۔

پھر لکھا ہے:۔

''جب ابراہام بادشاہوں کو قتل کر کے واپس آتا تھا تو اسی نے اس کا استقبال کیا اور اس کے لئے برکت چاہی۔'' (عبرانیوں باب ۷ آیت ۱)

یعنی ملک صدق سالم نے ابراہیم کو برکت دی۔معلوم ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بڑا سمجھتا تھا کیونکہ بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ ملک صدق سالم نے یہ نہیں کہا کہ اے ابراہیم خدا تجھے برکت دے بلکہ اس نے یہ کہا کہ اے ابراہیم تیرے مال میں برکت ہو یعنی میں تجھے برکت دیتا ہوں۔

اور لکھا ہے:۔

''اسی کو ابراہیم نے سب چیزوں کی دہ یکی دی''

آگے لکھا ہے:۔

''یہ اول تو اپنے نام کے معنی کے موافق راستبازی کا بادشاہ ہے (کیونکہ صدق راستبازی کو کہتے ہیں) اور پھر سالم یعنی صلح کا بادشاہ (سالم سلامتی سے نکلا ہے) یہ بے باپ، بے ماں، بے نسب نامہ ہے۔نہ اس کی عمر کا شروع نہ زندگی کا آخر بلکہ خدا کے بیٹے کا مشابہ ٹھہرا۔''

(عبرانیوں باب ۷ آیت ۲، ۳)

یعنی ملک صدق سالم کا نہ باپ تھا نہ ماں تھی۔وہ خدا تعالیٰ کی طرح ازلی ابدی تھا۔نہ اس کی عمر کا کوئی شروع ہے اور نہ زندگی کا آخر۔نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ کبھی مرتا ہے۔وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے زندہ ہے اور خدا تعالیٰ کے بیٹے کے مشابہ ہے جس طرح مسیح ازل سے ابد تک ہے (وہ مسیح نہیں جو مریم کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ بلکہ وہ مسیح جو اقنوم ثلاثہ

میں شامل ہے)اسی طرح ملک صدق سالم بھی ازلی ابدی ہے۔نہ اس کی کوئی ابتداء اور نہ انتہاء۔

اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ اس دنیا میں ایک اور وجود بھی تھا جو نیک تھا اور ایسا نیک تھا کہ وہ راستبازی اور صلح کا بادشاہ تھا اور ابراہیمؑ کو برکت دینے کا حق رکھتا تھا۔

پھر انجیل میں حضرت زکریاؑ اور ان کی بیوی کے متعلق لکھا ہے۔

''وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سب احکام وقوانین پر بے عیب چلنے والے تھے'' (لوقا باب ۱ آیت ۶)

پھر یوحنا کے بارے میں حضرت زکریا علیہ السلام کو فرشتے نے کہا:۔

''وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیئے گا اور اپنی ماں کے بطن ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔ (لوقا باب ۱ آیت ۱۵)

گویا یوحنا پر روح القدس کا نزول ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد نہیں ہوگا بلکہ ابھی وہ ماں کے پیٹ میں ہی ہوگا کہ روح القدس اس پر نازل ہوگا اور وہ اسے اپنے تصرف میں لے لے گا اور یہ صاف بات ہے کہ گناہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد شروع ہوتا ہے جب کسی پر ماں کے پیٹ میں ہی روح القدس نازل ہوجائے گا تو وہ گناہ کا مرتکب ہی نہیں ہوسکے گا۔

غرض یوحنا کے متعلق بھی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گناہ اور خرابی ان کے قریب نہیں آئی۔ بلکہ حضرت مسیحؑ نے یہاں تک کہا کہ:۔

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں۔'' (متی باب ۱۱ آیت ۱۱ و ۱۲)

اس طرح اس نے یوحنا کو اپنی ذات سے بھی بالا ثابت کیا۔ کیونکہ مسیحؑ بھی عورت سے پیدا ہوا تھا اور یوحنا بھی عورت سے پیدا ہوئے۔

ان حوالوں سے ظاہر کہ انجیل کے رو سے حضرت زکریاؑ اور ان کی بیوی دونوں بے عیب تھے اور خدا تعالیٰ کے قانون پر چلنے والے تھے۔ اسی طرح یوحنا ماں کے پیٹ سے ہی روح القدس سے بھرے ہوئے تھے اور وہ کامل اور بے عیب تھے۔ اب اگر یوحنا اور زکریا اور ان کی بیوی بے گناہ ہوسکتے ہیں تو اسی قانون کے ماتحت دوسرے لوگ بھی کیوں بے گناہ نہیں ہوسکتے۔ جب عملاً حضرت مسیح سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں جو کفارہ واقعہ ہونے سے پہلے

نیک ، راستباز ، بے عیب اور شریعت پر چلنے والے تھے تو معلوم ہوا کہ کفارہ کے بغیر بھی دنیا میں نیکی قائم تھی اور جب کفارہ کے بغیر دنیا میں نیکی قائم تھی تو آئندہ بھی قائم رہ سکتی ہے اور اس کے لئے کسی کفارہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بعض دفعہ مسیحی علماء اس سوال کے متعلق کہ پہلے لوگ جو نجات پا گئے تھے انہوں نے کس طرح نجات پائی اور پہلے لوگوں میں سے جو نیک گزرے ہیں وہ کس طرح نیک ہوئے تھے؟ یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ پہلے لوگ بھی مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے سے نیک ہوئے تھے اور مسیح کے کفارہ پر ایمان لانے کی وجہ سے ہی ان کو نجات ملی تھی۔ مگر ظاہر ہے کہ ان کا یہ دعویٰ محض ڈھکوسلہ ہے وہ اپنے اس دعویٰ کی بنیاد محض اس بات پر رکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت داؤدؑ اور بعض اور انبیاء نے مسیح کی خبر دی تھی حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئیوں میں کہیں مسیح کی خبر کا پتہ نہیں لگتا۔ یہ محض ایک دھوکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف اتنی خبر دی تھی کہ ان کی اولاد کو بابرکت کیا جائے گا اور یہ کہ ان کی اولاد کے ذریعہ خدا تعالیٰ اپنے تقدس کو ظاہر کرے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ خبر اولادِ ابراہیم کے حق میں ہے کسی خاص فرد کے حق میں نہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جو خدا تعالیٰ کے ایک بزرگ نبی تھے وہ اس پیشگوئی کے ماتحت آ جاتے ہیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام جو خدا تعالیٰ کے ایک بزرگ نبی تھے وہ اس پیشگوئی کے ماتحت آ جاتے ہیں۔ اسی طرح یعقوبؑ۔ یوسفؑ۔ موسیٰؑ۔ داؤدؑ اور زکریاؑ سب اس پیشگوئی کے ماتحت آتے ہیں۔ بعض اور نبیوں کی پیشگوئیوں سے بے شک معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک آنے والے مسیح کی خبر دے رہے ہیں لیکن کسی آنے والے کے متعلق خبر دینا اور یہ خبر دینا کہ خدا تعالیٰ کا ایک بیٹا ہوگا جو لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوگا اور اس کے بغیر دنیا کو نجات نہیں مل سکے گی ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے قریباً ہر نبی کی خبر پہلے نبیوں نے دی ہے حضرت یحیٰ کی خبر پہلے سے موجود تھی، حضرت داؤد کی خبر پہلے سے موجود تھی اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خبر بھی پہلے سے موجود تھی مگر اس سے یہ نہیں نکلتا کہ ان کے آنے کی اس رنگ میں خبر موجود تھی کہ ان کے کفارہ پر ایمان لانے سے دنیا کو نجات ملے گی۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو خبر اپنی اولاد کے متعلق دی تھی وہ خبر اگر فرض کرو اس مفہوم کی بھی ہو کہ آئندہ زمانہ میں میرا ایک بیٹا ایسا ہوگا جس سے دنیا کو نجات ملے گی تو بہر حال وہ مسیح پر چسپاں نہیں ہو سکتی کیونکہ مسیحؑ کے دعویٰ کی ساری بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ عیسائیت کہتی ہے کہ آدم کے بیٹے کا گنہگار رہنا ضروری ہے اور گنہگار دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا پس ضروری ہے کہ اس کے لئے کوئی ایسا وجود تلاش کیا جائے جو آدم کا بیٹا نہ ہو چنانچہ وہ کہتی ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنا اکلوتا یسوع مسیح دنیا میں بھیجا تا کہ وہ لوگوں کے گناہوں

کا کفارہ ہوجائے اگر مسیح خدا تعالیٰ کا بیٹا تھا تو پھر وہ ابراہیم کا بیٹا نہیں تھا اور اگر وہ ابراہیم کا بیٹا تھا تو کفارہ کا موجب نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کا بیٹا نہیں تھا پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی کو مسیح پر چسپاں کرنا کفارہ کی ساری بنیاد ہی اکھیڑ دیتا ہے مجھے یاد ہے میں چھوٹا تھا سترہ اٹھارہ سال میری عمر ہوگی کہ میں لاہور گیا اور مجھے شوق پیدا ہوا کہ میں کسی پادری سے گفتگو کروں لاہور کا سب سے بڑا پادری جو بعد میں مشنری کالج سہارنپور کا پرنسپل مقرر ہوگیا تھا میں اس سے ملنے چلا گیا اور میں نے اس سے یہی سوال کیا کہ پہلے لوگ کس طرح نجات پاتے تھے؟ وہ کہنے لگا وہ بھی مسیح پر ایمان رکھتے اور اس ایمان کی وجہ سے ہی انہوں نے نجات پائی۔ میں نے کہا اگر میں کہہ دوں کہ مجھ پر ایمان لا کر انہوں نے نجات پائی ہے تو پھر اس کا کیا حل ہوگا؟ وہ کہنے لگا پیشگوئی بھی تو ہونی چاہیے۔ میں نے کہا یہ ٹھیک ہے آپ یہ بتائیں کہ مسیح کے متعلق کون سی پیشگوئی تھی؟ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشگوئی پیش کی۔ میں نے کہا آپ ابراہیم کی ساری پیشگوئیاں نکال لیں اگر ان میں ایک طرف یہ ذکر آتا ہے کہ میں اسحاق کی اولاد کو یوں برکت دوں گا تو ساتھ ہی اسمٰعیلؑ کی اولاد کا بھی ذکر ہے۔ اگر آپ کا یہ حق ہے کہ آپ اس پیشگوئی مسیحؑ پر چسپاں کریں تو ہمیں کیوں یہ حق حاصل نہیں کہ اس پیشگوئی کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کرلیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے؟ پھر میں نے کہا پہلے آپ میرے اس سوال کا جواب دیں کہ کفارہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا۔ اگر وہ ابراہیمؑ کا بیٹا تھا تو کفارہ نہیں ہوسکتا۔ میرے اس سوال پر اس نے بڑے چکر کھائے حالانکہ وہ بچپن ساٹھ سال کی عمر کا تھا۔ آخر گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا مجھے معاف فرمائیں۔ یونانی میں ایک مثل ہے کہ ہر بیوقوف سوال کرسکتا ہے مگر جواب دینے کے لئے عقلمند انسان چاہیے۔ گویا اس نے مجھے بیوقوف بنایا اور اپنے متعلق کہا کہ میں اتنا عقل مند نہیں کہ ہر بے وقوف کا جواب دے سکوں۔ میرا ابھی اس وقت جوانی کا زمانہ تھا میں بھلا کب رکنے والا تھا میں نے کہا مجھے بڑا افسوس ہے میں آپ کو عقل مند سمجھ کر ہی آیا تھا۔ تو مسیحؑ اگر ابراہیمؑ کی اولاد میں سے تھا تو کفارہ باطل ہوجاتا ہے اور اگر وہ خدا کا بیٹا تھا تو ابراہیم کی پیشگوئی پوری نہیں ہوتی۔ گویا دونوں صورتوں میں اعتراض پیدا ہوتا ہے ایک صورت میں مسیحؑ کفارہ نہیں بن سکتا اور دوسری صورت میں ابراہیم کی پیشگوئی پوری نہیں ہوتی۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد میں سے کسی آنے والے کی خبر دی ہے تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ ہے کون حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں کہ میری اولاد میں سے ایک شخص آئے گا اور ابراہیمی نسل میں بھی یہ مشہور ہے کہ اس نے کسی بڑے آدمی کے ظہور کی خبر دی تھی اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں دو آدمی کھڑے ہوتے ہیں

ایک کہتا ہے میں اس پیشگوئی کا مستحق ہوں اور دوسرا کہتا ہے میں اس پیشگوئی کا مستحق ہوں ایک سے ہم پوچھتے ہیں کہ تیرے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تو اس پیشگوئی کا مصداق ہے؟ وہ کہتا ہے میرا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اس کا باپ فلاں تھا اور اس کا باپ ابراہیم تھا۔ دوسرے سے ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم ابراہیم کی نسل میں سے ہو وہ کہتا ہے میری ماں فلاں تھی۔ وہ فلاں سے بیاہی گئی تھی اور وہ شخص جس سے میری ماں بیاہی گئی تھی وہ فلاں کا بیٹا تھا وہ فلاں کا بیٹا تھا اور وہ ابراہیم کا بیٹا تھا۔ کیا دنیا کا کوئی بھی معقول آدمی اس بات کو تسلیم کرے گا کہ وہ واقعہ میں ابراہیم کی اولاد میں سے ہے وہ کہتا ہے میرا باپ فلاں تھا، دادا فلاں تھا، پردادا فلاں تھا اور اس طرح چلتے چلتے وہ اپنا نسب نامہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میری ماں فلاں سے بیاہی گئی تھی اور وہ ابراہیم کی اولاد میں سے تھا۔ ہر شخص اسی کی بات مانے گا جو اپنے باپ دادا کا نسب نامہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہنچا رہا ہو اس کی بات کوئی نہیں مانے گا جو اپنی ماں کے شوہر کو ابراہیم کی اولاد میں سے قرار دے کر یہ سمجھ رہا ہو کہ میں بھی ابراہیم کی اولاد میں سے ہوں مسیح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی کیفیت ہے۔ حضرت مسیحؑ کا جو نسب نامہ متی باب ا میں درج کیا گیا ہے اور جسے ’’یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ‘‘ قرار دیا گیا ہے اس کے آخر میں یہ لکھا ہے کہ

’’یعقوب سے یوسف پیدا ہوا یہ اس مریم کا شوہر تھا جس سے یسوع پیدا ہوا جو مسیح کہلاتا ہے۔‘‘ (انجیل متی باب ا آیت ۱۶)

گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام تک مسیح کا نسب نامہ نہیں پہنچتا بلکہ یوسف کا نسب نامہ پہنچتا ہے جن سے حضرت مریم بیاہی گئی تھیں۔ اس کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ میرا باپ عبداللہ تھا وہ عبدالمطلب کا بیٹا تھا اور اسی طرح چلتے چلتے آپ اس نسب نامہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا دیتے ہیں (السیرۃ النبی لابن ھشام الجزء اول صفحہ ۱، ۲)۔ پس ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں کہ تم جس وجود پر ابراہیم کی پیشگوئی کو چسپاں کرتے ہو اور جسے ابراہیم کی اولاد میں سے قرار دیتے ہو وہ تو صاف کہتا ہے کہ میری ماں مریم جس سے بیاہی گئی تھی وہ ابراہیم کی اولاد میں سے تھا میں ابراہیم کی اولاد میں سے نہیں۔ لیکن ہم جس وجود پر اس پیشگوئی کو چسپاں کرتے ہیں یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ یقینی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ پھر تم اس پیشگوئی کا مصداق حضرت مسیح کو کس طرح قرار دیتے ہو۔

باقی رہا یہ دعویٰ کہ میں دنیا کا نجات دہندہ ہوں یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران:۳۲) اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں سے یہ کہہ دے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کرو کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ تو میری اطاعت کرو اور میری بیعت میں شامل ہو جاؤ نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف تم نجات پا جاؤ گے بلکہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے انسان کو صرف نجات ہی نہیں ملتی بلکہ وہ اس قدر روحانی ترقی حاصل کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔

اسی طرح فرماتا ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال:۲۵) کہ اے مومنو! تم خدا اور اس کے رسول کے احکام کو قبول کرو کیونکہ وہ تمہیں زندہ کرنے کے لئے اپنی طرف بلا رہا ہے اس جگہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ آپ لوگوں کو زندہ کرتے ہیں اور چونکہ انجیل خود تسلیم کرتی ہے کہ گناہ کا نتیجہ موت ہے۔ اس لئے ان الفاظ میں درحقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کا نجات دہندہ قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کی اتباع میں ہی بنی نوع انسان کو اس موت سے نجات مل سکتی ہے جو گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

کفارہ کے متعلق ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تین اقنوم تھے تو پھر مسیح کے ذمہ کفارہ کیوں لگایا گیا۔ مان لیا کہ آدم نے گناہ کیا تھا یہ بھی ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ آدم کا گناہ ورثہ کے طور پر اس کی اولاد میں چلا گو یہ بالکل احمقانہ بات ہے۔ اس کے بعد ہم یہ تیسری احمقانہ بات بھی مان لیتے ہیں کہ ورثہ کا گناہ ایسی چیز ہے جو کسی طرح علاج پذیر نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے بہرحال کوئی خارجی علاج چاہیے۔ پھر یہ چوتھی احمقانہ بات بھی ہم مان لیتے ہیں کہ اس ورثہ کے گناہ کا علاج کفارہ ہے گو یہ علاج بالکل ویسا ہی ہے جیسے ہمارے ملک کی مثل ہے کہ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔ کسی کے گھٹنے پر چوٹ لگی تو اس نے اپنی آنکھ پر ہاتھ رکھ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ ہائے مر گیا۔ ہائے مر گیا۔ یہ بھی بالکل وہی بات ہے کہ دنیا سے گناہ دور نہیں ہوسکتا لیکن مسیحؑ کے صلیب پر لٹکنے سے وہ گناہ دور ہو گیا۔ یہ بالکل بے جوڑ بات ہے لیکن چلو ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہوا اور یہ بھی مان لیتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی خدائی طاقتوں والا وجود چاہیے مگر سوال یہ ہے کہ اس غرض کے لئے خدا باپ نے کیوں نہ اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ آخر رحم کی صفت خدا باپ میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ جب وہ دنیا پر اتنا رحم کرتا ہے کہ جس کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔ تو خدا باپ نے کیوں نہ اپنے آپ کو کفارہ کے لئے پیش کر دیا؟ روح القدس خدا نے کیوں نہ اپنے آپ کو پیش کر دیا؟ آخر کیا وجہ ہے کہ بیٹے نے اس غرض کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا؟ اس کے دو ہی جواب ہو سکتے ہیں یا تو یہ بات ماننی پڑے گی

کہ خدا باپ اور خدا روح القدس کے مرنے سے دنیا فنا ہو جاتی تھی اس لئے خدا بیٹے نے اپنے آپ کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔لیکن اس صورت میں ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بیٹا ناقص خدا ہے اس کے مرنے سے دنیا فنا نہیں ہو سکتی تھی اس لئے اسے پیش کر دیا گیا۔ باپ خدا نے اپنے آپ کو اس لئے پیش نہ کیا۔ کہ اگر وہ مرا تو ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ خدا باپ اور خدا روح القدس کے دل میں بنی نوع انسان کی اتنی محبت اور اتنا پیار نہیں تھا جتنا پیار خدا بیٹے کے دل میں تھا۔مگر یہ جواب خدا باپ اور خدا روح القدس دونوں کو ناقص قرار دیتا ہے۔ دوسرے انجیل کے بھی خلاف ہے کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ خدا محبت ہے (۲۔کرنتھیوں باب ۱۳ آیت ۱۱) اور یہ فقرہ نہ روح القدس کے متعلق ہے نہ مسیح کے متعلق ہے۔غرض ایک صورت میں بیٹا ناقص قرار پاتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک غیر ضروری شئے تھا جس کے مرنے سے دنیا فنا نہیں ہوسکتی تھی۔لیکن اگر خدا باپ مر جاتا تو ساری دنیا تباہ ہو جاتی اور اگر بیٹے کے دل میں بنی نوع انسان کی کامل محبت تھی تو پھر باپ خدا اور روح القدس خدا دونوں ناقص قرار پاتے ہیں۔ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک نہ ایک خدا ضرور ناقص قرار پاتا ہے اور ناقص چیز تمام مذاہب کے مسلمہ عقیدہ کے مطابق خدا نہیں ہوسکتی۔

پھر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہودیت کے نزدیک کفارہ ضروری ہے؟ ہم کہتے ہیں بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ کفارہ ضروری نہیں اس لئے کہ کفارہ کی ضرورت تب پیش آتی ہے جب گناہ معاف نہ ہو سکتے ہوں لیکن بائبل کہتی ہے کہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں اور تمام بائبل گناہوں کی معافی کی تعلیم سے بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح ان قربانیوں کی تعلیم سے بھری پڑی ہے جو خدا تعالیٰ کے حضور مقبول ہوتی ہیں۔ بلکہ بائبل بتاتی ہے کہ خود آدم کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کی قربانیوں کو خدا نے قبول کیا اور انہیں اپنے قرب میں جگہ دی۔ بائبل میں لکھا ہے:۔

”چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا (یعنی ہابل بھی خدا تعالیٰ کا مقرب ہو گیا اور اس کا ہدیہ بھی منظور ہو گیا) پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا۔ (یہ قائن وہی ہے جسے ہمارے ہاں قابیل کہتے ہیں) اس لئے قائن نہایت غضبناک ہوا اور اس کا منہ بگڑا اور خداوند نے قائن سے کہا تو کیوں غضبناک ہوا اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے (یعنی خدا تعالیٰ نے جب قائن کے ہدیہ کو قبول نہ کیا تو اس کا منہ بگڑ گیا اور اسے سخت غصہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا منہ بگڑا ہوا دیکھا تو اس نے کہا اے قائن تجھے کیوں غصہ آیا ہے اور تیرا

منہ کیوں بگڑا ہوا ہے) اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے پر تو اس پر غالب آ۔‘‘ (پیدائش باب ۴ آیت ۳ تا ۷)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ:۔

اول باوجود آدم کے گناہ کے اس کے بعض بیٹوں کی قربانی قبول ہوتی تھی۔ چنانچہ ہابیل کی قربانی قبول ہوئی اور وہ خدا تعالیٰ کا منظور نظر ہو گیا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ ’’خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا‘‘ ہابل کو قبول کرنے کے یہ معنے تو نہیں ہو سکتے کہ خدا نے ہابل کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا نے اس کو اپنا منظور نظر بنا لیا اور اس کے ہدیہ کو ایک زندہ قربانی تصور کیا جو انسان کے درجہ کو برابر بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ کیونکہ ہدیہ قبول کرنے کے یہی معنے ہوتے ہیں کہ اس کا نتیجہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بندہ کو ملنا شروع ہو جائے۔ اب ہابل اور قائن دونوں آدمؑ کی اولاد تھے اور آدم کے گناہ کے بعد پیدا ہوئے۔ ان دونوں میں ورثہ کے طور پر گناہ آنا چاہیے تھا۔ مگر باوجود اس کے کہ وہ گناہ لے کر پیدا ہوئے تھے جب انہوں نے قربانی کی تو ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قربانی ردّ کی گئی۔ اگر ورثہ میں انہیں گناہ ملا تھا تو اول تو انہیں قربانی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی اور اگر کرتے تو دونوں کی قربانیاں ردّ کر دی جاتیں۔

دوم۔ اسی حوالہ میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے قائن سے کہا

’’اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا۔‘‘

یعنی اگر تو نیک بنے تو کیا خدا تجھے اپنا مقرب نہ بنائے گا۔ ان الفاظ کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر تو نیک بننا چاہے تو بن سکتا ہے اور نیک بننے کا دروازہ تیرے لئے ہر وقت کھلا ہے اور ’’کیا تو مقبول نہ ہوگا‘‘ کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا مقبول اور اس کا مقرب بننے کا دروازہ بھی تیرے لئے کھلا ہے جو نجات سے بڑا درجہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک بنی نوع انسان خدا تعالیٰ کے حضور عمل سے مقبول ہوتے تھے نہ کہ کفارہ سے۔ اور یہ کہ گناہ کرنے کے بعد بھی انسان توبہ سے مقبول ہو سکتا تھا۔ اور یہ دونوں باتیں بتاتی ہیں کہ ہر انسان نیک بھی بن سکتا ہے اور ہر انسان خدا تعالیٰ کا مقرب بھی ہو سکتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو قائن جو گناہ کی وجہ سے نامقبول ہو چکا تھا اسے یہ نہ کہا جاتا کہ ’’اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا۔‘‘

سوم۔ پھر لکھا ہے:۔

’’اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے‘‘

مسیحیت کہتی ہے کہ آدم کے گناہ کے بعد گناہ انسان کے دل میں بویا گیا۔ ورثہ کے بھی یہی معنے ہوتے ہیں۔ مگر بائبل کہتی ہے کہ گناہ اس کے دل میں نہیں گیا بلکہ وہ اس کے گھر کے دروازہ کے باہر دبکا بیٹھا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ انسان کے دل میں نہیں بلکہ باہر سے آتا ہے۔ پس بائبل کے نزدیک آدم کے گناہ کے بعد گناہ کا بیج انسان کے دل میں نہیں بویا گیا بلکہ ہر انسان کے دروازہ کے باہر دبکا بیٹھا ہے۔ گویا گناہ ایک خارجی شئے ہے نہ کہ ورثہ کی چیز جو جزو بدن ہو جاتی ہے۔

چہارم پھر لکھا ہے:۔

''پر تو اس پر غالب آ''

یعنی اے قائن تو اس پر غالب آ۔ جب خدا کہتا ہے تو ایسا کر۔ تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے ایک چھوٹے بچے کو پیار میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے (سوائے اس کے کہ ہم غلط مذاق کر رہے ہوں) کہ جا اور موٹر کو اٹھا لا یا جا اور ہاتھی کو پکڑ لا۔ ہم اسے وہی بات کہیں گے جو اس کی طاقت کے اندر ہو گی۔ اگر دفتر میں ہی کوئی افسر اپنے چپڑاسی کو بلائے اور کہے کہ جیکب آباد کی طرف جو انجن جاتا ہے وہ اٹھا کر لے آ۔ تو تم جانتے ہو وہ کیا کرے گا؟ وہ چپ کر کے اور کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے کھسک جائے گا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ جائے گا اور وہ دوسروں سے جا کر کہے گا کہ صاحب پاگل ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس نے ایک ایسی بات کہی ہے جو انسانی طاقت میں ہی نہیں۔ اسی طرح اگر گناہ دب ہی نہیں سکتا تھا تو خدا تعالیٰ نے قائن سے یہ کیوں کہا کہ تو اس پر غالب آ سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خدا تعالیٰ نے اس کی قربانی کو رد کر دیا اور کہا کہ چونکہ تو نے اس اخلاص اور نیک نیتی سے قربانی نہیں کی جس اخلاص اور نیک نیتی سے قربانی قبول ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں تیری قربانی کو قبول نہیں کرتا۔ مگر ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ میں نے جو قربانی رد کر دی ہے وہ ہمیشہ کے لئے ردّ کر دی ہے تیرے لئے اب بھی موقعہ ہے کہ تو گناہوں پر غالب آ جائے اور میرا قرب حاصل کر لے۔ گویا انسان کے لئے اپنی ذاتی جدوجہد سے گناہ پر غالب آنا ممکن تھا۔

غرض آدم کا گناہ تو الگ رہا۔ قائن کے اپنے گناہ کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو دبائی نہ جا سکے۔ اگر تو کوشش کرے تو گناہ پر غالب آ سکتا ہے اور میں تجھے یہی نصیحت کرتا ہوں کہ تو اس پر غالب آ۔

اوپر کے حوالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی قابیل کے متبع ہیں اور مسلمان ہابیل کے متبع۔ کیونکہ عیسائی کفارہ کی معافی کے قائل ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے اس لئے دشمن ہیں کہ قابیل کی طرح ان کی

قربانی قبول نہیں ہوئی۔ پس وہ اس کا بدلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت سے لینا چاہتے ہیں۔ پھر جیسا کہ خدا تعالیٰ نے قابیل سے کہا تھا کہ ''اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے۔'' آج کل ہمیں وہی نظارہ نظر آ رہا ہے۔ عیسائی دنیا میں اس کثرت کے ساتھ گناہ پایا جاتا ہے کہ اس کی کوئی حد ہی نہیں۔

بہرحال بائبل کے نزدیک انسان بعد از گناہ آدم بھی نیک ہوسکتا تھا اور یہ کہ گناہ کا بیج اس کے دل میں نہیں بویا گیا تھا۔ بلکہ اس وقت بھی وہ باہر سے آتا تھا اور اگر وہ گناہ کر بیٹھتا تھا تب بھی اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا تھا اور آئندہ گناہ پر غالب آنے کا امکان اس کے لئے موجود تھا۔ بلکہ نہ صرف وہ گناہ پر غالب آنے کی طاقت رکھتا تھا بلکہ وہ خدا تعالیٰ کا مقبول ہونے کی بھی طاقت رکھتا تھا۔ پس وہ کیفیت جس کے نتیجہ میں کفارہ کی ضرورت مسیحی بتاتے ہیں بائبل کے بیان کے رُو سے موجود ہی نہیں۔

ایک سوال کفارہ کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ فرض کرو دنیا میں نیکی موجود نہیں تھی اور فرض کرو کہ کفارہ کی ضرورت تھی۔ پھر بھی کیا اس کفارہ کے لئے خدا تعالیٰ کے بیٹے کی ضرورت تھی؟ اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسیح خدا کا بیٹا تھا؟

یہ سوال کہ کفارہ کی ضرورت تھی۔ اس کے لئے ہم خود مسیحؑ کی کتاب کو دیکھتے ہیں۔ بائبل اس بات کو مانتی ہے کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء مختلف معجزات دکھاتے رہے ہیں۔ اس کے نزدیک نبی مردے زندہ کرتے تھے۔ نبی بیماروں کو اچھا کرتے تھے۔ نبی تھوڑے سے کھانے کو بڑھا دیتے تھے اسی طرح اور قسم قسم کے معجزات دکھاتے تھے۔ لیکن مسیحی کہتے ہیں (میں مسیحیوں کا لفظ اس لئے استعمال کرتا ہوں کہ بہت سی باتیں مسیحی اپنے پاس سے کہہ دیتے ہیں اور باوجود اس کے کہ انجیل بگڑ چکی ہے۔ پھر بھی ان باتوں کا انجیل سے ثبوت نہیں ملتا) کہ گناہ کا معاف کرنا یہ انسانی طاقت سے بالا ہے۔ انبیاء بے شک مردے زندہ کر لیتے تھے۔ جیسا کہ ایلیاہ نبی اور الیسع کے متعلق آتا ہے کہ انہوں نے مردے زندہ کئے (۱۔سلاطین باب ۱۷ آیت ۲۲ و نمبر ۲ سلاطین باب ۴ آیت ۳۵) مگر گناہ کا معاف کر دینا یہ ناممکن تھا اور اس کے لئے بیٹے کے کفارہ کی ضرورت تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا انجیل اس عقیدہ کی تصدیق کرتی ہے۔

انجیل میں لکھا ہے کہ لوگ ایک مفلوج کو چارپائی پر پڑا ہوا مسیحؑ کے پاس لائے۔ مسیحؑ نے اسے دیکھا اور کہا۔

''بیٹا خاطر جمع رکھ تیرے گناہ معاف ہوئے۔'' (متی باب ۹ آیت ۲)

اس پر لوگ حیران ہو گئے کہ کیا یہ گناہ معاف کرتا ہے۔ یہی بات آج کل مسیحیت کہتی ہے کہ انسان گناہ کس

طرح معاف کرسکتا ہے لیکن انجیل میں لکھا ہے کہ

''یسوع نے ان کے خیال معلوم کر کے کہا کہ تم کیوں اپنے دلوں میں برے خیال لاتے ہو۔
آسان کیا ہے یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یا یہ کہنا کہ اُٹھ اور چل پھر۔'' (متی باب ۹ آیت ۴، ۵)

یعنی ان دونوں میں سے کون سی آسان بات ہے۔ایک مفلوج کو یہ کہہ دینا کہ اُٹھ اور چل پھر یہ آسان ہے یا ایک گنہگار کو یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یہ آسان ہے مسیحیت کی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ اٹھ اور چل پھر کہنا زیادہ آسان ہے اور یہ کہنا کہ تیرے گناہ معاف ہوئے ناممکن ہے۔لیکن حضرت مسیح کے متعلق انجیل بتاتی ہے کہ انہوں نے کہا۔

''اس لئے کہ تم جان لو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے (اس نے مفلوج سے کہا) کہ اٹھ اپنی چار پائی اٹھا اور اپنے گھر چلا جا۔ وہ اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا لوگ یہ دیکھ کر ڈر گئے اور **خدا کی تمجید کرنے لگے جس نے آدمیوں کو ایسا اختیار بخشا۔**'' (متی باب ۹ آیت ۶ تا ۸)

گویا پہلے حضرت مسیحؑ کے گناہ معاف کرنے کے فقرہ پر لوگ حیران ہوئے کہ کیا آدم زاد بھی لوگوں کے گناہ معاف کرسکتا ہے مسیحؑ نے کہا اس لئے کہ تم جان لو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے میں اس مفلوج سے یہ کہتا ہوں کہ اٹھ اپنی چار پائی اٹھا اور اپنے گھر چلا جا۔اس پر وہ اور حیران ہوئے اور اس خدا کی تمجید کرنے لگے جس نے آدمیوں کو ایسا اختیار بخشا ہے یہ واقعہ جو انجیل میں آتا ہے بتاتا ہے کہ گناہ معاف کرنا اور کسی بیمار سے یہ کہنا کہ اٹھ اور اپنے گھر چلا جا یہ معجزہ آدمیوں کا ہے خدا کا نہیں۔

اسی طرح یوحنا باب ۸ آیت ۱ تا ۱۱ میں ایک زانیہ عورت کا قصہ درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اس عورت کو مسیح نے معاف کر دیا حالانکہ وہ مسیح یا اس کے کفارہ پر ایمان نہیں لائی تھی۔

باقی رہا یہ امر کہ اگر خدا کے بیٹے کے ذریعہ ہی گناہ معاف ہوسکتا ہے تو کیا مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی دلیل اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ مسیح نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسیح میں خدائی صفات بھی پائی جاتی تھیں؟ مثلاً ہم جب کہتے ہیں کہ خدا ہے تو اس کی ہستی کے دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور وہ مختلف قوتیں اور طاقتیں جو انسان میں نہیں پائی جاتیں اس کی ہستی کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔لیکن مسیحی کوئی ایسی چیز پیش نہیں کرتے جو اور نبیوں میں تو نہ پائی جاتی ہو اور مسیح میں پائی جاتی ہو بلکہ بہت سی باتیں بائبل میں نبیوں کے متعلق ایسی پائی جاتی ہیں جو مسیحؑ میں نہیں پائی جاتیں۔مگر یہ ایک الگ بحث ہے سوال یہ ہے کہ مسیحیت کی

ساری بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیح نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا اور چونکہ اس نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا اس لئے خدا کا بیٹا ہو گیا ہم کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خدا کا بیٹا کوئی اصطلاح ہے یا یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں عام طور پر یہ لفظ ہماری زبان میں بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ زید کا بیٹا یا عمرو کا بیٹا یا خالد کا بیٹا یا اس کے کوئی اور معنے ہیں۔

جہاں تک اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہنے کا تعلق ہے جب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس میں حضرت مسیحؑ کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ

"ہاں اے باپ کیونکہ ایسا ہی تجھے پسند آیا۔ میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا اور کوئی بیٹے کو نہیں جانتا سوا باپ کے اور کوئی باپ کو نہیں جانتا سوا بیٹے کے اور اس کے جس پر بیٹا اسے ظاہر کرنا چاہیے۔" (متی باب ۱۱ آیت ۲۶۔۲۷)

یہاں مسیح نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا ہے جہاں تک لفظوں کا تعلق ہے ہم مانتے ہیں کہ خدا کے بیٹے کے الفاظ انجیل میں مسیح کے متعلق آئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ مسیح کو بیٹا کہنے کے وہی معنے ہیں جو جسمانی بیٹے کے ہوتے ہیں یا اس کے کچھ اور معنے ہیں۔

اسی طرح یوحنا باب ۳ آیت ۱۷ میں آتا ہے:۔

"خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اس کے وسیلہ سے نجات پائے۔"

یہاں مسیح نے پھر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ایسی بات کہی ہے جو انجیل کے ایک دوسرے حوالہ کے خلاف ہے۔ یہاں وہ کہتے ہیں "خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اس کے وسیلہ سے نجات پائے" لیکن دوسری جگہ لوقا باب ۲۰ آیت ۹ تا ۱۶ میں حضرت مسیحؑ ایک تمثیل بیان کرتے ہیں جو باغ کی تمثیل کہلاتی ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے باغ لگایا اور اسے کرایہ پر دے دیا جن لوگوں کو وہ باغ کرایہ پر دیا گیا تھا ان کے پاس باغ کے مالک نے اپنا ایک نوکر بھیجا تا کہ وہ پھل کا حصہ دے دیں۔ لیکن باغبانوں نے اسے مارا اور خالی ہاتھ واپس کر دیا پھر اس نے ایک دوسرا نوکر بھیجا مگر انہوں نے اس کو بھی پیٹ کر نکال دیا پھر اس نے ایک تیسرا نوکر بھیجا مگر انہوں نے اس کو بھی مارا اور زخمی کر کے نکال دیا۔.................اس پر باغ کے مالک نے کہا اب میں اپنے اکلوتے بیٹے کو بھیجتا ہوں شاید باغبان اس کا لحاظ کریں

اور باغ کا پھل اسے دے دیں لیکن جب اس کا اکلوتا بیٹا باغبانوں کے پاس آیا تو انہوں نے آپس میں مل کر یہ فیصلہ کیا کہ آؤ ہم اسے قتل کر دیں تا کہ یہ باغ ہماری میراث ہو جائے اور پھر ہمیں پوچھنے والا کوئی نہ رہے چنانچہ انہوں نے بیٹے کو باغ کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا۔ حضرت مسیح یہ تمثیل بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں تم جانتے ہو پھر کیا ہوگا۔ پھر یہی بات رہ جائے گی کہ باغ کا مالک آپ آئے گا اور وہ ان مالیوں کو نکال دے گا اور باغ کو کسی اور قوم کے سپرد کر دے گا۔ یہ تمثیل صاف بتاتی ہے کہ بیٹے کا آنا سزا کے لئے ہوگا چونکہ وہ لوگ باغ کا مالیانہ ادا نہیں کرتے تھے اس لئے خدا اپنے بیٹے کو بھیجے گا تا کہ ان پر حجت تمام کر کے انہیں سزا دے پس یہ تمثیل مسیح کے اس قول کے بالکل خلاف ہے کہ ''خدا نے بیٹے کو دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا کہ دنیا پر سزا کا حکم کرے بلکہ اس لئے کہ دنیا اس کے وسیلہ سے نجات پائے''

پھر متی میں لکھا ہے کہ مسیح نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ:۔

''تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔'' (متی باب ۲۸ آیت ۱۹)

اس کے علاوہ بھی بعض جگہوں پر حضرت مسیح نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی نہیں بھلانا چاہیے کہ جہاں حضرت مسیحؑ نے بعض جگہ اپنے آپ کو بیٹا بلکہ اکلوتا بیٹا کہا ہے وہاں اکثر مقامات پر اپنے آپ کو ابن آدم بھی کہا ہے۔ پس ہمارا کیا حق ہے کہ ہم ان کے ایک دعویٰ کو دوسرے دعویٰ پر فوقیت دیں۔ مسیحؑ ہی کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور مسیح ہی کہتا ہے کہ میں ابن آدم ہوں۔ اور جب دونوں دعوے ایک شخص کے ہیں تو ان میں سے کسی ایک دعویٰ کو دوسرے دعویٰ پر فوقیت دے دینا ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔ ہمیں یا تو دلائل سے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ ابن اللہ والی بات غلط ہے اور یا دلائل سے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ ابن آدم والی بات غلط ہے۔ بہر حال جب ایک شخص دونوں باتیں کہتا ہے تو محض اپنے عقل سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں بات سچی ہے اور فلاں بات غلط۔ انجیل میں لکھا ہے:۔

''ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اس لئے کہ خدمت کرے'' (متی باب ۲۰ آیت ۲۸)

(مثیل مسیح یعنی بانی سلسلہ احمدیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ ؎

''منہ از بہر ما کرسی کہ ماموریم خدمت را'' (آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۵۵)

یعنی میرے لئے کرسی نہ رکھو کہ مجھے خدا نے دنیا کی خدمت کے لئے مامور کیا ہے) چونکہ دنیا میں عام طور پر

لوگ غرباء سے کام لیتے ہیں اور ان پر کئی قسم کے مظالم کرتے ہیں۔ اس لئے مسیحؑ نے کہا کہ ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ وہ خدمت لے بلکہ اس لئے آیا ہے کہ خدمت کرے۔ جہاں تک اخلاقی تعلیم کا سوال ہے یہ بڑی اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے کہ انسان کو ظلم نہیں کرنا چاہیے اور دوسروں کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کرنی چاہیے لیکن جہاں تک یہ سوال ہے کہ مسیح کیا تھا؟ اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح آدم کا بیٹا تھا۔

پھر لکھا ہے

''جیسا نوح کے دنوں میں ہوا ویسا ہی ابن آدم کے آنے کے وقت ہوگا'' (متی باب ۲۴ آیت ۳۷)

اسی طرح اسی باب کی چوالیسویں آیت میں لکھا ہے۔

''جس گھڑی تم کو گمان بھی نہ ہوگا **ابن آدم** آ جائے گا۔'' (متی باب ۲۴ آیت ۴۴)

یعنی مسیحؑ کی پہلی آمد بھی ابن آدم کی حیثیت میں تھی اور جب وہ دوبارہ آئے گا تب بھی ابن آدم کی حیثیت میں ہی آئے گا۔ مگر وہ ایسا اچانک آئے گا کہ لوگوں کو اس کی آمد کا گمان بھی نہ ہوگا یعنی جس طرح خدا تعالیٰ کے انبیاء آتے ہیں اور لوگ ان کی آمد کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے انہیں جھوٹا کہنے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح مسیحؑ کے ساتھ ہوگا۔

پھر لکھا ہے:۔

''فانی خوراک کے لئے محنت نہ کرو بلکہ اس خوراک کے لئے جو ہمیشہ کی زندگی تک باقی رہتی ہے جسے ابن آدم تمہیں دے گا۔'' (یوحنا باب ۶ آیت ۲۷)

یعنی لوگ کوشش کرتے ہیں کہ انہیں روٹی کپڑا ملے لیکن تمہیں ان چیزوں کے لئے کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس خوراک کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے جو حقیقی زندگی بخشتی ہے اور جو ابن آدم یعنی مسیح سے حاصل ہوتی ہے۔ باقی چیزیں تو سب فانی اور عارضی فائدہ پہنچانے والی ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس تعلیم کے باوجود سب سے زیادہ حضرت مسیحؑ کی امت نے ہی دنیا کمانے کی طرف توجہ کی ہے اور سب سے زیادہ انہوں نے ہی روحانیت کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔

پھر لکھا ہے مسیحؑ نے کہا

''اے یہوداہ کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے۔'' (لوقا باب ۲۲ آیت ۴۸)

یہوداہ حضرت مسیحؑ کا ایک شاگرد تھا جس نے تیس روپوں کے بدلے انہیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا مسیحؑ

ان دنوں چھپے پھرتے تھے اور وہ اور ان کے شاگرد ایک ہی قسم کا لباس پہنتے تھے اور منہ کو بھی ڈھانک کر رکھتے تھے تا کہ حضرت مسیح کا ان کو پتہ نہ چل جائے (یوحنا باب ۲۱ آیت ۴) دشمن بھی آپ کی تلاش میں تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ہمیں پتہ لگ جائے کہ ان میں سے مسیحؑ کون سا ہے۔ آخر انہوں نے تیس روپے رشوت دے کر حضرت مسیحؑ کے ایک شاگرد کو جس کا نام یہوداہ تھا اپنے ساتھ ملا لیا اور اس نے کہا تم میرے ساتھ چلو۔ جہاں سب اکٹھے بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ وہاں آگے بڑھ کر میں جس شخص کا بوسہ لوں تم سمجھ جانا کہ وہی مسیح ہے اور اسے گرفتار کر لینا۔ ادھر حضرت مسیح کو اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت الہام کے ذریعہ بتا دیا کہ تمہارا فلاں شاگرد اس طرح غداری کرے گا۔ چنانچہ جب یہودا دشمن کے سپاہی لے کر وہاں پہنچا اور وہ آپ کا بوسہ لینے کے لئے آگے بڑھا تو حضرت مسیح نے کہا ’’اے یہوداہ کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے۔ (لوقا باب ۲۲ آیت ۴۸)

گویا مسیحؑ جب آیا تب بھی ابن آدم تھا جب دوبارہ آئے گا تب بھی ابن آدم ہوگا اور جب صلیب پر لٹکایا گیا تب بھی وہ اپنے قول کے مطابق ابن آدم ہی تھا۔

پس جب مسیحؑ خود اپنے آپ کو ابن آدم کہتا ہے تو خدا تعالیٰ کے بیٹے کے ایسے معنے کرنے جو توراۃ اور انجیل کی تعلیم کے خلاف ہوں کس طرح جائز ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں یا تو ہم یہ کہیں گے کہ حضرت مسیح نعوذ باللہ فاتر العقل لوگوں کی طرح کبھی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے دیتے تھے اور کبھی ابن آدم کہنے لگ جاتے تھے اور یا پھر ہمیں اس کا کوئی حل نکالنا پڑے گا اور ان میں سے ایک کو استعارہ اور دوسرے کو اصل قرار دینا پڑے گا۔ اگر ہمیں پتہ لگ جائے کہ استعارہ کونسا ہے اور اصل کونسا تو ہم بڑی آسانی سے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ اگر ابن آدم استعارہ ہو تو پھر ابن اللہ کو اصل ماننا پڑے گا اور اگر ابن اللہ استعارہ نکل آئے تو ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کی قربانی پر جو کفارہ کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ساری کی ساری غلط ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس میں مسیح کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ:۔

’’مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے‘‘ (متی باب ۵ آیت ۹)

یہاں حضرت مسیحؑ اپنے سوا دوسرے انسانوں کو بھی خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ خدا کا بیٹا کہلانا انسان کو خدا نہیں بنا دیتا۔ اگر کسی شخص کو خدا کا بیٹا ماننے سے اس میں خدائی تسلیم کرنی پڑتی ہے تو پھر وہ تمام لوگ جو صلح کراتے ہیں اس حوالہ کے مطابق خدائی کے دعوے دار بن سکتے ہیں اور وہ تمام کے تمام اس بات کے مستحق ہو جاتے ہیں کہ کفارہ دے سکیں۔ لیکن اس حوالہ سے صرف یہی نہیں نکلتا کہ حضرت مسیحؑ کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ

کے بیٹے ہیں اوراس طرح جو حق مسیح کا سمجھا گیا تھا کہ وہ لوگوں کے لئے کفارہ ہوسکتا ہے باطل ہو جاتا ہے بلکہ اس سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے حضرت مسیح اس حوالہ میں یہ کہتے ہیں کہ

’’مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔‘‘

اس جگہ لوگوں کو صرف خدا کا بیٹا قرار نہیں دیا گیا بلکہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ کیوں خدا کے بیٹے کہلائیں گے اگر خالی خدا تعالیٰ کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے جاتے تو یہ پتہ نہیں لگ سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کہلانے کی وجہ کیا ہے۔ ہوسکتا تھا کہ ہم کوئی وجہ پیش کرتے اور دوسرا کہہ دیتا کہ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔لیکن حضرت مسیح نے یہاں وجہ بھی بتائی ہے کہ کیوں یہ سمجھا جائے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور وہ وجہ صلح کرانا بتائی گئی ہے۔آپ فرماتے ہیں مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔گویا صلح کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلانے کی شرط رکھا ہے اور بتایا ہے کہ جو صلح کرواتا ہے وہ بڑا مبارک ہے کیونکہ صلح کرانے سے انسان خدا تعالیٰ کا بیٹا بن جاتا ہے۔اس حوالہ سے صرف یہی نہیں نکلتا کہ مسیحؑ کے سوا اور لوگ بھی خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں بلکہ ایک اور بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے نہیں۔اگر انہیں بیٹا کہا گیا ہے تو پھر کسی چھوٹی وجہ سے کہا گیا ہے یہ وجہ ان میں موجود نہ تھی۔کیونکہ حضرت مسیحؑ خود کہتے ہیں کہ

’’یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔‘‘

(متی باب ۱۰ آیت ۳۴)

گویا متی کا ایک حوالہ تو یہ بتاتا ہے کہ صلح کرانے کی وجہ سے انسان کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلانے کا حق ہوتا ہے اور دوسرا حوالہ یہ بتاتا ہے کہ یہ وجہ مسیح میں نہیں تھی اس لئے مسیح خدا کا بیٹا نہیں کہلا سکتا۔

اسی طرح ایک اور حوالہ ہے جس میں دوسرے انسانوں کو بھی خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا ہے اور حضرت مسیحؑ خود یہ بتاتے ہیں کہ میرا اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہنا یہ معنے نہیں رکھتا کہ میں واقعہ میں خدا یا خدا کا بیٹا ہوں۔یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۵ تا ۳۹ میں لکھا ہے حضرت مسیح نے یہود سے کہا:۔

’’جو کام میں اپنے باپ کے نام سے کرتا ہوں وہی میرے گواہ ہیں (یعنی میری سچائی معلوم کرنے کے لئے تمہیں باہر سے کسی شہادت کے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔جو کام خدا تعالیٰ نے مجھ سے کروائے ہیں وہ اپنی ذات میں اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ میں سچا اور راستباز انسان ہوں) لیکن تم اس لئے یقین نہیں کرتے کہ میری بھیڑوں میں سے نہیں ہو (یعنی چونکہ تم میری

جماعت سے نہیں اس لئے تم میرے مخالف ہو) میری بھیڑیں میری آواز سنتی ہیں (یعنی جو لوگ میری جماعت میں سے ہیں وہ میری آواز کو سنتے اور اس پر عمل کرتے ہیں) اور میں انہیں جانتا ہوں اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلتی ہیں اور میں انہیں ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہوں اور وہ ابد تک کبھی ہلاک نہ ہوں گی اور کوئی انہیں میرے ہاتھ سے چھین نہ لے گا۔ میرا باپ جس نے مجھے وہ دی ہیں سب سے بڑا ہے اور کوئی انہیں باپ کے ہاتھ سے نہیں چھین سکتا۔ میں اور باپ ایک ہیں (جب حضرت مسیحؑ نے یہودیوں سے یہ بات کہی تو چونکہ آخری فقرہ یہ تھا کہ کوئی انہیں میرے ہاتھ سے چھین نہیں سکتا اور پھر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ میں اور باپ ایک ہیں اور باپ سے مراد خدا تھا تو اس کے معنے یہ بن گئے کہ میں اور خدا ایک ہیں۔ اس سے یہودیوں نے یہ سمجھا کہ یہ شخص خدا ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے چنانچہ لکھا ہے اس فقرہ پر) یہودیوں نے اسے سنگسار کرنے کے لئے پھر پتھر اٹھائے یسوع نے انہیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں۔ ان میں سے کس کام کے سبب سے مجھے سنگسار کرتے ہو (یعنی مسیحؑ نے ان سے کہا کہ میں لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو۔ میں لوگوں کو حلم اور عفو کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو۔ میں لوگوں کو محبت الٰہی اور خدا ترسی کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو میں بنی نوع انسان کی خود بھی خدمت کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی خدمت کرنے کی تعلیم دیتا ہوں کیا تم اس وجہ سے مجھے سنگسار کرتے ہو جو کام خدا تعالیٰ نے میرے سپرد کئے ہیں ان میں سے بہتیرے کام میں نے کئے ہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میرا کون سا جرم ہے جس کی وجہ سے تم مجھے سنگسار کرنا چاہتے ہو؟) یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب سے تجھے سنگسار کرتے ہیں (یعنی خدمت خلق اور غریبوں سے اچھا سلوک اور حلم اور عفو کی تعلیم اور رحم دلی یہ چیزیں نہیں جن کی وجہ سے ہم تجھے سنگسار کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہمارے سنگسار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اپنی زبان سے کفر کا کلمہ نکالا ہے) اور اس لئے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے (یعنی تو نے انسان ہو کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں خدا ہوں اس لئے ہم تجھے سنگسار کریں گے) یسوع نے انہیں جواب دیا کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ میں نے کہا تم خدا ہو (یعنی کیا بائبل میں یہ بات درج نہیں کہ خدا نے اپنے بندوں کو خدا کہا ہے؟) جبکہ اس نے انہیں خدا کہا جن کے پاس خدا کا کلام آیا اور **کتاب مقدس کا باطل**

ہونا ممکن نہیں۔ آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے اس لئے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں؟ (حضرت مسیح کہتے ہیں تمہارے لئے بائبل میں خدا کا لفظ بولا گیا ہے مگر تم خدا نہیں ہو گئے نہ تم اس لفظ کی وجہ سے کافر بن گئے لیکن میرے لئے صرف بیٹے کا لفظ بولا گیا ہے اور تم کہتے ہو کہ میں کافر ہوں۔ جب مجھ سے پہلے لوگوں کے لئے خدا کا لفظ استعمال ہوا اور وہ کافر نہ ہوئے بلکہ یہ سمجھا گیا کہ یہ ایک استعارہ ہے جو استعمال کیا گیا ہے تو میرے لئے بیٹے کے لفظ کا استعمال کون سا قہر ہو گیا کہ تم نے مجھے کافر قرار دے دیا۔ یہاں حضرت مسیحؑ نے صاف طور پر اقرار کیا ہے کہ بائبل میں جو ان کے متعلق بیٹے کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ بیٹے کے معنوں میں نہیں کیونکہ دوسروں کی نسبت خدا کا لفظ آیا ہے مگر تم یہ کبھی نہیں کہتے کہ وہ واقعہ میں خدا بن گئے تھے جب تم انہیں مشرک نہیں کہتے جب تم اس لفظ کے باوجود انہیں خدائی کا دعویٰ کرنے والے قرار نہیں دیتے تو مجھے کیوں کہتے ہو کہ میں نے یہ لفظ استعمال کر کے خدائی کا دعویٰ کر دیا ہے اور اس وجہ سے میں کافر اور سنگسار کئے جانے کے قابل ہوں) اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو (یعنی لفظی ہیر پھیر اور شرارتوں سے کام لینے کا کیا فائدہ؟ سوال یہ ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کے جلال کے اظہار کے لئے کرتا ہوں یا اس کے خلاف کرتا ہوں۔ موحدوں والے کرتا ہوں یا مشرکوں والے کرتا ہوں اگر میں تمام کام موحدوں والے کرتا ہوں تو الہام میں اگر میرے متعلق خدا تعالیٰ نے بیٹے کا لفظ استعمال کیا ہے تو بہر حال اس کے کچھ اور معنے کرنے پڑیں گے اور ضروری ہو گا کہ اس بارہ میں کسی نتیجہ پر پہنچنے سے قبل میرے کاموں کو دیکھا جائے) لیکن اگر میں کرتا ہوں تو گو میرا یقین نہ کرو مگر ان کاموں کا تو یقین کرو تا کہ تم جانو اور سمجھو کہ باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں۔ انہوں نے پھر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔''

(یوحنا باب ۱۰ آیت ۲۵ تا ۳۹)

اس حوالہ سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ نے خود اپنے بیٹا ہونے کے معنے کر دیئے ہیں اور بتایا ہے کہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو میری مراد یہ نہیں ہوتی کہ واقعہ میں خدا کی خدائی مجھ میں آ گئی ہے یا میں بھی ایک خدا ہوں۔ بلکہ جس طرح بائبل میں دوسرے لوگوں کے متعلق آتا ہے کہ وہ خدا ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خدا نہیں بن گئے بلکہ یہ ایک استعارہ تھا جو استعمال ہوا۔ اسی طرح جب میں اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا ہوں تو یہ بھی ایک

استعارہ ہوتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ میں واقعہ میں خدا بن گیا ہوں۔

اس حوالہ میں یہود کی شریعت کی طرف جو اشارہ کیا گیا ہے وہ ہمیں زبور میں ملتا ہے زبور باب ۸۲ میں آتا ہے۔

''خدا کی جماعت میں خدا موجود ہے وہ الٰھوں نے کے درمیان عدالت کرتا ہے (یعنی مومن لوگ خدا ہیں اور ان خداؤں کے درمیان وہ عدالت کرتا ہے) تم کب تک بے انصافی سے عدالت کرو گے۔ اور شریروں کی طرف داری کرو گے غریب اور یتیم کا انصاف کرو۔ غمزدہ اور مفلس کے ساتھ انصاف سے پیش آ ؤ۔ غریب اور محتاج کو بچاؤ۔ شریروں کے ہاتھ سے ان کو چھڑاؤ۔ وہ نہ تو کچھ جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں وہ اندھیرے میں ادھر ادھر چلتے ہیں زمین کی سب بنیادیں ہل گئی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تم اِلٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو تو بھی تم آدمیوں کی طرح مرو گے اور امراء میں سے کسی کی طرح گر جاؤ گے۔ اے خدا اٹھ زمین کی عدالت کر۔ کیونکہ تو ہی سب قوموں کا مالک ہوگا۔''

(زبور باب ۸۲ آیت ۱ تا ۸)

حضرت داؤدؑ کے انہی کلمات کی طرف حضرت مسیحؑ اوپر کے حوالہ میں اشارہ کرتے ہیں۔ اس میں ایک تو یہ آیت ہے کہ

''وہ الٰھوں کے درمیان عدالت کرتا ہے'' اور پھر آیت ۶ اور ۷ تو بالکل واضح ہیں یعنی یہ کہ

''میں نے کہا تھا کہ تم اِلٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔''

اس جگہ حضرت داؤدؑ یہ کہتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل تم سب الٰہ ہو۔ تم سب خدا ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ باوجود اس کے کہ میں نے تمہیں خدا کہا ہے اور خدا کا بیٹا بھی کہا ہے تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ چونکہ تم نہ اصلی خدا ہو اور نہ اصل میں خدا کے بیٹے ہو۔ اس لئے تم آدمیوں کی طرح مرو گے۔ یعنی خدا تو مرتا نہیں لیکن تم موت سے نہیں بچو گے۔ تمہیں خدا اور خدا کا بیٹا اس لئے کہا گیا ہے کہ تم دنیا میں خدا کی طرح انصاف قائم کرو گے اور خدا تعالیٰ کے قوانین لوگوں میں جاری کرو گے پس چونکہ تم دنیا میں خدا کے مظہر ہو گے اس لئے استعارۃً تمہیں کبھی خدا اور خدا کا بیٹا کہہ دیا گیا ہے۔

بعض لوگ جو اس بات کے قائل ہیں کہ انبیاء کے دلی خیالات کا نام ہی الہام ہوتا ہے وہ اس کتاب کو داؤد کی زبور کہتے ہیں۔ لیکن ہم قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق اسے خدا تعالیٰ کا الہام سمجھتے ہیں اور ہمارے نقطہ نگاہ سے

حضرت داؤد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سے یہ بتایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل خدا اور خدا کے بیٹے ہیں لیکن آگے تشریح کر دی گئی ہے کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ واقعہ میں خدا یا خدا کے بیٹے بن جائیں گے۔ بلکہ خدا اور خدا کے بیٹے کہلانے کے باوجود یہ مریں گے بھی یہ کھائیں گے بھی یہ پہنیں گے بھی صرف اس لئے ان کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا ہے کہ یہ دنیا میں انصاف قائم کریں گے اور خدا تعالیٰ کے احکام پر لوگوں کو چلائیں گے حضرت داؤدؑ بنی اسرائیل کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا نے تم کو اپنا نام دیا ہے۔ خدا نے تم کو اپنا بیٹا قرار دیا ہے تم کو بھی چاہیے کہ اس نام کی وجہ سے اپنے کردار کا جائزہ لو۔ غریبوں سے انصاف کرو۔ کمزوروں کو اٹھاؤ۔ ستم رسیدوں پر رحم کرو۔ عفو اور درگزر سے کام لو اور خدائی صفات اپنے اندر پیدا کرو۔

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا تو ان معنوں میں نہیں کہا تھا کہ سچ مچ اپنے آپ کو خدا کا بیٹا سمجھتا تھا کیونکہ اپنے قول کے مطابق وہ اپنے آپ کو اسی طرح خدا تعالیٰ کا بیٹا سمجھتا تھا جس طرح داؤد نے بنی اسرائیل کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔ اسی طرح بائبل میں اور کئی مقامات پر مختلف لوگوں کے متعلق خدا یا خدا کے بیٹے کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں پس جن معنوں میں وہ خدا اور خدا کے بیٹے تھے انہی معنوں میں حضرت مسیح نے بھی اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہا۔

عیسائیوں کی طرف سے عام طور پر یہ دھوکا دیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کو خدا یا خدا کا بیٹا اور معنوں میں کہا گیا ہے لیکن یوحنا کا حوالہ صاف بتاتا ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو انہی معنوں میں خدا کا بیٹا کہتا تھا جن معنوں میں پہلے لوگوں کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا تھا۔ اگر اور معنے ہوتے تو حضرت مسیحؑ کی دلیل باطل ہو جاتی ہے حضرت مسیحؑ یہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو بے شک خدا کا بیٹا کہا ہے لیکن بیٹا کہنے سے میں خدائی کا مدعی نہیں بن جاتا۔ کیونکہ پہلے لوگوں کو بھی خدا اور خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسیحؑ کا دعویٰ اور قسم کا تھا تو یہ دلیل باطل ہو جاتی ہے یہودی کہہ سکتے تھے کہ پہلے لوگوں کو اور رنگ میں خدا کا بیٹا کہا گیا ہے مگر تم اپنے آپ کو اور رنگ میں خدا کا بیٹا کہتے ہو۔ مگر مسیح کا اس حوالہ کو پیش کرنا صاف بتاتا ہے کہ مسیح اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جن معنوں میں پہلے لوگوں کو خدا یا خدا کا بیٹا کہا گیا ہے انہی معنوں میں میں بھی خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی ہوں اور جب مسیحؑ انہی معنوں میں خدا کے بیٹے ہوئے جن معنوں میں پہلے لوگ خدا کے بیٹے تھے تو کفارہ دینے کا حق جیسے مسیح کو حاصل تھا ویسے ہی تمام اسرائیلی نبیوں کو اور ان کے مخلص مومنوں کو حاصل تھا اور اگر ان کو یہ حق حاصل نہیں تھا تو مسیحؑ کو بھی نہیں تھا کیونکہ کفارہ کی بنیاد مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے پر ہے اور میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ مسیح بیٹا کہلانے میں منفرد نہیں بلکہ سینکڑوں انبیاء اور ہزاروں لاکھوں

مومنوں کو بھی بائبل میں خدا کا بیٹا کہا گیا ہے۔

یہاں تک تو اس بات کا ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ مسیحؑ کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خدا کا بیٹا ہونے کا مدعی تھا اور اسی لئے وہ کفارہ ہوا یہ بائبل کی رو سے درست نہیں بے شک وہ بیٹا ہونے کا مدعی تھا مگر انہی معنوں میں جن معنوں میں پہلے لوگ خدا کے بیٹے کہلائے اور پھر وہ اس کے ساتھ ہی ابن آدم ہونے کا بھی مدعی تھا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسیحؑ کا ابن آدم ہونا اصل حقیقت تھی یا اس کا ابن اللہ ہونا اصل حقیقت ہے اور اس کے لئے ہم پھر اس کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

میں نے بتایا ہے کہ مسیحؑ نے یہ تسلیم کیا ہے۔ کہ میں انہی معنوں میں خدا کا بیٹا ہوں جن معنوں میں بنی اسرائیل خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے اور جب مسیحؑ کے اپنے قول سے یہ بات ثابت ہوگئی۔ تو معلوم ہوا کہ اگر مسیح کو کفارے کا حق حاصل تھا تو ان کو بھی حاصل تھا اور اگر ان کو حاصل نہیں تھا تو مسیحؑ کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اب ہم ایک اور طرح اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ دنیا میں جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو اس کا اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہنا استعارۃً بھی ہوسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ واقعہ میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دے رہا ہو۔ اور چونکہ یہ دونوں امکان موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے فیصلہ کے لئے ہمیں بہرحال کوئی نہ کوئی رستہ نکالنا پڑے گا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بعض دفعہ کسی شخص کے متعلق ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ شیر ہے اور کسی کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ باز ہے لیکن ہم اصلی شیر کو بھی شیر ہی کہتے ہیں ہم اپنے بچہ کو چڑیا گھر لے جاتے ہیں تو ایک جانور جو پنجرہ میں بند ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ کر کے ہم کہتے ہیں یہ شیر ہے اور دوسری طرف ہمارے سامنے اگر کوئی بڑا بہادر اور دلیر انسان بیٹھا ہو تو اس کے متعلق بھی ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ شیر ہے اب سوال یہ ہے کہ بچہ کس طرح پہچانتا ہے کہ وہ شیر اور ہے اور یہ شیر اور ہے؟ بہرحال کوئی پہچان ہونی چاہیے جو اس فرق کو واضح کر سکے اور وہ پہچان اسی طرح ہوتی ہے کہ بچہ نے جو نیچرل ہسٹری کی کتابیں پڑھی ہوئی ہوتی ہیں ان میں یہ لکھا ہوتا ہے کہ شیر کے پنجے ہوتے ہیں دم ہوتی ہے منہ اس طرح ہوتا ہے شکل اس طرح ہوتی ہے پس جب ہم کسی انسان کو شیر کہہ دیتے ہیں اور بچہ دیکھتا ہے کہ اس کی دم نہیں۔ اس کے پنجے نہیں اس کی شکل آدمیوں کی سی ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اسے شیر استعارہ کے طور پر کہا گیا ہے اور جب ہم چڑیا گھر کے شیر کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ وہی شیر ہے جس کی کتابوں میں تصویریں آتی ہیں۔ اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص خدا کا بیٹا تھا اور ہم استعارۃً کلام کرتے ہیں ہماری مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ حقیقتاً خدا ہے یا خدا کا بیٹا ہے تو اس وقت ہمارا سامع یہ کس طرح فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کو ہم نے جو خدا یا

خدا کا بیٹا کہا ہے تو ہماری مراد استعارہ ہے حقیقت نہیں اس کے لئے بہرحال کوئی نہ کوئی معیار ہونا چاہیے تا کہ لوگوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ جیسے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ (الفتح:۱۱) اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ تیری بیعت نہیں کرتے بلکہ خدا کی بیعت کرتے ہیں یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہاتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوتا تھا خدا کا ہاتھ نہیں ہوتا تھا اب اس آیت کے باوجود ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نہیں مانتے کیوں نہیں مانتے؟ اس لئے کہ قرآن کریم نے بعض اور مقامات پر خدا تعالیٰ کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کھاتا پیتا نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھاتے پیتے تھے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اونگھ بھی آتی تھی اور نیند بھی آتی تھی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بیوی کی ضرورت نہیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں تھیں۔ گویا وہ باتیں جو خدا میں نہیں ہوتیں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھیں اور وہ باتیں جو خدا میں ہوتی ہیں وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ پس جب خدا نے کہا اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ تو ہم نے سمجھ لیا کہ یہ استعارہ ہے۔ یہ مراد نہیں کہ آپ واقعہ میں خدا بن گئے تھے۔ چنانچہ ہمارا عقیدہ اور دنیا کے تمام مسلمانوں کا عقیدہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہی ہے کہ آپ بشر تھے سوائے بعض جہلاء کے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر قرار نہیں دیتے۔

تھوڑا ہی عرصہ ہوا ایک دوست مجھ سے ملنے کے لئے آئے وہ ان پڑھ تھے مگر قرآن کریم کی آیتیں بہت صاف پڑھتے تھے میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ جس دوست کے ذریعہ مجھے احمدیت میں داخل ہونے کی توفیق ملی ہے وہ قرآن کریم نہایت اچھا پڑھتے تھے ان کے پاس رہنے کی وجہ سے میری زبان بھی صاف ہوگئی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ میں ایک دفعہ اپنے بعض رشتہ داروں کے پاس گیا اور انہیں میں نے کہا کہ دیکھو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (حم السجدۃ:۷)

میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ اس پر وہ کہنے لگے دیکھو میاں یہ اچھی طرح سن لو تم ہمارے رشتہ دار ہو اس لئے ہمیں یہ اچھا نہیں لگتا کہ ہم تمہیں ماریں لیکن اب تم چپ کر کے یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ یہ بات ہم نے کبھی نہیں سنی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آدمی ہیں آج تم نے یہ بات بھی کہہ دی تو بعض جہلاء اس قسم کے بھی

ہیں لیکن مسلمانوں کا سمجھدار طبقہ ہمیشہ سے یہی تسلیم کرتا چلا آیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گو تمام انسانوں کے سردار ہیں۔ تمام نبیوں کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے محبوب اور پیارے ہیں۔ لیکن بہر حال وہ انسان ہیں پس مسیح جب کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ وہ باتیں جو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں کیا وہ ان کا مدعی ہے؟

جہاں تک کھانے پینے کا سوال ہے عیسائی یہ کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ مسیحؑ انسانی بھیس میں آیا تھا اس لئے وہ کھاتا پیتا تھا۔ ہم اس بحث میں نہیں پڑتے لیکن کم از کم جو روحانی باتیں ہیں وہ تو خدا میں رہے گی یہ تو نہیں کہ خدا اس دنیا میں آ کر وہ کمالات بھی بھول جائے گا جو خدا ہونے کی حیثیت سے اس میں پائے جانے چاہئیں۔ مرقس باب ۱۰ آیت ۱۷۔ ۱۸ میں لکھا ہے۔

''اور جب وہ باہر نکل کر راہ میں جا رہا تھا تو ایک شخص دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اس سے پوچھنے لگا کہ اے نیک استاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔ یسوع نے اس سے کہا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔''

پہلی صفت خدا تعالیٰ کی اس کا نیک ہونا ہے کیونکہ عیب دار خدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن پہلی ہی صفت جو خدا میں پائی جانی ضروری ہے مسیح اس سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا''

میں اس جگہ دوستوں کو ہوشیار کر دینا چاہتا ہوں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتراضات سن کر عیسائیوں نے اب بعض مقامات سے بائبل کو بدل ڈالا ہے۔ مثلاً اسی واقعہ کو متی میں اب اس طرح درج کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح نے اسے یہ جواب دیا کہ ''تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے'' (متی باب ۱۹ آیت ۱۷)

حالانکہ انگریزی بائیبلیں جو انگلستان میں چھپی ہوئی ہیں اور بائبل کے وہ اردو ایڈیشن جو ۱۹۱۰ء سے پہلے کے ہیں۔ ان سب میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے اسے یہ جواب دیا کہ

''تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے؟ نیک تو کوئی نہیں، مگر ایک یعنی خدا''

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعتراض کیا کہ تم کہتے ہو کہ مسیحؑ خدا کا بیٹا تھا اس لئے وہ کفارہ ہو گیا۔ حالانکہ یہ حوالہ صاف بتا رہا ہے کہ مسیح خدا نہیں تھا کیونکہ وہ تو اپنے نیک ہونے سے بھی انکار کر رہا ہے اور جب وہ خدا نہیں تھا تو کفارہ کس طرح ہوا۔ گویا ایک طرف اس سے کفارہ باطل ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس سے توحید ثابت

ہوتی ہے (جنگ مقدس روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۱۳۶)۔عیسائیوں کو اور تو کوئی جواب نہ سوجھا۔انہوں نے بائبل کے نئے اردو ایڈیشنوں میں ان الفاظ کی بجائے یہ الفاظ لکھ دیئے کہ:۔

’’تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے‘‘

گویا یہ ظاہر کیا کہ حضرت مسیح نے اسے یہ جواب دیا تھا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں سوال کر رہا ہے نیک تو صرف خدا ہے حالانکہ تمام انگریزی بائبلوں میں اور تمام یونانی اور جرمن بائبلوں میں اور اردو کی تمام پرانی بائبلوں میں یہ الفاظ تھے کہ ’’تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا‘‘ اس قسم کی سترہ اٹھارہ تبدیلیاں ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعتراضات کے نتیجہ میں عیسائیوں نے بائبل میں کی ہیں۔بہر حال کہنے والے نے یہی کہا کہ اے نیک استاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔اور حضرت مسیحؑ نے اسے کہا کہ

’’تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا‘‘

اس حوالہ سے دو باتیں نکل آئیں۔اول خدا میں نیکی ہے کیونکہ بغیر نیکی کے وہ خدا ہی نہیں ہوسکتا دوم مسیحؑ میں نیکی نہیں اور ان دو باتوں کا یہ لازمی نتیجہ نکل آیا کہ چونکہ مسیح میں نیکی نہیں اس لئے وہ خدا نہیں۔

اسی طرح متی باب ۲۴ آیت ۳۲ تا ۳۷ میں لکھا ہے:۔

’’اب انجیر کے درخت سے ایک تمثیل سیکھو جونہی اس کی ڈالی نرم ہوتی اور پتے نکلتے ہیں تم جان لیتے ہو کہ گرمی نزدیک ہے اسی طرح جب تم ان سب باتوں کو دیکھو تو جان لو کہ وہ نزدیک بلکہ دروازہ پر ہے (یعنی مسیح کی آمد ثانی) میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ سب باتیں نہ ہولیں یہ نسل ہرگز تمام نہ ہوگی آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں ہرگز نہ ٹلیں گی لیکن اس دن (یعنی مسیح کی آمد ثانی کے دن) اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر صرف باپ۔‘‘

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مسیح اپنے عالم الغیب ہونے سے انکار کرتا ہے حالانکہ خدا تعالیٰ کی ایک صفت اس کا عالم الغیب ہونا بھی ہے پس جب مسیح کہتا ہے کہ میں علم غیب نہیں جانتا اور مستقبل کے حالات کا مجھے علم نہیں۔تو دوسرے الفاظ میں وہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ جب میں اپنے آپ کو خدا کا بیٹا کہتا ہوں تو میں حقیقتاً نہیں کہتا بلکہ صرف استعارۃً کہتا ہوں۔یعنی میری مراد صرف اتنی ہوتی ہے کہ میں خدا کا پیارا ہوں۔

اسی طرح انجیل میں خدائے واحد کے لفظ پر بھی زور دیا گیا ہے۔یوحنا باب ۵ آیت ۴۴ میں لکھا ہے۔

’’تم جو ایک دوسرے سے عزت چاہتے ہو اور وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے ہوتی ہے

نہیں چاہتے کیونکر ایمان لا سکتے ہو۔‘‘

عیسائیت ہمارے سامنے تثلیث پیش کرتی ہے لیکن مسیح صاف طور پر خدائے واحد کا لفظ استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے تم جو ایک دوسرے سے عزت چاہتے ہو اور وہ عزت جو خدائے واحد کی طرف سے ہوتی ہے نہیں چاہتے کیونکر ایمان لا سکتے ہو۔

اسی طرح یوحنا باب ۱۷ آیت ۳ میں لکھا ہے:۔

’’اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔‘‘

یہاں سے ایک اور بات بھی ثابت ہوئی۔ پہلا حوالہ جو یوحنا باب ۵ کا تھا اس کا ایک بودہ سا جواب مسیحی دے سکتے تھے اور وہ یہ کہ جب ہم خدائے واحد کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری مراد اقنوم ثلاثہ سے ہوتی ہے جس میں خدا باپ بھی شامل ہے خدا بیٹا بھی شامل ہے اور خدا روح القدس بھی شامل ہے اور وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ ’’تین ایک ہیں اور ایک تین‘‘

پس وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی تین کو ایک سمجھتے ہیں اور خدائے واحد سے مراد خدا باپ، خدا بیٹا اور خدا روح القدس کا مجموعہ ہے۔ اس جواب کو یوحنا کے اوپر کے حوالہ نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہاں مسیح کا ذکر خدائے واحد سے الگ کر کے کیا گیا ہے۔

الفاظ یہ ہیں:۔

’’اور ہمیشہ کی زندگی یہی ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔‘‘

اس جگہ خدائے واحد کی جو اصطلاح استعمال کی گئی ہے اس میں مسیح شامل نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مسیح سے علیحدہ ہو کر خدائے واحد بنتا ہے اس کے ساتھ مل کر نہیں اور توحید اسی کا نام ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے نہ بیٹے کو نہ روح القدس کو اور نہ کسی اور کو۔

غرض اس حوالہ نے بھی بتا دیا کہ بیٹے کا لفظ ایک استعارہ تھا جو مسیح کے متعلق استعمال کیا گیا تھا اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ وہ خدا کا شریک تھا بلکہ یہ ویسا ہی ایک پیار کا کلمہ تھا جیسے مائیں اپنے بیٹے کو کہتی ہیں کہ یہ میرا بیٹا میرے جگر کا ٹکڑہ اور میرا دل ہے جس طرح بندوں کو حق حاصل ہے کہ وہ پیار میں اس طرح کلام کریں اسی طرح خدا کو بھی حق

حاصل ہے کہ وہ اپنے بندوں سے پیار اور محبت کی گفتگو کرے۔ دنیا میں بسا اوقات اپنے کسی عزیز یا دوست کے بچہ کو جب انسان دیکھتا ہے تو کہہ دیتا ہے تو میرا بچہ ہے اب یہ تو نہیں ہوتا کہ وہ بعد میں ورثہ کا دعویٰ کر دے اور کہے فلاں فلاں اس بات کے گواہ ہیں کہ اس نے ان کے سامنے مجھے اپنا بچہ قرار دیا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ محبت اور پیار کے الفاظ ہوتے ہیں اسی طرح مائیں اپنے بچوں کا ذکر کرتی ہیں تو کہتی ہیں۔ ہائے میرا کلیجہ۔ ہائے میرا دل۔ ہائے میری آنکھوں کی ٹھنڈک۔ اب اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ وہ بچہ سچ مچ ان کا کلیجہ یا دل یا آنکھیں ہوتا ہے یا عورت مر جائے تو ساتھ ہی بچے کو بھی دفن کر دیا جائے اور کہا جائے کہ یہ بچہ تو ہے ہی نہیں۔ یہ تو اس عورت کا کلیجہ یا دل تھا۔ کیا دنیا میں کبھی کسی نے ایسی حماقت کی ہے ہر شخص جانتا ہے کہ یہ محبت اور پیار کے الفاظ ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے الفاظ خدا تعالیٰ بھی اپنے پیاروں کے متعلق استعمال کر لیتا ہے اور بعض دفعہ ان کو اپنا بچہ کہہ دیتا ہے جیسے اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا یا جیسے اس نے اور کوئی نبیوں کو کہا پس کسی کو بیٹا کہنے کے یہ معنے نہیں کہ اب خدائے واحد نہیں رہا یا نعوذ باللہ دو یا تین خدا ہو گئے ہیں۔

غرض یہ حوالہ بھی بتاتا ہے کہ مسیحؑ کے نزدیک خدا اور ہے اور وہ اور۔ چنانچہ خدائے واحد کے وجود کا الگ ذکر کیا گیا ہے اور مسیح کا الگ ذکر کیا گیا ہے اگر مسیح خدا ہوتا تو اس کے علیحدہ ذکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خدائے واحد میں باپ خدا بھی آجاتا، بیٹا خدا بھی آجاتا اور روح القدس خدا بھی آجاتا۔ مگر اسے خدائے واحد سے الگ کیا گیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے وجود میں شامل نہیں پس ان حوالوں سے ثابت ہوا کہ جب مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا تو اس سے مراد حقیقتاً بیٹا نہ تھا بلکہ اسے استعارہ کے طور پر بیٹا کہا گیا تھا۔

پھر مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ مسیح خدا کی طرح بے جسم ہے (یوحنا باب ۱۴ آیت ۱) جب وہ اس دنیا میں آیا تو اس نے لوگوں کے لئے جسم اختیار کیا ورنہ خدا کے بیٹے کا کوئی جسم نہیں جیسے باپ خدا کا کوئی جسم نہیں یا جیسے روح القدس خدا کا کوئی جسم نہیں۔ اسی طرح بیٹے کا بھی کوئی جسم نہیں۔ جب وہ اس دنیا میں آیا تا کہ بنی نوع انسان کے گناہوں کی خاطر صلیب پر لٹک جائے تو اس نے اپنے لئے ایک جسم اختیار کر لیا۔ گویا جسم اختیار کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بنی نوع انسان کے بدلہ میں پھانسی پر لٹک جائے اور ایک دفعہ موت اختیار کرے کیونکہ موت کو گناہ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے جب مسیح نے دوسروں کا گناہ اٹھا لیا تو اس پر موت آنی لازمی تھی۔ مگر جب موت آ گئی تو اس کے بعد وہ سکیم جو بنی نوع انسان کے گناہ معاف کرانے کے لئے اختیار کی گئی تھی ختم ہو گئی۔ اب اگر عیسائیوں کا یہ دعویٰ صحیح ہے تو ضروری تھا کہ مسیحؑ جب دوبارہ زندہ ہوا تو اس کے ساتھ اس کا جسم نہ ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی غرض پوری ہو چکی تھی۔

بنی نوع انسان کے گناہ معاف ہو چکے تھے اور اب بیٹے کے تجسم کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ ویسا ہی کامل ہو چکا تھا جیسے خدا کا باپ کامل ہے مگر انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ صلیب کے واقعہ کے بعد بھی جب ان کے نزدیک مسیح دوبارہ زندہ ہوا مسیح کے ساتھ اس کا جسم تھا اور وہ اسی جسم سمیت آسمان پر گیا یا بعض دوسری روایتوں کے مطابق اسی جسم کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر جا کر غائب ہو گیا۔ گویا صرف یہی نہیں کہ انجیل کے رو سے مسیح قبر میں سے جسم لے کر نکلا۔ حالانکہ اسے جسم کے ساتھ نکلنا نہیں چاہیے تھا۔ بلکہ وہ آسمان پر بھی اس جسم کو لے گیا۔ حالانکہ اب جسم کے کوئی معنے ہی نہیں تھے۔ جب تک وہ دنیا میں نہیں آیا تھا اس کا کوئی جسم نہیں تھا پھر عارضی طور پر اس نے بنی نوع انسان کے گناہوں کو اپنے اوپر لینے کے لئے جسم اختیار کیا۔ اس کے بعد جب وہ غرض پوری ہو چکی تو لازماً اس کے ساتھ اس کا جسم نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر انجیل بتاتی ہے کہ دوبارہ جی اٹھنے کے بعد بھی وہ جسم سمیت اٹھا اور پھر آسمان پر بھی جسم سمیت گیا۔ اس طرح اس کی خدائی کی ساری عمارت گر جاتی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ مسیحؑ جو عیسائیوں کے نزدیک خدا باپ کے برابر ہے۔ وہ اب تک اسی جسم کے ساتھ آسمان پر بیٹھا ہوا ہے اور اس قید کے ساتھ مقید ہے۔ اور پھر انجیل میں یہ بھی کوئی ذکر نہیں کہ وہ کب اس جسم سے الگ ہو گا بلکہ انجیل سے تو یہ ظاہر ہے کہ جب وہ دوبارہ آئے گا تب بھی اسی جسم کے ساتھ آئے گا۔ کیونکہ لکھا ہے جب وہ آئے گا تو

''اس وقت لوگ ابن آدم کو بڑی قدرت اور جلال کے ساتھ بادلوں میں آتے دیکھیں گے۔''

(یعنی اس کا دعویٰ آسانی کے ساتھ نہیں پہچانا جائے گا بلکہ کسی قسم کے شکوک وشبہات بھی اس کے متعلق پیدا کئے جائیں گے) (مرقس باب ۱۳ آیت ۲۶)

گویا انجیل یہ بتاتی ہے کہ دوبارہ بھی لوگ اسی جسم کے ساتھ مسیح کو آسمان سے اترتا دیکھیں گے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اب دوبارہ مسیح پر موت نہیں آسکتی۔ کیونکہ پہلی موت اس پر کفارہ کے لئے آئی تھی جب وہ کفارہ ہو چکا تو اب دوسری موت کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ یا تو عیسائیوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ مسیحؑ اب ہمیشہ کے لئے جسم کی قید میں رہے گا اور وہ اس سے کبھی رہائی حاصل نہیں کر سکتا اور یا انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ وہ تھیوری جو ان کے تجسم کے متعلق انہوں نے پیش کی تھی وہ باطل ہے کیونکہ اگر یہ تھیوری درست ہوتی تو صلیب کے واقعہ کے بعد انہیں جسم سے آزاد ہو جانا چاہیے تھا مگر بجائے آزاد ہونے کے وہ بائبل کے رو سے اسی جسم کے ساتھ زندہ ہوئے اور اسی جسم کے ساتھ آسمان پر چلے گئے۔

پھر عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ مسیحؑ کفارہ ہو گیا ہے اس دعویٰ کے ثابت کرنے سے پہلے یہ سوال حل کرنا بھی

ضروری ہے کہ کیا مسیح کفارہ پر راضی تھا ساری دلیل کفارہ کی یہی ہے کہ خدا لوگوں کے گناہ معاف نہیں کرسکتا اور چونکہ وہ معاف نہیں کرسکتا اس لئے اس نے بنی نوع انسان کے گناہوں کا کفارہ مسیح کو سزا دے کر قبول کرلیا۔ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر زید مقروض ہے اور بکر اس کا قرضہ ادا کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے تو زید کا قرضہ اتر جاتا ہے بنی نوع انسان گناہ کر کے خدا تعالیٰ کے مقروض ہوگئے ہیں اور وہ بوجہ عادل ہونے کے ان کو معاف نہیں کرسکتا کیونکہ ان کے خیال میں عدل اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ گنہگار کو ضرور سزا دی جائے۔پس اس کا علاج اس نے یہ کیا کہ اپنے بیٹے سے لوگوں کا قرضہ وصول کرلیا۔فرض کرو یہ بات ٹھیک ہے۔اگرچہ گناہ روپیہ کی طرح نہیں بلکہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی کو سرطان کا پھوڑا نکلا ہوا ہو۔ایسے شخص کے متعلق اگر دس ہزار لوگ بھی یہ کہیں کہ یہ پھوڑا اسے نہیں نکلا ہوا بلکہ ہمیں نکلا ہوا ہے اور ہم اس کی تکلیف اٹھانے کے لئے تیار ہیں تو وہ اس کی تکلیف کو نہیں اٹھا سکتے۔اسی طرح دنیا میں اور کئی چیزیں ہیں جن کا بدلہ نہیں دیا جاسکتا اور گناہ بھی انہیں چیزوں میں سے ہے لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ گناہ کا بدلہ دیا جاسکتا ہے اور عیسائیوں کی بات درست ہے۔تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی کے قرض کے بدلہ میں دوسرے سے زبردستی روپیہ چھین لینا جائز ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر الف کا قرضہ ب اپنی مرضی سے ادا کردے تو ایسا کرسکتا ہے لیکن اگر الف کا قرضہ ہم معاف نہ کریں اور ب کی جیب سے جبراً روپیہ نکال لیں تو ہم نے انصاف ہی نہیں کیا بلکہ ظلم کیا۔انصاف اس لئے نہیں کیا کہ ہم نے اس سے قرض وصول نہیں کیا جس سے وصول کرنا چاہیے تھا اور ظلم اس لئے کیا کہ ہم نے جبر سے کام لیا اور دوسرے کی جیب سے زبردستی روپیہ نکال لیا۔پس اگر مسیح لوگوں کے گناہوں کا قرض ادا کرنے پر راضی ہو اور باقی باتیں بھی ثابت ہوجائیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ وہ کفارہ ہوگیا۔لیکن اگر باقی باتیں مسیحیت ثابت بھی کردے جن کا ہم نے اوپر رد کیا ہے اور یہ ثابت نہ کرے کہ بنی نوع انسان کے گناہ کا بوجھ اپنی مرضی سے مسیح نے اٹھایا تو کفارے کا تمام گھروندا ختم ہوجاتا ہے کیونکہ جس کو کفارہ کے لئے پیش کیا گیا ہے وہ کفارہ دینے پر راضی نہیں تھا۔اس کے متعلق ہم انجیل کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارہ میں کیا بیان دیتی ہے۔

مرقس باب ۱۴ آیت ۳۲ تا ۴۲ میں لکھا ہے:۔

’’پھر وہ ایک جگہ آئے جس کا نام گتسمنی (Gethsemane) تھا اور اس نے (یعنی مسیح نے) اپنے شاگردوں سے کہا یہاں بیٹھے رہو جب تک میں دعا کروں۔اور پطرس اور یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر نہایت حیران اور بے قرار ہونے لگا (یعنی حضرت مسیح نے صرف تین ساتھی لئے اور علیحدگی میں دعا کرنے کے لئے چلا گیا) اور ان سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو (یعنی پہلے تو باقی

شاگردوں کو پیچھے چھوڑا تھا اور صرف تین شاگرد اپنے ساتھ لئے تھے لیکن پھر اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کی وجہ سے طبیعت میں حجاب پیدا ہو اور پوری طرح گریہ وزاری نہ ہو سکے اس نے انہیں بھی کہا کہ تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو) اور وہ تھوڑا آگے بڑھا اور زمین پر گر کر دعا کرنے لگا کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ پر سے ٹل جائے۔ (یعنی صلیب پر لٹکنا جس کے ذریعہ سے اس نے تمام بنی نوع انسان کے گناہ اٹھانے تھے اس کے متعلق اس نے یہ دعا کی کہ اے خدا یہ گھڑی مجھ سے ٹل جائے اور دشمن مجھے صلیب پر نہ لٹکا دے) اور کہا اے ابا اے باپ تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے اس پیالہ کو میرے پاس سے ہٹالے (ان الفاظ کے صاف معنے یہ ہیں کہ اسے مجبور کیا جا رہا تھا کہ وہ پھانسی پر لٹکے اپنی مرضی سے وہ پھانسی پر لٹکنے کے لئے تیار نہیں تھا پھر اس نے کہا) تو بھی جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں بلکہ جو تو چاہتا ہے وہی ہو (یعنی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ صلیب پر نہ لٹکوں اور کفارہ نہ بنوں۔ لیکن تو چاہتا ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں گویا مجھ سے زبردستی ایک کام لے رہا ہے اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی بینکر اس شخص سے تو قرضہ وصول نہ کرے جس نے روپیہ لیا اور بازار جاتے ہوئے کسی کی جیب سے زبردستی روپیہ نکال کر یہ سمجھ لے کہ اس کا قرضہ ادا ہو گیا ہے۔ مسیح صاف الفاظ میں کہتا ہے ''تو بھی جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں بلکہ جو تو چاہتا ہے وہی ہو'' یعنی میں تو نہیں چاہتا کہ صلیب پر لٹکوں لیکن اگر تو لٹکانا ہی چاہتا ہے تو مجھے منظور ہے) پھر وہ آیا اور انہیں سوتے پا کر پطرس سے کہا اے شمعون تو سوتا ہے کیا تو ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکا (پطرس کا اصل نام شمعون تھا مسیح نے اس کا نام پطرس رکھا جس کے معنے چٹان کے ہیں اور جس میں اس طرف اشارہ تھا کہ آئندہ زمانہ میں یہ شخص مسیحیت کے لئے چٹان ثابت ہوگا۔ مرقس باب ۳ آیت ۱۶) جاگو اور دعا کرو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے (یعنی چونکہ خدا کا منشاء ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں اس لئے میرا دل تو نہیں ڈرتا مگر جہاں تک بشریت کا تعلق ہے میرا جسم اپنی کمزوری محسوس کرتا ہے) وہ پھر چلا گیا اور وہی بات کہہ کر دعا کی (یعنی پھر یہی کہا کہ اے خدا میری مرضی صلیب پر لٹکنے کی نہیں لیکن اگر تو لٹکانا چاہتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں) اور پھر آ کر انہیں سوتے پایا کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں اور وہ نہ جانتے تھے کہ اسے کیا جواب دیں (غرض مسیح گھبراہٹ اور بے قراری میں بار بار آتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ میرے حواری اس مصیبت اور تکلیف کی گھڑی میں میرا ساتھ دے رہے ہیں یا نہیں۔ مگر وہ جب بھی آتے۔ حواریوں کو سویا ہوا پاتے) پھر تیسری بار آ کر ان سے کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ بس وقت آ پہنچا ہے دیکھو ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جاتا ہے دیکھو میرا پکڑوانے والا نزدیک آ پہنچا ہے۔''

اس حوالہ سے پتہ لگتا ہے کہ مسیحؑ اپنی مرضی سے ہرگز کفارہ نہیں ہوا۔ اس کی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح یہ پیالہ

ٹل جائے اور صلیب پر اسے نہ لٹکنا پڑے پس جو کچھ ہوا زبردستی ہوا۔

اس بارہ میں دوسری گواہی لوقا کی ہے اس میں لکھا ہے۔

’’پھر وہ نکل کر اپنے دستور کے موافق زیتون کے پہاڑ کو گیا اور شاگرد اس کے پیچھے ہو لئے اور اس جگہ پہنچ کر اس نے ان سے کہا دعا کرو کہ آزمائش میں نہ پڑو اور وہ ان سے بمشکل الگ ہو کر کوئی پتھر کا ٹپہ آگے بڑھا اور گھٹنے ٹیک کر یوں دعا کرنے لگا کہ اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے ہٹا لے تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو (گویا یہ انجیل بھی مانتی ہے کہ مسیح نے یہ کہا کہ میری مرضی تو اس میں نہیں لیکن اگر تیری مرضی مجھے صلیب پر لٹکانے کی ہی ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لو کہ میں تو قرضہ دینا نہیں چاہتا لیکن اگر تو چھیننا چاہتا ہے تو چھین لے) اور آسمان سے ایک فرشتہ اس کو دکھائی دیا وہ اسے تقویت دیتا تھا (یعنی خدا کو فرشتہ تقویت دیتا تھا یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گھوڑے کو کوئی چوہا بلکہ اس سے بھی کوئی چھوٹی چیز سہارا دے) پھر وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو کر اور بھی دلسوزی سے دعا کرنے لگا (گویا فرشتے کی تقویت بھی کام نہ آئی اور وہ اس دعا میں مشغول ہو گیا کہ کسی طرح یہ صلیب کی مصیبت مجھ سے ٹل جائے) اور اس کا پسینہ گویا خون کی بڑی بڑی بوندیں ہو کر زمین پر ٹپکتا تھا (حالانکہ وہ دن سخت سردی کے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا شمالی علاقہ میں مسیح رہتے تھے اور پھر اس وقت پہاڑی پر چڑھے ہوئے تھے مگر اس پریشانی کا ان پر اتنا اثر تھا کہ ایسی سخت سردی میں بھی دعا کرتے وقت ان کا پسینہ ٹپ ٹپ بہنے لگا اس دعا کے بعد وہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے چونکہ انسان کے لئے اپنا عیب بیان کرنا مشکل ہوتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ کہیں دشمن کوئی طعنہ نہ دے دے اس لئے یہاں لوقا نے ایک عجیب بات لکھ دی ہے مرقس نے تو صاف طور پر بیان کر دیا تھا کہ اس شدت گھبراہٹ میں مسیح بار بار اپنے شاگردوں کے پاس آتے اور کہتے کہ اٹھو اور دعا کرو مگر وہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے لیکن لوقا کو خیال آیا کہ یہ تو بڑی بدنامی کی بات ہے لوگ کیا کہیں گے کہ مسیح کے اچھے شاگرد تھے اتنی بڑی مصیبت میں بھی وہ نہ جاگ سکے اور باوجود اس کے مسیحؑ بار بار کہتے تھے کہ اٹھو اور دعا کرو وہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اس بدنامی کے دھبہ کو دور کرنے کے لئے لوقا لکھتا ہے) جب دعا سے اٹھ کر شاگردوں کے پاس آیا تو انہیں غم کے مارے سوتے پایا۔ (گویا شدت غم میں وہ بالکل سو رہے تھے) اور ان سے کہا تم سوتے کیوں ہو (لوقا کے

نزدیک اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تم غم کیوں کرتے ہو اور شدت غم میں تم کیوں سو رہے ہو۔ گویا غم میں انسان سویا کرتا ہے اور جب غم نہ ہو تو اٹھ کر دعا کیا کرتا ہے۔ صاف پتہ لگتا ہے کہ چونکہ لوقا کو یہ خیال آ گیا کہ پڑھنے والے کیا خیال کریں گے کہ یہ عجیب شاگرد تھے جو اتنی بڑی مصیبت میں بھی سوئے رہے اس لئے اس نے یہ الفاظ لکھ دئے کہ وہ حواری شدت غم میں سو رہے تھے مسیح نے ان سے کہا) اٹھ کر کہ دعا کرو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔'' (لوقا باب ۲۲ آیت ۳۹ تا ۴۶)

اس حوالہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ صلیب پر لٹکنا نہیں چاہتا تھا اور کفارہ کی ساری بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ مسیح اپنی مرضی سے لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں صلیب پر لٹکا۔ جب وہ اپنی مرضی سے صلیب پر ہی نہیں لٹکا تو کفارہ کس طرح ہوا۔؟

بعض دفعہ عیسائی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں مسیح نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ ''تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو'' ہم کہتے ہیں ٹھیک ہے ایک نبی سے یہ کب امید ہوسکتی ہے کہ خدا چاہے اور وہ نہ چاہے مسیح نے بھی جب دیکھا کہ خدا کی مرضی اسی میں ہے کہ میں صلیب پر لٹک جاؤں تو اس نے خدا تعالیٰ سے کہا کہ اے خدا تیری مرضی پوری ہو لیکن اس سے اتنا تو ثابت ہو گیا کہ وہ اپنی مرضی سے کفارہ نہیں ہوا۔ اور کفارہ خدا تعالیٰ کی مرضی سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر کفارہ ہوسکتا ہے تو کفارہ دینے والے کی مرضی سے ہوتا ہے مسیح صاف طور پر کہتا ہے کہ میری مرضی نہیں کہ میں کفارہ پیش کروں یہ اور بات ہے کہ جبر کے بعد وہ تیار ہو گیا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے بعض دفعہ ڈاکو جنگل میں کسی مسافر کو پکڑ لیتے ہیں تو وہ ہنس ہنس کر انہیں روپیہ دینا شروع کر دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں بولا تو یہ مجھے قتل کر دیں گے لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ اپنی مرضی سے انہیں روپیہ دے رہا ہوتا ہے اسی طرح یہ سوال نہیں کہ خدا نے اسے جبراً ایک بات پر تیار کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ بات مسیح کی اپنی مرضی سے ہوئی؟ اگر اس کی اپنی مرضی سے ہوئی ہے تب تو وہ کفارہ ہوا ورنہ نہیں اور اوپر کے حوالہ جات بتا رہے ہیں کہ مسیحؑ نے صاف طور پر یہ کہا کہ میری مرضی نہیں کہ صلیب پر لٹکوں۔ پس جو کچھ ہوا جبر سے ہوا اور یہ چیز ایسی ہے جو کفارہ کو باطل ثابت کر دیتی ہے۔

بعض عیسائی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسیح کی عارضی حالت تھی بعد میں اس کی یہ کیفیت بدل گئی تھی۔ اس امر کا جائزہ لینے کے لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صلیب کے وقت مسیحؑ کی کیا حالت تھی۔ ساری انجیل میں عبرانی کا ایک ہی فقرہ محفوظ ہے جو مسیح نے صلیب کے وقت بولا اور وہ فقرہ یہ ہے کہ ''ایلی ایلی لما سبقتنی '' (متی باب ۲۷ آیت ۴۶)

یعنی جب مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا اور ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیل گاڑے گئے تو مسیحؑ نے نہایت ہی دردناک طور پر خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ ایلی ایلی اے میرے خدا اے میرے خدا لما سبقتنی تو کس وجہ سے مجھ کو چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ تو نے مجھے چھوڑ دیا اور مجھ سے اپنے رحم وکرم کی نظر ہٹالی۔ اس دعا سے بھی صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیح اپنے مرضی سے صلیب پر نہیں لٹکا بلکہ آخری حالت میں بھی وہ یہی سمجھتا تھا کہ خدا نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور اس نے مجھے اس مصیبت میں ڈال دیا ہے گویا مسیح اس بات پر خوش نہیں تھا کہ اس کو صلیب پر لٹکایا جائے اور جب وہ اس بات پر خوش نہ تھا نہ صلیب سے پہلے اور نہ بعد۔ اور وہ یہ قربانی دینے کے لئے تیار نہیں تھا تو اس کا صلیب پر لٹکنا کفارہ کا موجب نہیں ہوسکتا۔

پھر اس کے ساتھ ہی ایک اور سوال بھی حل کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیا مسیحؑ آدم کے گناہ سے خود پاک تھا کہ قابل کفارہ ہو؟ کفارہ کی تھیوری یہ ہے کہ انسان پاک نہیں ہوسکتا کیونکہ آدم نے گناہ کیا تھا اور وہ آدم کی نسل میں سے ہے اور چونکہ نسل اپنے باپ کی وارث ہوتی ہے۔ اس لئے جو آدم کی اولاد ہے وہ بہرحال اپنے باپ کے گناہ کی وارث ہے اور چونکہ وہ گناہ کی وارث ہے اس لئے اولاد آدم گناہ سے بچ نہیں سکتی۔ اور چونکہ وہ گناہ سے بچ نہیں سکتی اور نجات نہیں پاسکتی اور نہ کوئی گنہگار انسان دوسرے گنہگار کے لئے کفارہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ کوئی ایسا وجود ہوتا جو گنہگار نہ ہوتا اور اپنی مرضی سے لوگوں کے گناہ اٹھا لیتا اور ان کی سزا خود برداشت کر لیتا تا کہ دوسرے لوگ گناہ کی سزا سے بچ جائیں۔ اور یہ وجود مسیح ناصری تھا جو خدا کا بیٹا تھا اس نے تمام لوگوں کے گناہ اٹھا لئے اور صلیب پر لٹک کر ان کے لئے کفارہ بن گیا۔ یہ ہے کفارہ کی تھیوری اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسیح گناہ سے پاک نہیں تھا تو یہ ساری تھیوری ختم ہو جاتی ہے جب وہ گناہ سے پاک ہی نہیں تھا تو کفارہ بھی نہیں ہوسکتا تھا انبیاء کے متعلق عیسائی یہی کہتے ہیں کہ چونکہ وہ گنہگار تھے اس لئے کفارہ نہیں ہو سکتے تھے ابراہیم کفارہ نہیں ہوسکتا تھا موسیٰ کفارہ نہیں ہوسکتا تھا۔ داؤد کفارہ نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ خود گنہگار تھے اور گنہگار دوسرے گنہگار کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ لیکن بائبل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیح خود بھی پاک نہیں تھا اور جب وہ پاک نہیں تھا تو دوسرے گنہگاروں کا وہ بھی بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔

انسان کو گنہگار ثابت کرنے کی دلیل مسیحیت یہ دیتی ہے کہ وہ گناہ کرنے والے آدم کی نسل میں سے ہے اور چونکہ وہ آدم کی نسل میں سے ہے۔ اس لئے گنہگار ہے ہم کہتے ہیں مسیحؑ بھی حوا کے ذریعہ آدم کی اولاد میں سے تھا اور اس لئے وہ بھی گنہگار تھا۔ مسیحی کہتے ہیں کہ انسان نے گناہ آدم سے ورثہ میں لیا ہے۔ جب مسیحؑ کا کوئی باپ ہی نہیں

تھا تو آدم کا گناہ اس کے ورثہ میں نہیں آیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ورثہ باپ اور ماں دونوں سے مل سکتا ہے۔ مثلاً اگر ماں کے اندر آتشک ہو تو بچے کے اندر بھی آتشک کا مادہ آ سکتا ہے یا اگر ماں کو سل ہو تو بچے کے اندر بھی سل کا مادہ آ سکتا ہے۔ کئی مائیں مسلول ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی اولاد میں بھی سل کا مادہ آ جاتا ہے۔ اسی طرح ماؤں کو مرگی یا جنون کا مرض ہوتا ہے تو اولاد میں بھی مرگی اور جنوں کا مرض آ جاتا ہے۔ غرض دنیا کے حالات پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی، جسمانی یا روحانی عیوب جو ماں یا باپ میں ہوتے ہیں وہ ورثہ کے طور پر ان کی اولاد میں بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ صرف باپ سے ورثہ کے طور پر کوئی بات آ جائے اور ماں کی طرف سے نہ آئے بلکہ باپ اور ماں دونوں کا ورثہ ملتا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے جب مسیحؑ حوا کی اولاد میں سے تھا تو خواہ اس کا باپ کوئی نہ ہو تب بھی اس نے اپنی ماں سے ورثہ کا گناہ پا لیا تھا اور وہ دوسرے انسانوں کی طرح گنہگار تھا۔ مسیح اسی صورت میں گناہ کے ورثہ سے بچ سکتا ہے جب یہ ثابت کیا جائے کہ وہ آدم اور حوا دونوں کی اولاد میں سے نہیں تھا۔ جب اس کا نہ باپ ہو نہ ماں۔ تب بے شک ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ورثہ کا گناہ نہیں پایا۔ اور یا پھر یہ ثابت ہو جائے کہ حوا نے گناہ نہیں کیا۔ تب حضرت مسیحؑ ورثہ کے گناہ سے بچ سکتے ہیں کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسیحؑ حوا کی اولاد میں سے ہے جس نے گناہ نہیں کیا تھا آدم کی اولاد میں سے نہیں جس نے گناہ کیا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صورت میں بھی مسیح گناہ سے نہیں بچ سکتا۔ کیونکہ اگر فرض کر لیا جائے کہ حوا نے گناہ نہیں کیا تھا۔ گناہ صرف آدم نے کیا تھا تب بھی اگر مسیح کو حوا نے جنا ہوتا تب تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس میں گناہ کا مادہ نہیں آیا۔ لیکن مسیح تو اس عورت کا بیٹا ہے جو حوا سے ہزاروں سال بعد ہوئی اور جو کئی ہزار واسطے حوا تک رکھتی تھی اس دوران میں ہزاروں دفعہ آدم کی اولاد نے حوا کی بیٹیوں کو چھوا پھر اور حوا کی بیٹیاں ہوئیں تو ان کو پھر آدم کی اولاد نے چھوا۔ اس طرح کئی ہزار چکر کھانے کے بعد حضرت مریم پیدا ہوئیں۔ وہ اتنے ہزار چکر میں آدم کے گناہ کے اثر سے بچ کس طرح سکتی تھیں اگر تو وہ براہ راست حوا کی اولاد میں سے ہوتیں اور حوا بے گناہ ہوتیں تب بے شک یہ کہا جا سکتا تھا کہ چونکہ حوا بے گناہ ہے اور چونکہ مریم براہ راست بغیر کسی واسطہ کے حوا کی بیٹی ہے۔ اس لئے گناہ کا مادہ اس میں نہیں آیا مگر وہ براہ راست حوا کی اولاد میں سے نہیں بلکہ حوا کی ان بیٹیوں کی اولاد میں سے ہے جو ہزاروں دفعہ گناہوں سے ملوث ہو چکی ہیں۔ پس وہ عورت جو آدم کے گناہ کا حصہ لے چکی تھی کس طرح مسیح کے پاک ہونے کا موجب ہو سکتی تھی۔

پھر یہ بھی درست نہیں کہ حوا بے گناہ تھی۔ بلکہ بائبل سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حوا آدم سے بھی زیادہ گنہگار تھی۔ بائبل میں لکھا ہے:۔

’’اور سانپ کل دشتی جانوروں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا یہ (امر یاد رکھنا چاہیے کہ بائبل میں سانپ سے مراد شیطان ہوتا ہے) اور اس نے عورت سے کہا کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا (گویا شیطان حوا کے پاس گیا اور اس نے چالا کی یہ کی کہ حوا سے جا کر یہ نہیں کہا کہ میں نے سنا ہے کہ فلاں درخت کا پھل کھانے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ممانعت ہو چکی ہے بلکہ اس نے یہ کہا کہ کیا خدا نے یہ کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل نہ کھانا) عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا ورنہ مر جاؤ گے۔ تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے۔ بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے کھایا تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں۔ اور انہوں نے خداوند خدا کی آواز جو ٹھنڈے وقت باغ میں پھرتا تھا سنی اور آدم اور اس کی بیوی نے آپ کو خداوند خدا کے حضور سے باغ کے درختوں میں چھپایا۔ تب خداوند خدا نے آدم کو پکارا اور اس نے کہا کہ تو کہاں ہے۔ اس نے کہا میں نے باغ میں تیری آواز سنی اور میں ڈرا کیونکہ میں ننگا تھا اور میں نے اپنے آپ کو چھپایا اس نے کہا کہ تجھے کس نے بتایا کہ تو ننگا ہے کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا آدم نے کہا کہ جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔ تب خداوند خدا نے عورت سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ عورت نے کہا کہ سانپ نے مجھ کو بہکایا تو میں نے کھایا اور خداوند خدا نے سانپ سے کہا اس لئے کہ تو نے یہ کیا تو سب چوپایوں اور دشتی جانوروں میں ملعون ٹھہرا۔ تو اپنے پیٹ کے بل چلے گا اور اپنی عمر بھر خاک چاٹے گا اور میں تیرے اور عورت کے درمیان اور تیری نسل اور عورت کی نسل کے درمیان عداوت ڈالوں گا۔ وہ تیرے سر کو کچلے گا اور تو اس کی ایڑی پر کاٹے گا۔ پھر اس نے عورت سے کہا کہ میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت

اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا اور آدم سے اس نے کہا چونکہ تو نے اپنی بیوی کی بات مانی اور اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا۔ اس لئے زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی مشقت کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس کی پیداوار کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اُگائے گی اور تو کھیت کی سبزی کھائے گا تو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھائے گا جب تک کہ زمین میں تو پھر لوٹ نہ جائے اس لئے کہ تو اس سے نکالا گیا ہے کیونکہ تو خاک ہے اور خاک میں پھر لوٹ جائے گا۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۱۹)

یہ وہ واقعہ ہے جو بائبل میں آدم کے گناہ کے متعلق آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیطان کا مقصود آدم کو ورغلانا تھا۔ کیونکہ شیطان سمجھتا تھا کہ آدم کے وجود سے میری حکومت باطل ہو جاتی ہے حوا کا مقام ایسا نہیں تھا کہ شیطان کو اس سے خطرہ ہوتا۔ پس اس کی اصل غرض یہ تھی کہ آدم کو جنت سے نکالا جائے۔ گویا اصل ساکن جنت آدم تھا۔ حوا آدم کے طفیل پیدا ہوئی اور آدم کے طفیل ہی اسے جنت ملی۔ پس شیطان کا اصل مقصد آدم کو بہکانا تھا مگر شیطان آدم کے پاس نہیں گیا بلکہ حوا کے پاس گیا اور اسے پھل کھانے پر آمادہ کیا اور پھر حوا نے آگے آدم کو پھل کھلایا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور شیطان پہلے حوا کے پاس کیوں گیا جبکہ اس کی اصل غرض آدم کو بہکانا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیطان کی اصل غرض گو آدم کو بہکانا تھی مگر وہ ڈرتا تھا کہ اگر میں براہ راست آدم کے پاس گیا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ اور آدم میرے دھوکا میں نہیں آئے گا۔ اس لئے وہ پہلے حوا کے پاس گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ حوا جلد قابو آجائے گی اور پھر حوا کے ذریعہ آدم کو ورغلانا آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ جب آدم سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ

''کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا''

تو آدم نے یہی جواب دیا کہ

''جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا''

یعنی آپ کی طرف سے یہ عورت مجھے تحفہ کے طور پر ملی تھی۔ میں دھوکا میں آگیا اور میں نے سمجھا کہ یہ عورت جو خدا تعالیٰ کا عطیہ ہے یہ تو غلطی نہیں کر سکتی اور میں نے اس کے کہنے سے اس درخت کا پھل کھا لیا۔ غرض آدم بھی یہی کہتا ہے کہ عورت نے مجھے بہکایا اور شیطان بھی پہلے حوا کے پاس ہی گیا اور اس نے اسے ورغلایا۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ

۱۔ پہلے گناہ حوا نے کیا۔

۲۔ حوا آدم سے زیادہ کمزور اور گناہ میں پھنسنے کے زیادہ قابل تھی۔ اسی لئے شیطان پہلے حوا کے پاس گیا حالانکہ اس کا اصل مقصود آدم تھا۔

۳۔ جو نسل آدم اور حوا سے پیدا ہوگی اس میں ورثہ کے گناہ کی کمزوری اس اولاد سے کم آئے گی جو صرف حوا سے پیدا ہوگی۔ کیونکہ آدم اور حوا کی اولاد نے کچھ باپ کا ورثہ لیا ہے اور کچھ ماں کا ورثہ لیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب طاقتور اور کمزور چیزیں آپس میں ملتی ہیں تو وہ ایک درمیانی کیفیت پر آ جاتی ہیں لیکن وہ اولاد جو خالص حوا سے پیدا ہوگی وہ لازماً گناہ کے زیادہ قریب ہوگی۔

جب یہ حالات ہیں تو مسیح صرف حوا سے پیدا ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی نسبت گناہ کے زیادہ قریب ہو گئے پس وہ دوسروں کے گناہوں کا کفارہ نہیں ہو سکتے۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طاقت میں ہے کہ حوا کی نسل میں سے نیک لوگوں کو پیدا کر دے۔ ہم اس بات کو مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ حوا کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا کر دے جو ہر قسم کے گناہوں سے پاک ہوں۔ لیکن کفارہ کی بنیاد اس بات پر نہیں کہ خدا تعالیٰ کی طاقت میں یہ بات داخل ہے یا نہیں کہ وہ حوا کی نسل سے نیک لوگوں کو پیدا کر دے۔ بلکہ اس بات پر ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گنہگار ہے اور یہ گناہ کا مادہ اس نے آدم سے ورثہ میں لیا ہے ورنہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی طاقت اور اس کی قدرت کا سوال ہے ہمارا عقیدہ تو آدم کی اولاد کے متعلق بھی یہی ہے۔ کہ اس میں سے بھی نیک لوگ ہو سکتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ کی طاقت کا ہی سوال ہو تو خدا تعالیٰ کی طاقت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ حوا گنہگار کی اولاد سے نیک لوگ پیدا کرے اور خدا تعالیٰ کی طاقت میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ آدم گنہگار کی اولاد سے نیک لوگ پیدا کرے لیکن عیسائیوں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو گنہگار ہو اس کی اولاد نیک ہی نہیں ہو سکتی اور جب ان کا یہ عقیدہ ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طاقت کا کیا سوال رہا۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی طاقت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ حوا کی اولاد نیک بن سکتی ہے تو پھر ہم کہیں گے کہ خدا تعالیٰ میں یہ بھی طاقت ہے کہ وہ آدم کے نطفہ سے نیک اولاد پیدا کر دے۔ ایسی صورت میں نہ ورثہ کے گناہ پر زور دینے کی کوئی ضرورت رہتی ہے نہ گنہگاروں کی نجات کے لئے خدا تعالیٰ کے بیٹے کی قربانی کی ضرورت رہتی ہے گویا کفارے کی تمام عمارت ایک آن میں منہدم ہو جاتی ہے عیسائی سیدھی طرح تسلیم کر لیں کہ خدا تعالیٰ کو یہ طاقت حاصل ہے کہ وہ گنہگار ماں باپ سے نیک اولاد پیدا کر دے لیکن اگر وہ حوا کی اولاد

کے متعلق تو خدا تعالیٰ کی طاقت تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں اور آدم کی اولاد کے متعلق اس کی طاقت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تو یہ خود ایک قابل اعتراض امر ہوگا۔ بہرحال اصل سوال صرف اتنا ہے کہ خدا میں نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت ہے یا نہیں؟ اگر خدا تعالیٰ میں گنہگار ماں سے نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت ہے تو خدا تعالیٰ میں گنہگار باپ سے بھی نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت ہے اور اگر خدا میں گنہگار باپ سے نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت نہیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ میں گنہگار ماں سے بھی نیک اولاد پیدا کرنے کی طاقت نہیں۔ بہرحال اگر وہ گنہگار ماں سے نیک اولاد پیدا کرسکتا ہے تو گنہگار باپ سے بھی نیک اولاد پیدا کرسکتا ہے اور وہ گنہگار باپ سے نیک اولاد پیدا نہیں کرسکتا تو گنہگار ماں سے بھی نیک اولاد پیدا نہیں کرسکتا۔

غرض مسیح اگر گنہگار ماں کے بطن سے نیک پیدا ہوسکتا ہے تو باقی لوگ بھی نیک پیدا ہوسکتے ہیں بلکہ دوسرے لوگ مسیح سے زیادہ نیک ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اندر باپ اور ماں دونوں کے اثرات ہیں۔

میں نے اوپر لاہور کے ایک پادری کا ذکر کیا ہے جو بعد میں سہارنپور مشنری کالج کا پرنسپل ہوگیا میری اس سے جو گفتگو ہوئی۔ اس کا ایک حصہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اب گفتگو کا دوسرا حصہ بیان کرتا ہوں۔ اس پادری کا نام غالباً وڈ تھا۔ میں نے اس سے کہا پادری صاحب آپ یہ بتائیں کہ ٹھنڈے پانی اور گرم پانی کو اگر آپس میں ملائیں تو کیا ہوگا۔ وہ کہنے لگا پانی سمویا جائے گا۔ کچھ گرم پانی کی گرمی کم ہوجائے گی اور کچھ سرد پانی کی سردی کم ہوجائے گی ایک درمیانی سی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ میں نے کہا اب یہ بتایئے شیطان پہلے آدم کے پاس گیا تھا یا حوا کے پاس؟ کہنے لگا حوا کے پاس میں نے کہا شیطان کا مقصود کیا تھا کیا حوا کو بگاڑنا مقصود تھا یا آدم کو بگاڑنا مقصود تھا؟ کہنے لگا شیطان کا مقصود تو آدم کو بگاڑنا تھا۔ میں نے کہا جب آدم مقصود تھا تو وہ براہ راست آدم کے پاس کیوں نہیں گیا راستہ میں چکر کاٹنے کی اسے کیا ضرورت تھی؟ اس نے کہا وہ براہ راست آدم کے پاس اس لئے نہیں گیا کہ اس نے سمجھا حوا کمزور ہے اور میں اسے آسانی سے ورغلا لوں گا۔ اس کے بعد آدم کو یہ حوا خود بخود ورغلا لے گی میری ضرورت نہیں رہے گی۔ میں نے کہا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حوا آدم سے کمزور تھی کہنے لگا ہاں۔ میں نے کہا جب حوا آدم سے کمزور تھی اور گناہ کا ارتکاب پہلے اسی نے کیا اور اسی نے آدم کو ورغلایا تو وہ وجود جو صرف حوا سے پیدا ہوا وہ بے گناہ کس طرح ہوگیا؟ میں نے کہا آپ گرم اور ٹھنڈے پانی کی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے یوں سمجھ لیں کہ آدم کی مثال ٹھنڈے پانی کی سی تھی اور حوا کی مثال گرم پانی کی سی تھی۔ ان دونوں کے ملنے سے جو اولاد پیدا ہوتی وہ لازماً اتنی گنہگار نہیں ہوسکتی جتنی وہ اولاد گنہگار ہوسکتی ہے جو صرف حوا سے پیدا ہوئی ہے پس مسیح جو حوا سے پیدا ہوا وہ دوسرے

لوگوں کی نسبت زیادہ گنہگار تھا۔ کہنے لگا کیا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا؟ میں نے کہا ہمارا اور آپ کا سارا جھگڑا ہی یہی ہے۔ اگر مٹی میں سے سونا نکل سکتا ہے تو پھر آدم کو آپ بے شک گنہگار کہیں مگر ساتھ ہی یہ بھی مانیں کہ اس کی اولاد نیک ہوسکتی ہے ضروری نہیں کہ وہ گنہگار ہی ہو۔

اب جو میں نے اس طرح پکڑا تو کہنے لگا مٹی میں سے سونا نہیں نکلتا، سونے میں سے سونا نکلتا ہے۔ آدم چونکہ گنہگار تھا اس لئے اس کی اولاد بھی ضرور گنہگار ہوگی وہ نیک نہیں ہوسکتی کیونکہ سونے میں سے سونا نکلتا ہے میں نے کہا تو پھر حوا کا بیٹا دوسروں سے زیادہ گنہگار ماننا پڑے گا کیونکہ حوا آدم سے زیادہ گنہگار تھی۔ اس نے نہ صرف خود درخت کا پھل کھایا بلکہ آدم کو بھی کھلایا اور اس طرح وہ دوہری گنہگار بنی۔ اس پر وہ پھر جھنجلا کر کہنے لگا مٹی کی کان میں سے سونا نہیں نکلتا۔ کان مٹی کی ہوتی ہے مگر اندر سے سونا نکل آتا ہے میں نے کہا تو پھر آدم کے متعلق بھی یہی نظریہ تسلیم کریں کہ گو وہ گنہگار تھا مگر اس کی اولاد میں سے ایسے لوگ بھی پیدا ہوسکتے ہیں جو نیک ہوں اور ہر قسم کے عیوب سے پاک ہوں۔

اب عیسائیوں کے لئے صرف ایک ہی پہلو رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ مسیح کے متعلق وہ یہ کہیں کہ اس کے ماں باپ کے گناہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا۔ وہ ابن اللہ تھا اور اپنی ذات میں ہر قسم کے گناہوں سے پاک تھا۔ اس کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حوا کی نسل میں سے ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں کی نسبت کم گنہگار تھا یا زیادہ گنہگار تھا۔ وہ بوجہ ابن اللہ ہونے کے گناہ سے پاک تھا۔ گویا اس کا پاک ہونا ماں کے بطن سے پیدا ہونے کے سبب سے نہیں تھا بلکہ ابن اللہ ہونے کی وجہ سے تھا۔ اس پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ اگر مسیح کے بغیر باپ کے پیدا ہونے میں کوئی خاص حکمت نہیں تھی اور ابن اللہ ہونے کی وجہ سے اس نے ماں باپ کا اثر قبول نہیں کرنا تھا تو اگر اس کا باپ ہوتا تب بھی اس نے اس کے اثر کو قبول نہیں کرنا تھا۔ اگر مسیح ایک شادی شدہ عورت کے گھر میں پیدا ہوتا اور اس کا باپ ہوتا تو پھر بھی اس نے آدم اور حوا کے اثر کو قبول نہیں کرنا تھا۔ کیونکہ اس کی اصل حیثیت ابن اللہ کی تھی۔ پھر خدا نے یہ کیا ظلم کیا کہ اس نے گنہگار تو ہونا نہیں تھا مگر پھر بھی اس نے مسیح کو ایسے رنگ میں پیدا کیا کہ وہ ساری دنیا میں ذلیل ہوگیا اور جہاں بھی لوگ بیٹھتے یہی کہتے کہ وہ نعوذ باللہ حلال زادہ نہیں جب اس نے نہ باپ کا اثر قبول کرنا تھا نہ ماں کا اثر قبول کرنا تھا تو اس جھگڑے کی ضرورت کیا تھی اور خدا نے مریم اور مسیح کو ایک گندے الزام کے نیچے رکھ کر کیوں تکلیف دی جب وہ ابن اللہ تھا اور اپنی ذات میں ہر قسم کے گناہوں سے پاک تھا تو اسے باپ اور ماں دونوں سے پیدا کرنا چاہیے تھا تا کہ وہ اپنے زور سے پاک ہوتا اور ولدالزنا ہونے کے الزام سے بھی بچتا۔

اس جگہ مسیحی یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم بھی تو اس کو بن باپ مانتے ہو آخر تم کس وجہ سے یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ وہ بن باپ پیدا ہوا اور دشمن کو اس پر یہ الزام لگانے کا موقع ملا کہ وہ ولدالزنا ہے۔ تم کفارہ کو تو مانتے نہیں اور جو وجہ ہم پیش کرتے ہیں اس کو رد کرتے ہو۔ پھر تم کیوں کہتے ہو کہ وہ بن باپ پیدا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کی یہ وجہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ وعدہ تھا کہ آئندہ ان کی اولاد میں پے در پے انبیاء آئیں گے اور خدا تعالیٰ کی بادشاہت زمین و آسمان کے قیام تک ان کی نسل میں رہے گی اور پھر پے در پے نبیوں کی معرفت یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ وعدہ صدیوں تک اس طرح متواتر پورا ہوا۔ کہ موسوی سلسلہ کے لوگ دلیر ہو گئے اور انہیں اس امر کا یقین ہو گیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے خدا تعالیٰ اولاد ابراہیم کو نہیں چھوڑ سکتا اور موسوی سلسلہ سے نبوت اور بادشاہت باہر نہیں جا سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلنا شروع ہوا کہ خدا تعالیٰ کے انبیاء کا انذار بیکار جانے لگا۔ نبی آتے اور وہ اپنی تعلیم پیش کرتے تو یہود ان کا مضحکہ اڑا دیتے۔ جیسے یرمیاہ وغیرہ آئے اور یہود نے ہنس کر ان کو رد کر دیا (یرمیاہ باب ۸ آیت ۱۸) اور سمجھا کہ خدا نے یہ نعمت ہمیں ہمیشہ کے لئے دے دی ہے۔ تب خدا نے انہیں بعض نبیوں کی معرفت یہ خبر دی کہ ایک کنواری بیٹا جنے گی (یسعیاہ باب ۷ آیت ۱۴) یعنی وہ موعود آدھا اسرائیلی اور آدھا غیر اسرائیلی ہوگا یہ ایک انذار تھا جس میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اگر یہود نبیوں کی باتیں نہ سننے پر اسی طرح مصر رہے تو آئندہ وہ نبی آئے گا جو نہ باپ کی طرف سے اسرائیلی ہوگا اور نہ ماں کی طرف سے اسرائیلی ہوگا سو مسیح کے وجود میں وہ وعدہ پورا ہوا مسیح بن باپ کے پیدا ہوا اور اس کے ذریعہ سے یہود کو نوٹس دے دیا گیا کہ آدھی نبوت ان سے لے لی گئی ہے۔ کیونکہ نسل ہمیشہ باپ سے چلتی ہے سو انہیں کہا گیا کہ اب جو نبی آیا ہے وہ باپ کی طرف سے یہود میں سے نہیں ہے اگر اس کے انذار سے بھی یہود نے فائدہ نہ اٹھایا تو اگلا نبی بالکل ہی غیر اسرائیلی ہوگا گو ابراہیم کی نسل سے ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے وعدے تھے اور اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ بلا وجہ ان وعدوں کی برکات سے یہود کو محروم کر دے اس لئے اس نے پہلے متواتر انبیاء بھیجے جب یہود میں متواتر نبی آتے رہے اور ان کو یہ یقین کامل ہو گیا کہ اب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ نبوت غیر اسرائیلیوں میں چلی جائے تو خدا تعالیٰ نے اپنے بعض انبیاء کی معرفت ایک ایسے رنگ میں انذار کیا جس کے بعد اگر ان کے اندر کچھ بھی ایمان ہوتا تو ان کو ہوش آ جانا چاہیے تھا اور یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اب ہماری شرارتوں کی وجہ سے ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ مگر وہ پھر بھی نہ سمجھے اور اپنی شرارتوں پر مصر رہے۔ آخر خدا تعالیٰ نے اپنے انذار کے مطابق مسیح کو بن باپ پیدا کیا اور یہودیوں کو سمجھایا کہ آدھی نبوت تو ہم نے لے لی ہے اگر آئندہ

بھی باز نہ آئے تو سزا کے طور پر نبوت کا باقی حصہ بھی لے لیا جائے گا۔ چنانچہ اب جو نبی آیا ہے یہ ماں کی طرف سے تو یہودی ہے مگر باپ کی طرف سے نہیں۔ لیکن آئندہ ایک بالکل غیر اسرائیلی نبی آئے گا گو وہ ابراہیم کی نسل میں سے ہی ہوگا چنانچہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا جو بنو اسماعیل میں سے تھے اور بنی اسرائیل میں سے نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ پس ہمارا حضرت مسیحؑ کو بن باپ ماننا قابل اعتراض نہیں۔ ہمارے نزدیک اس میں بڑی حکمت ہے لیکن جو حکمت وہ بتاتے ہیں ہم نے اسے رد کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس طرح حضرت مسیح بے گناہ نہیں بلکہ دوسروں سے بھی زیادہ گنہگار ثابت ہوتے ہیں اور کفارہ بالکل باطل چلا جاتا ہے۔

مسئلہ کفارہ کے متعلق ایک اور قابل غور سوال یہ ہے کہ کیا مسیح کے صلیب پانے سے دنیا کا کفارہ ہو سکتا تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسیحؑ کی صلیب کا واقعہ جس رنگ میں بائبل پیش کرتی ہے اگر ہم اسے تسلیم بھی کر لیں تب بھی یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کو دیکھتے ہوئے ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مسیحؑ نے واقعہ میں کوئی قربانی پیش کی تھی۔ کیونکہ انجیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیح صرف ڈیڑھ دن کے قریب قبر میں رہا۔ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت مسیح کی صلیب کا واقعہ ہوا ہے اور اتوار کے دن صبح کے وقت وہ اٹھ بیٹھا (مرقس باب ۱۶) جمعہ کے بعد کی رات سے ہفتہ کی شام تک چوبیس گھنٹے ہوئے اور ہفتہ کی شام سے اتوار کی صبح تک بارہ گھنٹے ہوئے گویا انجیل کی رو سے مسیح صرف ۳۶ گھنٹے قبر میں رہا۔ فرض کرو یہ عیسائی عقیدہ کہ مسیح ڈیڑھ دن تک دوزخ میں رہا درست ہو تو بھی سوال یہ ہے کہ مسیح کا ڈیڑھ دن قبر میں رہنا دنیا کے گناہوں کا کفارہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ عیسائی عقیدہ کے مطابق دوزخ ابدی ہے اور ہر انسان جو دوزخ میں ڈالا جائے گا ہمیشہ کے لئے ڈالا جائے گا۔ لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کچھ مدت کے بعد خدا تعالیٰ دوزخیوں کو بھی معاف فرما دے گا اور انہیں جنت میں داخل کر دے گا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (القارعۃ:۱۰) یعنی دوزخ رحم مادر کی طرح ہے جس طرح رحم میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد بچہ باہر آ جاتا ہے اسی طرح دوزخی کچھ عرصہ تک دوزخ میں رہنے کے بعد اس میں سے نکل آئیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کر دے گا لیکن عیسائی عقیدہ یہ ہے کہ دوزخ ابدی ہے اور جو بھی اس میں جائے گا وہ اس میں سے کبھی نہیں نکل سکے گا (متی باب ۲۵ آیت ۴۱) اب ساری دنیا جو مسیح پر ایمان رکھتی ہے وہ کروڑوں کروڑ کی ہے اسی زمانہ میں ساٹھ ستر کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ عیسائی ہیں۔ اگر یہ ستر کروڑ آدمی دوزخ میں جاتا اور اس میں ابد تک رہتا تو ستر کروڑ کو ابدیت سے ضرب دے کر دیکھ لو کہ کتنا وقت بن جاتا ہے اور یہ تو صرف اس زمانہ کے عیسائیوں کی تعداد ہے۔ اگر مسیح سے لے کر اس وقت تک کے ان تمام لوگوں کا شمار کیا جائے جو مسیح پر ایمان لائے تھے اور ایک انسانی نسل کی اوسط عمر ہم تیس سال فرض کر لیں اور دنیا کی

اوسط عیسائی آبادی دس کروڑ مان لیں کیونکہ پہلے وہ تھوڑے تھے پھر لاکھ دو لاکھ ہوئے۔ پھر ستر اسی لاکھ ہوئے پھر کروڑوں کروڑ تک پہنچ گئے یہاں تک کہ ان کی ایک ایک زمانہ میں ستر ستر اسی اسی کروڑ تک تعداد ہو گئی۔ اس تمام تعداد کی اوسط اگر ہم صرف دس کروڑ رکھیں اور ایک صدی میں تین نسلیں فرض کریں تو اب تک ستاون عیسائی نسلیں دنیا میں گزر چکی ہیں۔ ستاون کو دس کروڑ سے ضرب دیں تو پانچ ارب ستر کروڑ آدمی بن جاتا ہے اب پانچ ارب ستر کروڑ آدمی کی سزا کو ابدیت سے ضرب دے کر دیکھو تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ گویا اگر مسیح کفارہ نہ بنتا تو اس پانچ ارب ستر کروڑ نے ہمیشہ ہمیش کے لئے دوزخ میں رہنا تھا اور یہ زمانہ اتنا بڑا تھا جس کی تعیین ہندسوں میں ہو نہیں سکتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے کو صرف ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر پانچ ارب ستر کروڑ آدمی کے ابدی عذاب کا کفارہ قبول کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسیح کو اس لئے صلیب پر لٹکایا گیا تھا۔ تا کہ اللہ تعالیٰ کے عدل پر کوئی حرف نہ آئے۔ مگر یہ کیا عدل ہے کہ پانچ ارب ستر کروڑ ضرب ابدیت کا عذاب ڈیڑھ دن میں پورا کر لیا گیا۔ گویا اور لوگ دوزخ میں پڑتے تو انہیں ابدالآباد تک دوزخ میں رکھا جاتا لیکن اپنے بیٹے کا سوال آیا تو اسے ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر کہہ دیا کہ چلو سب کا کفارہ ہو گیا۔ یہ تو ویسی ہی مثال ہے جیسے کہتے ہیں کہ ایک گاؤں کے کچھ شرارتی لڑکے باہر کھیل رہے تھے کہ انہوں نے ایک مردہ گدھا دیکھا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ آؤ ہم اسے پکا کر کھالیں زندہ کیا اور مردہ کیا گوشت تو ہے ہی۔ چنانچہ انہوں نے مل کر گدھا پکایا اور کھا لیا۔ گاؤں والے ایسی باتوں کو سخت برا سمجھتے ہیں انہیں پتہ لگا۔ تو وہ بھاگے بھاگے اپنے ملاں کے پاس گئے اور اسے کہنے لگے کہ غضب ہو گیا۔ آج لڑکوں نے مردہ گدھا پکا کر کھا لیا ہے ایسا نہ ہو کہ خدا تعالیٰ کا کوئی عذاب ہم پر نازل ہو جائے۔ ملاں نے کہا یہ تو بڑے گناہ کی بات ہوئی ہے اب فوراً اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے ورنہ اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہو جائے گا۔ وہ پہلے ہی گھبرائے ہوئے تھے ملاں نے انہیں اور ڈرا دیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ملاں جی اس مشکل کا آپ ہی کوئی حل نکالیں ایسا نہ ہو کہ ہم سب برباد ہو جائیں۔ ملاں نے کہا اچھا میں کتابیں دیکھوں گا اور پھر بتاؤں گا کہ اس کا کیا علاج ہے چنانچہ وہ سارا دن فقہ کی کتابیں دیکھتا رہا اور شام کو گاؤں والوں سے کہنے لگا کہ لو بھئی مسئلہ نکل آیا ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ ایک بڑا سا شہتیر کھڑا کر کے اس کے چاروں طرف روٹیوں کا ڈھیر لگانا شروع کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ ڈھیر شہتیر کے آخری سرے تک پہنچ جائے اور پھر وہ روٹیاں خدا تعالیٰ کے نام پر دے دی جائیں۔ مطلب یہ تھا کہ روٹیاں مجھے دے دی جائیں کیونکہ خدا کے نام پر جو کچھ دیا جاتا ہے ملاں کو ہی دیا جاتا ہے۔ اس نے سمجھا کہ چلو اس طرح کچھ دن مفت روٹیاں کھالیں گے اور جو باقی رہیں گی وہ بیچ لیں گے گاؤں چھوٹا سا تھا اور لوگ غریب تھے انہوں

نے یہ سنا تو ان کے ہوش اڑ گئے اور کہا ملاں جی ہم تو یہ کفارہ دینے کی طاقت نہیں رکھتے اس نے کہا نہ دو گے تو سارے دوزخ میں جاؤ گے۔ فقہ میں یہی لکھا ہے کہ اس گناہ کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے پھر آپس میں مشورہ کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے ایک لڑکا بولا کہ ملاں جی کا اپنا بیٹا نور جمال بھی اس میں شامل تھا۔ انہوں نے کہا سچ کہتے ہو؟ لڑکوں نے کہا بالکل سچ ہے وہ ہمارے ساتھ تھا آخر انہوں نے مشورہ کیا۔ کہ اب پھر ملا جی سے پوچھنا چاہیے شاید مسئلہ کی کوئی شکل بدل جائے۔ چنانچہ وہ پھر ملاں جی کے پاس آئے اور کہنے لگے ملاں جی آپ کا بیٹا نور جمال بھی اس میں شامل تھا یہ سن کر ملاں جی کو فکر ہوا کہ اب تو مجھے بھی کفارہ دینا پڑے گا کہنے لگا اچھا میں پھر کتابیں دیکھوں گا۔ چنانچہ کتابیں دیکھ کر کہنے لگے لو میاں یہ بھی مسئلہ نکل آیا ہے کہ اگر اتنی توفیق نہ ہو تو پھر شہتیر کو زمین پر ڈال کر اس پر ایک ایک پھلکا رکھ دیا جائے اور وہ چند پھلکے صدقہ میں دے دیئے جائیں تو یہ تو میاں نور جمال والی بات ہوگئی کہ پانچ ارب ستر کروڑ کو اگر عذاب دیا جائے تو ابدی طور پر عذاب دیا جائے لیکن جب اپنے بیٹے کا سوال آیا تو کہہ دیا کہ ہم انصاف سے کام لے رہے ہیں ہم اسے ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ساری دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو گیا۔ اور ابھی تو دنیا جاری ہے پانچ سو یا ہزار سال تک بھی دنیا اور جاری رہی تو گو اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب احمدیت کی وجہ سے عیسائیت دن بدن کم ہی ہوگی ترقی نہیں کرے گی لیکن ہمارے بڑھتے بڑھتے بھی تین چار ارب کا اس تعداد میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مگر اتنی بڑی تعداد کے گناہوں کے کفارہ کا جب سوال آیا تو کہہ دیا گیا کہ ہم نے اپنے بیٹے کو ڈیڑھ دن دوزخ میں رکھ کر سب سزا پوری کر لی ہے اور ہمارے عدل اور انصاف کا تقاضہ پورا ہو گیا ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ پانچ ارب ستر کروڑ کو تو ابدی عذاب دینے کا فیصلہ کرنا اور یہ کہنا کہ وہ دوزخ میں سے کبھی نکل نہیں سکیں گے اور اپنے بیٹے کے متعلق یہ کہہ دینا کہ چونکہ وہ ڈیڑھ دن جہنم میں رہ آیا ہے اس لئے سب لوگوں کی سزا معاف ہو گئی ہے۔ تم اس تجویز کو کسی کے سامنے رکھ کر دیکھ لو۔ مسیح اور خدا کا نام نہ لو۔ اتنا کہو کہ ایک شخص تھا جس کے ذمہ ڈیڑھ لاکھ کے قریب قرض تھا لوگوں نے اس سے روپیہ کا تقاضا کیا مگر وہ ادا نہ کر سکا آخر معاملہ عدالت میں گیا اس نے درخواست کی کہ یہ قرض مجھے معاف کر دیا جائے مگر جج نے کہا کہ میں معاف نہیں کر سکتا کیونکہ معاف کرنا میرے عدل کے منافی ہے میں ایسی بے انصافی نہیں کر سکتا کہ تمہارے ذمہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ ہو اور تمہیں سزا نہ دی جائے۔ مگر اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا کہ اس ڈیڑھ لاکھ روپیہ کے بدلہ میں تم ڈیڑھ روپیہ دے دو اور جب اس نے ڈیڑھ روپیہ دے دیا تو اس نے کہا کہ اب سارا قرض معاف ہو گیا ہے۔ کیا دنیا کا کوئی بھی عقلمند اس فیصلہ کو معقول قرار دے گا؟ ہر شخص کہے گا کہ قاضی صرف بے ایمان

ہی نہیں بلکہ بڑا چالاک اور فریبی بھی تھا گویا اس کا الزام بڑھ جائے گا اور دنیا اسے عادل نہیں کہے گی بلکہ کہے گی کہ وہ بڑا ظالم تھا بڑا چالاک اور فریبی تھا کہ اس نے اپنے بیٹے سے ڈیڑھ روپیہ لے کر یہ فیصلہ کر دیا کہ لوگوں کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ ادا ہو گیا ہے اسی طرح کفارہ کی جو صورت بتائی جاتی ہے وہ خدا تعالیٰ پر الزام کو بڑھانے والی ہے گھٹانے والی نہیں۔ اور اس قسم کے کھیل سے اس کا عادل ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ غیر عادل ہونے کے علاوہ چالاک اور دھوکے باز ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہی کرنا تھا تو پھر ڈیڑھ دن بھی اسے دوزخ میں کیوں رکھا؟

اگر کہو کہ انسان اور خدا میں بے انداز فرق ہے چونکہ انسان کی حالت اور ہے اور خدا تعالیٰ کی حالت اور ہے اس لئے انسان کو جتنا عذاب ابدی جہنم میں ملے گا وہی عذاب خدا تعالیٰ کے بیٹے کو ڈیڑھ دن میں مل گیا ہے اس وجہ سے بنی نوع انسان کی ابدی سزا کے مقابلہ میں ابن اللہ کا صرف ڈیڑھ دن کے لئے جہنم میں جانا کوئی قابل تعجب امر نہیں۔ جو عذاب ان کو ابدیت میں ملنا تھا وہی مسیح کو ڈیڑھ دن میں مل گیا۔ یہ بھی ایک جواب ہے جو دیا جا سکتا ہے۔

اس کا ردّ یہ ہے کہ جب خدا اور انسان میں بے انداز فرق ہے اور عیسائی بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو بے انداز فرق کے لحاظ سے یہ انسانی طاقت میں ہی نہیں کہ وہ خدا اور اس کی مخلوق کے باہمی فرق کو سمجھ سکے بے انداز چیز انسانی اندازوں سے باہر ہوتی ہے اور اندازہ ہمیشہ اسی چیز کا کیا جاتا ہے جو محدود ہو اور جس کا سمجھنا انسانی طاقتوں کے لحاظ سے ممکن ہو۔ اب بے انداز فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے پانچ ارب ستر کروڑ انسانوں کے مجموعی عذاب کے مقابلہ میں خدا تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ ڈیڑھ دن کے لئے دوزخ میں چلا گیا اور انسانوں کا کفارہ ہو گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ انہوں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ انسانی عذاب کی جو مقدار ہے وہ خدا تعالیٰ کو کتنے عرصہ میں مل سکتی ہے حالانکہ جب انسان اور خدا میں ہے ہی بے انداز فرق تو وہ یہ اندازہ کس طرح لگا سکتے ہیں کہ ڈیڑھ دن میں تمام عذاب خدا تعالیٰ کو پہنچ گیا ہے ایسی صورت میں تو اسے ایک منٹ کے لئے بھی دوزخ میں رکھنا درست نہ تھا بلکہ ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی اس کے لئے کافی سے زیادہ تھا کیونکہ یہاں مقابلہ محدود طاقتوں والے انسانوں اور غیر محدود طاقتوں والے خدا کا ہے اور غیر محدود طاقت والے خدا کا اندازہ محدود طاقت والوں کے ساتھ کرنا عقل کے بالکل خلاف ہے پھر تو ایک سیکنڈ کی تعیین بھی اس کے لئے نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ بے انداز فرق کے لحاظ سے تو جتنی دیر آنکھ جھپکنے میں لگتی ہے اتنی دیر کا عذاب بھی خدا تعالیٰ کے لئے ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں ڈیڑھ دن کا اندازہ انہوں نے کہاں سے نکال لیا اور اپنی محدود طاقتوں کے ساتھ غیر محدود طاقتوں والے خدا کے متعلق یہ کس طرح سمجھ لیا کہ اس نے ڈیڑھ دن میں وہ عذاب برداشت کر لیا جو انسان اربوں سال میں برداشت کر سکتا تھا۔

پھر یہ بھی سوال ہے کہ دوزخ میں گیا کون تھا ابن آدم گیا تھا یا ابن اللہ گیا تھا؟ اگر ابن آدم گیا تھا تو سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ابن آدم کی روح چونکہ بہر حال جسم سے پیدا ہوتی ہے اور وہ جسم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے اس کی روح دوزخ میں چلی گئی لیکن وہاں تو کوئی اور روح تھی ہی نہیں جسم بے شک انسان کا تھا لیکن اس میں ابن اللہ تھا اور ابن اللہ اگر جسم کی قید سے آزاد ہو جائے تو اسی وقت خدا بن جاتا ہے۔ وہ اسی وقت تک ابن آدم کہلا سکتا ہے جب تک وہ جسم کی قید میں ہے جب وہ اس جسم کی قید سے آزاد ہو جائے تو وہ اسی وقت ابن اللہ بن جاتا ہے اور جب وہ ابن اللہ ہو گیا تو اس کی حالت خدا کی سی ہو گئی اور جب اس کی حالت خدا والی ہو گی تو اس کے دوزخ میں جانے کے کوئی معنے ہی نہیں۔ کیا خدا کو بھی سردی گرمی لگتی ہے یا وہ بھی سردی سے آرام اور گرمی سے تکلیف محسوس کرتا ہے؟ انسان کی روح تو اگر دوزخ میں جائے گی تو وہ گرمی محسوس کرے گی۔ سرد مقام پر رکھی جائے گی تو سردی محسوس کرے گی مگر ابن اللہ جو خدا ہے اس کے لئے سردی اور گرمی کا کیا سوال ہے۔ دوزخ بھی اس کی پیدائش ہے اور جنت بھی اس کی پیدائش ہے نہ دوزخ اسے تکلیف پہنچا سکتی ہے اور نہ جنت اسے آرام پہنچا سکتی ہے۔ حدیثوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوزخ میں اپنا پاؤں ڈالے گا اور وہ ٹھنڈی ہو جائے گی کیونکہ خدا تعالیٰ کے لئے دوزخ کوئی چیز ہی نہیں۔ پس اگر مسیح ابن آدم تھا اور اس میں انسانی روح تھی تو دوزخ میں خدا نہیں گیا بلکہ انسان گیا اور اگر اس میں ابن اللہ کی روح تھی تو جونہی اس کی روح جسم کی قید سے آزاد ہوئی وہ فوراً خدا کی طرح ہو گئی اور جب وہ خدا کی طرح ہو گئی تو اب خواہ اسے دوزخ میں بھی لے جاؤ اسے کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ آخر مسیح کی کوئی دو روحیں تو تھی نہیں کہ کہا جائے ایک اس میں آدمی کی روح تھی اور ایک خدا کی روح تھی۔ اس میں ایک ہی روح تھی جو ابن اللہ کی تھی اور جب وہ روح جسم کی قید سے آزاد ہو گئی تو اس کے لئے دوزخ، دوزخ ہی نہ رہا۔ پھر اگر اس کو دوزخ میں بھی لے جاؤ تو وہاں اس کا جانا اس کے لئے کسی عذاب کا موجب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ مادی احساسات سے بالا ہے نہ اس پر دوزخ اثر کرتی ہے نہ جنت۔

عیسائی بعض دفعہ گھبرا کر یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ سب تمثیلی کلام ہے تم خواہ مخواہ اسے حقیقت پر محمول کرتے ہو۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ تمثیلی کلام ہے تو تمثیلی کلام سے نئے نئے مسئلے نہیں نکلا کرتے۔ اس صورت میں بھی کفارہ باطل ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب تم حقیقت بیان نہیں کر رہے بلکہ تمثیل بیان کر رہے ہو۔ تو اس سے عجیب وغریب مسائل نکالنا اور ان پر ایمان لانے کی لوگوں کو دعوت دینا تمہارے لئے جائز نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر ہم کسی شخص کے متعلق یہ کہیں کہ وہ سچ مچ شیر ہے اور جب کوئی شخص ہم سے پوچھے کہ اس کی دم کہاں ہے یا اس کے پنجے وغیرہ کہاں

ہیں اور ہم کہیں کہ یہ تو تمثیلی کلام تھا تم نے خواہ مخواہ اسے حقیقی شیر سمجھ لیا تو اس کے بعد ہمارے لئے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے حقیقی شیر ہی کہتے پھریں۔ اسی طرح اگر یہ تمثیلی کلام ہے تو عیسائیوں کو ماننا پڑے گا کہ مسیح کو ابن اللہ بھی تمثیلی طور پر کہا گیا تھا اور اگر وہ تمثیلی طور پر ابن اللہ تھا تو پھر نہ وہ لوگوں کے گناہ اٹھا سکتا تھا اور نہ ڈیڑھ دن دوزخ میں رہ سکتا تھا یہ ساری کی ساری باتیں ہی باطل اور بے حقیقت ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ عیسائیوں کی ساری باتیں مان لینے کے باوجود کہ کفارہ بھی کوئی ممکن چیز ہے اور مسیح ابن اللہ تھا کیا یہ بات ثابت ہے کہ وہ قربانی مسیح نے پیش کر دی تھی جسے کفارے کا موجب کہا جاتا ہے؟ انجیل کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے مسیحؑ نہ تو صلیب پر لٹک کر مرا اور نہ اس نے وہ قربانی پیش کی جسے کفارے کا موجب قرار دیا جاتا ہے۔ مسیحؑ کا صلیب پر سے زندہ اتر آنا درحقیقت ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں عیسائیت کی موت ہے۔ اگر مسیحؑ صلیب پر سے زندہ اتر آئے تھے تو عیسائیت کلی طور پر ختم ہو جاتی ہے اور اگر مسیح صلیب کے واقعہ کے بعد اپنی طبعی موت مر گئے تھے تو وہ غلط عقائد جو غیر احمدیوں میں پھیلے ہوئے ہیں سب کے سب ختم ہو جاتے ہیں گویا مسیح کا صلیب پر سے زندہ اتر آنا عیسائیت کو ختم کر دیتا ہے اور مسیح کا طبعی موت مر جانا اسلام سے الحاد کو ختم کر دیتا ہے۔ اگر عیسائیت مر جاتی ہے تو اس میں بھی اسلام کی زندگی ہے اور اگر الحاد مٹ جاتا ہے تو اس میں بھی اسلام کی زندگی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ دونوں کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ آپ نے مسیح کو صلیبی موت سے بچا کر ایک طرف مسیح کو لعنت سے بچایا اور دوسری طرف عیسائیت کو مار دیا۔ ادھر مسیحؑ کی طبعی موت ثابت کر کے اسلام کو الحاد سے بچا لیا کیونکہ ایک ایسا نبی جس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض حاصل نہیں کیا۔ جس نے آپؐ کے دین سے استفادہ نہیں کیا۔ جس نے آپؐ کے باغ سے خوشہ چینی نہیں کی اس کا اسلام میں آنا اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہ صرف ہتک ہے بلکہ ان کے کام کو بالکل ختم کر دیتا ہے پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو حملے کر کے عیسائیت اور الحاد دونوں کو ختم کر دیا۔ ایک دفعہ آپ نے مسیحؑ کو زندہ کر کے عیسائیت کو ختم کیا اور دوسری دفعہ آپ نے مسیح کو مار کر اسلام سے الحاد کو ختم کیا۔ یہ اتنے بڑے کارنامے ہیں جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ نہ ابھی تک ہماری جماعت نے ان کارناموں کی طرف توجہ کی ہے اور نہ ان کی اہمیت کو پوری طرح سمجھا ہے۔ باقی باتیں کہ مسیحؑ واقعہ صلیب کے بعد کہاں گیا یہ ضمنی دلائل ہیں جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش کئے ہیں۔ اصل چیز مسیح کا صلیب سے زندہ اتر آنا ہے۔ اگر وہ صلیب پر سے زندہ

اتر آیا ہے تو عیسائیت ختم ہے۔ چنانچہ اس بات کا اقرار خود مسیحی لوگ بھی کر رہے ہیں ۔Mr. Criltondon جو کہ انٹر یونیورسٹی فیلوشپ آف لنڈن کے سیکرٹری جنرل ہیں انہوں نے ۱۱/ مارچ ۵۶ء کو لنڈن مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

''اگر مسیح کی وفات کے متعلق جماعت احمدیہ کا نظریہ درست ہے تو پھر عیسائیت باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر فی الواقع مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تو پھر عیسائیت کی ساری بنیاد ہی ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور ایسی صورت میں عیسائیت کی تمام عمارت کا زمین پر آرہنا یقینی ہے۔''

(الفضل ۲۷/ نومبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۴ کالم۱)

پس اگر مسیح طبعی موت مر چکا ہے تو مسلمانوں کا الحاد ختم ہے۔ اس طرح وہ تمام تانا بانا جو انہوں نے بنایا ہوا ہے سب کا سب ٹوٹ جاتا ہے اور وہ غلط عقائد جن میں وہ ایک عرصہ سے مبتلا ہو چکے ہیں سب کے سب باطل ثابت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اگر مسیح طبعی موت مر گیا ہے تو آنے والا مسیح امت محمدیہ میں سے ہوگا۔ اور جب آنے والا امت محمدیہ میں سے ہوگا تو اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑا مطمح نظر قائم ہو جاتا ہے وہ قومیں جن کی امیدیں مر جاتی ہیں فنا ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ قومیں جن کی امیدیں نہیں مرتیں وہ کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ جب بھی وہ گرنے لگتی ہیں ان کی امیدیں ان کو پھر کھڑا کر دیتی ہیں۔ پھر ان کے اندر بیداری اور ہوشیاری پیدا کر دیتی ہیں۔ اور وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہمارے لئے بڑے بڑے درجے حاصل کرنے کے مواقع موجود ہیں۔ لیکن جب کسی قوم کی امید کا پہلو مار دیا جائے تو وہ قوم بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ پس حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ ایک طرف آپ نے مسیح کو صلیب سے اترنے کے بعد زندہ کر کے عیسائیت کو مار دیا اور دوسری طرف آپ نے مسیح کو قرآن کریم کی آیات کے مطابق وفات یافتہ ثابت کر کے اسلام کو الحاد سے بچا لیا۔ یہ کیسا شاعرانہ مضمون ہے کہ آپ نے مسیح کو زندہ کر دیا اور عیسائیت کو مار دیا اور مسیح کو مار دیا اور اسلام کو زندہ کر دیا۔ چونکہ عیسائیت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مسیحؑ صلیب پر لٹک کر مر گیا اس لئے جب یہ ثابت ہو جائے کہ مسیحؑ صلیب پر مرا ہی نہیں بلکہ زندہ رہا اور زندہ اترا تو ساتھ ہی کفارہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ بہر حال یہ ایک سوال ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے کہ کیا مسیح صلیب پر لٹک کر فوت ہوا اور کیا اس نے وہ قربانی پیش کی جو کفارہ کا موجب ہو سکتی تھی؟ انجیل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے مسیح نہ صلیب پر لٹک کر مرا اور نہ اس نے وہ قربانی پیش کی جسے کفارہ کہا جاتا ہے۔ اگر ہم انجیل پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کا اصل معجزہ جس پر

مسیحیت کو ناز ہے اور جو مسیحیت کے ابتدائی آثار میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے یوناہ نبی کا معجزہ ہے۔ صلیب کے واقعہ کے بعد ایک لمبے عرصہ تک عیسائی کمزور رہے وہ کبھی کسی ملک میں بھاگ کر چلے جاتے تھے اور کبھی کسی ملک میں عام طور پر وہ چھپ کر رہتے تھے۔ کیونکہ جب لوگوں کو ان کا پتہ لگتا۔ تو وہ ان پر مختلف قسم کے مظالم کرتے۔ ابتدائی مظالم کے سوا جو فلسطین میں یہودیوں کی طرف سے ہوئے۔ بعد میں یہ مظالم زیادہ تر مشرک قوموں خصوصاً رومیوں کی طرف سے ہوتے تھے۔ ایک عیسائی یہ رٹ لگانے سے نہیں رہ سکتا تھا کہ مسیح اس دنیا کا بادشاہ ہے۔ مگر ادھر بادشاہت کا لفظ اس کی زبان پر آتا اور ادھر رومیوں کو آگ لگ جاتی اور وہ فوراً مظالم شروع کر دیتے اس زمانہ میں یہودیت کا حملہ کمزور ہو چکا تھا بلکہ بعض جگہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسیحی چھپتے تو ان کے ساتھ یہودی بھی چھپ جاتے تھے۔ چونکہ مذہب ملتا جلتا تھا اور یہودی ابھی موسوی شریعت سے اتنے دور نہیں ہوئے تھے جتنے آجکل ہیں بلکہ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لئے جس طرح ہم بھی نمازیں پڑھتے ہیں اور غیر احمدی بھی نمازیں پڑھتے ہیں۔ ہم بھی روزے رکھتے ہیں اور غیر احمدی بھی روزے رکھتے ہیں ہم بھی حج کرتے ہیں اور غیر احمدی بھی حج کرتے ہیں ہم بھی قرآن مانتے ہیں اور غیر احمدی بھی قرآن مانتے ہیں اور اگر کوئی شخص صرف ظاہری شکل دیکھے عقائد کے اختلاف پر نظر نہ ڈالے تو وہ یہی کہے گا کہ احمدیوں اور غیر احمدیوں میں کوئی فرق نہیں۔ اسی طرح جو ایمان تورات پر مسیحیوں کو تھا ویسا ہی ایمان یہودیوں کو تھا۔ جس طرح صدقہ وخیرات عیسائی کرتے تھے ویسے ہی صدقہ وخیرات یہودی کرتے تھے۔ جس طرح تورات کی تعلیموں کو عیسائی قابل عمل سمجھتے تھے اسی طرح تورات کی تعلیموں کو یہودی قابل عمل سمجھتے تھے اور چونکہ تمام تعلیم میں دونوں مشترک نظر آتے تھے اس لئے جب رومی لوگ عیسائیت کے خلاف بھڑکے اور انہوں نے ظلم کرنے شروع کئے تو ساتھ ہی انہوں نے یہودیوں پر بھی ظلم کرنے شروع کر دیئے اور یہ خیال کیا کہ یہ بھی ان کے ساتھ ہی ہیں۔ پس ابتدائے عیسائیت میں تو ظلم یہودیوں کی طرف سے ہوئے مگر پھر شکل بدل گئی اور جب رومی دکھ دیتے ہیں تو وہ عیسائیوں اور یہودیوں دونوں کو اکٹھا دکھ دیتے تھے۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ ان میں سے یہودی کون ہے اور عیسائی کون ہے۔ چنانچہ جب عیسائی بھاگ کر کہیں چھپتے تھے تو یہودی بھی ان کے ساتھ ہی چھپ جاتے تھے اور روما میں جو آثار پائے جاتے ہیں ان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے مگر میں سمجھتا ہوں عیسائیوں نے یہ بڑی ہمت کی کہ باوجود اس کے کہ روم میں ان کی بڑی مخالفت تھی اور حکومت کی طرف سے ان پر شدید مظالم ہوتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے وہاں تبلیغ پر بڑا زور دیا۔ چنانچہ روم میں ان کے بڑے بھاری مشنز قائم تھے وہاں ان کی تبلیغ کی وجہ سے لوگ مخالفت بھی کرتے، ظلم بھی کرتے، جائدادیں بھی

چھین لیتے ۔مگر ظلم زیادہ دیر تک نہیں چلا کرتا۔ پہلے کچھ عرصہ مارتے پیٹتے اور پھر چھوڑ دیتے جیسے آجکل ہندوستان میں ہندوؤں کو بعض مقامات پر جوش آتا ہے اور وہ مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیتے ہیں مگر کچھ عرصہ کے بعد خاموشی ہوجاتی ہے۔ پھر کسی اور علاقہ میں ظلم شروع ہوجاتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں بھی خاموش ہوجاتی ہے۔ ان کا بڑا مرکز ایک تو روم تھا دوسرا مرکز انطاکیہ تھا اور تیسرا مرکز اسکندریہ تھا۔ ان تینوں جگہ عیسائی پادریوں پر حملے ہوتے تھے اور دشمن انہیں یا تو مار دیتا یا زخمی کر دیتا۔ ان متواتر حملوں کی وجہ سے عیسائی بعض دفعہ اپنے گھروں یا محلوں میں چھپ جاتے یا بھاگ کر اردگرد کے گاؤں میں چلے جاتے یا اپنی رہائش کے لئے زمین دوز جگہیں بنا لیتے۔ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ بعض لوگ اپنی قبریں تہ خانوں میں بناتے تھے اور ان کے لئے زمین سے پتھر نکال کر لاتے تھے۔ ان پتھروں کے نکالنے سے جو زمین میں گڑھے بن جاتے تھے انہی کو صاف کر کے عیسائی ان میں رہنا شروع کر دیتے تھے۔ روم میں ایسی کئی جگہیں ہیں جہاں عیسائی ایک لمبے عرصہ تک چھپے رہے۔ اور جن کو کیٹا کومبز (Catacombs) کہتے ہیں۔ ان میں ابھی تک ایسی تصویریں ہیں جو دینی روح قائم رکھنے یا اپنے شہداء کی یاد تازہ رکھنے کے لئے انہوں نے کھینچی ہوئی ہیں۔ اسی طرح قبروں پر کئی جگہ کتبے لگے ہوئے ہیں۔ اور ان میں یہ ذکر ہے کہ یہ کس کی قبر ہے اور کس طرح شہید ہوا ہے ان غاروں کا ایک حصہ میں نے بھی دیکھا ہے سارا تو دیکھا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ستر میل تک یہ علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ بہر حال ان کیٹا کومبز کے دیکھنے سے پرانی عیسائی تاریخ کا پتہ لگ جاتا ہے کیونکہ مسیحیت کے پھیلنے سے پہلے کے مظالم کا نقشہ ان آثار کو دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور کتبوں کی عبارات اور تصویروں سے پتہ لگتا ہے کہ اس وقت مسیحیوں کے کیا عقائد تھے۔ تیسری صدی مسیحی میں روم کا بادشاہ عیسائی ہوگیا تھا (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا زیر لفظ کانسٹائن) اور پھر مسیحیت کو طاقت حاصل ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے زمانہ سے تعلق رکھنے والی جس قدر باتیں ہیں ان کا پتہ انہی کیٹا کومبز کے دیکھنے سے لگتا ہے۔ ان کیٹا کومبز میں ہمیں زیادہ تر تین تصویریں ملتی ہیں۔ ایک نوح کی کشتی کی۔ ایک گڈریا کی جس کے اردگرد بھیڑیں ہیں اور ایک یوناہ نبی کی جسے مچھلی نگل رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تاریخ میں عیسائی مذہب کی بنیاد صرف تین چیزوں پر رکھی گئی تھی یا یوں کہو کہ تین مسئلے تھے جو عیسائیت کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ گڈریا کی تصویر میں اس طرف اشارہ تھا کہ مسیح کی یہود کی گم گشتہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہے۔ نوح کی کشتی کے یہ معنے تھے کہ مسیح ہمارا نجات دہندہ ہے اور یوناہ نبی کی تصویر سے وہ معجزہ مراد تھا جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ گویا ان تین تصویروں کے ذریعہ اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ مسیحیت کی بنیاد انہی تین باتوں پر ہے (۱) اس پر کہ مسیح اپنی گم گشتہ بھیڑوں کو جمع

کرنے کے لئے آیا ہے (۲) اس پر کہ مسیح نجات دہندہ ہے (۳) اس پر کہ مسیح کو ویسا ہی معجزہ دیا گیا ہے جیسے یوناہ نبی کو دیا گیا تھا۔

پس مسیحیت کی بنیاد اس معجزہ پر ہے بلکہ مسیحیت اس کو ہی ایک حقیقی معجزہ قرار دیتی ہے اور تمام ابتدائی زمانہ کے نقوش اور تصاویر جن کا مسیحیت کے لٹریچر سے پتہ لگتا ہے وہ بھی اسی طرف راہنمائی کرتی ہیں یعنی گڈریا کی تصویر جسے اپنی بھیڑوں سمیت دکھایا گیا ہے۔ نوحؑ کی کشتی کی تصویر اور یوناہ نبی کے مچھلی کے پیٹ میں جانے کی تصویر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کا اصل معجزہ یہی تھا خود مسیح بھی اسے اپنا منفرد اور اصل معجزہ قرار دیتا ہے انجیل میں لکھا ہے حضرت مسیحؑ وعظ کر رہے تھے کہ

"بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں اس سے کہا اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں (یعنی ہم ماننے کے لئے تو تیار ہیں لیکن دلائل سے ہماری تسلی نہیں ہوتی ہمیں کوئی نشان دکھایا جائے) اس نے جواب دے کر ان سے کہا اس زمانہ کے برے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔"

(متی باب ۱۲ آیت ۳۸ تا ۴۰)

مسیحؑ نے اس سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا کہ میں تم کو اور کئی نشان دکھا چکا ہوں تم ان سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اسی طرح مسیحؑ نے یہ نہیں کہا کہ میں تم کو کوئی نشان دکھاؤں گا۔ بلکہ مسیح نے کہا کہ یوناہ نبی کے نشان کے سوا ان کو اور کوئی نشان نہیں دکھایا جائے گا یہ بتاتا ہے کہ مسیحؑ اپنے اس نشان کو ایک ہی نشان قرار دیتا ہے ظاہر ہے کہ خدا کا کوئی نبی ایسا نہیں ہوسکتا جس نے ایک ہی نشان دکھایا ہو خود انجیل سے ظاہر ہے کہ مسیح نے اور بھی کئی نشان دکھائے ہیں۔ پس مسیح کا یہ کہنا کہ "یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا" اس کے معنے یہ ہیں کہ جہاں تک یہودیت کا تعلق ہے بنیادی نشان مسیح کو یوناہ نبی والا ہی دیا جائے گا اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے ابتدائی زمانہ کے مسیحیوں کی شہادت سے بھی یہی بات ثابت ہے اور درحقیقت ابتدائی زمانہ کا عیسائی ہی اس بات کا اہل تھا کہ وہ یہ سمجھتا کہ عیسائیت کی کیا غرض ہے ان کی تصویروں میں سے پہلی تصویر ہی یوناہ نبی کے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے جو بتاتی ہے کہ ابتدائی زمانہ کے مسیحی یہ تسلیم کرتے تھے۔ کہ یوناہ نبی والا نشان ہی مسیح کا اصل نشان ہے۔ باقی دو تصویریں اس پہلی تصویر کے تابع ہیں یعنی یوناہ نبی والے نشان میں ہی نجات بھی شامل ہے اور یوناہ نبی والے نشان

میں جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا گڈریا والی مثال بھی شامل ہے۔ کیونکہ مسیح واقعہ صلیب کے بعد اپنی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کرنے کے لئے ایران اور افغانستان اور کشمیر میں گیا اور اس نے انہیں خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ اور پھر مسیح خود بھی کہتا ہے کہ ایک ہی نشان ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کو دکھایا جائے گا اور وہ یوناہ نبی والا نشان ہے ایک ہی نشان کے معنے یہ ہیں کہ یہ ایک ہی اہم نشان ہے یا ایک ہی قابل اعتماد نشان ہے۔ غرض ابتدائی زمانہ کا عیسائی بھی تسلیم کرتا ہے کہ عیسائیت کی حقیقی شان یوناہ نبی والے نشان سے ہی ظاہر ہوتی ہے اور مسیح بھی اس کو اپنا منفرد اور مہتم بالشان نشان قرار دیتا ہے۔

لوقا میں بھی یہی ذکر آتا ہے اس میں لکھا ہے:۔

''اس زمانہ کے لوگ برے ہیں وہ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ کے نشان سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ٹھہرے گا۔'' (لوقا باب ۱۱ آیت ۲۹۔۳۰)

لوقا نے یہاں ایک زائد بات کہی ہے۔ متی نے تو یہ کہہ کر اپنی بات ختم کر دی تھی کہ ''یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا کیونکہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا'' یہاں متی نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا تھا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرے گا۔ متی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''نینوہ کے لوگ عدالت کے دن اس زمانہ کے لوگوں کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کو مجرم ٹھہرائیں گے کیونکہ انہوں نے یوناہ کی منادی پر توبہ کر لی اور دیکھو یہاں وہ ہے جو یوناہ سے بھی بڑا ہے'' (متی باب ۱۲ آیت ۴۱) مگر لوقا اس بات پر زور دیتا ہے کہ جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا تھا۔ اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرے گا۔ گویا اس نشان کے متعلق وہ خاص طور پر یہ بتاتا ہے کہ نینوہ کے لوگوں کے لئے جس رنگ میں یوناہ نشان ٹھہرا تھا اسی رنگ میں اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مسیح نشان ٹھہرے گا۔

ان حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل نشان جو زمانہ مسیح میں دکھایا جانے والا تھا وہ یوناہ نبی والا نشان تھا۔ یہ نشان کیا تھا اس کے متعلق مسیح خود کہتا ہے کہ:۔

''جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔''

اس جگہ حضرت مسیح نے خود تشریح کر دی ہے کہ یوناہ نبی کے نشان سے کیا مراد ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔ مشابہت کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ہر چیز میں مشابہت ہو۔ بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اصولی باتوں میں مشابہت ہوگی۔ چنانچہ اسی مشابہت کی بناء پر مسیح کہتا ہے کہ جس طرح یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات رہا اسی طرح مسیح قبر میں تین دن رات رہے گا۔ گویا اس نشان کا مقصد یہ تھا کہ مسیح بھی تین دن رات قبر میں رہے اور یوناہ نبی کی طرح خدا تعالیٰ کی حفاظت میں رہے۔ آخر کسی کا مچھلی کے پیٹ میں چلے جانا تو کوئی معجزہ نہیں۔ ہزاروں لوگ مچھلی کے پیٹ میں چلے جاتے ہیں اور کوئی نہیں کہتا کہ یہ معجزہ ہوا ہے پھر یوناہ نبی کا کیا معجزہ تھا؟ یوناہ نبی کا معجزہ یہ تھا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں خدا تعالیٰ کی حفاظت میں رہا۔ تا کہ اس کی قوم کے لئے اس کا وجود خدا تعالیٰ کا ایک نشان ثابت ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ یوناہ نبی کس طرح مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات رہا۔ اس کے لئے ہم یوناہ نبی کی کتاب کو دیکھتے ہیں اس میں لکھا ہے:۔

’’خداوند کا کلام یوناہ بن متی پر نازل ہوا۔ کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور اس کے خلاف منادی کر کیونکہ ان کی شرارت میرے حضور پہنچی ہے (نینوہ ایک بڑا شہر تھا خدا تعالیٰ نے یوناہ سے کہا کہ جاؤ اور ان لوگوں کو سمجھاؤ) لیکن یوناہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو بھاگا اور یافا میں پہنچا اور وہاں اسے ترسیس کو جانے والا جہاز ملا۔ اور وہ کرایہ دے کر اس میں سوار ہوا تا کہ خداوند کے حضور سے ترسیس کو اہل جہاز کے ساتھ جائے (یعنی بجائے اس کے کہ وہ اور نبیوں کی طرح خدا تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کرتے اور نینوہ والوں کو تبلیغ کرتے ان کے دل میں خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ بڑا رحیم و کریم ہے پہلے اس کی طرف سے عذاب کی خبریں ملتی ہیں اور پھر لوگوں کے تضرع پر وہ ان کو معاف کر دیتا ہے اور لوگ نبیوں کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں نینوہ میں جاتا ہی نہیں۔ چنانچہ وہ ترسیس جانے کے لئے جہاز میں سوار ہو گئے) لیکن خداوند نے سمندر پر بڑی آندھی بھیجی اور سمندر میں سخت طوفان برپا ہوا اور اندیشہ تھا کہ جہاز تباہ ہو جائے۔ تب ملاح ہراساں ہوئے اور ہر ایک نے اپنے دیوتا کو پکارا اور وہ اجناس جو جہاز میں تھیں سمندر میں ڈال دیں تا کہ اسے ہلکا کریں (پہلے زمانہ میں بادبانی جہاز ہوتے تھے جو زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے تھے اس لئے جب طوفان آتا اور جہاز ڈوبنے کا خطرہ ہوتا تو وہ اپنے سامان کا کچھ حصہ سمندر میں پھینک

دیتے تھے تا کہ اس کا بوجھ ہلکا ہو جائے) لیکن یوناہ جہاز کے اندر پڑا سو رہا تھا (باقی لوگ تو دعائیں کر رہے تھے اور جہاز کا بوجھ ہلکا کر رہے تھے اور یوناہ اندر سو رہے تھے) تب ناخدا اس کے پاس جا کر کہنے لگا تو کیوں پڑا سو رہا ہے اٹھ اپنے معبود کو پکار شاید وہ ہم کو یاد کرے اور ہم ہلاک نہ ہوں اور انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم قرعہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ آفت ہم پر کس کے سبب سے آئی۔ چنانچہ انہوں نے قرعہ ڈالا اور یوناہ کا نام نکلا۔ تب انہوں نے اس سے کہا۔ تو ہم کو بتا کہ یہ آفت ہم پر کس سبب سے آئی ہے۔ تیرا کیا پیشہ ہے اور تو کہاں سے آیا ہے۔ تیرا وطن کہاں ہے اور تو کس قوم کا ہے اس نے ان سے کہا میں عبرانی ہوں (ضمنی طور پر ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ بائبل کا یہ بیان غلط ہے یوناہ عبرانی نہیں تھا بلکہ کسی اور قوم کا نبی تھا۔ کیونکہ وہ نینوہ والوں کی طرف بھیجا گیا تھا جو کہ اشور کا دارالخلافہ تھا اور وہاں کے لوگ اشور قوم کے تھے۔ اشور سے مراد سیریا یعنی شام کا علاقہ نہیں بلکہ یہ الگ علاقہ ہے اور شہر بابل کے شمال سے شروع ہو کر آرمینیا کی سرحد سے جا ملتا ہے اور مشرقی طرف اس کی کردستان سے ملتی ہے اور مغربی سمت دجلہ کے مغرب کے علاقہ کے ایک حصہ پر مشتمل ہے۔ گویا موجودہ عراق کا ایک حصہ اس میں شامل ہے۔ ایک زمانہ میں اس علاقہ میں زبردست حکومت قائم تھی۔ اس کا دارالخلافہ پہلے تو اسور تھا جو موصل سے ساٹھ میل جانب شمال واقعہ تھا اور اب اسے قلعات شرجت کہتے ہیں لیکن تیرہ سو سال قبل مسیح اس شہر کو چھوڑ کر نینوہ کو دارالحکومت قرار دیا گیا۔ محققین یورپ بھی اس بارہ میں مختلف الخیال ہیں کہ آیا یونس نبی اسرائیلی ہے یا نہیں۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Jonah) اور خداوند آسمان کے خدا بحر و بر کے خالق سے ڈرتا ہوں۔ تب وہ خوف زدہ ہو کر اس سے کہنے لگے تو نے یہ کیا کیا۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ وہ خداوند کے حضور سے بھاگا ہے۔ اس لئے کہ اس نے خود ان سے کہا تھا تب انہوں نے اس سے پوچھا ہم تجھ سے کیا کریں کہ سمندر ہمارے لئے ساکن ہو جائے کیونکہ سمندر زیادہ طوفانی ہوتا جاتا تھا؟ تب اس نے ان سے کہا مجھ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو تو تمہارے لئے سمندر ساکن ہو جائے گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ بڑا طوفان تم پر میرے ہی سبب سے آیا ہے تو بھی ملاحوں نے ڈانڈ چلانے میں بڑی محنت کی کہ کنارہ پر پہنچیں لیکن نہ پہنچ سکے کیونکہ سمندر ان کے خلاف اور بھی زیادہ موجزن ہوتا جاتا تھا۔ تب انہوں نے خداوند کے حضور گڑگڑا کر کہا۔ اے خداوند ہم تیری منت کرتے ہیں کہ ہم اس آدمی کی جان کے سبب سے ہلاک

نہ ہوں اور تو خون ناحق کو ہماری گردن پر نہ ڈالے۔ کیونکہ اے خداوند تو نے جو چاہا سو کیا اور انہوں نے یوناہ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا اور سمندر کا تلاطم موقوف ہو گیا تب وہ خداوند سے بہت ڈر گئے اور انہوں نے اس کے حضور قربانی گزرانی اور نذریں مانیں لیکن خداوند نے ایک بڑی مچھلی مقرر کر رکھی تھی کہ یوناہ کو نگل جائے اور یوناہ تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ تب یوناہ نے مچھلی کے پیٹ میں خداوند اپنے خدا سے یہ دعا کی۔ میں نے اپنی مصیبت میں خداوند سے دعا کی اور اس نے میری سنی۔ میں نے پاتال کی تہ سے دہائی دی تو نے میری فریاد سنی۔ تو نے مجھے گہرے سمندر کی تہ میں پھینک دیا اور سیلاب نے مجھے گھیر لیا۔ تیری سب موجیں اور لہریں مجھ پر سے گزر گئیں اور میں سمجھا کہ تیرے حضور سے دور ہو گیا ہوں۔ لیکن میں پھر تیری مقدس ہیکل کو دیکھوں گا سیلاب نے میری جان کا محاصرہ کیا سمندر میری چاروں طرف تھا۔ بحری نبات میرے سر پر لپٹ گئی۔ میں پہاڑوں کی تہ تک غرق ہو گیا۔ زمین کے اڑبنگے ہمیشہ کے لئے مجھ پر بند ہو گئے۔ تو بھی اے خداوند میرے خدا تو نے میری جان پاتال سے بچائی جب میرا دل بیتاب ہوا تو میں نے خداوند کو یاد کیا اور میری دعا تیری مقدس ہیکل میں تیرے حضور پہنچی۔ جو لوگ جھوٹے معبودوں کو مانتے ہیں وہ شفقت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ میں حمد کرتا ہوا تیرے حضور قربانی گذرانوں گا۔ میں اپنی نذریں ادا کروں گا۔ نجات خداوند کی طرف سے ہے اور خداوند نے مچھلی کو حکم دیا اور اس نے یوناہ کو خشکی پر اگل دیا اور خداوند کا کلام دوسری بار یوناہ پر نازل ہوا کہ اٹھ اس بڑے شہر نینوہ کو جا اور وہاں اس بات کی منادی کر جس کا میں تجھے حکم دیتا ہوں۔ تب یوناہ خداوند کے کلام کے مطابق اٹھ کر نینوہ کو گیا اور نینوہ بہت بڑا شہر تھا۔ اس کی مسافت تین دن کی راہ تھی اور یوناہ شہر میں داخل ہوا اور ایک دن کی راہ چلا۔ اس نے منادی کی اور کہا چالیس روز کے بعد نینوہ برباد کیا جائے گا تب نینوہ کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ واعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا اور یہ خبر نینوہ کے بادشاہ کو پہنچی۔ اور وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا اور بادشاہ اور اس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوہ میں یہ اعلان کیا گیا۔ اور اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے نہ پئے۔ لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ وزاری کریں بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے شاید خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ

بدلے اور اپنے قہر شدید سے باز آئے اور ہم ہلاک نہ ہوں جب خدا نے ان کی یہ حالت دیکھی کہ وہ اپنی اپنی بری روش سے باز آئے تو وہ اس عذاب سے جو اس نے ان پر نازل کرنے کو کہا تھا باز آیا اور اسے نازل نہ کیا۔لیکن یوناہ اس سے نہایت ناخوش اور ناراض ہوا اور اس نے خداوند سے یوں دعا کی کہ اے خداوند جب میں اپنے وطن ہی میں تھا اور ترسیس کو بھاگنے والا تھا تو کیا میں نے یہی نہ کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تو رحیم و کریم خدا ہے جو قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔اب اے خداوند میں تیری منت کرتا ہوں کہ میری جان لے لے کیونکہ میرے اس جینے سے مر جانا بہتر ہے تب خداوند نے فرمایا کیا تو ایسا ناراض ہے۔اور یوناہ شہر سے باہر مشرق کی طرف جا بیٹھا اور وہاں اپنے لئے ایک چھپر بنا کر اس کے سایہ میں بیٹھ رہا کہ دیکھے شہر کا کیا حال ہوتا ہے۔تب خداوند خدا نے کدو کی بیل اگائی اور اسے یوناہ کے اوپر پھیلایا کہ اس کے سر پر سایہ ہو اور وہ تکلیف سے بچے۔(بائبل کہتی ہے اس نے پہلے چھپر بنایا اور پھر خدا نے کدو کی بیل اُگائی حالانکہ چھپر کے بعد بیل کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی چھپر زیادہ آرام دہ ہوتا ہے مگر قرآن کریم میں چھپر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا خالی بیل کا ذکر کیا گیا ہے (الصّٰفّٰت:۱۴۷) جو ثبوت ہے کہ قرآنی بیان ہی صحیح ہے اور عقل کے مطابق ہے) اور یوناہ اس بیل کے سبب سے نہایت خوش ہوا لیکن دوسرے دن صبح کے وقت خدا نے ایک کیڑا بھیجا جس نے اس بیل کو کاٹ ڈالا۔اور وہ سوکھ گئی اور جب آفتاب بلند ہوا تو خدا نے مشرق سے لو چلائی اور آفتاب کی گرمی نے یوناہ کے سر میں اثر کیا اور وہ بیتاب ہو گیا اور موت کا آرزومند ہو کر کہنے لگا کہ میرے اس جینے سے مر جانا بہتر ہے اور خدا نے یوناہ سے فرمایا کیا تو اس بیل کے سبب سے ایسا ناراض ہے اس نے کہا میں یہاں تک ناراض ہوں کہ مرنا چاہتا ہوں تب خداوند نے فرمایا کہ تجھے اس بیل کا اتنا خیال ہے جس کے لئے تو نے نہ کچھ محنت کی اور نہ اسے اُگایا جو ایک ہی رات میں اُگی اور ایک ہی رات میں سوکھ گئی اور کیا مجھے لازم نہ تھا کہ میں اتنے بڑے شہر نینوہ کا خیال کروں۔جس میں ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ ایسے ہیں جو اپنے دہنے اور بائیں ہاتھ میں امتیاز نہیں کر سکتے اور بے شمار مویشی ہیں۔'' (یوناہ باب ۱ تا ۴)

یہ ہے وہ یوناہ نبی کا واقعہ جس کی طرف حضرت مسیح اشارہ کرتے ہیں۔اس واقعہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوناہ نبی کو جب یہ الہام ہوا کہ جا اور اپنی قوم کو تبلیغ کر۔تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی قوم کو تبلیغ کرتے اس خیال

سے کہ نبی جب تبلیغ کرتے ہیں تو انہیں کچھ انذاری پیشگوئیاں بھی ملتی ہیں۔لیکن خدا تعالیٰ رحم کر کے اپنے بندوں کو معاف کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں شرمندہ ہونا پڑتا ہے،انہوں نے ایک دوسرے ملک کو بھاگ کر جانا چاہا تا کہ وہ اس ذلت سے بچ سکیں جو انہیں اپنی قوم سے پہنچ سکتی تھی۔لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ وہ نینوہ کے لوگوں کی طرف ہی جائیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں۔چنانچہ اس نے تدبیر کر کے انہیں سمندر میں پھینکوادیا۔اور پھر ایک بڑی مچھلی کو انہیں نگل جانے کا حکم دے دیا جس نے انہیں زندہ نگل لیا۔چنانچہ بائبل کے بیان کے مطابق وہ مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے اور دعائیں زندہ شخص ہی کیا کرتا ہے نہ کہ مردہ۔پس مچھلی کے پیٹ میں وہ زندہ گئے اور مچھلی کے پیٹ میں جب تک رہے زندہ رہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق مچھلی نے آپ کو اگل دیا۔سمندر میں نہیں بلکہ خشکی پر اور پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نینوہ کے لوگوں کی تبلیغ کے لئے بھجوایا گیا۔چنانچہ وہ گئے اور اپنی تبلیغ میں کامیاب ہوئے۔اس معجزہ سے ظاہر ہے کہ

(۱) یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا۔

(۲) وہ مچھلی کے پیٹ میں تین دن رات زندہ رہا۔

(۳) وہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا۔

(۴) اس کا اصل تبلیغ کا زمانہ مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد شروع ہوا۔

پہلے تو انہوں نے لوگوں کو بتایا ہی نہیں کہ مجھے تمہاری اصلاح کے لئے بھجوایا گیا ہے۔ممکن ہے چند لوگوں سے انہوں نے ذکر کیا ہو لیکن عام لوگوں کو ان کے مشن کی کوئی خبر نہیں تھی۔وہ وہاں سے بھاگے اور انہوں نے چاہا کہ ایک دوسرے ملک کو نکل جائیں لیکن مچھلی کے واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو اپنے ملک میں بھجوا کر کہا کہ اب تبلیغ کرو۔چنانچہ انہوں نے تبلیغ کی اور لوگ آپ پر ایمان لائے۔

اس نشان کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ واقعہ اسی صورت میں مسیح پر چسپاں ہو سکتا ہے۔جب

اول۔مسیح زندہ قبر میں جائے۔

دوم۔مسیح زندہ قبر میں رہے۔

سوم۔مسیح زندہ قبر میں سے نکلے۔

چہارم۔قبر سے نکلنے کے بعد اسے ایک کامیاب تبلیغ کا زمانہ میسر آئے۔

یہ چار چیزیں ہیں جو یوناہ نبی کے واقعہ سے نکلتی ہیں۔اگر مسیحی کہانی صلیبی موت کی ٹھیک ہے تو پھر یہ چاروں باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں (۱) اگر مسیح صلیب پر مر گیا اور زندہ قبر میں نہیں گیا اور (۲) اگر مسیح قبر میں تین دن رات مرا رہا بلکہ دوزخ میں رہا۔تو یوناہ نبی سے اس کی کوئی مشابہت ثابت نہیں ہوسکتی۔کیونکہ یوناہ نبی تین دن رات مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا۔اور اس کی خدا تعالیٰ سے صلح رہی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا رہا۔لیکن مسیح اول تو مر کر قبر میں گیا اور پھر دوزخ میں رہا۔گویا وہ خدا تعالیٰ سے دور ہو گیا۔(۳) اسی طرح اگر مسیح قبر میں سے دوبارہ زندہ ہو کر نکلے ہیں تو اس صورت میں بھی وہ یوناہ نبی کے مثیل نہیں ہوسکتے۔کیونکہ یوناہ نبی مچھلی کے پیٹ سے دوبارہ زندہ ہو کر نہیں نکلے وہ پہلے بھی زندہ تھے، مچھلی کے پیٹ میں بھی زندہ رہے اور زندہ ہی مچھلی کے پیٹ میں سے نکلے۔(۴) اگر قبر میں سے جی اٹھنے کے بعد مسیح کا مشن ختم ہو گیا جیسے مسیحیت کہتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر پہلے تین دن دوزخ میں رہا اور جب وہ دوبارہ جی کر اٹھا تو آسمان پر اپنے باپ کے تخت پر بیٹھنے کے لئے چلا گیا۔تو اس کی یوناہ نبی سے کوئی بھی مشابہت باقی نہیں رہتی۔کیونکہ یوناہ نبی کا تو یہ معجزہ تھا کہ اسے مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک کامیاب تبلیغ کا موقع عطا فرمایا اور درحقیقت اصل معجزہ یہی تھا کہ خدا تعالیٰ نے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ دیکھو یوناہ نے میری بات کو رد کیا اور وہ میرا پیغامبر نہ بنا وہ ڈرا کہ میں لوگوں میں ذلیل ہوں گا اور لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے۔چنانچہ وہ بھاگا لیکن ہم نے اسے مچھلی کے پیٹ میں ڈالا اور پھر مچھلی کے پیٹ میں زندہ رکھا اور آخر ہم نے مچھلی کو حکم دیا تو اس نے یوناہ کو خشکی پر اگل دیا۔اس کے بعد ہم نے پھر اسے نینوہ میں ہی بھجوایا اور اس نے تبلیغ کی اور وہ اپنی تبلیغ میں کامیاب رہا۔اس طرح خدا تعالیٰ نے اس بات کا اظہار کیا کہ جس شخص کو خدا اپنا پیغامبر بناتا ہے وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا بھی کمزور خیال کرے اور خواہ دنیا کے لوگ اسے کتنا بھی حقیر سمجھیں اللہ تعالیٰ یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ اسی کے ذریعہ اپنے پیغام کو کامیاب کرے اور لوگوں میں اسے مقبول بناوے۔یہ ہے یوناہ کا اصل نشان جو نینوہ والوں کو دکھایا گیا لیکن مسیح کا واقعہ جس رنگ میں عیسائی پیش کرتے ہیں اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کی یوناہ سے کوئی بھی مشابہت ثابت نہیں ہوسکتی۔کیونکہ یوناہ نبی کا اصل معجزہ یہ تھا کہ اسے تبلیغ کا موقعہ دیا گیا اور لوگوں نے دیکھا کہ وہی جو اپنی کمزوری کی وجہ سے ڈر کر بھاگ گیا تھا ایک کامیاب مصلح ثابت ہوا اور لوگوں نے اس کو قبول کر کے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی۔ورنہ یوناہ نبی جب مچھلی کے پیٹ میں گئے تھے نینوہ والوں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔یوناہ جب مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہے تب بھی نینوہ والوں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔یوناہ جب مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلے تب بھی نینوہ والوں نے ان کو نہیں دیکھا تھا۔ان کے اور نینوہ والوں

کے درمیان اس وقت پانچ سات سو بلکہ ہزار میل کا فاصلہ تھا۔ انہوں نے یہ کب دیکھا کہ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں گیا ہے یا مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا ہے یا مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلا ہے پس ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں تھی جو نینوہ والوں نے دیکھی ہو۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں گیا تب بھی نینوہ والوں نے اسے نہیں دیکھا۔ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا تب بھی نینوہ والوں نے اسے نہیں دیکھا اور جب مچھلی نے اسے اُگل دیا تب بھی نینوہ والوں نے اسے نہیں دیکھا لیکن جب یوناہ نینوہ والوں کے پاس دوبارہ گیا اور انہوں نے دیکھا کہ یہ وہ شخص ہے جو ڈر کر بھاگ گیا تھا مگر پھر خدا تعالیٰ اسے پکڑ کر واپس لایا ہے اور جس جگہ کے متعلق یہ سمجھتا تھا کہ وہاں مجھے کامیابی نہیں ہوگی وہیں اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی عطا فرمائی ہے تو یہ خدا تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کی طاقتوں کا ایک بہت بڑا نشان بن گیا جو انہوں نے دیکھا اور مسیح نے اپنے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ

''جس طرح یوناہ نینوہ کے لوگوں کے لئے نشان ٹھہرا اسی طرح ابن آدم بھی اس زمانہ کے لوگوں کے لئے ٹھہرے گا۔'' (لوقا باب ۱۱ آیت ۳۰)

اب سوال یہ ہے کہ نینوہ والوں نے کیا دیکھا تھا۔ نینوہ والوں نے یوناہ کو مچھلی کے پیٹ میں جاتے نہیں دیکھا۔ مچھلی کے پیٹ میں رہتے نہیں دیکھا مچھلی کے پیٹ میں سے نکلتے نہیں دیکھا۔ نینوہ والوں نے یہی دیکھا کہ ایک شخص پر الہام نازل ہوا کہ جا اور نینوہ والوں کو ہماری طرف بلا۔ مگر اسے جرات نہ ہوئی کہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغام ان کو پہنچائے۔ اور اس نے بھاگ کر کسی اور ملک کو جانا چاہا مگر کئی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بعد خدا تعالیٰ اسے پھر نینوہ والوں کے پاس لایا اور نینوہ والے اس کا پیغام ماننے پر مجبور ہو گئے۔ پس اگر کوئی نشان ایسا ہے جو نینوہ والوں نے دیکھا تو وہ یہی نشان ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک مچھلی کے پیٹ میں ان کا جانا ہے یہ بھی ایک نشان ہے مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہنا یہ بھی ایک نشان ہے اور مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلنا یہ بھی ایک نشان ہے مگر یہ نشانات ایسے ہیں جو نینوہ والوں نے نہیں دیکھے انہوں نے جو نشان دیکھا وہ یہی ہے کہ یوناہ نبی کے دل میں وسوسہ پیدا ہوا اور وہ وہاں سے چلا گیا۔ اس نے نہ چاہا کہ نبوت کا پیغام لوگوں تک پہنچائے۔ لیکن خدا اُسے سینکڑوں میل سے مجبور کر کے اور کئی قسم کی تکلیفوں میں سے گزار کر پھر اسے اپنی قوم کے پاس لایا اور خدا تعالیٰ نے وہ مشن پورا کر کے دکھا دیا جس کے لئے اس نے یوناہ کو کھڑا کیا تھا۔ لوگوں نے ان کا انکار بھی کیا، مقابلہ بھی کیا مگر آخر قوم کو جھکنا پڑا۔ یہ نشان تھا جو نینوہ والوں نے دیکھا پس مسیح کے لئے بھی یہ نشان اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب مسیح قبر میں زندہ جائے، قبر میں زندہ رہے اور قبر میں سے زندہ نکلے۔ مگر اتنا حصہ وہ ہوگا جس کو دشمن نے نہیں دیکھا۔ اس کے بعد نشان

کا یہ حصہ آئے گا کہ وہ بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو تبلیغ کر کے جو اس وقت نینوہ کے قریب اور ایران اور افغانستان اور کشمیر میں رہتی تھیں اپنے مذہب میں داخل کرے اور اس طرح اس مقصد میں کامیاب ہو جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا۔ اگر ایسا ہو جائے تو یوناہ نبی سے مسیح کی مماثلت ثابت ہو جاتی ہے اور وہ معجزہ جس کے دکھانے کا انہوں نے وعدہ کیا تھا وہ دنیا پر ظاہر ہو جاتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یوناہ نبی والا نشان پورا نہیں ہو سکتا۔ بہر حال جس طرح یوناہ نبی نے مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اپنی قوم کو تبلیغ کی اور وہ اس تبلیغ میں کامیب ہوئے اسی طرح مسیح کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ قبر میں سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو تبلیغ کرتا اور انہیں ہدایت پر لاتا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو یوناہ نبی کا نشان مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے وہی نشان دکھایا ہے جو یوناہ نبی نے اپنی قوم کو دکھایا تھا۔ نینوہ والوں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہ شخص جو اپنے آپ کو نا قابل سمجھتے ہوئے یہاں سے بھاگ گیا تھا اور جس نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے گریز کیا تھا وہ پھر ہم میں واپس آیا اور ہم اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوئے۔ لیکن مسیح واقعۂ صلیب کے بعد اگر غائب ہو گیا تھا تو یوناہ سے اس کی مشابہت کس طرح ہوئی اور نینوہ والوں کی طرح کونسا نشان تھا جو لوگوں نے دیکھا۔ گویا وہ نشان جو یوناہ نبی کی طرح مسیح کے لئے دکھانا ضروری تھا اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بھی کام لے لیتا ہے جو اپنے آپ کو کام کے نا قابل سمجھتے ہیں وہ تو مسیح نے نہ دکھایا اور وہ حصہ جو یوناہ نبی نے لوگوں کو نہیں دکھایا تھا وہ مسیح نے دکھا دیا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں گیا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں سے زندہ نکلا مگر نینوہ والوں نے یہ نشان نہیں دیکھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ جب یوناہ کو پھر نینوہ میں لایا تو انہوں نے لوگوں کو کام کر کے دکھایا کہ دیکھو خدا تعالیٰ سے کوئی شخص بھاگ نہیں سکتا۔ میں بھاگا تھا مگر پھر مجھے پکڑ کر خدا تمہاری طرف واپس لایا۔ یہ نشان تھا جو لوگوں نے دیکھا اور ہر شخص جو معمولی عقل و سمجھ سے کام لے کر بھی اس نشان پر غور کرے گا وہ بے اختیار یہ کہہ اُٹھے گا کہ سبحان اللہ یہ کتنا بڑا نشان ہے۔ یوناہ اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغامبر بنے اور وہ ڈر کر کسی اور ملک کی طرف بھاگا مگر خدا اسے پکڑ کر پھر نینوہ والوں کے پاس لایا اور جب اس نے پیغام پہنچایا تو وہی نینوہ والے جن کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اس پر ایمان لانے پر مجبور ہوئے اور انہوں نے یوناہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ وہ اس نشان پر جتنا بھی غور کرے گا اسے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں پر ایمان لانا پڑے گا اور وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ اللہ تعالیٰ کتنی بڑی طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے رُتبہ بخشتا ہے لیکن اگر یوناہ لوگوں سے

یہ کہتا کہ دیکھو میں مچھلی کے پیٹ میں زندہ رہا تھا یا مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکلا تھا۔ تو لوگ کہتے یہ بالکل جھوٹ اور فریب ہے ہم اسے نہیں مان سکتے۔ پس مسیح کی یوناہ نبی سے مماثلت اگر پوری ہوسکتی تھی تو اسی طرح کہ وہ یوناہ نبی کی طرح زندہ ہی قبر میں جاتا، زندہ ہی قبر میں رہتا اور زندہ ہی قبر میں سے نکلتا اور پھر واقعہ صلیب کے بعد بنی اسرائیل کے ایک حصہ میں کامیاب تبلیغ کرتا۔ لیکن انجیل ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جو نشان یوناہ نے لوگوں کو نہیں دکھایا تھا وہ تو مسیح نے لوگوں کو دکھایا اور جو نشان یوناہ نے لوگوں کو دکھایا وہ مسیح نے نہیں دکھایا۔ مچھلی کے پیٹ میں زندہ جانے، اس کے پیٹ میں زندہ رہنے اور اس کے پیٹ میں سے زندہ نکلنے کا نشان یوناہ نے نینوہ والوں کو نہیں دکھایا۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ قبر میں جانے، قبر میں رہنے اور قبر میں سے نکلنے کا نشان مسیح نے لوگوں کو دکھایا۔ پھر بائبل بتاتی ہے کہ یوناہ نے نینوہ والوں کو یہ نشان دکھایا کہ مچھلی کے پیٹ میں سے نکلنے کے بعد اس نے تبلیغ کی اور نینوہ والے اسے ماننے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن انجیل کہتی ہے کہ مسیح قبر میں سے نکلنے کے بعد غائب ہوگیا اور اس نے کوئی تبلیغ نہیں کی۔ گویا جو نشان یوناہ نے دکھایا تھا اور جو اصل نشان تھا وہ تو مسیح نے نہیں دکھایا اور جو نہیں دکھایا تھا وہ مسیح نے دکھایا۔ پھر بائبل تو بتاتی ہے کہ یوناہ مچھلی کے پیٹ میں زندہ گیا، زندہ رہا، اور زندہ نکلا۔ لیکن مسیحی کہتے ہیں کہ مسیح قبر میں مر کر گیا، قبر میں تین دن مردہ پڑا رہا اور پھر دوبارہ زندہ ہوکر باہر نکل آیا۔ اگر مسیحیوں کی یہ بات درست ہے تو یوناہ نبی کا نشان مسیح نے نہیں دکھایا اور اگر اس نے یوناہ نبی کا نشان دکھایا تھا اور وہ صلیب پر نہیں مرا۔ نہ مردہ ہونے کی حالت میں قبر میں رہا تو کفارہ کا مسئلہ بالکل ختم ہوجاتا ہے۔ کیونکہ کفارہ تب ثابت ہوتا ہے جب یہ مانا جائے کہ مسیح نے صلیب پر لٹک کر لوگوں کے گناہ اٹھالئے۔ اگر وہ زندہ ہی رہا تھا تو ثابت ہوا کہ اس نے کوئی قربانی نہیں دی تھی اور جب قربانی نہیں دی تھی تو کفارہ بھی باطل ہوا۔

غرض صلیب کا واقعہ جسے مسیحی پیش کرتے ہیں سر تا پا اس نشان کے خلاف ٹھہرتا ہے جو یوناہ نے دکھایا تھا اور جس کے دکھانے کا مسیح نے اپنی قوم سے وعدہ کیا تھا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نتیجہ جو ہم نے یوناہ نبی کی پیشگوئی سے نکالا ہے آیا اس کا ذکر مسیح کی کسی پیشگوئی میں بھی ہے؟ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم انجیل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت آتی ہے کہ یہی بات حضرت مسیح نے بھی بیان کی ہے بلکہ مسیح سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں اور جنہوں نے حضرت مسیح کے آنے کی پیشگوئی کی تھی انہوں نے بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے چنانچہ یسعیاہ میں لکھا ہے:۔

’’خداوند یہوواہ جو اسرائیل کے تتر بتر کئے ہوؤں کا جمع کرنے والا ہے یوں فرماتا ہے کہ میں

ان کے سوا جو اسی کے ہو کے جمع ہوئے ہیں اوروں کو بھی اس پاس جمع کروں گا۔‘‘

(یسعیاہ باب ۵۶ آیت ۸)

یہاں یسعیاہ نبی یہ پیشگوئی فرماتے ہیں کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جبکہ خدا تعالیٰ اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو پھر اکٹھا کرے گا اور ایک نبی بھیجے گا جس کے ارد گرد وہ جمع ہو جائیں گی۔ یسعیاہ نبی جو اس جگہ خبر دیتے ہیں یہ مسیح کے بارہ میں ہے کیونکہ مسیح کے سوا اور کوئی شخص نہیں جس نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ میں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں۔ یہ جو گمشدہ بھیڑیں ہیں ان سے مراد بنی اسرائیل کے وہ دس قبیلے ہیں جن کو نبوکدنضر کے زمانہ میں عراقی حکومت نے حملہ کر کے تباہ کر دیا تھا اس حملہ کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اس وقت یہودیوں میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے کی دشمنی میں مشغول رہتے تھے چنانچہ اس وقت یہود کی دو حکومتیں بنی ہوئی تھیں ایک اسرائیلی کہلاتے تھے اور دوسرے یہودی کہلاتے تھے ایک یروشلم سے تعلق رکھتے تھے اور دوسروں نے اپنا الگ دارالحکومت بنایا ہوا تھا جب عراقی حکومت نے یہودی حکومت کو تباہ کرنے کے لئے حملہ کیا تو یہود کا ایک حصہ دوسروں کی دشمنی کی وجہ سے اس کے ساتھ مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی حکومت یہود کی آپس کی پھوٹ کی وجہ سے ملک پر غالب آ گئی۔ اور اس نے یہود کے تمام مقدس مقامات تباہ کر دیئے حتیٰ کہ یروشلم کا معبد جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا بنایا ہوا تھا اس میں سور کی قربانی کی گئی اور اسی طرح اور بہت کچھ مظالم کئے گئے چونکہ یہود کا حکومت سے دیر سے مقابلہ چلا آتا تھا اس لئے حکومت نے فیصلہ کیا کہ اب ان کا پوری طرح قلع قمع کر دیا جائے۔ چنانچہ بارہ یہودی قبائل میں سے دس کو اس نے پکڑ لیا اور مشرق کے علاقہ میں لا کر پھیلا دیا۔ صرف دو قبائل فلسطین میں رہ گئے تھے اور یہ دو قبائل وہ تھے جنہوں نے اپنی قوم سے دشمنی کر کے دشمن کا ساتھ دیا تھا۔ اس لئے ان سے دشمن نے رعایت برتی۔ بہرحال وہ دس قبائل جو مشرق کے علاقہ میں لا کر پھیلا دیئے گئے تھے ان کے متعلق بائبل میں تو اتنا ہی لکھا ہوا ہے کہ ایران کے مشرق کے علاقہ میں یہود کے دس قبائل کو پھیلا دیا گیا۔ لیکن ہماری تحقیقات سے ثابت ہے کہ یہ علاقے افغانستان اور کشمیر کے تھے اور چونکہ ایک لمبا فاصلہ درمیان میں حائل ہو گیا تھا اور بابلیوں کی کوشش بھی یہی تھی کہ یہ لوگ واپس نہ آئیں۔ اس لئے دیر تک ان کا حال چھپا رہا۔ مگر تمام یہود انہوں نے مشرق میں نہیں بھیجے بلکہ کچھ لوگ اپنی خدمت کے لیئے انہوں نے بابل اور اس کے ارد گرد رکھ لئے تھے یہ لوگ جو وہاں رہے تھے فارس اور میڈ کے بادشاہوں کی مدد سے پھر واپس آئے اور انہوں نے یروشلم کی بستیاں دوبارہ بسائیں (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ سائرس) ان یہودیوں کا قرآن کریم میں بھی ذکر آتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو کشمیر اور افغانستان بھیج دئے گئے تھے ان کا

واپس آنا مشکل تھا۔ اور پھر چونکہ وہ ایک لمبا عرصہ بدھوں کے ساتھ رہے اور ان کی تہذیب سے متاثر ہو گئے اس لئے وہ اپنی روایات اور اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کو بھی بھول گئے ۔ اس وجہ سے ان کے واپس آنے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق یہود کا یہ خیال تھا کہ یسعیاہ نبی کی پیشگوئی کے مطابق مسیح ان گمشدہ بھیڑوں کو واپس لا کر اپنی قوم سے ملا دے گا اور یسعیاہ نبی کی پیشگوئی جس سے یہود کو یہ امید تھی کہ ان کی گمشدہ بھیڑیں پھر اپنے بھائیوں سے آملیں گی وہی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام بھی اس بارہ میں کئی جگہ پر ذکر فرماتے ہیں ۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنے شاگردوں کی جماعت کو تبلیغ کے لئے بھجوایا تو اس موقعہ پر انہوں نے اپنے شاگردوں کو جو نصیحتیں کیں ان میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' (متی باب ۱۰ آیت ۶)

یہ نصیحت انہوں نے اسی لئے کی تا کہ وہ پیشگوئی پوری ہو جائے جو یسعیاہ نبی نے کی تھی کہ جو اسرائیلی کھوئے گئے ہیں وہ مسیح کے ذریعہ پھر اکٹھے ہو جائیں گے آپ کہتے ہیں غیر قوموں کی طرف توجہ نہ کرنا بلکہ صرف اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور انہیں تبلیغ کرنا۔

اسی طرح متی باب ۱۵ آیت ۲۱ تا ۲۸ میں لکھا ہے کہ ایک عورت کی لڑکی بیمار تھی معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں عام طور پر یہ خیال پایا جاتا تھا کہ جن آدمی کو بیمار کر دیا کرتے ہیں اور اگر جن نکال دیا جائے تو آدمی اچھا ہو جاتا ہے اس نے سنا ہوا تھا کہ مسیح جن نکالتا ہے ایک دفعہ حضرت مسیح کہیں جا رہے تھے کہ اس نے آپ کو دیکھ لیا اور وہ آپ کے پیچھے پیچھے شور مچاتی اور آوازیں دیتی دوڑی کہ اے خدا کے مقدس مجھ پر رحم کر اور میری لڑکی کا جن نکال دے۔ لیکن حضرت مسیح اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ غیر قوم کی تھی مگر وہ برابر شور مچاتی چلی جاتی تھی اور درخواست کرتی تھی کہ اس کی بیٹی کو بدروح سے بچایا جائے ۔ جب شاگردوں نے دیکھا کہ اس طرح ایک عورت پیچھے پیچھے شور مچاتی آ رہی ہے تو انہوں نے آپ کو توجہ دلائی کہ حضور یہ عورت میلوں میل سے بھاگی چلی آ رہی ہے اور شور مچا رہی ہے۔ کہ میری بیٹی کی بدروح نکالی جائے۔ اس پر حضرت مسیح نے کہا۔

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔''

اس میں حضرت مسیح نے بتایا کہ میرا اصل مقصد یہ ہے کہ اسرائیل کے گھرانے کی وہ دس قومیں جو کھوئی گئی ہیں

انہیں تبلیغ کروں اور انہیں پھر اپنے مذہب پر قائم کروں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبیوں کو الہام سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ دوسری قوموں میں رہنے کی وجہ سے وہ اپنے مذہب کو بھول چکی ہیں اور موسوی شریعت پر ان کا عمل نہیں رہا۔ اور خدا تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ دوبارہ ان کو مذہب کی طرف لایا جائے ''کھوئی ہوئی بھیڑوں'' کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ظاہری طور پر وہ غیر ملک میں چلی گئی تھیں بلکہ روحانی طور پر بھی غیر مذاہب کا اثر انہوں نے قبول کر لیا تھا پس وہ روحانی اور جسمانی دونوں لحاظ سے کھوئی ہوئی تھیں۔ اسی وجہ سے جس طرح حضرت مسیح نے یہ کہا کہ یوناہ نبی کے نشان کے سوا اور کوئی نشان یہودیوں کو نہیں دکھایا جائے گا اور یہی میرا سب سے بڑا نشان ہوگا۔ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ میرا سب سے بڑا مشن یہی ہے کہ میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کو پھر جمع کروں۔ اسی طرح یوحنا میں حضرت مسیحؑ کا یہ قول درج ہے کہ

''میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں مجھے ان کو بھی لانا ضرور ہے اور وہ میری آواز سنیں گی۔ پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا۔'' (یوحنا باب ۱۰ آیت ۱۶)

یہاں حضرت مسیحؑ یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ یہودی کسی اور ملک میں رہتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ ''میری اور بھی بھیڑیں ہیں جو اس بھیڑ خانہ کی نہیں'' یعنی اس ملک کی نہیں بلکہ وہ کسی اور ملک میں رہتی ہیں اور میرے لئے یہ امر فیصل شدہ اور مقدر ہے کہ میں ان کو لاؤں ان بھیڑوں نے تو میرا انکار کیا ہے لیکن وہ میری آواز سنیں گی اور مجھے مان لیں گی یوں تو نبی کا انکار لوگ کیا ہی کرتے ہیں حضرت مسیح کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو ضد کی وجہ سے انکار کر رہے ہیں مگر وہ ضد کی وجہ سے انکار نہیں کریں گے بلکہ جلدی ہی مجھ پر ایمان لے آئیں گے۔ ''پھر ایک ہی گلہ اور ایک ہی چرواہا ہوگا'' یہ الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ اس وقت موسوی قوم کا ایک بڑا حصہ موسوی شریعت کو چھوڑ بیٹھا تھا اور اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کے ذریعہ پھر ان کو موسوی مذہب کی طرف واپس لائے اور اس طرح سب کو ایک قوم بنا دے۔

ان حوالجات سے ثابت ہے کہ گزشتہ نبیوں کے ذریعہ سے مسیحی مشن کی نسبت یہ خبر دی گئی تھی کہ

(۱) وہ اسی طرح مشرقی ممالک کے یہود کو پیغام دے گا جس طرح فلسطین کے یہود کو دے گا۔

(۲) یہ کہ مسیح کے نزدیک جہاں فلسطین کی بھیڑوں نے اس کو کم مانا ہے وہاں دوسری بھیڑیں اس کی آواز کو زیادہ سنیں گی اور اس پر جلد ایمان لائیں گی۔

(۳) مسیح کا ان لوگوں تک جانا اور انہیں پیغام پہنچانا ضروری ہے۔

یہ تین باتیں ہیں جو ان حوالوں سے نکل آتی ہیں اول یہود کے ملک سے باہر کچھ یہودی قبائل ہیں جن تک مسیح اپنا پیغام پہنچائے گا۔ دوسرے وہ لوگ اس کی بات سنیں گے اور اسے مان لیں گے۔ تیسرے مسیح کا ان لوگوں تک جانا کوئی اختیاری بات نہیں۔ بلکہ ان کا وہاں جانا اور پیغام پہنچانا ایک ضروری امر ہے۔ ان تین نتیجوں کو یوناہ نبی کی پیشگوئی سے ملا لو تو ایک ہی بات بن جاتی ہے۔ یوناہ نبی کو بھی ایک غیر ملک کی طرف بھجوایا گیا تھا چنانچہ واقعات پڑھ کر دیکھ لو۔ یوناہ نینوہ کی مملکت میں نہیں رہتے تھے۔ انہیں الہام ہوا کہ جاؤ اور نینوہ والوں کو ہمارا پیغام پہنچاؤ جو مشرق کی طرف ہے۔ اسی طرح مسیح کو حکم دیا گیا کہ وہ مشرق کی طرف ایک غیر ملک میں جائیں اور انہیں پیغام پہنچائیں۔ دوسرے یوناہ نبی کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے جبری طور پر وہاں بھجوایا ورنہ وہ تو وہاں سے بھاگے تھے اور چاہتے تھے کہ نینوہ نہ جائیں لیکن خدا تعالیٰ نے جبر کر کے یوناہ کو وہاں بھجوا دیا۔ اسی طرح پیشگوئی بتاتی تھی کہ حضرت مسیح کو بھی اللہ تعالیٰ جبراً اپنے ملک سے نکال کر ایک غیر ملک میں لے جائے گا اور ان کے ذریعہ اپنا پیغام یہود کی گمشدہ بھیڑوں تک پہنچائے گا۔ (۳) جب وہ وہاں جائیں گے تو لوگ ان کو قبول کر لیں گے اور ان کے دعویٰ پر ایمان لائیں گے۔

یوناہ نبی کے ساتھ جو واقعہ ہوا وہ اسی طرح ہوا کہ وہ مچھلی کے پیٹ میں گئے۔ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہے۔ پھر مچھلی نے ان کو خشکی پر اگلا۔ اور جب وہ اچھے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا کہ جاؤ اور نینوہ والوں کو ہمارا پیغام پہنچاؤ۔ اس طرح یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ میں کتنا بھی بھاگوں بہرحال خدا تعالیٰ کی بات مجھے ماننی پڑے گی چنانچہ وہ واپس آئے اور انہوں نے نینوہ والوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا پہلے تو انہوں نے معمولی سا انکار کیا۔ مگر جونہی عذاب کے آثار ظاہر ہوئے انہوں نے مان لیا۔

غرض ان حوالوں کو جب ہم یوناہ نبی کی پیشگوئی کے حوالہ سے ملا کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یوناہ نبی والا معجزہ جو حضرت مسیح نے دکھانا تھا وہ مسیح کے زندہ قبر میں جانے، زندہ قبر میں رہنے اور زندہ قبر میں سے نکلنے پر ہی مشتمل نہیں تھا۔ بلکہ اس میں یہ چوتھی بات بھی بتائی گئی تھی اور یہی اہم بات تھی کہ مسیح کو خدا تعالیٰ یوناہ نبی کی طرح ان اسرائیلی قبائل کی طرف لے جائے گا جو کھوئے گئے تھے۔ اور وہ ان کو خدا کا کلام سنائے گا اور وہ لوگ اس کی باتیں مانیں گے اور یہ ایک ایسا نشان ہوگا جسے اسرائیل کی گمشدہ بھیڑیں دیکھیں گی۔ جیسے نینوہ کے لوگوں نے نشان دیکھا تھا۔ اب دیکھ لو مسیح کے ساتھ جو حالات گزرے ہیں وہ بھی بالکل اسی طرح تھے مسیح فلسطین میں پیدا ہوا اور اس کی بولی عبرانی تھی۔ اس کی ماں بھی فلسطین میں موجود تھی اور اس کا جو باپ کہلاتا تھا وہ بھی وہیں موجود تھا۔ اسی طرح باپ

کے دوسرے بیٹے بھی موجود تھے۔ پھوپھی زاد بھائی بھی وہیں تھے پھر وہاں سب کے سب ان کی اپنی قوم کے لوگ تھے۔ اپنا رسم ورواج تھا اپنا تمدن اور اپنا طریق تھا اور یہ چیزیں ایسی ہیں جو بڑی اہمیت رکھنے والی ہیں اور جن سے انسان کا غیر معمولی لگاؤ ہوتا ہے مگر جہاں ان کو بھیجا جا رہا تھا وہ ایک غیر ملک تھا اور اس کے ساتھ مسیح کا کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ افغانستان کی زبان کہاں اور فلسطین کی زبان کہاں۔ اسی طرح کشمیر کی زبان کہاں اور مسیح کی زبان کہاں۔ ان دونوں میں کوئی بھی تو نسبت نہیں تھی۔ پھر اسرائیلی قبائل بدھوں اور دوسری اقوام سے مل کر انہی کے تمدن اور انہی کے رسم ورواج کو اختیار کر چکے تھے جن کا بدلنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ فلسطین سے افغانستان اور کشمیر تک کا رستہ بھی بڑا کٹھن اور تکلیف دہ تھا اول تو کوئی سہولتیں میسر نہ تھیں اور پھر دو اڑھائی ہزار میل طے کر کے جانا اور بھی مشکل تھا پس جس طرح یوناہ نبی کا دل نینوہ والوں کی طرف جانے سے گھبراتا تھا اسی طرح مسیح کا دل بھی افغانستان اور کشمیر جانے سے گھبراتا تھا کیونکہ وہاں جانے سے اپنی زبان کو چھوڑنا پڑتا تھا۔ اپنی قوم کو چھوڑنا پڑتا تھا اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑنا پڑتا تھا آسان طریق یہی تھا کہ مسیحؑ اپنی قوم میں رہتے اور فلسطین میں بیٹھے ہوئے یہود کو تبلیغ کرتے رہتے۔ مگر جس طرح یوناہ نبی نے گریز کیا تو خدا تعالیٰ نے اس پر جبر کیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ جن کے نتیجہ میں وہ مجبور ہو کر نینوہ والوں کے پاس جائیں اور انہوں نے بھی سمجھ لیا کہ خدا تعالیٰ سے بھاگنے کے کوئی معنے نہیں جہاں وہ مجھے بھجوانا چاہتا ہے وہاں مجھے ضرور جانا چاہیے۔ اسی طرح حضرت مسیح کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کئے کہ ملک میں ان کے خلاف مخالفت کی ایک عام رو چل پڑی۔ یہاں تک کہ ان پر مقدمہ ہوا۔ انہیں عدالت میں حاضر ہونا پڑا اور آخر عدالت نے انہیں پھانسی کا حکم دے دیا اور پھر صلیب پر انہیں لٹکنا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی پیشگوئی کے مطابق اسی طرح بچا لیا جس طرح یوناہ کو بچایا تھا جس طرح یوناہ نبی کو جب سمندر میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک مچھلی مقرر کر دی تھی جس نے انہیں زندہ نگل لیا اور پھر وہ مچھلی کے پیٹ میں تین رات دن زندہ رہے اور پھر زندہ ہی مچھلی کے پیٹ میں سے نکل آئے اور یہ دیکھ کر ان کا ایمان تازہ ہو گیا۔ کہ میرے رب میں کتنی بڑی طاقتیں ہیں اور وہ کس طرح اپنے بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ اسی طرح حضرت مسیح بھی جب صلیب پر سے زندہ اترے۔ قبر میں زندہ رہے اور پھر زندہ ہی قبر میں سے باہر آئے تو ان کا ایمان بھی تازہ ہو گیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ تعالیٰ میں بہت بڑی طاقتیں ہیں۔ مگر جب قبر میں سے نکلے تو اب حالات کی وجہ سے وہ اس ملک میں جانے پر مجبور ہو گئے جس ملک میں اللہ تعالیٰ انہیں بھجوانا چاہتا تھا۔ کیونکہ حکومت کی طرف سے جس کو پھانسی کا حکم مل چکا ہو اور پھر وہ بچ رہا ہو وہ اس ملک میں رہ ہی نہیں سکتا اگر رہے گا تو پکڑا جائے گا

اور پھر دوبارہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ غرض خدا تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ یوناہ نبی کی طرح وہ مجبور ہو کر کشمیر اور افغانستان کی طرف چلے گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نبی خدا کی راہ میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن نبی نکمی زندگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ کام کے لئے پیدا کیا جاتا ہے۔ اور کام ہی کا عاشق ہوتا ہے۔ وہ ایک مشین ہوتا ہے جو ہر وقت چلتی ہے پھر کس طرح ہو سکتا تھا کہ مسیح اپنی باقی عمر ادھر ادھر چھپ کر گزار دے۔ پس اس واقعہ نے جہاں اس کے کے ایمان کو اور بھی مضبوط کر دیا وہاں اسے جلد سے جلد فلسطین چھوڑ کر یوناہ نبی کی طرح مشرق میں جا کر خدا تعالیٰ کا کلام سنانے پر مجبور کر دیا۔ جب مسیح نے ان کو یہ واقعات سنائے ہوں گے اور بتایا ہوگا کہ ان ان حالات کی وجہ سے میں تمہاری طرف آنے پر مجبور ہوا ہوں تو کس طرح ان کے ایمان بڑھ گئے ہوں گے اور کس طرح ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے شکر کے جذبات پیدا ہوئے ہوں گے کشمیر کی تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کشمیر میں داخل ہوئے تو ان کے زخم ابھی موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں جراح اتنے اچھے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب شہزادہ نبی کشمیر پہنچا تو اس کے ہاتھوں اور پیروں پر زخم تھے جن کا ایک لمبے عرصہ تک وہاں کے جراح علاج کرتے رہے جب حضرت مسیح نے ان کو یہ واقعات سنائے ہوں گے کہ اس طرح جبراً اللہ تعالیٰ مجھے فلسطین سے نکال کر تمہاری طرف لایا۔ اگر میں وہیں رہتا تو وہ دوبارہ مجھے پھانسی دے دیتے۔ تو وہ اپنی خوش قسمتی پر کتنا ناز کرتے ہوں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ قدرت رکھتا تھا کہ انہیں پھر بچا لیتا۔ وہ پھر صلیب پر لٹکاتے تو پھر بچا لیتا مگر اس طرح صلیب پر چڑھنا اور اترنا ہی رہتا تو حضرت مسیح تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ بہر حال جب یہ باتیں انہوں نے سنی ہوں گی تو ان کے دلوں میں خدا تعالیٰ کی محبت کتنی بڑھ گئی ہوگی کہ وہ ایک نبی کو مجبور کر کے ہمارے ملک میں لایا تا کہ ہم اس کے ذریعہ سے ہدایت حاصل کریں بے شک بعض لوگوں نے مخالفت بھی کی ہوگی اور مخالفت ہونی بھی چاہیے مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ حضرت مسیح کے بہت جلد معتقد ہو گئے (Jesus in Heaven On Earth by Khwaja Nazir Ahmad pg.368.369) اور بہت جلد انہوں نے ایک نبی کی حیثیت میں آپ کو ماننا شروع کر دیا۔ غرض ان حالات میں خدا تعالیٰ نے ان کو مجبور کر کے وہاں بھجوا دیا۔ اگر ہم یہ تشریح نہ مانیں تو کفارہ تو الگ رہا مسیح ایک سچا اور راستباز انسان بھی نہیں رہتا۔ کیونکہ مسیح صاف کہتا ہے کہ میں قبر میں زندہ جاؤں گا، قبر میں زندہ رہوں گا اور قبر میں سے زندہ نکلوں گا، اور یہ کہ ان واقعات کے بعد میرا گمشدہ بھیڑوں کی طرف جانا ضروری ہے تا کہ یوناہ نبی سے میری مماثلت ثابت ہو جائے۔ یوناہ آخر کس وقت تبلیغ کے لئے نینوہ والوں کی طرف گئے تھے۔ اسی وقت جب وہ مچھلی کے پیٹ میں سے نکلے۔ اسی طرح مسیح کا اصل کام کا زمانہ

وہی تھا جب وہ قبر میں سے نکلا۔ اگر یہ بات واقع نہیں ہوئی اور اگر قبر میں سے زندہ نکلنے کے بعد مسیح نے تبلیغ نہیں کی اور اس نے اپنی گمشدہ بھیڑوں کو جمع نہیں کیا۔ تو مسیح بھی جھوٹا ثابت ہوتا ہے اور یسعیاہ وغیرہ وہ انبیاء بھی نعوذ باللہ جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ جنہوں نے مسیح کے متعلق یہ خبر دی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو اکٹھا کرے گا۔

پس یہ واقعات اس امر کا قطعی ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ مسیحؑ کے لئے صلیب پر مرنا یا کفارہ ہونا مقدر ہی نہیں تھا۔ اور اگر کفارہ کو مانا جائے تو مسیح کو سچا ماننا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی سب سے بڑی پیشگوئی جھوٹی نکلتی ہے اسی طرح وہ کلام بھی جھوٹا ثابت ہوتا ہے جو یسعیاہ نبی پر نازل ہوا اور جس کی بعض اور نبیوں نے بھی خبر دی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ مسیح نے وہ قربانی نہیں کی جو کفارہ ماننے والے اس کی طرف منسوب کرتے ہیں اور نہ وہ کفارہ ہوا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ جو واقعہ ہوا کیا وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح زندہ قبر میں جائے گا زندہ قبر میں رہے گا اور زندہ قبر میں سے نکلے گا یا وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ مسیح قبر میں مردہ گیا۔ مردہ ہونے کی حالت میں ہی رہا اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر باہر نکلا۔ میں اس غرض کے لئے چند بڑی بڑی باتیں بیان کرتا ہوں۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسیح صلیب پر نہیں مرا۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ مسیح جس حاکم کے سامنے پیش کیا گیا وہ حاکم مسیح کا خیر خواہ تھا (لوقا باب ۲۳ آیت ۱ تا ۲۳) اور مسیح کے بعض ماننے والوں کا دوست تھا۔ مسیح کے ماننے والے جو ابھی ظاہر میں حواری نہیں بنے تھے لیکن دل سے آپ پر ایمان لا چکے تھے ان میں ایک یوسف آرمیتیا بھی تھا۔ انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ یوسف آرمیتیا بوجہ اس کے کہ یہودیوں میں بڑا معزز اور مالدار انسان تھا پیلاطوس کا دوست تھا (لوقا باب ۲۳ آیت ۵۰، ۵۱)۔ جب مسیح پیلاطوس کے سامنے پیش ہوئے تو پیلاطوس نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح وہ مسیح کو چھوڑ دے۔ اس بارہ میں اس نے جو تدابیر کیں ان میں سے ایک تدبیر یہ تھی کہ جس دن وہ پیش ہوئے وہ جمعہ کا دن تھا (لوقا باب ۲۳ آیت ۵۴) اور جمعہ کے ساتھ ہی سبت کا دن آتا تھا۔ جو یہودیوں کا ایک مقدس تہوار ہے مگر اس دن ایک اور خاص تہوار بھی تھا جس میں رومی حکومت یہود کو خوش کرنے کے لئے ایک قیدی چھوڑا کرتی تھی تا کہ یہود یہ سمجھیں کہ حکومت مذہب کا احترام کرتی ہے اور اس کا دل ان کے مذہب سے متاثر ہے۔ اس تقریب کی وجہ سے پیلاطوس نے یہ کوشش کی کہ وہ حضرت مسیح کو یہ کہہ کر ہم نے کوئی نہ کوئی قیدی تو چھوڑنا ہی ہے چلو اسے ہی چھوڑ دیں آپ کو رہا کر دے۔ مگر یہودیوں نے کہا کہ ہم اس تجویز کو نہیں مان سکتے فلاں ڈاکو کو بے شک چھوڑ دیا جائے مگر مسیح کو نہ چھوڑا جائے (متی باب ۲۷ آیت ۲۱ و ۲۲) اس

بارہ میں انجیل میں بہت سے اختلافات ہیں جن میں اس وقت پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال مسیح کو انہوں نے چھڑوانے نہیں دیا۔ اتنے میں جب پیلاطوس اپنی ذاتی دلچسپی سے مسیح کو چھوڑنے کی کوشش کر رہا تھا عدالت میں ایک پیغامبر آیا اور اس نے کہا کہ مجھے آپ کی بیوی نے بھجوایا ہے جب پیلاطوس اس کی بات سننے کے لئے اٹھا تو اس نے کہا آپ کی بیوی نے مجھے یہ پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے دیا ہے کہ آج میں ساری رات سوئی نہیں کیونکہ فرشتے مجھے بار بار آ کر کہتے تھے کہ یہ شخص بے گناہ ہے اسے سزا نہ دینا ورنہ مر جاؤ گے (متی باب ۲۷ آیت ۱۹) پیلاطوس نے جب یہ بات سنی تو اس نے مزید کوشش شروع کر دی کہ کسی طرح یہودی مسیح کو رہا کر دینا مان لیں۔ مگر انہوں نے نہ مانا بلکہ انہوں نے دھمکی دی کہ ہم روم میں بادشاہ کو لکھیں گے کہ ایک شخص جو حکومت کا باغی تھا اور بادشاہت کا دعویٰ کرتا تھا پیلاطوس نے اسے چھوڑ دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ پیلاطوس بھی باغی ہے۔ یہ سن کر پیلاطوس ڈر گیا اور اس نے پانی منگوایا۔ یہودیوں کو تمثیلی زبان میں گفتگو کرنے کا بہت شوق تھا۔ اسی طریق کے مطابق اس نے پانی منگوایا اور سب کے سامنے اپنے ہاتھ دھو کر کہا کہ مجھ پر اس گناہ کی کوئی ذمہ واری نہیں میں اس انسان کے خون سے بری ہوں۔ اگر گناہ ہوگا تو وہ تم پر اور تمہاری اولادوں پر ہوگا۔ اس پر ان سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہاں ہاں اس کا خون ہم پر اور ہماری اولادوں کی گردن پر ہے (متی باب ۲۷ آیت ۲۴و۲۵) تب پیلاطوس نے مسیح کو ان کے حوالے کر دیا کہ اسے لے جاؤ اور صلیب پر لٹکا دو۔

جب وہ مسیح کو لے کر صلیب کے مقام پر پہنچے ہیں تو انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ اس وقت چھٹا گھنٹہ آ گیا تھا۔ اور چھٹے گھنٹے کے معنے اس زمانہ کے لحاظ سے تین اور چار بجے کے درمیان کے وقت کے ہیں۔ اس دن دو اور مجرم بھی پیش تھے جن کو پھانسی پر لٹکایا جانا تھا۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ ایک مجرم کے لٹکانے اور تین مجرموں کے لٹکانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک آدمی کو تھوڑے سے وقت میں لٹکایا جا سکتا ہے مگر تین آدمیوں کو لٹکانے سے لئے لازماً زیادہ وقت لگے گا۔ پھر ایک اور بات بھی ہے جس کو عام طور پر نہ مسلمان سمجھتے ہیں اور نہ بوجہ اپنے مذہب کے ناواقف ہونے کے عیسائی سمجھتے ہیں۔ اس زمانہ میں صلیب کے لئے ایک لکڑی گاڑی جاتی تھی۔ جس کی شکل اس قسم کی ہوا کرتی تھی۔
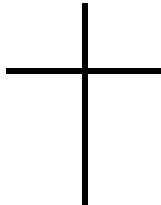
جب کسی شخص کے متعلق یہ فیصلہ ہوجاتا تھا کہ اسے صلیب پر لٹکا دیا جائے تو وہ اس لکڑی کے ساتھ سیدھا کھڑا کر دیا جاتا اور اس کے بازوؤں کو پھیلا کر دو ڈنڈوں کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ اس کے بعد مجرم کے بازوؤں اور ٹانگوں کے نرم گوشت میں کیل گاڑ دیئے جاتے اور وہ اسی طرح بھوکا پیاسا صلیب پر لٹکا لٹکا مرجاتا۔ بعض حالات میں علاوہ ان کیلوں کے جو بازوؤں کے گوشت اور پنڈلیوں کے گوشت میں گاڑے جاتے تھے وہ ایک ایک کیل ہتھیلیوں میں بھی گاڑ دیتے تھے لیکن جن لوگوں کو علم التشریح کی واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ یہاں بھی کیلوں کا گاڑنا ہڈیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ بہرحال صلیب دیتے وقت کیل جسم کی ہڈیوں میں نہیں گاڑے جاتے تھے بلکہ بازوؤں اور پنڈلیوں کے نرم نرم گوشت میں گاڑے جاتے تھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جسم کے گوشت میں کیل گاڑ دینا یہ بھی انسان کو خطرناک تکلیف پہنچاتا ہے۔ بلکہ کیل تو الگ رہے معمولی ٹیکہ سے بھی بعض لوگ چیخیں مارنے لگ جاتے ہیں لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس صلیب سے انسان کی موت کئی دنوں کے بعد واقع ہوتی تھی اور وہ سسک سسک کر اپنی جان دیتا تھا فوری طور پر موت واقع نہیں ہوتی تھی۔ اس میں صرف ہیبت کا پہلو ہے جو دماغی لحاظ سے سخت اذیت پہنچاتا ہے یعنی انسان یہ دیکھتا ہے کہ اب کیل آ گئے ہیں اب ہتھوڑا آ گیا ہے۔ اب کیل گاڑنے والا آ گیا ہے۔ اب کیل گاڑنے کے لئے اٹھا ہے۔ اب کیل جسم پر رکھا گیا ہے۔ اب کیل پر ہتھوڑا پڑنے والا ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جو اس کے دماغ کو خوف زدہ کر دیتی ہیں اور وہ اس کی ہیبت سے شدید متاثر ہوتا ہے ورنہ محض گوشت کٹ جانے سے ایسی تکلیف نہیں ہوتی جسے برداشت نہ کیا جاسکتا ہو۔ لڑائیوں میں ہزاروں مرتبہ تلوار لگتی ہے اور گوشت کٹ کر علیحدہ ہوجاتا ہے مگر چونکہ وہ تلوار یکدم آ پڑتی ہے اس لئے اس کی ہیبت طاری نہیں ہوتی۔ لیکن کیل کی ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اب نہ معلوم کیا ہونے والا ہے۔ لیکن تلوار لگ کر اگر گوشت کٹ جائے تو بعض دفعہ اس کی اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی جتنی ڈاکٹر کی سوئی سے انسان محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا پتہ اسی وقت لگتا ہے جب گوشت کٹ چکا ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات ایسی حالت میں جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہڈی سلامت ہے تو بجائے گھبرانے کے بے اختیار الحمد للہ کہہ اٹھتا ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر ٹیکا لگانے کے لئے سرنج تیار کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ شاید ڈاکٹر مجھے ذبح کرنے لگا ہے اور اس پر ایک ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔ پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیح کے ساتھ جو کچھ گزرا وہ دماغی لحاظ سے ایک نہایت ہی تکلیف دہ واقعہ تھا۔ لیکن وہ حقیقی تکلیف جس سے انسان مرجاتا ہے وہ آپ کو نہیں ہوئی۔ لیکن چونکہ آپ نازک طبیعت انسان تھے آپ نے اس تکلیف کو بھی شدت سے محسوس کیا اور بیہوش ہو گئے۔ اس کے مقابلہ میں وہ چور جو آپ کے دائیں بائیں لٹکائے گئے تھے وہ ایک

دوسرے سے مذاق کرتے رہے۔ بلکہ ان میں سے ایک نے مسیح کو طعنہ دے کر کہا کہ اگر تو مسیح ہے تو اپنے آپ کو بھی اور ہم کو بھی بچا۔ اس پر دوسرے نے اسے جھڑک کر کہا کہ تو خدا سے ڈر ہم تو اپنے کئے کی سزا پا رہے ہیں اور یہ بے گناہ ہے۔ (لوقا باب ۲۳ آیت ۳۹۔۴۰) اب دیکھو وہ صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں مگر مذاق جاری ہے کیونکہ وہ سنگدل لوگ تھے اوران باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اسی قسم کی طبیعت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے اندر سختی برداشت کرنے کا مادہ رکھتے ہیں۔ کشمیر میں ہی ہمارا ایک احمدی خاندان ہے جو پہلے زمانہ میں مظفرآباد کے راجہ تھے مہاراجہ کشمیر نے حملہ کر کے انہیں شکست دی اور راجہ کو قید کر کے سری نگر لے آیا اوران کے گزارہ کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد حکومت کی بات ہے جس کے زمانہ میں حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ ریاست جموں و کشمیر میں ملازم تھے۔ وہ مسلمان راجہ بڑا خوبصورت اور قوی نوجوان تھا اور اس کی شکل مہاراجہ کو بڑی پسند تھی۔ ایک دن وہ پولو کھیلتے ہوئے گرا اور کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ انہوں نے علاج کرایا اور ہڈی جڑ گئی۔ مگر ہڈی کچھ ٹیڑھی جڑی۔ ایک دن دربار لگا ہوا تھا کہ مہاراجہ نے کہا کیوں راجہ صاحب آپ فلاں دن پولو کھیلتے ہوئے گرے تھے اور آپ کو چوٹ آئی تھی۔ بتایئے اب ہڈی کا کیا حال ہے جڑ گئی ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا جڑ گئی ہے اس نے کہا آیئے مجھے دکھائیں۔ انہوں نے دکھائی تو کہنے لگا راجہ صاحب یہ آپ نے کیا کیا۔ یہ ہڈی تو ٹیڑھی جڑی ہے اوراس سے آپ کی خوبصورتی پر دھبہ آ گیا ہے۔ آپ اتنے خوبصورت انسان تھے آپ مجھے بتاتے تو میں اپنا ڈاکٹر آپ کے لئے مقرر کر دیتا اور اس ہڈی کو بالکل صحیح جڑوا دیتا۔ وہ اس وقت کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بڑے اطمینان سے اپنے بازو پر دباؤ ڈال کر اتنے زور سے اسے جھٹکا دیا کہ بازو دو ٹکڑے ہو گیا اور کہنے لگے ’’مہاراج اب جڑوا دیں‘‘ یہ دیکھ کر مہاراجہ کی ایسی حالت ہوگئی کہ وہ بے ہوش ہونے لگا۔ اور دربار سے اٹھ کر چلا گیا۔ تو ایسے ایسے سنگدل لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں ان باتوں کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی مگر حضرت مسیح ایک نازک مزاج انسان تھے۔ اردگرد کے چور تو مذاق کرتے رہے اور مسیح بے ہوش ہو گئے جب انہیں ہوش آیا تو کراہنا شروع کر دیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے آپ کے حواس قائم تھے کیونکہ انجیل بتاتی ہے کہ اوپر سے آپ کی والدہ آ گئیں۔ آپ نے اپنی والدہ کو دیکھا اور آپ پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہوگئی۔ آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ نہ معلوم میری والدہ کو اس وقت کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی سامنے ہی آپ کا ایک شاگرد تھوما نامی کھڑا تھا۔ آپ نے تھوما کی طرف دیکھا اور کہا۔ اے تھوما یہ تیری ماں ہے اور اپنی والدہ سے کہا اے عورت یہ تیرا بیٹا ہے (یوحنا باب ۱۹ آیت ۲۵ تا ۲۷)۔ بعض لوگ تھوما س سے یہ غلطی کھاتے ہیں کہ تھوما س کے معنے ہوتے ہیں توأم بھائی۔ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت مسیحؑ کا

باپ تھا لیکن ان کا یہ خیال غلط ہے۔ تھوماس کے معنے عبرانی میں دودھ شریک بھائی کے ہوتے ہیں۔ پس اس نام سے صرف اتنا نکلتا ہے کہ حضرت مسیح کو جس عورت کا دودھ پلایا گیا تھا اسی عورت نے تھوماس کو بھی دودھ پلایا تھا۔ یا یہ کہ خود حضرت مریم کا دودھ اس نے پیا تھا اور اس طرح وہ حضرت مسیح کا دودھ شریک بھائی ہو گیا تھا بہر حال حضرت مسیح نے اس چھوٹے سے فقرہ میں نہایت لطیف طریق پر ایک طرف تھوما کی توجہ دلائی کہ میں تو اس وقت صلیب پر لٹکا ہوا ہوں اور گو مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر یقین ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے اس کے وعدوں کے سمجھنے میں کوئی غلطی کی ہو۔ اس لئے اب میں اپنی والدہ کو تیرے سپرد کرتا ہوں اور اپنی والدہ سے کہا کہ تھوما کو اپنا بیٹا سمجھنا۔ ساری انجیل میں اپنی ماں سے محبت کا اظہار اگر حضرت مسیح نے کیا ہے تو صرف اس جگہ۔ ورنہ انجیل پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں اپنی والدہ سے کچھ خارسی ہے۔ کیونکہ کسی جگہ پر ان کی محبت کا اظہار نہیں۔ بہر حال حضرت مسیح کی یہی کیفیت رہی۔ کبھی انہیں ہوش آ جاتا اور کبھی وہ بے ہوش ہو جاتے اس موقعہ پر پیلاطوس کی طرف سے جو پہریدار مقرر کئے گئے تھے وہ بھی دل میں ان کے مرید تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ حضرت مسیحؑ تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تو وہ دوڑ کے گئے۔ اور انہوں نے اسفنج کا ایک ٹکڑہ لے کر اسے شراب اور مر سے بھگویا اور حضرت مسیح کو چوسنے کے لئے دیا۔ انجیل میں تو صرف اتنا لکھا ہے کہ اسفنج کو سرکہ میں ڈبو کر انہوں نے حضرت مسیح کو چوسنے کے لئے دیا (مرقس باب ۱۵ آیت ۳۶) مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ آپ کو شراب اور مر کا مرکب دیا گیا (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۴ زیر لفظ Cross) عیسائی لوگ بعض دفعہ اس بات پر بڑا زور دیا کرتے ہیں کہ یہود نے آپ پر اتنا ظلم کیا کہ جب آپ شدت تکلیف سے کراہ رہے تھے تو انہوں نے شراب اور مُر کے مرکب میں اسفنج بھگویا اور چوسنے کے لئے آپ کو دیا۔ حالانکہ رومی کتب کے حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جس شخص کے ساتھ وہ رعایت کرنا چاہتے تھے اور جس کو وہ تکلیف سے بچانا چاہتے تھے اس کو وہ شراب اور مر کا مرکب دیا کرتے تھے (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Crucifixion)۔ معلوم نہیں طبی طور پر یہ چیز فائدہ بخش بھی ہے یا نہیں لیکن اس زمانہ میں لوگ یہی سمجھتے تھے کہ جس کو شراب اور مر دی جائے اس کی تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ پس یہ واقعہ بھی بتا رہا ہے کہ وہ لوگ جو آپ کے پہرہ کے لئے مقرر کئے گئے تھے وہ بھی دل میں آپ کے مرید تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کی تکلیف کو کم کرنے میں وہ جس قدر بھی حصہ لے سکتے ہوں لیں۔ پھر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں انہیں جمعہ کے دن پچھلے پہر صلیب پر لٹکایا گیا تھا اور مغرب سے سبت کا دن شروع ہو جاتا تھا آج کل تورات کے بارہ بجے کے بعد سے اگلا دن شمار کیا جاتا ہے لیکن اسلامی طریق یہ ہے کہ سورج کے غروب ہونے کے ساتھ ہی یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اگلا دن شروع ہو گیا ہے اور یہی

طریق بنی اسرائیل میں بھی رائج تھا۔ اس لحاظ سے سورج کے غروب ہوتے ہی سبت کا دن شروع ہو جاتا تھا اور یہودیوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی سبت کے دن صلیب پر لٹکا رہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوتا ہے (یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱) چنانچہ دو تین گھنٹہ کے بعد ہی پیلاطوس نے انہیں توجہ دلائی کہ اگر یہ صلیب پر لٹکا رہا اور سبت کا دن شروع ہو گیا تو تم پر عذاب آ جائے گا۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے یکدم ایک زوردار آندھی چلا دی جس سے چاروں طرف تاریکی چھا گئی (مرقس باب ۱۵ آیت ۳۳) اس کو دیکھ کر یہودی اور بھی ڈرے کہ ایسا نہ ہو یہ صلیب پر رہے اور سبت شروع ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے پیلاطوس سے خود درخواست کی کہ اب ان کو اتار لیا جائے (یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۱) ایسا نہ ہو کہ ہم پر عذاب نازل ہو جائے۔ اب فرض کرو انہیں سورج غروب ہونے سے آدھ گھنٹہ یا پون گھنٹہ پہلے اتار لیا گیا تھا۔ تب بھی ان کی صلیب کا وقت کچھ نہ کچھ تو ضرور کم ہو جائے گا اگر سات بجے سورج غروب ہوا کرتا تھا اور ساڑھے تین بجے انہیں صلیب پر لٹکایا گیا تھا تو یہ کل وقت ساڑھے تین گھنٹے بنتا ہے لیکن چونکہ شدید آندھی کی وجہ سے سخت تاریکی چھا گئی تھی اور سبت شروع ہو جانے کے خوف سے انہیں جلدی اتار لیا گیا تھا۔ اس لئے اگر آدھ یا پون گھنٹہ بھی یہ وقت فرض کر لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اڑھائی سے تین گھنٹہ تک حضرت مسیح کو صلیب پر رہنا پڑا۔ حالانکہ اس صلیب پر سات سات دن تک بھی بعض لوگ زندہ رہتے تھے اور وہ صرف بھوک اور پیاس کی وجہ سے یا زخموں کا زہر جسم میں پھیل جانے کی وجہ سے ہلاک ہوتے تھے۔ پھر یہ بھی قاعدہ تھا کہ جو لوگ صلیب پر سے زندہ اتر آتے تھے ان کی ہڈیاں توڑ دی جاتی تھیں۔ مگر پہرے دار چونکہ حضرت مسیح کے مرید تھے انہوں نے چوروں کی تو ہڈیاں توڑیں مگر حضرت مسیح کی ہڈیاں نہیں توڑیں دراصل صلیب دینے کے اصل معنے بھی ہڈیاں توڑ کر گودا نکال دینے کے ہیں اور یہ نام اسی لئے رکھا گیا تھا کہ اکثر لوگ صلیب پر مرتے نہیں تھے بلکہ بعد میں ہڈیاں توڑ کر ان کا گودا نکالا جاتا تھا لیکن حضرت مسیحؑ کی ہڈیاں نہیں توڑی گئیں۔ (یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۳) پھر حضرت مسیح کے صلیب پر سے زندہ اتر آنے کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ انجیل میں لکھا ہے۔ جب حضرت مسیح کو اتارا گیا تو ایک سپاہی دوڑتا ہوا گیا اور اس نے آپ کی پسلی میں آہستہ سے نیزہ مار کر دیکھا تو اس میں سے خون اور پانی بہ نکلا (یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴) جسم میں سے خون اور پانی نکلنا یہ تو کوئی محاورہ نہیں۔ اس کے معنے یہی ہیں کہ سیال خون نکل آیا۔ ورنہ انجیل کا بیان ہی اگر درست ہو تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ پانی الگ چیز ہے اور خون الگ۔ اور خون کو سیال بنانے والی سرم کے علاوہ کوئی اور بھی چیز ہے حالانکہ کوئی اور چیز ہے ہی نہیں۔ پس اس کے معنے پانی اور خون کے نہیں بلکہ بہتے ہوئے خون کے ہیں۔ مگر یہودیوں میں انہوں نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ مر گیا ہے اور اسی لئے ہم نے اس کی ہڈیاں نہیں توڑیں۔

معلوم ہوتا ہے یہودی بھی دل میں گھبرائے ہوئے تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے ایک بے گناہ کو سزا دلوائی ہے پس چونکہ ان کے دل میں چور تھا اور وہ جانتے تھے کہ ہم ایک نیک اور خدا رسیدہ انسان کو سزا دلوا رہے ہیں۔ اس لئے جب انہوں نے ایک شدید آندھی دیکھی تو ڈر گئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عذاب معلوم ہوتا ہے۔ اور انہوں نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ کہا کہ اچھا اگر وہ مر گیا ہے تو اسے دفن کر دو۔

ان تمام واقعات سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت مسیح کے صلیب پر مرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوسکتا۔ عام طور پر ساتویں دن تک بھی لوگ زندہ رہا کرتے تھے اور ہڈیاں توڑ کر انہیں مارنا پڑتا تھا کجا یہ کہ اڑھائی یا تین گھنٹہ تک صلیب پر رہنے کے نتیجہ میں وہ فوت ہوجاتے۔ ان کا صلیب پر لٹکنے کا وقت زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین گھنٹے ہوسکتا ہے مگر جب اس صلیب پر سات سات دن تک بھی لوگ زندہ رہتے تھے تو ساڑھے تین گھنٹہ بلکہ اس سے بھی کم عرصہ میں آپ کس طرح فوت ہو سکتے تھے اور پھر وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ آپ کے ماننے والے آپ کے پہریدار تھے اور انہوں نے آپ کی تکلیف کو کم کرنے اور آپ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ بہرحال جب حضرت مسیح کو صلیب پر سے اتار لیا گیا تو یوسف آرمیتیا پیلاطوس کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ لاش میرے حوالے کی جائے۔ چنانچہ پیلاطوس نے حکم دے دیا کہ لاش یوسف آرمیتیا کو دے دی جائے (متی باب ۲۷ آیت ۵۸) اس کے بعد یوسف آرمیتیاہ نے ان کو ایک قبر میں جا کر رکھ دیا۔ مگر وہ قبر ہماری قبروں جیسی نہیں تھی۔ اس قبر میں تو کسی کو رکھا جائے تو اس کا سانس بند ہوجائے کیونکہ یہ اور طرح بنائی جاتی ہے وہ قبر ایک کھلی کوٹھڑی تھی جو چٹان میں کھدی ہوئی تھی (متی باب ۲۷ آیت ۶۰) یوسف آرمیتیاہ نے اس قبر میں حضرت مسیح کو جا کر رکھ دیا اور سامنے دروازہ پر ایک پتھر لڑھکا دیا (متی باب ۲۷ آیت ۶۰) تا کہ لوگوں کو شبہ بھی نہ ہو اور ہوا کی آمد و رفت بھی جاری رہے۔ یہ سارے واقعات بتاتے ہیں کہ یہ امر قطعی طور پر ناممکن تھا کہ مسیح صلیب پر مر سکتا۔ یوں تو بعض دفعہ انسان بیٹھے ہوئے زمین پر سے اٹھنے لگتا ہے تو اس کا دم نکل جاتا ہے چلتے چلتے کھڑا ہوتا ہے تو دم نکل جاتا ہے مگر یہ اور چیز ہے ہم جس امر پر بحث کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ عام طور پر ان حالات میں جو حضرت مسیح کو پیش آئے لوگ مرا نہیں کرتے بلکہ زندہ رہتے ہیں اور حضرت مسیح کی موت بھی ان حالات میں قطعی طور پر ناممکن تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک ان کے ساتھ ایسے لوگ رہے جو ان کے مرید تھے یا ان کے دوست اور خیر خواہ تھے اور انہوں نے ہر ممکن کوشش آپ کو بچانے کے لئے کی۔ پھر ان کی خیر خواہی کا اس امر سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت مسیح کو صلیب پر سے اتار لیا گیا اور ایک قبر میں رکھ دیا گیا تو یہودیوں نے درخواست کی کہ جس کوٹھڑی میں مسیح کو رکھا گیا ہے اس پر تین دن تک

پہرہ لگا دیا جائے کیونکہ مسیح کہا کرتا تھا کہ میں یوناہ کی طرح تین دن رات کے بعد زندہ ہو جاؤں گا۔ مگر پیلاطوس نے انہیں سرکاری پہرے دار دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ’’ تمہارے پاس پہرے والے ہیں جاؤ جہاں تک تم سے ہو سکے اس کی حفاظت کرو۔‘‘ (متی باب ۲۷ آیت ۶۵)

پیلاطوس کی اس انکار سے یہی غرض تھی کہ اگر سرکاری پہرے دار مقرر کئے گئے تو حضرت مسیح باہر نہیں نکل سکیں گے اور اگر وہ پہریداروں کا مقابلہ کریں گے تو ان کا مقابلہ حکومت کا مقابلہ سمجھا جائے گا لیکن اگر عام لوگ پہرہ پر ہوئے تو ان کا مقابلہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکے گا۔ پس پیلاطوس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں پولیس دینے کے لئے تیار نہیں۔

پھر اس کے بعد جو واقعات ہوئے وہ بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے تھے۔

اگر عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق مسیح مر کر زندہ ہو چکے تھے تو وہ خدا کے بیٹے بن چکے تھے۔ ایسی صورت میں انہیں لوگوں کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر انجیل بتاتی ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد وہ چھپ چھپ کر پھرا کرتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے بھی کہا کرتے تھے کہ کسی کو بتانا نہیں کہ میں زندہ ہوں۔ بلکہ انجیل سے پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے حواریوں کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ ممکن ہے یوسف آرمیتیاہ کے مکان میں ہی رہتے ہوں۔ کیونکہ لکھا ہے کہ مسیح یکدم ظاہر ہو جاتا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہی کہیں ادھر ادھر غائب ہو جاتا۔ ایک دفعہ جب وہ اپنے حواریوں کے پاس آئے تو انہیں دیکھنے کے باوجود یہ یقین نہ آیا کہ یہ سچ مچ مسیح کھڑا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ کیا تمہارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انہوں نے مچھلی کا ایک ٹکڑا اور کچھ شہد دیا اور اس نے ان کے سامنے کھایا تب انہیں یقین آیا کہ وہ واقعہ میں مسیح کو دیکھ رہے ہیں۔ (لوقا باب ۲۴ آیت ۴۱ تا ۴۳)

اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی روح ایسا نہیں کیا کرتی۔ اس قسم کے کام جسم ہی کیا کرتا ہے مگر چونکہ قانون حکومت کے مطابق وہ پھانسی کی سزا کے مستحق ہو چکے تھے اور اگر پکڑے جاتے تو دوبارہ پھانسی پر لٹکا دیئے جاتے اس لئے ضروری تھا کہ وہ چھپ کر رہتے اور حواریوں کو بھی نہ بتاتے کہ وہ کہاں رہائش رکھتے ہیں۔

بہرحال انجیل کے بیانات سے یہ امر قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت مسیح صلیب پر فوت نہیں ہوئے بلکہ وہ صلیب پر زندہ رہے۔ قبر میں زندہ رہے اور پھر زندہ ہی اس قبر میں سے نکلے اور انہوں نے حواریوں کو بتایا کہ میں زندہ ہوں لطیفہ یہ ہے انجیل بتاتی ہے جب تھوما کو یہ خبر پہنچی کہ مسیح زندہ ہے تو اس نے کہا جب تک میں اس کے ہاتھوں میں کیلوں کے نشان نہ دیکھوں گا اور جب تک ان کیلوں کے نشان میں اپنی انگلی نہ ڈالوں گا میں اس بات کو ماننے کے

لئے تیار نہیں کہ مسیح دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اس پر حضرت مسیح نے تھوما کو بلایا اور کہا میرے ہاتھوں کو دیکھ اور اپنا ہاتھ میری پسلی میں ڈال اور دیکھ کہ میں مسیح ہی ہوں کوئی روح نہیں ۔(یوحنا باب ۲۰ آیت ۲۴ تا ۲۹)

یہ سارے واقعات بتاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے جو پیشگوئی کی تھی کہ یوناہ نبی کا نشان اس قوم کو دکھایا جائے گا وہ لفظ بلفظ پوری ہوئی۔ایک گوشت پوست والے مسیح کو صلیب پر لٹکایا گیا مگر وہ صلیب پر زندہ رہا۔وہ زندہ قبر میں داخل ہوا اور زندہ ہی قبر میں سے نکلا اور اس کے بعد وہ لوگوں سے چھپتا پھرا۔کیونکہ قانون اس ملک میں رہنے کی انہیں اجازت نہیں دیتا تھا۔اور یہی اللہ تعالیٰ کی وہ مخفی تدبیر تھی جس کے ماتحت وہ مجبور ہوئے کہ کشمیر اور افغانستان کی طرف جائیں اور بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو تلاش کریں۔خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ ان حالات کے نتیجہ میں مسیح اس ملک میں رہنا مناسب ہی نہیں سمجھے گا اور وہ خوشی سے خود ان قوموں کی طرف چلا جائے گا جن کی ہدایت اور اصلاح کے لئے اسے مبعوث کیا گیا ہے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ اب فلسطین میں میرا رہنا مشکل ہے تو مشرق کی طرف چلے گئے اور اللہ تعالیٰ کا پیغام بنی اسرائیل کے ان دس قبائل کو پہنچاتے رہے جو کشمیر اور افغانستان میں آ بسے تھے۔اس بحث کا اگلا حصہ بائبل سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ افغانستان اور کشمیر کی تاریخوں اور بعض پرانی قبائلی روایات وغیرہ سے اس کا تعلق ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی ایک کتاب میں جس کا نام ’’مسیح ہندوستان میں‘‘ ہے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد حضرت مسیح ہجرت کر کے افغانستان اور کشمیر کی طرف آ گئے تھے۔اس کے علاوہ بعض اور تحقیقاتیں بھی ہوئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مغرب کی طرف سے ایک نبی جسے شہزادہ نبی کہا جاتا تھا اور جس کے ہاتھوں اور پاؤں میں زخموں کے نشانات تھے ہجرت کر کے کشمیر میں آیا اور اس نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔

غرض کٓھٰیٰعٓصٓ میں عیسائیت کے ابطال کے لئے خدا تعالیٰ کی چار صفات پیش کی گئی ہیں۔یعنی صفت کافی، صفت ہادی، صفت علیم اور صفت صادق اور جیسا کہ میں شروع میں بتا چکا ہوں خدا تعالیٰ کی صفت کافی اور ہادی اس کی صفت علیم اور صادق کے تابع ہیں جو علیم ہوتا ہے وہ کافی ہوتا ہے اور جو صادق ہوتا ہے وہ ہادی ہوتا ہے۔اس وقت ہی کسی کا علاج ناقص ہوتا ہے جب اسے ساری مرض کا علم نہ ہو۔یا مرض کا علاج معلوم نہ ہو۔تشخیص ناقص ہو تب بھی نسخہ ناقص لکھا جاتا ہے اور اگر علاج پورا معلوم نہ ہو تو تب بھی نسخہ ناقص ہوتا ہے لیکن جو علیم ہوگا اور جسے ہر بات کا علم ہوگا اس کا نسخہ اپنی ذات میں مکمل ہوگا یہ نہیں ہوگا کہ باوجود علم کے وہ مرض ادھوری بتائے یا باوجود علم کے نسخہ ناقص لکھے۔دوسری صفت صادق ہے صادق کے معنے ہوتے ہیں مخلص سچا اور دوستی میں پکا اب جو شخص سچا ہوگا مخلص

ہوگا اور دوستی میں پکا ہوگا لازماً وہ ہادی بھی ہوگا۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک صادق انسان کا دوست اور پیارا اور رحم کا مستحق وجود ڈوب رہا ہو اور وہ اسے نکالے نہیں۔ تباہ ہورہا ہو اور وہ اسے بچائے نہیں۔ غرض علم کی صفت کے ماتحت کافی لفظ آتا ہے اور صادق کی صفت کے ماتحت ہادی کی لفظ آتا ہے۔ عیسائیت کے تمام مسائل انہی چار صفات کے اردگرد چکر کھاتے ہیں کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے علیم اور کافی ہونے کو اور اس کے صادق اور ہادی ہونے کو نہیں سمجھا اور اس لئے انہوں نے غلط عقائد اختیار کر لئے۔ اس سورۃ میں چونکہ خدا تعالیٰ نے عیسائیت کا ذکر کیا ہے اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان صفات کو بیان کیا گیا ہے جو عیسائیت کے رد میں کام آنے والی تھیں۔

میں نے بتایا تھا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مقطعات کو صفات الٰہیہ قرار دیا ہے اور میری ایک پرانی رؤیا بھی اس کی تصدیق کرتی ہے میں ایک دفعہ سندھ سے آرہا تھا۔ کہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ کسی نے مجھ سے کہا ہے کہ قرآن کریم میں جو کٓہٰیٰعٓصٓ آتا ہے ان حروف مقطعات میں تمہارا بھی ذکر ہے۔ گویا مجھے بتایا گیا کہ کٓہٰیٰعٓصٓ میں میرا بھی ذکر آتا ہے اور چونکہ میرا کام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام مثیل مسیح ناصری ہیں۔ اس لئے درحقیقت ان حروف مقطعات میں میرا ذکر ہونے کے یہ معنے ہیں کہ کٓہٰیٰعٓصٓ میں مسیحیت کا ذکر ہے اور جب اس میں پہلی مسیحیت کا ذکر ہے تو لازماً اس میں دوسرے مسیح کا ذکر ہوگا۔ اس میں پہلی مسیحیت کا ذکر تو اس لحاظ سے ہے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے کافی اور ہادی ہونے اور اس کے علیم اور صادق ہونے کی صفات کو نہ سمجھ کر غلط مذہب اختیار کر لیا۔ اور ہمارے حق میں یہ مقطعات اس لحاظ سے ہوں گے کہ ہم نے انہی صفات سے کام لے کر عیسائیت کا رد کر دیا۔ گویا مراد تو دونوں سلسلے ہوں گے مسیح ناصری کا سلسلہ بھی اور مسیح موعودؑ کا سلسلہ بھی مگر عیسائیت کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ان صفات کو مدنظر نہ رکھ کر وہ صحیح راستہ سے بھٹک گئے اور ہمارے لئے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات نے ہماری تائید کی اور ہم نے ان کے ذریعہ سے عیسائیت کا کچل دیا۔

درحقیقت دنیا میں تمام روحانی کام صفاتِ الٰہیہ سے ہی چلتے ہیں اور اگر کسی کو علم صحیح عطا ہو جائے تو وہ صرف صفات الٰہیہ سے ہی تمام غلط مذاہب کو رد کر سکتا اور ان کا باطل ہونا ثابت کر سکتا ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝۳ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً

(اس سورت میں) تیرے رب کی (اس) رحمت کا ذکر (ہے) جو اس نے اپنے بندے زکریا پر (اس وقت) کی

خَفِيًّا ۝۴

جب اس نے اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارا

حل لغات۔ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ خبر ہے ایک مبتداء محذوف کی جو هٰذَا ہے یعنی هٰذَا ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ یہ ذکر ہے تیرے رب کی رحمت کا۔ یہاں مصدر جو ذکر ہے فعل کا عمل کر رہا ہے اور یہ عبارت اپنے معنوں کے لحاظ سے اس طرح کہ هٰذَا ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ اَیْ زَكَرِيَّا حِیْنَ نَادَاهُ یعنی یہ ذکر ہے تیرے رب کی رحمت کا وہ رحمت جو اس نے اپنے بندہ پر کی۔ کون سے بندہ پر؟ زکریا پر۔ کس وقت کی؟ جب اس نے اپنے رب کو ایک ایسی آواز میں پکارا جو خفی یعنی آہستہ تھی۔

نَادٰی کے معنے ہوتے ہیں صَاحَ بِهٖ یعنی اونچی اور بلند آواز سے پکارا اور نَادٰی فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں جَالَسَهٗ فِی النَّادِی اس کے ساتھ مجلس میں اٹھتا بیٹھتا رہا اور اس کے معنے فَاخَرَهٗ کے بھی ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کے ساتھ مفاخرت کی باتیں کیں اور نَادٰی بِسِرِّهٖ کے معنے ہوتے ہیں اَظْهَرَهٗ اس نے اپنے دل کا راز اس پر ظاہر کیا۔ (اقرب)

تفسیر۔ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ اس سورۃ میں عیسائیت پر بحث کی گئی ہے اور عیسوی عقائد کی تردید کے لئے کٓھٰیٰعٓصٓ میں چار صفات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ دو بنیادی صفات کی طرف اور دو ایسی صفات کی طرف جو ان صفات کا لازمی ظہور ہیں۔ بنیادی صفات عالم اور صادق کی ہیں اور وہ صفات جو ان دو کا لازمی نتیجہ ہیں وہ کافی اور ہادی کی صفات ہیں۔ لیکن ابتداء زکریاؑ کے ذکر سے کی گئی ہے اس میں کیا حکمت ہے؟ اور عیسائیت کے ذکر سے پہلے حضرت زکریاؑ کا کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا حل کرنا ضروری ہے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اس جگہ زکریا سے وہ زکریا مراد نہیں جن کی کتاب بائبل میں شامل ہے وہ زکریا ۴۸۷ سال قبل مسیح گزرے ہیں اور یہ زکریا وہ ہیں جو حضرت مسیح کے قریب زمانہ میں آپ کی والدہ کے کفیل تھے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زکریاؑ بھی نبی تھے لیکن اناجیل میں ان کا ذکر بطور کاہن کیا گیا ہے بطور نبی کے

نہیں۔مگر اس مشکل کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بالکل حل کر دیتی ہے۔آپ فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (ابو داؤد جلد ۲ کتاب الملاحم باب مایذکر فی قرن المائة) یعنی اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر صدی کے سر پر احیاء دین کے لئے ایک مجدد مبعوث فرمایا کرے گا۔اسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (النور:۵۶) یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور عمل صالح کرنے والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں بھی زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کے خلفاء یعنی مجددین کو پہلے زمانہ کے اسرائیلی خلفاء کا مثیل قرار دیا ہے۔اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ (مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم صفحہ ۳۳ مکتوب نمبر ۲۳۴ و نمبر ۲۴۹) یعنی میری امت کے علماء روحانی یعنی مجددین انبیاء بنی اسرائیل کی طرح ہیں پس ممکن ہے کہ ایسے نبی جو کسی دوسرے نبی کے کام کی تکمیل کے لئے آتے ہوں ان کے لئے بائبل میں کاہن کا لفظ استعمال ہوتا ہو۔قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی کفار یہ اعتراض کیا کرتے تھے کہ یہ شخص کاہن ہے (طور:۳۰) معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل ایسے رنگ میں نبیوں اور کاہنوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس سے وہ دونوں ایک وجود معلوم ہوتے تھے۔لیکن چونکہ مکہ والے کاہن کو برا سمجھتے تھے جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہونے کا دعویٰ کرتے تو وہ سمجھتے کہ یہ کاہن ہے لیکن اس کے علاوہ جب ہم بائبل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ یہود کے حالات دیکھ کر بہت چھوٹی چھوٹی جگہوں میں اپنے نبی بھیج دیا کرتا تھا یہاں تک کہ بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ بعض دفعہ سینکڑوں انبیاء ایک ہی زمانہ میں ہوئے ہیں (نمبر ا سلاطین باب ۲۲ آیت ۶) بلکہ بعض بڑے بڑے پایہ کے انبیاء بھی ایک ہی زمانہ میں بھیجے گئے ہیں۔چنانچہ حزقی ایل (۵۹۵ قبل مسیح)۔دانی ایل (۶۰۷ قبل مسیح) اور یرمیاہ (۶۲۹ قبل مسیح) یہ سب ایک ہی وقت میں آگے پیچھے ہوئے بلکہ کچھ حصہ ان کی زندگیوں کا متوازی بھی گزرا ہے۔پس اگر بائبل نے زکریا کو نبی نہیں کہا تو یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں۔جب بائبل کہتی ہے کہ بعض دفعہ ایک ایک زمانہ میں چار چار سو نبی آئے (نمبر ا سلاطین باب ۲۲ آیت ۶) اور وہ نام ایک کا بھی نہیں لیتی۔تو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں اتنی کثرت سے نبی آیا کرتے تھے کہ بائبل نے ان کے ناموں کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔قرآن کریم نے اپنی ضرورت کے مطابق جن نبیوں کا نام ضروری سمجھا لے لیا اور بائبل نے جن نبیوں کی ضرورت سمجھی ان کا نام لے لیا۔باقیوں کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کون تھے اور ان کے کیا

نام تھے۔ بہرحال حضرت زکریا کو انجیل نے گو کاہن قرار دیا ہے مگر قرآن کریم انہیں نبی قرار دیتا ہے اور اس جگہ زکریا سے وہی زکریاؑ مراد ہیں جو حضرت مسیحؑ کی والدہ کے کفیل تھے اور حضرت مسیح کے قریب ترین زمانہ میں گزرے ہیں۔

عیسائیت کے تفصیلی ذکر سے پہلے حضرت زکریاؑ کا ذکر کرنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہود میں یہ پیشگوئی پائی جاتی تھی کہ مسیح کی آمد سے پہلے ایلیاہ نبی کا آنا ضروری ہے۔ چونکہ حضرت زکریا کے ہاں یحییٰ پیدا ہونے والے تھے اور حضرت یحییٰ ارہاص تھے مسیح ناصری کے۔ یعنی وہ اس لئے آئے تھے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے آنے کے لئے راستہ تیار کرتے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ وہ یہود کو حضرت مسیح سے واقف اور انٹرڈیوس کرانے کے لئے آئے تھے اس لئے خدا تعالیٰ نے مسیح کے ذکر سے پہلے حضرت زکریا کا ذکر فرما دیا۔ چنانچہ جب ہم بائبل کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ملاکی نبی کی یہ پیشگوئی نظر آتی ہے کہ

''دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔'' (ملاکی باب ۴ آیت ۵)

اس جگہ ''خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن'' سے مراد حضرت مسیحؑ کی آمد ہے۔ چنانچہ جب مسیح ناصری نے دعویٰ کیا تو یہود نے یہی سوال کیا کہ وہ ایلیاہ جو آنے والا تھا وہ کہاں ہے؟ حضرت مسیح نے جواب دیا کہ اس سے مراد یوحنا ہے اور فرمایا کہ

''چاہو تو مانو ایلیاہ جو آنے والا تھا یہی ہے۔'' (انجیل متی باب ۱۱ آیت ۱۴)

پس چونکہ حضرت یحییٰ جن کا انجیل میں یوحنا نام آتا ہے اور جو ایلیاء نبی کے بروز تھے جب تک ظاہر نہ ہوتے حضرت مسیح نہیں آ سکتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ مسیح کے ذکر سے پہلے حضرت یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کیا جاتا۔ تا ملاکی نبی کی پیشگوئی کے پورا ہونے کی طرف اشارہ کر دیا جاتا اور لوگوں کو بتا دیا جاتا کہ دیکھو وہ ایلیاہ بھی آ گیا جس کی ملاکی نبی نے خبر دی تھی اور پھر ہمارا مسیح بھی دنیا میں ظاہر ہو گیا۔

دوسری وجہ قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کا موجب حضرت مریم علیہا السلام ہوئیں۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ

الدُّعَآءِ۔ (آل عمران:۳۸، ۳۹)

یعنی حضرت زکریا علیہ السلام جو حضرت مریم کے کفیل تھے اور جن کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی وہ ایک دفعہ اپنی عبادت گاہ میں گئے اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت مریم جو اس وقت چھوٹی بچی تھیں ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے مریم سے پوچھا کہ اَنّٰی لَكِ هٰذَا بیٹی تمہیں یہ چیزیں کہاں سے ملی ہیں۔ چھوٹے بچوں سے عام طور پر لوگ محبت اور پیار کی وجہ سے اس قسم کی باتیں پوچھا ہی کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ نے دی ہیں مفسرین اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسمان سے یہ چیزیں بھجوا دیا کرتا تھا (تفسیر کبیر لامام رازی زیر آیت آل عمران کلما دخل)۔ حالانکہ یہاں آسمان سے آنے کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ جواب صرف اس نیک تربیت کا نتیجہ تھا جو حضرت مریم علیہا السلام کی ہوئی تھی۔ ہمارے گھروں میں بھی بچوں کو سکھایا جاتا ہے کہ جب کوئی تم سے پوچھے کہ فلاں چیز تمہیں کہاں سے ملی ہے تو تم یہ کہا کرو کہ خدا نے دی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام نے جب یہ جواب دیا تو ایک تین چار سال کے بچہ کے منہ سے یہ بات سن کر کہ اللہ سب کچھ دیتا ہے یہ نعمتیں بھی اللہ نے ہی دی ہیں حضرت زکریا علیہ السلام کے دل پر چوٹ لگی اور انہوں نے خیال کیا کہ جب واقعہ یہی ہے کہ ہر چیز اللہ دیتا ہے اور ایک بچی بھی یہی کہہ رہی ہے تو میں تو سمجھدار اور تجربہ کار ہوں میں کیوں نہ یقین کروں کہ ہر چیز خدا ہی دیتا ہے۔ چنانچہ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ یہ جواب سن کر حضرت زکریا علیہ السلام کو توجہ ہوئی کہ میں بھی اپنی ضرورت کی چیز خدا تعالیٰ سے مانگوں۔ میرے گھر میں بھی کوئی بچہ نہیں۔ اگر مریم کی طرح میرے گھر میں بھی بچہ ہوتا اور میں اس سے پوچھتا کہ یہ چیز تمہیں کس نے دی ہے اور وہ کہتا کہ خدا نے تو جس طرح مریم کی بات سن کر میرا دل خوش ہوا ہے اسی طرح اپنے بچہ کی بات سن کر میرا دل خوش ہوتا۔ پس حضرت مریم علیہا السلام حضرت یحییٰ کی پیدائش کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرانے کا ایک محرک ہو گئیں اور اس طرح بالواسطہ طور پر جہاں خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کے ماتحت حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت مسیح کے ارہاص کے طور پر آئے وہاں حضرت مریم علیہا السلام جو حضرت مسیح کی والدہ تھیں حضرت یحییٰ کی پیدائش کے لئے ارہاص بن گئیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے حضرت زکریا کی دعا سنی اور ان کے گھر میں بچہ پیدا ہو گیا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا یہاں خالی یہ نہیں فرمایا ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ زَكَرِيَّا بلکہ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا فرمایا ہے اس میں جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا ایک بہت بڑی حکمت ہے اور قرآن کریم کا یہ کمال ہے کہ وہ ہر لفظ ایسے موقع پر استعمال کرتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے کوئی لفظ

زائد یا بے معنی نہیں ہوتا۔

اس آیت میں بھی پہلے فرمایا ذِكْرُ یعنی هٰذَا ذِكْرُ اور ذکر کے معنے صرف ایک واقعہ بیان کرنے کے نہیں ہوتے بلکہ اسے یاد کرانے کے ہوتے ہیں۔یعنی جو واقعہ ہم بیان کرنے لگے ہیں یہ ایسا اہم ہے کہ ہر شخص کو یہ واقعہ یاد رکھنا چاہیے اور خدا تعالیٰ کی طاقتوں اور اس کی قدرتوں پر ایمان لانا چاہیے۔ رَحْمَتُ رَبِّكَ ۔ یہ واقعہ کیا ہے یہ تیرے رب کی رحمت کا نشان ہے۔اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ رحمت تھی زکریا پر۔ربوبیت ہوئی مریم کی۔پھر ربك کیوں کہا گیا۔خالی یہ کیوں نہیں کہا کہ ذِكْرُ رَحْمَةِ الرَّبِّ۔ یہ رب کی رحمت کا ذکر ہے رَحْمَتُ رَبِّكَ کیوں کہا گیا ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا رَبِّ کی بجائے رَبِّكَ کے الفاظ لانا صاف بتا رہا ہے کہ یہاں کسی ایسی چیز کا بیان ہے جس میں ربوبیت محمدؐ کا بھی ذکر ہے اب اگر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ جس طرح یحییٰ علیہ السلام ارہاص تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارہاص تھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیونکہ حضرت عیسیٰ کے وجود میں جو بن باپ پیدا ہوئے یہ خبر دی گئی تھی کہ اب موسوی دور ختم ہو چکا ہے اور وہ پیشگوئی شروع ہونے والی ہے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے اسماعیل کے متعلق یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ

''دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔''

(پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰)

اسی طرح وہ وعدہ پورا ہونے والا ہے جو موسیٰ سے کیا گیا تھا کہ

''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔تم اس کی سننا۔'' (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵)

پس یہ واقعہ چونکہ ایک لمبے سلسلہ کی کڑی تھا۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے رَحْمَتُ رَبِّكَ کے الفاظ استعمال کئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ یہ تیرے رب کی رحمت کا نشان ہے کہ اس نے اتنے لمبے عرصہ سے دنیا کو تیری طرف متوجہ کرنے کے لئے تیار کیا پہلے اس نے یحییٰ کو پیدا کیا جو عیسیٰؑ کے لئے ارہاص تھا۔پھر اس نے عیسیٰؑ کو پیدا کیا جو تیرے لئے راستہ صاف کرنے والا تھا۔

پھر فرماتا ہے عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا۔ حالانکہ اگر عبدہ کا ذکر نہ بھی کیا جاتا تب بھی فقرہ مکمل تھا۔اس لفظ کو زائد کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ایک عمومی اور ایک خصوصی یعنی ایک وہ رحمتیں ہوتی ہیں جو

صفت رحمانیت کے ماتحت ہوتی ہیں اور مومن اور کافر سب کو ملتی ہیں اور ایک وہ رحمتیں ہوتی ہیں جو خاص طور پر اعلیٰ درجہ کے کارکنوں کو ملتی ہیں۔ جو جزاء کے طور پر ہوتی ہیں اور صفت رحیمیت کے ماتحت نازل ہوتی ہیں۔ رَحۡمَتُ رَبِّكَ میں صرف رحمت کا ذکر تھا۔ یہ پتہ نہیں لگتا تھا کہ یہ رحمانیت سے تعلق رکھنے والی رحمت ہے یا رحیمیت سے تعلق رکھنے والی رحمت ہے۔ عَبۡدَهٗ نے بتا دیا کہ یہ رحیمیت والی رحمت ہے وہ رحمت مراد ہے جو کسی کام کے نتیجہ میں نازل ہوتی ہے ایسے احسان کا ذکر نہیں جو بغیر خدمت اور کوشش کے صرف رحمانیت کے نتیجہ میں کیا جاتا ہے۔

اگر صرف زکریا کہا جاتا تو یہ سارا مضمون غائب ہو جاتا لیکن عَبۡدَهٗ زَكَرِيَّا کہہ کر بتایا کہ ہم نے زکریا پر جو رحمت نازل کی وہ عام رحمت نہیں تھی بلکہ خود زکریا بھی بہت نیک تھے اور انہوں نے بڑی بڑی خدمات کی تھیں۔ یہ سارا مضمون صرف ونحو کے چند اشاروں میں اللہ تعالیٰ نے ادا کر دیا ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ لگا کہ ایک دعا ایسے شخص کی ہوتی ہے جو رحمت کا مستحق نہیں ہوتا اور ایک دعا ایسے شخص کی ہوتی ہے جو رحمت کا مستحق ہوتا ہے مگر رحمت کی صفت بھی آپ ہی آپ ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے بھی بعض ایسی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو اس رحمت کو ابھارنے والی ہوں چنانچہ کبھی مشکلات کبھی دشمنوں کے مظالم اور کبھی اپنی بے کسی اور بے بسی انسانی قلب میں دعا کا ایک غیر معمولی جوش پیدا کر دیتی ہے اور آسمان سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہو جاتی ہے۔ گویا صفات الٰہیہ کا ظہور بعض خاص خاص محرکات کی وجہ سے ہوا کرتا ہے اس جگہ اس رحمت کے نزول کی کیا وجہ ہوئی اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں کیا ہے کہ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا یعنی حضرت زکریا کے پکارنے کی وجہ سے وہ رحمت آئی جو خالص خدمت گاروں کے لئے آیا کرتی ہے۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے نَادٰی کے کئی معنے ہوتے ہیں جن میں سے ایک معنے بلند آواز سے پکارنے کے بھی ہیں مگر وہ معنے یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر وہ معنے لئے جائیں تو پھر خَفِيًّا کے کوئی معنے نہیں بنتے۔ پس یہاں لازماً کوئی اور معنے لینے پڑیں گے اور وہ معنے یہی ہیں کہ اس نے مخفی آواز میں اپنے دل کا بھید اس پر ظاہر کیا۔

دنیا میں دو طرح کی دعائیں ہوا کرتی ہیں۔ ایک تو وہ دعا ہوتی ہے جس میں انسان دوسروں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے اور اس غرض کے لئے وہ بلند آواز سے دعائیہ کلمات کو دہراتا چلا جاتا ہے اور ایک دعا ایسی ہوتی ہے جو انسان علیحدگی میں کرتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کوئی اور بھی اس کے ساتھ شامل ہو جب ایسی دعا ہوتی ہے تو اس کا اصل مقام اخفاء ہوتا ہے۔ یعنی آہستہ آہستہ دعا کرنا۔ تا کہ دوسروں کے کانوں میں آواز نہ پڑے۔ مثلاً اگر اس میں اضطراب اور اضطرار ہوتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میں نے لوگوں کے سامنے تضرع سے دعا کی تو میری آواز نکلے گی جس

کو میں پسند نہیں کرتا تو وہ علیحدگی میں دعا کرتا ہے تا کہ اس کے اضطراب اور اضطرار پر کوئی دوسرا مطلع نہ ہو۔ یہاں حضرت زکریا کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا حضرت زکریا نے آہستہ آواز میں دعا کی یعنی وہ اس دعا میں دوسروں کو شریک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں نہیں کرتے تھے؟ اس کا ہمیں سورۂ آل عمران سے پتہ چلتا ہے اور یہاں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اصل بات یہ ہے کہ جب کسی انسان کو الٰہی ارشادات سے یہ معلوم ہو کہ اب خدا تعالیٰ کا فیضان کسی اور طرف منتقل ہونے والا ہے تو چاہے وہ خود اللہ تعالیٰ کے انوار کا حامل ہو۔ اس کے دل کو دکھ پہنچتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کے ہاتھ سے وہ نور ختم ہو بلکہ وہ چاہتا ہے کہ خواہ ایک منزل پرے ہٹ کر نور ختم ہو بہرحال میں وہ آخری چراغ نہ بنوں جس پر آسمانی نور کا خاتمہ ہو۔ سورۂ آل عمران سے پتہ چلتا ہے کہ مریم کی حالت دیکھ کر حضرت زکریاؑ کو یہ شبہ پڑ گیا تھا کہ آنے والا اسرائیلی موعود مریم کے بطن سے پیدا ہونے والا ہے کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ایسے اشارے ہوئے کہ مریم کا خیال رکھو ادھر مریم نے چھوٹی عمر میں ایسی باتیں شروع کر دیں جو ان کی نیکی اور تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے پیار پر دلالت کرتی تھیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لئے اپنے نشانات دکھانے شروع کر دیئے اور لوگوں کے دلوں میں ان کے تقویٰ اور ان کی بزرگی کا احساس پیدا کر دیا۔ چنانچہ کوئی کھانا لا رہا ہوتا، کوئی پھل پیش کر رہا ہوتا اور کوئی اور چیز تحفۃً لا کر دے رہا ہوتا۔ ادھر انہوں نے مریم کو دیکھا کہ اس کے دل میں کوئی دنیوی رغبت نہیں۔ بچہ ہونے کے باوجود وہ محسوس کرتی تھیں کہ یہ نعمتیں خدا تعالیٰ کی طرف سے آئی ہیں اور اسی کے فضل اور احسان کا نتیجہ ہیں۔ حضرت زکریا نے ان تمام باتوں کو دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ موعود جس پر بنی اسرائیل کی نبوت کا خاتمہ مقدر ہے۔ مریم کے پیٹ سے پیدا ہونے والا ہے ادھر ملاکی نبی اور بعض دوسرے انبیاء کی پیشگوئیاں ان کے سامنے تھیں جو بتا رہی تھیں کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ اب ختم ہونے والا ہے۔ پس حضرت زکریا نے اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا فیضان اب ختم ہونے والا ہے اللہ تعالیٰ سے وہ دعا کی جس کا ان آیات میں ذکر آتا ہے اور کہا کہ اے میرے رب میرے دل میں دیر سے یہ خواہش پائی جاتی تھی مگر آج مریم کی بات سن کر میرا دل بے قرار ہو گیا ہے اور میں اپنے دل کا راز تجھ پر ظاہر کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں پس یہاں نَادٰی کے وہ معنے نہیں جو شور مچانے کے ہیں بلکہ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا کے یہ معنے ہیں کہ اس نے خدا سے وہ راز سربستہ بیان کیا جو اس نے اپنے دل میں چھپایا ہوا تھا اور خدا تعالیٰ سے مانگتا نہیں تھا مریم کی بات سن کر اس کے دل میں جوش پیدا ہوا اور اس نے اپنے رب سے اپنے درد کا اظہار کر دیا۔ بیشک خدا تعالیٰ کے لئے کوئی چیز راز نہیں مگر جب تک کوئی دعا مانگی نہیں جائے گی اصطلاحاً اسے ایک راز

ہی سمجھا جائے گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اسی رنگ میں ایک جگہ خدا تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

وہ دے مجھ کو جو اس دل میں بھرا ہے
زباں چلتی نہیں شرم و حیا ہے

حقیقت یہی ہے کہ کئی خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں بندہ ایک مدت تک چھپائے رکھتا ہے اور کہتا ہے خدا تعالیٰ سے کیا مانگنا ہے لیکن کسی وقت محرک ایسا پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے دل کا راز سربستہ خدا تعالیٰ کے سامنے ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے نِدَآءً خَفِيًّا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ خدایا یہ میرے دل کا ایک راز تھا۔ میری پہلے سے یہی خواہش تھی کہ مجھے بیٹا ملے مگر اب مریم کی بات میں نے سنی ہے تو اس خواہش کو دل میں چھپائے رکھنے کی طاقت نہیں رہی۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ

(اور) کہا اے میرے رب (میری حالت تو یقیناً ایسی ہے کہ) میری تمام ہڈیاں تک کمزور ہو گئی ہیں اور (میرا) سر

شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۞

بڑھاپے کی وجہ سے بھڑک اٹھا ہے اور اے میرے رب میں (کبھی بھی) تجھ سے دعائیں مانگنے کی وجہ سے ناکام (و نامراد) نہیں رہا۔

حل لغات۔ اَلْوَهْنُ اَلْوَهْنُ کے معنے ہیں ضَعْفٌ مِنْ حَيْثُ الْخَلْقِ اَوِ الْخُلُقِ (مفردات) یعنی خواہ پیدائش کے لحاظ سے کمزوری ہو یا اخلاق کے لحاظ سے کمزوری ہو اسے وھن کہتے ہیں پس وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ کے معنے ہوں گے کہ میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں۔

تفسیر۔ حضرت زکریا علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اے میرے رب میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ بڑھاپے میں ہڈیاں Brittle ہو جاتی ہیں یعنی ایسی نازک ہو جاتی ہیں کہ ذرا سی ٹھوکر سے بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور ان کا جڑنا مشکل ہو جاتا ہے اسی لئے جوان کی ہڈی تو جلدی جڑ جاتی ہے لیکن بوڑھے آدمی کی ہڈی ٹوٹ جائے تو وہ آسانی سے نہیں جڑتی۔ پس رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ کے یہ معنے ہوئے کہ

میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور میرا ضعف اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اب مجھ میں تاب مقاومت باقی نہیں رہی۔

وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا۔اور میرا سر بڑھاپے کی وجہ سے شعلے مارنے لگ گیا ہے۔ بال جب سفید ہوتے ہیں تو یکدم سفید نہیں ہوتے بلکہ پہلے بالوں کا رنگ اڑتا ہے اور وہ سیاہی سے زردی مائل ہوجاتے ہیں پھر ان میں سفیدی آتی ہے مگر وہ اتنی تیز اور نمایاں نہیں ہوتی۔صرف ہلکی ہلکی سفیدی ہوتی ہے۔لیکن جب بڑھاپا غالب آجائے تو سر کے بال بہت زیادہ سفید ہوجاتے ہیں۔اسی کیفیت کا ان الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے کہ میرا سر تو اب بڑھاپے کی وجہ سے شعلے مارنے لگ گیا ہے۔

وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا۔اور اے میرے رب میں تیری دعا کے ساتھ کبھی شقی نہیں ہوا۔

اس کے ایک معنے یہ ہیں بِدُعَائِيْ اِيَّاكَ یعنی تجھے پکارنے کی وجہ سے یا ان دعاؤں کی وجہ سے جو میں تجھ سے مانگا کرتا ہوں میں کبھی شقی نہیں ہوا۔

دوسرے معنے حضرت زکریا کے لحاظ سے ایک اور بھی ہوسکتے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت زکریا چونکہ خدا تعالیٰ کے نبی تھے اس لئے بِدُعَآئِكَ کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ بِدُعَآئِكَ اِيَّايَ یعنی اے خدا جب تو نے مجھے پکارا اور مجھے اپنا نبی بنایا تو تیرا مقرب اور ہمکلام ہونے کی وجہ سے میں کسی بات میں بھی شقی نہیں ہوا۔میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مجھے اپنے کسی مقصد میں ناکامی ہوئی ہو اور شقاوت میرے حصہ میں آئی ہو۔

شقاوت سعادت کی ضد ہے اور سعادت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ایسی مدد انسان کے شامل حال ہونا جس سے اسے خیر حاصل ہوجائے اور شقاوت کے معنے ہوتے ہیں خدا تعالیٰ کی مدد کا میسر نہ آنا جس کی وجہ سے اسے مخصوص خیر حاصل نہ ہو۔ان معنوں کے لحاظ سے اس آیت کے دونوں مطلب لئے جاسکتے ہیں۔یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ تیرے حضور دعا کرنے کی وجہ سے مجھے کبھی ناکامی نہیں ہوئی اور یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے اس لئے تیرے مخصوص کرلینے کی وجہ سے اور تیرے انعامات کی وجہ سے میں نے یہ برکت پائی ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مشکلات میں مجھے ناکامی ہوئی ہو بلکہ ہمیشہ مجھے کامیابی ہوئی ہے اور میں نے اپنے مقصد کو حاصل کیا ہے۔

وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا

اور میں یقیناً اپنے رشتہ داروں سے اپنے (مرنے کے) بعد (کے سلوک) سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔

فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۙ﴿۶﴾ یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ

پس تو اپنے پاس سے ایک دوست (یعنی بیٹا) عطا فرما۔ جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب (سے جو دین وتقویٰ ہم

یَعْقُوْبَ ۗۖ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿۷﴾

کو ورثہ میں ملا ہے اس) کا بھی وارث ہو اور اے میرے رب اس کو (اپنا) پسندیدہ (وجود) بنائیو۔

حل لغات۔ موالی مَوَالِی مَوْلٰی کی جمع ہے اور اس کے بہت سے معنے ہیں چنانچہ مَوْلٰی کے ایک معنے دوست کے بھی ہوتے ہیں اور مَوْلٰی کے معنے اِبْنُ الْعَمِّ یعنی چچا زاد بھائی کے بھی ہیں جنہیں پنجابی میں ''شریکے والے'' کہتے ہیں (اقرب) اس جگہ موالی سے مراد شریک ہی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ میں اپنے شریکوں سے ڈرتا ہوں کہ وہ نہ معلوم میرے بعد کیسا معاملہ کریں گے۔

عاقر عَاقِرٌ اس مرد یا عورت کو کہتے ہیں جس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو۔ اصل میں عَقَرَ کے معنے زخمی کر دینے کے ہیں۔ چنانچہ عَقَرَ النَّخْلَةَ کے معنے ہوتے ہیں۔ قَطَعَ رَاْسَهَا كُلَّهٗ مَعَ الْجُمَّارِ فَيَبَسَتْ یعنی اس نے کھجور کے درخت کا اوپر کا حصہ اس قدر کاٹ دیا کہ وہ سوکھ گیا اور اس میں پھل لگنا بند ہو گیا۔ (اقرب) جس مرد یا عورت کی اولاد نہ ہو چونکہ وہ بھی اپنے خاندان کو زخمی کر دیتا اور اسے مار دیتا ہے اس لئے بےنسلی کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے اصل معنے کاٹ دینے اور زخمی کر دینے کے ہی ہیں۔ عقر کا لفظ عورت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور مرد کے لئے بھی۔

الولی اَلْوَلِیُّ کے معنے ہیں اَلْمُحِبُّ وَ الصَّدِّيْقُ محب اور دوست نیز اس کے معنے ہیں النَّصِيْرُ۔ مددگار۔ وَقَالَ ابْنُ فَارِسٍ وَ كُلُّ مَنْ وَلِيَ اَمْرَ اَحَدٍ فَهُوَ وَلِيُّه جو شخص کسی کے امور کو سنبھالنے والا ہو وہ اس کا ولی کہلاتا ہے۔ نیز ولی کے معنے حَافِظُ النَّسَبِ کے بھی ہیں یعنی نسب کا محافظ۔ (اقرب)

مفردات میں ہے فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا اَیْ اِبْنًا يَكُوْنُ مِنْ اُوْلِيَائِكَ یعنی ایسا بیٹا عطا کر جو تیرے

مقربین میں سے ہو۔

تفسیر ۔اس دعا میں حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی ضرورت حقہ کا اظہار کیا ہے وہ کوئی دولت مند نہیں تھے کہ انہیں اپنے بعد اپنی دولت کا فکر ہوتا وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی تھے پس ان کا خوف دولت کے جانے کا نہیں تھا بلکہ تعلیم کے مفقود ہونے کا تھا۔حضرت زکریا علیہ السلام پروہت فیملی میں سے تھے اوران کے رشتہ دار بھی پروہت تھے جو بیت المقدس اور دوسری عبادت گاہوں کے ساتھ تعلق رکھتے تھے(لوقا باب آیت ۵)۔حضرت زکریا علیہ السلام ان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ الٰہی ان میں ایسی دنیا داری آ چکی ہے کہ ان کا کوئی قدم یہودیت اور مذہب کو بچانے کے لئے نہیں اٹھتا۔معلوم ہوتا ہے مسلمان پیروں کی طرح یہود میں بھی بزرگی وراثت بن گئی تھی اور گدیاں قائم ہوگئی تھیں جیسے مسلمانوں میں پیر مرجائے تو اس کے بیٹے کو پیر بنا لیا جاتا ہے چاہے وہ کیسا ہی بے دین ہو۔اسی طرح وہاں بیٹا موجود ہوتا تو بیٹا گدی سنبھال لیتا۔بیٹا نہ ہوتا تو چچا کا بیٹا گدی پر بیٹھ جاتا۔گویا ان کی حالت مسلمان پیروں جیسی ہوگئی تھی۔جو کہلاتے تو پیر ہیں مگر عملی لحاظ سے وہ دین سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک سید پیر صاحب کا لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ وہ ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہوکر ہرن کے شکار کے لئے گئے۔شکار کرنا منع نہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گو خود شکار نہیں کیا مگر حدیثوں سے ثابت ہے کہ آپ شکار کروایا کرتے تھے چنانچہ ایک غزوہ میں آپ نے سعد بن ابی وقاص کو بلایا اور فرمایا کہ دیکھو وہ ہرن جارہا ہے اسے تیر مارو۔جب وہ تیر مارنے لگے تو آپ نے پیار سے اپنی ٹھوڑی ان کے کندھے پر رکھ دی اور فرمایا اے خدا اس کا نشانہ بے خطا کردے۔تو شکار بری چیز نہیں۔اس میں جو لطیفہ ہے وہ آگے آتا ہے بہرحال پیر صاحب نے ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ہرن بہت مضبوط تھا اس نے بھاگنا شروع کیا اور کئی میل تک بھاگتا چلا گیا۔اس زمانہ میں بندوقیں نہیں تھیں۔تیر یا نیزہ سے شکار کرتے تھے۔پیر صاحب بھی ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا دوڑاتے چلے گئے اور آخر اسے زخمی کرکے گرالیا۔جب وہ نیچے اترے اور ہرن کو ذبح کرنے لگے تو بجائے اس کے کہ وہ تکبیر کہہ کر اسے ذبح کرتے انہیں اتنا غصہ چڑھا ہوا تھا کہ چھری پھیرتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے کہ ’’ارے سؤر تو نے تو میرا گھوڑا ہی مار دیا ہے ارے سؤر تو نے تو میرا گھوڑا ہی مار دیا ہے‘‘ گویا غصہ یہ تھا کہ وہ بھاگا کیوں۔حالانکہ انسان ہو یا جانور جسے بھی اپنی جان کا خوف ہوگا بھاگے گا۔

غرض یہودیوں میں بھی مسلمانوں کی طرح یہ رواج تھا کہ جب خاندان میں ایک دفعہ کوئی بزرگ ہوجاتا تو اس کی اولاد اس کی گدی سنبھال لیتی تھی خواہ وہ کیسی ہی نالائق ہوتی۔حضرت زکریا علیہ السلام اس کا ذکر کرتے ہوئے

فرماتے ہیں کہ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ۔ خدایا میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے بھی ڈرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ ان کے اندر دین کی خدمت کا کوئی احساس نہیں۔ وَ کَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا۔ اور پھر میری بیوی بھی بانجھ ہے اگر میں جوان ہوتا یا میری بیوی جوان ہوتی تو ہوسکتا تھا کہ میرے ہاں کوئی اولاد پیدا ہو جاتی۔ کیونکہ بوڑھے مرد سے بھی جوان عورت کو بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض دفعہ ادھیڑ عمر والی عورت اگر کسی جوان مرد سے شادی کرلے تو اس کے ہاں بھی بچے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں مگر فرماتے ہیں دنیا میں بچے پیدا ہونے کے جو اسباب ہوتے ہیں وہ نہ میرے اندر پائے جاتے ہیں اور نہ میری بیوی کے اندر پائے جاتے ہیں۔ فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا پس اے خدا تو مجھے اپنے پاس سے ایک ایسا شخص عطا فرما جو ہمارے خاندان کی اولادوں کا حافظ ہو اور ان کو دین پر قائم کرے۔ یَّرِثُنِیْ وَ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔ یعنی جو میرے اندر قوم کی خدمت اور دین کی اشاعت کے لئے نیک جذبات پائے جاتے ہیں وہ بھی اس میں پائے جائیں اور اسی طرح بنی اسرائیل میں جو نیکیوں کا ورثہ چلا آتا ہے اور موسیٰ اور ہارون اور داؤد اور سلیمان اور دوسرے انبیاء سے انہوں نے جو جو خوبیاں حاصل کی ہیں وہ سب کی سب اس میں پائی جائیں۔ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا۔ اور اے میرے رب تو اس کو دنیا میں ایک پسندیدہ وجود بنادے۔

دیکھو یہ کیسی لطیف دعا ہے اور کس طرح دعا کے چاروں کونے اس میں پورے کر دیئے گئے ہیں۔ اس دعا کو اگر ہم اپنے الفاظ میں بیان کریں تو اس کی یہ صورت ہوگی کہ

''اے میرے خدا میرے اندرونی قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ میرا بیرونی چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔ میں ہمیشہ سے ہی تیرے الطاف خسروانہ کا عادی ہوں۔ اس لئے مایوسیاں اور ناکامیاں میں نے کبھی دیکھی نہیں۔ ناز کرنے کی عادت مجھ میں پیدا ہو چکی ہے۔ رشتہ دار میرے برے اور موت کے بعد گدی سنبھالنے کے منتظر بیوی میری بیکار۔ ان سب وجوہ کے ساتھ میں مانگنے آیا ہوں اور کیا مانگنے آیا ہوں یہ مانگنے آیا ہوں کہ اے میرے خدا تو مجھے بیٹا دے۔ ایسا بیٹا دے۔ جو میرا ہم خیال اور دوست ہو ایسا بیٹا دے جو میرے بعد تک زندہ رہنے والا اور میرے خاندان کو سنبھالنے والا ہو اور ایسا بیٹا دے جو میرے اخلاق اور آل یعقوب کے اخلاق کو پیش کرنے والا ہو گویا صرف میرے نام کو ہی زندہ نہ کرے بلکہ اپنے دادوں پردادوں کے نام کو بھی زندہ کردے اور پھر وہ انسانوں ہی کے لئے باعث خوشی نہ ہو۔ بلکہ اے میرے رب وہ تیرے لئے بھی باعث خوشی ہو۔''

سبحان اللہ کیسی لطیف دعا ہے کہ اندر میرا خراب ہو چکا ہے باہر میرا خراب ہو چکا ہے بیوی میری بیکار ہو چکی ہے رشتہ دار میرے خراب ہو چکے ہیں اور میں مانگتا یہ ہوں کہ تو مجھے بیٹا دے مگر اس بڑھاپے میں بھی میں ناقص بیٹا نہیں مانگتا بلکہ میں یہ مانگتا ہوں کہ تو مجھے وہ بیٹا دے جو میرے کمالات بھی اپنے اندر رکھتا ہو اور اپنے باپ دادوں کے کمالات بھی اپنے اندر رکھتا ہو اور پھر وہ میرا ہی پسندیدہ نہ ہو بلکہ تیرا بھی پسندیدہ اور محبوب ہو۔ یہ دعا ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام نے کی۔ بے شک وہ پیشگوئیوں کی بنا پر جانتے تھے کہ نبوت کا نور اب بنی اسرائیل سے چھینا جانے والا ہے۔ مگر پھر بھی انسان خیال کرتا ہے کہ شاید کوئی ایسا ذریعہ نکل آئے جس سے قوم بچ جائے اور وہ ہلاکت اور تباہی کے گڑھے میں نہ گرے۔ پس حضرت زکریا علیہ السلام نے یحییٰ کے لئے اس لئے دعا کی وہ جانتے تھے کہ اب ایک ایسا شخص آنے والا ہے جس پر بنی اسرائیل کی نبوت ختم ہو جائے گی۔ سو انہوں نے چاہا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جس کے نتیجہ میں آنے والے موعود کو قوم مان لے اور اس کی امداد اور نصرت کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائے اور خدا تعالیٰ کا نور کچھ دنوں کے لئے اور ہماری قوم میں باقی رہ جائے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا انجیل سے جو حال معلوم ہوتا ہے اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی آمد کی بڑی غرض یہی تھی کہ قوم کو حضرت مسیحؑ پر ایمان لانے کے لئے تیار کریں۔ انجیل میں لکھا ہے حضرت یحییٰؑ نے لوگوں سے کہا

> ’’میں تو تم کو توبہ کے لئے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن جو میرے بعد آتا ہے (یعنی مسیح) وہ مجھ سے زور آور ہے میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں وہ تم کو روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا۔‘‘ (متی باب ۳ آیت ۱۱)

بہر حال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سارا زور اس بات پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود مقصود نہیں بلکہ مسیح کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور حضرت زکریا علیہ السلام نے جو دعا مانگی وہ بھی اسی لئے مانگی تھی کہ ان کا بیٹا آنے والے اسرائیلی موعود کے لئے رستہ صاف کرے شاید وہ اپنی کوشش اور جدو جہد سے بنی اسرائیل کو آنے والے مسیح کی طرف متوجہ کر سکے اور اس طرح قوم پر جو عذاب آنے والا ہے وہ ٹل جائے یہ چیز ہے جو حضرت زکریا علیہ السلام کے سامنے تھی۔ اب اس پس منظر کے سامنے ساری عیسائیت کو رکھ لو اس کی کوئی حقیقت بھی باقی نہیں رہتی عیسائیت اپنے آپ کو بنیاد قرار دیتی ہے اور یہ پس منظر بتاتا ہے کہ وہ عمارت کی آخری اینٹ تھی کسی نئے مذہب اور نئے اصول کی تعلیم اس کا مقصد نہیں تھا بلکہ ایک لمبے عرصہ سے جو نبوت اور وحی و الہام کا سلسلہ بنی اسرائیل میں جاری تھا اس کے خاتمہ کا اس ذریعہ سے اعلان کیا گیا تھا۔ گویا مسیحیت کوئی بنیادی چیز نہیں بلکہ خاتمہ کی اینٹ ہے حضرت زکریا کی

کوشش یہ تھی کہ یہ نور کچھ اور دیر قائم رہے اور انہیں ایک ایسا بیٹا ملے جو اس بات کے لئے اپنا پورا زور صرف کر دے کہ بنی اسرائیل مسیح کے منکر نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا سن کر حضرت یحییٰ کو بھیج دیا اور اس نے اپنا سارا زور بھی لگا لیا مگر پھر خدا تعالیٰ کی تقدیر ہی پوری ہوئی اور وہی کچھ ہوا جس کا وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں جب فرشتے ان کے پاس لوط کی بستی کی ہلاکت کی خبر لے کر آئے یا انسان آئے جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے اور انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے لوط کی قوم کو تباہ کرنے کا حکم دیا ہے تو اس خبر کو سن کر انہیں درد پہنچا اور انہوں نے دعا کرنی شروع کی کہ یا اللہ اس قوم پر سے عذاب ٹل جائے دعا کرتے کرتے ان کے دل میں جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے کہا خدایا!

’’کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا شاید اس شہر میں پچاس راستباز ہوں کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں‘‘

اللہ تعالیٰ نے کہا اے ابراہیم!

’’اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راستباز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا‘‘

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال آیا کہ معلوم ہوتا ہے اس میں پچاس بھی نیک آدمی نہیں ہیں اور انہوں نے کہا اچھا

’’اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں شاید پچاس راستبازوں میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا کہ میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا۔ خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا۔ دیکھئے میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا۔ میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔‘‘

(پیدائش باب ۱۸ آیت ۲۳ تا ۳۲)

اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش ہو گئے۔ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب یہ بستی ضرور تباہ ہو کر رہے گی۔ اب دیکھو خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی خوش کر دیا اور اپنی تقدیر بھی پوری کر دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب یہ دعا کر رہے ہوں گے تو وہ اپنے دل میں کتنے خوش ہوں گے اور انہوں نے اسے خدا تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان سمجھا ہوگا کہ خدا تعالیٰ ایک بستی کو بتاہ کرنے کا ارادہ کر چکا ہے مگر ان کی دعا اور التجا پر وہ کہتا ہے کہ اچھا میں نے تمہاری بات مان لی اگر اس میں پچاس مومن ہوئے تو میں اس بستی کو کبھی ہلاک نہیں کروں گا۔ پھر وہ پینتالیس پر آئے تو خدا تعالیٰ نے یہ بات بھی مان لی پھر چالیس پر آئے تو یہ بات بھی مان لی۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے دس پر بات آ گئی مگر اس کے بعد خود بخود ان کی زبان بند ہو گئی اور انہوں نے خیال کیا کہ اب میں اس سے زیادہ خدا تعالیٰ کو اور کیا کہوں۔ میری تو اب زبان ہی نہیں چلتی۔ اسی طرح حضرت زکریا کے دل میں جب اس بات سے گھبراہٹ پیدا ہوئی کہ قوم تباہ ہونے والی ہے تو ان کے دل میں خیال آیا کہ میں تو اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں کہ اس بوجھ کے اٹھانے کی اب مجھ میں ہمت ہی نہیں رہی اگر خدا تعالیٰ مجھے کوئی بیٹا دے اور ایسا بیٹا دے جو نبی ہو اور وہ آنے والے اسرائیلی موعود کا راستہ صاف کرے اور لوگوں کو اس پر ایمان لانے کی تحریک کرے تو ممکن ہے یہ عذاب ہماری قوم پر سے ٹل جائے اور خدا تعالیٰ کا نور اس میں کچھ اور مدت تک باقی رہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ بہت اچھا ہم تجھے بیٹا دیں گے اور اسے نبی بھی بنا دیں گے مگر پھر بھی ہماری تقدیر ہی پوری ہوگی یہودی قوم پھر بھی ایمان نہیں لائے گی بلکہ خود تمہارا بیٹا انہی لوگوں کے ہاتھ سے قید خانہ میں قتل کیا جائے گا۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨ اسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝۸

(اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا) اے زکریا۔ ہم تجھے ایک لڑکے کی خبر دیتے ہیں (جو جوانی کی عمر تک پہنچے گا اور) اس کا نام (خدا کی طرف سے) یحیٰی ہوگا ہم نے اس سے پہلے کسی کو اس نام سے یاد نہیں کیا۔

حل لغات۔ غُلَامٌ غلام کا لفظ تین مختلف عمروں والوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یعنی پیدائش سے لے کر جوانی تک کی عمر والے کو بھی غلام کہتے ہیں۔ جوانی سے لے کر کہولت تک کی عمر والے کو بھی غلام کہتے ہیں اور کہولت سے لے کر بڑھاپے تک کی عمر والے کو بھی غلام کہتے ہیں (اقرب)۔ گویا زندگی کے چار دوروں بچپن، جوانی،

ادھیڑعمر اور بڑھاپے میں سے بڑھاپے کو چھوڑ کر باقی تینوں زمانوں کے لئے غلام کا لفظ بولا جاتا ہے۔

سَمِیًّا سَمِیٌّ کے معنے ہم نام کے بھی ہوتے ہیں۔اور سَمِیٌّ کے معنے نظیر اور مثل کے بھی ہوتے ہیں۔(اقرب)

تفسیر ۔دعا مانگنے والا خدا تعالیٰ کا ایک برگزیدہ انسان زکریا تھا جس نے اللہ تعالیٰ سے ایک کامل دعا مانگی۔اب دوسرے کامل کی قبولیت کو دیکھو۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سنو اے زکریا! ہم تمہیں ایک بچہ کی بشارت دیتے ہیں جو ادھیڑ عمر تک پہنچے گا مگر بڑھاپا نہیں دیکھے گا۔ اسْمُهٗ يَحْيٰى اور اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ پیدائش سے پہلے نام نہیں رکھا جاتا بلکہ پیدائش کے بعد نام رکھا جاتا ہے۔پس اسْمُهٗ يَحْيٰى کے معنے یہ ہیں کہ جب وہ پیدا ہو تو تم اس کا نام یحییٰ رکھنا۔ یہ مطلب نہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی کہنا شروع کردے گا کہ میرا نام یحییٰ ہے۔

یحییٰ کے متعلق یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں تو ان کا نام یحییٰ آتا ہے لیکن اردو بائبل میں یحییٰ کی بجائے یوحنا نام لکھا ہے۔عبرانی اور یونانی زبان میں انہیں John اور Jhanan بھی کہتے ہیں انگریزی بائبلوں میں ان کا نام John لکھا ہے۔عبرانی کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں کہ یوحنا کے کیا معنے ہیں لیکن عربی میں یہ بامعنی لفظ ہے اور یحییٰ کے معنے ہیں وہ شخص جو زندہ رہتا ہے پس اسْمُهٗ يَحْيٰى میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ یہ بچہ زندہ رہے گا تم اس کا نام یحییٰ رکھنا یا اس کی صفت یحییٰ ہوگی اور ہمیشہ زندہ رہنے والا ہوگا۔قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ شہداء ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔اس لحاظ سے یحییٰ نام میں یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ یہ خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہوگا اور ایسے اعلیٰ درجہ کا روحانی مقام رکھے گا۔کہ دنیا میں اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا چنانچہ یہ واضح بات ہے کہ مسیح جیسا نبی کبھی مر نہیں سکتا اور جب مسیح مر نہیں سکتا تو جس کی نبوت مسیح سے وابستہ ہے وہ بھی کبھی مر نہیں سکتا۔مسیح اس لئے نہیں مر سکتا کہ وہ ایک نہ مرنے والے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارہاص تھا اور یوحنا اس لئے نہیں مر سکتا کہ وہ مسیح کا ارہاص تھا۔ جو خود ایک نہ مرنے والے نبی کا ارہاص تھا چنانچہ دیکھ لو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اب تک ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء گزرے ہیں۔(مسند احمد بن حنبل بروایت ابی عمامہ الباھلی) مگر ہمیں تو سو نبیوں کا بھی علم نہیں باقی سب مر گئے ہیں پس نبی کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے بعض زندہ رہتے ہیں اور بعض مر جاتے ہیں۔حضرت یحییٰ ؑ ان نبیوں میں سے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھے گئے ہیں کیونکہ ان کی نبوت مسیح ؑ کے ساتھ وابستہ تھی اور مسیح ؑ اس لئے نہیں مر سکتے کہ ان کی نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستہ تھی جو ہمیشہ کے لئے زندہ رہنے والے نبی ہیں۔

لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔ سَمِیٌّ کے معنے ہوتے ہیں اسی قسم کا نام رکھنے والا یعنی ہم اسم ۔اور سَمِیٌّ کے معنے

مثل کے بھی ہوتے ہیں۔مفسرین غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ سَمِیًّا ہم اسم کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پہلے دنیا میں کسی کا نام یحییٰ نہیں رکھا گیا تھا (بحر محیط زیر آیت یاز کریا)۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔خود بائبل میں بعض ایسے لوگوں کا ذکر آتا ہے جن کا نام یوحنا تھا۔ چنانچہ ۲۔سلاطین باب ۲۵ آیت ۲۳ میں یہودیوں کے ایک سردار کا نام یوحناہ لکھا ہے۔اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک پڑپوتے کا نام یوحنا تھا۔ دیکھوا۔تواریخ باب ۳ آیت ۱۵۔اسی طرح عزرا نبی کے ساتھ جو لوگ ایران سے یروشلم بنانے کے لئے آئے ان میں سے ایک شخص کا نام یوحنا تھا (عزرا باب ۸ آیت ۱۲) پس مفسرین کا یہ خیال کہ اس نام کا پہلے کوئی شخص نہیں گذرا یہ واقعات کے خلاف ہے۔

عیسائیوں کو ایسی بات خدا دے۔انہوں نے سمیًا کے معنے مفسرین کے بیان کے مطابق یہ سمجھ لئے کہ اس کا ہم نام کوئی نہیں۔اور پھر بائبل سے یوحنا کے ہم نام بتانے لگے گئے۔اور پھر اس اعتراض کو مزید پختہ کرنے کے لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ کسی سے بائبل کی تھوڑی سی باتیں سنی ہوئی تھیں ان سے دھوکا کھا کر آپ نے یہ خیال کر لیا کہ یحییٰ نام کا پہلے کوئی شخص نہیں گزرا (تفسیر وہیری)۔ چنانچہ اس کے لئے وہ یہ حوالہ بیان کرتے ہیں کہ انجیل میں لکھا ہے جب حضرت زکریا کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو چونکہ وہ اس سے پہلے گونگے ہو چکے تھے اس لئے آٹھویں دن ان کے رشتہ دار لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور انہوں نے نے تجویز کیا کہ اس کا نام اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھا جائے۔مگر اس کی ماں نے کہا نہیں اس کا نام یوحنا رکھا جائے۔اس پر انہوں نے اس سے کہا کہ۔

''تیرے گھرانے میں کسو کا یہ نام نہیں۔'' (لوقا باب ا آیت ۶۱)

یعنی تیرے خاندان میں چونکہ پہلے یہ کسی کا نام نہیں۔اس لئے ہم یہ نام نہیں رکھتے۔اس کے بعد لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت زکریا کو اشارہ کیا کہ تو اس کا کیا نام رکھنا چاہتا ہے۔انہوں نے تختی منگوا کر اس پر لکھا کہ اس کا نام یوحنا ہے اور اسی وقت ان کی زبان کھل گئی۔اور وہ بولنے لگے گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ انجیل میں یہ جو فقرہ آتا ہے کہ

''تیرے گھرانے میں کسو کا یہ نام نہیں۔''

معلوم ہوتا ہے یہ فقرہ کسی نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سنایا مگر انہیں پوری طرح یاد نہ رہا اور بجائے اس کے کہ وہ یہ سمجھتے کہ یوحنا نام زکریا کے خاندان میں سے کسی کا نہیں تھا۔انہوں نے قرآن میں یہ لکھوا دیا کہ اس سے پہلے

یہ نام دنیا میں کسی شخص کا نہیں تھا۔ حالانکہ قرآن کریم نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا کہ اس سے پہلے کسی کا نام یوحنا نہیں تھا۔ قرآن کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ مفسرین کی غلطی ان کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم تو یہ کہتا ہی نہیں کہ ان کا ہم نام کوئی نہیں تھا۔ قرآن کریمہ کہتا کہ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔ ہم نے اس سے پہلے کسی اور کو اس کا سمی نہیں بنایا۔ اب بتاؤ کہ بچوں کا نام ان کے نام باپ رکھا کرتے ہیں یا خدا رکھا کرتا ہے؟ عیسائیوں میں دیکھ لو۔ ہندوؤں میں دیکھ لو۔ مسلمانوں میں دیکھ لو۔ کون نام رکھا کرتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے۔ کہ ماں باپ بچوں کے نام رکھا کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ہم نے اس سے پہلے کسی کا نام یوحنا نہیں رکھا۔ اب فرض کرو یوحنا دنیا میں دس کروڑ بھی ثابت ہو جائیں۔ تب بھی کیا حرج ہے۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ یوحنا نام پہلے تھا یا نہیں۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے پہلے کسی اور کا نام خود خدا تعالیٰ نے یوحنا رکھا تھا؟ بے شک دس کروڑ چھوڑ دس ارب یوحنا ثابت ہو جائیں ان کا نام خدا نے یوحنا نہیں رکھا تھا بلکہ ان کے ماں باپ نے رکھا تھا۔ اور قرآن کہتا ہے کہ ہم نے یہ نام پہلے کسی کا نہیں رکھا۔ اگر ایک نام دس کروڑ دفعہ بھی ماں باپ رکھیں تب بھی خدا اگر پہلی دفعہ کسی کا وہ نام رکھے گا تو وہ تو یہی کہے گا کہ میں نے یہ نام اس سے پہلے کسی کا نہیں رکھا۔ ہمارے ملک میں لاکھوں محمد ہوں گے۔ لاکھوں عبداللہ ہوں گے۔ لاکھوں عبدالرحمٰن ہوں گے۔ لاکھوں عبدالرحیم ہوں گے مگر ان کے نام ماں باپ نے رکھے ہیں۔ اگر کل کسی کو الہام ہو کہ تو اپنے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھ اور یہ وہ نام ہے جو ہم نے اس سے پہلے کسی کا نہیں رکھا اور پھر وہ اس کا نام عبدالرحمٰن رکھ دے تو کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے عبدالرحمٰن تو اس سے پہلے لاکھوں ہوں خدا نے اسے پہلے اور کسی کا نام عبدالرحمٰن نہیں رکھا۔ وہ نام ان کے ماں باپ نے رکھے ہیں۔ اسی طرح اگر تو خدا تعالیٰ نے یہ کہا ہوتا کہ یوحنا کا ہم نام کوئی نہیں ہوگا تب تو اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ہم نے اور کسی کو یہ نام نہیں دیا۔ اور یہ ٹھیک بات ہے کہ جتنے نام بتائے جاتے ہیں وہ سب ایسے ہیں جو ماں باپ نے رکھے تھے اور یہاں اس کا نام ذکر ہے جو خدا تعالیٰ نے رکھا۔ اس لئے اعتراض کی کوئی بات نہیں۔

دوسرے عربی زبان میں سمیا کے معنے مثل کے بھی ہوتے ہیں پس لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی مثل نہیں بنایا۔ گویا اس میں ان کے بے مثل ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اب سوال ہو سکتا ہے کہ یحییٰ بے مثل کس طرح ہو گئے۔ کیا موسیٰ ؑ اس جیسا نہیں تھا؟ ہم کہتے ہیں بے مثل ہونا بھی اپنے اپنے دائرہ میں ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں شخص گھوڑے کا بے مثل سوار ہے۔ فلاں بے مثل کاتب ہے۔ فلاں بے مثل انگریز ہے۔ اب اس کے یہ معنے تو نہیں ہوتے کہ جو گھوڑے کی سواری میں

بے مثل ہے وہ بے مثل کاتب بھی ہے یا بے مثل رنگساز بھی ہے یا بے مثل تفسیر لکھنے والا بھی ہے۔ جو شخص بے مثل کہلاتا ہے وہ اپنی کسی خاص خوبی میں بے مثل کہلاتا ہے۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ سارے جہان کی خوبیاں اور کمالات اس میں پائے جاتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یحییٰ کس بات میں بات میں بے مثل تھے۔ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ وہ پہلے نبی ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ الیاس کا نام پا کر آئے ہیں گویا ارہاص والے نبیوں میں سے یہ پہلے نبی تھے۔ جو الیاس کا نام پا کر اس کی خو بو پر آئے۔ اس سے پہلے پرانے نبیوں میں کوئی ایسا نبی نہیں مل سکتا جو کسی دوسرے نبی کے لئے ارہاص کے طور پر آیا ہو۔ لیکن یحییٰ کے بعد حضرت مسیحؑ آ گئے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ارہاص تھے۔ اور پھر حضرت سید احمد صاحب بریلوی آ گئے جو حضرت مسیح موعودؑ کے لئے ارہاص تھے۔ پس لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا میں یہی خبر دی گئی تھی کہ ہم نے اس سے پہلے کسی اور کو اس کا مثل نہیں بنایا۔ یعنی یحییٰ وہ پہلے شخص ہیں جو کسی کے مثیل ہو کر آئے ہیں چنانچہ دیکھ لو اب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے ہیں تو ہمیں بار بار یحییٰ کا نام لینا پڑتا ہے۔ کیونکہ پیشگوئیوں میں بتایا گیا تھا کہ مسیح آسمان سے نازل ہوگا۔ جب مخالف ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ مسیح کہاں ہے؟ تو ہم کہتے ہیں مسیح ناصری کے وقت میں بھی لوگوں نے یہی سوال کیا تھا۔ جب حضرت مسیحؑ نے دعویٰ کیا تو لوگوں نے پوچھا کہ ملاکی نبی کتاب میں ایلیاہ کے دوبارہ نزول کی خبر دی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ وہ مسیح سے پہلے آئے گا وہ ایلیاہ کہاں ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جواب دیا کہ یوحنا ہی ایلیاہ ہے (متی باب ۱۱ آیت ۱۴)۔ اگر چاہو تو قبول کر لو۔ پس جس جس طرح وہاں ایلیاہ کے نام پر یوحنا آیا اسی طرح یہاں مسیح ناصریؑ کے نام پر خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے مسیح کو بھیج دیا۔ اس طرح اب ہماری جماعت بھی مجبور ہے کہ وہ یحییٰ کے نام کو زندہ رکھے کیونکہ مثلیّت کا نکتہ انہی کے ذریعہ سے حل ہوا ہے۔

غرض لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا سے یہ مراد ہے کہ ہم نے اس کا مثل پہلے نہیں بنایا اور اسے ایسی خصوصیت عطا فرمائی ہے جو پہلے کسی کو نہیں دی گئی۔ چنانچہ موٹی مثال موجود ہے کوئی بتا دے کہ یوحنا سے پہلے کسی اور نبی کو مثیلِ ایلیاہ قرار دیا گیا ہو۔ اگر عیسائی اور یہودی بھی مانتے ہیں کہ اس پہلو کے لحاظ سے اس کا کوئی مثل پہلے نہیں گذرا تو اس کا بے مثل ہونا ثابت ہو گیا۔ بے مثل ہونے کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ ساری دنیا کی خصوصیات کسی میں پائی جائیں۔ کسی ایک بات میں بھی اگر کوئی بے مثل ہو تو اسے بے مثل کہا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک بات میں نے بھی بتا دی ہے۔ اسی طرح اور بھی بعض خوبیاں ہو سکتی ہیں جو ان کو بے مثل بنانے والی ہوں۔ انجیل میں بھی اس کے مطابق ہی

حضرت یحییٰ ؑ کی تعریف آئی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت مسیح ؑ نے کہا کہ

''میں تم سے کہتا ہوں کہ ان میں سے جو عورتوں سے پیدا ہوئے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی نبی بڑا نہیں۔'' (لوقا باب ۷ آیت ۲۸)

گویا انجیل بھی ان کو بے مثل قرار دیتی ہے۔ مگر انجیل نے جو مثال دی ہے وہ غلط ہے۔ انجیل کہتی ہے کہ اس سے کوئی بڑا نبی نہیں ہوا۔ مگر کیا وہ موسیٰ ؑ سے بھی بڑا تھا؟ حالانکہ وہ موسیٰ ؑ کا تابع تھا۔ کیا وہ ابراہیمؑ سے بھی بڑا تھا؟ حالانکہ وہ ابراہیم کا تابع تھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات جو بیان کی گئی ہے غلط ہے۔ کیونکہ موسیٰ ؑ اور ابراہیم ؑ اور دوسرے کئی انبیاء یوحنا سے بڑے تھے۔ لیکن قرآن نے جو کچھ فرمایا ہے۔ اس میں اس نے یہ مثال نہیں دی صرف اتنا کہا ہے کہ کسی بات میں ہم نے اسے بے مثل بنایا تھا۔ مسیح کہتا ہے کہ وہ بڑے نبی ہونے میں بے مثل ہے مگر خود عیسائی عقیدہ اس کے خلاف ہے پس حضرت یحییٰ کے بے مثل ہونے کا ثبوت بھی انجیل سے مل گیا اور انجیل کے جھوٹا ہونے کا بھی ثبوت مل گیا۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ منافق تیرے پاس آتے ہیں اور قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ تو اللہ کا رسول ہے خدا تعالیٰ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے مگر خدا اس بات کا بھی گواہ ہے کہ یہ منافق اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں (المنافقون: ۲)۔ اسی طرح اس حوالہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ قرآن نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو جو بے مثل کہا تھا وہ درست تھا انجیل بھی اسے بے مثل مانتی ہے مگر ساتھ ہی جو وجہ اس نے بتائی اس نے بتا دیا کہ انجیل جھوٹی ہے اور قرآن سچا۔ کیونکہ وہ وجہ خود عیسائی مسلّمات کے خلاف ہے اور وہ یوحنا کو تمام انبیاء سے بڑا قرار نہیں دیتے۔

اب میں بتاتا ہوں کہ یوحنا یعنی یحییٰ کا انجیل سے کیا حال معلوم ہوتا ہے۔

لوقا میں لکھا ہے زکریا کاہن اور اس کی بیوی الیسبات (یعنی الزبتھ) بڈھے تھے۔ عورت بانجھ تھی۔ لڑکا کوئی نہ تھا۔ دونوں نیک اور راستباز تھے۔ ایک دن وہ خوشبو جلانے کے لئے ہیکل میں گیا تو فرشتہ ملا جس نے کہا کہ

''زکریاہ مت ڈر کہ تیری دعا سنی گئی اور تیری جورو الیسبات تیرے لئے ایک بیٹا جنے گی تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے خوشی و خورمی ہو گی اور بہتیرے اس کی پیدائش سے خوش ہوں گے۔ کیونکہ وہ خداوند کے حضور بزرگ ہو گا اور نہ مے اور نہ کوئی نشہ پئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا اور بنی اسرائیل میں سے بہتوں کو ان کے خداوند خدا کی طرف پھیرے گا اور وہ اس کے آگے الیاس کی طبیعت اور قدرت کے ساتھ چلے گا۔'' (لوقا باب ۱ آیت ۱۳ تا ۱۷)

پھر لکھا ہے کہ یہ فرشتہ جبریل تھا۔اور لکھا ہے کہ چونکہ زکریا نے فرشتہ کی بات پر شک کیا اس لئے اسے یوحنا کی پیدائش بلکہ ختنہ کے وقت تک کے لئے یعنی قریباً دس ماہ کے لئے گونگا کیا گیا۔ یہ بات قرآن شریف سے مختلف ہے۔مگر ظاہر ہے کہ ان کے نبی ہونے کے لحاظ سے قرآن کریم کا بیان زیادہ درست ہے۔قرآن کریم کا بیان ایک نبی کی شان کے مطابق ہے اور انجیل کا بیان نبی کی شان کے خلاف ہے۔

بائبل کے بیان اور قرآنی بیان میں کچھ اختلافات بھی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) قرآن کہتا ہے کہ حضرت زکریاؑ کو دعا کی تحریک حضرت مریم علیہا السلام کے ایک معصومانہ کلام سے ہوئی (آل عمران:۳۸،۳۹) بائبل اس بارہ میں خاموش ہے۔مگر خاموش ہونا واقعہ کے غلط قرار دینے کے مترادف نہیں ہوتا۔ بائبل نے جہاں بشارت کا ذکر کیا ہے تسلیم کیا ہے کہ زکریاؑ بیٹے کے لئے دعا کیا کرتے تھے۔ کیونکہ لکھا ہے فرشتے نے اسے کہا کہ ’’تیری دعا سنی گئی‘‘ (لوقا باب ۱ آیت ۱۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریا بیٹے کے لئے دعا کیا کرتے تھے۔لیکن بائبل نے یہ نہیں بتایا کہ اس دعا کا محرک کیا ہوا۔قرآن کریم نے یہی واقعہ ابتداء سے بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام سے ان کی باتیں ہوئیں تو اس بچی کے معصومانہ کلام سے ان کے دل میں دعا کا جوش پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے رب سے یہ دعا کی۔گویا بائبل نے صرف اتنا واقعہ بیان کیا ہے جو بعد کا ہے دعا کے محرک کا ذکر اس نے نہیں کیا۔اس سے اس کے نقص کا تو اظہار ہوتا ہے لیکن قرآن کریم کی غلطی ظاہر نہیں ہوتی۔

ہمارے پاس اس بات کا ثبوت کہ قرآن کریم کی روایت ہی صحیح ہے یہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ حضرت زکریاؑ کی آخری عمر میں پیدا ہوئے تھے اور اس بات کو خود بائبل بھی تسلیم کرتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب فرشتہ نے انہیں یحییٰ کی پیدائش کی خوشخبری دی تو انہوں نے کہا کہ

’’میں اس بات کو کس طرح جانوں۔ کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی عمر رسیدہ ہے‘‘۔

(لوقا باب ۱ آیت ۱۸)

اب سوال یہ ہے کہ حضرت زکریا نے اس سے پہلے کیوں نہیں دعا کی؟ آخری عمر میں جا کر دعا کرنا صاف بتاتا ہے کہ کوئی نیا محرک پیدا ہوا تھا اور وہ نیا محرک یہی تھا کہ حضرت مریمؑ پیدا ہو چکی تھیں جن کے ایک معصومانہ کلام سے انہیں دعا کی تحریک پیدا ہوئی پس قرائن اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ قرآن کریم کی بات ہی صحیح ہے۔ بہرحال اس بات کو اختلاف قرار دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص صبح کی بات بیان کرے اور دوسرا دس بجے کی اور ان

دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر کوئی شخص کہنا شروع کر دے کہ ان میں بڑا اختلاف ہے۔ ہر شخص جو حقیقت کو سمجھتا ہوگا وہ فوراً کہے گا کہ ان میں اختلاف کون سا ہے۔ ایک صبح کی بات ہے اور دوسری دس بجے کی ہے۔ اختلاف تب ہوتا جب ایک ہی وقت کی بات میں متضاد بیان ہوتا۔ بائبل کے یہ الفاظ کہ اے زکریا تیری دعا سنی گئی بتاتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کو قبولیت دعا سے شروع کرتی ہے لیکن قرآن کریم جو واقعہ بیان کرتا ہے وہ دعا کرنے سے پہلے کا ہے۔ پس بائیبل کی اس خاموشی کے صرف یہ معنے ہیں کہ قرآن کریم میں ابتداء سے واقعہ بیان کیا گیا ہے اور بائبل نے اس دعا کے محرک کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے اس کے بیان کے نامکمل ہونے کا تو پتہ چلتا ہے لیکن قرآن کریم کی غلطی ظاہر نہیں ہوتی۔

(۲) بائبل کہتی ہے کہ ایک فرشتہ نے یہ بشارت دی مگر قرآن کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے کہا کہ اے زکریا تیرے ہاں بیٹا ہوگا۔ بظاہر یہ اختلاف ہے لیکن حقیقت میں نہیں۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کا کلام اکثر فرشتے لاتے ہیں اور فرشتے اپنے پاس سے غیب کی باتیں نہیں کر سکتے ورنہ ان کو خدا ماننا پڑے گا۔ پس اگر فرشتے نے کہا تب بھی وہ خدا کی طرف سے کہا اس لئے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ نے یوں کہا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے یوں کہا۔ اور چونکہ اس جگہ پر یہ الفاظ ہیں کہ ''تیری دعا سنی گئی'' اس لئے اس کے معنے یہ ہیں کہ فرشتے کو خدا نے بتایا تھا۔ کہ میں نے زکریا کی دعا سن لی ہے۔ پس فرشتہ کا قول خدا تعالیٰ کی نمائندگی میں تھا۔ اور اس کا ذکر دونوں طرح کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح بھی کہ فرشتے نے کہا اور اس طرح بھی کہ خدا نے کہا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے خواب میں اگر کوئی شخص آم دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا۔ اب اگر کوئی شخص ایسی خواب دیکھے اور اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے اور وہ اس کی پیدائش پر کہے کہ خدا نے مجھے پہلے سے بتا دیا تھا کہ میرے ہاں لڑکا ہوگا تو کیا کوئی شخص کہہ سکتا کہ تم جھوٹ بولتے ہو تمہیں خدا نے کب کہا تھا تم نے تو آم دیکھا تھا؟ اگر کوئی شخص ایسا اعتراض کرے تو سب لوگ اسے پاگل کہیں گے کیونکہ خواہ آم کی شکل میں اسے بتایا گیا ہو بہرحال بتایا تو اسے خدا نے ہی تھا۔ اسی طرح تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ فرشتے نے یوں کہا اور تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ خدا نے یوں کہا۔ آخر فرشتہ اپنے پاس سے تو کچھ نہیں کہتا وہ تو جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے ہی کہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے ایک دوسری جگہ کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہی حقیقت ہے۔ کیونکہ سورۂ آل عمران میں اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى (آل عمران: ۴۰) یعنی حضرت زکریا علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ اتنے میں ملائکہ ظاہر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ خدا تمہیں یحییٰ کی پیدائش کی بشارت دیتا ہے دیکھ لو

یہاں خدا تعالیٰ کے بولنے کا ذکر نہیں بلکہ ملائکہ کے بولنے کا ذکر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ سورۂ مریم میں خدا تعالیٰ کے بولنے کا جو ذکر ہے۔ اس سے مراد بھی براہ راست بولنا نہیں بلکہ ملائکہ یا ان کے سردار جبریل کی معرفت بولنا ہے۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں لکھا ہے پس یہ اختلاف نہیں ایک مزید لطیف تشریح ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ فرشتہ جب کلام کرتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ ہی کا کلام ہوتا ہے۔ اس کے متعلق یہ بھی کہہ سکتے ہیں خدا نے یوں کہا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرشتہ نے یوں کہا۔ وہیری اس جگہ لکھتا ہے کہ مسلمان دماغ بھی کیسا عجیب ہے بائبل میں لکھا ہے کہ جبریل ظاہر ہوا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ فرشتوں نے اسے پکارا۔ اور پھر اسے ایک معمولی اختلاف سمجھتے ہیں (تفسیر وہیری)۔ گویا وہیری نے ہنسی اڑائی ہے کہ مسلمان بھی عجیب انسان ہیں اتنا بڑا اختلاف قرآن اور انجیل میں پایا جاتا ہے اور پھر اسے معمولی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا بھی ٹھیک ہے۔ کہ فرشتوں نے یوں کہا اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ فرشتہ نے یوں کہا۔ کیونکہ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جتنے اہم کلام ہوتے ہیں۔ ان کے نزول کے وقت کئی کئی فرشتے ساتھ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا۔ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَ اَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔ (الجن: ۲۷ تا ۲۹) یعنی اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اور وہ سوائے اپنے رسولوں کے اور کسی کو اپنے غیب سے کثرت کے ساتھ اطلاع نہیں دیتا اور پھر جو غیب نازل ہوتا ہے اس کے ساتھ بہت سے فرشتے بھی نازل ہوتے ہیں تا کہ وہ اس کلام کی نگرانی کریں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنا کوئی اہم کلام کسی فرشتہ کے ذریعہ بھجواتا ہے تو اس کے ساتھ اَور بھی بہت سے سپاہی فرشتے متعین ہوتے ہیں۔ پس فرشتہ کہو تب بھی درست ہے کیونکہ بولتے وقت ایک ہی بولے گا اور اگر فرشتے کہو تب بھی درست ہے کیونکہ کلام الٰہی کے ساتھ کئی کئی فرشتے آتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اسے ملائکہ نے پکارا تو اس کے معنے یہ تھے کہ چونکہ یہ ایک اہم کلام تھا اس لئے ہم نے بہت سے فرشتوں کے ساتھ اپنا کلام بھجوایا۔ اور اگر انجیل نے اسے ایک فرشتہ قرار دیا ہے تب بھی درست ہے کیونکہ جب بولے گا تو ایک ہی بولے گا۔ مگر اس کا بولنا دوسروں کی نمائندگی میں ہوگا۔ جیسے گورنر یا وزراء سے ملنے کے لئے جب کوئی وفد جاتا ہے تو اخباروں والے یہی لکھتے ہیں کہ وفد نے یہ بات کہی۔ حالانکہ وفد نہیں بولتا بلکہ ان کی طرف سے کوئی ایک شخص بولتا ہے۔ آئیں گے سات آٹھ لیکن بولے گا ایک۔ اگر سات آٹھ یکدم بولنا شروع کر دیں تو گورنر ان سب کو نکال دے کہ تم کیسے بدتہذیب ہو۔ اسی طرح فرشتہ کہو تب بھی درست ہے اور فرشتے کہو تب بھی درست ہے۔ تعجب ہے کہ

اتنی معمولی بات جس کے یوروپین لوگ رات دن عادی ہیں اور وہ وفود کے طریق ملاقات کو اچھی طرح جانتے ہیں وہی اگر قرآن کریم میں آجائے تو اس پر ہنسی اڑانے لگ جاتے ہیں۔کسی شاعر نے کہا ہے ع

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

یہ گناہ وہ ہے جو تمہارے شہر میں بھی ہوتا ہے۔اسی طرح ہم کہتے ہیں یہ طریق وہ ہے جو رات دن تمہارے ہاں جاری ہے اس پر اعتراض کیسا؟

پھر ہم بائبل کو دیکھتے ہیں تو اس میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔چنانچہ پیدائش باب ۱۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق آتا ہے

''پھر خداوند ممرے کے بلوطوں میں اسے نظر آیا اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے دروازہ پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کی۔اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اس کے سامنے کھڑے ہیں (یعنی پہلے خدا نظر آیا اور پھر دیکھا تو تین مرد سامنے کھڑے تھے) وہ ان کو دیکھ کر خیمہ کے دروازہ سے ان سے ملنے کو دوڑا اور زمین تک جھکا۔اور کہنے لگا کہ اے میرے خداوند اگر مجھے پر آپ نے کرم کی نظر کی ہے تو اپنے خادم کے پاس سے چلے نہ جائیں بلکہ تھوڑا سا پانی لایا جائے اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اس درخت کے نیچے آرام کریں۔میں کچھ روٹی لاتا ہوں آپ تازہ دم ہو جائیں تب آگے بڑھیں کیونکہ آپ اسی لئے اپنے خادم کے ہاں آئے ہیں۔انہوں نے کہا جیسا تو نے کہا ہے ویسا ہی کر۔اور ابراہام ڈیرے میں سارہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ تین پیمانہ باریک آٹا جلد لے اور اسے گوندھ کر پھلکے بنا اور ابرہام گلہ کی طرف دوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لا کر ایک جوان کو دیا اور اس نے جلدی جلدی اسے تیار کیا۔پھر اس نے مکھن اور دودھ اور اس بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کر ان کے سامنے رکھا اور آپ ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انہوں نے کھایا پھر انہوں نے اس سے پوچھا کہ تیری بیوی سارہ کہاں ہے۔اس نے کہا وہ ڈیرے میں ہے۔تب اس نے کہا میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤں گا۔اور دیکھ تیری بیوی سارہ کے بیٹا ہوگا (دیکھو یہاں پہلے خدا نظر آتا ہے۔پھر تین مرد دکھائی دیتے ہیں اور وہ باتیں شروع کر دیتے ہیں مگر یکدم ان کی گفتگو میں ہی پھر یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ ''میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤں گا'') اس کے پیچھے ڈیرے کا دروازہ تھا سارہ وہاں سے سن رہی تھی اور ابرہام اور سارہ ضعیف اور بڑی عمر کے تھے۔اور

سارہ کی وہ حالت نہیں رہی تھی جو عورتوں کی ہوتی ہے۔ تب سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے۔ پھر خداوند نے ابرہام سے کہا (اب پھر میں کی بجائے خداوند ہو گیا ہے) کہ سارہ کیوں یہ کہہ کر ہنسی کہ کیا میرے جو ایسی بڑھیا ہو گئی ہوں واقعی بیٹا ہوگا۔ کیا خداوند کے نزدیک کوئی بات مشکل ہے۔ موسم بہار میں معین وقت پر میں تیرے پاس پھر آؤں گا۔ اور سارہ کے بیٹا ہوگا۔ تب سارہ انکار کر گئی کہ میں نہیں ہنسی کیونکہ وہ ڈرتی تھی پر اس نے کہا نہیں تو ضرور ہنسی تھی۔'' (پیدائش باب ۱۸ آیت ۱ تا ۱۵)

اس حوالہ کو دیکھو۔ پہلے یہ کہا گیا ہے کہ ابراہیمؑ کو خدا نظر آیا۔ پھر خدا کی بجائے تین مرد کہا گیا اور انہوں نے گفتگو شروع کر دی اور کھانا بھی کھایا۔ اس کے بعد پھر تینوں غائب ہو گئے۔ اور ذکر اس طرح شروع کیا گیا کہ ''اس نے کہا میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤں گا''۔ یعنی پھر تین کا ذکر ایک شخص کے طور پر کرنا شروع کر دیا گیا اور ان کے لئے ضمیر ''اس'' اور ''میں'' کی استعمال کی گئی۔ مگر آگے چل کہہ دیا گیا کہ ''خداوند نے ابرہام سے کہا کہ سارہ کیوں یہ کہہ کر ہنسی کہ کیا میرے جو ایسی بڑھیا ہو گئی ہوں واقعی بیٹا ہوگا''۔ پس اس میں تو عیسائیوں کے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن اگر قرآن نے ایک جگہ یہ کہہ دیا کہ ملائکہ نے زکریا کو خبر دی تھی اور دوسری جگہ یہ کہہ دیا کہ خدا نے اسے خبر دی تھی تو اس میں ان کے نزدیک بڑے تعجب کی بات ہے۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ اس میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ تعجب کی بات ہے۔ انجیل میں بے شک ایک فرشتے کا ذکر آتا ہے مگر جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اہم کلام کے ساتھ کئی فرشتے نازل ہوا کرتے ہیں گو کلام ایک ہی فرشتہ کرتا ہے۔ پس ہم بائبل کے بیان کو بھی غلط نہیں کہتے۔ اس نے بھی ٹھیک کہا اور قرآن نے جو کچھ کہا وہ بھی ٹھیک کہا۔

(۳) انجیل میں لکھا ہے کہ وہ مسیح کے لئے بطور ارہاص ہوگا مگر قرآن میں اس کا ذکر نہیں۔ یہ بھی ایک اختلاف ہے جو عیسائیوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اس کا یہاں ذکر نہیں مگر سورۂ آل عمران میں لکھا ہے مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ (آل عمران: ۴۰) پس اختلاف کوئی نہ رہا۔ انجیل میں لکھا ہے کہ وہ ایلیاہ کی روح اور اس کی قوت میں مسیح کے آگے آگے چلے گا (لوقا باب ۱ آیت ۱۷) اور قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ اپنی آمد سے ایک پیشگوئی کو پورا کرے گا جو صحف سابقہ میں پائی جاتی ہے اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ سب واقعہ ایک ہی جگہ بیان ہو۔ بائبل میں بھی کوئی ٹکڑہ کسی جگہ پایا جاتا ہے اور کوئی کسی جگہ۔

(۴) قرآن میں لکھا ہے کہ زکریا کو تین دن خاموش رہنے کا نشان دیا گیا (خواہ خود خاموش رہنے کا یا خدا تعالیٰ

کی طرف سے زبان بند ہو جانے کا) مگر بائبل کہتی ہے کہ ان کی زبان بطور سزا بند رہی اور یحییٰ ؑ کی پیدائش کے بعد ان کے ختنہ کے دن تک وہ گونگے رہے۔ آخر ختنہ کے دن جب انہوں نے یہ لکھ کر دیا کہ اس کا نام یحییٰ رکھو تب ان کی زبان کھلی۔ (لوقا باب ۱ آیت ۲۰، ۵۷)

ان دونوں میں اختلاف تو ہے لیکن خود سوچ لو کہ عقل اور فطرت کسے سچا بتاتی ہے۔ ایک نبی یا بائبل کے بیان کے مطابق کاہن پر (جو ایسا ہی مقام رکھتا ہے جیسا ہمارے ہاں محدث کا مقام ہوتا ہے) خدا تعالیٰ ابراہیمی انعام نازل کرتا ہے یعنی جس طرح ابراہیم ؑ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑھاپے میں بیٹے کا وعدہ کیا تھا اسی طرح زکریا ؑ کے ساتھ اس نے بیٹے کا وعدہ کیا ایسے بیٹے کا جو بقول مسیح ؑ سب نبیوں کا موعود تھا اور اس نے ضرور پیدا ہونا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر مسیح ؑ پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن محض زکریا کے اس قول پر کہ میں بھی بوڑھا ہوں اور میری بیوی بھی بوڑھی ہے بچہ کہاں سے ہوگا اس پر یہ عذاب نازل کیا جاتا ہے کہ اسے دس ماہ کے لئے گونگا کر دیا جاتا ہے حالانکہ بائبل سے ثابت ہے کہ یہی فعل سرّی زوجہ ابراہیم ؑ نے بھی کیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

''سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہو سکتی ہے حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے۔'' (پیدائش باب ۱۸ آیت ۱۲)

لیکن اس پر کوئی عذاب نازل نہیں ہوا۔ اور خدا تعالیٰ نے اس کو ایک دن کے لئے بھی گونگا نہیں کیا۔ حالانکہ اگر یہ فعل جرم تھا تو اس جرم کے بدلہ میں یہی عذاب سارہ پر بھی نازل ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس پر تو کوئی عذاب نازل نہیں ہوا۔ اور زکریاؑ نے یہی بات کہی تو اسے دس ماہ کے لئے گونگا کر دیا گیا۔

پھر بائبل سے ہی ثابت ہے کہ زکریا کا یہ قول انکار کے طور پر نہ تھا بلکہ محض اظہار تعجب کے طور پر تھا یعنی یہ کتنی بڑی عظمت اور شان کا نشان ہے۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لوقا میں فرشتہ کا یہ قول درج ہے کہ

''اے زکریا مت ڈر کہ تیری دعا سنی گئی۔'' (لوقا باب ۱ آیت ۱۳)

اب سوال یہ ہے کہ کیا زکریا اس دن بوڑھے ہوئے تھے یا زکریا کی بیوی اس دن بوڑھی ہوئی تھیں وہ لازماً چھ مہینے یا سال دو سال پہلے بوڑھے ہو چکے تھے۔ اور اگر یہ بات انہیں قطعی طور پر ناممکن نظر آتی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہی نہیں ہو سکتا تو وہ اس قسم کی دعا کرتے ہی کیوں؟ ان کا دعا کرنا اور بائبل میں فرشتے کا یہ قول درج ہونا کہ ''اے زکریا مت ڈر کہ تیری دعا سنی گئی'' بتاتا ہے کہ زکریا کا اس بات پر ایمان تھا کہ خدا ایسا کر سکتا ہے۔ زکریا جانتا تھا کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ زکریا جانتا تھا کہ میری بیوی بھی بوڑھی ہو چکی ہے۔ مگر وہ یہ بھی یقین رکھتا تھا

کہ خدا تعالیٰ بڑی قدرتوں کا مالک ہے۔اس لئے وہ اس سے دعائیں کرتا رہتا تھا۔پس جب اس کی دعا کی قبولیت کی اطلاع اسے ملی۔تو وہ حیرت واستعجاب کا شکار تو ہوسکتا تھا کہ خدا تعالیٰ ایسا قادر ہے کہ ایسی غیر معمولی دعا بھی سن سکتا ہے مگر وہ منکر اور متردد نہیں ہوسکتا تھا۔اور سزا منکر اور متردد کو ملا کرتی ہے۔حیرت اور استعجاب ظاہر کرنے والے کو انعام ملا کرتا ہے۔پس بائبل کی اپنی شہادت قرآنی معنوں کی تائید کرتی ہے کہ زکریا نشان کا طالب ضرور ہوا مگر انکار کا مرتکب نہیں ہوا۔پس بائبل کا یہ بیان کہ اسے سزا ملی اور وہ دس ماہ تک گونگا رہا غلط ہے اور قرآن کریم کا یہ بیان ہی درست ہے کہ صرف تین دن تک اس نے کلام نہ کیا۔اور یہ خاموشی ذکر الٰہی کے لئے تھی نہ کہ بطور سزا کے۔جیسا کہ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ (آل عمران:۴۲) یعنی تیرے لئے حکم یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن تک کلام نہ کرے سوائے اشارہ کے اور بجائے لوگوں سے باتیں کرنے کے ان ایام میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے رہو اور صبح اور شام اس کی تسبیح کرو۔چونکہ تین دن انہوں نے ذکر الٰہی کرنا تھا۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ ان دنوں میں اور باتیں نہ کرو۔ورنہ اسے کوئی بیماری نہیں تھی۔چنانچہ قرآن کریم نے اسی الزام کو دور کرنے کے لئے جو انجیل نے حضرت زکریا پر لگایا ہے کہ وہ گونگے ہو گئے تھے فرمایا اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا۔تیرا نشان یہ ہے کہ تو تین دن رات کلام نہیں کرے گا مگر ہوگا بے عیب اور تندرست (سَوِيًّا) کوئی بیماری تجھے نہیں ہوگی۔اب دیکھ لو قرآنی بات کتنی سچی نظر آتی ہے کہ خدا نے جب حضرت زکریا کی دعا قبول کی۔تو انہوں نے کہا خدایا اب مجھے بھی شکریہ کا موقع دیجئے۔خدا نے کہا تین دن مسجد میں اعتکاف بیٹھو اور ذکر الٰہی میں مشغول رہو یہ تمہاری طرف سے ہمارے شکریہ کا ایک نشان ہوگا لیکن بائبل کا بیان عقلاً بھی غلط ہے اور نقلاً یعنی دلیل کے لحاظ سے بھی باطل ہے۔

قرآن کریم اور بائبل میں یہ ایک نمایاں فرق ہے۔کہ بائبل ہمیشہ انبیاء پر گناہ کا الزام لگانے پر دلیر ہوتی ہے۔مگر ایسے ہر الزام کی قرآن کریم تردید کرتا ہے۔مثلاً بائبل میں لکھا ہے کہ ہارون نے شرک کیا (خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۶) قرآن کہتا ہے کہ اس نے شرک نہیں کیا (طٰہٰ:۹۱)۔بائبل کہتی ہے کہ زکریا نے خدا کی قدرت کا انکار کیا تو اسے سزا ملی (لوقا باب ۱ آیت ۲۰ و ۲۱) قرآن کہتا ہے کہ اس نے خدائی وعدہ کو سن کر چاہا کہ اسے شکریہ کا کوئی کام بتایا جائے چنانچہ خدا تعالیٰ نے تین دن چپ کا روزہ رکھنے اور ذکر الٰہی کی کثرت کا ارشاد فرمایا اور اس عرصہ میں ان پر نہ کوئی عذاب آیا نہ بیماری ہوئی۔

اسی طرح بائبل نے حضرت سلیمانؑ کو مجرم اور عیاش اور بے دین قرار دیا ہے (۱۔سلاطین باب ۱۱ آیت ۱ تا ۶)

لیکن قرآن کریم نے ان کو راستباز اور مومن اور نیک قرار دیا ہے (ص:۳۱)۔ یہ کتنا بڑا ثبوت ہے اس بات کا کہ قرآنی تاریخ سچی ہے اور بائبل کی روایات مخدوش۔ اگر یہ لوگ جن کا ذکر ہے خدا کے برگزیدہ تھے تو پھر ان سے ان افعال کا ارتکاب نہیں ہوسکتا۔ اور اگر برگزیدہ نہ تھے تو پھر نبیوں میں ان کا ذکر کرنا حماقت ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہی باتیں جو بائبل میں نبیوں کی نسبت لکھی ہیں عوام الناس یا پادریوں کے ماں باپ کی نسبت کہی جائیں تو وہ لڑنے مرنے پر تیار ہوجائیں گے مگر دلیری سے ان باتوں کو نبیوں کی نسبت تسلیم کر لیتے ہیں۔

(۵) بائبل کہتی ہے کہ جب مریم حاملہ ہوئیں اور یوحنا کی ماں کے پاس گئیں تو یوحنا کی ماں روح القدس سے بھر گئیں اور بولیں کہ

''یہ کیونکر ہوا کہ میرے خداوند کی ماں مجھ پاس آئی کہ دیکھ تیرے سلام کی آواز جونہی میرے کان تک پہنچی لڑکا میرے پیٹ میں خوشی سے اچھل پڑا۔'' (لوقا باب ۱ آیت ۴۳ و ۴۴)

لیکن قرآن کہتا ہے کہ اٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا (مریم:۱۳) اور یہ کہ سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا (آل عمران:۴۰) یعنی اس کو خدا نے روحانی طاقت اور روحانی حکمت اور روحانی بادشاہی بچپن سے ہی عطا فرمائی تھی۔ اور یہ کہ وہ سردار تھا اور ہر قسم کی بدیوں سے پاک اور منزہ تھا۔ گویا عیسائیوں کے نزدیک اختلاف یہ ہے کہ بائبل تو یحییٰ کو مسیحؑ کا غلام قرار دیتی ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ یحییٰ سید تھا اور بچپن سے ہی اسے سرداری عطا کی گئی تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انجیل کے دوسرے حوالوں سے ظاہر ہے کہ لوقا کا بیان محض زیب داستان کے لئے ہے ورنہ حقیقت سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اگر یوحنا مسیحؑ کا خادم تھا جیسا کہ لوقا نے اس واقعہ میں لکھا ہے تو کیا مصیبت پڑی تھی کہ مسیحؑ یوحنا کا شاگرد ہوتا۔ اناجیل کے مصنفوں نے اپنے آقا کو عزت دینے کے لئے اس موقعہ پر سخت ظلم کئے ہیں۔ مثلاً متی کہتا ہے کہ مسیحؑ یوحنا سے بپتسمہ پانے کے لئے آیا اور اسے کہا کہ مجھے اپنا مرید بناؤ تو یوحنا نے کہا کہ میں تجھ سے بپتسمہ پانے کا محتاج ہوں (متی باب ۳ آیت ۱۴) یعنی حضور میرے استاد ہیں اور میں تو آپ کا شاگرد ہوں میں آپ کو کس طرح بپتسمہ دے سکتا ہوں۔ پھر یہ بات مسیحؑ کے منہ میں بھی ڈالی گئی ہے کہ ''اب ہونے دے کیونکہ ہمیں مناسب ہے کہ یوں ہی سب راستبازی پوری کریں'' (متی بات ۳ آیت ۱۵) یعنی ہے تو یہ ٹھیک کہ میں بڑا ہوں اور تو چھوٹا ہے لیکن چونکہ نبی خبر دے چکے ہیں اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ جواب کتنا غیر معقول ہے اگر مسیح یوحنا کی شاگردی سے بالا تھا تو نبیوں نے یہ پیشگوئی کیوں کی اور خدا تعالیٰ نے ایسا مقدر کیوں کیا؟ یہ عجیب بات ہے کہ مسیح جاتا ہے یوحنا کی بیعت کرنے اور یوحنا آگے سے یہ کہتا ہے کہ میں کس کی بیعت لوں میں تو خود چھوٹا

ہوں اور تو بڑا ہے اور مسیح کہتا ہے پہلے نبیوں سے غلطی ہو گئی ہے۔ ہے تو یہی درست کہ میں بڑا ہوں لیکن چونکہ وہ ایک بات کہہ چکے ہیں اس لئے اب اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ ایسی ہی بات ہے جیسے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کی رات خدا تعالیٰ کے پاس گئے اور باتیں ہونے لگیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ حضور اتنی دور سے میں چل کر آیا ہوں اب دیدار تو کروا دیجئے۔ اس پر اللہ میاں نے پردہ اٹھایا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دیکھا کہ حضرت علیؓ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے کہا حضور نے اتنی تکلیف دے کر بلایا۔ یہ دیدار تو نیچے بھی روزانہ ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے کہا اس میں بھی راز ہوتے ہیں۔ اسی قسم کا راز یوحنا والے واقعہ میں ہے کہ مسیح یوحنا کے پاس ان کے مرید بننے کے لئے جاتے ہیں اور یوحنا کہتے ہیں توبہ توبہ بھلا مجھ میں یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ میں آپ کی بیعت لوں اور حضرت مسیح کہتے ہیں کہ ہوں تو میں ہی سردار۔ لیکن چونکہ نبیوں کے منہ سے ایک بات نکل چکی ہے اس لئے اس کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ کیا لغویت ہے۔ مرقس نے بھی اسی رنگ کو اختیار کیا ہے گو اوپر والی گفتگو اس نے بیان نہیں کی۔ لوقا نے بھی اس گفتگو کا تو ذکر نہیں کیا۔ لیکن یوحنا کی شاگردی اور ماتحتی کا اوپر کے واقعہ میں اظہار کیا ہے۔ یوحنا نے مسیح کے یوحنا سے بپتسمہ پانے کا ذکر چھوڑ دیا ہے مگر ان باتوں سے کیا بنتا ہے۔ تین اناجیل کہہ رہی ہیں کہ یوحنا نے مسیح کو بپتسمہ دیا جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ استاد بنا۔ بے شک مسیح اس سے بڑھ گیا مگر بڑھنے کے وقت بڑھا۔ اس سے پہلے تو وہ بہرحال یوحنا کا شاگرد تھا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے دنیا میں کئی شاگرد استاد سے بڑھ جاتے ہیں۔ استاد پرائمری پاس ہوتا ہے لیکن اس کا شاگرد ایم اے پاس کر لیتا ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ جب وہ پرائمری میں پڑھ رہا ہو تو پرائمری کا استاد اسے پڑھانے سے انکار کر دے اور کہے کہ تو بڑا ہے اور میں چھوٹا۔ بے شک جب وہ ایم اے ہو جائے گا تو استاد سے آگے نکل جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے وہ اپنے استاد کی شاگردی سے انکار نہیں کر سکتا۔ پس یہ کہنا کہ یوحنا نے پیٹ سے اس کی بڑائی کا اقرار کیا ایک عبث فعل ہے۔ اگر ایسا تھا تو اسے بپتسمہ پر مقرر ہی کیوں کیا گیا؟

قرآن نے جو بات بیان کی ہے کہ یوحنا مسیح کا مصدق تھا۔ وہیری اپنی کتاب کی جلد ۲ ص ۱۷ میں اس پر سخت برافروختہ ہوا ہے کہ ایک ماتحت اور چھوٹے درجہ کے نبی کو مصدق قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ اس کی حماقت ہے جو کچھ قرآن نے کہا ہے وہی انجیل نے بھی کہا ہے اور بتایا ہے کہ وہ مسیح کے لئے بطور ارہاص تھا۔

(۶) قرآن کہتا ہے کہ مریم کے پاس رزق آتا تھا بائبل میں اس کا ذکر نہیں۔ اس اختلاف سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ لوگ بچوں کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خصوصاً ان بچوں کو جو نذر کے ہوں۔ اور لوگ

ان کی خدمت کرتے ہیں۔ جو لوگ صحیح طور پر ان کی قدر سمجھتے ہیں وہ ان کا اداب اور احترام کرتے ہیں اور جو نہیں سمجھتے وہ انہیں صدقہ وغیرہ دے دیتے ہیں۔ اسی جذبہ کے ماتحت حضرت مریم کے لئے بھی لوگ مختلف تحائف لاتے ہوں گے۔ چنانچہ میور اور آرنلڈ نے اپنی کتب میں مسیحیوں کی روایات سے اس کے مشابہ باتیں نقل کی ہیں (دیکھو وہیری جلد ۲ ص ۱۶) اور انہوں نے اسے معجزانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ مگر اس کے یہ معنے بھی نہیں کہ ہم تفاسیر کے قصوں کو صحیح سمجھیں۔ مثلاً تفاسیر والے لکھتے ہیں کہ حضرت زکریا نے مریم کے پاس کھانا دیکھا تو انہیں شبہ ہوا کہ کوئی بدمعاش آتا ہے اور وہ اس قسم کی چیزیں پہنچا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ مریم کو کمرہ میں بند کر دیتے تھے اور پھر سات دروازے آگے پیچھے بند کر دیتے تھے مگر رزق ان کے پاس پھر بھی آ جاتا تھا (الرازی و المیزان زیر آیت کلما دخل علیہ زکریا)۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مفسرین کو سات دروازوں سے کوئی خاص دلچسپی ہے کیونکہ یوسفؑ کے واقعہ میں بھی وہ لکھتے ہیں کہ زلیخا نے سات دروازے بند کر کے یوسف کو ورغلانے کی کوشش کی۔ پس سات دروازوں سے مفسرین کو کوئی خاص لگاؤ ہے۔ مریم کو بھی اگر روٹی آتی تھی تو سات بند دروازوں سے اور زلیخا اگر یوسف کو چھیڑتی تھی تو سات دروازے بند کر کے (الرازی زیر آیت وراودتہ التی۔۔۔)۔ قرآن نے صرف اتنا کہا ہے کہ حضرت زکریا نے ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں دیکھیں تو انہوں نے پوچھا کہ یہ چیزیں تمہیں کس نے دی ہیں۔ حضرت مریم نے جواب دیا کہ اللہ نے۔ ایک معصوم بچی کے یہ الفاظ ان کے لئے دعا کا محرک بن گئے اور انہوں نے کہا کہ خدایا مجھے بھی ایک بچہ عطا فرما جو اپنے اندر روحانی اوصاف اور کمال رکھتا ہو۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہودی روایتوں سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ میور اور آرنلڈ نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ

(زکریا نے) کہا اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے

قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝۹ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ

کی انتہائی حد کو پہنچ چکا ہوں۔ (الہام لانے والے فرشتہ نے) کہا کہ (جس طرح تو کہتا ہے واقعہ) اسی طرح (ہے)

هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝۱۰

(مگر) تیرا رب کہتا ہے کہ یہ (بات) مجھ پر آسان ہے اور (دیکھ کہ) میں تجھے اس سے پہلے پیدا کر چکا ہوں حالانکہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔

حلّ لُغات۔ عتی عِتِیٌّ عَتَی سے بنا ہے اور عَتَا کے معنے حد سے نکل جانے کے ہیں عَاتٍ اسم فاعل ہے۔ عِتِیٌّ بھی عَاتٍ کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ آیت مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا میں عِتِیٌّ سے مراد بڑھاپے کی اس حالت کے ہیں جس کا کوئی مداوا اور علاج نہیں ہوسکتا۔

تفسیر۔ حضرت زکریا کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملی کہ ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا تو انہوں نے کہا اے میرے رب اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ میرے ہاں کس طرح بیٹا پیدا ہوگا وَ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا اور میں بڑھاپے کی انتہاء کو پہنچ چکا ہوں۔

غلام ہونے میں دو باتیں پائی جاتی تھیں۔ اول یہ کہ بیٹا ہو اور دوسرے یہ کہ کہولت کی عمر تک پہنچنے والا ہو۔ اور پھر جب کسی شخص کو بیٹے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کے یہ معنے بھی ہوتے ہیں کہ تم بھی اس کی زندگی کا اچھا حال دیکھو گے۔ حضرت زکریا اتنے عظیم الشان انعام کے وعدہ پر استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اول تو میں بوڑھا اور میری بیوی بانجھ اور پھر میں حد درجہ کا بوڑھا لیکن مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ میرے ہاں بیٹا ہوگا اور اس کی پیدائش کے بھی کچھ عرصہ بعد تک میں زندہ رہوں گا اور اس کی تربیت کرسکوں گا۔ گویا یہ ذوالعجائب الہام ہے۔ قَالَ كَذٰلِكَ اس نے کہا اسی طرح ہوگا قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔ تیرا رب کہتا ہے کہ یہ بات مجھ پر آسان ہے۔

ہمارے مفسرین نے اس جگہ عیسائیوں سے ڈر کر یہ لکھا ہے کہ قَالَ كَذٰلِكَ میں فرشتہ کے قول کا ذکر ہے اور قَالَ رَبُّكَ میں اللہ تعالیٰ کی بات بیان کی گئی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں کثرت سے ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں کہ حاضر کا صیغہ استعمال ہو رہا ہوتا ہے مگر وہ غائب میں بدل جاتا ہے اور غائب کا صیغہ استعمال ہو رہا ہوتا ہے اور پھر وہ حاضر میں بدل جاتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ قَالَ كَذٰلِكَ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ یہ فرشتہ کا قول ہے اور اگلے حصہ کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرشتہ اگر کچھ کہتا ہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوتا ہے کیونکہ فرشتہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ خدا تعالیٰ کا کلام دوسرے تک پہنچاتا ہے۔ پس اس امتیاز کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر فرشتہ نے یہ کہا تھا کہ اسی طرح واقعہ ہوگا تب بھی اس نے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی

کہا تھا اپنی طرف سے نہیں کہا۔ پس یہ بات بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی منسوب ہوگی۔ درحقیقت قَالَ كَذٰلِكَ اور قَالَ رَبُّكَ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ دونوں باتوں کو تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھو جہاں فرشتہ کلام کرتا ہے وہاں یہ سمجھو کہ اس کلام کا منبع خدا تھا۔ اور جہاں خود کلام کرے وہاں یہ سمجھو کہ اب اس نے براہ راست کلام کیا ہے۔

وَ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا۔ اور اس سے پہلے میں نے تجھے پیدا کیا تھا اور تو کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہاں جسمانی پیدائش مراد نہیں۔ کیونکہ جسمانی پیدائش زکریا سے خاص طور پر تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اگر پیدائش جسمانی کا ذکر ہوتا تو خَلَقْتُكَ کی بجائے یہ کہنا چاہیے تھا۔ کہ ساری دنیا کو میں نے پیدا کیا ہے حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر یہاں حضرت زکریا کو خاص طور پر مخاطب کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جسمانی پیدائش کا ذکر نہیں بلکہ درحقیقت اس طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا میں ذکر آتا ہے کہ ہم تجھے ایک غیر معمولی بیٹا عطا فرمائیں گے جو بعض باتوں میں بے مثل ہوگا۔ اول بیٹا ہونا اور پھر بعد تک زندہ رہنے والا بیٹا ہونا اور پھر غیر معمولی شان کا بیٹا ہونا یہ ساری باتیں اپنے اندر حیرت انگیز رنگ رکھتی تھیں۔ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ میں اللہ تعالیٰ نے پہلی دو باتوں کا جواب دے دیا تھا۔ اب تیسری بات کا جواب دیتا ہے کہ تمہاری بھی پہلے کوئی حیثیت نہیں تھی مگر پھر ہم نے تمہیں علوم بخش دئے۔ اسی طرح ہم میں یہ بھی طاقت ہے کہ ہم تیرے بیٹے کو بھی علوم عطا فرما دیں۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ

(زکریا نے) کہا اے میرے رب! میرے لئے کوئی حکم بخش۔ فرمایا تیرے لئے یہ حکم ہے کہ تو لوگوں سے تین

النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ﴿۱۱﴾

راتیں متواتر کلام نہیں کرے گا (یعنی کلام نہ کرنا)

تفسیر۔ آیت کے معنے قرآن کریم میں کئی مقامات پر حکم کے بھی آئے ہیں۔ آیات قرآنیہ کو بھی اسی وجہ سے آیات کہا جاتا ہے کہ ان میں احکام الٰہیہ کا بیان ہوتا ہے پس رَبِّ اجْعَلْ لِّيْۤ اٰيَةً کے یہ معنے ہیں کہ خدایا مجھے کوئی حکم دے جس کی میں تعمیل کروں۔ یعنی تو نے جو مجھ پر یہ احسان فرمایا ہے میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ اب تو

مجھے کوئی ایسا حکم دے جو تیرے شکر کی ایک ظاہری علامت ہو اور جس کو پورا کر کے میرا دل خوش ہو جائے کہ میں نے رب کا حکم پورا کر دیا ہے۔

بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں آئندہ کی خبروں کے لئے نشان مقرر ہوتے تھے جن میں سے بعض نشان تو آسمانی ہوتے تھے اور بعض میں صرف عبادت کا حکم ملتا تھا۔ چنانچہ پیدائش باب ۹ میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے حضرت نوح اور ان کی اولاد سے آئندہ سب دنیا پر طوفان نہ لانے کا عہد کیا اور اس کے لئے قوس قزح کو نشان مقرر کیا۔ بائبل کے الفاظ یہ ہیں کہ۔

''خدا نے نوح اور اس کے بیٹوں سے کہا کہ دیکھو میں خود تم سے اور تمہارے بعد تمہاری نسل سے اور سب جانداروں سے جو تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا پرندے کیا چوپائے۔ کیا زمین کے جانور یعنی زمین کے ان سب جانوروں کے بارے میں جو کشتی سے اترے عہد کرتا ہوں۔ میں اس عہد کو تمہارے ساتھ قائم رکھوں گا کہ سب جان دار طوفان کے پانی سے پھر ہلاک نہ ہوں گے اور نہ کبھی زمین کو تباہ کرنے کے لئے پھر طوفان آئے گا۔ اور خدا نے کہا کہ جو عہد میں اپنے اور تمہارے درمیان اور سب جانداروں کے درمیان جو تمہارے ساتھ ہیں پشت در پشت ہمیشہ کے لئے کرتا ہوں اس کا نشان یہ ہے کہ میں اپنی کمان کو بادل میں رکھتا ہوں۔ وہ میرے اور زمین کے درمیان عہد کا نشان ہو گی اور ایسا ہو گا کہ جب میں زمین پر بادل لاؤں گا تو میری کمان بادل میں دکھائی دے گی اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے اور ہر طرح کے جاندار کے درمیان ہے یاد کروں گا اور تمام جانداروں کی ہلاکت کے لئے پانی کا طوفان پھر نہ ہو گا اور کمان بادل میں ہو گی اور میں اس پر نگاہ کروں گا تا کہ اس ابدی عہد کو یاد کروں۔ جو خدا کے اور زمین کے سب طرح کے جاندار کے درمیان ہے۔ پس خدا نے نوح سے کہا کہ یہ اس عہد کا نشان ہے جو میں اپنے اور زمین کے کل جانداروں کے درمیان قائم کرتا ہوں۔'' (پیدائش باب ۹ آیت ۸ تا ۱۷)

یہ روایت گو بگڑی ہوئی ہو مگر بہر حال اس سے یہود کی روایات اور ان کے دستور کا علم ہو جاتا ہے اور پتہ لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ جب کوئی عہد کرتا تھا تو اس کے پورا ہونے کا وہ کوئی ظاہری نشان بھی مقرر کر دیتا تھا۔ اسی طرح بعض دفعہ ایسا نشان مقرر کیا جاتا تھا جس کا کرنا خود بندے کے اختیار میں ہو۔ چنانچہ پیدائش باب ۱۷ آیت ۹ تا ۱۱ میں لکھا ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ

’’تو میرے عہد کو ماننا اور تیرے بعد تیری نسل پشت در پشت اسے مانے اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔‘‘

اسی طرح حزقی ایل باب ۲۰ میں سبت کو ایک نشان قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ

’’میرے سبتوں کو مقدس جانو کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان نشان ہوں تا کہ تم جانو کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔‘‘ (حزقیل باب ۲۰ آیت ۲۰)

ان حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں کسی نیک کام کا کرنا پیشگوئیوں کے پورا ہونے کے لئے ایک ظاہری نشان سمجھا جاتا تھا۔ اسی رنگ میں حضرت زکریا نے بھی خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ الٰہی مجھے کوئی نشان دیا جائے یعنی مجھے کوئی ایسا حکم دیا جائے کہ جب میں اسے پورا کردوں تو یہ وعدہ اٹل ہوجائے کیونکہ جب بندہ اپنا وعدہ پورا کردے تو اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرتا ہے اور اس کو کسی اور رنگ میں نہیں بدلتا۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تیرے لئے وہ حکم جو اس بات کی علامت ہو گا کہ تو نے خدا کا شکر ادا کردیا ہے یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین راتیں کلام نہیں کرے گا اس حالت میں کہ تو تندرست اور بے عیب ہوگا اور بغیر کسی بیماری کے ہوگا۔ اور ان دنوں میں ذکر الٰہی کرتا رہے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ ثَلَاثَ لَيَال بلکہ فرمایا ہے اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ تو لوگوں سے کلام نہیں کرے گا۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ انسان کامل صرف انسانوں سے ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے بھی باتیں کیا کرتا ہے چنانچہ دیکھ لو۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے خدا تعالیٰ سے کتنی لمبی باتیں کی ہیں کہ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا۔ وَ اِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا۔ يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ١ۖۗ وَ اجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا۔ یہ تمام باتیں کسی آدمی سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے کی گئی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے بعض دفعہ فرشتوں سے بھی ہمکلام ہوتے ہیں پس النَّاسَ کے لفظ نے اس کلام کا استثناء کردیا جو خدا اور اس کے ملائکہ سے کی جاتی ہے اور اس طرف اشارہ کردیا کہ یہ صرف ایک روزہ تھا جس میں انہیں خاموشی کے ساتھ ذکر الٰہی کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کی زبان ماری گئی تھی اگر زبان ماری جاتی تو لَا تُكَلِّمُ کہنا چاہیے تھا مگر کہا یہ گیا ہے کہ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ تو ان تین

راتوں میں لوگوں سے کلام نہیں کرے گا یعنی ان تین راتوں میں لوگوں سے کلام نہ کیجیئو۔ گویا تو خدا کے لئے اپنے اوپر یہ واجب کر لے گا کہ میں نے تین رات دن لوگوں سے گفتگو نہیں کرنی حالانکہ تو تندرست ہوگا اور تجھ میں طاقت ہوگی کہ تو باتیں کرے۔

یہاں خدا تعالیٰ کے ایک وعدے کو اس کے ایک حکم کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر بندہ وہ حکم پورا کر دے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اسے دیا گیا ہے تو وہ وعدہ کسی صورت میں بھی ٹل نہ سکے اور وہ بہر حال پورا ہو جائے۔

اسی طرح ثَلٰثَ لَيَالٍ سے صرف تین راتیں مراد نہیں بلکہ دن بھی ساتھ ہی مراد ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (الاعراف: ۱۴۳) ہم نے موسیٰؑ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا حالانکہ وہاں دن بھی مراد ہیں۔ پس یہاں بھی تین راتوں سے تین رات دن مراد ہیں نہ کہ صرف تین راتیں۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا

اس کے بعد (زکریا) محراب سے نکل کر اپنی قوم کے پاس گئے اور انہیں آہستہ آواز میں کہا کہ صبح اور شام خدا تعالیٰ کی

بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۱۲﴾

تسبیح کرتے رہو۔

حل لغات۔ محراب مِحْرَابٌ کے معنے چوبارہ کے بھی ہوتے ہیں اور محراب کے معنے گھر کے اچھے حصہ کے بھی ہوتے ہیں۔ مسجد کے محراب کو اسی لئے محراب کہتے ہیں کہ وہاں امام کھڑا ہوتا ہے جو سب سے زیادہ معزز ہوتا ہے اور محراب اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں بادشاہ علیحدگی میں مسائل پر غور کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں اور عوام کو وہاں آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اور قلعہ کو بھی محراب کہتے ہیں اور شیر کی کچھار کو بھی محراب کہتے ہیں۔ (اقرب)

اَوْحٰى اِلَيْهِ اَوْحٰى اِلَيْهِ اِيْحَاءً کے معنے ہوتے ہیں۔ بَعَثَهٗ اس کو مبعوث کیا۔ اسی طرح اَوْحٰى بِكَذَا کے معنے ہوتے ہیں اَلْهَمَهٗ بِهٖ۔ اس کو کسی بات کی خبر دی۔ اور اساس میں لکھا ہے کہ وَحَيْتُ اِلَيْهِ وَ اَوْحَيْتُ۔ اِذَا كَلَّمْتَهٗ بِمَا تُخْفِيْهِ مِنْ غَيْرِهٖ یعنی وَحَيْتُ اِلَيْهِ اور اَوْحَيْتُ کے معنے ہوتے ہیں ایسی طرز پر بات کرنا کہ

دوسرے اس کو نہ سنیں۔ اور مصباح میں ہے کہ بَعْضُ الْعَرَبِ یَقُوْلُ وَحَیْتُ اِلَیْہِ وَحَیْتُ لَہٗ وَ اَوْحَیْتُ اِلَیْہِ وَلَہٗ یعنی بعض اہل عرب کے نزدیک وَحَیْتُ اِلَیْہِ اور وَحَیْتُ لَہٗ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور اَوْحَیْتُ اِلَیْہِ اور اَوْحَیْتُ لَہٗ بھی استعمال ہوتا ہے۔ معنے سب کے ایک ہی ہیں۔ پس اَوْحٰی کے معنے صرف اشارہ کرنے کے نہیں بلکہ اس سے مراد کسی سے ایسے رنگ میں بات کرنا ہے کہ دوسرے لوگ نہ سنیں۔

بُکْرَۃً بُکْرَۃً صبح سے دوپہر تک کو کہتے ہیں (اقرب) اور عَشِیًّا دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ بعض زبان دان کہتے ہیں کہ مغرب سے عشاء تک کے وقت کے لئے عَشِیٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ (اقرب)

تفسیر ۔حضرت زکریاؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تین رات دن خاموش رہ کر ذکر الٰہی کرنے کی ہدایت ہوئی تو انہوں نے نیت کر لی کہ میں اب کوئی بات نہیں کروں گا اور خدا کے ذکر میں مشغول رہوں گا۔ چنانچہ وہ اپنے کمرہ میں سے یا مسجد کے اس حصہ میں سے جہاں امام کھڑا ہوتا ہے باہر آئے اور انہوں نے ایسے رنگ میں بات کی کہ غیر لوگ اس کو نہ سنیں گویا نہایت آہستگی سے اپنے دوستوں کے پاس کھڑے ہو کر بات کی تا کہ غیر لوگ نہ سنیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ ان کے گونگے ہونے کا کوئی سوال نہیں تھا صرف ایسے رنگ میں بات کرنا مراد تھا کہ دوسروں کو سنائی نہ دے۔

سورۂ آل عمران میں اَوْحٰی اِلَیْھِمْ کی بجائے رَمْزًا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (آل عمران: ۴۲) رَمْزًا کے معنے چونکہ عام طور پر اشارہ کے ہوتے ہیں اس لئے انجیل سے متاثر ہو کر ہمارے مفسرین نے بھی اس کے معنے اشارہ کے کر لئے ہیں (تفسیر ابن کثیر زیر آیت فنادته الملائکة) حالانکہ لغت والے لکھتے ہیں کہ اس کے معنے ہونٹوں سے یا آنکھوں سے یا بھوؤں سے اشارہ کرنے کے ہیں (اقرب)۔ اور ظاہر ہے کہ ہونٹوں سے انسان اشارہ نہیں کیا کرتا صرف آہستگی سے گفتگو کیا کرتا ہے پس ہونٹوں کے اشارہ کا مطلب بھی یہی ہے کہ صوت نہ نکلے جیسے کسی کا گلا خراب ہو تو کہا جاتا ہے کہ تم اس طرح بولو کہ تمہاری آواز نہ نکلے۔ بلکہ ثعالبی جو لغت کے امام ہیں وہ تو اپنی کتاب فقہ اللغة میں لکھتے ہیں کہ هُوَ مُخْتَصٌّ بِالشَّفَةِ۔ رمز کا لفظ ہونٹوں سے اشارہ کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ (فقه اللغة فصل فی تفصیل تحریکات مختلفة) یعنی صرف ہونٹ سے بولنا گلا استعمال نہ کرنا اور یہ معنے اَوْحٰی اِلَیْھِمْ کے بالکل مطابق ہیں یعنی اونچا بولنا ان کو منع تھا۔ ہونٹوں میں یعنی آہستہ کلام کر سکتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت تھی۔ چونکہ خدائی ارشاد پہنچانے کے لئے بعض قریبی لوگوں کو بتانا ضروری تھا۔ اس لئے انہوں نے آہستگی سے کہہ دیا۔ کہ میں خدائی حکم کے ماتحت تین دن

ذکر الٰہی کروں گا تم بھی صبح و شام ذکر الٰہی کرو۔

بُكْرَةً چونکہ صبح سے لے کر دوپہر تک کے وقت کو کہتے ہیں اور عَشِيًّا کا لفظ زوال سے لے کر رات تک کے وقت پر استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا سے مراد یہ ہے کہ تم سارا دن عبادت کرو۔ میں بھی یہ ایام عبادت میں بسر کروں گا۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۳﴾ۙ

(اس کے بعد یحییٰ پیدا ہو گیا اور ہم نے اسے کہا) اے یحییٰ! تو (الٰہی) کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور ہم نے

وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ﴿۱۴﴾ۙ

اسے چھوٹی عمر میں ہی (اپنے) حکم سے نوازا تھا۔ (اور یہ بات) ہماری طرف سے بطور مہربانی (اور شفقت کے تھی) اور (اسے) پاک کرنے کے لئے (تھی) اور وہ بڑا متقی تھا۔

حل لغات۔ حَنَانٌ کے کئی معنے ہیں اس کے معنے رحمت کے بھی ہیں۔ رزق کے بھی ہیں۔ برکت کے بھی ہیں۔ دل کی نرمی کے بھی ہیں۔ ہیبت کے بھی ہیں اور وقار کے بھی ہیں (اقرب) اس جگہ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا کے یہ معنے ہیں کہ ہم نے اسے دل کی نرمی بخشی۔

تفسیر۔ اس آیت سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ تورات اور اس کے صحیفے اس وقت تک منسوخ نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام پر کسی نئی کتاب کے اترنے کے نہ مسلمان قائل ہیں اور نہ عیسائی۔ پس اَلْكِتٰبَ سے مراد تورات ہی ہے جس کو مضبوطی سے پکڑنے کا حضرت یحییٰ علیہ السلام کو حکم ہوا اور پھر آگے مسیح نے بھی یوحنا سے بپتسمہ لیا۔ گویا اسی کے دین کی اتباع کا اقرار کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کوئی نئی کتاب نہیں لائے۔ کیونکہ جب ایک ہی زمانہ میں دو نبی ظاہر ہو رہے تھے اور ایک ہی قوم کی طرف آنے والے تھے اور ایک دوسرے کا شاگرد ہونے والا تھا۔ تو کس طرح ممکن تھا کہ ایک تو تورات پر مضبوطی سے قائم ہو اور دوسرا اس شریعت کو منسوخ کر کے ایک اور کتاب لے آئے۔ پس یہ الفاظ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ موسوی شریعت ابھی جاری رہنے والی تھی۔ اگر وہ مسیحؑ کے ذریعہ منسوخ ہونے والی ہوتی تو اتنی شدت کے ساتھ نہ کہا جاتا کہ خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ۔ اس

کتاب پر مضبوطی کے ساتھ عمل کرو۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس وقت تک بنی اسرائیل کے لئے تورات ہی واجب العمل تھی۔ اگر وہ جلدی ہی منسوخ ہو جانے والی ہوتی تو اس قدر تاکید نہ کی جاتی۔ کہ تم پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر عمل کرو۔ یہ الفاظ دفع الوقتی کے لئے استعمال نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اسی صورت میں استعمال ہو سکتے ہیں جب اس شریعت نے ابھی کچھ عرصہ تک قائم رہنا ہو۔

وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا۔ اور ہم نے اس کو بچپن کی عمر سے ہی حکم دیا تھا۔ صَبِیًّا کے معنے بچپن کی عمر کے بھی ہوتے ہیں لیکن درحقیقت مراد یہ ہے کہ وہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا قرب عطا کر دیا۔ یعنی ابھی لوگ ان کو بچہ ہی جانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ان پر کلام نازل ہونے لگ گیا۔ ہماری زبان میں بھی محاورہ ہے کہ فلاں تو ابھی کل کا بچہ ہے۔ مراد یہ ہوتی ہے کہ ابھی تو وہ چھوٹی عمر کا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ دودھ پیتا بچہ ہے لیکن اس کے علاوہ جوانی کے لئے بھی یہ لفظ بول لیتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں دو نبی یعنی حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام آگے پیچھے آئے اور ان دونوں کے متعلق صَبِیًّا کا لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ جب ان کی والدہ نے یہودیوں سے کہا کہ اس سے بات کرو تو انہوں نے کہا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (مریم: ۳۰) ہم ایک بچہ سے کس طرح بات کر سکتے ہیں گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لوگوں نے صبی کہا اور یحییٰ علیہ السلام کو بھی خدا نے صبی قرار دیا۔ اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ ہے کہ انہوں نے بچپن میں کلام کی تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا۔ پھر وہاں تو دشمنوں نے آپ کو صبی قرار دیا تھا اور یہاں خدا نے حضرت یحییٰ کو صبی قرار دیا ہے۔ اگر دشمن کے قول کی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ کو عظمت دی جا سکتی ہے تو حضرت یحییٰ کے متعلق تم اسی عظمت کے کیوں قائل نہیں۔ جب کہ یحییٰ کو دشمنوں نے نہیں بلکہ خدا نے صبی قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا (آل عمران: ۴۷) کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں مگر آپ کے متعلق صبی کا لفظ دشمنوں نے ہی استعمال کیا ہے۔

جس طرح اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا میں اس طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اگر مسیحؑ کی عظمت کے تم اس وجہ سے قائل ہو کہ وہ بچپن میں ہی اپنے دشمنوں پر بھاری تھا تو وہی عظمت تم کو یحییٰ کو بھی کیوں نہیں دیتے جبکہ ہم نے اسے بھی بچپن میں ہی اپنا قرب عطا کر دیا تھا اسی طرح یہاں بھی حضرت مسیحؑ کی تعلیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے عیسائیوں کا بڑا زور

اس امر پر ہے کہ حضرت مسیحؑ نرمی اور حلم اور عفو اور بردباری کی تعلیم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں فرما دیا کہ یحییٰ بھی دل کا بڑا حلیم اور بردبار اور نرم مزاج تھا۔ اگر نرمی اور حلم کسی فضیلت کا باعث ہیں تو یہ فضیلت حضرت یحییٰ کو بھی حاصل ہے۔ غرض جتنی باتیں حضرت مسیحؑ کی افضلیت کے متعلق پیش کی جاتی ہیں ان سب کی اللہ تعالیٰ نے اس جگہ تردید کر دی ہے۔

(۱) کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح دل کے بڑے حلیم تھے اور ان کی طبیعت میں رأفت اور محبت تھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یحییٰ بھی دل کا بڑا حلیم تھا اور اس کی طبیعت میں بھی رأفت اور محبت ڈالی گئی تھی۔

(۲) کہا جاتا ہے کہ مسیح ایک نئی شریعت لایا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یحییٰ کو بھی کہا تھا کہ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ تو اس کتاب پر مضبوطی سے عمل کر۔

(۳) کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے بچپن میں کلام کیا اور یہ ان کی فضیلت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے یحییٰ کو بھی بچپن میں اپنا مامور بنا کر لوگوں کی طرف بھیج دیا تھا۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ مسیحؑ گناہوں سے پاک تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یحییٰ بھی گناہوں سے پاک تھا کیونکہ ساتھ ہی فرماتا ہے وزکوۃً اس میں پاکیزگی اور تقدس بھی پایا جاتا تھا۔

غرض جتنی خصوصیات حضرت مسیحؑ میں بیان کی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ نے وہ سب کی سب حضرت یحییٰ میں بیان کر دی ہیں اور اس طرح عیسائیوں پر حجت تمام کی ہے کہ اگر ان خصوصیات کی وجہ سے حضرت مسیح کو تم تمام نبیوں پر فضیلت دیتے ہو تو پھر یحییٰ کو بھی تم ایسا ہی کیوں نہیں سمجھتے جبکہ اس میں بھی یہی باتیں پائی جاتی تھیں۔

وَ كَانَ تَقِيًّا۔ اور وہ صاحب تقویٰ تھا۔ پہلے فرمایا کہ اس میں زَکٰوۃً یعنی پاکیزگی پائی جاتی تھی پھر فرمایا کہ اس میں تقویٰ پایا جاتا تھا۔ اردو میں جب ہم معنی الفاظ آجائیں تو انسان سمجھتا ہے کہ ان کے کوئی الگ الگ معنے نہیں صرف ایک ہی مفہوم کو مختلف الفاظ میں حسن کلام کے لئے ادا کیا گیا ہے۔ لیکن عربی زبان میں یہ بات نہیں۔ عربی زبان میں ہر لفظ الگ الگ معنے رکھتا ہے۔ پس كَانَ تَقِيًّا اور مفہوم کا حامل ہے اور زَکٰوۃً کا لفظ اور مفہوم کا حامل ہے۔ زَکٰوۃً کا لفظ عربی زبان میں اندرونی خرابیوں کو دور کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور تقویٰ کا لفظ باہر سے آنے والی خرابیوں کو دور کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پس اس آیت کے معنے یہ ہوئے کہ ہم نے اس کو اپنے پاس سے حلم اور نرمی بخشی اور ہم نے اس کے اندرونی خیالات بھی پاکیزہ بنائے اور جو باہر سے خرابیاں آتی ہیں ان کے مقابلہ کی بھی اس کو طاقت بخشی۔

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۵﴾

اور وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا تھا اور ظالم اور نافرمان نہیں تھا

حلّ لُغات۔ بَرَّ بَرَّ فِيْ يَمِيْنِهٖ کے معنے ہوتے ہیں صَدَقَ۔ اس نے اپنی قسم کو پورا کر کے دکھایا یعنی اپنی بات کا پکا اور سچا نکلا۔ اور بَرَّ وَالِدَهٗ کے معنے ہوتے ہیں اَحْسَنَ الطَّاعَةَ اِلَيْهِ وَ رَفَقَ بِهٖ۔ اس نے اپنے والد کی پوری اطاعت کی اور اس کے ساتھ نرمی اور محبت کا سلوک کیا۔ وَ تَحَرّٰى مُحَابَّهٗ وَ تَوَقّٰى مَكَارِهَهٗ اور جو باتیں اس کو پسند تھیں ان کو اس نے اختیار کیا اور جو باتیں اس کو ناپسند تھیں ان کو اس نے چھوڑ دیا فَهُوَ بَرٌّ بِهٖ وَ بَارٌّ۔ ایسے شخص کو بَرٌّ بھی کہتے ہیں اور بَارٌّ بھی کہتے ہیں (اقرب)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے باپ کو خوش کرنے کے لئے ظاہری اور باطنی طور پر وہ تمام اخلاق اپنے اندر پیدا کر لے جن کو وہ پسند کرتا ہو اور ان تمام برائیوں کو ترک کر دے جن کو وہ ناپسند کرتا ہو تو اس وقت اسے اسے بَرٌّ اور بَارٌّ کہتے ہیں۔ لیکن بَرٌّ میں بَارٌّ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

جَبَّارًا جَبَرَ الْعَظْمَ کے معنے ہوتے ہیں اَصْلَحَهٗ مِنْ كَسْرٍ۔ اس نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو درست کیا۔ یہ متعدی اور لازم دونوں طرح استعمال ہوتا ہے یعنی جَبَرَ الْعَظْمَ کے تو یہ معنی ہوں گے کہ اس نے ٹوٹی ہڈی کو درست کیا۔ لیکن جَبَرَ الْعَظْمُ بِنَفْسِهٖ کے معنے ہوں گے صَلُحَ بَعْدَ الْكَسْرِ۔ ہڈی ٹوٹ گئی تھی مگر پھر درست ہو گئی اور جَبَرَ الْفَقِيْرَ کے معنے ہوتے ہیں اَغْنَاهُ اس نے فقیر کو غنی کر دیا۔ اور جَبَرَ فُلَانًا عَلَى الْاَمْرِ کے معنے ہوتے ہیں اَكْرَهَهٗ۔ اس نے فلاں کو کسی کام پر سختی سے مجبور کیا (اقرب) گویا جہاں اس کے معنے اصلاح کرنے کے ہیں وہاں کسی کی مرضی کے خلاف اس پر ظلم کر کے جبراً اس سے کام لینے کے بھی ہیں گویا ایک معنے ایسے ہیں جن میں نیکی اور اصلاح پائی جاتی ہے اور ایک معنے ایسے ہیں جن میں سختی اور ظلم پایا جاتا ہے۔

عصيًّا عِصِيًّا بمعنے عاصی استعمال ہوا ہے یعنی وہ نافرمان نہیں تھا۔ (اقرب)

تفسیر۔ بَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اس کا اپنے ماں باپ سے یہ سلوک تھا کہ وہ ان کا پورا مطیع اور فرمانبردار تھا۔ وہ ان تمام اخلاق فاضلہ کو پسند کرتا تھا جن کو وہ پسند کرتے تھے اور ان تمام برائیوں سے بچتا تھا جن کو وہ ناپسند کرتے تھے۔

وَ لَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا۔ اور پھر وہ جبار اور نافرمان بھی نہیں تھا۔

یہ خوبیاں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں یہ بھی اسی لئے بیان کی ہیں کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کے متعلق یہ کہا کرتے ہیں کہ اس نے کیا ہی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کہ

''جو کوئی تیرے داہنے گالے پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔''

(انجیل متی باب ۵ آیت ۳۹)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یحییٰ بھی جبار نہیں تھا۔ اس نے جو تعلیم دی اس میں بھی ظلم کا کوئی پہلو نہیں تھا۔

اسی طرح عیسائی حضرت مسیحؑ کی یہ بڑی خوبی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا

''جو قیصر کا ہے قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو'' (انجیل متی باب ۲۲ آیت ۲۱)

اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ یحییٰ بھی عِصِیًّا نہیں تھا۔ اس نے بھی یہی تعلیم دی تھی کہ نافرمانی مت کرو۔ اور قیصر کا حق قیصر کو اور خدا کا حق خدا کو دو۔

غرض وہ ساری خوبیاں جو حضرت مسیحؑ میں بیان کی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رنگ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بھی تھیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت یحییٰ حضرت مسیحؑ سے درجہ میں کم تھے لیکن یہاں درجہ اور مقام پر بحث نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا ذکر کر رہا ہے کہ حضرت مسیحؑ میں کوئی نرالی خصوصیت نہیں تھی۔ چونکہ عیسائی حضرت مسیح کو غیر معمولی عظمت دیتے ہیں اور کہتے ہیں ان میں بعض اخلاق مخصوص طور پر پائے جاتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کو رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ساری خوبیاں حضرت یحییٰؑ میں بھی پائی جاتی تھیں۔ اگر ان باتوں کی وجہ سے تم عیسیٰ کو فضیلت دیتے ہو تو یحییٰ کو کیوں فضیلت نہیں دیتے؟

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ

اور جب وہ پیدا ہوا تب بھی اس پر سلامتی تھی اور جب وہ مرے گا اور جب وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا

حَيًّا ﴿۱۶﴾ ع

(تب بھی اس پر سلامتی ہوگی)

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت فرماتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوا تب بھی اس پر سلامتی تھی اور جب وہ مرے گا تب بھی اس پر سلامتی ہوگی اور جب وہ زندہ کر کے دوبارہ اٹھایا جائے گا تب بھی

اس پر سلامتی ہوگی۔ اس سے بعض لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ یہاں سلامتی سے جسمانی سلامتی مراد ہے اور چونکہ یہ سلامتی ان کی موت کے دن کے لئے بھی مقدر تھی۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام شہید نہیں ہوئے۔ حالانکہ اگر آپ پر سلامتی نازل ہونے کا یہی مفہوم ہے کہ آپ قتل سے محفوظ رہے تو قیامت کے دن آپ پر سلامتی نازل ہونے کے کیا معنے ہیں۔ کیا قیامت کے دن بھی کوئی دشمن آپ کے قتل کی تدبیر کرے گا کہ اس دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سلامتی آپ کے لاحق حال ہوگی۔ اگر سلامتی کا اس جگہ یہی مفہوم لیا جائے کہ اس میں دشمنوں کی تدابیر قتل کا رد ہے۔ تو اس کے معنے یہ بنیں گے کہ جس دن حضرت یحییٰ پیدا ہوئے اس دن بھی وہ قتل سے محفوظ رہیں گے۔ جس دن وہ فوت ہوں گے اس دن بھی وہ قتل نہیں ہوں گے اور جب قیامت کے دن وہ دوبارہ زندہ ہوں گے تو اس دن بھی قتل نہیں ہوں گے۔ اب بتاؤ کیا قیامت کے دن بھی وہ قتل ہو سکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے متعلق یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا پر بھی سلامتی کا وعدہ کرنا پڑا۔

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں تین مختلف زمانوں کو بیان کیا ہے مگر لوگوں نے غلطی سے اس کا مفہوم کچھ کا کچھ سمجھ لیا۔ دراصل انسانی زندگیاں تین ہوتی ہیں۔ ایک زندگی شروع ہوتی ہے انسانی پیدائش سے اور ختم ہوتی ہے انسانی موت پر۔ دوسری زندگی موت سے شروع ہوتی اور قیامت تک قائم رہتی ہے۔ اس زندگی کو برزخی زندگی کہا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد ایک تیسرا زمانہ ہے۔ جسے قرآن کریم نے یوم البعث قرار دیا ہے اور جس دن کامل طور پر جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل کر دئے جائیں گے۔ یہ تین ابتدائی نقطے ہیں انسانی زندگی کے۔ پیدائش ابتدائی نقطہ ہے حیٰوۃ الدنیا کا۔ موت ابتدائی نقطہ ہے حیات برزخی کا۔ اور یوم البعث ابتدائی نقطہ ہے حیات اخروی کا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے تینوں نقطہ ہائے حیات میں سلامتی ہی سلامتی ہے اس کی پیدائش پر بھی ہماری طرف سے سلامتی نازل ہوگی اور وہ زندگی بھر اس سے متمتع ہوتا رہے گا۔ پھر جب وہ وفات پائے گا تب بھی اس پر سلامتی نازل ہوگی اور وہ عالم برزخ میں بھی سلامتی سے حصہ پائے گا اور اس کے بعد جب یوم البعث آئے گا تو اس دن بھی اس پر سلامتی نازل ہوگی اور وہ اخروی حیات میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل کے ماتحت رہے گا۔

غرض اس آیت میں قتل کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ اس میں تین زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ان تینوں زندگیوں میں اللہ تعالیٰ کی سلامتی کے مورد ہوں گے مگر یہ سلام صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لئے نہیں آیا بلکہ سب مومنوں کے لئے آیا ہے۔ چنانچہ سورہ انعام ع ٦۔ ۱۲

میں آتا ہے وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام:۵۵)۔ یعنی جب تیرے پاس ہماری آیتوں پر ایمان لانے والے لوگ آئیں تو ان کو ہمارا یہ پیغام دے دینا کہ تم پر سلام ہو تمہارے رب نے تمہارے لئے اپنے آپ پر رحمت واجب کر لی ہے۔ یہ سلام بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ حالانکہ ان میں سے کئی شہید ہوئے۔ پھر سب مومنوں کی نسبت آتا ہے۔ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (النحل:۲۹) یعنی جن لوگوں کی روح فرشتے اس حالت میں نکالتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں فرشتے انہیں کہتے چلے جاتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو۔ جاؤ اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اب یہ تو ظاہر ہے کہ فرشتے مومنوں کی جان کئی طرح نکالتے ہیں۔ بعض کی شہادت کے ذریعے نکالتے ہیں تو کیا اگر سلامتی کے معنے دشمنوں کے ہاتھوں سے نہ مارے جانے کے ہیں تو یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ دشمن ان کو قتل بھی کر رہا ہوگا اور فرشتے ساتھ ساتھ سلام بھی کرتے جا رہے ہوں گے۔ گویا جو بات ہو رہی ہوگی اس کی تردید کر رہے ہوں گے۔ اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں آتا ہے وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (طٰہٰ:۴۸) جو بھی ہدایت کے تابع چلے اس پر سلامتی ہے۔ اگر سلام کے معنے دشمنوں کے قتل سے محفوظ رہنے کے لئے جائیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کبھی کوئی مومن قتل نہیں ہوتا پھر سورۂ مائدہ ع ۳۔۷ میں مومنوں کی نسبت فرمایا ہے يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (المائدۃ:۱۷) یعنی قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کو جو خدا تعالیٰ کی رضا کے تابع ہوتے ہیں سلام کے راستے دکھاتا ہے۔ اب اگر سلام کے معنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل نہ ہونے کے کئے جائیں تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو ایسی زندگی بخشتا ہے کہ وہ کبھی دشمن کے ہاتھ سے قتل نہیں ہوتے جو بالبداہت غلط ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سلام ایک وسیع معنوں کا حامل لفظ ہے بعض موقعوں پر یقیناً اس کے یہ معنے بھی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ دشمن کے کسی حملہ سے بچا لے گا۔ لیکن بعض جگہ بیماری سے بچانے کے اور بعض جگہ ناکامی سے بچانے کے معنے ہوں گے۔ بہر حال بغیر کسی زبردست قرینہ کے ایک عام لفظ کے کوئی خاص معنے کرنے اور وہ بھی ایسے جو تاریخی واقعات کے سراسر خلاف ہوں کسی صورت میں بھی درست نہیں ہو سکتے۔ پس یہاں سلامتی سے جسمانی سلامتی مراد نہیں بلکہ روحانی سلامتی مراد ہے۔ اگر جسمانی سلامتی مراد ہو تو موت کے دن بھی اس پر سلامتی ہونے کے کوئی معنے نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انسان جب بھی مرتا ہے کسی بیماری یا حادثہ سے مرتا ہے اور جب وہ کسی بیماری یا حادثہ سے ہلاک ہوگا تو اس کے لئے سلامتی کہاں ہوئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جسمانی سلامتی مراد نہیں بلکہ روحانی سلامتی مراد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جس دن وہ پیدا ہوگا اس دن بھی اس پر سلامتی ہوگی

اور وہ تمام دماغی اور جذباتی کمزوریوں سے محفوظ ہوگا اور جس دن وہ مرے گا اس دن بھی اس پر سلامتی ہوگی یعنی وہ تمام روحانی امراض سے پاک ہوگا اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا اس دن بھی اس پر سلامتی ہوگی۔

یہ آیت بھی حضرت مسیحؑ کی ایک خصوصیت کو رد کرنے کے لئے بیان کی گئی ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ سوائے حضرت عیسیٰؑ اور اس کی والدہ کے دنیا میں کوئی شخص مس شیطان سے پاک نہیں۔ یہ بات عیسائیوں نے نہیں کہی بلکہ مسلمانوں نے مسیحیوں پر احسان کر کے ان کے لئے پیدا کی ہے خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب خود مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کر دینا ہے کہ مسیحؑ مس شیطان سے پاک تھا اور یہ اس کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں وہ منفرد ہے(تفسیر ابن کثیر زیر آیت انی اعیذھا بک)۔ اس کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کی نسبت فرمایا وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ۔ یوحنا بھی اپنی پیدائش کے دن خدا تعالیٰ کی سلامتی کے نیچے تھا۔ اگر پیدائش کے وقت شیطان ہر شخص کو چھیڑتا ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کیا ہی برکت والا وہ دن تھا۔ جس دن یحییٰ پیدا ہوا (تفسیر ابن کثیر زیر آیت انی اعیذھا بک) اور شیطان نے اسے چھیڑا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر شیطان ہر انسان کو اس کی پیدائش پر چھیڑتا ہے تو یحییٰ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بڑی برکتوں والا اور سلامتی کا دن تھا جس دن یحییٰ پیدا ہوا۔ ہاں اگر شیطان نے اسے نہیں چھیڑا تب بے شک کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڑی ہی برکتوں والا دن تھا جب یحییٰ پیدا ہوا۔ اور شیطان نے اسے نہیں چھیڑا۔ پس حضرت یحییٰ علیہ السلام میں اللہ تعالیٰ نے وہ ساری خوبیاں بیان کر دی ہیں۔ جو عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح میں پائی جاتی تھیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں جو اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور کمالات پائے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے ان کو عیسائیوں کے سامنے پیش کرنا تھا اور عیسائیوں نے ان کا انکار کرتے ہوئے یہ کہنا تھا کہ ساری خوبیاں تو مسیح میں پائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے ذریعہ مسلمانوں کی توجہ اس طرف پھیری کہ تم انجیل میں یوحنا کے حالات دیکھ لو تمہیں وہ ساری خوبیاں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر یوحنا میں دکھائی دیں گی جو مسیحؑ میں بیان کی جاتی ہیں۔ میں نے بتایا ہے کہ یوحنا کے متعلق اناجیل میں یہاں تک لکھا ہے کہ

> ’’میں تم سے کہتا ہوں کہ ان میں سے جو عورتوں سے پیدا ہوئے یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی نبی بڑا نہیں‘‘۔ (لوقا باب ۷ آیت ۲۸)

اسی طرح یوحنا کے متعلق سابق انبیاء کی پیشگوئیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ پس مسیحؑ کو کوئی خاص خصوصیت حاصل نہیں جس کی وجہ سے اسے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا جا سکے۔ باقی یہ کہ ایک بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ اس سے ہم بھی انکار

نہیں کرتے۔لیکن یہ کہ وہ کوئی نرالی خصوصیات رکھتا تھا یہ ایک ایسی بات ہے جو اناجیل کے رو سے بالکل باطل ہے بلکہ یوحنا کے متعلق تو یہ بھی لکھا ہے کہ

’’وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مَے نہ کوئی اور شراب پئے گا۔‘‘

(لوقا باب ۱ آیت ۱۵)

اور مسیح انجیل کے رو سے نہ صرف خود شراب پیتا تھا بلکہ شراب بنانے کا معجزہ بھی اس نے دکھایا تھا (انجیل یوحنا باب ۲ آیت ۱ تا ۱۱) اسی طرح مسیحؑ اگر روزہ رکھتا اور عبادتیں کرتا تھا تو یہ باتیں یوحنا میں بھی پائی جاتی تھیں۔غرض خدا تعالیٰ نے اس سورۃ میں مسلمانوں کو یہ گر بتایا ہے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں تم یحییٰ کے حالات کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جتنی باتیں مسیح کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہ ساری کی ساری یوحنا میں بھی پائی جاتی ہیں اور جب یہ حالت ہے تو مسیح کی اس میں خصوصیت کیا رہی۔

پس یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ سے آخر رکوع تک مسیحیت کے رد کے دلائل بیان کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق بیان کرو گے تو عیسائی مانیں گے نہیں۔ہم تمہیں گر بتاتے ہیں کہ انجیل میں یوحنا کا ذکر پڑھو۔وہاں تمہیں وہی باتیں ملیں گی جو عیسائی حضرت مسیحؑ میں بیان کرتے ہیں۔ پس تم انہیں بتاؤ کہ مسیحؑ میں کوئی نرالی خصوصیت نہیں جس کی وجہ سے اسے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا جا سکے۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ مَرْیَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَھْلِھَا

اور تو (اس) کتاب میں مریم کا (جو) ذکر (آتا ہے اسے) بیان کر (خصوصاً اس بات کو کہ) جب وہ اپنے

مَکَانًا شَرْقِیًّا ﴿۱۷﴾

رشتہ داروں سے مشرقی (جانب ایک) جگہ چلی گئی

حلّ لُغَات۔اِنْتَبَذَ کے معنے ہوتے ہیں اِعْتَزَلَ وَ تَنَحّٰی نَاحِیَۃً۔وہ الگ ہوگیا۔اور ایک طرف چلا گیا۔(اقرب)

شَرْقِیًّا شَرْقِیٌّ کے متعلق لغت میں لکھا ہے اَلشَّرْقِیُّ الْمَنْسُوْبُ اِلَی الشَّرْقِ۔ وَ کُلُّ مَکَانٍ فِیْ جِھَۃِ الشَّرْقِ وَ کُلُّ مَا اتَّجَہَ نَحْوَ الشَّرْقِ۔یعنی شَرْقِیٌّ کے معنے مشرق کی طرف کے بھی ہوتے ہیں اور شرقی ہر ایسے مکان کو بھی

کہتے ہیں جس کا منہ مشرق کی طرف ہو۔ (اقرب)

تفسیر ۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ کے یہ معنے ہیں کہ تو کتاب میں مریم کا ذکر کر یا کتاب میں مریم کا جو ذکر ہے اس کو اپنے ذہن میں لا۔

الْكِتٰبِ سے مراد گر قرآن کریم لیا جائے تو اس کا یہ مفہوم ہو گا کہ اس قرآن کے ذریعہ تو مریم کا ذکر بیان کر۔ لیکن الْكِتٰبِ سے مراد بائبل بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ بائبل میں مریم کا جو ذکر آتا ہے اس کو بیان کر یا اسے اپنے ذہن میں لا۔ یہ ظاہر ہے کہ بائبل میں بہت کچھ غلط واقعات اپنی طرف سے شامل کر دیئے گئے ہیں پس وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ کے یہ معنے ہوں گے کہ بائبل میں مریم کے جو حالات بیان کئے گئے ہیں ان کو بھی دیکھو۔ اور پھر قرآن کریم میں جو حالات بیان ہوئے ہیں ان کو پڑھو۔ اور دونوں کا مقابلہ کر کے اندازہ لگاؤ کہ مریم کے حالات کس کتاب نے زیادہ عمدگی کے ساتھ ان کی شان کے مطابق پیش کئے ہیں۔

اس سورۃ میں خدا تعالیٰ نے پہلے حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان کر کے یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کیا۔ کیونکہ پیشگوئیوں کے مطابق یحییٰ کی پیدائش مسیحؑ کے لئے بطور ارہاص تھی اور مسیحؑ دنیا میں اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ ان سے پہلے ایلیاہ کا بروز ظاہر نہ ہو جاتا۔ اب خدا تعالیٰ یحییٰ کے ذکر کے بعد مریم کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح یحییٰ کا وجود مسیحؑ سے پہلے ضروری تھا اور یحییٰ کا آنا ایک نشان کے طور پر تھا اسی طرح مسیح کی بن باپ ولادت بھی یہود کے لئے ایک عظیم الشان نشان تھی۔ کیونکہ اس ذریعہ سے یہود کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ اب بنی اسرائیل میں سے نبوت کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس نعمت کو ان کے دوسرے بھائیوں کی طرف منتقل کر دے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم نے بیسیوں دفعہ سنا ہے کہ مسیح کی بن باپ ولادت نبوت کا کانٹا پھیرنے اور یہود کو یہ بتانے کے لئے تھی کہ بنی اسرائیل سے خدا تعالیٰ نے اب اپنا منہ موڑ لیا ہے۔ اور وہ ان کی بداعمالیوں کی سزا میں اب نبوت کا سلسلہ ایک دوسری قوم میں منتقل کرنے والا ہے (مواہب الرحمن روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱)۔ چونکہ سلسلہ نسب باپ کی طرف سے چلتا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے مسیح کو بن باپ پیدا کیا۔ یہ بتانے کے لئے کہ اب یہود میں کوئی مرد ایسا نہیں رہا جس کی اولاد میں سے کسی کو نبی بنایا جا سکے۔ چنانچہ اب ہم جس کو نبی بنا رہے ہیں بغیر باپ کے بنا رہے ہیں صرف اس کی ماں اسرائیلی ہے مگر آنے والے نبی میں اتنا حصہ بھی نہیں ہو گا اور اللہ تعالیٰ اسرائیل سے اپنے تعلقات کلی طور پر منقطع کر لے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی کتابوں میں بھی اس مسئلہ کا بار بار ذکر فرمایا ہے چنانچہ

مواہب الرحمٰن وغیرہ میں یہ مضمون پایا جاتا ہے۔ اور درجنوں دفعہ ہم نے آپ کی زبان سے بھی یہ بات سنی ہے کہ حضرت مریم بھی ایک علامت تھیں اس خدائی انتباہ کی کہ نبوت اب بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل میں منتقل ہونے والی ہے اور موسیٰ ؑ کی اس پیشگوئی کا ظہور بالکل قریب ہے جس میں اس نے بتایا تھا کہ

''خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں (یعنی بنی اسماعیل) میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔'' (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۵)

پس چونکہ مریم بھی ایک خدائی نشان تھیں اس لئے ہمیں پوری طرح تحقیق کرنی چاہیے کہ بائبل اور قرآن نے ان کا وجود کس شکل میں پیش کیا ہے۔

عربی زبان میں حضرت مسیح ؑ کی والدہ کے لئے مریم کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن عبرانی زبان میں اس کا تلفظ کئی رنگ میں آتا ہے۔ چنانچہ ماریہؔ۔ مریمؔ۔ مریوم۔ یہ تین تلفظ ہیں جن میں اس لفظ کو ادا کیا جاتا ہے۔ انجیل میں جہاں حضرت مسیح کی والدہ کا ذکر آتا ہے وہاں تو مریم کا لفظ ہی استعمال کیا گیا ہے مگر جہاں دوسری عورتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہاں کا نام کبھی مریم آتا ہے اور کبھی ماریہ۔ غرض مریمؔ، ماریہؔ اور مریوم یہ مختلف تلفظ ہیں جو اس زمانہ کے لوگوں میں رائج تھے۔ مگر غالباً حضرت مسیح کی عظمت کی وجہ سے ان کی والدہ کے لئے صرف ایک ہی نام رکھا گیا تھا یعنی مریم۔

سب سے پہلے بائبل میں یہ نام تورات کے صحیفہ میں آیا ہے اور اس میں حضرت موسیٰ ؑ کی ہمشیرہ کا یہ نام بتایا گیا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہی وہ بہن تھی جو موسیٰ کے دریا میں پھینکنے کے بعد ان کے پیچھے پیچھے گئی جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر آتا ہے (القصص: ۱۲) مگر اس کے نام کا تلفظ بائبل میں مِریم آتا ہے۔ یعنی میم کی زیر سے۔ اس کے بعد یہ نام دوسری دفعہ نئے عہد نامہ میں آتا ہے اور اس جگہ کا تلفظ مَریم میم کی زبر سے آتا ہے۔ (متی باب ۱ آیت ۱۸)

اس لفظ کے معنوں میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے اس کے معنے تلخ سمندر کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے سمندر کا ستارہ کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ مریم کے معنے ''دن کی ملکہ'' کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنے ''ماسٹر کی مہر'' کے ہیں۔ بعض نے اس کے معنے سمندر کے استاد کے لئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ مریم کے معنے سمندر کی مر (Myrrh) کے ہیں۔ مِر ایک قسم کی گوند ہوتی ہے جو دواؤں میں استعمال ہوتی ہے۔

درحقیقت جن لوگوں نے عبرانی زبان کی تحقیق کی ہے وہ کہتے ہیں کہ مریم کے جو مختلف معنے کئے گئے ہیں اس

کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مشابہ بعض اور الفاظ عربی اور ایرانی اور دوسری زبانوں میں پائے جاتے ہیں لوگوں نے ان زبانوں کے ملتے ہوئے الفاظ سے یہ معنے اخذ کر لئے اور اس طرح اختلاف پیدا ہو گیا۔ مثلاً ''سمندر کے مِر'' کے جو معنے کئے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیٰ ؑ کی بہن کا نام تورات میں مِریم آتا ہے اور مُر عربی زبان میں ایک گوند کا نام ہے اور یَم سمندر کو کہتے ہیں۔ پس انہوں نے دوسری زبانوں کے مشابہ الفاظ کو دیکھ کر مِریم کا یہ ترجمہ کر لیا کہ ''سمندر کا مِر'' اسی طرح بعض معنے ایرانی اور دوسری زبانوں کے ملتے ہوئے الفاظ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے Hebrew زبان کی پوری تحقیق کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس کے معنے یا تو سینہ زور کے ہیں یا موٹی کے ہیں۔ گویا اس کے ایک معنے خودسر کے اور ایک موٹاپے کے کئے جاتے ہیں۔ خودسر کا مفہوم بھی موٹاپے کی طرف ہی جاتا ہے کیونکہ جو مضبوط بچہ ہوتا ہے وہی اَڑتا اور مقابلہ کرتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ عام طور پر جو بچے مشکل سے پیدا ہوتے تھے اور وزنی ہوتے تھے ان کا نام مریم رکھا جاتا تھا بعض نے کہا ہے کہ اصل میں ہر ملک کی خوبصورتی کا معیار الگ الگ ہوتا ہے۔ سامی نسلوں میں یعنی یہودیوں اور عربوں میں موٹاپا خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بَانَتْ سُعَادُ میں شاعر اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

هَيْفَاءُ مُقْبِلَةً عَجْزَاءُ مُدْبِرَةً

یعنی جب وہ سامنے سے آ رہی ہو تو پتلی کمر والی دکھائی دیتی ہے اور جب واپس جا رہی ہو تو موٹی دکھائی دیتی ہے۔ تو چونکہ موٹاپا اُن میں خوبصورتی کا معیار تھا اس لئے جو لڑکی خوبصورت ہوتی تھی اور موٹی بھی ہوتی تھی اس کا نام مریم رکھ دیا جاتا تھا۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ صرف خوبصورتی کی وجہ سے یہ نام رکھا جاتا تھا۔ موٹاپے کو خاص طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ یہ معنے غالباً انہوں نے اس لئے کر لئے ہیں کہ حضرت مریم کی عیسائیوں میں جو تصویریں پائی جاتی ہیں ان میں وہ زیادہ موٹی نظر نہیں آتیں۔

انجیل میں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مریمؔ اور ماریہؔ کے نام تبدیل ہوتے رہتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی جگہ بولے جاتے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح ؑ کی والدہ کے لئے ہمیشہ مریم کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں یہ نام بہت معروف تھا کیونکہ انجیل میں کئی عورتوں کا یہ نام مذکور ہے۔

مریم کی زندگی کے حالات

انجیل قبل از ولادتِ مسیح مریم کے حالات کے بارہ میں بالکل خاموش ہے۔ متی باب ۱ آیت ۱۸ سے صرف اتنا

معلوم ہوتا ہے کہ مریم کنواری حاملہ ہوئی تو یوسف جس سے اس کی منگنی ہوئی تھی اس نے اسے چھوڑنا چاہا مگر فرشتہ نے اسے منع کیا اور اسے یوسف کی جورو قرار دیا اور کہا اے یوسف تو اپنی جورو کو گھر لے جا (متی باب ۱ آیت ۱۸ تا ۲۰)۔ اس سے پہلے کا کوئی واقعہ متی میں نہیں ہے۔ مرقس نے اس پیدائش کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ لوقا نے اس معجزانہ پیدائش کا ذکر کیا ہے۔ مگر اسی وقت سے اس نے مریم کا ذکر کیا ہے جب فرشتہ نے اسے حمل کی خبر دی اور وہ حاملہ ہوگئی۔ کیونکہ لکھا ہے کہ مریم کنواری تھی اور اس کی یوسف سے منگنی ہوئی تھی مگر شادی سے پہلے فرشتہ نے اسے حمل کی خبر دی اور وہ حاملہ ہوئی (انجیل لوقا باب ۱ آیت ۲۷ تا ۳۵) لیکن حاملہ ہونے سے پہلے کے حالات پر لوقا نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ صرف اتنا بتایا ہے کہ مریم زکریاہ کی بیوی کی رشتہ دار تھی اور اس کے گھر آتی جاتی تھی۔ اس کے ماں باپ اور اس کے بچپن کے حالات پر اس نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ یوحنا اس بارہ میں بالکل خاموش ہے۔

قرآن کریم نے مریم کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی والدہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کی پیدائش کا واقعہ بھی ذکر کیا ہے (آل عمران: ۳۶، ۳۷) جس سے مسیح کی پیدائش کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آخر اتنا بڑا نشان دکھانے کے لئے کوئی ابتدائی علامات بھی تو ہونی چاہئیں۔ وہ ابتدائی علامات قرآن کریم پیش کرتا ہے انجیل نہیں۔ چنانچہ سورۂ آل عمران ع ۴۔ ۱۲ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عمران کے خاندان کی ایک عورت تھی (یعنی موسوی خاندان کی) اس نے اپنے دل میں محسوس کیا کہ دین کی حالت خراب ہو رہی ہے اور اس کی اصلاح کے لئے واقفین زندگی کی ضرورت ہے۔ اگر میرا بچہ ہوا تو میں اس کام کے لئے اسے وقف کر دوں گی اور خدا تعالیٰ سے اس نے یہ وعدہ کیا اور دعا کی کہ وہ اس کی نذر کو قبول کرے اور اس میں برکت دے۔ لیکن جب اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو بجائے لڑکے کے وہ لڑکی تھی جس پر اسے مایوسی ہوئی کہ وہ کام جس کے لئے اس نے اپنی اولاد وقف کی تھی لڑکی سے نہ ہو سکے گا اور گھبرا کر پھر خدا سے دعا کی کہ الٰہی اب کیا کروں میرے گھر میں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ خدا جانتا تھا کہ جو نر اولاد اس نے مانگی تھی وہ اس لڑکی کے برابر کام نہیں کر سکتی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ زمانہ کی خرابی کا احساس تو نیک لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو چکا تھا مگر اس خرابی کو دور کرنے کا جو صحیح وقت تھا اسے وہ نہیں جانتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ خرابی پیدا ہو چکی ہے اور دین سے محبت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں جوش تھا کہ وہ اس کی اصلاح کریں۔ مرد اپنی جگہ فکرمند تھے اور عورتیں اپنی جگہ فکرمند تھیں۔ عورتوں نے اس طرف توجہ کی کہ ہم اپنی اولادیں خدا تعالیٰ کے دین کی خدمت کے لئے وقف کریں گی۔ مگر ان کو کیا معلوم تھا کہ اس اصلاح کا صحیح موقعہ کونسا ہے۔ اگر مریم کی والدہ کی دعا اس وقت قبول ہو جاتی تو مسیحؑ اپنے وقت سے

بیس سال پہلے پیدا ہو جاتے۔ حالانکہ درمیان میں یحییٰ نے بھی آنا تھا اور ان کا آنا مسیح کے لئے ارہاص کے طور پر تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو اس رنگ میں قبول کیا کہ بجائے اس کے کہ انہیں وہ بیٹا دیتا جو دین کی خدمت کرتا اس نے انہیں وہ بیٹی دی جس سے آگے چل کر ایک عظیم الشان بیٹا پیدا ہونے والا تھا۔ اس طرح دعا بھی قبول ہو گئی اور زمانہ کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وقت مقدر تھا وہ بھی نہ ٹلا۔

غرض خدا تعالیٰ جو حالات سے واقف تھا اگر اسی وقت اس کی دعا سن لیتا تو وہ بچہ اس خدمت کو سرانجام نہیں دے سکتا تھا جو امّ مریم کے ذہن میں تھی۔ اس نے پرانی پیشگوئیوں کے مطابق کہ کنواری لڑکا جنے گی جو یہود کو نجات دلوائے گا (یسعیاہ باب ۷ آیت ۱۴) اور وہ ایک غیر معمولی فرزند کی ماں ہو گی لڑکے کی بجائے لڑکی دے دی۔ اور اس کی ماں کی دعا اس رنگ میں سنی گئی کہ لڑکی سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوا جو یہود کی رستگاری کا موجب ہوا۔

بہر حال ماں نے جب دیکھا کہ لڑکی ہوئی ہے تو چونکہ نذر مان چکی تھی۔ اس نے اسے علماء اور مجاوروں کی تربیت میں دے دیا۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہ بے بیاہی رہے بلکہ صرف دینی تربیت کے لئے۔ کیونکہ ماں دعا کرتی ہے کہ میں اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے تجھ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ شیطان سے محفوظ رہیں (آل عمران: ۳۷)۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ انہوں نے اس خیال سے کہ میں چونک دعا کر چکی ہوں اس لئے اگر علماء کے سپرد اسے کیا گیا تو وہ اس کی اچھی تربیت کریں گے اور اسے دین کی باتیں سکھائیں گے اور یہ آگے اپنی اولاد کو سکھائے گی اسے پادریوں اور مجاوروں کے سپرد کر دیا۔ ورنہ ان کی خواہش تھی کہ یہ لڑکی شادی کرے اور اس کے بچے پیدا ہوں کیونکہ وہ اس کے لئے اور پھر اس کی اولاد کے لئے بھی دعا کرتی ہیں کہ وہ شیطان سے محفوظ رہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی شادی کرے اور اس کے بچے ہوں۔

خدا تعالیٰ نے ماں کی دعا سنی اور مریم پر خاص فضل کیا۔ وہ زکریاہ کاہن کی تربیت میں پلی اور دوسرے کاہنوں کی نگرانی میں رہی اور اس کے دل میں دین کی محبت پیدا ہوئی۔ چنانچہ بچپن ہی میں وہ اس یقین پر پہنچی کہ جو کچھ ملتا ہے خدا سے ملتا ہے۔ اس کے ایک ایسے ہی جواب سے زکریا متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے لئے بھی لڑکے کی دعا کی جس سے یحییٰ پیدا ہوئے اور اس طرح عیسیٰ کی ماں عیسیٰ کے ارہاص والے نبی کے پیدا کرنے میں ممد ہوئی اور اپنے بیٹے کی سخت سے سخت مشکل کے حل کرنے والی بن گئی۔ کہ ایلیاہ نبی کی آمد کے بغیر اس کا دعویٰ ثابت نہ ہو سکتا تھا سو یحییٰ ایلیاہ کا مثیل بنا اور عیسیٰ کی ماں کی ایک معصوم حرکت سے اس کا وجود ظہور میں آیا۔

مریم کی بعد کی زندگی کے حالات انجیل میں یہ لکھے ہیں کہ حمل کے بعد یوسف اسے گھر لے گیا (متی باب ۱ آیت ۲۴)۔

شادی کا کوئی ذکر نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہود میں منگنی شادی ہی سمجھی جاتی تھی اور حضرت مسیحؑ پیدا ہوئے ان کی پیدائش تک یوسف نے مریم سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ان کی پیدائش کے بعد وہ ان کے پاس گیا۔اور دوسرے بچے پیدا ہوئے۔(انجیل متی باب ۱ آیت ۲۵)

پھر لکھا ہے۔

''یسوع بچپن سے اپنے ماں باپ سے نفور تھا اور جب اس نے دعویٰ کیا مریم اس پر ایمان نہیں لائی بلکہ اس کی باتوں کو تعجب سے دیکھتی رہی''۔

متی باب ۱۲ آیت ۴۶ تا ۵۰ میں لکھا ہے۔

''جب وہ جماعتوں سے یہ کہہ رہا تھا دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے اس سے بات کیا چاہتے تھے۔تب کسی نے اس سے کہا کہ دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے تجھ سے بات کیا چاہتے ہیں۔ پر اس نے جواب میں خبر دینے والے سے کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی اور اپنا ہاتھ اپنے شاگردوں کی طرف بڑھا کر کہا کہ دیکھو میری ماں اور میرے بھائی کیونکہ جو کوئی میرے باپ کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے میرا بھائی اور بہن اور ماں وہی ہے۔''

اس سے پتہ لگا کہ مسیح نے اپنے بھائیوں اور اپنی ماں کو مومن نہیں قرار دیا۔کیونکہ انہوں نے یہ کہا کہ ''جو کوئی میرے باپ کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے میرا بھائی اور بہن اور ماں وہی ہے'' یعنی یہ خدا کی مرضی پر چلنے والے نہیں۔

پس انجیل کی رو سے حضرت مریم منکرہ اور کافرہ تھیں۔انہوں نے مسیح کی باتوں کو نہیں مانا۔مرقس باب ۳ آیت ۳۱ تا ۳۵ اور لوقا باب ۸ آیت ۲۰ میں بھی یہی مضمون ہے۔اور یوحنا تو اس واقعہ پر بالکل خاموش ہے۔

متی میں پھر اور وضاحت سے لکھا ہے کہ لوگوں نے کہا کہ کیا یسوع کی ماں اور بھائی اور سب بہنیں ہمارے ساتھ نہیں۔یعنی لوگوں نے کہا کہ اگر یہ سچا ہے تو اس کی ماں ہمارے ساتھ کیوں ہے۔اس کے بھائی ہمارے ساتھ کیوں ہیں۔اس کی بہنیں ہمارے ساتھ کیوں ہیں۔وہ اس پر کیوں ایمان نہیں لائے۔گویا متی صاف طور پر اقرار کرتا ہے کہ مسیح پر نہ مریم ایمان لائی تھیں نہ مسیح کی بہنیں ایمان لائی تھیں نہ مسیح کے بھائی ایمان لائے تھے۔اور یہود کہا کرتے تھے کہ یسوع کے سب بھائی اور بہنیں اور اس کی والدہ ہمارے ساتھ ہیں۔اگر یہ سچا ہے تو چاہیے تھا کہ وہ اس پر ایمان لاتے۔جس پر مسیح نے کہا کہ

’’نبی اپنے وطن اور گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہے۔‘‘ (متی باب ۱۳ آیت ۵۵ تا ۵۷)

یعنی میں اپنے وطن میں بھی بے عزت ہوں اور اپنے گھر میں بھی بے عزت ہوں۔ مگر میری یہ بے عزتی اس بات کی دلیل نہیں کہ میں جھوٹا ہوں کیونکہ نبیوں کے گھر والے ہمیشہ ان کے مخالف ہوا کرتے ہیں۔

پھر یہیں تک بس نہیں۔ مرقس باب ۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح کے عزیز اور رشتہ دار اسے پاگل سمجھا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

’’جب اس کے عزیزوں نے یہ سنا تو اسے پکڑنے کو نکلے کیونکہ کہتے تھے وہ بے خود ہے۔‘‘

(انجیل مرقس باب ۳ آیت ۲۱)

گویا بجائے اس کے کہ وہ اس پر ایمان لاتے وہ اسے دیوانہ اور مجنون سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اسے پکڑ کر رکھیں تا کہ وہ ادھر اُدھر نہ پھرے۔

ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ انجیل کے نزدیک مریم اور ان کی دوسری اولاد اور یوسف جو باپ کہلاتا تھا مسیحؑ پر ایمان نہیں لائے اور مسیحؑ ان سے تُرش روئی سے پیش آتا تھا۔ حتیٰ کہ بائبل کے رو سے عین صلیب کے وقت بھی مسیحؑ نے اپنی ماں کی طرف توجہ نہیں کی۔ ماں کے دل میں درد تھا اور وہ صلیب کے وقت وہاں پہنچی۔ مگر بائبل بتاتی ہے کہ اس وقت بھی مسیحؑ نے اپنی ماں سے محبت کے ساتھ بات نہیں کی۔ بلکہ اسے جب کھڑا دیکھا تو تھوما سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ تیری ماں ہے اور مریم سے کہا اے عورت یہ ہے تیرا بیٹا۔ (انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۲۶ و ۲۷) گویا اس وقت بھی انجیل کی رو سے مسیح کے دل میں مریم کی نسبت اتنا بغض تھا کہ بجائے یہ کہنے کے کہ اے ماں یا اے مریم مسیح نے اس وقت بھی یہ کہا کہ اے عورت یہ ہے تیرا بیٹا۔ اس طرح انہوں نے اپنا اخلاقی فرض تو ادا کر دیا اور ماں کو اس کا ٹھکانہ بتا دیا اور تھوما سے بھی کہہ دیا کہ اس کی اپنی ماں کی طرح خدمت کرنا لیکن اس وقت بھی ان کے جذبات انجیل کی رو سے اتنے زخمی تھے کہ بجائے اس کے کہ ایسے خطرناک موقعہ پر جبکہ انہیں صلیب پر لٹکایا جا رہا تھا وہ اپنی محبت کا اظہار کرتے۔ انہوں نے اس وقت بھی ماں کا لفظ نہیں بولا بلکہ اسے اے عورت کہہ کر مخاطب کیا۔

پھر انجیل کے بیان کے مطابق اس کی اپنی ماں سے بے رخی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ ایک دفعہ ایک عورت نے اس کے لیکچر سے متاثر ہو کر کہا کہ

’’مبارک ہے وہ پیٹ جس میں تُو رہا اور وہ چھاتیاں جو تُو نے چوسیں۔‘‘

یعنی کیا ہی وہ اچھی عورت تھی جس کے پیٹ میں تُو رہا۔ اور کیا ہی وہ اچھی عورت تھی جس کی چھاتیوں سے تو نے

دودھ پیا۔ اب کم از کم اس موقعہ پر ہی مسیح اس عورت کی تعریف کو پی جاتے اور کچھ نہ کہتے۔ مگر مسیح سے اتنی بات بھی برداشت نہ ہوسکی اور انہوں نے کہا

''ہاں مبارک ہیں وہ جو خدا کا کلام سنتے ہیں اور اسے مانتے ہیں۔''

(انجیل لوقا باب ۱۱ آیت ۲۷و۲۸)

یعنی وہ ماں کوئی مبارک نہیں جس کے پیٹ میں رہا۔ وہ ماں کوئی مبارک نہیں جس کی چھاتیوں سے میں نے دودھ پیا۔ بلکہ مبارک وہ ہیں جو خدا کا کلام سنتے اور اسے مانتے ہیں جس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ مریم نے نہ خدا کا کلام سنا اور نہ اسے مانا۔ غرض دوسرے کے منہ سے بھی وہ ان کی تعریف نہیں سن سکتے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کے دشمن جانی تھے اور وہ انہیں مومن نہیں سمجھتے تھے۔

لیکن قرآن خود مسیحؑ کے منہ سے کہلواتا ہے کہ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ (مریم:۳۲) میں تو اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار ہوں۔ میں اس سے بڑی محبت اور پیار کرنے والا ہوں۔ اب خود ہی دیکھ لو کہ ان دونوں میں سے کونسی تاریخ سچی ہو گی۔ ایک طرف بائبل کہتی ہے کہ فرشتہ نے مریم سے کہا کہ

''خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہوگی اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اس کا نام یسوع رکھنا وہ بزرگ ہوگا خدا تعالیٰ کا بیٹا کہلائے گا۔'' (انجیل لوقا باب ۱ آیت ۳۰و۳۱)

مگر باوجود اس کے کہ فرشتہ اسے ایک ایسی خبر دے گیا تھا جو ظاہری حالات کے لحاظ سے قطعی طور پر ناممکن نظر آتی تھی۔ اور پھر خدا نے اس ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیا پھر بھی یہ عظیم الشان نشان دیکھنے کے باوجود وہ بائبل کے مطابق مسیح کو پاگل سمجھتی رہی اور اس پر ایمان نہ لائی۔ یوں اگر کسی کو بچہ کے متعلق خواب آجائے اور پھر اس کے ہاں بچہ پیدا بھی ہوجائے تو بے شک یہ ایک نشان تو ہوگا مگر اتنا بڑا نہیں ہوگا جتنا یہ معجزہ تھا۔ اگر کسی عورت کو ایسی خواب آ جائے اور پھر اس کے ہاں بچہ پیدا ہوجائے اور وہ نیک بھی بن جائے تب بھی ممکن ہے کہ ماں کسی وقت ناراض ہوکر اسے کہہ دے کہ تو نے میرا کوئی حق ادا نہیں کیا۔ لیکن یہاں کوئی معمولی نشان نہیں دکھایا جاتا۔ یہاں ایک کنواری حاملہ ہوتی ہے۔ فرشتہ اس کے پاس آتا ہے اور اسے خبر دیتا ہے کہ تیرے ہاں بچہ ہوگا اور وہ اپنے اندر یہ یہ صفات رکھے گا۔ اور پھر واقعہ میں اسے حمل ہوجاتا ہے اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ دنیا میں غیر معمولی عزت اور شہرت حاصل کرتا ہے۔ کیا دنیا کی کوئی بھی عقل تسلیم کرسکتی ہے کہ اتنے عظیم الشان واقعہ کے بعد بھی وہ عورت اپنے بچہ کو پاگل کہے گی یا اس کے دعویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کردے گی۔ جس نے خدا تعالیٰ کی قدرت کا اتنا عظیم الشان

نشان دیکھا ہو اس کے لئے تو انکار کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی پس انجیل کا یہ بیان کہ وہ اپنی ماں کا نافرمان تھا عقلی لحاظ سے بھی بالکل ناقابل تسلیم ہے۔مگر قرآن خود مسیح کی زبان سے یہ کہلواتا ہے کہ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ میں تو اپنی والدہ سے نہایت ہی حسن سلوک کرنے والا ہوں۔

پھر بائبل کہتی ہے کہ مریم کافرہ تھی مگر قرآن کہتا ہے کہ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا (آل عمران:۳۸) یعنی خدا نے مریم کی والدہ کی دعا کو قبول فرمایا اور وہ نیکیوں پر پختہ ہوگئی اور خدا تعالیٰ نے اسے غیر معمولی ترقی اور عظمت بخشی۔پس قرآن اسے مومن اور اعلیٰ درجہ کی نیکیوں کی حامل قرار دیتا ہے لیکن انجیل جو اسے خدا کی ماں قرار دیتی ہے وہ اسے کافرہ اور بے ایمان ٹھہراتی ہے۔

پھر فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران:۴۳) یعنی اے مریم اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگ بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تجھے پاک کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تجھے اس زمانہ کی ساری عورتوں پر فضیلت بخشی ہے غرض قرآن وہ بات کہتا ہے جو فطرت کہتی ہے اور انجیل وہ بات کہتی ہے جس کا فطرت انکار کرتی ہے۔اتنے بڑے نشان کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ مریم انکار کرے۔پس صحیح بات وہی ہے جس کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ دشمن کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو واقعات کا صحیح علم نہیں تھا انہوں نے غلط باتیں اس میں درج کر دیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں اے احمقو! تم صحیح لکھنے والوں کو اس قرآن کے سامنے لاؤ۔وہ جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ اسے پتہ نہیں تا وہ تو سچی باتیں بتاتا ہے اور جن کے متعلق تم کہتے ہو کہ انہیں سب کچھ پتہ تھا وہ جھوٹی باتیں بتاتے ہیں۔کیا یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا عظیم الشان ثبوت نہیں؟

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اِصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ انجیل میں کئی مریموں کا نام آتا ہے جن کی نیکی اور تقدس کی بڑی تعریف کی گئی ہے لیکن وہ مریم جو ماں تھی مسیح کی اسی کو عیسائیوں نے مسیح کا دشمن اور مخالف ظاہر کیا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم مریم مگدلینی اور دوسری عورتوں کو امّ عیسیٰ پر فضیلت دیتے ہو۔ حالانکہ تم جن مریموں کو لئے بیٹھے ہو وہ اس مریم کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی تھیں۔سب سے بہتر اور سب سے مقدس وہی مریم تھی جو عیسیٰ کی ماں تھی۔

پھر فرماتا ہے يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (آل عمران:۴۴)

رَاكِعٌ اس شخص کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایمان خالص عطا کر دیا جائے۔پس يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کے یہ معنے ہیں کہ اے مریم اپنے رب کی فرمانبردار رہو۔اس کی عبادت بجا

لاؤ اور باقی مومنوں کے ساتھ مل کر اس کی جماعت میں شامل رہو۔ گویا قرآن صاف طور پر اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ مریم اول درجہ کے ایمانداروں میں سے تھیں۔ مگر انجیل کہتی ہے کہ وہ بدعورتیں جو مسیح کے سر پر تیل ملا کرتی تھیں وہ تو باایمان تھیں اور جس نے اتنا بڑا معجزہ دیکھا وہ بے ایمان تھی۔

اب بظاہر یہ سب عام باتیں ہیں کوئی مخفی اور غیب کی باتیں نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس امر کا ذکر کرنے کے بعد کہ مریم خدا تعالیٰ کی فرمانبردار اور نماز گزار اور مومنوں کی جماعت میں شامل تھی فرماتا ہے ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ (آل عمران:۴۵) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تیری طرف وحی کے ذریعہ نازل کر رہے ہیں۔ یعنی یہ باتیں تمہیں بظاہر معمولی نظر آتی ہیں۔ لیکن انجیل ان باتوں کو کھا گئی ہے اور اس لئے اب یہ غیب کی خبریں بن گئی ہیں۔ انجیل میں لکھا ہے کہ مریم کافرہ تھی۔ انجیل میں لکھا ہے کہ وہ مسیح کو پاگل سمجھتی تھی۔ مگر ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ سب باتیں غلط ہیں۔ وہ ایماندار تھی، وہ فرمانبردار تھی اور وہ مسیح پر سچے دل سے ایمان لانے والوں میں شامل تھی۔ وہیری کہتا ہے کہ قرآن کو پتہ نہیں کہ صحیح واقعات کیا ہیں (تفسیر وہیری) اور قرآن کہتا ہے کہ ہم تمہیں وہ تاریخ بتا رہے ہیں جو بائیبل میں بھی درج نہیں۔ یہ کتنا عظیم الشان نشان ہے قرآن کی صداقت کا۔ کہ بائبل جو عیسائیوں کی کتاب ہے اور جس میں مسیح اور اس کی والدہ کے متعلق سچی باتیں ہونی چاہئیں تھیں وہ تو غلط باتیں لکھتی ہے اور قرآن ان کے متعلق سچی تاریخ پیش کرتا ہے۔ فرماتا ہے ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ۔ یہ باتیں انجیل میں نہیں لکھیں۔ یہ عیسائیوں نے چھپا دی تھیں اب ہم تم کو بتا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے بغیر مسیح کی کہانی پوری نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انجیل کا بیان بتاتا ہے کہ اپنے قرب کو ظاہر کرنے کے لئے حواریوں نے خدا کی ماں پر الزام لگانے سے دریغ نہیں کیا۔ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم متیؔ اور مرقسؔ اور لوقاؔ اور یوحناؔ اور تھوماؔ بڑے مقرب تھے مسیح کی والدہ پر انہوں نے انتہائی ظلم کیا کہ اسے کافرہ اور بے ایمان قرار دے دیا۔ لیکن قرآن نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا اور بتا دیا کہ مریم مومنہ تھی، مریم راستباز تھی اور انجیل میں جو باتیں ان کے خلاف لکھی ہیں وہ سراسر جھوٹی اور مفتریانہ ہیں۔

وہیری نے الزام لگایا تھا کہ قرآن جھوٹا ہے لیکن قرآن نے تیرہ سو سال پہلے بتا دیا تھا کہ ہم اس میں وہ باتیں بیان کر رہے ہیں جو انجیل میں بھی نہیں یا یہ کہ انجیل نے ان کے متعلق جھوٹ بولا ہے۔ اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ قرآن سچا ہے اور انجیل جھوٹی۔

اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا حضرت مریم کا وطن جیسا کہ بائبل سے ثابت ہوتا ہے ناصرہ تھا ان کا بھی

اوران کے خاوند یوسف کا بھی لیکن چونکہ عبادت گاہ یروشلم تھی قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے (بائبل سے نہیں) کہ بچپن میں ان کو دینی تعلیم وتربیت کے لئے یوروشلم میں حضرت زکریاؑ کے پاس چھوڑا گیا تھا مگر جیسا کہ قرآن کریم سے ہی پتہ چلتا ہے حضرت مریم کی والدہ کا یہ منشاء نہیں تھا کہ وہ کاہن یا نن بنیں۔ اس لئے انہوں نے ہمیشہ وہاں نہیں رہنا تھا۔ چنانچہ حضرت مریم کے متعلق انہوں نے دعا کی تھی کہ الٰہی اس کی اولاد بھی پیدا ہو جو نیکی اور تقویٰ پر قائم رہنے والی ہو۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں پس جب وہ جوان ہوئیں اور بالغ ہو گئیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی والدہ انہیں ناصرہ اپنے وطن لے گئیں۔ پس اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا سے یروشلم اوراس میں رہنے والے مراد نہیں۔ بلکہ اس سے ان کے وہی اہل مراد لئے جائیں گے جو کہ ناصرہ میں تھے۔ ان سے وہ ایک طرف ہو کر مکان شرقی میں چلی گئیں۔

یہ شرقی مکان کیا تھا؟ مفسرین کہتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ نظارہ دیکھا تو وہ کسی مشرقی شہر کی طرف گئی تھیں۔ انجیل کہتی ہے کہ وہ ناصرہ میں تھیں جوان کا اوران کے خاوند کا وطن تھا (انجیل لوقا باب ۱ آیت ۲۶، ۲۷) اور ناصرہ یوروشلم سے شمال کی طرف ہے نہ کہ مشرق کی طرف۔ پس یہ معنے نہیں لئے جاسکتے کہ حضرت مریم اس وقت یروشلم سے ناصرہ کو چلی گئیں بلکہ اس جگہ ناصرہ کی رہائش کے زمانہ کا کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ بہرحال جہاں تک بائبل کی تاریخ کا سوال ہے حضرت مریم مشرق کے مکان کی طرف نہیں گئیں بلکہ اپنے وطن میں رہیں اور یوروشلم کے لحاظ سے وہ شمال میں تھیں۔

بائبل کی تاریخ کوئی معتبر تاریخ تو ہے نہیں مگر بہرحال اس کے اپنے زمانہ کے متعلق باتیں بلا عقلی یا نقلی دلیلوں کے رد نہیں کی جاسکتیں کیونکہ وہ اس زمانہ کے قریب کی باتیں ہیں اور چونکہ شَرْقِيٌّ کے معنے عربی زبان میں ایسے مکان کے بھی ہوتے ہیں جس کا منہ مشرق کی طرف ہو اور مشرق کے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے مَكَانًا شَرْقِيًّا کے معنے ہوئے۔ مشرق کی جانب یا ایسے مکان میں جس کا منہ مشرق کی طرف تھا۔ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم قرآن کریم کی بناء پر بائبل کے بیان کو رد بھی نہیں کر سکتے اور آسانی سے یہ معنے کر سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسے مکان میں گئیں جس کا منہ مشرق کی طرف تھا۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ قرآن کریم میں تو اہم باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ آخر یہ کوئی قصہ کہانی کی کتاب تو ہے نہیں کہ غیر ضروری تفصیلات بھی بیان کی جائیں اور بتایا جائے کہ فلاں نے اس رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا اوراس کی پگڑی اس رنگ کی تھی۔ اس میں تو وہی باتیں بیان ہوتی ہیں جو اپنے اندر اہمیت رکھتی ہیں۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ وہ ایک مکان شرقی کی طرف گئیں۔ مکان شرقی کی کوئی خصوصیت ہونی چاہیے جس کا مریم کے واقعہ سے تعلق ہو۔ ورنہ یہ ایک بے معنی بات بن جائے گی۔

سو یاد رکھنا چاہیے کہ یہود کے نزدیک مشرق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سب سے اول تورات میں لکھا ہے کہ

''خداوند خدا نے عدن میں پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو جسے اس نے بنایا تھا وہاں رکھا۔'' (پیدائش باب ۲ آیت ۸)

پورب کے معنے مشرق کے ہوتے ہیں یعنی خدا نے عدن میں مشرقی جانب جنت بنائی اور اس میں آدم کو رکھا گیا۔ پس بائبل کے نزدیک جنت و انسانی ابتداء کا تعلق مشرق سے ہے۔

بابلی لوگ جہاں یہودی قید ہو کر گئے تھے اور جن کے خیالات اور روایات سے وہ بہت ہی متاثر تھے وہ بھی مشرق کو بہت متبرک خیال کرتے تھے وہ مشرق کو روشنی کا دروازہ سمجھتے تھے اور طوفان نوح سے بچانے والا جو ہیرو تھا (اسے تم لیڈر کہہ لو یا پیغمبر کہو) ان کا عقیدہ تھا کہ وہ مشرق کا باشندہ تھا لیکن مغرب کی نسبت ان کا خیال تھا کہ وہ مردوں کی دنیا ہے۔ غرض بابلی لوگ مشرق کو روشنی کا دروازہ اور مغرب کو مردوں کی دنیا خیال کرتے تھے اور طوفان نوح سے بچانے والے بطل کو وہ مشرق کا باشندہ سمجھتے تھے۔

حزقیل نبی بھی چونکہ اسی علاقہ میں رہے اس لئے وہ بھی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

''روح مجھ کو اٹھا کے خداوند کے گھر کے پوربی دروازہ پر جس کا رخ پورب کی طرف ہے لے گئی۔'' (حزقیل باب ۱۱ آیت ۱)

یعنی جو ہیکل بنی ہوئی تھی اس کا دروازہ پورب کی طرف تھا معلوم ہوتا ہے اس خیال سے کہ مشرق کی طرف سے روشنی آتی ہے وہ ہیکلوں میں بھی اس امر کو مدنظر رکھتے تھے کہ ان کے دروازے مشرق کی طرف ہوں اور وہ اس کو برکت والا خیال کرتے تھے۔

متی باب ۲ آیت ۲ میں لکھا ہے کہ مجوسی آئے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے پورب میں اس کا ستارہ دیکھا اور اسے سجدہ کرنے کو آئے ہیں یعنی مسیح کی پیدائش پر انہوں نے مشرق میں ستارہ دیکھا اور انہوں نے سمجھا کہ وہ جس کے آنے کی صحیفوں میں خبر تھی پیدا ہو گیا ہے۔ گنتی باب ۲۴ آیت ۱۷ میں ہے۔

''یعقوب میں سے ایک ستارہ نکلے گا۔''

اس میں ایک نبی کی خبر دی گئی تھی اور روایات اسے مشرق کی طرف بتاتی تھیں۔ پس چونکہ پہلی کتابوں میں

ایک ستارہ کے نکلنے کی خبر تھی اور یہودی روایات میں یہ بات پائی جاتی تھی کہ وہ ستارہ مشرق سے نکلے گا۔اس لئے پورب سے جو لوگ آئے انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک ستارہ مشرق میں دیکھا ہے جس سے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نبی جس کے آنے کی پیشگوئی کی گئی تھی پیدا ہو گیا ہے۔

مکاشفات باب ۷ آیت ۲ میں لکھا ہے

''پھر میں نے ایک اور فرشتے کو پورب سے اٹھتے دیکھا جس کے پاس زندہ خدا کی مہر تھی۔''

مکاشفات بے شک مسیح کے بعد کی کتاب ہے لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہود اور نصاریٰ میں مشرق کا خاص احترام تھا اور وہ عبادت گاہوں کے دروازے مشرق کی طرف بناتے تھے بلکہ بعض مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت بھی کرتے تھے۔اس وجہ سے اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ مریم ایک عبادت گاہ میں جس کا منہ مشرق کی طرف تھا تا کہ جنت اولیٰ اور بشارت عظیمہ سامنے رہیں عبادت کے لئے گئیں۔

یادرکھنا چاہیے کہ عیسائیوں کے عبادت گاہ اور مسلمانوں کی عبادت گاہ میں فرق ہوتا ہے۔عیسائیوں کی عبادت گاہ میں جدھر امام کا منہ ہوتا ہے اسی طرف مقتدیوں کا منہ نہیں ہوتا بلکہ ان دونوں کے منہ آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو امام بھی قبلہ رو کھڑا ہوتا ہے اور مقتدیوں کا منہ بھی قبلہ رخ ہوتا ہے۔مگر ان میں عبادت گاہ کا دروازہ مشرق کی طرف ہوگا۔امام اور مقتدی سب اس دروازہ سے داخل ہوں گے مگر اندر داخل ہو کر امام اپنا منہ مشرق کی طرف کر لے گا اور مقتدی اپنا منہ مغرب کی طرف کر لیں گے یا یوں کہو کہ مقتدیوں کا منہ امام کی طرف ہوگا اور امام کا منہ مقتدیوں کی طرف ہوگا۔

غرض عیسائی اپنی عبادت گاہوں کا دروازہ مشرق کی طرف بناتے ہیں بلکہ بعض فرقوں کے متعلق یہ ثابت ہے کہ وہ عبادت بھی مشرق کی طرف ہی منہ کر کے کرتے ہیں۔ میں یہ تحقیق نہیں کر سکا کہ آیا سارے ایسا کرتے ہیں یا صرف بعض فرقے ایسا کرتے ہیں۔ بہر حال بعض فرقوں کے متعلق میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے ہیں۔پس مَكَانًا شَرْقِيًّا کے معنے یہ ہوئے کہ وہ مکان جس کا منہ مشرق کی طرف تھا۔معلوم ہوتا ہے جب حضرت مریم جوان ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں دعا کا جوش پیدا کیا اور وہ گھر سے نکلیں اور ایک عبادت گاہ میں گئیں وہ عبادت گاہ ایسی تھی جس کا منہ مشرق کی طرف تھا اس یادگار میں کہ جنت اور انسانی ابتداء کا تعلق مشرق سے ہے۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا

اور (اپنے اور) ان (یعنی رشتہ داروں) کے درمیان پردہ ڈال دیا (یعنی ان سے تعلق قطع کر کے اپنے آپ کو چھپا دیا)

فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۸﴾

اس وقت ہم نے اس کی طرف اپنا کلام لانے والا فرشتہ (یعنی جبرئیل) بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک تندرست بشر کی شکل میں ظاہر ہوا۔

حل لغات۔ رُوْحٌ کے معنے اس چیز کے ہیں جس سے حیات نفس قائم ہے اور روح کے معنے نبوت کے بھی ہیں اور روح کے معنے جبریل کے بھی ہیں اور روح کے معنے وحی کے بھی ہیں نبوت کو روح اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی انسان کو ایک نئی روحانی زندگی بخشتی ہے اور جبریل کو بھی اسی لئے روح کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کلام لاتا ہے جو زندگی بخش ہوتا ہے۔ اسی طرح وحی کو بھی اسی لئے روح کہتے ہیں کہ وہ ایمان کو تازہ کرتی ہے غرض یہ ساری چیزیں روح کہلاتی ہیں۔

تفسیر۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا کا یہ مطلب ہے کہ انہوں نے دعا میں خلوت کے حصول کے لئے پردہ کھینچ لیا۔ موجودہ زمانہ میں مکانوں کے اندر دروازے بنائے جاتے ہیں جو آسانی کے ساتھ بند کر لئے جاتے ہیں لیکن اس زمانہ میں دروازوں کا رواج نہیں تھا صرف پردے کھینچ لئے جاتے تھے بلکہ بنوعباس کے زمانہ تک شاہی محلات کے اندر دروازے نہیں ہوتے تھے۔ شاہان مغلیہ کی عمارتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تخلیہ کے لئے پردے ڈال لیا کرتے تھے۔ پس فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات کرنے کے لئے علیحدہ ہوئیں جس میں حجاب کی ضرورت تھی۔ بلکہ چونکہ وہ دعا اور عبادت کے لئے علیحدہ ہوئی تھی اور اس کے لئے تخلیہ کی ضرورت تھی انہوں نے پردہ کھینچ لیا تا کہ لوگ ان کو نہ دیکھیں اور وہ علیحدگی میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر سکیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام بھی عبادت گاہ میں تھے جب انہیں الہام ہوا۔ اسی طرح حضرت مریم بھی عبادت گاہ میں ہی تھیں جب انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت ملی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب وہ تخلیہ میں گئیں اور دعا میں مشغول ہو گئیں تو اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا ہم نے اپنا فرشتہ ان کی طرف بھیجا۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ اور وہ ان کے لئے ایک مثالی جسم بن گیا جیسے خواب میں اگر کوئی شخص دیکھے کہ اس نے بکرا ذبح کیا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ

اس کا کوئی بیٹا یا بیٹی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار فوت ہو جائے گا۔ یا خواب میں چوہا دیکھے تو اس سے مراد کوئی منافق ہو گا یا خواب میں دیکھے کہ میرے گھر میں چور آیا ہے تو اس سے مراد داماد ہو گا۔ اب تعبیر بظاہر بالکل بے جوڑ نظر آتی ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تصویری زبان میں یہ واقعات اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہاں بھی اسی مثالی وجود کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ فَتَمَثَّلَ لَهَا اس نے ان کے لئے ایک تمثیلی شکل اختیار کر لی۔ بَشَرًا سَوِيًّا ایک ایسے انسان کی صورت جو تندرست تھا۔ گویا اس وقت حضرت مریم پر جو کلام نازل ہوا ان الفاظ میں اس کی کیفیت بتائی گئی ہے کہ وہ کس رنگ میں نازل ہوا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا کبھی تو وہ گھنٹی کی آواز کی طرح نازل ہوتی ہے یعنی یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک گھنٹی بجی ہے اور اس کے بعد کلام الٰہی نازل ہونے لگتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی فرشتہ آتا ہے اور وہ مجھ سے بات کرتا ہے اور کبھی وہ کوئی دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے۔

یہاں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا کہ وہ وحی ایسی نہیں تھی جو مریم کے کان پر پڑی یا اس کی زبان پر جاری ہوئی۔ بلکہ وہ ایک خواب یا کشف کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ انہوں نے کشف میں دیکھا کہ ایک فرشتہ سامنے آیا ہے جو ایک تندرست انسان کی شکل میں ہے اور اس فرشتہ نے انہیں خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچایا ہے۔ درحقیقت اگر ہم گہرا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہی ہے جو نزول کے وقت مختلف شکلیں اختیار لیتا ہے اور کبھی وہ کسی شکل میں نازل ہو جاتا ہے اور کبھی کسی شکل میں۔ حضرت مریم پر جب کلام الٰہی نازل ہوا تو اس کلام نے اس وقت ایک انسان کی شکل اختیار کر لی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ جبریل تھا جو ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ حالانکہ اگر اسے جبریل کہو تب بھی حقیقت تو وہی ہے جو میں نے بتائی ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہی مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص خواب میں بینگن دیکھتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کلام نے بینگن کی شکل اختیار کر لی۔ یا اگر کوئی شخص فرشتہ دیکھتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کلام الٰہی نے اس وقت فرشتہ کی شکل اختیار کر لی۔ بہرحال خدا تعالیٰ کا کلام نزول کے وقت مختلف رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

میں ابھی چھوٹا بچہ تھا کہ میں نے رؤیا میں دیکھا کہ جس طرح کٹورہ بجائیں تو اس میں سے ٹن کی آواز نکلتی ہے۔ اسی طرح کسی نے کٹورہ بجایا ہے اور اس میں سے ٹن کی آواز پیدا ہوئی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ آواز پھیلنی شروع ہوئی اور پھیلتی چلی گئی۔ جس طرح دریا میں پتھر پھینکا جائے تو اس کے بعد پانی میں ایک دائرہ سا بن جاتا ہے جو پھیلتا چلا جاتا ہے اسی طرح وہ آواز جوّ میں پھیلنی شروع ہوئی اور آخر پھیلتے پھیلتے جوّ کے عین وسط میں ایک خالی

فریم پیدا ہو گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس فریم میں ایک تصویر بننی شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ اس تصویر نے انسان کی شکل اختیار کر لی۔ پھر یکدم اس میں حرکت پیدا ہوئی اور تصویر میں سے ایک آدمی کود کر نکلا۔ اور میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا میں خدا کا فرشتہ ہوں۔ مجھے خدا نے تمہارے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں تمہیں سورۂ فاتحہ کی تفسیر سکھاؤں میں نے کہا سکھاؤ۔ چنانچہ اس نے مجھے سورۂ فاتحہ کی تفسیر سکھانی شروع کر دی۔ جب وہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ تک پہنچا تو کہنے لگا کہ اب تک جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں اسی آیت تک لکھی گئی ہیں اگر تم کہو تو تمہیں اس سے آگے بھی سکھا دوں۔ میں نے کہا ہاں آگے بھی سکھاؤ۔ چنانچہ اس نے مجھے ساری سورۂ فاتحہ کی تفسیر سکھا دی۔

اب دیکھو اس رؤیا میں آوز پیدا ہوئی آواز فریم بن گئی۔ فریم میں تصویر ظاہر ہوئی اور تصویر آدمی کی شکل میں کود کر میرے سامنے آ گئی اور اس نے مجھ سے بات کی۔ پس یہ ساری چیزیں اسی رنگ میں ہوتی ہیں کہ کلام الٰہی مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ پس اس میں خاص بات کوئی نہیں جن لوگوں کو اس کوچہ کا علم نہیں وہ حیران ہوتے ہیں کہ نہ معلوم یہ کیا بات ہے مگر اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ اس کے قسم کے واقعات کثرت سے ہوتے رہتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت مریم سے پیش آیا اور کلام الٰہی ایک آدمی کی شکل بن کر ان کے سامنے آ گیا۔ اس سے حمل کی حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے صرف کُنْ فَیَکُوْنُ کا ایک نشان تھا نہ کہ کسی فرشتے یا روح کا ان کے اندر داخل ہو جانا۔

اس جگہ رُوْحَنَا کا جو لفظ آتا ہے اس سے مسیحی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا مریم کے اندر داخل ہو گیا تھا اور وہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن نے ان کے عقیدہ ابنیت کی تصدیق کر دی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ وہ ایک فرشتہ تھا جو ان کے سامنے متمثل ہوا مگر چونکہ اس جگہ رُوْحَنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے ''ہماری روح'' اس لئے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ جب خدا کہہ رہا ہے کہ ہماری روح نے ایک تمثل اختیار کیا تو اس کے صاف طور پر یہ معنے ہیں کہ خدا مریم کے اندر داخل ہو گیا تھا اور ان کا یہ عقیدہ کہ مسیح خدا یا خدا کا بیٹا تھا درست ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ لوقا باب ۱ آیت ۳۵ میں ہے کہ فرشتہ نے حضرت مریم سے کہا کہ

''روح القدس تجھ پر نازل ہوگا۔''

جب فرشتہ نے مریم سے یہ کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا اور قرآن کہتا ہے کہ خدا مریم کے اندر داخل ہو گیا تو یہ انجیل کی تصدیق نہ ہوئی بلکہ تردید ہوئی کیونکہ انجیل تو یہ مانتی ہی نہیں کہ خدا اس کے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ

صرف اتنا کہتی ہے کہ روح القدس اس پر نازل ہوا تھا۔

پھر متی باب ۱ آیت ۱۸ میں ہے

’’وہ روح القدس سے حاملہ پائی گئی۔‘‘

یہاں معاملہ اور بھی مشتبہ ہو گیا کیونکہ متی کے الفاظ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف القدس اس پر نازل ہی نہیں ہوا بلکہ روح القدس اس کے اندر داخل ہو گیا۔

اسی طرح متی باب ۱ آیت ۲۰ میں ہے

’’جو اس کے رحم میں ہے سو روح القدس سے ہے۔‘‘

اس میں روح القدس سے حاملہ ہونے کی تشریح کر دی کہ جو اس کے رحم میں ہے سو روح القدس سے ہے یعنی اس کے نطفہ سے ہے۔ یہاں اور بھی مشکل پیش آ گئی۔ کیونکہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا مریم کے اندر داخل ہوا تھا یا روح القدس مریم کے پیٹ میں داخل ہوا تھا۔ کیونکہ متی یہ بتاتا ہے کہ روح القدس مریم سے ملا اور اس کے نطفہ سے آگے مسیح پیدا ہوا پس عیسائیوں کا یہ خیال کہ قرآن نے انجیل کی تصدیق کر دی ہے بالکل غلط ہے اوّل تو قرآن کہتا ہے کہ روح نے متمثل ہو کر اسے خبر دی یہ نہیں کہتا کہ روح اس کے اندر چلی گئی اور انجیل خدا کی جگہ روح القدس کا حمل بتاتی ہے۔ گویا دونوں باتیں مسیحی عقیدہ کے خلاف ہیں۔ مسیحی عقیدہ جو مشہور ہے وہ یہ ہے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے اور قرآن یہ نہیں کہتا۔ اور انجیل کا مطلب یا تو یہ ہے کہ وہ روح القدس کا فرزند تھا یا یہ کہ خدا روح القدس تھا اور یہ دونوں باتیں مسیحی عقیدہ کے خلاف ہیں۔ قرآن صرف اتنا بتاتا ہے کہ ایک فرشتہ ان کے سامنے متمثل ہوا اور اس نے انہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک بیٹے کی خبر دی۔ پس رُوْحَنَا سے عیسائیوں کا یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن انجیل کا مصدق ہے بالکل غلط ہے۔

قَالَتْ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝۱۹

(مریم نے اس سے) کہا میں تجھ سے رحمٰن (خدا) کی پناہ مانگتی ہوں اگر تیرے اندر کچھ بھی تقویٰ ہے

تفسیر۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کی طرف رحمٰن کا لفظ منسوب کیا ہے اور یقیناً خدا تعالیٰ کی بات ہی درست ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ عیسائیت خدا تعالیٰ کی رحمانیت ہی کی منکر ہے اور عیسائیت کی بنیاد ہی اس

امر پر ہے کہ خدا رحمٰن نہیں۔ اگر وہ رحمٰن ہے تو پھر وہ گناہ بھی بخش سکتا ہے لیکن عیسائیت کہتی ہے کہ وہ کسی کو بخش نہیں سکتا کیونکہ یہ اس کے عدل کے خلاف ہے گویا جو کام اس دنیا میں ہر انسان کرتا ہے اور جس کام کے کرنے پر انسان کی تعریف کی جاتی ہے نہ کہ مذمت وہ خدا نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا رحم تقاضا کرتا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو بخشے۔ پس اس نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا اور وہ لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں پھانسی پر لٹک گیا۔ اب چونکہ تمام گناہ خود اس نے اٹھا لئے ہیں اور وہ لوگوں کے گناہوں کے بدلہ میں کفارہ ہو گیا اس لئے لوگوں کو کسی اور عمل کی ضرورت نہیں وہ مسیحؑ پر ایمان لانے کے نتیجہ میں ہی نجات پا جائیں گے۔ غرض عیسائیت کی ساری بنیاد ہی اس امر پر ہے کہ خدا رحمٰن نہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ حضرت مریم نے جب یہ نظارہ دیکھا تو انہوں نے کہا اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۔ اگر تو تقی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں رحمٰن کے معنے ہیں وہ ہستی ہے جو بغیر کسی عمل کے انسان کو اپنی نعمتوں سے متمتع فرماتی ہے۔

یہ ایک رؤیا کا نظارہ تھا جو حضرت مریم نے دیکھا۔ اور رؤیا میں جب انسان کوئی خطرہ کی بات دیکھتا ہے۔ تو جس طرح مادی دنیا میں وہ گھبراتا ہے اسی طرح خواب میں بھی گھبراتا ہے۔ مثلاً اگر تم رؤیا میں دیکھو کہ تم اوپر سے گرنے لگے ہو تو تم ڈرو گے۔ اگر تم دیکھو کہ تم ڈوبنے لگے ہو تو تم گھبراؤ گے۔ اسی طرح خواب میں اگر کوئی دیکھے کہ وہ مرنے لگا ہے تو وہ خوش نہیں ہو گا۔ بلکہ غمزدہ ہو گا۔ پس بے شک یہ ایک کشفی نظارہ تھا جو انہوں نے دیکھا۔ لیکن ظاہر میں جو بات ناپسندیدہ ہو وہ اگر کشف میں پیش آئے تو انسان ناپسندیدگی کا ہی اظہار کرے گا۔ اسی وجہ سے حضرت مریم نے جب فرشتہ کو انسانی صورت میں اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو وہ گھبرا گئیں اور انہوں نے کہا کہ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۔ ان الفاظ میں ان کے قلب کی کیفیت بیان کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت مریم اس نظارہ کو دیکھ کر اس قدر گھبرائیں کہ انہوں نے اس سے کہا کہ اگر تجھ میں تقویٰ پایا جاتا ہے۔ تو میں خدائے رحمٰن سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے تیرے شر سے بچا لے۔ رحمٰن کے معنے ہیں وہ ہستی جو بے محنت اور کوشش کے اپنا فضل نازل کرتی ہے۔ گویا وہ اس قدر گھبرا گئیں کہ انہوں نے کہا خدایا تو میرے عمل کو نہ دیکھ کہ میں نے تیری رضاء کے لئے کچھ کیا ہے یا نہیں میں تجھے رحمانیت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تو مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھ۔ اگر اس میں رحیمیت کا واسطہ ہوتا تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ خدایا کچھ عمل میں نے بھی کئے ہوئے ہیں ان کی جزاء کے طور پر میں تجھ سے درخواست کرتی ہوں کہ مجھ پر رحم فرما لیکن وہ رحیمیت کا واسطہ نہیں دیتیں۔ وہ اپنے انتہائی درد اور کرب کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئی رحمانیت کا واسطہ دیتی ہیں اور کہتی ہیں خدایا میرا کوئی عمل نہیں مجھ بے عمل پر ہی

رحم کر دے اور یہ کرب و بلا کا وقت مجھ سے دور فرما دے۔

ان الفاظ میں اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ جب انسان انتہائی مشکلات میں مبتلا ہو اور کرب و بلا نے اسے گھیرا ہوا ہو تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے اسی طرح دعا کیا کرے کہ خدایا میرا کوئی عمل نہیں۔ لیکن میں بے عمل ہوتے ہوئے بھی تیری رحمانیت کا تجھے واسطہ دیتا ہوں اور تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو مجھ پر اپنا فضل نازل فرما۔

اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا انہوں نے اس لئے کہا کہ خدا کا واسطہ دینا بھی اسی شخص پر کچھ اثر ڈال سکتا ہے جس میں خدا کا ڈر اور خوف پایا جائے ورنہ قاتل جب قتل کرتے ہیں تو لوگ انہیں بار بار خدا کا واسطہ دیتے ہیں مگر ان کے دلوں میں ذرا بھی رحم پیدا نہیں ہوتا۔ آج کل ہماری مخالفت میں بھی لوگوں کا یہی حال ہے۔ انہیں خدا کا لاکھ دفعہ خوف دلایا جائے ان کو خدا کا خوف آتا ہی نہیں۔ حضرت مریم بھی جانتی تھیں کہ اگر یہ نیک نہیں تو اس کے سامنے خدا کا نام لینا بیکار ہے بلکہ ادب کے بھی خلاف ہے پس انہوں نے کہا کہ میں خدا کا واسطہ تو تجھے دیتی ہوں مگر ایسی شرط کے ساتھ کہ تو نیک ہو۔ اگر تو نیک نہیں تو پھر میں خدا سے کہوں گی کہ وہ آپ میری حفاظت کرے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝۲۰

(اس پر اس فرشتہ نے) کہا میں تو صرف تیرے رب کا بھیجا ہوا پیغامبر ہوں۔ تا کہ میں تجھے (وحی کے مطابق) ایک پاک لڑکا دوں (جو جوانی کی عمر تک پہنچا گا)

حل لغات۔ غُلَامٌ غُلَامٌ کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بچہ، جوان اور ادھیڑ عمر والا تینوں کے لئے غلام کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور زَكِيًّا کا لفظ زکوٰۃ سے ہے اور اس کے معنے ایسے شخص کے ہیں جس میں اندرونی پاکیزگی پائی جاتی ہو۔

تفسیر۔ جب حضرت مریم نے کہا کہ اگر تم میں کچھ تقویٰ ہو اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہو تو رحمٰن کے نام سے پناہ مانگتی ہوں۔ تو فرشتہ نے کہا گھبراؤ نہیں میں تو تمہارے رب کی طرف سے ایک پیغامبر کے طور پر آیا ہوں لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا تا کہ میں تم کو ایک زکی غلام دوں۔

رَسُوْلٌ کا لفظ بتاتا ہے کہ بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ شخص درحقیقت حضرت مریم کا خاوند تھا یا خدا تعالیٰ کی طرف سے خاوند تجویز کیا گیا تھا یہ درست نہیں۔ کیونکہ وہ یہ نہیں کہتا کہ میں کوئی کام کرنے آیا ہوں۔ بلکہ

وہ یہ کہتا ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے صرف ایک پیغامبر کے طور پر بھجوایا گیا ہوں۔ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا۔ اَهَبَ کے متعلق بھی خیال ہوسکتا ہے کہ شاید اس کے معنے دینے کے ہوں اور مراد یہ ہو کہ وہ تعلقات رکھے لیکن یہ بھی درست نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ طریق ہے کہ جو چیز یقینی اور قطعی ہو۔ وہ ایسے الفاظ میں میں بیان کرتا ہے جن میں شبہ کی کوئی گنجائش نہ ہو مثلاً مستقبل کی خبر بیان کی جاتی ہے تو اسے ماضی کے صیغہ میں بیان کیا جاتا ہے یہ بتانے کے لئے کہ تم اس بات کو ایسا ہی سمجھو جیسا کہ یہ ہو چکی ہے۔ اسی طرح اس پیشگوئی پر زور دینے کے لئے کہ یہ پیشگوئی ضرور پوری ہوگی اس نے اَهَبَ کہا جس کے معنے یہ ہیں کہ میں دینے آیا ہوں۔ یعنی اس بات کو ایسا ہی سمجھو کہ گویا بیٹا مل گیا ہے۔ ورنہ سب جانتے ہیں کہ لڑکا خدا دیا کرتا ہے فرشتہ نہیں دیا کرتا۔ پس اَهَبَ لَكِ سے مراد صرف لڑکے کی خبر ہے نہ کہ لڑکا دینا۔ خدائی خبر چونکہ یقینی ہوتی ہے اس لئے اسے گویا چیز کے مل جانے کے برابر ظاہر کیا اور اس نے کہا کہ میں خدائی وحی کے مطابق تجھ کو ایک پاک لڑکا دینے آیا ہوں یعنی میں اس لئے آیا ہوں کہ تجھ کو ایک پاک لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر دوں اور یہ کشف قطعی اور یقینی ہے۔ اسے ایسا ہی سمجھو جیسا کہ لڑکا مل گیا ہے۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ

(مریم نے) کہا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا حالانکہ اب تک مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا اور میں کبھی بدکاری میں

وَّ لَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۱﴾

مبتلا نہیں ہوئی.

حل لغات۔ بَغِیٌّ کے معنے ہوتے ہیں جو تجاوز عن الاقتصاد کرے۔ یہ تجاوز اچھا بھی ہوسکتا ہے اور برا بھی۔ انسان عدل سے احسان کی طرف جائے گا تو اچھا ہوگا۔ اور حق سے باطل کی طرف تجاوز کرے گا تو برا ہوگا۔ اور بَغَتِ الْمَرْاَةُ کے معنے ہوتے ہیں فَجَرَتْ اس نے بدکاری کی لِتَجَاوُزِهَا اِلٰى مَا لَيْسَ لَهَا۔ کیونکہ جو حق تھا اس سے وہ آگے نکل گئی۔ (مفردات)

تفسیر۔ حضرت مریم بھی زکریا کی طرح تعجب کا اظہار کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ میرے ہاں بچہ کس طرح پیدا ہوسکتا ہے۔

اس جگہ غلام سے مراد بچہ ہی ہے بڑی عمر کا انسان مراد نہیں۔ یوں تو بڑی عمر کا آدمی بھی عربی زبان کے لحاظ سے غلام کہلاتا ہے لیکن یہ چونکہ مریم کا کلام ہے اور ان کے لئے حیرت کی بات بچہ پیدا ہونا ہی تھا اس لئے اس جگہ غلام کے معنے بچہ ہی کے لئے جائیں گے۔ بہرحال حضرت مریم کو تعجب پیدا ہوا کہ میرے ہاں کس طرح بچہ پیدا ہو سکتا ہے جبکہ مجھے نہ تو کسی مرد نے چھوا ہے اور نہ میں باغیہ ہوں۔

اگر حضرت مریم کے اس استعجاب کو ظاہری حالات محمول کیا جائے اور خواب میں بھی ان کے وہی حواس سمجھے جائیں جو جاگتے ہوئے ہوتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ چونکہ ظاہر میں ایسی بات ناممکن ہوتی ہے اس لئے رویا میں بھی انہوں نے وہی بات کہہ دی جو ظاہر میں کہی جاتی ہے۔ خواب میں دونوں قسم کی کیفیات انسان پر وارد ہوتی ہیں۔ کبھی صرف نظارہ اور کلام تاثیر رؤیا کے نیچے ہوتا ہے دلی جذبات تاثیر رؤیا کے نیچے نہیں ہوتے۔ کبھی انسان دیکھتا ہے کہ بیٹا مارا گیا ہے اور وہ بڑا خوش ہے۔ حالانکہ بیٹے کے مرنے پر انسان کو خوشی نہیں ہوسکتی وہ ضرور روتا اور غمزدہ ہوتا ہے۔ پس جب رؤیا میں وہ بیٹے کے مرنے پر خوش ہوتا ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ رؤیا میں اس کے جذبات بھی تاثیر رؤیا کے نیچے تھے۔ ورنہ بیٹے کے مارے جانے پر اسے رونا چاہیے تھا۔ اگر وہ خوش ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس کے قلب کی کیفیت بھی رؤیا کے ماتحت تھی۔ لیکن بعض دفعہ دیکھے گا کہ بیٹا مارا گیا ہے اور میں رو رہا ہوں۔ اب جہاں تک بیٹے کے مارے جانے کا سوال ہے۔ اس کی تعبیر تو یہ ہوگی کہ اس کا بیٹا نیک ہوگا اور دین کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے گا اور اس تعبیر پر اسے خوش ہونا چاہیے۔ مگر چونکہ اس نے دیکھا کہ وہ رو رہا ہے اس لئے ہم یہ کہیں گے کہ اس کا رونا رؤیا کی تعبیر کے نیچے نہ تھا بلکہ ظاہری کیفیات کے تابع تھا۔ غرض کبھی تاثیر قلبی رؤیا کے نظارہ کے ماتحت ہوتی ہے۔ اور کبھی رؤیا کے نظارہ کے ماتحت نہیں ہوتی۔ ایک شخص خواب میں گنّا دیکھتا ہے اور بڑا خوش ہوتا ہے۔ حالانکہ گنے کی تعبیر غم ہے۔ پس خواب میں اس کا خوش ہونا بتاتا ہے کہ اس وقت تعبیر اس پر اثر نہیں کر رہی تھی بلکہ ظاہری حالات اثر کر رہے تھے۔ چونکہ ظاہر میں انسان گنّا ملنے پر خوش ہوتا ہے اس لئے خواب میں بھی وہ خوش ہوگیا۔ اور اگر وہ گنّا ملنے پر رو رہا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اس وقت اس کے دل کی کیفیت بھی رؤیا کی تعبیر کے نیچے تھی۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس کو صرف علم تعبیر الرؤیا جاننے والے ہی سمجھ سکتے ہیں دوسرے لوگ نہیں۔ پس اگر اس قول سے حضرت مریم کی تعبیر ظاہری مراد لی جائے تو اس سے صرف اتنا نکلے گا کہ چونکہ ظاہر میں ایسی باتیں بری سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے جب اس نے یہ بات کہی تو حضرت مریم نے کہا۔ ہائے ہائے تم کیسی باتیں کر رہے ہو کبھی مردوں کے بغیر بھی بچہ پیدا ہوا ہے۔ اور اگر یہ الفاظ بھی تاثیر رؤیا کے ماتحت سمجھے جائیں تو اس

کے معنے یہ ہوں گے کہ چونکہ ان کو بلا مرد کے ایک بچہ کی ولادت کی خبر دی جا رہی تھی اس لئے وہ حیرت ظاہر کر رہی ہیں کہ کیا خدا مجھ سے یہ سلوک کرے گا۔

بہر حال اس آیت سے صاف ثابت ہے کہ حضرت مریم نے یہی سمجھا تھا۔ کہ بغیر شادی کے اور شادی سے پہلے اولاد ہوگی۔ کیونکہ لَمْ يَمْسَسْنِىْ بتاتا ہے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اولاد اس رؤیا کے دن بعد کے شادی سے پہلے ہوگی ورنہ ماضی کے ذکر کی نفی کے معنے کیا ہوئے۔

دوسرے لَمْ اَكُ بَغِيًّا بھی یہی بتاتا ہے۔ پہلا حصہ جائز تعلق کی نفی کرتا ہے اور دوسرا ناجائز تعلق کی۔ آئندہ شادی کے ہونے یا نہ ہونے کا وہ ذکر تک نہیں کرتیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے اس وقت یہ سوال نہیں تھا کہ مجھے وقف کیا ہوا ہے۔ اس لئے میرے ہاں اولاد نہیں ہوسکتی بلکہ اس وقت ان کے سامنے اپنی ماضی کی حالت تھی جس میں اولاد ناممکن تھی۔ اگر آئندہ تعلقات کے نتیجہ میں وہ اولاد کا وعدہ سمجھتیں تو وہ یا تو یہ کہتیں کہ میری تو شادی نہیں ہوسکتی پھر اولاد کیسی اور یا پھر شادی کا احتمال تھا وہ اس وعدہ پر تعجب نہ کرتیں۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً

(فرشتہ نے) کہا (بات) اسی طرح (ہے جس طرح تو نے کہی) (مگر) تیرے رب نے یہ کہا ہے کہ یہ (کام) مجھ پر

لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۲﴾

آسان ہے اور (ہم اس لئے یہ لڑکا پیدا کریں گے) تا کہ اسے لوگوں کے لئے ایک نشان بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت (کا موجب بھی) بنائیں اور یہ (امر) ہماری تقدیر میں طے ہو چکا ہے۔

حلّ لُغات۔ مَقْضِيًّا عربی زبان میں قضا اور قدر دو الگ الگ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مگر عام طور پر لوگ ان دونوں لفظوں کو ہم معنی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً یہ ہم معنے نہیں۔ مفردات میں لکھا ہے اَلْقَضَاءُ فَصْلُ الْاَمْرِ قَوْلًا كَانَ ذَالِكَ اَوْ فِعْلًا۔ قضاء کسی امر کے فیصلہ کرنے کا نام ہے خواہ وہ قولاً ہو یا فعلاً ہو وَ كُلٌّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا عَلٰى وَجْهَيْنِ اِلٰهِيٍّ وَ بَشَرِيٍّ اور یہ قضاء الٰہی بھی ہوتی ہے اور بشری بھی۔ یعنی کبھی خدا کے متعلق قضاء کا لفظ استعمال ہوجاتا ہے اور کبھی بشر کے متعلق قضاء کا لفظ استعمال ہوجاتا ہے۔ وَالْقَضَاءُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى اَخَصُّ مِنَ الْقَدَرِ لِاَنَّهُ الْفَصْلُ بَيْنَ التَّقْدِيْرِ فَالْقَدَرُ هُوَ التَّقْدِيْرُ وَالْقَضَاءُ هُوَ الْفَصْلُ وَالْقَطْعُ یعنی جب

قضاء الٰہی کا ذکر کیا جائے تو وہ قدر سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ کیونکہ قدر صرف ایک معیار یا سکیم کے تجویز کرنے کو کہتے ہیں۔ اور قضاء کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس سکیم کے جاری کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام تشریف لے گئے اور وہاں طاعون پڑ گئی۔ جو طاعونِ عمواس کے نام سے مشہور ہے اور حضرت ابوعبیدہؓ اور اسلامی لشکر نے آپ کا استقبال کیا تو اس وقت صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ چونکہ اس وقت علاقہ میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے اس لئے آپ کو واپس تشریف لے جانا چاہیے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے مشورہ کو قبول کر کے فیصلہ کر لیا کہ آپ واپس لوٹ جائیں گے۔ حضرت ابوعبیدہؓ ظاہر پر بڑا اصرار کرنے والے تھے انہیں جب اس فیصلہ کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اَتَفِرُّ مِنَ الْقَضَاءِ کیا آپ قضاء الٰہی سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا اَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰہِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰہِ میں اللہ تعالیٰ کی قضاء سے اس کی قدر کی طرف بھاگ رہا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فیصلہ ہے اور ایک عام فیصلہ۔ یہ دونوں فیصلے اسی کے ہیں کسی اور کے نہیں۔ پس میں اس کے فیصلہ سے بھاگ نہیں رہا بلکہ اس کے ایک فیصلہ سے اس کے دوسرے فیصلہ کی طرف جا رہا ہوں۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کو جب طاعون کی خبر ملی اور آپ نے مشورہ کے لئے لوگوں کو اکٹھا کیا تو آپ نے دریافت کہ شام میں تو پہلے بھی طاعون پڑا کرتی ہے پھر لوگ ایسے موقعہ پر کیا کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ جب طاعون پھیلتی ہے تو لوگ بھاگ کر ادھر ادھر چلے جاتے ہیں اور طاعون کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی مشورہ کی طرف آپ نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے ایک عام قانون بھی بنایا ہوا ہے کہ جو شخص طاعون کے مقام سے بھاگ کر ادھر ادھر کھلی ہوا میں چلا جائے وہ بچ جاتا ہے۔ پس جبکہ یہ قانون بھی خدا تعالیٰ کا ہی بنایا ہوا ہے۔ تو میں اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کر رہا۔ بلکہ اس کی قضاء سے قدر کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ یعنی خدا تعالیٰ کے خاص قانون کے مقابلہ میں اس کے عام قانون کی طرف جا رہا ہوں۔ پس تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں بھاگ رہا ہوں میں صرف ایک قانون سے اُس کے دوسرے قانون کی طرف جا رہا ہوں۔ پس حضرت عمرؓ نے بھی قضاء اور قدر میں فرق کیا ہے اور مفردات والے لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اس قول کا مفہوم یہی تھا۔ کہ اِنَّ الْقَدَرَ مَا لَمْ یَکُنْ قَضَاءً فَمَرْجُوٌّ اَنْ یَّدْفَعَهُ اللّٰہُ۔ یعنی جب تک قدر قضاء کا رنگ اختیار نہ کر لے اُس وقت تک امید ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ اُسے ٹلا دے۔ گویا آپ نے بتایا کہ چونکہ میں ابھی اس ملک میں داخل نہیں ہوا اور خدا تعالیٰ نے ایک دوسرا قانون بھی بنایا ہوا ہے کہ جو لوگ طاعون زدہ مقام سے اِدھر اُدھر بھاگ جاتے ہیں وہ بچ جاتے ہیں۔ اِس لیے میں اُسی کے ایک دوسرے قانون سے فائدہ اُٹھا رہا ہوں۔ فَاِذَا قَضٰی فَلَا مُدْفِعَ لَهٗ لیکن جب وہ فیصلہ کر دے تو پھر اُس کے فیصلہ سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

تفسیر ۔ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کے یہ معنی نہیں کہ اور لوگوں کے لئے تو یہ بات مشکل ہے اور میرے لئے آسان ہے کیونکہ انسان کے لئے تو یہ چیز قطعی طور پر ناممکن ہے۔ یہاں صرف خدا تعالیٰ کے پہلو کو ہی مدنظر رکھا گیا ہے متقابل بیان مدنظر نہیں اور مراد یہ ہے کہ جب میں کسی کام کا ارادہ کر لوں تو میرے لئے کوئی مشکل نہیں۔

وَ لِنَجۡعَلَہٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَةً مِّنَّا اس جگہ لام لامِ عاقبت ہے یعنی ہم ضرور ایسا کریں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ہماری ایک آیت ہو جائے گا اور لوگوں کے لئے رحمت بن جائے گا یعنی ہمارے اس فعل کے نتیجہ میں وہ لوگوں کے لئے ایک نشان بن جائے گا اور ہمارے اس فعل کے نتیجہ میں وہ لوگوں کے لئے رحمت بن جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ ہم جو اُسے بغیر باپ کے پیدا کریں گے تو یہ نشان ہوگا اس بات کا کہ ابراہیمی نُور اب ہم بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل کرنے والے ہیں۔ رَحۡمَةً مِّنَّا اور پھر اس کے ساتھ ہی ہم اُسے لوگوں کے لئے رحمت بنا دیں گے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو مسیح لوگوں کے لئے رحمت کس طرح بنا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ مسیح کے ظہور کے بعد اُس کی تعلیم سے یہود کی خشونت اور اُن کی درشتی میں جو کمی آنے والی تھی اُس کا رَحۡمَةً مِّنَّا میں ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی وجہ سے یہود کی خشونت کو دُور کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ دُنیا کو محبت اور پیار کی تعلیم دے گا اور رحم پر اپنا سارا زور صرف کرے گا۔ پس وہ لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ کی رحمت کا ایک ذریعہ بن جائے گا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف نعمتِ نبوت منتقل ہونے کے نتیجہ میں ہی نبی آخر الزمان نے پیدا ہونا تھا پس چونکہ وہ ذریعہ بننے والا تھا رحمۃٌ للعالمین کے ظہور کا اور وہ رحمت والی تعلیم کا راستہ صاف کرنے والا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اُسے اپنی رحمت کے ماتحت نازل کیا ہے یعنی ہم نے اُس کو ذریعہ بنایا ہے اُس عظیم الشان پیشگوئی کے پورا ہونے کا جس کے نتیجہ میں نبی آخر الزمان نے پیدا ہونا ہے۔ گویا مسیح ایک کُنجی تھا اس دروازہ کی جس کے کھلنے پر خدا تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت نے دنیا پر نازل ہونا تھا۔

یہ قرآن کریم کا کتنا بڑا کمال ہے کہ مسیح سردار تو عیسائیوں کے ہیں لیکن انجیل میں جہاں مسیح کی پیدائش کی پیشگوئی ہے وہاں یہ ذکر تک نہیں کیا گیا کہ مسیح دنیا کو محبت کی تعلیم دے گا۔ مگر قرآن مجید نے اُس کی پیدائش کی پیشگوئی میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی پیدائش سے پہلے مریم کو بتا دیا تھا کہ وہ محبت کی تعلیم دے گا۔ یہ مضمون قرآن کریم کے انصاف اور کمال پر دلالت کرتا ہے اور انجیل کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔ مسیحؑ کا سب سے بڑا کمال اس کی رحم کی تعلیم تھی۔ مگر انجیل نے اس کی پیدائش کی پیشگوئی میں اس کا ذکر تک نہیں کیا ہاں قرآن نے کیا ہے

جو اس کے کامل اور سچا ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تمام انبیاء اپنے اپنے رنگ میں خدا تعالیٰ کی آیت ہوتے ہیں۔مگر عیسائیوں کی عادت ہے کہ وہ بعض الفاظ سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وَ لِنَجۡعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحۡمَةً مِّنَّا حضرت مسیح کی اہمیت پر دلالت کرتے ہیں اور ہم بھی اُن کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔مگر عیسائی اِس قسم کے الفاظ سے انہیں غیر معمولی اہمیت دے دیتے ہیں۔ہمارا اُن سے یہ اختلاف نہیں کہ ہم مسیح کو نعوذ باللہ ادنیٰ درجہ کا نبی سمجھتے ہیں۔ہم بھی مسیح کو خدا تعالیٰ کا نبی اور رسول سمجھتے ہیں مگر ہم یہ نہیں سمجھتے کہ انہیں کوئی ایسی فوقیت حاصل تھی۔جو دوسرے نبیوں کو حاصل نہیں تھی یا اُن میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ کمالات پائے جاتے تھے۔بہر حال اس آیت میں حضرت مسیح کے متعلق جو آیت کا لفظ آیا ہے۔عیسائی اُس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اُنہیں قرآن نے غیر معمولی اہمیت دی ہے مگر یہ درست نہیں۔قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اس نے آیت کا لفظ اور لوگوں کے متعلق بھی استعمال کیا ہے چنانچہ ایک نبی کے متعلق آتا ہے۔وَ لِنَجۡعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ (البقرۃ:۲۶۰) اس جگہ پہلے ایک نبی کی رؤیا بیان کی گئی ہے اور پھر اس رؤیا کو بیان کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم تجھے لوگوں کے لئے آیت بنا دیں گے یہ حزقیل نبی تھے جو موسیٰؑ اور داوٴدؑ سے درجہ میں چھوٹے تھے۔

پھر نبی تو الگ رہے اُونٹنی تک کو آیت کہا گیا ہے۔چنانچہ اعراف ع ۱۰ میں آتا ہے هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰيَةً (الاعراف:۷۴)۔یہ خدا کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے آیت ہے۔اگر اونٹنی آیت ہوسکتی ہے تو مسیح کے آیت ہونے میں اس کی کونسی فضیلت رہی۔

پھر فرعون کے متعلق فرماتا ہے فَالۡيَوۡمَ نُنَجِّيۡكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَكَ اٰيَةً (یونس:۹۳) ہم آج تیرے جسم کو بچا لیں گے تا کہ تو اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے ایک آیت بن جائے۔گویا قرآن کریم میں مسیح کے علاوہ دوسرے رسولوں کو بھی آیت کہا گیا ہے۔جانوروں کو بھی آیت کہا گیا ہے بلکہ ایک دشمن خدا اور کافر فرعون کو بھی آیت کہا گیا۔پس آیت کے اتنے ہی معنے ہیں کہ اُس کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی صداقت نظر آجاتی ہے۔یہ معنے نہیں کہ اُسے دوسروں سے کوئی بڑا درجہ حاصل ہوجاتا ہو۔اِسی طرح یہ جو فرمایا کہ رَحۡمَةً مِّنَّا یہ بھی کوئی خاص فضیلت کی بات نہیں۔حضرت یحیٰی کے متعلق اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ حَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا اور حنان کا لفظ عربی زبان میں رحمت کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔چنانچہ لُغت والے لکھتے ہیں کہ حنان اس اظہار محبت کو کہتے ہیں جس میں آواز ہو۔جیسے ماں کو بعض دفعہ جوش آتا ہے تو وہ اپنے بچہ کو پچکارنے لگ جاتی ہے اور زبان سے بھی محبت

اور پیار کے الفاظ دُہراتی ہے۔ پس محبت کے کمال پر جبکہ زبان سے بھی محبت کا اظہار ہونے لگے حنان کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہ محبت بغیر رحمت کے نہیں ہو سکتی جب بھی اس قسم کا اظہار ہوگا پہلے رحمت آئے گی۔ پس حنان کا لفظ بھی رحمت کے مترادف ہے اور یہ حضرت یحییٰ کے متعلق استعمال ہوا ہے کہ ہم نے اُسے حنان دی اور اُس میں رحمت پیدا کر دی۔ بلکہ مزید بات یہ ہے کہ یحییٰ کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اُسے حنان یا رحمت اپنے پاس سے بخشی۔ لیکن مسیح کے لئے یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے اُسے رحمت بخشی بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ ہم نے اُسے لوگوں پر رحمت کر کے اُتارا۔ گویا رحمت خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہے نہ کہ مسیح کی طرف۔ پس یحییٰ ایک مجسم رحمت تھے اور عیسیٰؑ صرف لوگوں کے لئے رحمت کا نشان بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ مجسم رحمت بڑی چیز ہے پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت نہ صرف یہ کہا گیا آپ رحمت تھے بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ آپ رحمۃٌ للعالمین تھے فرماتا ہے وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (الانبیاء:) اے ہمارے رسول ہم نے تجھے تمام جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے گویا حضرت عیسیٰؑ کو رحمت بھی نہیں کہا صرف رحمت کا نشان کہا۔ حضرت یحییٰ کو رحمت کہا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا کہ ہم نے اُن کو رحمت یہ نہیں بنایا بلکہ ایسی رحمت بنایا ہے جو مختص القوم اور مختص الزمان نہیں بلکہ سارے جہان کے لئے اور قیامت تک آنے والے لوگوں کے لئے ہے۔ گویا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

(۱) ایک تو رحمت بنایا گیا نہ کہ صرف لوگوں پر رحمت کر کے بھجوایا گیا۔

(۲) دوسرے رحمت بھی مختص القوم و مختص الزمان نہیں بنایا گیا بلکہ رحمۃٌ للعالمین بنایا گیا۔

یہاں ایک عیسائی کہہ سکتا ہے کہ ہم یہ نہیں مان سکتے کہ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں آپ کو سارے جہان کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے کیونکہ مریم کی نسبت بھی تو کہا گیا ہے کہ اُسے عالمین کی عورتوں پر فضیلت دی گئی ہے جیسا کہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران:۴۳) مگر آپ لوگ وہاں نساء العالمین کے یہ معنے کرتے ہیں کہ مریم کو اپنی قوم کی عورتوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ اگر وہاں عالمین سے صرف قوم کی عورتیں مراد ہو سکتی ہیں تو یہاں بھی یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ میں آپ کو اپنی قوم کے لئے رحمت قرار دیا گیا ہے نہ کہ سارے جہان کے لئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ الفاظ محدود معنے بھی رکھتے ہیں اور غیر محدود بھی یہ سیاق وسباق سے پتہ چلتا ہے کہ کسی لفظ کے معنے محدود ہیں یا غیر محدود۔ سورۂ انبیاء میں غیر عرب قوموں کا ذکر کر کے اس فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے۔ خصوصاً بنی اسرائیل کا ذکر کر کے کیونکہ پہلے بتایا ہے اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اور پھر یہ آیت آتی ہے۔ پس اس جگہ بنو اسرائیل کو شامل کر

کے تمام انسانوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا ذکر ہے۔اس لئے یہ وعدہ بہر حال وسیع ہے۔اگر غیر قوموں کا ذکر نہ ہوتا تو تمہارا حق تھا کہ تم کہتے کہ جس طرح وہاں تمہارے نزدیک صرف بنی اسرائیل کی عورتوں پر مریم کی فضیلت کا ذکر ہے اسی طرح یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس زمانہ کے عربوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔مگر یہاں عربوں کا ذکر نہیں بلکہ غیر قوموں کا ذکر ہے۔اور بنی اسرائیل کی نعمتیں اُن سے چھین کر مسلمانوں کو دئے جانے کا بیان ہے پس سیاق وسباق سے صاف ظاہر ہے کہ رحمۃٌ للعالمین میں غیر قومیں بھی شامل ہیں لیکن مریم والا وعدہ صرف اپنی قوم کی عورتوں کے متعلق ہے پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختص القوم والزمان ہونے کے معنے نہیں لئے جا سکتے کیونکہ وہاں ایک غیر قوم کا ذکر ہے۔ایسی قوم کا جو اپنے آپ کو ساری دنیا سے افضل سمجھتی ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کی نعمتیں چھین کر مسلمانوں کو دینے کا وعدہ کرتا ہے پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا رحمت ہونا صرف قبائل عرب کے لئے نہیں بلکہ سب اقوامِ عالم کے لئے ہے۔

وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا چونکہ پہلے خدا تعالیٰ نے یہ کہا تھا کہ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ یعنی خدا اگر کسی کو بغیر باپ کے پیدا کرنا چاہے تو اُس کے لئے یہ کوئی مشکل امر نہیں اِس لئے اب یہ بتاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قضاء تھی کہ مریم کے ہاں ایسا بیٹا پیدا ہوگا جو بغیر باپ کے ہوگا اور اس طرح بنی اسرائیل سے سلسلہ نبوت کا انقطاع ہو کر بنی اسمٰعیل میں منتقل ہو جائے گا یہ وہ تقدیر نہیں تھی جو ٹل جاتی بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق احکام جاری ہو چکے تھے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۳﴾

اس پر مریم نے (اپنے پیٹ میں) اُس (بچہ) کو اٹھا لیا اور پھر اس کو لے کر ایک دور مکان کی طرف چلی گئی۔

تفسیر۔حضرت مریم کس طرح حاملہ ہوئیں یہ ایک الٰہی راز ہے۔جو قانونِ قدرت سے بالا ہے یا اگر قانون قدرت میں ہی شامل ہے تو یہ ایک ایسا حصہ ہے جس کا ابھی انسان کو علم نہیں ہو سکا۔قانون قدرت کے بھی کئی راز ایسے ہیں جن کا ابھی انسان کو پتہ نہیں لگا جیسے اٹیم بم کا اس سے پہلے نسلِ انسانی کو کوئی علم نہیں تھا لیکن اب اس کا انکشاف ہوا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کئی راز ایسے ہیں جن کو ابھی دنیا دریافت نہیں کر سکی۔اُنہی اسرار میں سے ایک بن باپ ولادت بھی ہے۔بہر حال وہ خدا جس نے کُن سے سب کچھ پیدا کیا ہے۔وہ مادہ میں بھی نئے تغیر پیدا کر سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ تاریخ میں ہمیں بعض ایسی شہادتیں بھی نظر آتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اور

بچے بھی بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً منچو خاندان جو چین پر حکمران تھا اور جو سنہ ۶ یا سنہ ۷ میں آ کر تباہ ہوا اس کی بنیاد بھی اِسی طرح پڑی کہ اس خاندان کی ایک پڑدادی بغیر نکاح کے حاملہ ہوگئی لوگوں نے بڑا شور مچایا مگر اس نے کہا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ کسی گڈریا کی بیٹی تھی اُس نے کہا میں ایک دن اپنے جانور چرا رہی تھی کہ ایک فرشتہ نازل ہوا اور اس نے کہا کہ میں تجھ پر خدا کا نور ڈالتا ہوں تیرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس لڑکے کا لڑکا سارے چین کا بادشاہ ہوگا چنانچہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ مجھے حمل ہوگیا ہے پس اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

لوگوں نے یہ بات سنی تو انہوں نے کہا یہ عورت ایک آئندہ کی خبر بتا رہی ہے انتظار کرو کہ کیا ہوتا ہے چنانچہ نو ماہ کے بعد اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوگیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس عورت کی پہلی بات تو سچی ہوگئی اب اگلی خبر کا انتظار کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ لڑکا جوان ہوا اور اٹھارہ بیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی پھر جلدی ہی اس کے ہاں بھی ایک لڑکا پیدا ہوگیا۔ وہ لڑکا پندرہ سولہ برس کا تھا کہ ملک میں فساد ہوگیا۔ چونکہ وہ بہادر تھا۔ اُس نے نوجوانوں کو اپنے ساتھ ملایا اور حملہ کرکے اِردگرد کے دیہات پر قابض ہوگیا۔ اس کامیابی سے اس کا حوصلہ بڑھا اور اس نے آگے قدم بڑھایا۔ پھر وہاں کامیابی ہوئی تو اور آگے بڑھا یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ چین کا بادشاہ بن گیا۔ اس واقعہ نے ثابت کردیا کہ جو کچھ اُس عورت نے کہا تھا درست تھا۔ اور اسے خدا نے ہی خبر دی تھی۔ اِسی طرح چنگیز خاں جو ترکوں کی دوسری نسل کا سردار ہے اس کے متعلق بھی ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ترکوں کی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ برلاس ہے جس میں سے ہم ہیں اور دوسری شاخ وہ ہے جس میں چنگیز خان۔ باتو خان اور جتلائی خان وغیرہ مشہور لوگ گذرے ہیں۔ چنگیز خاں کا باپ جب مر گیا اور اس کی ماں بیوہ ہوگئی۔ تو ملک کے رواج کے لحاظ سے اُس کی ماں ہی بادشاہ تسلیم کی گئی۔ ایک دن اس کی ماں نے درباریوں کو بلایا اور کہا کہ مجھے حمل ہوگیا ہے درباریوں نے شور مچادیا کہ ہم تجھے قتل کردیں گے۔ اُس نے کہا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک نور آیا ہے اور وہ میرے آر پار ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے بتایا گیا کہ تیرے ہاں ایک لڑکا ہوگا جو دنیا کا بادشاہ ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد جب میں بیدار ہوئی تو مجھے حمل ہو چکا تھا انہوں نے یہ سن کر صبر کرلیا اور فیصلہ کیا کہ ہمیں اس خبر کے پورا ہونے کا انتظار کرنا چاہیے چنانچہ اسی حمل سے چنگیز خاں پیدا ہوا جس سے ساری دنیا میں بڑی بھاری تباہی آئی۔ اور وہ دنیا کا بادشاہ بنا۔

اِسی طرح اور بہت سے واقعات انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اس قسم کے جتنے بچے پیدا ہوئے ہیں اُن کے پیدا ہونے سے پہلے عورتوں کو کوئی نہ کوئی خواب بھی آئی ہے۔ جس کی وجہ

سے ہم اُن پر الزام نہیں لگا سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹ بولا۔ پس مسیحؑ کی بن باپ ولادت کوئی قابل تعجب نہیں۔ کیونکہ مسیحؑ کی پیدائش کے علاوہ اس قسم کے اور بھی کئی واقعات تاریخوں میں ملتے ہیں۔

فَحَمَلَتۡهُ سے مراد وہی حمل ہے جو اس رؤیا کے نتیجہ میں ہوا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام نے یہی بات تسلیم کی ہے چنانچہ ''مواھب الرحمٰن'' میں آپ نے صاف طور پر لکھا ہے کہ یہ بات ہمارے عقائد میں داخل ہے کہ مسیح بن باپ پیدا ہوئے (مواھب الرحمٰن روحانی خزائن جلد ۱۹ صفحہ ۲۹۵) اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے لئے سوائے اِن دو صورتوں کے اور کوئی صورت ہی نہیں کہ یا تو ہم یہ کہیں کہ وہ خدا کے حکم کے ماتحت پیدا ہوئے تھے اور یا یہ کہیں کہ اُن کی ولادت ناجائز تھی۔ غرض حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا عقیدہ یہی بیان فرمایا ہے کہ مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور یہی ہمارا عقیدہ ہے۔ میں نے زیادہ زور اس پر اس لئے دیا ہے مولوی محمد علی صاحب امیر غیر مبایعین نے لکھا ہے کہ مسیح کا باپ تھا (بیان القرآن زیر آیت ھذا) اور اُس کا نام یوسف تھا حالانکہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں انجیل کے رُو سے بھی یوسف نے اُس وقت تک مریم کے ساتھ تعلقات نہیں رکھے جب تک کہ مسیح پیدا نہیں ہو گئے۔ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حمل کے ایام میں ایک وقت حضرت مریم پر ایسا بھی آیا جب انہیں کہیں دور جانا پڑا۔ اس کے متعلق جب ہم بائبل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں وہاں سے کچھ تفصیل ملتی ہے۔ وہ تفصیل یقیناً ایسی ہے کہ اگر اُس میں غلط بیانی کی کوئی وجہ ثابت نہ ہو تو اُسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

لوقا باب ۲ میں لکھا ہے کہ

> ''اُن دنوں میں ایسا ہوا کہ قیصر اگسطس کی طرف سے یہ حکم جاری ہوا کہ ساری دنیا کے لوگوں کے نام لکھے جائیں۔ یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم کورینس کے عہد میں ہوئی اور سب لوگ نام لکھوانے کے لئے اپنے اپنے شہر کو گئے پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرہ سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے اس لئے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا تا کہ اپنی منگیتر مریم کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے۔'' (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۱ تا ۵)

انجیل کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ چونکہ قیصر اگسطس نے حکم دیا تھا کہ تمام شہروں اور گاؤں کے لوگوں کے نام لکھے جائیں۔ اس لئے یوسف بھی جو حضرت مریم کے شوہر تھے ناصرہ سے بیت لحم گئے۔ کیونکہ وہ داؤد کی نسل میں سے تھے۔ اور بیت لحم اُس وقت قبیلہ داؤد کا ایک بہت بڑا شہر تھا۔ اس سفر میں حضرت مریم بھی اُن کے ساتھ تھیں۔ مگر آگے لکھا ہے کہ چونکہ بیت لحم میں بہت سے لوگ اپنے نام لکھوانے کے لئے آئے ہوئے تھے اس لئے انہیں سرائے

میں جگہ نہ ملی اور وہ کہیں باہر ٹھہرے۔ وہیں حضرت مریم کو دردِ زہ شروع ہوا اور بچہ پیدا ہو گیا۔

(انجیل لوقا باب ۲ آیت ۷)

بیت لحم یروشلم سے جنوب کی طرف پانچ میل کے فاصلہ پر ہے اور بہت زرخیز علاقہ ہے (تاریخ بائبل صفحہ ۴۸۴)۔ ناصرہ سے بھی بیت لحم جنوب کی طرف ہے اور قریباً ستّر میل دُور ہے۔ پس مَكَانًا قَصِيًّا میں اسی سفر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا انجیل میں ذکر آتا ہے۔ کہ وہ ناصرہ سے بیت لحم گئیں۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ

پس (جب وہ وہاں پہنچی) تو اُسے دردِ زہ (اٹھی اور اُسے) مجبور کر کے ایک کھجور کے تنہ کی طرف لے گئی (جب مریم کو

مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۴﴾

یقین ہو گیا کہ اُس کو ہاں بچہ ہونیوالا ہے تو اس نے دنیا کی انگشت نمائی کا خیال کر کے) کہا اے کاش میں اس سے پہلے مر جاتی اور میری یاد مٹا دی جاتی۔

حل لغات۔ مَخَاضٌ کے معنے شدت کے ساتھ دردِ زہ ہونے کے بھی ہیں (تاج) اور مخاض پیدائش کے وقت کے قریب آجانے کو بھی کہتے ہیں (اقرب)۔ اِس وقت کے قریب آجانے کی بڑی علامت بھی دردِ زہ ہی ہوا کرتی ہے۔

جِذْعٌ تنے کو بھی کہتے ہیں اور بڑی شاخ کو بھی کہتے ہیں۔

تفسیر۔ کھجور کے تنہ کی طرف انسان تبھی جاتا ہے جب وہ گھر میں نہ ہو۔ اور جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے بائبل میں یہ ذکر آتا ہے کہ انہیں سرائے میں جگہ نہ ملی اور چونکہ وہ میدان میں ڈیرہ ڈالے پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ پر کوئی کھجور کا درخت ہوگا جس کے نیچے وہ اُس وقت آ گئیں۔

ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ وہ درد کا سہارا لینے کے لئے وہاں گئیں تھیں (مجمع البیان زیر آیت ھذا)۔ لیکن درد کا سہارا لینے کی وجہ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا میرے نزدیک عیسائی روایتوں سے ڈر کر بنائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر درخت سایہ بھی دیتا ہے اور سہارا بھی دیتا ہے اور یہ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ پھر انہوں نے سہارا کیوں نہ کہا سایہ کیوں نہ کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی روایات سے مطابقت رکھنے کا

خیال ہمارے مفسرین کے ذہنوں پر غالب رہا۔ اورانہوں نے سایہ کی بجائے سہارا لینے کا ذکر کر دیا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ درد میں سہارے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ جب شدید دردِ زہ ہورہا ہوتو اُس وقت ہوشیار عورتیں اپنا ہاتھ زچہ کو پکڑا دیتی ہیں اوراُسے کہتی ہیں کہ ہمارے ہاتھ کو زور سے دباؤ۔ وہ زور سے دباتی ہے تو اُسے درد میں ایک قسم کا سہارا مل جاتا ہے اور بچہ آسانی سے پیدا ہوجاتا ہے پس اتنی بات تو درست ہے کہ درد میں سہارے کی ضرورت ہوتی ہو لیکن میرے نزدیک اس آیت کے متعلق مفسرین کی یہ توجیہہ درست نہیں۔

قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا بعض لوگوں نے اس کے یہ معنے کئے ہیں چونکہ بچہ جو پیدا ہونے والا تھا بغیر باپ کے تھا اس لئے وہ گھبرائیں اورانہوں نے کہا کہ ہائے اب میں کیا کروں گی اور لوگوں کو کیا جواب دوں گی (تفسیر ابن کثیر زیر آیت ھذا)۔ لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں تجربہ کار لوگ جانتے ہیں کہ پہلا بچہ ہمیشہ اتنی تکلیف کے ساتھ ہوتا ہے کہ عورت بے اختیار ہوکر کہتی ہے کہ ہائے میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی۔ میں نے اپنے خاندان میں اپنی بیویوں اور بچیوں کو بھی دیکھا ہے۔ اُن میں سے ہر ایک اپنے پہلے بچہ کی ولادت پر یہی کہتی تھی ہائے میں اس سے پہلے مرجاتی۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ واقعہ بھی اپنی ذات میں غیر معمولی تھا کہ ایک کنواری کے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ مگر عام طور پر پہلوٹھے بچوں کی پیدائش کی تکلیف پر لڑکیاں اسی طرح کہا کرتی ہیں۔ پس اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس میں مخفی طور پر اُس حدیث کی تردید کی طرف بھی اشارہ ہو جس میں یہ ذکر آتا ہے کہ ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اُسے چھوتا ہے جس کی وجہ سے وہ رونے لگتا ہے لیکن مسیح جب پیدا ہوا تو شیطان نے اُسے نہیں چھوا (بخاری کتاب التفسیر سورۃ آل عمران باب منه آیات محکمات)۔ پیدائش پر بچہ اس لئے روتا ہے کہ راستہ تنگ ہوتا ہے اور وہ نہایت تکلیف کے ساتھ رحم مادر میں سے باہر آتا ہے اُدھر عورت چیختی ہے کیونکہ اُس کی ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ بتا کر کہ حضرت مریم کو اچھی خاصی درد ہوئی اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ جب مریم کو اتنی درد ہوئی تو تم سمجھ سکتے ہو کہ عیسٰی کو بھی ضرور درد ہوئی ہوگی اور وہ بھی تکلیف سے چیخا چلایا ہوگا۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ

پس (فرشتہ نے) اس کو نچلی جانب کی طرف سے پکار کر کہا کہ (اے عورت) غم نہ کر اللہ (تعالیٰ) نے تیری نچلی

سَرِيًّا ﴿۲۵﴾ وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ

جانب ایک چشمہ بہایا ہوا ہے (اس کے پاس جا اور اپنی اور بچہ کی صفائی کر) اور (وہ) کھجور (جو تیرے قریب ہوگی

رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۶﴾

اس) کی ٹہنی کو پکڑ کر اپنی طرف ہلا۔ وہ تجھ پر تازہ بتازہ پھل پھینکے گی۔

حل لغات۔ تَحْتَ کے معنے نیچے کے بھی ہوتے ہیں اور نشیب کے بھی ہوتے ہیں کیونکہ نشیب بھی نیچے کی طرف ہوتا ہے اگر تم کسی پہاڑ پر جا رہے ہو تو وہ جگہ بھی نیچے کہلائے گی جس طرف پہاڑی اُترتی ہو اور وہ جگہ جو تمہارے پاؤں کے نیچے ہوگی وہ بھی تحت کہلائے گی۔

سریا سَرِيًّا سَرٰی سے ہے جس کے معنے چلنے والی چیز کے ہیں لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ سَرِيًّا سَرْوٌ سے ہے جس کے معنے بلندی شان اور عظمت کے ہیں۔

هز هَزَّ کے معنے زور سے ہلانے کے ہوتے ہیں۔ (لسان)

تفسیر۔ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ سے مفسرین کا ذہن پاؤں کے نیچے والے معنوں کی طرف چلا گیا ہے (روح المعانی)۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی چونکہ نیچے تھے اس لئے انہوں نے یہ آواز دی۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت مسیحؑ نہیں بلکہ فرشتہ ہے جس نے پاؤں کی طرف سے کلام کیا (در منثور)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس جگہ مراد فرشتہ ہی ہے۔ مگر یہ بالکل احمقانہ خیال ہے کہ فرشتہ نے جسم کے نیچے سے بات کی تَحْتِهَآ سے مراد نشیب ہے کیونکہ جس جگہ پر اُن کے ہاں بچہ پیدا ہوا اُس کے پاس نشیب تھا اور نشیب کے نیچے چشمہ تھا۔ بائبل کی روایت سے پتہ لگتا ہے کہ بچہ بیت لحم میں پیدا ہوا۔ اور بیت لحم ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے جو سمندر سے ۲۳۵۰ فٹ اونچی ہے۔ اس کے ارد گرد سبز وادیاں ہیں جو سارے یہوداہ سے زیادہ سرسبز ہیں۔ اس پہاڑی کے اندر دو تین چشمے ہیں جن کو چشمۂ سلیمان کہتے ہیں اور یہیں سے شہر میں پانی لایا جاتا ہے گویا شہر میں پانی نہیں بلکہ تالاب سلیمان سے نالیوں کے ذریعہ پانی لایا جاتا ہے۔ مگر شہر سے جنوب مشرق کی طرف آٹھ سو گز یعنی نصف میل پر اور وہ بھی نیچے

ڈھلوان کی طرف چشمہ ہے (قاموس کتاب المقدس ترجمہ وتالیف ڈاکٹر جارج ای پوسٹ ایم ڈی۔تحت بیت لحم) پس فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ سے یہ مراد ہے کہ اُنہیں چشمہ کی طرف سے آواز آئی۔انسان آواز سے بھی اندازہ لگا لیتا ہے کہ جگہ کہاں ہے۔مثلاً اگر ہمیں کوئی شخص بائیں طرف سے آواز دے تو ہم اُس آواز سے فوراً قیاس کرلیں گے کہ یہ آواز ہمیں بائیں طرف سے آئی ہے دائیں طرف سے نہیں آئی۔پس حضرت مریم کو جگہ بتانے کے لئے کہ تمہیں کہاں سے پانی ملے گا فرشتہ نے اُس نشیب سے اُنہیں آواز دی اور اس طرح بتایا کہ پہاڑی کا جو نشیب ہے یہاں سے تمہیں پانی مل جائے گا یہ مراد نہیں کہ وہ اُن کی کمر کے نیچے سے بولا۔جغرافیہ سے بھی ثابت ہے کہ وہاں چشمے پائے جاتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بائبل بتاتی ہے حضرت مریم جب بیت لحم گئیں تو انہیں ٹھہرنے کے لئے شہر میں جگہ نہیں ملی پس وہ شہر سے باہر جا کر رہیں۔اور بائبل بتاتی ہے کہ وہ اس جگہ رہیں جہاں گڈریے اپنے جانور چرایا کرتے تھے (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۸) اور گڈریے اپنے جانور ہمیشہ شہر سے کچھ فاصلے پر چرایا کرتے ہیں اسی وجہ سے لکھا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوا تو انہوں نے اُسے کھلیان میں ڈالا پس شہر اور چشموں کے درمیان کسی جگہ پر جا کر وہ ٹھہر گئیں۔شاید انہیں یہ بھی خیال ہو کہ اگر میں شہر میں رہی تو لوگ شور ڈالیں گے کہ یہ کس کا بچہ ہے اس لئے بہتر ہے کہ شہر سے کچھ فاصلہ پر جا کر رہوں چنانچہ انہوں نے شہر سے کچھ فاصلہ پر ڈیرہ لگا دیا۔جہاں سے پانی نزدیک تھا مگر بوجہ اجنبی جگہ ہونے کے انہیں اس کا علم نہیں تھا۔اس لئے اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اُنہیں الہاماً بتا دیا کہ اس طرف چشمہ بہ رہا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت مسیحؑ کو اس ذریعہ سے حضرت اسمٰعیل سے مشابہت دی گئی ہو۔حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی جب مکہ میں چھوڑے گئے تو اُن کی والدہ کو اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے آواز دی تھی کہ جا ہم نے تیرے بیٹے کے پاؤں تلے سے چشمہ پھوڑ دیا ہے۔بہر حال یہ خدا تعالیٰ کا ایک نشان تھا کہ اس نے حضرت مریم کی گھبراہٹ کے وقت انہیں بتا دیا کہ فلاں جگہ پانی ہے وہاں سے تم اپنی ضرورت پوری کرلو۔

ہمارے مفسرین تَحْتَكِ سَرِيًّا کے یہ معنے کرتے ہیں کہ خدا نے تیرے نیچے ایک شاندار وجود بنایا ہے یعنی تیرا بچہ بڑی شان والا ہوگا (تفسیر کبیر لامام رازی)۔اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لفظ حضرت مسیحؑ کی شان کی بلندی اور اُن کی عظمت کے اظہار کے لئے بولا گیا ہے۔درحقیقت ہمارے مفسرین کو شوق ہے کہ وہ اُٹھتے بیٹھتے حضرت مسیح کی تعریف کرتے رہیں اور اُن کی شان کی بلندی کے قصے بیان کرتے پھریں۔اُن کے پیدا ہونے کا ذکر ہو تو کہتے ہیں کہ تمام دنیا میں سے صرف وہی مسِ شیطان سے پاک تھے اور موت کا ذکر ہو تو کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اُن کو زندہ

آسمان پر اٹھا لیا ہے پس یہ معنے اُن کی اِسی دیرینہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں حالانکہ بات سیدھی تھی بچہ پیدا ہوا تو ماں کو اپنی اور بچہ کی صفائی کے لئے پانی کی ضرورت تھی۔خیال تھا کہ کپڑے دھونے اور بچے کو نہلانے کے لئے پانی کہاں سے آئے گا فرشتے نے کہا کہ نیچے پانی موجود ہے وہاں سے اپنی ضرورت پوری کرلو اور جغرافیہ سے ثابت ہے کہ بیت لحم میں پہاڑی کے نیچے چشمے موجود ہیں۔

اب اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا یعنی کھا اور پی اور اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کر۔کھجور کا ذکر چونکہ پہلے آچکا ہے اس لئے مراد یہ ہے کہ کھجوریں کھا اور پانی پی اور تجھے یہ جو فکر تھا کہ میں گند کا کیا علاج کروں گی اُس کو اب دُور کر دے اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔یہ اگلی عبارت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ یہاں سَرِيًّا کے معنے رفعت کے نہیں بلکہ چشمہ کے ہیں۔پہاڑی کے نشیب میں چشمہ تھا۔خدا تعالیٰ نے کہا کہ کھجوریں کھا۔پانی پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔

اب اس مقام پر ایک بہت بڑی مشکل پیش آجاتی ہے جس کو حل کرنا ہمارے لئے نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ عیسائی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش ۲۵ دِسمبر کو ہوئی اور لوقا کہتا ہے کہ قیصر اگسطس نے اُس وقت مردم شماری کا حکم دیا تھا جس کے لئے یوسف اور مریم ناصرہ سے بیت لحم گئے اور وہیں حضرت مسیح کی پیدائش ہوئی۔گویا ۲۵ دسمبر کو۔اُس زمانہ میں جب کہ قیصر اگسطس کے حکم کے ماتحت یہود کی پہلی مردم شماری ہوئی مسیحؑ بیت لحم میں پیدا ہوئے (لوقا باب ۲ آیت ۱ تا ۵)۔لیکن قرآن بتاتا ہے کہ مسیح اس موسم میں پیدا ہوئے جس میں کھجور پھل دیتی ہے اور کھجور کے زیادہ پھل دینے کا زمانہ دسمبر نہیں ہوتا بلکہ جولائی اگست ہوتا ہے۔اور پھر جب ہم یہ دیکھیں کہ خدا تعالیٰ نے انہیں ایک چشمے کا بھی پتہ بتایا جہاں وہ اپنے بچے کو نہلا سکتی تھیں اور اپنی بھی صفائی کرسکتی تھیں تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جولائی اگست کا مہینہ تھا ورنہ سخت سردی کے موسم میں چشمہ کے پانی سے نہانا اور بچے کو بھی غسل دینا خصوصاً ایک پہاڑ پر اور عرب کے شمال میں عقل کے بالکل خلاف تھا۔لیکن عیسائی تاریخ یہی کہتی ہے کہ حضرت مسیحؑ دسمبر میں پیدا ہوئے۔اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت مسیح کی پیدائش دسمبر میں ہوئی تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن تو حضرت مریم سے کہتا کہ هُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا تو کھجور کے تنا کو ہلا تجھ پر تازہ کھجوریں گریں گی۔حالانکہ کھجور اُس وقت بہت کم ہوتی ہے۔کھجور زیادہ تر جولائی اگست میں ہوتی ہے اور مسیح کی پیدائش دسمبر میں پیدا ہوئی۔پس اگر یہ درست ہے کہ مسیح دسمبر میں پیدا ہوئے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے کھجور کا کیوں ذکر کیا جبکہ کھجوریں اُس موسم میں ہوتی ہی نہیں۔اس اعتراض سے ڈر کر ہمارے مفسرین نے یہ لکھ

دیا کہ حضرت مریم کھجور کے تنہ کے پاس درد کا سہارا لینے گئی تھیں۔انہیں خیال آیا کہ مسیح کی پیدائش دسمبر میں بتائی جاتی ہے اور دسمبر میں کھجور کے درخت پر بہت کم پھل لگتا ہے پھر وہ کھجور کے سوکھے درخت کے پاس کیوں گئی تھیں۔ اِس کا جواب اُنہوں نے یہ سوچا کہ وہ درد کا سہارا لینے گئی تھیں۔مگر انہیں یہ خیال نہ آیا کہ ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ کھا اور یہ بھی کہا ہے کہ کھجور کے تنہ کو ہلا تو تجھ پر تازہ کھجوریں گریں گی صرف اس وجہ سے کہ عیسائی بیان اُن کے سامنے تھا کہ مسیح دسمبر میں پیدا ہوئے اور دسمبر میں کھجور کو بہت کم پھل لگتا ہے انہوں نے یہ معنے کر لئے کہ وہ سہارا لینے کے لئے کھجور کے سوکھے درخت کے پاس گئی تھیں لیکن بعض مفسروں کو فَكُلِيْ اور تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا کا بھی خیال آیا ہے اور انہوں نے لکھا ہے کہ یہ ایک معجزہ تھا۔حضرت مریم کھجور کے سوکھے درخت کو ہلاتیں تو تازہ بتازہ کھجوریں گرنی شروع ہو جاتی تھیں (تفسیر کبیر لامام رازی)۔

دوسری مشکل ہمارے سامنے یہ پیش آتی ہے کہ یہ واقعہ یہودیہ میں ہوا ہے۔قرآن اس موقعہ پر کھجور کا ذکر کرتا ہے اور بائبل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں زیتون بادام اور انگور ہوتا تھا کھجور کا ذکر نہیں آتا (قاموس الکتاب تحت بیت لحم) اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ دسمبر میں بادام بھی نہیں ہوتا۔انگور بھی نہیں ہوتا اور زیتون بھی نہیں ہوتا گویا قرآن صرف کھجور کا ذکر کرتا ہے مگر دسمبر میں کھجور بہت کم ہوتی ہے اور تاریخ بائبل یہودیہ میں زیتون بادام اور انگور کا تو ذکر کرتی ہے لیکن کھجور کا ذکر نہیں کرتی۔اور پھر یہ تینوں چیزیں بھی دسمبر میں نہیں ہوتیں۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس علاقہ میں جس میں انجیل حضرت مسیح کی پیدائش بتاتی ہے کھجور ہوتی تھی یا نہیں۔اِس کے متعلق جب ہم بائبل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خود بائبل اس بات پر گواہ ہے کہ اُس علاقہ میں کھجور ہوا کرتی تھی۔چنانچہ لکھا ہے

”تب موسیٰ کے سُسر قینی کی اولاد کھجوروں کے شہر سے بنی یہوداہ کے ساتھ یہوداہ کے بیابان کو جو عراد کے دکھن کی طرف ہے چڑھیں۔“ (قاضیوں باب ۱ آیت ۱۶)

عراد جس کا حوالہ میں ذکر آتا ہے بیت لحم سے کوئی سو میل کے فاصلہ پر ہے اور چونکہ اس سے شمالی کی طرف کھجوروں کا شہر تھا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت لحم کے قریب قریب یقیناً کھجوریں پائی جاتی تھیں پھر یہودیہ کا علاقہ جس میں بیت لحم ہے چونکہ عرب سے ملتا ہے اس لئے بھی اُس میں کھجوروں کا پایا جانا بالکل قرین قیاس ہے لیکن اس تحقیق سے اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ تک تو بات ٹھیک ہو گئی۔پتہ لگ گیا کہ اُس علاقہ میں کھجور پائی جاتی تھی لیکن یہ سوال ابھی حل نہیں ہوا کہ قرآن کہتا ہے کہ مسیح جس موسم میں پیدا ہوئے اُس وقت کھجوریں درخت پر لگی ہوئی تھیں اور کھجوریں بھی پختہ تھیں اور کھانے کے قابل تھیں۔اور عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت مسیح دسمبر میں پیدا ہوئے جبکہ

کھجوریں بہت کم ہوتی ہیں۔اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک حضرت مسیحؑ کی پیدائش اس موسم میں جس میں کھجور لگی ہوئی ہوتی ہے مسیحی تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح ۲۵ دسمبر کو پیدا ہو۔بعض اس کا وقت اپریل بتاتی ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن آف اتھکس زیر لفظ Christmas)۔مگر دسمبر یا اپریل میں کھجور درخت پر بہت کم ہوتی ہے۔پس ہمیں اس مسئلہ کی مزید تحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے۔

میں نے کہا تھا کہ لوقا نے جو کچھ بیان کیا ہے اگر اُس میں غلط بیانی کی کوئی وجہ نہیں تو ٹھیک ہے لیکن اب اس قرآنی آیت نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم وہ وجہ تلاش کریں جس کی بناء پر ان دونوں باتوں کا آپس میں جوڑ نظر نہیں آتا۔اس نقطہ نگاہ سے اب ہم پھر تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ لوقا کو مردم شماری کے بارہ میں غلطی لگی ہے۔وہ کہتا ہے کہ یوسف اور مریم مردم شماری کی غرض سے ناصرہ سے بیت لحم گئے۔لیکن جب ہم روما کی تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ لگتا ہے کہ مسیح کی پیدائش کے سن میں کوئی مردم شماری ہوئی ہی نہیں اور جوزیفس جو مسیح کے زمانہ کا سب سے بڑا مورخ ہے وہ لکھتا ہے کہ پہلی مردم شماری ۷ بعد مسیح میں ہوئی ہے سات سال پہلے کوئی مردم شماری نہیں ہوئی اور وہ لکھتا ہے کہ یہ یہود کے لئے اتنی نئی چیز تھی کہ وہ حیران ہوتے تھے اور تعجب کرتے تھے کہ اس مردم شماری کی غرض کیا ہے۔اگر سات سال پہلے بھی مردم شماری ہو چکی ہوتی تو یہود اتنے حیران کیوں ہوتے؟ علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہیروڈ (Herod) کی وفات کے وقت کون سٹیسلس واردس گورنر تھا لوقا کا بیان کردہ کورینس (Quirinius) نہیں تھا بلکہ رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے گورنر سینٹی نس (Sentinis) اور (Titnis) تھے۔اول الذکر ۹ قبل مسیح سے ۶ قبل مسیح تک رہا۔اور دوسرے کا ذکر تاریخ میں ۱۰ قبل مسیح میں آتا ہے۔(انسائیکلوپیڈیا ببلیکا زیر لفظ کرانیکل) اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مسیح کی پیدائش سے دس سال قبل سے لے کر ہیروڈ کی وفات تک کورنیس نام کا کوئی گورنر تھا ہی نہیں۔پس جبکہ دس سال قبل مسیح سے بعد وفات ہیروڈ تک کے گورنروں کے نام ہمیں معلوم ہیں اور اُن میں سے کوئی بھی لوقا کا بیان کردہ کورنیس نہ تھا اور جوزیفس کے بیان کے مطابق اُس وقت کوئی مردم شماری ہوئی ہی نہ تھی تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ لوقا کے ذہن میں واقعات مشوش ہو گئے ہیں۔یا تو اُس نے مردم شماری کا ذکر سُن کر جو کئی سال بعد ہوئی تھی یہ سمجھ لیا کہ وہ پہلے ہوئی تھی اور یوسف اس کے لئے باہر گئے تھے اور پھر پیدائش کا واقعہ اُس نے ساتھ ملا لیا۔اور یا پھر اُس نے جان بوجھ کر اُن واقعات کو بدلا۔اور یہی حقیقت ہے۔اب میں بتاتا ہوں کہ کس طرح قرآنی بات سچی ثابت ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ حضرت مریم بغیر خاوند کے حاملہ ہوئیں۔خاوند نے شور مچایا کہ یہ میرا حمل نہیں۔اِدھر خاوند کو

خواب آ گئی کہ مریم کو اپنے گھر میں لے آ کیونکہ وہ جو کچھ کہتی ہے ٹھیک کہتی ہے۔مگر جس کو خواب آ گئی اُس کی تو تسلی ہو گئی کہ میری بیوی بدکار نہیں۔لیکن شہر والے تو نہیں مان سکتے تھے جو بھی سُنے گا وہ کہے گا کہ حرام کا ہے۔اور کوئی خاوند یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی کو بدکار کہا جائے۔پس چونکہ لوگوں میں بدنامی کا ڈر تھا۔اِس لیے تین چار مہینے جب تک کہ حمل چھپ سکتا تھا وہ اپنے گھر میں رہے اور جب دیکھا کہ پیٹ بڑا ہو رہا ہے اور حمل اب چھپ نہیں سکتا تو ایک دور کے علاقہ میں چلے گئے اور وہاں جا کر بچہ پیدا ہوا۔اب لوقا کے لئے اس بات کے اظہار میں کیا مشکل تھی لوقا کے لئے یہ مشکل تھی کہ وہ صرف یہی نہیں بتاتا کہ مریم کو خواب میں فرشتہ ملا اور اُس نے بتایا کہ تو حاملہ ہو گی بلکہ وہ ساتھ ہی معجزے بھی بیان کرنے شروع کر دیتا ہے۔کہ ادھر مریم حاملہ ہوئیں اور اُدھر خداوند کے ظہور کی وجہ سے معجزے ظاہر ہونے لگ گئے۔چنانچہ مریم حضرت زکریا کی بیوی سے ملنے گئیں تو وہ کہنے لگیں کہ ''میرے خداوند کی ماں میرے پاس آئی ہے'' اور پھر کہا کہ ''دیکھو تیرے سلام کی آواز جونہی میرے کان تک پہنچی لڑکا میرے پیٹ میں خوشی سے اُچھل پڑا۔'' (لوقا باب ۱ آیت ۴۳و۴۴) اور یہ ظاہر بات ہے کہ جب اس حمل کے ساتھ ہی معجزات ظاہر ہونے لگ گئے تھے تو حمل کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔مگر اِدھر واقعات بتا رہے تھے کہ یوسف اور مریم ایک لمبے عرصہ تک باہر رہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یوسف کو خواب آ چکی تھی کہ میری بیوی کا کوئی قصور نہیں۔مگر صرف یوسف کی خواب سے کیا بنتا تھا۔سوال لوگوں میں بدنامی کا تھا پس یوسف نے یہ تدبیر کی کہ جب تک حمل چھپ سکتا تھا انہیں اپنے گھر میں رکھا اور جب دیکھا کہ اب حمل چھپ نہیں سکتا تو وہ اُنہیں کسی دور مقام پر لے گیا تا کہ لوگوں میں بدنامی نہ ہو اور بچہ کہیں باہر ہی پیدا ہو جائے لیکن لوقا کی غرض یہ تھی کہ مسیح کی خدائی ثابت کرے اِس لئے اُس نے حمل کے ساتھ ہی مسیح کے معجزے بیان کرنے شروع کر دئے کہ ابھی وہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہی تھا کہ زکریا کی بیوی حضرت مریم کو دیکھ کر کہہ اُٹھیں کہ میرے خداوند کی ماں میرے پاس آئی ہے بلکہ زکریا کی بیوی تو الگ رہی۔یوحنا جو ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں تھا وہ بھی خوشی سے اچھل پڑا اور پیٹ میں ہلنے لگ گیا۔پس لوقا نے یہ سمجھا۔کہ اگر حمل کی وجہ سے مریم کا باہر جانا ثابت ہو تو یہ خیال کیا جائے گا کہ گویا مریم اور اُس کے خاوند یوسف اللہ تعالیٰ کے اِس قدر نشانات اور معجزات کے باوجود لوگوں کے اعتراض سے ڈرتے تھے لیکن اِدھر وہ اس امر سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ یوسف اور مریم باہر گئے پس سوال پیدا ہوتا تھا کہ جب یہ حمل معجزانہ تھا اور جب حمل کے ساتھ ہی مسیح کے معجزات بھی ظاہر ہونے لگ گئے تھے تو پھر اس حمل کو چھپانے کی ضرورت نہیں تھی اور جب نہیں تھی تو پھر یوسف اور مریم باہر کیوں گئے۔اس اعتراض سے بچنے کے لئے وہ سات سال بعد کی مردم شماری کے واقعہ کو پہلے بیان کرتا ہے

تا کہ یوسف اور مریم کے باہر جانے کی ایک قانونی وجہ نکل آئے اور لوگوں کو بتایا جا سکے کہ وہ حمل کو چھپانے کے لئے باہر نہیں گئے بلکہ اس لئے گئے تھے کہ قیصر نے مردم شماری کا حکم دیا تھا اور اُن کا بیت لحم میں جانا ضروری تھا پس رومی تاریخ کے واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوقا نے پردہ ڈالا۔ درحقیقت یہ مردم شماری اُس وقت نہیں ہوئی محض پیدائش کو چھپانے کے لئے یہ سفر تھا نہ کہ مردم شماری کے لئے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے یوسف خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت حضرت مریم کو اپنے گھر تو لے آیا مگر دیکھا کہ اگر میں مریم کو اپنے گھر میں ہی رکھوں تو میری ناک کٹتی ہے پس اُس نے یہ تدبیر کی کہ جب حمل چھپ نہیں سکتا تھا تو وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر کسی بہانہ سے سفر پر چلا گیا۔ اب سیدھی بات ہے کہ اگر وہ بچہ پیدا ہونے کے فوراً بعد ہی اپنے شہر میں واپس آجاتے تو اعتراض قائم رہتا کہ مریم کو تمہارے گھر آئے تو ابھی پانچ ماہ ہی ہوئے تھے یہ بچہ کہاں سے پیدا ہو گیا اگر وہ ٹھیک نو ماہ کے بعد بھی واپس آتے اور کہتے کہ کہ جائز حمل کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے تو بچہ کی شکل سے لوگ پہچان جاتے کی یہ نوزائیدہ بچہ ہے یا اس کی پیدائش پر چار پانچ ماہ گذر چکے ہیں۔ اس بات کو چھپانے کا صرف ایک ہی طریق تھا کہ وہ کئی سال باہر رہتے چنانچہ بڑی عمر کا بچہ لے آؤ تو پھر کچھ پتہ نہیں لگ سکتا کہ وہ کب پیدا ہوا۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اُن کو کئی سال باہر رہنا پڑا۔ میں قیاساً سمجھتا ہوں کہ وہ آٹھ نو سال باہر رہے اور پھر واپس آئے۔ بہر حال چونکہ یوسف حضرت مریم کو اپنے گھر لے آئے تھے لیکن گھر لانے سے پہلے چند ماہ کا حمل تھا۔ اس لئے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر وہ چند سال باہر رہتے تو اس پر پردہ پڑ جاتا اور یہ سمجھا جاتا کہ عیسیٰ شادی کے بعد جائز حمل سے پیدا ہوئے ہیں لیکن اگر اُسی وقت لے آتے تو راز فاش ہو جاتا۔ فرض کرو یوسف حضرت مریم کو اپریل میں اپنے گھر لایا تو لوگ حمل کا وقت اپریل سے شروع کریں گے اور اس طرح اُن کے نزدیک دسمبر میں بچہ پیدا ہو جانا چاہیے۔ اگر وہ اگست ستمبر میں پیدا ہو جاتا ہے تو لوگ کہیں گے کہ یہ حرام کا بچہ ہے۔ کیونکہ خاوند تو اسے اپریل میں اپنے گھر لایا تھا اور بچہ اگست ستمبر میں پیدا ہو گیا۔ اگر وہ بچہ کہیں باہر جنوا لیتا ہے اور واپس اُس وقت آتا ہے جب شادی پر نو مہینے گذر جاتے ہیں تب بھی ہر شخص جو بچے کو دیکھے گا کہے گا کہ یہ تو ایک مہینے کا ہے ہی نہیں۔ وہ کہے گا کہ یہ دسمبر میں پیدا ہوا ہے اور لوگ کہیں گے کہ یہ تین چار ماہ کا معلوم ہوتا ہے۔ آخر کون شخص ہے جو تین مہینے اور ایک مہینہ کے بچہ میں فرق نہ کر سکے پس اگر یوسف دسمبر میں ہی اپنے بچے کو لے آتے اور کہتے کہ یہ اِسی مہینہ میں پیدا ہوا ہے تو ہر شخص کہتا کہ یہ بالکل غلط بات ہے یہ تو پانچ چھ ماہ پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ اِس پر پردہ اُسی صورت میں پڑ سکتا تھا جب وہ کئی سال باہر رہتے۔ چونکہ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ حضرت مسیح اس موسم میں پیدا ہوئے جس موسم میں کھجور تیار ہوتی ہے اور کھجور زیادہ تر جولائی اگست میں

ہوتی ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ جولائی یا اگست میں پیدا ہوئے اور حضرت مریم کو اکتوبر یا نومبر میں حمل ہوا۔ اگر وہ جولائی کے مہینہ میں یا اگست کے شروع میں پیدا ہوئے تھے تو حضرت مریم کو اکتوبر میں حمل ہوا اور اگر وہ اگست کے وسط یا آخر میں پیدا ہوئے تو حضرت مریم کو نومبر میں حمل ہوا۔ بہر حال قرآن کریم کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو ۱۵ اکتوبر سے ۱۵ نومبر تک کسی تاریخ میں حمل ہوا ہے تبھی جا کر اُس موسم میں بچہ پیدا ہوتا ہے جس میں کھجور زیادہ تر پھل دیتی ہے۔ نومبر میں حمل ہوا تو مریم اپنی ماں سے تو نہیں چھپا سکتی تھی۔ اُس نے اپنی ماں کو ضرور بتایا ہوگا۔ اور پھر ماں نے اپنے رشتہ داروں کو بتایا ہوگا۔ اور وہ روئے پیٹے ہوں گے اور پھر یوسف کے پاس گئے ہوں گے کہ وہ کسی طرح مریم کو اپنے گھر لے آئے۔ اور یہ بات دب جائے۔ یوسف نے پہلے انکار کرنا چاہا مگر خدا تعالیٰ نے خواب میں اُسے حکم دیا کہ وہ انکار نہ کرے اور مریم کو اپنے گھر لے آئے اب وہ خدا سے بھی ڈرتا تھا اور لوگوں سے بھی ڈرتا تھا وہ خدا تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مریم کو اپنے گھر میں لے آیا۔ فرض کرو فروری میں یا مارچ کے آخر میں وہ اُن کو اپنے گھر لایا اور مئی جون میں جب اس نے دیکھا کہ اب حمل پر پردہ نہیں پڑ سکتا تو وہ کوئی بہانہ بنا کر جنوب کی طرف سفر پر چلا گیا اور بیت لحم میں پہنچ کر بچہ پیدا ہو گیا۔ اب اگر اُسی وقت وہ اپنے بچہ کو واپس لے آتے تو بڑے بے وقوف بنتے کیونکہ وہ تو نکلے ہی اس لئے تھے کہ لوگوں کو بچہ کی پیدائش کا علم نہ ہو اور وہ یہ نہ کہیں کہ مریم تو تمہارے گھر میں مارچ میں آئی تھیں جولائی یا اگست میں بچہ کس طرح پیدا ہو گیا۔ اگر وہ چھ مہینے کے بعد بھی واپس لاتے تب بھی بے وقوف بنتے کیونکہ وہ یہ کہتے کہ ایک مہینہ ہوا ہمارے ہاں یہ بچہ ہوا ہے اور اس کی شکل چار پانچ مہینے کے بچے والی ہوتی اور چار پانچ مہینے کا فرق بڑا بھاری فرق ہوتا ہے پس وہ کئی سال باہر رہے تا کہ اس بات پر پردہ پڑ جائے اور لوگوں کے ذہنوں سے یہ بات نکل جائے اور جب وہ بچہ بڑا ہو گیا تو پھر اپنے وطن میں واپس آئے۔ متی سے بھی پتہ لگتا ہے کہ وہ کئی سال مصر میں رہے (انجیل متی باب ۲ آیت ۱۳) اب واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ یوسف اور مریم لوگوں سے ڈر کر باہر گئے۔ مگر لوقا بتاتا ہے کہ مسیح ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں ہی تھا کہ اُس کے معجزے ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور سب کو پتہ لگ گیا کہ مریم روح القدس کی وجہ سے حاملہ ہے۔ اب جبکہ سب کو پتہ لگ گیا تھا اور مسیح کے معجزے بھی ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے تو اس حمل کو چھپانے اور اُن کے باہر جانے کی کوئی وجہ نہ تھی مگر دوسری طرف واقعات بتاتے ہیں کہ یوسف اور مریم باہر گئے اور باہر ہی بچہ پیدا ہوا۔ پس سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر سب کو علم تھا کہ مریم روح القدس سے حاملہ ہے تو پھر یوسف اور مریم باہر کیوں گئے۔ اس سوال کو حل کرنے کے لئے لوقا سات سال بعد کی مردم شماری کو سات سال پہلے بیان کرتا ہے اُس نے خیال کیا کہ ستر اسی سال گذر چکے

ہیں (کیونکہ لوقا کی انجیل مسیحؑ کے واقعہ صلیب کے بہت بعد لکھی گئی ہے) کون یاد رکھے گا کہ مردم شماری کس سال میں ہوئی۔ آؤ ہم دنیا کے سامنے یہ وجہ پیش کر دیں کہ یوسف اور مریم کسی اور غرض سے نہیں بلکہ مردم شماری کی غرض سے ناصرہ سے بیت لحم گئے تھے لیکن قرآن تو سچی بات بتاتا ہے۔ اُس نے وہ بات بتائی ہے جو عین فطرت انسانی کے مطابق ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسیحؑ کی پیدائش دسمبر میں نہیں ہوئی جیسا کہ عیسائی بتلاتے ہیں۔ بلکہ جولائی یا اگست میں ہوئی ہے۔ جبکہ کھجور کے درخت پر کثرت سے پھل تیار ہو جاتا ہے۔ عیسائیوں نے دسمبر کی پیدائش محض اس لئے بیان کی ہے تا کہ اصل واقعہ پر پردہ پڑا رہے اور لوگ یہ سمجھیں کہ حضرت مسیح شادی کے بعد جائز حمل سے پیدا ہوئے ہیں۔

پھر انجیل میں مسیح کی پیدائش کا موقع بیان کرتے ہوئے لکھا ہے

''اسی علاقہ میں چرواہے تھے جو رات کو میدان میں رہ کر اپنے گلّہ کی نگہبانی کر رہے تھے۔''

(لوقا باب ۲ آیت ۸)

ظاہر ہے کہ یہ گرمی کا موسم تھا نہ کہ شدید سردی کا۔ دسمبر کا مہینہ تو علاوہ شدید سردی کے فلسطین میں سخت بارش اور دُھند کا ہوتا ہے۔ کون یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ ایسے موسم میں کھلے میدان میں چرواہے اپنے گلّوں کو لے کر باہر نکل آئے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ گرمی کا موسم تھا چنانچہ پیکس تفسیر بائبل میں انجیل لوقا کے مفسّر پرنسپل اے۔ جے۔ گریوایم۔ اے۔ ڈی کی طرف سے لوقا کے اس بیان پر کہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش جس موسم میں ہوئی تھی اُس وقت چرواہے گلّوں کو باہر نکال کر کھلے میدان میں راتیں بسر کرتے تھے مندرجہ ذیل تبصرہ موجود ہے کہ یہ موسم ''ماہ دسمبر کا نہیں ہو سکتا ہمارا کرسمس ڈے مقابلتاً بعد کی ایک روایت ہے جو کہ پہلے پہل مغرب میں پائی گئی''۔ اسی طرح بشپ جارنس اپنی کتاب Rise of Christianity میں تحریر کرتے ہیں

''اس تعین کے لئے کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے کہ ۲۵ دسمبر ہی مسیح کی پیدائش کا دن تھا اگر ہم لوقا کی بیان کردہ ولادت مسیح کی کہانی پر یقین کر لیں کہ اس موسم میں گڈریے رات کے وقت اپنی بھیڑوں کے گلّہ کی نگرانی بیت لحم کے قریب کھیتوں میں کرتے تھے تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش موسم سرما میں نہیں ہوئی جبکہ رات کو ٹمپریچر اتنا گر جاتا ہے کہ یہودیہ کے پہاڑی علاقہ میں برف باری ایک عام بات ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا کرسمس ڈے کافی بحث و تمحیص کے بعد قریباً ۳۰۰ء میں متعین کیا گیا ہے'' (ص ۷۹)

پس اِن حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ مسیح کی پیدائش دسمبر میں نہیں ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب حضرت مریم کو دردِ زہ ہوئی تو وہ ایک کھجور کے نیچے گئیں اور کھجور اُس وقت موجود تھی۔لیکن انجیل جس زمانہ کی خبر دیتی ہے اُس وقت کھجور نہیں ہوتی۔میں نے بتایا ہے کہ درحقیقت انجیل کی غلط بیانی کی ایک وجہ موجود ہے اور وہ کہ لوقا بتاتا ہے کہ مسیح سے حاملہ ہونے پر صرف مریم ہی کو خبر نہیں ہوئی بلکہ جب وہ اپنی بہن الزبتھ کو ملنے گئیں جو زکریا کی بیوی تھیں تو اُن کے پیٹ میں یحییٰ خوشی سے ہلا جس سے یہ بات دوسروں میں بھی پھیل گئی کہ مریم حاملہ ہے۔پھر قرآن تو خاموش ہے۔لیکن انجیل بتاتی ہے کہ حضرت مریم کو جب فرشتہ نے خبر دی کہ تُو حاملہ ہوگی تو انہوں نے صرف تعجب کا ہی اظہار نہیں کیا کہ بغیر خاوند کے مجھے کس طرح حمل ہوسکتا ہے بلکہ وہ اس پر خوش ہوئیں اور انہوں نے کہا کہ ’’دیکھ میں خداوند کی بندی ہوں میرے لئے تیرے قول کے موافق ہو‘‘(انجیل لوقا باب ۱ آیت ۳۸) اب اس چیز کے ساتھ یہ بات ملتی نہیں کہ جب حمل ہو چکا تھا اور لوگوں پر ظاہر ہو چکا تھا کہ یہ بچہ روح القدس سے ہے باپ سے نہیں۔اور مریم کو بھی فرشتے کی وجہ سے تسلی ہوگئی تھی اور وہ خوش تھیں کہ مجھے ایسا حمل ہوا ہے تو پھر وہ اپنی جگہ سے غائب کیوں ہوئیں کیونکہ ساری انجیلیں اِس بات پر متفق ہیں کہ بچہ کسی اور جگہ ہوا۔سوال یہ ہے کہ کسی اور جگہ کیوں ہوا۔اپنے وطن میں ہی کیوں نہ ہوا؟ اس بات کو چھپانے کے لئے کہ غائب ہونے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنا بچہ چھپانا چاہتی تھیں لوقا کہتا ہے کہ چونکہ وہ مردم شماری کا وقت تھا اس لئے وہ اپنے نام لکھوانے کے لئے وہاں گئے تھے اور مردم شماری کا مہینہ دسمبر بتایا جاتا ہے۔اِس سے اُن کی غرض یہ تھی کہ شہر والوں پر یہ ظاہر کریں کہ مسیح دسمبر میں پیدا ہوا ہے اور اُس دن سے نو مہینے پورے ہوجاتے ہیں جب یوسف اُسے اپنے گھر میں لایا اور اس طرح حمل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔لیکن قرآن نے تو اصل واقعہ بیان کرنا تھا۔اِس لئے اُس نے اُس وقت سے تاریخ بیان کی ہے جب وہ روح القدس سے حاملہ ہوئی۔اور بائبل نے اُس وقت سے تاریخ بنانے کی کوشش کی ہے جب وہ یوسف کے گھر میں آئی۔تم یوں سمجھ لو کہ قرآنی بیان کے مطابق حضرت مریم نومبر میں حاملہ ہوئیں اِس لحاظ سے نو مہینے جولائی کے آخر میں ختم ہوجاتے ہیں۔چونکہ بعض بچے ۸۱/۲ ماہ بعد بعض ۹ ماہ بعد اور بعض ساڑھے نو ماہ بعد پیدا ہوتے ہیں۔اِس لئے ہم اندازاً کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ ۱۵ جولائی سے ۱۵ اگست تک کسی وقت میں پیدا ہوئے اور اُس وقت کھجور بکثرت ہوتی ہے لیکن انجیل کہتی ہے کہ وہ ۲۵ دسمبر کو پیدا ہوئے۔اب ہم ۲۵ دسمبر سے اُلٹ حساب کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو ۲۵ مارچ کو حمل ہوا۔اور چونکہ عیسائیوں نے مسیح کی پیدائش اُس وقت کی بتائی ہے جبکہ یوسف کے مریم کو گھر لانے کے بعد نو ماہ ہوتے تھے

اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ مارچ میں کسی وقت یوسف اُن کو اپنے گھر میں لایا۔نومبر میں وہ حاملہ ہوئی تھیں۔فرض کرو ۱۵ نومبر کو وہ حاملہ ہوئیں۔چوتھے مہینے جا کر حمل نمایاں ہوجاتا ہے چوتھے مہینے جب بات کھلی تو یوسف خدا کے حکم سے اُن کو اپنے گھر میں لے آیا۔اب لوگوں کو یہ بتانے کے لئے کہ یہ حلال کا حمل ہے حرام کا نہیں عیسائیوں نے مارچ سے حساب لگایا اور اس کے ٹھیک ۹ ماہ بعد دسمبر میں اُس کی پیدائش بتائی۔پس عیسائی مجبور تھے کہ وہ اُن کی تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ہی بتاتے ورنہ لوگوں کو کیا جواب دیتے کہ خاوند کے گھر میں مارچ میں آئی اور بچہ پیدا ہوگیا جولائی اگست میں۔اس کا ایک ہی طریق تھا کہ وہ اُن کی تاریخ پیدائش کو چھپا دیتے اور کسی بعد کے مہینہ میں اُن کی ولادت ظاہر کرتے۔

یوں سمجھ لو کہ نومبر میں مریم حاملہ ہوئیں مارچ میں پیٹ بڑا ہوگیا اور یوسف تک بات پہنچی اُس نے ارادہ کیا کہ میں طلاق دیدوں۔مگر خدا تعالیٰ نے خواب میں بتلایا کہ یہ بدکار نہیں بلکہ اسے معجزانہ طور پر حمل ہوا ہے۔چنانچہ مارچ میں وہ انہیں گھر لے آیا۔ممکن ہے فروری میں ہی لے آیا ہو مئی جون میں کوئی عذر کر کے وہ ان کو ناصرہ سے باہر لے گیا۔اب خاوند ساتھ تھا اور اُسے یقین تھا کہ یہ خدائی فعل ہے وہ انہیں شہر سے باہر لے گیا۔جولائی کے آخر یا اگست میں حضرت مسیح پیدا ہوئے۔چند سال یوسف باہر رہے جب واپس آئے تو پیدائش دسمبر کی بتائی۔یا یوں کہو کہ یوسف نے تو پیدائش ٹھیک ہی بتائی انجیل نے ان کی پیدائش دسمبر میں بتائی جو مارچ میں مریم کو گھر لانے کی صورت میں ۹ ماہ بعد کی تھی تا کہ لوگ سمجھیں کہ مسیح یوسف کی اولاد سے ہے اس صورت میں کھجور کا معاملہ بھی صاف ہوجاتا ہے کیونکہ جولائی اگست میں کھجوریں بکثرت لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ظاہر ہے کہ جب یوسف اس واقعہ سے شرماتا تھا اور جب وہ اس پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا تو اُس کے سوا کیا صورت تھی کہ وہ حمل اُس وقت سے ظاہر کرتا جب مریم اُن کے گھر آ گئی تھیں اور اس صورت میں اس کے حمل کو چار پانچ ماہ بعد کا ظاہر کرنا ضروری تھا۔اور اسی طرح پیدائش بھی چار پانچ ماہ بعد کی ظاہر کرنی ضروری تھی۔ممکن ہے سات سال کے بعد جو مردم شماری ہوئی وہ دسمبر میں ہوئی ہو اور اس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے لوقا نے اُسے پیدائش کے سال پر چسپاں کر دیا ہو۔ظاہر ہے کہ لوقا نے ستر اسی سال بعد کتاب لکھی ہے اتنے عرصہ بعد کسی کو کیا یاد رہتا ہے کہ کب مردم شماری ہوئی تھی۔اس تشریح سے جو نہایت اہم تشریح ہے اور جو رومن تاریخ کے واقعات سے موید ہے اور انجیل کی روایات کی روشنی اس کی تائید کرتی ہے قرآن میں پھل دار کھجور کے ذکر کا واقعہ صاف ہوجاتا ہے۔

فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ

پس ان کو کھاؤ اور (چشمہ سے پانی بھی) پیو اور (خود نہا کر اور بچہ کو نہلا کر) اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو۔ پھر اگر (اس

فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ

عرصہ میں) تو کسی مرد کو دیکھے تو کہہ دے میں نے رحمن (خدا) کے لئے ایک روزے کی نذر کی ہوئی ہے پس آج

اِنْسِيًّا ۚ﴿۲۷﴾

میں کسی انسان سے بات نہیں کروں گی۔

تفسیر ۔خدا نے کہا کہ کھاؤ اور پیو۔ اور آنکھیں ٹھنڈی رکھو۔ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا اور اگر تمہیں کوئی شخص نظر آئے۔ تو فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا اُسے کہو کہ آج میں نے خدا کے لئے روزہ رکھا ہوا ہے پس آج میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں روزہ سے مراد خاموشی کا روزہ ہے یعنی اُن کے لئے کلام کرنا بالکل ممنوع تھا (فتح البیان)۔ لیکن میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ دراصل حضرت مریم کو بھی حضرت زکریا کی طرح روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تھا اور حضرت زکریا کے متعلق میں بتا چکا ہوں کہ اُنہیں اونچی آواز سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے سے روک دیا گیا تھا لیکن آہستہ بولنا اُن کے لئے جائز تھا۔ یہاں بھی اِسی رنگ کا روزہ مراد ہے یعنی حضرت مریم کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ زیادہ باتیں نہیں کرنی بلکہ اپنا وقت ذکرِ الٰہی میں بسر کرنا۔ پس روزہ سے مراد وہ روزہ نہیں جس میں کھانا پینا ترک کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس وقت تو وہ نفاس کی حالت میں تھیں اور وہ روزہ اُس وقت ہوتا ہی نہیں۔ اور پھر خصوصاً اس لئے بھی وہ روزہ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے كُلِيْ وَ اشْرَبِيْ کھا اور پی جس سے معلوم ہوا کہ کھانا پینا اُن کے لئے منع نہیں تھا۔ پس یہاں صوم سے مراد یہ ہے کہ زیادہ باتیں نہیں کرنی زیادہ باتیں میں اس لئے کہتا ہوں کہ ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے کہا ہے قُوْلِيْۤ کہو۔ اگر بات بالکل منع تھی تو وہ کہہ کس طرح سکتی تھیں کہ میں روزہ سے ہوں۔ یہ لفظ صاف بتاتا ہے کہ اُنہیں بات کرنا بالکل منع نہ تھا وہ ایک حد تک بات کر سکتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ہدایت تھی کہ اپنے وقت کو ذکرِ الٰہی میں بسر کریں۔ اِس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ ابھی بچہ پیدا ہوا تھا اس لئے لازماً جو بھی ملتا وہ ضرور پوچھتا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

فرما دیا کہ آج ذکر الٰہی کرو اور اگر کوئی شخص تم سے کچھ پوچھنا چاہے تو اُسے بھی کہہ دو کہ آج میں نے ذکر الٰہی کرنا ہے۔ اِس طرح بات ختم ہو جائے گی اور اگلی بات پیدا ہی نہیں ہو گی۔ پس صوم سے مراد کلام کی حد بندی ہے یعنی فضول اور لغو باتیں نہیں کرنی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔

اس سے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ نفاس اور حیض کی حالت میں ذکر الٰہی منع نہیں۔ لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی حالت میں دل میں بھی ذکر الٰہی نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ اگر ذکر الٰہی منع ہو جائے تو روحانیت بالکل مر جائے بلکہ بعض لوگ تو مُنہ سے بھی ذکر الٰہی کرنا جائز سمجھتے ہیں حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ عورت حیض کے دنوں میں بھی قرآن کو کسی کپڑے یا رومال سے پکڑ کر اور پھر صاف ستھرے کپڑے پر رکھ کر پڑھ سکتی ہے ہاتھ سے پکڑنا اس لئے منع ہے کہ ممکن ہے ہاتھ کو حیض کی نجاست لگی ہوئی ہو۔ چنانچہ جن عورتوں نے حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ سے قرآن پڑھا ہے وہ اب بھی حیض کے ایام میں کپڑے پر قرآن رکھ کر پڑھ لیتی ہیں۔ میرا یہ عقیدہ نہیں لیکن اگر کوئی پڑھے تو ہم اُسے کہتے کچھ نہیں۔ کیونکہ قرآن بہرحال خدا تعالیٰ کا کلام ہے اگر کسی کے نزدیک حیض کی حالت میں اُسے دیکھ کر پڑھنا جائز ہو تو کیا حرج ہے۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۸﴾

اس کے بعد وہ اس کو لے کر اپنی قوم کے پاس اس کے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہوئی آئی۔ جنہوں نے کہا اے مریم تُو نے بہت بُرا کام کیا ہے۔

تفسیر۔ مفسرین اس کے یہ معنے کرتے ہیں کہ جب وہ وہاں سے فارغ ہوئیں اور چلنے پھرنے کے قابل ہوئیں تو اپنی قوم کے پاس آئیں۔ بچہ اُن کی گود میں تھا۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ مریم تُو نے یہ کیا بلا ماری ہے حضرت مریم نے کہا مجھ سے کیا پوچھتے ہو اس بچہ سے پوچھ لو (تفسیر ابن کثیر)۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ اُس وقت بولے اور انہوں نے کہا کہ میں خدا کا نبی ہوں۔ گویا مسیح کا پہلا معجزہ ہی جھوٹا تھا۔ وہ نبی نہیں تھا مگر اُس نے کہا میں نبی ہوں۔ وہ نماز نہیں پڑھتا تھا مگر اُس نے کہا خدا نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے حالانکہ وہ اُس وقت پوتڑوں میں پاخانہ پھرتا تھا گویا مفسرین کے نزدیک حضرت مسیح ابھی اپنی ماں کی گود میں ہی تھے کہ انہوں نے جھوٹ بولنے کی مشق شروع کر دی اور

جب اُن پر نماز فرض نہیں تھی کہنے لگے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور جب پوری طرح ہوش بھی نہیں تھا تو کہنے لگے کہ میں نبی ہو گیا ہوں اس بارہ میں اُن کا استدلال تَحۡمِلُهٗ اور يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ (آل عمران:۴۷) سے ہے۔

اب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارہ میں کیا کہتی ہے۔ مرقس کہتا ہے کہ وہ یوحنا کے ظہور کے وقت ناصرہ میں تھا۔ (انجیل مرقس باب ا آیت ۹)

متی باب ۴ آیت ۱۳ میں بھی لکھا ہے کہ جب یوحنا گرفتار ہوا تو مسیح ناصرہ چھوڑ کر کفر ناحوم ایک گلیلی شہر میں گیا گویا وہ یہ تو نہیں بتاتے کہ پیدائش کے بعد حضرت مسیح ناصرہ کب گئے مگر یہ بتاتے ہیں کہ جب یوحنا کا ظہور ہوا تو اُس وقت وہ ناصرہ میں تھے اور اس کی گرفتاری پر وہ کفرناحوم چلے گئے۔ اِس سے پتہ لگا کہ حضرت مسیحؑ جب جوان ہوئے تو ناصرہ میں آتے جاتے تھے۔ لوقا سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش کے کچھ دنوں بعد یوسف اور مریم ناصرہ چلے گئے اور وہیں مسیح پلا۔ (انجیل لوقا باب ۲ آیت ۳۹) گویا یوحنا اِس بارہ میں بالکل خاموش ہے۔ متی کچھ نہیں کہتا کہ وہ پیدا ہو کر کہاں گئے۔ مرقس کچھ نہیں کہتا کہ وہ پیدا ہو کر کہاں گئے۔ لیکن لوقا کہتا ہے کہ وہ ناصرہ گئے۔

لوقا باب ا آیت ۲۶ و ۲۷ میں لکھا ہے کہ خدا کا فرشتہ مریم پر ناصرہ میں ظاہر ہوا اور وہیں اُسے حاملہ ہونے کی خوشخبری دی۔ یہ حوالہ بتاتا ہے کہ حضرت مریم ناصرہ میں رہتی تھیں مردم شماری کے لئے بیت لحم گئیں اور پھر بچہ پیدا ہونے پر ناصرہ میں آ گئیں اور حضرت مسیح وہیں ناصرہ میں رہے یہاں تک کہ یوحنا نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

اِس روایت کے مطابق حضرت مریم ناصرہ کی رہنے والی تھیں اور وہیں وہ مسیح کو لے گئیں اور لے جانے کا وقت پیدائش کے معاً بعد کا ہے اگر یہ بیان درست ہے تو معلوم ہوا کہ مسیح کو اس کی والدہ پیدائش کے معاً بعد اپنے وطن لے گئی تھیں جس کا نام ناصرہ تھا۔ اس صورت میں اِن آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ مسیح نے پیدا ہوتے ہی کلام کیا۔ کیونکہ قرآنی الفاظ یہ ہیں کہ فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا حضرت مریم اپنے رشتہ داروں اور تعلق والوں کے پاس اُن کو لائیں اور مسیح نے اُن سے کلام کیا۔ پس اگر یہ صحیح ہے کہ وہ ناصرہ کی رہنے والی تھیں اور ناصرہ میں ہی اپنے بچے کو لے گئیں اور پیدائش کے چند دن بعد لے گئیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح نے پیدائش کے چند دن بعد ہی یہ کلام کیا۔ لیکن اب ہم تحقیق کرتے ہیں کہ کیا لوقا کا یہ بیان ٹھیک ہے کہ مریم ناصرہ کی تھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیان درست نہیں۔

متی میں لکھا ہے کہ جب مسیح پیدا ہوا تو اُس وقت مریم بیت لحم میں تھیں لیکن وہ اصل وطن کا ذکر نہیں کرتا بلکہ باب ۲ میں جو ذکر ہے اُس سے شبہ ہوتا ہے کہ اُن کا وطن بیت لحم کے سوا کوئی اور تھا مگر وہ بیت لحم کے قریب ہی تھا۔ اس

کے بعد اُس میں لکھا ہے کہ چونکہ بادشاہ ہیرودیس کو شبہ تھا کہ یہ لڑکا جو پیدا ہوا ہے بڑا ہو کر حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرے گا کیونکہ مجوسی فقیروں نے اُسے بتایا تھا کہ ایسا لڑکا پیدا ہوا ہے اور ہم پورب میں اُس کا ستارہ دیکھ کر آئے ہیں اس لئے ہیرودیس نے انہیں کہا کہ جب تمہیں اُس کا پتہ ملے تو مجھے بھی بتانا۔ اُس کی غرض یہ تھی کہ میں اُسے مروا ڈالوں گا تا کہ حکومت کو نقصان نہ پہنچے مگر متی کہتا ہے جب مجوسی آئے اور انہوں نے حضرت مسیح کو دیکھ لیا تو رات کو فرشتہ نے اُنہیں کہا کہ اب ہیرودیس کے پاس نہیں جانا چنانچہ وہ کسی دوسرے راستہ سے اپنے ملک کو روانہ ہو گئے ۔ان کے جانے کے بعد یوسف پر فرشتہ ظاہر ہوا اور اُس نے کہا کہ بادشاہ اس بچہ کو مروانا چاہتا ہے تو اُٹھ اور بچے اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر مصر میں بھاگ جا۔ چنانچہ یوسف اور مریم بچے کو لے کر مصر میں چلے گئے۔ اِدھر جب بادشاہ نے دیکھا کہ مجوسی واپس نہیں آئے بلکہ کسی اور راہ سے اپنے ملک کو واپس چلے گئے ہیں تو اُسے سخت غصہ آیا اور اُس نے حکم دے دیا کہ بیت لحم اور اُس کے گرد و نواح کے وہ تمام لڑکے جو دو سال یا اس سے چھوٹی عمر کے ہوں قتل کر دئے جائیں (یہ قصہ دراصل موسیٰؑ کی نقل میں بنایا گیا ہے) بہر حال یوسف خدا سے خبر پا کر مسیح کو مصر لے گیا اور خدا تعالیٰ نے کہا کہ تو اُس وقت تک مصر میں ہی رہ جب تک کہ میں دوبارہ تجھ کو کوئی خبر نہ دُوں (متی باب ۲)

اب دیکھو یہ بیان لوقا سے کتنا مختلف ہے لوقا کہتا ہے کہ مریم پیدائش کے معاً بعد ناصرہ گئیں اور متی کہتا ہے کہ وہ مصر گئیں اور متی کہتا ہے ۔کہ یہ قیاسی بات نہیں بلکہ الہاماً یوسف کو کہا گیا کہ تُو نے وطن واپس نہیں جانا بلکہ مصر جانا ہے۔اور پھر الہاماً کہا کہ تُو نے مصر سے نہیں ہلنا جب تک کہ میں دوبارہ تجھ پر الہام نازل نہ کروں ۔ چنانچہ وہ وہاں رہے ۔ یہاں تک کہ ہیرودیس مر گیا۔ پھر خدا نے اُس کو خبر دی ۔کہ اب ہیرودیس مر گیا ہے تو واپس اسرائیل کے ملک میں چلا جا۔لیکن جب یوسف واپس آیا اور اُسے معلوم ہوا کہ اَرخَلاؤس اپنے باپ کی جگہ پر بیٹھا ہے تو وہ ڈرا کہ اگر میں اسرائیل کے ملک یعنی یہودیہ میں گیا تو مجھے مار ڈالیں گے (اس سے معلوم ہوا کہ بائبل کی رُو سے وہ جوڈیا یعنی یہودیہ کے کسی شہر کا باشندہ تھا) تب خدا سے اطلاع پا کر (گویا خدا تعالیٰ کو اَرخَلاؤس کا پہلے علم نہ تھا) وہ جلیل کے ایک شہر ناصرہ میں جا کر رہا تا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا (انجیل متی باب ۲ آیت ۱ تا ۲۳) اس حوالہ سے کتنی باتیں ظاہر ہوتی ہیں

۱۔اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح بیت لحم میں پیدا ہوا۔

۲۔ پیدائش کے بعد یوسف خدا تعالیٰ کے حکم کے ماتحت مریم اور بچہ کو لے کر مصر گیا۔

۳۔مصر میں وہ ہیرودیس کی وفات تک رہا۔

۴۔ ہیرودیس کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے اُسے اپنے ملک میں واپس جانے کے لئے کہا۔
۵۔ مگر جب وہ وطن میں واپس جانے سے ڈرا تو خدا تعالیٰ سے علم پا کر وہ گلیل کے شہر ناصرہ میں گیا۔
۶۔ اور خدا نے کہا کہ تو ناصرہ میں اس لئے جا تا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔

اگر وہ ناصرہ کے رہنے والے ہوتے تو خدا کیوں کہتا کہ تُو ناصرہ چلا جا تا کہ وہ جو نبیوں نے کہا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا۔ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ یوسف ناصرہ کا رہنے والا نہیں تھا بلکہ اس کا وطن کوئی اور تھا۔ ناصرہ میں مصر سے واپس آنے کے بعد اُس نے قیام کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسیحؑ کا وطن ناصرہ نہ تھا۔ وہ ناصرہ پیدائش کے معاً بعد نہیں گیا بلکہ مصر سے واپسی پر گیا ۔ اگر فوراً بھی گیا تو ناصرہ میں رشتہ داروں سے گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہاں اُس کے کوئی رشتہ دار نہ تھے اور قرآن رشتہ داروں سے گفتگو کا ذکر کرتا ہے کیونکہ فرماتا ہے کہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا وہ اُسے اپنے رشتہ داروں اور قوم کے لوگوں کے پاس لائی۔

اب ہمیں اِن دونوں بیانوں سے پتہ لگ گیا کہ اگر لوقا کا بیان صحیح ہے کہ پیدائش کے کچھ دنوں کے بعد یوسف اور مریم ناصرہ چلے گئے تو متی کے حوالہ سے پتہ لگتا ہے کہ ناصرہ ان کا وطن نہیں تھا پس اگر ماں مسیح کو ناصرہ لے گئی تھی تب بھی وہاں اُن کے بولنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن اُن کے بولنے کا ذکر وہاں کرتا ہے جہاں اُن کی قوم کے لوگ تھے اور اگر وہ مصر میں رہا اور پھر ناصرہ گیا جو اس کا وطن نہیں تھا تو بچپن میں بھی بولنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ بائبل کے بیان کے مطابق یوحنا کے دعوے بلکہ اس کی گرفتاری تک وہ ناصرہ میں رہا۔ پس یہ کلام یوحنا کے دعویٰ تک کے زمانہ کا بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ اُس وقت تک ناصرہ میں تھا۔

متی سے پتہ لگتا ہے کہ مسیح یروشلم میں دو دفعہ گیا ہے جس کے اردگرد اُن کا وطن تھا۔ ایک دفعہ بارہ برس کی عمر میں اور ایک دفعہ بتیس سال کی عمر میں بارہ سال کی عمر میں جب وہ یروشلم آیا تو اس وقت کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ وہ بزرگوں کی باتیں سنتا تھا اور کھیل کود میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اِس کے بعد وہ ۳۲ سال کی عمر میں دوبارہ یروشلم آیا اور اسی علاقہ میں اُس کے رشتہ دار ثابت ہوتے ہیں پس اِن دو سفروں میں کسی ایک سفر میں ہی اس کا رشتہ داروں سے یہ مکالمہ ہو سکتا ہے اور غالباً یہ مکالمہ دوسرے سفر میں تھا جب وہ مسیحیت کی تبلیغ کرنے کے لئے یروشلم آیا جس کی نسبت لکھا ہے کہ وہ اس کی بعثت کے قریباً تیسرے سال میں ہوا تھا۔ جبکہ وہ دو سال سے اپنے دعویٰ کا اعلان کر چکا تھا۔ (انجیل متی باب ۲۱) اُس وقت اس کے مُنہ سے یہ کلمات جو قرآن کریم نے کہے ہیں بالکل درست ثابت

ہوتے ہیں۔ پہلے سفر کے حالات جب وہ بچہ تھا اس پر چسپاں نہیں ہوتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ رشتہ داروں سے مسیحؑ نے باتیں کیں۔انجیل کہتی ہے کہ پیدائش کے بعد مسیحؑ ناصرہ گیا وطن نہیں گیا۔ پس وطن کسی دوسرے وقت میں گیا اور دوسری جگہ یروشلم کا گردونواح ہے جہاں اُس کا جانا دو دفعہ ثابت ہے۔ایک دفعہ بچپن میں جب اُس کی ماں اور باپ اُس کے حالات سے ابھی نا آشنا تھے اور دوسری دفعہ جب وہ مدعی ہوکر گیا۔ پس یہ گفتگو اُسی وقت ہوئی۔اس سے پتہ لگ گیا کہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ سے وہ زمانہ مراد ہے جب مسیح ۳۳ سال کے ہو چکے تھے اور دعویٰ نبوت کر چکے تھے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے تَحْمِلُهٗ سے کیا مراد ہے بچہ کو تو ماں اُسی وقت اُٹھاتی ہے جب وہ چھوٹا ہوتا ہے۔ سو یاد رکھنا چاہیے کہ بیشک اس کے ایک معنے گود میں اٹھانے کے ہیں۔لیکن اِس کے علاوہ مجازی طور پر یہ کسی کا ساتھ دینے اور اس کی تائید اور نصرت کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔قرآن کریم میں آتا ہے مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا (الجمعة:۶) یعنی وہ لوگ جن پر تورات رکھی گئی تھی لیکن انہوں نے اُس کو اُٹھایا نہیں۔اب دیکھو یہاں حمل کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مگر حُمِّلُوا کے یہ معنے نہیں کہ تورات ان کے سروں پر رکھ دی گئی تھی بلکہ اُس کی تائید کرنے کا ان کو حکم دیا گیا تھا۔اور جب خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ لَمْ يَحْمِلُوْهَا تو اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ ہر یہودی نے تورات اپنے ہاتھ سے پھینک دی تھی۔ بلکہ مطلب یہ تھا کہ انہوں نے تورات کی تبلیغ اور تائید چھوڑ دی تھی۔ چنانچہ مفردات امام راغب میں مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا کے معنی کرتے ہوئے لکھا ہے کُلِّفُوْا اَنْ يَقُوْمُوْا بِحَقِّهَا فَلَمْ يَحْمِلُوْهَا یعنی یہودیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ تورات کے واجبات کو ادا کریں اُس کی ظاہری اور باطنی طور پر تائید وحفاظت کریں اور اُس کے احکام پر خود بھی عامل ہوں اور دوسروں کو بھی اس کی تبلیغ کریں لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔گویا خدا تعالیٰ نے حُمِّلُوا کہا مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ ہر یہودی کے سر پر تورات رکھی گئی تھی اور خدا تعالیٰ نے لَمْ يَحْمِلُوْهَا۔ کہا مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ ہر یہودی نے تورات اُٹھا کر پھینک دی تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ انہوں نے تورات نہیں اُٹھائی تو انہوں نے ظاہر میں تورات اُٹھائی ہوئی تھی اور جب خدا تعالیٰ نے کہا کہ تورات اُن پر رکھی گئی تو ظاہر میں اُن کے سروں پر کوئی تورات نہیں تھی۔ پس حمل کے معنے کبھی تائید اور نصرت اور ساتھ دینے کے بھی ہوتے ہیں۔انجیل کہتی ہے کہ مسیحؑ پر اُن کی ماں ایمان نہیں لائی (مرقس باب ۳ آیت ۳۱ تا ۳۵) لیکن قرآن کہتا ہے کہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ جب انہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ماں اُن کے ساتھ اُن کی تصدیق کرتی اور اُن کے دعویٰ کی تائید کرتی ہوئی آئی۔اِسی طرح تَحْمِلُهٗ کے معنی حوصلہ دلانے اور ہمت

بڑھانے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ پس اَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کے یہ معنے نہیں کہ حضرت مریم مسیح کو اُٹھائے ہوئے تھیں بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ مسیحؑ کی تعلیم پر عمل کرنے والی اور اس کی تصدیق کرنے والی تھیں۔ گویا انجیل نے جو الزام لگایا تھا کہ مریم حضرت مسیح کو نہیں مانتی تھی قرآن کریم نے اَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کے الفاظ میں اس کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے وہ تو مسیحؑ کے ساتھ ساتھ آئی تھیں اور کہتی تھیں کہ میں اس پر ایمان لاتی ہوں یہ سچا ہے۔ تم کہتے ہو یہ حرام کا بچہ ہے کیا حرام کے بچے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ تم اس سے بات کر کے تو دیکھو تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ یہ حلال زادہ ہے یا نہیں۔

قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا انہوں نے کہا اے مریم تُو نے یہ کیا گند پھیلایا ہے۔ پہلے تُو نے ایک گندہ کام کیا اور آگے یہ بھی خدا پر جھوٹ بولنے لگ گیا۔ گویا انہوں نے یہ طعن کیا کہ چونکہ یہ حرام کا تھا اس لئے ایسی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔

يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۹﴾

اے ہارون کی بہن! تیرا باپ تو بُرا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی۔

تفسیر ۔ یعنی اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو برا آدمی نہیں تھا اور تیری ماں بھی بدکار نہیں تھی پھر یہ کیا اندھیر ہو گیا ہے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت مریم کی دوسری والدہ سے ایک اور بھائی تھا جس کا نام ہارون تھا (تفسیر مظھری) لیکن یہودی تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اِس لئے ایسی بے دلیل بات پیش نہیں کی جا سکتی۔ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مریم کو ہارون کی بہن اس لئے کہا کہ وہ ان کی نسل میں سے تھیں۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ الزبتھ جو حضرت زکریا کی بیوی تھیں بائبل سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہارون کے خاندان میں سے تھیں اور چونکہ یہ اُن کی رشتہ دار تھیں اس لئے قرآن نے اُن کو اُن کے قبیلہ کی زبان میں اُختِ ہارون کہہ دیا (دیکھو القرآن از جارج سیل زیر آیت یٰۤاُختِ ھارون) یہ اُن عیسائیوں نے تشریح کی ہے جو منصف مزاج ہیں اور تعصب کا مادہ اپنے اندر نہیں رکھتے۔ بعض عیسائیوں نے تو اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تاریخ سے ایسے ناواقف تھے کہ اُنہیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ہارون حضرت مسیح سے چودہ سو سال پہلے گذرے ہیں (ینابیع الاسلام صفحہ ۱۰۴) لیکن بعض دوسرے عیسائیوں نے خود اس اعتراض کو ردّ کیا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ

بات غلط ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو موسیٰ اور ہارون کے زمانہ کا خوب علم تھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہی کئی جگہ ذکر آتا ہے کہ موسیٰ اور ہارون کے بعد فلاں فلاں نبی آئے پس یہ اعتراض صحیح نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ چونکہ حضرت زکریا کی بیوی الزبتھ ہارون کے خاندان میں سے تھیں اور مریم اُن کی رشتہ دار تھیں اِس لئے انہوں نے حضرت مریم کو بھی ہارون کی بہن کہہ دیا۔ (تفسیر القرآن از وہیری)

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایک دفعہ یہ اعتراض پیش ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہود انبیاء وصلحاء کے نام پر اپنے اپنے خاندان کے مردوں اور عورتوں کے نام رکھ لیا کرتے تھے (تفسیر فتح البیان جلد ۶ وتفسیر ابن جریر جلد ۱۶) لیکن میرے نزدیک اس کے ایک اور معنے بھی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت مریم کو ہارون کی بہن طنز کے طور پر کہا ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی ایک سوتیلی بہن تھی۔ جو ہارون کی سگی تھی یا بعض مورخوں کے نزدیک وہ حضرت موسیٰ کی سوتیلی بہن نہیں بلکہ سالی تھی اور اس کا نام بھی مریم تھا۔ گنتی باب ۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مریم نے جو ہارون کی سگی بہن اور حضرت موسیٰؑ کی سوتیلی بہن تھی اور بعض کے نزدیک حضرت موسیٰ کی سالی تھی۔ بہرحال ہارون سے اُس کا زیادہ رشتہ تھا اور موسیٰؑ سے کم۔ ہارون کے ساتھ مل کر ایک کوشی عورت سے شادی کرنے کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کئے تھے (آیت ۱)۔ قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ یہ اعتراض اس حد تک تھا کہ گویا ناجائز تعلق قائم کیا گیا ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (الاحزاب: ۷۰) یعنی اے ایمان والو تم اُن لوگوں کی طرح مت بنو جنہوں نے موسیٰؑ کو اذیت دی اور پھر خدا نے اُس کی بریت کی۔ معلوم ہوتا ہے یا تو اُن کا یہ اعتراض تھا کہ ایک بدکار عورت سے موسیٰ نے شادی کرلی ہے اور یا یہ تھا کہ کسی شادی شدہ عورت سے شادی کرلی ہے۔ بہرحال پتہ لگتا ہے کہ اُن پر ناجائز رشتہ کا الزام لگایا گیا تھا۔ بائبل میں لکھا ہے کہ اس جرم کی سزا میں مریم کو کوڑھی کر دیا گیا (گنتی باب ۱۲ آیت ۱۰)۔ مگر چونکہ بائبل ایک طرف یہ بتاتی ہے کہ ہارون اور مریم دونوں نے اعتراض کیا اور دوسری طرف بائبل سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف مریم کو سزا ملی ہارون کو سزا نہیں ملی۔ اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہارون کا نام بائبل میں حسب معمول انبیاء پر اعتراض کرنے کے شوق میں درج کیا گیا ہے ورنہ ایک ہی جرم میں دونوں کو سزا کیوں نہ ملتی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہارون نے اعتراض نہیں کیا صرف مریم نے اعتراض کیا تھا۔ آخر ہارون کی سفارش پر حضرت موسیٰؑ نے خدا تعالیٰ سے دعا کی اور مریم کا قصور معاف کیا گیا اور صرف سات دن اسے کوڑھی بن کر رہنا پڑا۔ لیکن اس جرم سے پہلے جس شان اور عظمت کے ساتھ اُس کا ذکر کیا جاتا

ہے تھا اس شان اور عظمت سے بعد میں اُس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ بعض تو اس کی طرف اور بھی عیوب منسوب کرتے ہیں۔ پس میرے نزدیک یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ کہہ کر انہوں نے طعنہ دیا ہے کہ اے ہارون کی بہن یعنی جس طرح اس مریم نے قہر مارا اور وہ کوڑھی ہوگئی تھی اسی طرح تو نے بھی کوڑھیوں والا کام کیا ہے۔ پس ان الفاظ میں اُن کی طعنہ زنی تھی کہ اُس مریم نے بھی طوفان اٹھایا تھا تُو نے بھی طوفان اُٹھایا ہے۔ اس نے موسیٰ پر بدکاری کا الزام لگایا تھا اور تُو نے آپ بدکاری کی ہے حالانکہ تیرا باپ بُرا نہیں تھا اور تیری ماں بھی بُری نہیں تھی پس تُو نے یہ کیا گند اُچھالا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ

اس پر اُس نے اُس (بچہ) کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر لوگوں نے کہا ہم اس سے کس طرح باتیں کریں جو کہ کل تک

صَبِيًّا ﴿۳۰﴾

پنگھوڑے میں بیٹھنے والا بچہ تھا۔

تفسیر ۔ جیسا کہ میں اُوپر بتا چکا ہوں ہمارے نزدیک حضرت مسیح کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی تھی اور الٰہی نشان کے طور پر ہوئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ فعل اس لئے کیا کہ حضرت موسیٰؑ کی نسل سے جو نبیوں کا سلسلہ چلا آرہا تھا خدا تعالیٰ اس کو ختم کر کے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل کرنا چاہتا تھا اور یہ سلسلہ اتنا لمبا ہوگیا تھا کہ بنو اسحاق کے خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نبوت اُن کے گھروں سے منتقل ہو کر اب کسی اور قوم میں چلی جائے گی اس کے لئے ایک بڑی ٹھوکر کی ضرورت تھی اور وہ ٹھوکر حضرت مسیحؑ کی بن باپ پیدائش تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک معجزہ تھا۔ مگر یہ معجزہ ایک ابتلاء کا رنگ لئے ہوئے تھا۔

معجزے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معجزے ہدایت دینے کے لئے اور لوگوں پر حجت تمام کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ ایسے معجزے ہوتے ہیں جن کو دشمن سے بھی منوایا جاسکتا ہے۔ اگر منوایا نہ جاسکے تو وہ حجت کس طرح ہوسکتے ہیں۔ پس جو معجزے حجت کے لئے آتے ہیں وہ ایسی ہی شکل میں آتے ہیں جن کو منوایا جاسکے۔ مثلاً ایک پیشگوئی ہے جسے شائع کر دیا گیا۔ دشمن نے اُس پر بحث کی۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر جرح کی اور پھر وہ پیشگوئی پوری ہوگئی تو اُس کا کوئی دشمن انکار نہیں کرسکتا۔ سوائے اُن کے جو ضدی طبیعت کے ہوں یا مثلاً قرآن کریم کا معجزہ ہے یہ ایسا معجزہ ہے جو عیسائی سے بھی منوایا جاسکتا ہے ہم اُسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن سامنے پڑا ہے اگر ہمت ہے تو

اس جیسی کتاب بنالاؤ۔ یا عرفان الٰہی کا معجزہ ہے۔فطرت کے باریک رازوں کو ظاہر کرنے کا معجزہ ہے۔ یہ ہر ایک سے منوایا جا سکتا ہے۔تو جو معجزے ہدایت کے لئے آتے ہیں اُن کے لئے یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ ایسے ہی ہوں جن کو دشمن سے بھی منوایا جا سکے۔ اسی طرح بعض معجزات ایسے ہوتے ہیں جو صرف تقویت ایمان کے لئے ہوتے ہیں اُن کا منوایا جانا ضروری نہیں ہوتا وہ صرف مومنوں کے ازدیادِ ایمان کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں اور ایسی شکل میں ظاہر کئے جاتے ہیں کہ مومن تو مان لیتا ہے اور کافر نہیں مانتا مثلاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کے درمیانی سوراخوں سے ایک دفعہ پانی پھوٹ نکلا اور ایک لوٹا پانی بہت سے لوگوں کی ضروریات کے لئے پورا ہو گیا(بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ الحدیبیۃ) یا تھوڑا سا کھانا تھا مگر آپ کی دعا کی برکت سے بہت سے لوگوں نے کھانا کھالیا اور وہ سیر ہو گئے(بخاری کتاب المغازی باب غزوۃ خندق) یا مثلاً یہ معجزہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کُرتے پر سرخی کے چھینٹے پڑے(سرمہ چشمہ آریہ روحانی خزائن جلد ۲ صفحہ ۱۸۰ ح)۔اب ایک مومن اِن معجزات کو مان جائے گا لیکن دوسرا کہے گا کہ اپنے مریدوں سے جھوٹ بلوالیا ہے یا مثلاً میں نے ایک دفعہ کشفی حالت میں دیکھا کہ میرے مُنہ میں مشک ڈالا گیا ہے۔ جب میں جاگا تو میرے مُنہ سے مشک کی خوشبو آرہی تھی میں نے اپنی بیوی کو جگایا اور اُس سے کہا کہ سونگھ کر دیکھو میرے مُنہ سے کسی چیز کی خوشبو آرہی ہے یا نہیں۔ اُس نے سونگھا تو کہا کہ مشک کی خوشبو آرہی ہے۔اب یہ معجزہ میرے لئے تو تقویت ایمان کا موجب تھا۔ میری بیوی کے لئے بھی تقویت ایمان کا موجب تھا مگر دوسروں کے لئے اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اِسی طرح ایک دفعہ مجھے روزہ لگا اور بہت تکلیف ہوئی اس حالت میں یکدم مجھ پر غنودگی طاری ہوئی اور میں نے دیکھا کہ ایک فرشتہ آیا ہے اور اُس نے میرے مُنہ میں پان ڈالا ہے جب میری آنکھ کھلی تو پیاس بالکل غائب تھی۔تو ایک معجزے تقویت ایمان کے لئے ہوتے ہیں اور وہ مخصوص ہوتے ہیں مومنوں کے لئے اور ایک آیت ہوتے ہیں یعنی دشمنوں پر حجت تمام کرنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ معجزے ایسے ہوتے ہیں جنہیں دشمنوں کے سامنے کھلے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔اور کچھ معجزے ایسے ہوتے ہیں جو ابتلائی ہوتے ہیں اور اُن میں رنج اور کوفت کا پہلو پایا جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کسی حکمت کے ماتحت اُن کو ظاہر فرماتا ہے حضرت مسیح کی بن باپ ولادت بھی ایسے ہی ابتلائی معجزوں میں سے ہے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ یہود کو بتائے کہ اب نبوت تم میں ختم ہونے والی ہے اور اس کے نشان کے طور پر اُس نے مسیح کو بن باپ پیدا کر دیا لیکن یہودی مذہب پر ایمان لانے والوں کے لئے یہ بات ماننی کہ آئندہ ہماری قوم میں سے نبوت مٹ جائے گی اور ایک غیر قوم میں چلی جائے گی بالکل ناممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ یہودی قوم کی توجہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پھرائے

اوراس نے ایک کنواری کے بطن سے حضرت مسیح کو پیدا کر دیا بے شک یہ ایک معجزہ تھا لیکن یہود کے لئے یہ معجزہ نہیں تھا۔ وہ تو سنتے ہی کہتے تھے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے یہ شخص (نعوذ باللہ) حرام زادہ ہے خود مسیح کے لئے بھی یہ معجزہ تقویت ایمان کا موجب نہیں تھا بلکہ وہ شرمندگی سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو ابنِ آدم کہا کرتا تھا۔ قرآن کریم نے ابنِ مریم نام رکھ دیا۔ وہ اپنے آپ کو ابن آدم بھی اِسی لئے کہتے تھے کہ لوگ پوچھتے ہوں گے کہ کس کے بیٹے ہو وہ کہتے کہ میں ابن آدم ہوں ۔قرآن کریم نے ایک آسان ذریعہ اختیار کرلیا کہ اُن کی والدہ کی طرف انہیں منسوب کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ ابن مریم تھے پس یہ ایک معجزہ تو ہے مگر بنی اسرائیل کی ٹھوکر کے لئے اور ان کو ہوشیار کرنے کے لئے کہ جس مامور کے تم ماننے والے ہو اس کا باپ بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا اس ذریعہ سے خدا تعالیٰ نے کانٹا بدل دیا اور ظاہر کر دیا کہ اب غیر قوم سے نبی آئے گا۔ گویا یہ ایک ٹھوکر تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اور عیسائیوں کے لئے اسلام کا رستہ کھولنے کے لئے۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ حضرت مریم جب مسیحؑ کے ساتھ اپنی قوم میں آئیں تو انہوں نے کہا اے مریم تُو نے یہ کیا بدکاری کی ہے تُو تو بڑے اچھے خاندان میں سے تھی فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ اس پر انہوں نے اُس کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم جانتی تھیں کہ عیسیٰؑ نے جواب دینا ہے تبھی تو انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ نے اس موقعہ پر معجزانہ کلام کیا یہ فقرہ اُن کی تردید کرتا ہے ورنہ مریم کو کس طرح پتہ تھا کہ یہ کلام کرے گا۔ اَشَارَتْ اِلَيْهِ کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے بھی بولا کرتا تھا اور چونکہ بولا کرتا تھا اس لئے انہیں پتہ تھا کہ اب بھی بولے گا۔

اگر کہا جائے کہ سورۂ آل عمران سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا (آل عمران:۴۷) یہ بچہ مہد و کہل میں باتیں کرے گا اور چونکہ ان کو بتا دیا گیا تھا کہ یہ بچہ مہد میں باتیں کرے گا اس لئے انہوں نے اس کی طرف اشارہ کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ آل عمران میں جس الہام کا ذکر ہے اُس میں موقع نہیں بتایا گیا کہ کس موقع پر بات کرے گا صرف اتنا کہا گیا ہے کہ بات کرے گا پس سوال یہ ہے کہ اس موقع پر انہوں نے کیوں اشارہ کیا؟ یا تو الہام بتاتا کہ وہ ہمیشہ ہی دُودھ پیتے زمانہ میں باتیں کرے گا اور چونکہ وہ پہلے بھی باتیں کیا کرتا تھا اس لئے اس موقعہ پر بھی اُنہوں نے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ مگر اس کا تو کوئی بھی قائل نہیں کہ اس سے پہلے بھی عیسیٰؑ بولا کرتے تھے اور بعد میں بھی بولا کرتے تھے اِس لئے یہ الہام اس فعل کا محرک نہیں ہوسکتا۔ اُن کا حضرت مسیحؑ کی طرف اشارہ کرنا درحقیقت یہود کے اعتراض کا جواب تھا۔ انہوں نے اعتراض

یہ کیا تھا کہ تُو نے ایک نا جائز فعل کا ارتکاب کیا ہے اور اپنی قوم اور خاندان کو بدنام کیا ہے حضرت مریم نے اس اعتراض کا جواب اس رنگ میں دیا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا کہ تم اس سے باتیں کر کے دیکھ لو کیا تمہیں یہ بدکاری کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اگر تمہارا یہ خیال درست ہے کہ میں نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے تو پھر بدکاری کے نتیجہ میں یہ عظیم الشان لڑکا کس طرح پیدا ہوگیا۔تمہارے اصل کے مطابق تو خود یہ لڑکا تمہارے تمام شبہات اور وساس کو دور کرنے والا اور میری بریت کو ثابت کرنے والا ہے۔

قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا یہ آیت حضرت مسیحؑ کے بچپن میں کلام کرنے کے متعلق بطور دلیل پیش کی جاتی ہے کہ ہم اس سے کس طرح کلام کریں جو کہ مہد میں ایک بچہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کے متعلق یاد رکھنا چاہئے کہ مہد کا لفظ تیاری کے زمانہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔قرآن کریم میں آتا ہے کہ وَ مَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا (المدثر:۱۵) یعنی میں نے کافر کو مال دیا، روپیہ دیا اور اس کی ترقیات کے لئے بڑے بڑے سامان مہیا کئے پس مہد کا لفظ محاورۃً اُس زمانہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو تیاری کا زمانہ ہو اور تیاری کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہوتا ہے کیونکہ اُس زمانہ میں انسان آئندہ کے لئے اپنے اندر طاقتیں جمع کرتا ہے یہاں بھی جوانی کے زمانہ کے لئے استعارۃً مہد کا لفظ بولا گیا ہے اور قوم کے بڑے لوگ چھوٹی عمر کے نوجوانوں کا ذکر انہی الفاظ میں کیا کرتے ہیں مگر اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ واقعہ میں پنگھوڑے میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ یہ مراد ہوتی ہے کہ ہم سے بہت چھوٹے ہیں۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لو آپ کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔بڑھاپا شروع ہو چکا تھا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کفار مکہ کی طرف سے ایک رئیس آپ سے گفتگو کرنے کے لئے آیا تو وہ بار بار کہتا کہ اے بچے مَیں تجھے کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔حالانکہ آپ اُس وقت قریباً ساٹھ سال کی عمر کے تھے مگر پھر بھی وہ آپ کو بچہ کہتا تھا کیونکہ خود اسّی سال کا تھا۔تو قوم کے بڑے لوگوں کا یہ کہہ دینا کہ اس ہم سے کیا گفتگو کریں یہ تو ابھی کل کا بچہ ہے کوئی قابل تعجب بات نہیں۔مولوی سید محمد احسن صاحب کا امروہی جب سخت غصّہ میں آیا کرتے تو انجمن کے ممبروں سے کہا کرتے تھے کہ تم کل کے بچے۔دودھ پیتے بچّے میرے سامنے بات کرتے ہو۔اب اگر کوئی اس بات کو سن کر یہ کہنا شروع کردے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے چودہ ممبروں پر مشتمل ایک انجمن بنائی تھی جس میں صرف ایک جوان شخص تھا باقی سب دُودھ پیتے بچے تھے تو یہ کیسی ہنسی والی بات ہوگی۔جس طرح مولوی سید محمد احسن صاحب کہتے تھے کہ تم کل کے بچے ہو اسی طرح یہودی کہتے کہ یہ جو ہمارے سامنے پوتڑوں میں کھیلا ہوا ہے کیا ہم اس سے بات کریں۔یعنی ابھی تو اس کے سیکھنے کے دن ہیں یہ ہمیں کیا بتائے گا کہ ہم اس سے بات کریں گویا ان الفاظ میں وہ

اپنے علم و فضل اور اپنی عمر کی بڑائی پر فخر کرتے ہیں۔

دیکھو سورۂ آل عمران میں بتایا گیا ہے کہ یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَ کَھْلًا (آل عمران:۴۷) مسیح مہد اور کہل میں کلام کرے گا۔ اِس سے مسلمان یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ایک پیشگوئی ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ مسیح بچپن میں کلام کرے گا اور مہد سے مراد حقیقی مہد ہے لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔ کیونکہ سورۂ آل عمران میں مہد کے ساتھ کہل بھی لگایا گیا ہے اگر مہد میں بولنا معجزہ ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا کہولت میں بولنا بھی معجزہ ہوتا ہے۔ کیا ۳۳ سے پچاس سال تک کی عمر میں جو کہولت کا زمانہ ہوتا ہے لوگ بولا کرتے ہیں یا تنتیس سے پچاس سال تک کی عمر والا اگر بولے تو اُسے بڑا معجزہ سمجھا جاتا ہے؟ جب مہد کے ساتھ کہل کا لفظ بھی لگایا ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں کسی عمر میں بولنے کا معجزہ مراد نہیں بلکہ بولنے کی نوعیت مراد ہے اگر کسی عمر میں بولنا مراد ہوتا تو ساتھ کہل کا لفظ کیوں ہوتا۔ اگر کہل میں بولنا معجزہ ہوتا ہے تو پھر مہد سے مراد بھی دودھ پیتے بچے کا کلام کرنا مراد ہوسکتا ہے اور اگر کہولت کا کلام عام بات ہے تو مہد کا زمانہ بھی وہی زمانہ لیا جائے گا جس میں عام بچے بولتے ہیں۔ اس پر سوال ہوسکتا ہے کہ پھر پیشگوئی کیوں کی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مہد کے زمانہ کے متعلق پیشگوئی کرنے کی وہی ضرورت ہے جو کہولت کے زمانہ کے متعلق پیشگوئی کرنے کی ہے آخر کہولت کی عمر والے باتیں کیا کرتے ہیں یا نہیں جب کیا کرتے ہیں تو پھر یہاں پیشگوئی کیوں کی؟ بہر حال کوئی نہ کوئی غرض ہے جس کے ماتحت اللہ تعالیٰ نے یہ پیشگوئی کی ہے اور ہمیں وہ غرض تلاش کرنی چاہیے سو یاد رکھنا چاہیے کہ کلام اپنی ذات میں بھی معجزہ ہوتا ہے قطع نظر عمر کے۔ یعنی ہے تو یہ معجزہ اگر معجزہ نہ ہوتا تو پیشگوئی نہ ہوتی اور یہ نہ کہا جاتا کہ ایسا ہوجائے گا مگر سوال یہ ہے کہ معجزہ آیا عمر کے لحاظ سے ہوتا ہے یا اس میں کوئی اور بات ہوتی ہے؟ ہم مان لیتے ہیں کہ اگر دو مہینے کا بچہ بول پڑے تو یہ بڑا معجزہ ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے۔ وہ پچاس سال کی عمر میں بھی بولے گا پچاس سال کی عمر میں بولنا کس طرح معجزہ ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب وہی ہے جو میں اُوپر دے چکا ہوں کہ قطع نظر عمر کے کلام اپنی ذات میں بھی معجزہ ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم ایک بڑا معجزہ ہے مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کس وقت نازل ہونا شروع ہوا۔ جب آپ دو مہینے کے بچے تھے یعنی چالیس سال کے تھے۔ چالیس سال کی عمر سے قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا اور تریسٹھ سال کی عمر تک نازل ہوتا چلا گیا۔ مگر ہم پھر بھی اُس کو معجزہ کہتے ہیں۔ کیا اس لئے کہ آپ دو مہینے کے تھے جب یہ نازل ہوا یا تین مہینے کے تھے جب یہ نازل ہوا۔ بلکہ ہم اس کلام کو کلام کی وجہ سے معجزہ کہتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کلام اِس شان کا ہے کہ دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہے۔ پس یُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَ کَھْلًا کے یہ معنے ہیں کہ حضرت مسیحؑ اپنی تیاری اور جوانی کے زمانہ

میں بھی اور کہل کے زمانہ میں بھی ایسی باتیں کریں گے جو معجزانہ ہوں گی۔اور تمام انبیاء ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی محبت کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تریسٹھ سال تک وہ کلام کیا کہ مسیحؑ تو مسیحؑ ،موسیٰؑ کا کلام بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔چنانچہ موسیٰ کی تورات اور عیسیٰ کی انجیل قرآن کے مقابلہ میں حقیقت ہی کیا رکھتی ہیں۔حالانکہ یہ کلام چالیس سال کی عمر میں نازل ہونا شروع ہوا تھا۔پس خدا ہی یہ بتا سکتا تھا کہ مسیح ایسا کلام کرے گا جو معجزہ ہوگا۔یہ معجزہ دو مہینے کے بچہ کے کلام کی وجہ سے نہیں بلکہ خود اس کلام کی ذاتی خوبیوں اور حُسن کی وجہ سے ہے۔پس مہد کے معنے بچپن کے کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر وہ جوانی میں بھی ایسی باتیں کرتے تھے جو عام آدمی نہیں کر سکتے تھے تو وہ معجزہ تھا۔جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چالیس سال کی عمر میں بولے مگر اُن کا کلام پھر بھی معجزہ تھا اور ایسا معجزہ کہ مسیح کو اس کا ہزارواں حصہ بھی نصیب نہیں ہوا پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور موسیٰؑ وغیرہ کا کلام جس طرح بڑی عمر میں معجزہ تھا اور خدا تعالیٰ ہی اس کے متعلق پہلے سے بتا سکتا تھا اسی طرح مسیح کے متعلق تھا۔پس پیشگوئی کی ضرورت مہد میں کلام کرنے کے لئے نہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ کہل بھی لگا ہوا ہے پیشگوئی کی ضرورت معجزانہ کلام کی وجہ سے تھی اور اسی وجہ سے مہد کے ساتھ کہل لگایا گیا ہے کیونکہ کلام خاص جس طرح جوانی میں معجزانہ ہوتا ہے اسی طرح کہولت اور بڑھاپے میں بھی معجزانہ ہوتا ہے۔

قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ ۟ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ﴿ۙ۳۱﴾ وَّ

(یہ سُن کر ابن مریم نے) کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھے کتاب بخشی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔

جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪ وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ

اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھے بابرکت (وجود) بنایا ہے۔اور جب تک میں زندہ ہوں مجھے نماز

الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ﴿۪۳۲﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ

اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے۔اور مجھے اپنی والدہ سے نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے

جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۳﴾

اور مجھے ظالم اور بد بخت نہیں بنایا۔

تفسیر ۔ یہ بھی یاد رکھنے والی بات ہے کہ اگر مہد سے مراد بچپن کا زمانہ ہی لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مسیح ابھی دُودھ پیتے بچے تھے کہ آپ نے یہ کلام کیا تو اِن آیات میں جس قدر باتیں انہوں نے بیان کی ہیں وہ ساری کی ساری اُس وقت جھوٹی بنتی ہیں۔ اگر وہ دو مہینے کی عمر میں بولے تھے تو غور کرو وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ عبداللہ کے معنے اس جگہ محض مخلوق کے نہیں ہو سکتے کیونکہ مخلوق ہونے کے لحاظ سے تو سب انسان برابر ہیں اور حضرت مسیح اپنی وہ خصوصیات بیان کر رہے ہیں جن میں انہیں دوسروں سے امتیاز حاصل ہے پس یہاں عبداللہ کے معنے ہیں خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت کرنے والا اور اُس کی صفات کو دنیا میں ظاہر کرنے والا۔ ایک دودھ پیتا بچہ کہتا ہے کہ میں اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہوں میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اخلاق کو دنیا میں ظاہر کرنے والا ہوں۔ اب اگر دُودھ پیتا بچہ ایسا کہتا ہے تو وہ یقیناً جھوٹ بولتا ہے کوئی معجزہ نہیں دکھاتا بلکہ اُس کی اپنی حالت یہ تھی کہ ابھی اُس کو طہارت بھی اس کی ماں کرواتی تھی۔ وہ چوستا تھا ماں کا پستان اور کہتا تھا کہ میں عبداللہ ہوں۔ کیا عبداللہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی ماں کا پستان پکڑ کر چُوسنا شروع کر دے یہ عجیب نظارہ ہوگا کہ اِدھر وہ کہتا ہوگا اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اور پھر ماں کی طرف مُنہ کر کے اس کا پستان چوسنے لگ جاتا ہوگا گویا فعل کرتا ہے بچے والا اور دعویٰ کرتا ہے بڑے مقرب اور پاکیزہ انسانوں والا۔ اور پھر جو کچھ کہتا ہے محض جھوٹ ہے کہتا ہے میں اللہ کا عبد ہوں اور اس کی عبادت کرتا ہوں حالانکہ وہ اس وقت عبادت کرتا ہی نہیں تھا بلکہ اگر وہ اُس وقت اپنے اس دعویٰ کے مطابق نماز پڑھنی شروع کر دیتا تو اُس کی ماں اُسے پھینک کر چلی جاتی اور شاید وہ سارا دن پاخانہ میں لتھڑا رہتا۔

پھر کہتا ہے اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ اُس نے مجھے کتاب دی ہے۔ سوال یہ ہے اُس وقت خدا تعالیٰ نے اُسے کون سی کتاب دی تھی؟

پھر کہتا ہے وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا اس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے حالانکہ یہ جھوٹ تھا۔

اِسی طرح کہتا ہے وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ اُس نے مجھے برکت والا بنایا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں۔ چلنا آتا نہیں ماں گود میں اُٹھائے پھرتی ہے اور کہتا یہ ہے کہ اَيْنَ مَا كُنْتُ جہاں کہیں بھی میں جاؤں خدا تعالیٰ کی برکت میرے ساتھ ہے۔

وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ اوراس نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے حالانکہ طہارت بھی کوئی دوسرا کراتا تھا۔ اور نماز پڑھنی آتی ہی نہیں تھی۔

وَ الزَّکٰوۃِ اوراس نے مجھے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے حالانکہ اس کے پوتڑے بھی اس کی ماں بناتی تھی اور کہتا یہ ہے کہ مجھے خدا نے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے۔

وَ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ اور میں اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار ہوں حالانکہ ماں کی کیا فرمانبرداری کرنی تھی ماں تو اُسے اپنا خون چوسا رہی تھی اور اپنی گودی میں اٹھائے پھرتی تھی اور راتوں کو اُس کے لئے جاگتی تھی۔

وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا اوراس نے مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا حالانکہ اُس وقت اُس نے جبار کیا ہونا تھا چٹکی کاٹنے سے وہ رونے لگ جاتا تھا۔

غرض اگر یہ درست ہے کہ انہوں نے بچپن میں کلام کیا تو یہ جتنی باتیں ہیں سب کی سب جھوٹ بن جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آئندہ کی خبریں تھیں جو اُن کی زبان پر جاری ہوئیں۔لیکن اگر اتنی باتوں کو آئندہ کی خبریں بنانا ہے تو صرف اِسی بات کو کہ وہ بچپن میں کلام کرے گا آئندہ کی خبر کیوں نہ کہا جائے۔ سارا سوال حل ہو جاتا ہے۔ پھر ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر اس سے اللہ تعالیٰ کی غرض کیا تھی۔ وہ کہتے ہیں غرض یہ تھی کہ یہود کو معجزہ دکھایا جائے۔ حالانکہ اس معجزہ سے بجائے اس کے کہ وہ کچھ فائدہ اٹھاتے وہ تو اور زیادہ بگڑے ہوں گے کہ یہ جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے کہتا ہے کہ خدا نے مجھے کتاب دی حالانکہ اس کے پاس کوئی کتاب نہیں۔ کہتا ہے کہ اُس نے مجھے نبی بنایا ہے حالانکہ ابھی اُس کو طہارت بھی اس کی ماں کرواتی ہے کہتا ہے کہ اُس نے مجھے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے حالانکہ پاس پیسہ بھی نہیں۔ اور اگر کہو کہ دشمن پر صرف اُن کا بولنا حجت تھا گویا معجزہ کسی اور بات میں نہیں تھا بلکہ معجزہ صرف اتنا تھا کہ اتنی چھوٹی عمر کا بچہ بول پڑا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اتنے جھوٹ بلوانے کی کیا ضرورت تھی ایک دو ماہ کا بچہ تو اگر خالی اتنا ہی کہہ دے گا کہ ’’چچا جان کیا حال ہے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں خدا کا خوف کریں‘‘ تو بڑے بڑے جبہّ پوش فقیہوں اور فریسیوں نے اُسی وقت بھاگ جانا تھا اتنے جھوٹ بلوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی حقیقت یہ ہے کہ حضرت مریم کئی سال باہر رہیں جب وہ تیس سال کے ہو گئے (انجیل لوقا باب ۳ آیت ۲۳) اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت کے مقام پر فائز کر دیا تو حضرت مریم اُن کو ساتھ لے کر اپنی قوم میں واپس آئیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے دشمن رشتہ دار ٹوہ میں رہے یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور دشمنوں نے راز کا پتہ لگا ہی لیا اور یا پھر خدا تعالیٰ اپنے نشان کو نمایاں کرنے کے لئے راز فاش کروا دیا۔

عربی کی کتابوں میں ایک لطیفہ لکھا ہے جو دراصل لطیفہ نہیں بلکہ کثیفہ ہے مگر اس لئے کہ یہاں چسپاں ہوتا ہے اُسے بیان کر دیتا ہوں۔

ہماری عربی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کوئی مولوی صاحب تھے جو بڑے بے وقوف اور بخیل تھے۔ جو بھی روپیہ آتا اُسے جمع کر لیتے اور بیوی کو صرف آنہ دو آنے خرچ کرنے کے لئے دے دیتے۔ تنگ آ کر وہ طلاق لے لیتی دوسری آتی تو اُسے بھی اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا آخر ایک عورت آئی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ میں اس بخیل سے اس کا سارا روپیہ چھین لوں گی چنانچہ اُس نے آتے ہی اپنے پاس سے خوب مزیدار چیزیں پکا پکا کر اُسے کھلانی شروع کر دیں اور کہتی یہ میرے بھائی نے بھیجی ہیں۔ یہ میرے چچا نے بھیجی ہیں یہ میرے فلاں رشتہ دار نے بھیجی ہیں۔ اِسی طرح اُس نے پیاز اور لہسن وغیرہ خوب کھلانے شروع کر دیئے اُس نے یہ بھی پتہ لگا لیا کہ روپیہ کہاں رکھا ہے چنانچہ وہ رسّی کو موم لگا کر اس جگہ لٹکاتی جہاں روپیہ رکھا تھا اور ایک اشرفی نکال لیتی اور اُسی سے اُسے کھلانا پلانا شروع کر دیتی جب وہ اشرفی ختم ہو جاتی تو ایک اور نکال لیتی۔ آخر نفاخ چیزیں کھا کھا کر اُس کا جگر خراب ہو گیا اور پیٹ پھولنا شروع ہو گیا جب اس کا پیٹ کچھ زیادہ بڑھ گیا تو عورت نے اس کا پیٹ ملنا شروع کیا اور پیٹ ملتے ملتے کہا کہ تمہیں تو حمل ہو گیا ہے۔ وہ گو مولوی تھا مگر بے وقوف تھا۔ سنتے ہی کہنے لگا خبردار کسی کو بتانا نہیں ورنہ میری بڑی بدنامی ہو گی۔ اُس نے کہا فکر نہ کرو میں کسی کو نہیں بتاتی غرض اس طرح اس کا پیٹ پھولتا چلا گیا اور وہ یقین دلاتی چلی گئی کہ یہ حمل ہے نو ماہ کے بعد اُس نے اپنی ایک ہمسائی سے جو اس کی سہیلی تھی مشورہ کیا اور دونوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ کسی کا بچہ اٹھا کر لے آتے ہیں اور اسے دکھا دیتے ہیں کہ یہ تیرے حمل کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے چنانچہ وہ کسی کا بچہ لے آئے اور انہوں نے اُس کا پیٹ خوب ملنا شروع کیا اور پھر ایک بچہ نکال کر دکھا دیا کہ لو یہ بچہ پیدا ہو گیا ہے اس نے منتیں کرنی شروع کیں کہ کسی کو بتانا نہیں۔ اور پھر کہا کہ اب بچہ تو پیدا ہو گیا ہے اس کے دُودھ کا کیا انتظام ہو گا وہ کہنے لگی کہ دُودھ کا فکر نہ کرو میں اس کا خود انتظام کر لوں گی۔ ادھر اُس نے سارے شہر میں خبر مشہور کر دی کہ مُلا جی کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوا ہے اور سارے شہر کے لوگ اُس کے پاس آنے لگے۔ وہ اس قدر گھبرایا کہ شہر چھوڑ کر ہی بھاگ گیا اور پندرہ بیس سال تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر اُسے خیال آیا کہ اب تو بات بہت پرانی ہو چکی ہے سب لوگ اس قصہ کو بھول چکے ہوں گے آؤ اب وطن واپس چلوں چنانچہ بیس سال کے بعد وہ اپنے شہر میں واپس آیا۔ شہر کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ پُرانے لوگوں میں سے کئی مر چکے تھے اور بچے جوان ہو چکے تھے۔ ایک جگہ کچھ نوجوان کھیل رہے تھے۔ اس نے ایک لڑکے کو بلایا اور پوچھا کہ کچھ جانتے ہو فلاں مکان کس گلی میں ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ مجھے تو کچھ علم

نہیں۔ وہ حیران ہوا اور اُس نے پوچھا کہ لڑکے تمہاری عمر کتنی ہے۔ اُس نے کہا عمر کا تو مجھے علم نہیں مگر جس سال قاضی کے پیٹ سے بچہ پیدا ہوا تھا اُسی سال میں پیدا ہوا تھا۔ ایسا ہی لطیفہ اس جگہ گزرا حضرت مریم تو بھاگیں مگر وہ رشتہ دار جو اُن کے ''شریک'' تھے انہوں نے اس واقعہ کو یاد رکھا اور جب آپ واپس پہنچیں اور انہوں نے دیکھا کہ وہی بچہ آگیا ہے جس کی خبر مشہور ہوئی تھی تو انہوں نے حضرت مریم کو طعنہ دیا۔

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ اُن کے طعنہ پر حضرت مریم شرما گئیں اور انہوں نے حضرت مسیح کی طرف اشارہ کر دیا مگر وہ بچہ اب جوان ہو کر خدا تعالیٰ کا نبی بن چکا تھا۔ اُس نے کہا تم کیا بکواس کرتے ہو اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا میں خدا تعالیٰ کی صفات کو دنیا میں ظاہر کرنے والا ہوں۔ میں خدا تعالیٰ کے اخلاق کو دنیا میں قائم کرنے والا ہوں۔ خدا نے مجھے کتاب دی ہے اور خدا نے مجھے نبی بنایا ہے کیا ایسی اولاد حرام کی اولاد ہو سکتی ہے وَ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ اور اُس نے مجھے مبارک بنایا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ اور خدا نے مجھے نماز کا اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے مَا دُمْتُ حَيًّا جب تک کہ میں زندہ رہوں۔ اگر یہ دُودھ پیتے زمانہ کا معجزہ تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دُودھ پیتے وقت چلتے پھرتے بھی تھے اور نمازیں بھی پڑھتے تھے اور زکوتیں بھی دیتے تھے حالانکہ اس بات کو نہ غیر احمدی مانتے ہیں اور نہ عیسائی مانتے ہیں۔ اگر کہو کہ یہ آئندہ کی پیشگوئیاں تھیں تو سوال یہ ہے کہ وہ بولا تو اس لئے تھا کہ لوگ ایمان لاتے مگر اس سے تو اُن کے ایمان اور بھی خطرہ میں پڑ گئے ہوں گے کہ یہ کیسا جھوٹا ہے کہتا کیا ہے اور اس کی حالت کیا ہے جب اس نے کہا ہوگا کہ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ مجھے اُس نے کتاب دی ہے تو وہ کہتے ہوں گے صریح جھوٹ ہے دکھاؤ کتاب کہاں ہے اور پھر اگر اُس نے کتاب دے دی تھی تو اس کے اوّل منکر خود مسیحؑ ہوئے کیونکہ اُس پر عمل نہیں کیا۔

اِسی طرح جب انہوں نے کہا ہوگا کہ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا اس نے مجھے نبی بنایا ہے تو وہ کہتے ہوں گے کیسا جھوٹا ہے۔ تجھے نبی بنایا ہے تُو تو ابھی ماں کا پستان چوس رہا ہے۔

جب کہا ہوگا کہ وَ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ تو وہ کہتے ہوں کہ خوب! ماں کی گود سے تو اُتر نہیں سکتا اور کہتا یہ ہے کہ میں جہاں کہیں جاؤں خدا نے مجھے برکت والا بنایا ہے۔

جب کہا ہوگا وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مجھے اس نے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے تو انہوں نے کہا ہوگا اچھا فرمایئے آپ نے کتنی نمازیں پڑھی ہیں اور پھر دھیلہ آپ کی جیب میں نہیں اور کہتے یہ ہیں کہ مجھے اُس نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔

جب کہا ہوگا وَ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ میں اپنی ماں سے بڑا احسن سلوک کرنے والا ہو۔تو وہ کہتے ہوں گے کہ تُو ماں کے کپڑوں پر تو پیشاب کر رہا ہے اور ماں تجھے خون چوسا رہی اور تو کہتا ہے کہ میں اپنی ماں کا بڑا فرمانبردار ہوں۔

اسی طرح جب کہا ہوگا کہ وَ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا مجھے اُس نے جبار اور شقی نہیں بنایا میں ایسا نہیں ہوں کہ لوگوں پر ظلم کروں اور اُن کے حقوق تلف کروں تو وہ کہتے ہوں گے کہ تُو نے ظلم کیا کرنا ہے تجھے تو خود بات بات میں دوسروں کی احتیاج ہے۔

لیکن اگر اتنے جھوٹ بولنے کی بجائے وہ صرف اتنا ہی کہہ دیتے کہ چچا جان آپ میری ماں پر کیسا ظلم کر رہے ہیں اور کیسی جھوٹی باتیں اُس کے متعلق کہہ رہے ہیں۔تو میں سمجھتا ہوں کہ اتنی بات سے ہی اُن مولویوں اور پنڈتوں نے بھاگ جانا تھا۔ان دعووں کے ساتھ تو یہ معجزہ رہا ہی نہیں صریح جھوٹ بن گیا ہے جس کا دشمن پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب وہ جوان ہوئے اور تیس سال کی عمر میں یوروشلم آئے اُس وقت حضرت مریم بھی اُن کے ساتھ تھیں۔وہ جانتی تھیں کہ رشتہ دار مجھے طعنہ دیں گے پس جب انہوں نے طعنہ دیا اور کہا کہ يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا تو انہوں نے کہا تم مجھے کیا طعنہ دیتے ہو اسی سے پوچھ لو حضرت مسیحؑ نے کہا تم یہ کیا باتیں کر رہے ہو خدا نے مجھے نبی بنایا ہے خدا نے مجھے تقویٰ و طہارت عطا کیا ہے خدا نے مجھے علم الکلام عطا کیا ہے۔ خدا نے مجھے اخلاق فاضلہ سے متصف کیا ہے۔وَ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ اگر ماں میرے لئے ایسی ٹھوکر کا موجب ہوتی تو میں اُس کا اتنا خدمت گزار کیوں ہوتا۔خدا نے اس کی نیکی دیکھ کر ہی اُسے چن لیا اور مجھے اُس کے گھر میں پیدا کر دیا۔

پس یہاں مہد سے بچپن کا زمانہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا کلام مراد ہے یعنی تیس سال کی عمر کا جو کہولت سے پہلے ہوتا ہے۔کہولت کا زمانہ تیس سے پچاس تک کا ہوتا ہے اس کے بعد بڑھاپا شروع ہوتا ہے۔مسیح تیس سال کی عمر میں نبی ہوئے اور ۳۳ سال تک اپنے ملک میں رہے۔پس اُنہیں مہد و کہولت میں بولنے کا موقع ملا۔بڑھاپے میں بولنے کا موقع انہیں غیر ملکوں میں جا کر ملا۔

ان آیات کے متعلق اس وقت تک میں نے یہ مضمون بیان کیا ہے کہ قرآن کریم حضرت مسیحؑ کے متعلق کیا نظریہ پیش کرتا ہے آیا انہوں نے اس وقت کلام کیا تھا جب وہ ابھی اپنی ماں کی گود میں تھے یا اُس وقت کلام کیا تھا جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کے مقام پر فائز ہو چکے تھے مگر جیسا کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے ان آیات کا تعلق صرف مسلمانوں کے ساتھ نہیں بلکہ عیسائیوں کے ساتھ بھی ہے اور اُن کی طرف سے یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ

قرآن کریم نے ہمارے لیڈر کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہے چنانچہ اب میں اسی سوال کی طرف آتا ہوں کہ آیا عیسائی بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کہ مسیحؑ نے یہی کچھ بیان کیا تھا اور لوگوں سے یہی کہا تھا کہ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا عیسائی مفسر اور عیسائی مصنف جو اسلام کے متعلق کتابیں لکھتے ہیں وہ اس موقع پر آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور نہایت غصہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کرے ہوئے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ نے اپنی بات منوانے کے لئے مسیح کے مُنہ میں جھوٹی باتیں ڈالیں (تفسیر القرآن از وہیری)۔ گویا علماء نے اپنے قول سے مسیح کی طرف تو ایک معجزہ منسوب کیا لیکن اپنے آقا اور سردار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عیسائیوں سے گالیاں دلوائیں اور انہیں جھوٹا کہلوایا۔ وہ کہتے ہیں مسیح تو خدا تھا پھر اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اور اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا کہنے کے کیا معنے ہوئے ان کے نزدیک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) اپنی بات سچی ثابت کرنے کے لئے مسیحؑ کی زبان سے اس قسم کے فقرے کہلوائے ہیں۔ جو بالکل غلط ہیں اور جن کو مسیحؑ کی طرف کسی صورت میں بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا چنانچہ اس موقع پر وہ اپنی شدید نفرت کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت مسیحؑ کی طرف بالکل غلط دعاوی منسوب کر دیئے ہیں پس ہم ان آیات سے اس وقت تک نہیں گذر سکتے جب تک ہم یہ بھی ثابت نہ کر دیں کہ جو کچھ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ درست ہے اور اناجیل سے بھی وہی باتیں ثابت ہوتی ہیں جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں یہ اسلامی تعلیم یا اسلامی ہسٹری کا سوال نہیں کہ ہم خاموشی سے گذر جائیں اور کہیں کہ کسی غیر کا اس سے کیا تعلق ہے یہ ایسی باتیں ہیں جو ایک قوم کے لیڈر کے متعلق کہی گئی ہیں اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ اُس نے یہ باتیں کیں۔ پس اُس لیڈر کے اتباع کا حق ہے کہ وہ کہیں کہ ان باتوں کا ثبوت لاؤ اور اگر واقعہ میں انجیل سے ان باتوں کا کوئی ثبوت نہ ملے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن انسانی کتاب سمجھا جائے گا اور یہ خیال کیا جائے گا کہ نعوذ باللہ قرآن کریم نے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے لیکن اگر یہ ثابت ہوجائے کہ جو کچھ قرآن کریم نے بیان کیا ہے وہ درست ہے اور انجیل سے بھی یہی باتیں ظاہر ہوں تو نہ صرف یہ سوال حل ہوجائے گا کہ مسیحؑ مہد میں نہیں بولا بلکہ یہ سوال بھی حل ہوجائے گا کہ مسیحؑ کی طرف خدائی کا دعویٰ منسوب کرنا غلط ہے مسیحؑ بھی ایک ویسا ہی انسان تھا جیسا کہ اور لوگ اس دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے حضرت مسیحؑ کی طرف جو باتیں منسوب کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے کہا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ میں اللہ کا بندہ ہوں اسی طرح انہوں نے کہا اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا اُس نے مجھے کتاب دی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے اب یہ باتیں اگر درست ہیں تو اس میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ مسیح نہ خدا تھا نہ خدا کا بیٹا

تھا بلکہ وہ خدا کا ایک نبی تھا پس ان آیات پر یقیناً عیسائیوں کو چڑنے کا حق ہے گو بدکلامی کا حق نہیں۔ یہ تو انہیں حق حاصل ہے کہ وہ کہیں کہ قرآن کریم نے مسیح کی طرف غلط دعاوی منسوب کر دیئے ہیں مگر اُن کا یہ حق نہیں کہ وہ بدزبانی پر اتر آئیں اور گالیوں سے کام لیں بہرحال جب ہم انجیل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی عقائد غلط فہمیوں پر مبنی ہیں اور اسلام اور قرآن نے جو بات کہی ہے وہی صحیح اور درست ہے۔

پہلی بات۔قرآن کریم یہ بیان کرتا ہے کہ مسیح نے کہا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اب اگر انجیل بھی یہی کہتی ہے کہ مسیح اللہ کا بندہ تھا تو قرآن کریم کی بات سچی ثابت ہو جائے گی پس سب سے پہلے ہم اسی بات کو لیتے ہیں اور قرآن کریم کے اس بیان کی تائید کے لئے متی باب ۴ آیت ۱ تا ۱۱ کو پیش کرتے ہیں۔اس میں لکھا ہے۔

’’تب یسوع روح کے وسیلے بیابان میں لایا گیا تا کہ شیطان اُسے آزمائے اور جب چالیس دن اور چالیس رات روزہ رکھ چکا آخر کو بھوکا ہوا تب آزمائش کرنے والے نے اس پاس آکے کہا اگر تُو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ کہ یہ پتھر روٹی بن جائیں۔اس نے جواب میں کہا لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی جیتا ہے تب شیطان اُسے مقدس شہر میں اپنے ساتھ لے گیا اور ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کر کے اس سے کہا اگر تُو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرادے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تیرے لئے اپنے فرشتوں کو فرمائے گا اور وے تجھے ہاتھوں پر اُٹھالیں گے۔ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سے ٹھیس لگے یسوع نے اس سے کہا یہ بھی لکھا ہے کہ تُو خداوند اپنے خدا کو مت آزما۔پھر شیطان اُسے ایک بڑے اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی ساری بادشاہتیں اوران کی شان وشوکت اُسے دکھائیں اور اُس سے کہا اگر تو گر کے مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دوں گا تب یسوع نے اُسے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اوراس اکیلے کی بندگی کر (یہ آیات بتاتی ہیں کہ گو مسیحؑ نے شیطان کو سجدہ نہیں کیا مگر مسیحی قوم نے آخر شیطان کو سجدہ کیا تبھی اُن کو دنیا کی بادشاہت مل گئی۔کیونکہ انجیل بتاتی ہے کہ دنیا کی بادشاہت شیطان کو سجدہ کرنے کے نتیجہ میں ملتی ہے) تب شیطان اُسے چھوڑ گیا اور دیکھو فرشتوں نے آکے اُس کی خدمت کی۔‘‘

یہ بیان کس تفصیل سے مسیح کی انسانیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ شیطان اُسے آزمانے کے لئے آیا۔اب کوئی عقلمند یہ نہیں مان سکتا کہ شیطان جس نے مسیح کو آزمانا چاہا وہ اتنا بھی نہیں جانتا تھا

کہ خدا کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا صفات ہیں اور اس کے اندر کیا کیا طاقتیں پائی جاتی ہیں۔ بائبل میں جہاں بھی شیطان کا ذکر آتا ہے وہاں سے اتنا تو پتہ لگتا ہے کہ شیطان ایک باغی وجود تھا اور خدا تعالیٰ کی معرفت کاملہ اس کو حاصل نہیں تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ خدا کیا ہوتا ہے اور اس کی کیا طاقتیں ہیں پس شیطان کا مسیح کے پاس اُس کی آزمائش کے لئے آنا جبکہ وہ جانتا تھا کہ خدا تعالیٰ کو آزمایا نہیں جاسکتا صاف بتاتا ہے کہ شیطان یہ بھی جانتا تھا کہ مسیح خدا نہیں۔ ورنہ اگر وہ جانتا کہ یہ خدا ہے تو وہ اُسے آزمانے کے لئے کیوں آتا۔

پھر لکھا ہے جب وہ چالیس دن اور چالیس رات کا روزہ رکھ چکا تو ''آخر کو بھوکا ہوا'' اب چالیس دن اور چالیس رات کے روزہ کے اگر یہ معنے بھی لئے جائیں کہ اُس نے چالیس دن رات کھانا نہیں کھایا تب بھی اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ گاندھی جی نے تو ساٹھ ساٹھ دن کے بھی روزے رکھے ہیں۔ پھر یہاں صرف بھوکا رہنے کا ذکر ہے پیاسا رہنے کا ذکر نہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح گاندھی جی پھلوں کا رس اور سوڈا وغیرہ پی لیا کرتے تھے اسی طرح وہ بھی چالیس دن رات صرف پانی اور پھلوں کا رس وغیرہ پیتے رہے روٹی انہوں نے نہیں کھائی لیکن بہر حال جب چالیس دن اور چالیس رات کا روزہ ختم ہوا تو انجیل بتاتی ہے کہ انہیں بھوک لگی اور جب وہ بُھوکے ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ انسان تھے خدا نہیں تھے کیونکہ بھوک انسان کو ہی لگا کرتی ہے خدا کو نہیں۔

عیسائی اس موقع پر کہا کرتے ہیں کہ چونکہ مسیحؑ انسانی جسم میں تھا اس لئے انسانی حوائج بھی اس کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ہمارا تو اعتقاد ہے کہ اس کا جسم بھی انسانی تھا اور اس کی روح بھی انسانی تھی۔ لیکن بہر حال ہم عیسائیوں سے کہتے ہیں کہ کم از کم تم نے مسیح کا انسانی جسم تو مان لیا۔ اب رہ گیا یہ سوال کہ اس میں انسانی روح تھی یا خدائی۔ اس کا حل اگلی آیات سے ہو جاتا ہے۔

لکھا ہے شیطان نے اُس سے کہا کہ

''اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو کہہ کہ یہ پتھر روٹی بن جائیں۔''

اس پر حضرت مسیحؑ نے کہا

''لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے مُنہ سے نکلتی جیتا ہے۔''

یعنی شیطان نے کہا کہ پتھر کو روٹی بنا دے۔ اب پتھر کو روٹی بنانا خدا کے اختیار میں ہے انسان کے اختیار میں نہیں۔ پس چونکہ یہ چیز خدا کے اختیار میں تھی۔ اس لئے شیطان نے کہا کہ جب تُو کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور

لوگ بھی تجھے ایک فوق العادت وجود سمجھتے ہیں تو تُو پتھر کو روٹی بنا دے مگر اُس نے ایسا نہ کیا جس کے معنے یہ ہیں کہ اُس میں خدائی طاقتیں نہیں تھیں۔

اِس موقع پر عیسائیوں کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روٹی نہ بنانے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس میں خدائی طاقتیں نہیں تھیں کیونکہ یہ امر اس کی مرضی پر منحصر تھا۔ اگر اس کا جی چاہتا تو وہ پتھر کو روٹی بنا سکتا تھا۔ مگر چونکہ اُس نے نہ چاہا کہ وہ ایسا کرے اس لئے پتھر روٹی نہ بن سکا پس اگر مسیح نے یہ معجزہ نہیں دکھایا تو اس سے اُس کے عجز کا اظہار نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے جب شیطان کی گستاخی دیکھی تو اُس نے اُس کی بات کو رد کر دیا اور کہہ دیا کہ تم کون ہوتے ہو جو مجھ سے ایسا سوال کرو جاؤ میں پتھر کو روٹی نہیں بناتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ مسیح نے پتھر کو روٹی کیوں نہ بنایا ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ مسیحؑ نے اس سوال کا جواب کیا دیا ہے؟ اگر تو مسیحؑ یہ جواب دیتا کہ میں پتھر کو روٹی نہیں بناتا یہ امر میری مرضی پر منحصر ہے تم کون ہو جو مجھے اس امر پر مجبور کرو تب تو یہ بات درست تسلیم کی جا سکتی تھی کہ مسیحؑ نے پتھر کو روٹی اس لئے نہیں بنایا کہ وہ بنا نہیں سکتا تھا بلکہ اس لئے نہیں بنایا کہ وہ بنانا نہیں چاہتا تھا لیکن مسیح یہ جواب دیتا ہے کہ

''لکھا ہے کہ انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے مُنہ سے نکلتی جیتا ہے''۔

اب سوال یہ ہے کہ وہاں کون سے دو وجود تھے جو باتیں کر رہے تھے کیا روٹی کھانے والا وجود وہاں مسیحؑ کے علاوہ کوئی اور بھی تھا؟ صاف ظاہر ہے کہ شیطان روٹی کھانے والا نہیں تھا۔ روٹی کھانے والا وجود صرف مسیحؑ تھا اور مسیحؑ یہ جواب دیتے ہیں کہ آدمی روٹی کے بغیر بھی جیتا ہے۔ گویا مسیحؑ نے اس امر کا اقرار کیا کہ میں انسان ہوں اور روٹی کا محتاج ہوں لیکن اگر خدا نے مجھے روٹی نہیں دی تو مجھے خدا کے کلام پر اعتبار کرنا چاہئے اور ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں کہ پتھر روٹی بن جائیں۔

پھر اس نے کہا کہ

''انسان صرف روٹی سے نہیں بلکہ ہر ایک بات سے خدا کے منہ سے نکلتی جیتا ہے''

یہ بھی وہ اپنے متعلق ہی کہتا ہے پس معلوم ہوا کہ مسیحؑ خدا کی باتوں سے جیتا تھا اور جو خدا کی باتوں سے جیتا ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

پھر لکھا ہے

''تب شیطان اُسے مقدس شہر میں اپنے ساتھ لے گیا اور ہیکل کے کنگورے پر کھڑا کر کے اُس

سے کہا کہ اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو اپنے تئیں نیچے گرادے کیونکہ لکھا ہے کہ وہ تیرے لئے فرشتوں کو فرمائے گا اور وے تجھے ہاتھوں پر اٹھالیں گے۔ایسا نہ ہو کہ تیرے پاؤں کو پتھر سی ٹھیس لگے۔''

یعنی شیطان نے کہا کہ تم ہیکل کے کنگرے سے اپنے آپ کو نیچے گرادو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو میں سمجھ لوں گا کہ تم خدا ہو کیونکہ خدا کو چوٹ نہیں لگ سکتی اس پر مسیح نے کہا

''یہ بھی لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو مت آزما''

یعنی یہ کام بھی میں اس لئے نہیں کرتا کہ میں اپنے خدا کو کس طرح آزماؤں میں خدا کا ایک بندہ ہوں اور بندوں کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے خدا کو مت آزمائیں۔

پھر شیطان اُسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور ''دنیا کی ساری بادشاہتیں اور ان کی شان وشوکت اُسے دکھائیں اور اُس سے کہا اگر تُو گر کے مجھے سجدہ کرے تو یہ سب کچھ تجھے دے دُوں گا''۔ یہ الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ مسیحؑ خدا نہیں تھا کیونکہ خدا کی تو سب چیزیں ہیں جب وہ مسیحؑ کو کہتا ہے کہ اگر تو مجھے سجدہ کرے تو میں سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ شیطان جانتا تھا کہ یہ خدا نہیں ورنہ خدا کو کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں تجھے سب چیزیں دے دُوں گا۔ جو چیزیں ہیں ہی خدا وہ خدا کی کو دینے کے کیا معنے ہیں پس اگر مسیحؑ شیطان کی نظر میں خدا ہوتا تو وہ اُسے یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ اگر تُو مجھے سجدہ کردے تو میں دنیا کی سب نعمتیں تجھے دے دوں گا اور پھر جب مسیحؑ نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ یہ سب چیزیں میری ہیں تو اس سے بھی پتہ لگا کہ وہ بھی اپنے آپ کو خدا کا بندہ ہی سمجھتا تھا اگر مسیحؑ خدا ہوتا تو مسیحؑ کا جواب یہ ہونا چاہیے تھا کہ میں تو خدا ہوں اور میری ہی یہ سب چیزیں ہیں تم میری ہی چیزیں مجھے دینے کا کیا وعدہ کرتے ہو۔ مگر مسیح اس کا بھی یہ جواب دیتا ہے کہ ''اے شیطان دُور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اُس اکیلے کی بندگی کر''۔ گویا مسیحؑ نے اقرار کرلیا کہ میں صرف خدا کا ایک بندہ ہوں اور میرا کام یہ ہے کہ میں اُسی کو سجدہ کروں اور اُسی کی عبادت بجالاؤں۔

لوقا باب ۴ آیات ۱ تا ۱۳ میں بھی یہی باتیں بیان کی گئی ہیں صرف اس میں اتنی بات زائد ہے کہ متی نے تو یہ لکھا ہے۔ کہ وہ چالیس دن اور چالیس رات بھوکا رہنے کے بعد آزمایا گیا اور یہاں یہ لکھا ہے کہ چالیس دن تک شیطان اُسے آزماتا رہا۔ ہمارے مولوی کہتے ہیں کہ مسیحؑ کو شیطان نے مس بھی نہیں کیا اور انجیل کہتی ہے کہ چالیس دن تک شیطان اُسے اپنے ساتھ لے کر پھرتا رہا اور مختلف آزمائشوں میں سے اُسے گذرنا پڑا۔ گویا اُس کو خدا ماننے والے تو اس کو مس شیطان سے پاک نہیں کہتے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع باقی سب نبیوں کو

مس شیطان سے آلودہ قرار دیتے ہیں صرف اُس نام نہاد خدا کے بیٹے کو جس کے متعلق اُس کی اُمت بھی کہتی ہے کہ چالیس دن تک شیطان کے ساتھ پھرتا رہا مس شیطان سے پاک قرار دیتی ہے۔ پھر لطیفہ یہ ہے کہ مسلمان مولوی تو یہ کہتے ہیں کہ پیدائش کے وقت جب وہ بچہ تھا اس وقت بھی اُسے شیطان نے نہیں چھوا۔ لیکن انجیل کہتی ہے کہ جب وہ بالغ اور عاقل تھا تب بھی وہ شیطان کے ساتھ ساتھ پھرتا تھا صرف ایک دومنٹ کے لئے نہیں۔ بلکہ چالیس دن تک پھرتا رہا۔

پھر یوحنا باب ۴ آیت ۲۲ میں لکھا ہے

''تم جسے نہیں جانتے اس کی پرستش کرتے ہو ہم جسے جانتے ہیں اس کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ نجات یہودیوں میں سے ہے۔''

اس حوالہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت مسیح اپنے آپ کو خدا کا ایک بندہ سمجھتے تھے کیونکہ فرماتے ہیں کہ میں اور باقی یہودی اُس خدا کی پرستش کرتے ہیں جس کو ہم جانتے ہیں اور تم اس کی پرستش کرتے ہو جسے تم نہیں جانتے۔

پھر خدائی کی ایک بڑی علامت علم غیب ہوتا ہے اگر کوئی خدائی کا دعویدار ہوتا تو ضروری ہے کہ علم غیب بھی اسے حاصل ہو مگر مسیح کہتا ہے کہ

''اُس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا مگر باپ''۔

(مرقس باب ۱۳ آیت ۳۲)

اُس دن یا اُس گھڑی میں اختلاف ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ بعض لوگ اس سے قیامت مراد لیتے ہیں اور بعض اس مسیح کی آمد ثانی مراد لیتے ہیں بہر حال قیامت مراد ہو یا مسیح کی آمد ثانی حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ اُس دن یا اس گھڑی کو نہ میں جانتا ہوں نہ آسمان کے فرشتے جانتے ہیں صرف خدا جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی۔ گویا علم غیب کے متعلق حضرت مسیحؑ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے مجھے حاصل نہیں۔ اگر وہ خدا ہوتا تو اُسے بھی یہ علم غیب حاصل ہوتا۔

اسی طرح مرقس باب ۱۰ آیت ۱۷و۱۸ میں لکھا ہے

''اور جب وہ باہر نکل کر راہ میں جا رہا تھا تو ایک شخص دوڑتا ہوا اُس کے پاس آیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اُس سے پوچھنے لگا کہ اے نیک اُستاد میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں یسوع نے اُس سے کہا تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے۔ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔''

ان آیات میں حضرت مسیح دو دعوے کرتے ہیں ایک یہ کہ نیک صرف خدا ہے۔ دوسرا یہ کہ میں نیک نہیں ہوں۔ اب اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ میں خدا نہیں تم منطقی صغریٰ کبریٰ بنالو۔ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا۔ ایک طرف یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نیک صرف خدا ہے اور دوسری طرف یہ کہا گیا ہے کہ میں نیک نہیں۔ اِن دو دعووں کا سوائے اس کے اور کوئی مفہوم نہیں کہ میں خدا نہیں گویا حضرت مسیح انسان ہونے کا اس جگہ اقرار کرتے ہیں۔

یہاں یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ بعض مسلمان بغیر حقیقت پر غور کرنے کے اس جگہ عیسائیوں سے بھی زیادہ جوش میں آجاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا مسیحؑ نیک نہیں تھا اگر کسی احمدی سے یہ سوال کیا جائے تو وہ کہے گا کہ تم عیسائیوں سے پوچھو ان کی کتاب میں یہ لکھا ہے۔ پس اس کے جواب کی اصل ذمہ واری ان پر ہے ہم پر نہیں لیکن اگر ہمیں ہی جواب دینا پڑے تو ہم یہ جواب دیں گے کہ عبداللہ کی نیکی کسبی ہوتی ہے اور یہاں حضرت مسیح کی مراد اس نیکی سے ہے جو ذاتی ہوتی ہے انسان کی نیکی کسبی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی نیکی ذاتی ہوتی ہے۔ اسی لئے خدا قدوس کہلاتا ہے لیکن انسان قدوس نہیں کہلا سکتا کیونکہ وہ اپنی ذات میں بے عیب ہے اور انسان بے عیب کوشش سے بنتا ہے۔ خدا تعالیٰ پر کوئی وقت ایسا نہیں آیا جب وہ ناقص تھا اور پھر اس نے کامل بننے کی کوشش کی۔ لیکن انسان پہلے ناقص ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ پہلے وہ بچہ ہوتا ہے پھر اسے عقل آتی ہے تو وہ نماز شروع کرتا ہے اس کے بعد ایک دن کی نماز اسے کچھ اور آگے لے جاتی ہے۔ دو دن کی نماز اسے اور آگے لے جاتی ہے۔ تین دن کی نماز اسے اور آگے لے جاتی ہے۔ لیکن خدا تعالیٰ جیسے آج سے اربوں ارب سال پہلے تھا اسی طرح آج بھی ہے اس کی قدوسیت نہ پہلے کم تھی اور نہ آج زیادہ ہے لیکن انسان کی نیکی کسی وقت کم ہوتی ہے اور کسی وقت زیادہ ہوتی ہے چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ جب وہ بچہ ہوتا ہے تو اس کی نیکی ادنیٰ ہوتی ہے جب وہ صداقتوں کو سمجھنے لگ جاتا ہے تو اس کی نیکی کا معیار اور زیادہ ترقی کر جاتا ہے اور جب اس پر شریعت یا الہام نازل ہونا شروع ہوتا ہے تو اس کی روحانیت اور زیادہ ترقی کر جاتی ہے پس جب مسیح نے کہا کہ میں نیک نہیں تو اس کے صرف اتنے معنے تھے کہ میرے اندر ذاتی نیکی نہیں کسبی نیکی ہے۔

اسی طرح یوحنا میں لکھا ہے کہ ایک عورت کو لوگ پکڑ کر آپ کے پاس لائے اور کہا کہ یہ عورت زنا کی حالت میں پکڑی گئی ہے موسیٰؑ کی شریعت کے مطابق زانیہ کی سزا سنگساری ہوتی ہے مگر ہم اسے آپ کے پاس لائے ہیں آپ اس کے متعلق کیا فتویٰ دیتے ہیں مسیحؑ نے جواب دیا کہ جو شخص تم میں بے گناہ ہے وہ آگے آئے اور سب سے پہلے اس کو پتھر مارے۔ وہ لوگ یہ سن کر بھاگ گئے۔ حضرت مسیح نے اس عورت سے پوچھا کہ تجھ پر حکم لگانے والے

لوگ کہاں چلے گئے اس نے کہا کہ بھاگ گئے۔ حضرت مسیحؑ نے کہا میں بھی تجھ پر کوئی حکم نہیں لگاتا۔ اس بارہ میں انجیل کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ لکھا ہے۔

''فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے تو ریت میں موسیٰؑ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے۔ انہوں نے اسے آزمانے کے لئے یہ کہا تا کہ اس پر الزام لگانے کا کوئی سبب نکالیں۔ مگر یسوع جھک کر انگلی سے زمین پر لکھنے لگا۔ جب وہ اس سے سوال کرتے ہی رہے تو اس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا کہ جو تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اس کے پتھر مارے اور پھر جھک کر زمین پر انگلی سے لکھنے لگا۔ وہ یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر کے نکل گئے اور یسوع اکیلا رہ گیا اور عورت وہیں بیچ میں رہ گئی۔ یسوع نے سیدھے ہو کر اس سے کہا۔ اے عورت یہ لوگ کہاں گئے۔ کیا کسی نے تجھ پر حکم نہیں لگایا؟ اس نے کہا اے خداوند کسی نے نہیں یسوع نے کہا میں بھی تجھ پر حکم نہیں لگاتا۔ جا پھر گناہ نہ کرنا۔''

(انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۳ تا ۱۱)

اب دیکھو فقیہی اور فریسی کہتے ہیں کہ موسیٰ کی شریعت میں ایسی عورتوں کو سنگسار کرنے کا حکم ہے۔ حضرت مسیح کہتے ہیں کہ تم میں سے وہ شخص پہلے پتھر چلائے جو بے گناہ ہو۔ مگر جب سب لوگ ایک ایک کر کے غائب ہو گئے تو مسیح نے اس عورت سے کہا کہ میں بھی تجھ پر حکم نہیں لگاتا جس کے معنے یہ ہیں کہ میں بھی بے گناہ نہیں ہوں۔ یہ حوالہ بھی بتاتا ہے کہ مسیح اپنے گنہگار ہونے کا اقرار کرتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ وہ بندہ ہونے کا اقرار کرتا ہے۔

دوسری بات قرآن کریم نے حضرت مسیح کی طرف یہ منسوب کی ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ اس نے مجھے کتاب دی ہے۔ اس کے لئے دیکھو یوحنا باب ۸ آیت ۲۸ جہاں حضرت مسیح کہتے ہیں کہ میں

''اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ جس طرح باپ نے مجھے سکھایا اسی طرح یہ باتیں کہتا ہوں۔''

یہ حوالہ اس امر پر صراحتاً دلالت کرتا ہے کہ حضرت مسیح لوگوں کو جو کچھ تعلیم دیتے تھے وہ اپنی طرف سے نہیں دیتے تھے بلکہ وہی کچھ بتاتے تھے جو خدا انہیں بتاتا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا بلکہ جس

طرح باپ نے مجھے سکھایا ہے اور جس طرح اس نے مجھے تعلیم دی ہے اسی طرح میں لوگوں سے کہتا ہوں مجھے یہ اختیار حاصل نہیں کہ میں اپنی طرف سے انہیں کچھ کہوں۔

اسی طرح حضرت مسیح کہتے ہیں۔

''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا جب تک سب کچھ پورا نہ ہو۔''

(انجیل متی باب ۵ آیت ۱۷۔۱۸)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ حضرت مسیح یہود کی طرف اس لئے مبعوث کئے گئے تھے کہ وہ تورات کو رائج کریں پس قرآن کریم نے جو ان کے متعلق اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ بالکل صحیح اور درست ہیں۔ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ کے الفاظ اس لحاظ سے بھی استعمال ہوئے ہیں کہ ایک پہلے نبی کی کتاب پر عمل کرنے اور دوسروں سے عمل کروانے کا انہیں حکم تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ پہلی کتاب کی تفسیر انہیں الہاماً سکھائی جاتی تھی اور یہ دونوں باتیں انجیل سے ثابت ہیں حضرت مسیح نے یہ بھی کہا کہ میں تورات کو رائج کرنے اور اس کے احکام پر عمل کروانے کے لئے آیا ہوں اور یہ بھی کہا کہ میں اپنی طرف سے کوئی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا مجھے سکھاتا ہے۔

تیسری بات قرآن کریم نے یہ بتائی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنی قوم کے سامنے نبوت کا دعویٰ پیش کیا اور کہا کہ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا خدا تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا ہے اس کی صداقت بھی انجیل سے ثابت ہے۔ یوحنا میں لکھا ہے حضرت مسیح نے کہا۔

''جس نے مجھے بھیجا وہ میرے ساتھ ہے (نبی اسی کو کہتے ہیں جسے لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا جائے) اس نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا کیونکہ میں ہمیشہ وہی کام کرتا ہوں جو اسے پسند آتے ہیں۔'' (انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۲۹)

یہ الفاظ ایک رنگ میں وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا کی ہی تفسیر ہیں۔

اسی طرح لکھا ہے فریسیوں نے حضرت مسیح سے کہا

''ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔ یسوع نے ان سے کہا اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے۔ اس لئے کہ میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں۔ کیونکہ میں آپ سے نہیں آیا بلکہ اسی نے مجھے

بھیجا۔'' (انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۴۱۔۴۲)

یہاں بھی ''اسی نے مجھے بھیجا'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو حضرت مسیحؑ کی نبوت اور رسالت کے مقام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس حوالہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ کا خدا تعالیٰ کو اپنا باپ کہنا ان کی الوہیت پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ یہود بھی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے بیٹے کہا کرتے تھے۔ چنانچہ فریسیوں نے ان سے کہا

''ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔''

معلوم ہوا کہ بیٹا ہونے میں مسیح کی خصوصیت نہیں یہ یہود میں عام محاورہ تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنا باپ کہا کرتے تھے اور اس قسم کے محاورہ کا ان میں رائج ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں محبت الٰہی پائی جاتی ہو اور جو صرف مادی چیزوں کے پیچھے جانے والے نہ ہوں بلکہ روحانیت کی سچی تڑپ اور خدا تعالیٰ کے وصال کی حقیقی خواہش رکھتے ہوں وہ جذبات محبت کے غلبہ کے وقت خدا تعالیٰ کو ماں اور باپ کی شکل میں ہی دیکھتے ہیں اور رؤیا اور کشوف میں بھی خدا تعالیٰ اپنے منتخب کردہ بندوں کو بعض دفعہ اپنا وجود ماں یا باپ کی شکل میں ہی دکھاتا ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اپنے باپ کی شکل میں خدا تعالیٰ کو دیکھا (الحکم ۱۰؍مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۷) اور میں نے ایک دفعہ خدا تعالیٰ کو حضرت اماں جانؓ کی شکل میں دیکھا تھا تو جہاں اخلاص اور محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں وہاں بندے اپنی محبت کے جوش کے وقت خدا تعالیٰ کو ماں یا باپ کی حیثیت میں ہی دیکھتے ہیں اور خدا تعالیٰ بھی رؤیا و کشوف کے ذریعہ جب اپنی محبت ان پر ظاہر کرتا ہے تو بالعموم باپ یا ماں کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ آگے یہ ایک باریک روحانی نکتہ ہے کہ وہ کن حالات میں اپنے آپ کو باپ کی شکل میں دکھاتا ہے اور کن حالات میں اپنے آپ کو ماں کی شکل میں دکھاتا ہے بہرحال یہ دونوں وجود محبت کا ایک نشان سمجھے جاتے ہیں مگر دونوں کی محبت میں فرق ہوتا ہے۔ ماں کی محبت اور رنگ کی ہوتی ہے اور باپ کی محبت اور رنگ کی ہوتی ہے ماں کی ذمہ داریاں اور قسم کی ہوتی ہیں اور باپ کی ذمہ داریاں اور قسم کی ہوتی ہیں۔ جب خدا تعالیٰ ماں کی محبت اور ماں کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے تو وہ ماں کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے اور جب وہ باپ کی محبت اور باپ کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہے تو باپ کی شکل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ نبیوں کے پیرو اور ان پر ایمان لانے والے لوگ ان کی زبان سے یہ باتیں سنتے رہتے ہیں کہ ہمارا خدا ہم سے ماں اور باپ کی طرح محبت کرتا ہے اس لئے وہ بھی ان کی نقل کرنے لگ جاتے ہیں۔ اسی رنگ میں جب یہود میں خدا تعالیٰ کے انبیاء آئے اور انہوں نے خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کے پیار کا بار بار ذکر کیا اور بتایا کہ ہم سے خدا نے یوں محبت کی

ہے جس طرح باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے یا ماں اپنے بچے سے کرتی ہے تو وہ بھی خدا تعالیٰ کو باپ کہنے لگ گئے۔ اسی محاورہ کو حضرت مسیح بھی استعمال کرتے اور خدا تعالیٰ کو اپنا باپ کہتے تھے۔

دوسرا مسئلہ اس حوالہ سے یہ نکلتا ہے کہ حضرت مسیح کہتے ہیں

''اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے اس لئے کہ میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں۔''

یعنی جس سے محبت ہوتی ہے اس کی محبت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان چیزوں سے بھی محبت رکھی جائے جن سے محبوب محبت رکھتا ہو۔ اس میں مدارج کا سوال نہیں ہوتا کہ فلاں چھوٹا ہے اور فلاں بڑا۔ بلکہ انسان صرف یہ دیکھتا ہے کہ خواہ میرا مقام بڑا ہے جب میرا محبوب اور پیارا فلاں سے محبت رکھتا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ میں اس سے محبت کروں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق ذکر آتا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ ان سے ملنے کے لئے آیا وہ کھڑے ہو گئے اور بادشاہ سے ملے اور پھر بیٹھ گئے پھر وزیر ملنے کے لئے آیا تو وہ اسی طرح بیٹھے رہے کھڑے نہیں ہوئے۔ اس کے بعد بادشاہ کا پہرے دار آیا تو پھر وہ کھڑے ہو گئے اور کھڑے ہونے کے بعد بیٹھ گئے جب یہ لوگ چلے گئے تو کسی نے کہا آپ نے یہ کیا کیا کہ جب بادشاہ آیا تو آپ اس کے اعزاز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ وزیر آیا تو کھڑے نہ ہوئے لیکن پہرے دار آیا تو پھر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے فرمایا بادشاہ کے آنے پر میں اس لئے کھڑا ہوا تھا کہ بادشاہ کی اطاعت کا حکم ہے۔ وزیر کے آنے پر میں اس لئے کھڑا نہیں ہوا کہ وزیر کی اطاعت کا حکم نہیں۔ اس کے بعد پہرے دار آیا تو میں پھر کھڑا ہو گیا مگر اس لئے کہ وہ حافظ قرآن تھا۔ اب دیکھو پہرے دار ایک ادنیٰ ملازم تھا لیکن چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب کے محبوب کا کلام اس نے یاد کیا ہوا تھا اس لئے باوجود چھوٹا ہونے کے آپ اس کے آنے پر کھڑے ہو گئے۔ یہی بات حضرت مسیح بیان فرماتے ہیں کہ اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھے بھی عزیز سمجھتے اور میری مخالفت نہ کرتے۔ اسی نقطہ نگاہ کے ماتحت حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے باوجود اس کے کہ آپ کا رتبہ بہت بڑا تھا فرمایا کہ

''خاکم نثار کوچہ آلِ محمد است'' (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۴۵)

ادھر آپ اپنا مقام حضرت امام حسینؓ سے بڑا بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اپنے علماء سے پوچھو کہ تمہارا مسیحؑ جس نے آسمان سے آنا ہے وہ امام حسین سے بڑا ہو گا یا چھوٹا۔ لیکن دوسری طرف امام حسین ہی نہیں امام حسین کی اولاد در اولاد پر اپنی جان قربان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے قابل احترام وجود ہیں۔ کیونکہ وہ

بہرحال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہیں۔تو رتبہ اور مقام اور چیز ہے اور محبت کا تعلق اور چیز ہے۔ پس حضرت مسیح کہتے ہیں کہ اگر واقعہ میں تمہارا اللہ تعالیٰ سے تعلق ہوتا اور تم اس کے بیٹے ہوتے تو تم مجھ سے محبت کیوں نہ کرتے۔تمہارا مجھے نہ چاہنا بتاتا ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے بیٹے نہیں ''اس لئے کہ میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں'' یعنی اپنے محبوب کی طرف سے آنے والی ہر چیز پیاری ہوتی ہے۔ پس تم جو مجھ سے محبت نہیں رکھتے تو معلوم ہوا کہ تمہارے دلوں میں اپنے محبوب کی بھی کوئی قدر نہیں۔

حدیثوں میں آتا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ کھڑے تھے کہ بادل آیا اور بارش ہوئی جب اس کے قطرات گرے تو آپ نے اپنی زبان باہر نکالی اور بارش کا قطرہ اس پر لے لیا۔ پھر آپ نے سمجھا کہ ممکن ہے میرے اردگرد کے لوگ یہ سمجھیں کہ میں نے کیا خلاف مرتبت بات کی ہے اس لئے آپ نے فرمایا یہ میرے رب کی تازہ نعمت آئی ہے یہی مضمون حضرت مسیح بیان فرماتے ہیں کہ ''میں خدا میں سے نکلا اور آیا ہوں'' یعنی میں خدا تعالیٰ کا ایک تازہ انعام ہوں۔اگر تم خدا تعالیٰ سے سچی محبت رکھنے والے ہوتے تو تم میری قدر کیوں نہ کرتے۔

''کیونکہ میں آپ سے نہیں آیا بلکہ اسی نے مجھے بھیجا۔''

اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مسیح نے جب اپنے آپ کو بیٹا کہا تو صرف رسول ہونے کی حیثیت سے ہی کہا ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۴ آیت ۱۶ تا ۲۲ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ ایک دفعہ ناصرہ میں سبت کے دن عبادت خانہ میں گئے تو وہاں ان کو یسعیاہ نبی کی کتاب دی گئی کہ اس میں سے وعظ کریں۔انہوں نے کتاب کھول کر وہ مقام نکالا جہاں لکھا تھا۔

> ''خداوند کا روح مجھ پر ہے اس لئے کہ اس نے مجھے غریبوں کو خوشخبری دینے لئے مسح کیا۔اس نے مجھے بھیجا ہے کہ قیدیوں کو رہائی اور اندھوں کو بینائی پانے کی خبر سناؤں۔ کچلے ہوؤں کو آزاد کروں اور خداوند کے سال مقبول کی منادی کروں۔''

اور پھر لوگوں کو وعظ و نصیحت کی۔ جب درس دے چکے تو لکھا ہے۔

> ''جتنے عبادت خانہ میں تھے سب کی آنکھیں اس پر لگی تھیں۔وہ ان سے کہنے لگا کہ آج یہ نوشتہ تمہارے سامنے پورا ہوا ہے۔''

یعنی یسعیاہ نبی کی کتاب کا جو نوشتہ تھا وہ آج پورا ہو گیا ہے۔اس نوشتہ کا یسعیاہ باب ۶۱ آیت ۱ تا ۳ میں تفصیلی طور پر ذکر آتا ہے حضرت یسعیاہ کہتے ہیں۔

’’خداوند خدا کی روح مجھ پر ہے کیونکہ خداوند نے مجھے مسح کیا تا کہ میں مصیبت زدوں کو خوشخبریاں دوں (یسعیاہ کہتے ہیں کہ خدا نے مجھے مسح کیا ہے تا کہ میں مصیبت زدوں کو خوشخبری سناؤں۔مگر عیسائی کہتے ہیں کہ اس میں مسیح کے متعلق پیشگوئی کی گئی ہے) اس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں ٹوٹے دلوں کو درست کروں اور قیدیوں کے لئے چھوٹنے اور بندھوؤں کے لئے قید سے نکالنے کی منادی کروں کہ خداوند کے سال مقبول کا اور ہمارے خدا کے انتقام کے روز کا اشتہار دوں اور ان سب کو جو غمزدہ ہیں تسلی بخشوں کہ صیہوں کے غمزدوں کے لئے ٹھکانہ کردوں کہ ان کو راکھ کے بدلے پگڑی اور نوحے کی جگہ خوشی کا روغن اور اداسی کے بدلے ستائش کی خلعت بخشوں تا کہ وے صداقت کے درخت اور خداوند کے لگائے ہوئے پودے کہلاویں کہ اس کا جلال ظاہر ہووے۔‘‘

(یسعیاہ ب ۶۱ آیت ۱ تا ۳)

عیسائیوں کے نزدیک یسعیاہ نبی کی یہ پیشگوئی حضرت مسیح پر چسپاں ہوتی ہے۔اگر یہ درست ہے اور یہ پیشگوئی واقعہ میں حضرت مسیح پر چسپاں ہوتی ہے تو پھر یہاں خدا کا ذکر نہیں بلکہ ایک انسان کے آنے کا ذکر ہے اور وہ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا کے ماتحت ہی آتا ہے کیونکہ لکھا ہے۔

’’اس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں ٹوٹے دلوں کو درست کروں اور قیدیوں کے لئے چھوٹنے اور بندھوؤں کے لئے قید سے نکالنے کی منادی کروں۔‘‘

’’اس نے مجھے بھیجا ہے‘‘ کا عربی میں یہی ترجمہ ہوگا کہ اَرْسَلَنِیْ اس نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یا جَعَلَنِیْ نَبِیًّا اس نے مجھے اپنا نبی بنایا ہے۔

یہ بھی یاد رکھو کہ اس پیشگوئی کے الفاظ مصلح موعود والی پیشگوئی کے الفاظ سے بالکل ملتے جلتے ہیں۔یعنی اس پیشگوئی میں بھی اسی قسم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس قسم کے الفاظ یسعیاہ نبی کی اس پیشگوئی میں استعمال کئے گئے ہیں۔

پھر متی باب ۲۱ آیت ۱۰ و ۱۱ میں لکھا ہے۔

’’اور جب وہ یروشلم میں داخل ہوا تو سارے شہر میں ہلچل پڑ گئی اور لوگ کہنے لگے یہ کون ہے۔ بھیڑ کے لوگوں نے کہا یہ گلیل کے ناصرہ کا نبی یسوع ہے۔‘‘

یہی بات قرآن کریم نے بیان کی ہے کہ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ مجھے خدا نے نبی بنا کر بھیجا ہے۔

پھر یوحنا باب ۷ آیت ۱۴ تا ۱۶ میں لکھا ہے کہ یسوع ایک دن ہیکل میں جا کر تعلیم دینے لگا۔ اس پر یہودیوں نے متعجب ہو کر کہا کہ اس کو بغیر پڑھے کیونکر علم آ گیا۔

''یسوع نے جواب میں ان سے کہا کہ میری تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے کی ہے۔''

گویا یہود نے جب تعجب کیا کہ اسے بغیر پڑھے تورات کا علم کس طرح آ گیا تو حضرت مسیحؑ نے کہا یہ میری تعلیم نہیں بلکہ اس خدا کی ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔ پس ان الفاظ میں بھی وہ اپنے رسول ہونے کا اعلان کرتے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ کا کمال ذاتی ہوتا ہے۔ اگر وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہوتے تو یہ کمال ان کے اندر ذاتی طور پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ میرا اس میں ذاتی کمال کوئی نہیں خدا نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے یہ تعلیم مجھے سکھائی ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی لکھا ہے کہ ؎

دگر استاد را نامے ندانم
کہ خواندم در د بستان محمدؐ

(استفتاء، روحانی خزائن جلد ۱۲ صفحہ ۱۲۳)

یعنی میں کسی اور استاد کا نام نہیں جانتا کیونکہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سکول میں پڑھا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ میرے علوم قرآنی علوم ہیں اور گو آپ نے ادب کے طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا ہے لیکن آپ کا اشارہ قرآن کریم کی طرف ہی ہے جو خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ہے۔ پس آپ کا یہ شعر وہی معنے رکھتا ہے جو حضرت مسیح کے اس فقرہ کے ہیں کہ ''میری تعلیم میری نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے کی ہے۔''

پھر وہ اسی باب کی سترھویں آیت میں کہتے ہیں

''اگر کوئی اس کی مرضی پر چلنا چاہے تو وہ اس کی تعلیم کی بابت جان لے گا کہ خدا کی طرف سے ہے یا میں اپنی طرف سے کہتا ہوں۔''

یعنی وہ لوگ جو سچے دل سے تحقیق کرنا چاہیں وہ اگر تحقیق کریں گے تو معلوم کر لیں گے کہ یہ تعلیم میری نہیں بلکہ میرے خدا کی ہے۔ پہلی آیت میں انہوں نے یہ کہا تھا کہ خدا نے مجھے بھیجا ہے اور اب اس آیت میں وہ اپنے اس دعویٰ پر اصرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تعلیم میں نے نہیں بنائی بلکہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے۔ پھر وہ اور زیادہ اس پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

''جو اپنی طرف سے کچھ کہتا ہے وہ اپنی عزت چاہتا ہے لیکن جو اپنے بھیجنے والے کی عزت چاہتا ہے وہ سچا ہے اور اس میں ناراستی نہیں'' (آیت ۱۸)

اس میں وہ پھر اپنے رسول ہونے پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو شخص یہ کہے کہ میں اپنے پاس سے علم دیتا ہوں وہ جھوٹا ہے لیکن وہ شخص جو یہ کہے۔ کہ میں خدا تعالیٰ سے علم حاصل کر کے دیتا ہوں وہ سچا ہے گویا حضرت مسیح عیسائیوں کو جن کا یہ عقیدہ ہے کہ مسیح خدا تھا اور اپنے علم سے بولتا تھا جھوٹا قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کے اس عقیدہ کو کہ مسیح خدا کا بندہ تھا سچا قرار دیتے ہیں۔

پھر یوحنا باب ۸ آیت ۱۶ میں فرماتے ہیں۔

''اگر میں فیصلہ کروں بھی تو میرا فیصلہ سچا ہے کیونکہ میں اکیلا نہیں بلکہ میں ہوں اور باپ ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔''

گویا وہ پھر جَعَلَنِیْ نَبِیًّا پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے میرے خدا نے بھیجا ہے۔

اسی طرح سترھویں آیت میں فرماتے ہیں۔

''تمہاری توریت میں بھی لکھا ہے (استثناء باب ۱۷ آیت ۶ و باب ۱۹ آیت ۱۵) کہ دو آدمیوں کی گواہی مل کر سچی ہوتی ہے ایک تو میں خود اپنی گواہی دیتا ہوں اور ایک باپ جس نے مجھے بھیجا میری گواہی دیتا ہے۔''

گویا وہ اپنی سچائی کی دو شہادتیں پیش کرتے ہیں ایک یہ کہ میں اس لئے سچا ہوں کہ میں خود کہتا ہوں کہ میں سچا ہوں اور دوسرے میں اس لئے سچا ہوں کہ خدا کہتا ہے میں سچا ہوں اور جب تمہاری شریعت میں یہ لکھا ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی سچی تسلیم کی جائے گی اور میری سچائی پر بھی دو شہادتیں موجود ہیں تو تم کیوں میری سچائی کے قائل نہیں ہوتے۔

دیکھو یہ جو مسیحؑ نے کہا ہے کہ ''ایک تو میں خود اپنی گواہی دیتا ہوں'' یہ وہی دلیل ہے جو قرآن کریم نے ان الفاظ میں پیش کی ہے کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔(یونس:۱۷)

ورنہ گواہی دینے والا بعض دفعہ جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں ہزاروں ایسے واقعات ملتے ہیں۔ پس اس جگہ گواہی سے یہ مراد نہیں کہ چونکہ میں اپنے آپ کو سچا کہتا ہوں اس لئے میں سچا ہوں۔ بلکہ اس جگہ اپنی گواہی سے مراد آپ کی دعویٰ نبوت سے پہلے کی زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے اور حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ ایک تو میری سابقہ زندگی اس

بات کا ثبوت ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں اور دوسرے خدا نے میری تائید میں جو نشانات دکھائے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ میرا دعویٰ سچا ہے اور درحقیقت نبیوں کی زندگی کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے باقی سب جھگڑے لغو اور فضول ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب ’’دعوۃ الامیر‘‘ میں اسی دلیل کو پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ دلیل ایسی ہی ہے جیسے کہتے ہیں۔ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

(دعوۃ الامیر، انوار العلوم جلد ۷ صفحہ ۴۲۴)

اگر کوئی پوچھے کہ آفتاب کے نکلنے کی کیا دلیل ہے تو ہم اسے یہی کہیں گے کہ آفتاب کی دلیل خود آفتاب کا وجود ہے۔ اسی طرح ایک شخص جس کی ساری زندگی ایک کھلے ورق کی طرح لوگوں کے سامنے ہے۔ جس کے متعلق اپنے اور بیگانے سب جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا خطرناک سے خطرناک اوقات میں بھی سچ سے کام لیتا ہے۔ اگر وہ خدا تعالیٰ کے متعلق کوئی بات کہے تو کوئی احمق اور بے وقوف ہی ہوگا جو اس کا انکار کرے اور کہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے لیکن اس شہادت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے شخص کا کیریکٹر اور چال چلن لوگوں کے لئے ایک کھلی کتاب کی طرح ہو۔ وہ شخص جس کی زندگی کے حالات لوگوں کو معلوم نہیں وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری پہلی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔

مجھے یاد ہے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ہماری جماعت میں سے ایک شخص جو اچھا مخلص اور سمجھدار تھا مگر بعد میں غیر مبایعین میں شامل ہو گیا اس کے بعد پھر خدا تعالیٰ نے اس پر فضل کیا اور وہ ہماری جماعت میں شامل ہو گیا۔ ایک دفعہ کسی جھگڑے کے موقعہ پر دوسرے سے کہنے لگا کہ میرا اپنا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اس وقت بچہ تھا مگر مجھے یہ سن کر ہنسی آئی کہ اس کا وجود بھلا لوگوں کے لئے کس طرح صداقت کا نشان بن سکتا ہے۔ اس کی زندگی کے تو حالات ہی لوگوں کو معلوم نہیں۔ پس اس آیت کو وہی شخص اپنی ذات پر چسپاں کر سکتا ہے جس نے لوگوں کے سامنے چیلنج کے طور پر اپنی زندگی کو پیش کیا ہو اور لوگوں نے بھی کرید کرید کر اس کے حالات زندگی کو دیکھا ہوا ہو۔ ایک عام آدمی کی زندگی تو ہوتی ہی پردے میں ہے وہ اس دلیل کو پیش کس طرح کر سکتا ہے۔ اسی طرح انبیاء کی صداقت کے جو اور دلائل ہیں ان کے متعلق بھی لوگ غلطی کرتے ہیں اور بعض دفعہ ایک ایسی بات اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کر دیتے ہیں جو موقع اور محل کے لحاظ سے وہاں چسپاں ہی نہیں ہوتی۔

سید احمد نور صاحب کابلی جواب (۵۶ء سے پہلے) فوت ہو چکے ہیں نبوت کا دعویٰ کیا کرتے تھے ایک دفعہ ایک دوست ان کے پاس گئے تو وہ واپس آ کر مجھے کہنے لگے کہ ان کی اور باتوں کا جواب تو مجھے آ گیا ہے لیکن ایک دلیل کو میں رد نہیں کر سکا اور وہ یہ کہ انہوں نے کہا تم لوگ مجھے پاگل کہتے ہو حالانکہ قرآن میں یہ لکھا ہے کہ جتنے نبی اور رسول آئے سب کو لوگ پاگل کہا کرتے تھے۔ پس تمہارا مجھے پاگل کہنا میری صداقت کی دلیل ہے میرے جھوٹے ہونے کی دلیل نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ تو بالکل سیدھی بات تھی نبی کو اس کے دعویٰ کے بعد محض اس کے دعوے کی وجہ سے لوگ پاگل کہتے ہیں لیکن سید احمد نور صاحب سے کہئے کہ آپ نے تو ابھی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا کہ ہم آپ کو رسیوں سے باندھا کرتے تھے۔ پس ایک پاگل کا اپنے آپ کو نبی کہنا اور چیز ہے اور نبی کو لوگوں کا پاگل کہنا بالکل اور چیز ہے۔ اگر تو نبوت کے دعویٰ کے بعد لوگ انہیں پاگل کہنے لگ جاتے پہلے وہ دماغی لحاظ سے بالکل ٹھیک ہوتے تو کچھ دلیل بھی تھی لیکن انہیں تو دعویٰ سے پہلے ہی کئی دفعہ جنون کی وجہ سے رسیوں سے باندھا جا چکا ہے۔ تو یہ دلیل بھی غلط استعمال ہونے لگ گئی ہے۔ اسی طرح ایک نبی کی صداقت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کی سابق زندگی اتنی شاندار ہوتی ہے کہ ہر قسم کے حالات میں سے گزرنے کے باوجود لوگ اس کی زندگی کو بالکل بے عیب پاتے ہیں۔ اردگرد کے لوگ اسے ٹٹولتے ہیں۔ ایسے حالات اس پر گزرتے ہیں جب جھوٹ کے بغیر اس کی نجات کی کوئی صورت نہیں ہوتی مگر پھر بھی وہ جھوٹ نہیں بولتا اور لوگوں پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ شخص نیک اور راستباز انسان ہے۔ لیکن عام آدمیوں کی زندگیاں نمایاں نہیں ہوتیں۔ بیسیوں چور ہوتے ہیں لیکن لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ چور ہیں۔ بیسیوں جھوٹے ہوتے ہیں مگر چونکہ ان کے حالات لوگوں کے سامنے نہیں آتے اس لئے وہ مخفی رہتے ہیں۔ پس یہ آیت صرف انبیاء ہی اپنے اوپر چسپاں کر سکتے ہیں۔ وہ لوگوں کو چیلنج دیتے ہیں کہ تم نے ہماری زندگیوں کو دیکھا۔ تم نے ہمارے حالات کو دیکھا۔ تم نے ہمارے اخلاق اور عادات کی جستجو کی۔ مگر تم نے یہی دیکھا کہ ہم جھوٹ بولنے والے نہیں۔ پس جب ہم انسانوں پر جھوٹ نہیں بولتے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم خدا پر جھوٹ بولنے لگ جائیں۔ یہی دلیل حضرت مسیح پیش کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

> ''تمہاری توریت میں بھی لکھا ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی مل کر سچی ہوتی ہے۔ ایک تو میں خود اپنی گواہی دیتا ہوں اور ایک باپ جس نے مجھے بھیجا میری گواہی دیتا ہے۔''

اب اگر اپنی گواہی سے صرف اتنی ہی مراد ہو کہ چونکہ میں کہہ رہا ہوں اس لئے میری بات سچی ہے تو اس طرح تو دنیا میں تباہی مچ جائے۔ کیا عدالت میں مقدمہ پیش ہو تو ملزم کہہ سکتا ہے کہ ایک تو اس واقعہ کا میں گواہ ہوں اور

ایک خدا گواہ ہے۔ اگر وہ ایسا کہے تو سب ہنسنے لگ جائیں گے۔ پس اس جگہ مسیح نے درحقیقت وہی دلیل پیش کی ہے کہ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

وہ اپنے یسوع ہونے کی حیثیت کو پیش نہیں کرتا بلکہ دعویٰ نبوت سے پہلے کی زندگی کو متحدیانہ طور پر پیش کرتا ہے۔ مگر بہرحال اس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ بندہ تھا۔ رسول تھا۔ خدائی کا دعویدار نہیں تھا۔

پھر متی باب ۲۱ آیت ۹ میں لکھا ہے۔

''اور بھیڑ جو اس کے آگے آگے جاتی اور پیچھے پیچھے چلی آتی تھی پکار پکار کر کہتی تھی ابن داؤد کو ہوشعنا۔ مبارک ہے وہ جو خدا کے نام سے آتا ہے عالم بالا پر ہوشعنا۔''

یہ ایک پیشگوئی تھی جس میں مسیحؑ کی آمد کی خبر دی گئی تھی پس جب یہ پیشگوئی پوری ہوئی تو لوگ خوش ہوئے کہ وہ شخص جس کے آنے کی خبر دی گئی تھی۔ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے آ گیا ہے۔ بہرحال یہاں حضرت مسیح کو ابن داؤد کہا گیا ہے گویا انہیں بنی اسرائیل کا ہی ایک فرد قرار دیا گیا ہے خدا نہیں کہا گیا۔

پھر مرقس باب ۶ آیت ۲ تا ۵ میں لکھا ہے کہ

''جب سبت کے دن مسیح عبادت خانہ میں تعلیم دینے لگا تو لوگ سن کر حیران ہوئے کہ یہ کیا حکمت ہے جو اسے بخشی گئی ہے۔ کیا یہ وہی بڑھئی نہیں جو مریم کا بیٹا اور یعقوب اور یوسیس اور یہوداہ اور شمعون کا بھائی ہے اور کیا اس کی بہنیں یہاں ہمارے ہاں نہیں۔''

یعنی اس کے بھائی اور بہنیں تو سب مذہب میں ہمارے ساتھ متفق ہیں اس کے ساتھ نہیں پھر یہ باتیں اسے کیسے آ گئیں۔ اس پر حضرت مسیح نے کہا۔

''نبی اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔''

(مرقس باب ۶ آیت ۴)

گویا وہ صاف طور پر اپنے آپ کو نبی کہتا ہے اور بتاتا ہے کہ نبی اپنے وطن اور اپنے رشتہ داروں اور اپنے گھر کے سوا اور کہیں بے عزت نہیں ہوتا۔

یوحنا باب ۴ آیت ۴۴ میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے لکھا ہے کہ

''یسوع نے خود گواہی دی کہ نبی اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ رشتہ دار اس کے ضرور مخالف تھے۔

یوحنا باب ۵ آیت ۳۶، ۳۷ میں حضرت مسیح فرماتے ہیں۔

’’باپ نے مجھے بھیجا ہے اور باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اسی نے میری گواہی دی ہے۔‘‘

گویا ایک ہی آیت میں دو دفعہ انہوں نے اپنے آپ کو رسول کہا ہے۔

پھر یوحنا باب ۴ آیت ۱۹ میں لکھا ہے

’’عورت نے اس سے کہا اے خداوند مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تو نبی ہے۔‘‘

گویا لوگ بھی اس کو نبی کہتے تھے اور وہ بھی اپنے آپ کو نبی کہتے تھے مگر آج کل کے عیسائی کہتے ہیں کہ وہ خدا تھے۔

غرض عیسائیوں نے قرآن کریم کے اس بیان پر جو گالیاں دی ہیں۔ وہ درحقیقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیں بلکہ اپنے مسیح کو گالیاں دی ہیں جس نے خود یہ دعوے کئے ہیں۔

چوتھی بات قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ وَ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ یہ الفاظ بھی اس کے انسان ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا اپنی ذات میں مبارک ہے اور انسان اس سے برکت حاصل کرتا ہے۔ خدا مبارِک ہوتا ہے اور انسان مبارَک ہوتا ہے۔ میرے ایک بچے کا نام مبارَک ہے۔ کوئی غلطی سے اسے مبارِک کہہ دیتا ہے تو میں کہتا ہوں یہ مبارِک نہیں مبارَک ہے۔ اسے برکت دی گئی ہے۔ برکت دینے والا خدا ہے پس حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ مجھے خدا نے برکت دیا گیا بنایا ہے اور جو مبارَک ہے وہ یقیناً انسان ہے۔ کیونکہ خدا کو کوئی برکت نہیں دے سکتا خدا تعالیٰ کے اندر ساری طاقتیں ذاتی ہیں وہ کسی سے کوئی طاقت نہیں لیتا۔ پس اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسیح مبارک ہے وہ برکت نہیں دیتا بلکہ برکت مانگتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ ایک انسان تھا اس کے لئے دیکھو یوحنا باب ۸ آیت ۲۹ جہاں وہ کہتا ہے۔

’’اور جس نے مجھے بھیجا ہے میرے ساتھ ہے۔ باپ نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑا (گویا وہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ مدد کا محتاج ہے اور یہ بھی کہ خدا نے اس کی مدد کی ہے) کیونکہ میں ہمیشہ ایسے کام کرتا ہوں جو اسے خوش آتے ہیں۔‘‘

پھر مرقس باب ۶ آیت ۳۹ تا ۴۱ میں لکھا ہے۔

’’تب اس نے انہیں حکم کیا کہ ان سب کو ہری گھاس پر بانٹ بانٹ کر کے بٹھلاوے سو سو اور

پچاس پچاس بانٹ میں بیٹھے۔تب اس نے وہ پانچ روٹیاں اور دو مچھلیاں لے کے آسمان کی طرف دیکھ کے برکت چاہی۔‘‘

یعنی مسیحؑ کے پاس ایک دفعہ بہت سے لوگ آ گئے آپ نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ ان کو کھانا کھلانے کے لئے قطاروں میں بٹھا دو۔ پھر مسیحؑ نے پانچ روٹیاں اور دو مچھلیاں اپنے ہاتھ میں لیں اور آسمان کی طرف دیکھا اور خدا تعالیٰ سے برکت چاہی۔جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ سمجھتا تھا کہ برکت صرف خدا تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔

پھر لکھا ہے کہ اس نے

’’روٹیاں توڑیں اور اپنے شاگردوں کو دیں کہ ان کے آگے رکھیں اور اس نے وے دو مچھلیاں ان سب میں بانٹیں وے سب کھا کے سیر ہوئے۔‘‘ (آیت ۴۱۔۴۲)

یعنی پھر برکت آ بھی گئی۔ پہلے مسیح نے خدا سے برکت مانگی اور پھر خدا نے اسے برکت دے بھی دی۔ پس مرقس تسلیم کرتا ہے کہ خدا مبارِک ہے اور مسیح مبارَک ہے۔خدا برکت دینے والا ہے اور مسیح برکت لینے والا ہے۔

پھر یہی مضمون مرقس باب ۸ آیت ۶ تا ۸ میں بھی بیان ہوا ہے۔لکھا ہے

’’پھر اس نے بھیڑ کو حکم کیا کہ زمین پر بیٹھ جائیں اور اس نے وہی سات روٹیاں لیں اور شکر کر کے توڑیں (یعنی روٹی ملنے پر اس نے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا) اور اپنے شاگردوں کو دیں کہ ان کے آگے رکھیں اور انہوں نے لوگوں کے آگے رکھ دیں اور ان کے پاس کئی ایک چھوٹی مچھلیاں تھیں سو اس نے برکت مانگ کے حکم کیا کہ انہیں بھی ان کے آگے دھریں چنانچہ انہوں نے کھایا اور سیر ہوئے۔‘‘

اس جگہ پھر برکت مانگنے کا ذکر ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پھر وہ برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ بھی گئی۔ یہ کہ یہ کیا معجزہ ہے اس جگہ میں ہمیں اس تفصیل میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہمارا مقصد ان حوالوں سے صرف اس قدر ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ حضرت مسیح نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ وَ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ اور بائبل بھی یہی کہتی ہے کہ اس نے خدا تعالیٰ سے برکت مانگی اور خدا تعالیٰ نے اسے برکت دی۔ پس قرآن کریم کا دعویٰ بالکل درست ہے اگر قرآن نے غلط دعویٰ کیا ہے تو پھر بائبل بھی غلط اور ناقابل اعتبار ہے۔

حدیثوں میں بھی اس قسم کے بعض واقعات آتے ہیں۔حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے غلہ خریدا جو چلتا چلا گیا اور ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔آخر مجھے خیال آیا کہ دیکھیں تو سہی کہ ہے کتنا جب اس کو تولا تو ختم ہو گیا (ترمذی کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع باب ۳۱)۔ بے شک بعض دفعہ انسان اپنی تدبیر اور حکمت عملی سے بھی

تھوڑی چیز میں گزارہ کر لیتا ہے لیکن بعض دفعہ انسانی ہاتھ کا کوئی دخل نظر نہیں آتا اور برکت چلتی چلی جاتی ہے یہ ایک ایسا راز ہے جس کو انسان بیان نہیں کر سکتا۔ میرے گھر کے بہت سے افراد ہیں چار بیویاں ہیں۔ بائیس بچے ہیں اور پھر بچوں کی اولادیں ہیں۔ کئی ایسے ہیں جو ابھی کوئی کام نہیں کرتے اور کئی ایسے ہیں جو کام تو کرتے ہیں لیکن بوجہ دینی خدمت کرنے کے جو رقم ان کو ملتی ہے اس میں ان کا گزارہ نہیں ہوتا اور ہمیشہ ان کے اخراجات کا کچھ حصہ مجھے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب بھی میں حساب کرنے لگوں تو دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان اخراجات کے پورا ہونے کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ مگر حساب نہ کروں۔ تو روپیہ آ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب ضرورتوں کو پورا کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ میں دریا پر سیر کرنے کے لئے گیا ہوا تھا کہ ایک دن ہم نے صرف ایک چوزہ اور ایک چھوٹی سی مرغابی تیار کروائی یہ کھانا ہمارے لئے کافی تھا۔ مگر ہم مغرب کی نماز پڑھ کر بیٹھے تو اردگرد کے علاقہ کے تیس چالیس آدمی آ گئے۔ ان میں سے ایک دو تو احمدی تھے اور باقی ان کے غیر احمدی رشتہ دار تھے۔ مگر انہوں نے یہ نہ بتایا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر چلے جائیں گے مگر وہ اتنی دیر بیٹھے کہ عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ آخر میں نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں کے آنے کی کیا غرض ہے؟ کہنے لگے ہم نے ایک نکاح پڑھوانا ہے۔ میں نے کہا بہت اچھا چنانچہ میں نے نکاح پڑھ دیا۔ مگر وہ نکاح پڑھوانے کے بعد پھر بیٹھ گئے۔ غالباً وہ اسی نیت سے آئے تھے کہ ہم کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ پہلے تو میرے دل میں بخل پیدا ہوا کہ ہم کچھ دیر اور انتظار کر لیتے ہیں شاید یہ چلے جائیں۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ تو جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ تو میں نے امّ طاہر مرحومہؓ کو رقعہ لکھا کہ اس طرح مہمان آ گئے ہیں۔ چالیس کے قریب یہ ہیں چھ سات گھر کے افراد ہیں اور بیس کے قریب دفتر کے آدمی اور بعض دوسرے لوگ ہیں ان ستر آدمیوں کے کھانے کا کیا انتظام ہوگا۔ انہوں نے مجھے کہلا بھیجا کہ ہم تو آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میں نے باورچی سے اس بارہ میں بات کر لی ہے آپ بے فکر رہیں۔ چنانچہ اس کے بعد سب کو کھانے کے لئے بٹھا دیا گیا اور وہ دستر خوان پر سے سیر ہو کر اٹھے۔ جب میں باہر سے فارغ ہو کر گھر آیا تو میں نے امّ طاہر سے کہا کہ آج تم کو تو کھانا نہیں ملا ہوگا۔ انہوں نے کہا ملا کیوں نہیں۔ میں نے بھی کھا لیا ہے اور کچھ کھانا بچ بھی گیا ہے اب اس میں کچھ باورچی کا بھی کمال ہوگا مگر کچھ خدا تعالیٰ کا بھی فضل تھا کہ ستر آدمی دو چوزوں پر بیٹھ گئے اور سیر ہو کر اٹھے تو خدا تعالیٰ کی برکتیں کئی رنگوں میں ظاہر ہوتی ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک حد تک اس میں اخفاء کا بھی پہلو ہوتا ہے جیسے میں نے اپنے متعلق ہی بتایا ہے کہ حساب کرنے بیٹھوں تو دماغ پریشان ہو جاتا

ہے اور طبیعت سخت کوفت محسوس کرتی ہے لیکن حساب نہ کروں تو سب کام خود بخود ہو جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی اسی رنگ میں اللہ تعالیٰ نے سلوک کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی حدیثوں میں اسی قسم کے کئی واقعات آتے ہیں۔

پھر متی باب ۲۶ آیت ۲۶ تا ۲۸ میں بھی یہی لکھا ہے کہ

''ان کے کھاتے وقت یسوع نے روٹی لی اور برکت مانگ کے توڑی پھر شاگردوں کو دے کر کہا لو کھاؤ یہ میرا بدن ہے پھر پیالہ لے کر شکر کیا اور انہیں دے کر کہا تم سب اس میں سے پیو کیونکہ یہ میرا لہو ہے یعنی نئے عہد کا لہو جو بہتوں کے گناہوں کی معافی کے لئے بہایا جاتا۔''

یہاں بھی یہی ذکر ہے کہ مسیح نے برکت مانگ کر روٹی توڑی اور شاگردوں سے کہا کہ کھاؤ یہ میرا بدن ہے اور پانی دے کر کہا کہ پیؤ یہ میرا خون ہے عیسائیوں میں عشاء ربانی کی جو عبادت پائی جاتی ہے اس کی بنیاد اسی واقعہ پر ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۱ آیت ۴۱۔ ۴۲ میں لکھا ہے کہ جب مریم حاملہ ہوئیں اور یحییٰ کی ماں سے ملنے کے لئے گئیں تو اس نے حضرت مریم سے کہا کہ

''تو عورتوں میں مبارک ہے اور تیرے پیٹ کا پھل مبارک ہے۔''

گویا اس جگہ وہی مضمون ہے جو جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

پھر لوقا باب ۱۱ آیت ۲۷۔ ۲۸ میں لکھا ہے۔

''جب وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ بھیڑ میں سے ایک عورت نے پکار کر اس سے کہا مبارک ہے وہ پیٹ جس میں تو رہا اور وہ چھاتیاں جو تو نے چوسیں اس نے کہا ہاں مگر زیادہ مبارک وہ ہیں جو خدا کا کلام سنتے اور اسے مانتے ہیں۔''

غرض جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا کے ثبوت میں انسانوں کی شہادتیں بھی انجیل میں موجود ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی شہادتیں بھی انجیل میں موجود ہیں۔

پانچویں بات قرآن کریم نے یہ بیان کی ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کہا وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ خدا تعالیٰ نے مجھے نماز کا حکم دیا ہے یہ بھی انسان ہی کی صفت ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کو کوئی حکم دینے والا نہیں ہوتا اور پھر اس کے لئے نماز کا بھی کوئی سوال نہیں۔ اس کے لئے دیکھو لوقا باب ۹ آیت ۱۸ جہاں لکھا ہے۔

’’جب وہ تنہائی میں دعا کر رہا تھا اور شاگرد اس کے پاس تھے تو ایسا ہوا کہ اس نے ان سے پوچھا کہ لوگ مجھے کیا کہتے ہیں۔‘‘

اس حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح دعائیں کرنے کا عادی تھا اور دعائیں بھی وہ زیادہ تر اپنی ترقی اور دعویٰ کی کامیابی کے لئے کرتا تھا کیونکہ اس کا یہ کہنا کہ لوگ مجھے کیا کہتے ہیں بتاتا ہے کہ اس کے دماغ پر یہ امر حاوی تھا کہ لوگوں کے متعلق اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آیا وہ اسے سچا سمجھتے ہیں یا جھوٹا سمجھتے ہیں۔ یہ فقرہ بتاتا ہے کہ وہ دعا اپنے سلسلہ کی ترقی اور دعویٰ کی کامیابی کے لئے کرتا تھا۔

پھر لوقا باب ۱۱ آیت ۱ تا ۴ میں لکھا ہے۔

’’اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگتا تھا جب مانگ چکا ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس کو کہا اے خداوند ہم کو دعا مانگنا سکھا جیسا کہ یوحنا نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اس نے ان سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے۔ تیرے نام کی تقدیس ہو تیری بادشاہت آوے تیری مراد جیسی آسمان پر، زمین پر بھی آوے۔ ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دے اور ہمارے گناہوں کو بخش کیونکہ ہم بھی ہر ایک کو جو ہمارا قرض دار ہے بخشتے ہیں۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ ہم کو برائی سے چھڑا۔‘‘

یہاں سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ وہ دعا کا عادی تھا یہ الفاظ کہ ’’ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگتا تھا‘‘ بتاتے ہیں کہ خلوت میں کوئی جگہ ہوگی جہاں حضرت مسیح دعا مانگتے ہوں گے۔ ان کے ساتھیوں پر بھی اس دعا اور گریہ وزاری کا اثر ہوا اور انہوں نے کہا کہ ہمیں بھی بتائیے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے کیا مانگا کریں۔ اس پر حضرت مسیح نے ان کو یہ دعا سکھلائی۔ یہ دعا عیسائیوں کی سورۂ فاتحہ ہے لیکن غور کرکے دیکھو قرآن کریم کی سورۂ فاتحہ میں اور انجیل کی اس دعا میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ فاتحہ شروع ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی نصرت مانگتے ہوئے جو بے مانگے دینے والا اور ہمارے کاموں کے بہتر سے بہتر نتائج پیدا کرنے والا ہے اس کے حضور یہ دعا کرتا ہوں۔ گویا سورۃ فاتحہ جو دعا ہے اس کی قبولیت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک دعا سکھلائی ہے یعنی پیشتر اس کے کہ وہ دعا مانگی جائے اس دعا کو صحت نیت کے ساتھ مانگنے کے لئے اور ان سامانوں کے حصول کے لئے جن سے کام لے کر دنیا میں ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اور جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ وتصرف میں ہیں اور اسی طرح ان پیدا کردہ سامانوں سے صحیح طور پر کام لینے کے لئے اور ان کے اعلیٰ درجہ کے نتائج کے

حصول کے لئے جو انسان کو مزید انعامات کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو جوش میں لاتا ہے جن کا دعا کی قبولیت کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ یہ کسی کامل دعا ہے کہ ابھی دعا شروع بھی نہیں کی گئی کہ اس کی قبولیت کے لئے اور اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی استعانت طلب کی جاتی ہے اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کا واسطہ دے کر التجاء کی جاتی ہے کہ وہ اپنی مدد انسان کے شامل حال رکھے اور اس کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا فرمائے اور نہ صرف سامان مہیا فرمائے بلکہ ان کے اعلیٰ سے اعلیٰ نتائج بھی پیدا فرمائے۔ پھر وہ کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ گویا وہ خدا تعالیٰ کی چار صفات بیان کرتا ہے اور یہ چاروں اصولی صفات ہیں جن کے ارد گرد باقی تمام صفات چکر کھاتی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مسیح کہتا ہے۔

''اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرے نام کی تقدیس ہو۔''

گویا وہ محض اس کو قدوس کہتا ہے حالانکہ قدوس ان صفات میں سے ایک صفت ہے جو اس کے گرد چکر کھا رہی ہیں۔

پھر سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کا اسم ذات بیان کیا گیا ہے مگر مسیح کہتا ہے ''اے ہمارے باپ'' حالانکہ باپ کا لفظ اس کی صرف ایک صفت کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی یہ لفظ صرف اتنا بتاتا ہے کہ اس کے اندر باپ کی سی شفقت اور رحم پایا جاتا ہے حالانکہ صرف باپ ہی رحم کرنے والا نہیں ہوتا ماں بھی رحم کرنے والی ہوتی ہے بھائی بھی رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ استاد بھی رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ بادشاہ بھی رحم کرنے والا ہوتا ہے اور سب اپنے اپنے دائرہ میں محبت اور احسان کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان ساری صفات کو جمع کر کے اس کا اسم ذات بیان کیا۔ یعنی اللہ جس میں ساری صفات جمع ہیں۔ بے شک باپ بھی مہربان ہوتا ہے مگر وہ اللہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ میں باپ والی محبت بھی شامل ہے، ماں والی محبت بھی شامل ہے، بیٹے والی محبت بھی شامل ہے۔ بھائی والی محبت بھی شامل ہے۔ استاد والی محبت بھی شامل ہے، محلہ کی پنچایت والی محبت بھی شامل ہے، بادشاہ والی محبت بھی شامل ہے لیکن باپ میں ان محبتوں سے کوئی محبت بھی شامل نہیں ہوتی۔ پس قرآنی دعا کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ اس دعا میں خدا تعالیٰ کے اسم ذات کو پیش کرتا ہے جس میں تمام قسم کے کمالات اور خوبیاں جمع ہیں۔ اس کے بعد اس نے صفات کی تقسیم شروع کی اور کہا کہ وہ رب ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، مالک یوم الدین ہے لیکن انجیل نے صرف اتنا کہا کہ

''تیرے نام کی تقدیس ہو''

حالانکہ تقدیس جھوٹی بھی ہوسکتی ہے اور سچی بھی۔ بتوں کو لوگ قدوس کہتے ہیں لیکن وہ مقدس نہیں ہو جاتے۔ پھر انجیل نے یہ بھی نہیں کہا کہ تو مقدس ہے بلکہ کہا ہے کہ ''تیرے نام کی تقدیس ہو'' یعنی لوگ تجھے مقدس کہا کریں حالانکہ مقدس کہنے والے جھوٹے بھی ہوسکتے ہیں اور سچے بھی ہوسکتے ہیں۔

پھر لکھا ہے ''تیری بادشاہت آوے'' مگر قرآن کہتا ہے کہ وہ مالک یوم الدین ہے اس کی بادشاہت نے آنا کیا ہے وہ تو ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے پھر وہ تو یہ کہتا ہے کہ '' تیری بادشاہت آوے'' اور قرآن کہتا ہے کہ خالی بادشاہت کچھ چیز نہیں بادشاہتیں قائم ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں تیری بادشاہت وہ ہے جو انجام تک ممتد ہوتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے گویا خدا تعالیٰ کو وہ بادشاہت حاصل ہے جو کبھی ختم ہونے والی نہیں جس کی طرف مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر انجیل کہتی ہے کہ

''تیری مراد جیسی آسمان پر زمین پر بھی آوے''

یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی شان کے بالکل خلاف ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جو دوسروں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے مگر اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ زمین پر بھی تیری مرادیں پوری ہوں گویا جس طرح فقیروں کو خیرات ڈال دی جائے تو وہ خوش ہو کر کہتے ہیں کہ اللہ تیری مرادیں پوری کرے اسی طرح خدا تعالیٰ کو بھی دعا دی گئی ہے کہ تیری مرادیں پوری ہوں۔ حالانکہ خدا تعالیٰ کو یہ کہنا کہ تیری مرادیں پوری ہو جائیں اس سے زیادہ ہتک آمیز بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

اس کے بعد قرآن کریم نے ایک فقرہ استعمال کیا ہے جس کا انجیل میں ذکر تک نہیں۔ قرآن کریم نے صفات الٰہیہ کے بعد انسان کو یہ سکھایا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے کہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ یعنی اے خدا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں گویا ان الفاظ میں انسان خدائی طاقتوں کا اقرار اور اپنی عبودیت کا اظہار کرتا ہے لیکن انجیل نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

پھر قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ یعنی اے خدا دنیا کے بھی کام ہیں اور دین کے بھی کام ہیں۔ زمین کے بھی کام ہیں اور آسمان کے بھی کام ہیں۔ اگر میں باپ ہوں تو مجھ پر باپ کی ذمہ واریاں ہیں۔ ماں ہوں تو مجھ پر ماں کی ذمہ واریاں ہیں۔ خاوند ہوں تو مجھ پر خاوند ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ بیوی ہوں تو مجھ پر بیوی ہونے کی ذمہ وایاں ہیں۔ سپاہی ہوں تو مجھ پر سپاہی ہونے کی ذمہ واریاں

ہیں۔ کرنیل ہوں تو مجھ پر کرنیل ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ جرنیل ہوں تو مجھ پر جرنیل ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ بادشاہ ہوں تو مجھ پر بادشاہ ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ فلاسفر ہوں تو مجھ پر فلاسفر ہونے کی ذمہ واریاں ہیں صناع ہوں تو مجھ پر صناع ہونے کی ذمہ واریاں ہیں۔ غرض مجھ پر کئی قسم کی ذمہ واریاں ہیں تو میرے ہر کام میں کامیابی کا قریب ترین راستہ مجھے دکھا۔ مگر مسیح کہتا ہے کہ

''ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دے''

گویا جس طرح کھانا کھاتے وقت بلی پاس آ بیٹھتی ہے یا طوطا اور کوّا آ بیٹھتا ہے اور روٹی کا ایک ٹکڑہ اٹھا کر ہم اسے بھی ڈال دیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی گئی ہے کہ ''ہماری روز کی روٹی ہر روز ہمیں دے''

پھر کہا گیا ہے کہ

''ہمارے گناہوں کو بخش کیونکہ ہم بھی ہر ایک کو جو ہمارا قرضدار ہے بخشتے ہیں''

لیکن قرآن کریم نے سورۂ فاتحہ میں غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ کہہ کر بتایا ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک گناہ Positive ہوتا ہے اور ایک گناہ Negative ہوتا ہے یعنی ایک گناہ مثبت ہوتا ہے اور ایک گناہ منفی ہوتا ہے۔ بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو نواہی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جو نیکیوں کے نہ کرنے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ انجیل کی دعا میں صرف Positive گناہوں کا ذکر ہے۔ Negative گناہوں کا ذکر نہیں۔ یعنی یہ تو دعا کی گئی ہے کہ جو گناہ ہم کر بیٹھے ہیں وہ ہمیں بخش دے لیکن اس امر کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ جو نیکیاں ہم نے نہیں کیں ان کے بدنتائج سے ہمیں محفوظ رکھ۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کریم نے غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ میں Positive گناہوں کا ذکر کیا ہے۔ اور وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ میں Negative گناہوں کا ذکر کیا ہے یعنی جو نیکیاں ہمیں کرنی چاہیے تھیں لیکن ہم نے نہیں کیں ان کے بدنتائج سے بھی ہمیں بچا۔ اور اسی طرح ہم کو اس بات سے بھی بچا کہ جو کام کرنے والے ہیں وہ ہم نہ کریں اور نیکی کے رستہ سے بہک جائیں۔

آخر میں کہا گیا ہے کہ

''ہمیں آزمائش میں نہ ڈال بلکہ ہم کو برائی سے چھڑا۔''

یہ فقرہ اس پہلے فقرہ کا ہی نتیجہ ہے کہ ''ہمارے گناہوں کو بخش'' اس میں کوئی زائد بات نہیں بیان کی گئی لیکن قرآن کریم نے اس دعا کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کیونکہ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کے ماتحت جب ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھایا جائے گا جو منعم علیہ گروہ میں شامل تھے تو ہم آزمائش میں پڑیں گے ہی نہیں۔

بہرحال اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مسیح دعا مانگا کرتا تھا اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ قرآنی دعا اور مسیحؑ کی دعا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۵ آیت ۱۶ میں لکھا ہے

''پر وہ بیابان میں الگ جا کے رہا اور دعا مانگتا تھا''

یعنی وہ ایک دفعہ جنگل میں جا کے رہا تا کہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے۔ یہ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ کی صداقت کا کیسا واضح اور کھلا ثبوت ہے اَوْصَاہُ بِکَذَا کے معنے ہوتے ہیں عَھِدَ اِلَیْہِ یعنی مستقل طور پر کام کرنے کی تاکید کی۔ حکم محض اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کہ ہم فلاں بات کا تقاضا کرتے ہیں اور وصیت کے مفہوم میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ ہم مستقل طور پر زور سے اس کام کو جاری رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔ پس اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ کے یہ معنے ہیں کہ اس نے مجھے دعائیں کرنے کی بڑے زور سے تاکید کی ہے اور کہا ہے کہ تم ہمیشہ دعائیں کرتے رہو۔ اور جو حوالے میں نے بتائے ہیں ان سے یہی امر ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح مستقل طور پر دعائیں کرنے کا عادی تھا۔

پھر لوقا باب ۲۲ آیت ۳۲ میں آتا ہے

''لیکن میں نے تیرے لئے دعا مانگی کہ تیرا ایمان جاتا نہ رہے۔''

یہاں بھی دعا کا ذکر ہے۔

اسی طرح لوقا باب ۲۲ آیت ۴۱ میں ہے

''اور اس نے ان سے تیر کے ایک ٹپے پر بڑھ کے گھٹنے ٹیک کر دعا مانگی۔''

یعنی اتنی دور جتنے فاصلہ پر تیر گرتا ہے گویا اندازاً سو ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلہ پر تشہد کی طرح گھٹنے ٹیک کر اس نے دعا کی۔

پھر اسی باب کی آیت ۴۴ میں لکھا ہے

''اور وہ جان کنی میں پھنس کے بہت گڑگڑا کے دعا مانگتا تھا اور اس کا پسینہ لہو کی بوند کی مانند ہو کر زمین پر گرتا تھا۔''

یعنی حضرت مسیح اس طرح گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگ رہے تھے کہ یوں معلوم ہوتا تھا ان کے پسینہ کی جگہ خون بہہ رہا تھا۔

اسی طرح آیت ۴۵، ۴۶ میں لکھا ہے

’’اور دعا سے اٹھ کر اپنے شاگردوں کے پاس آیا اور انہیں غم سے سوتا پایا۔‘‘

اپنی تعریف بھی کتنی کرتے ہیں کہ دعا کی نہیں اور غفلت کی حالت میں سو گئے۔ لیکن بتایا یہ جاتا ہے کہ انہیں اتنا غم پہنچا کہ وہ سو گئے۔ حضرت مسیحؑ پھر ان کے پاس آئے اور کہا کہ

’’تم کیوں سوتے ہو اٹھ کر دعا مانگو تا کہ آزمائش میں نہ پڑو۔‘‘

دوسری چیز زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ انبیاء کا کام ہی یہی ہوتا ہے کہ جو کچھ خدا تعالیٰ انہیں دیتا ہے وہ آگے لوگوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ پس نبیوں کا زکوٰۃ دینا درحقیقت ان کا اپنے مریدوں کو اس کی تلقین کرنا ہوتا ہے۔

متی باب ۲۲ میں آتا ہے کہ فریسی حضرت مسیحؑ کے پاس آئے اور آکر کہا کہ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ آیا قیصر کو ہم اس کا ٹیکس ادا کریں یا نہ کریں۔ ان کی غرض یہ تھی کہ اگر یہ جواب دیں گے کہ ادا کرو تو ہم قوم کو اکسائیں گے اور کہیں گے کہ یہ حکومت کا خوشامدی ہے یہ لوگوں کو تعلیم دیتا ہے کہ قیصر کو جزیہ ادا کرنا چاہیے اور اگر یہ جواب دیں گے کہ نہ دو تو ہم شور مچا دیں گے کہ یہ حکومت کا باغی ہے۔ یہ وہی مولویوں والی چال تھی جو آج کل ہمارے خلاف چلی جاتی ہے۔ حضرت مسیحؑ نے ان کی اس شرارت کو بھانپ لیا۔ چنانچہ لکھا ہے

’’یسوع نے ان کی شرارت سمجھ کے کہا اے ریاکارو مجھے کیوں آزماتے ہو۔ جزیہ کا سکہ مجھے دکھلاؤ۔ وے ایک دینار اس پاس لائے۔ تب اس نے ان سے کہا یہ صورت اور سکہ کس کا ہے۔ انہوں نے کہا قیصر کا پھر اس نے کہا پس جو چیزیں قیصر کی ہیں قیصر کو اور جو خدا کی ہیں خدا کو دو۔ انہوں نے یہ سن کر تعجب کیا اور اسے چھوڑ کر چلے گئے۔‘‘ (متی باب ۲۲ آیت ۱۸ تا ۲۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے اموال میں سے خدا تعالیٰ کا حصہ دینے کا قانون تسلیم کیا ہے اور یہی چیز ہے جسے زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

پھر متی باب ۱۵ میں لکھا ہے

’’تب یسوع نے اپنے شاگردوں کو اپنے پاس بلا کے کہا کہ مجھے اس جماعت پر رحم آتا ہے کہ تین دن میرے ساتھ رہی اور ان کے پاس کچھ کھانے کو نہیں۔ اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں فاقہ سے رخصت کروں ایسا نہ ہو کہ راہ میں کہیں ناطاقت ہو جائیں۔ اس کے شاگردوں نے اس سے کہا کہ اس ویرانہ میں ہم اتنی روٹیاں کہاں سے پاویں کہ ایسی جماعت کو آسودہ کریں۔ تب یسوع نے انہیں

کہا کہ تمہارے پاس کتنی روٹیاں ہیں وے بولے سات اور کئی ایک چھوٹی مچھلی۔ تب اس نے جماعتوں کو حکم کیا کہ زمین پر بیٹھ جاویں۔ پھر ان سات روٹیوں اور مچھلیوں کو لے کر شکر کیا اور توڑ کر اپنے شاگردوں کو دیا اور شاگردوں نے لوگوں کو۔ اور سب کھا کے آسودہ ہوئے اور ٹکڑوں سے جو بچ رہے تھے انہوں نے سات ٹوکریاں بھر کر اٹھائیں اور کھانے والے سوا عورتوں اور لڑکوں کے چار ہزار مرد تھے اور جماعتوں کو رخصت کر کے کشتی پر چڑھا اور مگدلا کی اطراف میں آیا۔‘‘

(انجیل متی باب ۱۵ آیت ۳۲ تا ۳۹)

بائبل کے بیان میں ہمیشہ مبالغہ ہوتا ہے ممکن ہے چار پانچ ہی آدمی ہوں جنہیں چار ہزار کہہ دیا گیا ہو جیسے سکھوں کی عادت ہے کہ ایک آدمی بھی آ جائے اور وہ دروازہ کھٹکھٹائے۔ تو اندر والا پوچھتا ہے۔ باہر کون ہے؟ اس پر باہر والا جواب دیتا ہے ’’فوجاں‘‘ وہ پوچھتا ہے کتنی؟ وہ جواب دیتا ہے سوا لاکھ۔ جس طرح سکھ ایک آدمی کو سوا لاکھ کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح بائبل کے لکھنے والے بھی تعداد میں خوب مبالغہ کرتے ہیں۔ موسیٰ کی قوم کی تعداد بتائی گئی ہے تو اس میں اتنا مبالغہ کیا گیا ہے کہ کوئی حد ہی نہیں۔ حالانکہ وہ کوئی بڑی قوم نہیں تھی۔ اسی طرح اس واقعہ میں بھی خوب مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ مگر بہر حال اس سے ظاہر ہے کہ بھوکوں کو روٹی کھلانے کا جذبہ اس کے اندر موجود تھا اور وہ غریبوں اور بھوکوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ یہی واقعہ دوسری جگہوں میں بھی آتا ہے۔

پھر حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ بَرًّاۢ بِوَالِدَتِيْ خدا تعالیٰ نے مجھے اپنی والدہ کے ساتھ نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کا ذکر لوقا باب ۲ آیت ۵۱ میں آتا ہے جہاں لکھا ہے۔

’’اور وہ ان کے ساتھ روانہ ہو کر ناصرت میں آیا اور ان کے تابع رہا اور اس کی ماں نے یہ سب باتیں اپنے دل میں رکھیں۔‘‘

یعنی مسیح اپنی ماں کی اطاعت کرتا تھا۔ لیکن جہاں لوقا نے یہ لکھا ہے کہ وہ اپنی ماں کا تابع رہا وہاں باقی سب انجیل نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ عملاً اپنی ماں کے احکام کو توڑتا رہا۔ کسی جگہ اس نے سختی سے اپنی ماں کو ڈانٹا کسی جگہ یہ کہا کہ میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو۔ کسی جگہ یہ کہا کہ تم چلے جاؤ میں تمہارے پیچھے آنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن قرآن ہر جگہ یہی بتاتا ہے کہ وہ اپنی ماں کا فرمانبردار تھا اور اس نے ہمیشہ اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

پھر فرماتا ہے وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا اس نے مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا۔ جبار کا لفظ اضداد میں سے ہے۔ یعنی اس کے ایک معنے ٹوٹے ہوئے کی اصلاح کرنے والے کے ہیں اور اس کے ایک معنے دوسرے کا حق مار کر اور

اس کو ذلیل کر کے اپنے آپ کو اونچا کرنے والے کے ہیں۔ گویا ایک شخص تو ایسا ہوتا ہے جو جائز طور پر بڑائی حاصل کر کے بڑا بنتا ہے اور ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو دوسرے کو گرا کر اور اس کا حق مار کر اس کے اوپر چڑھتا ہے۔ پس جبار کے ایک معنے ہیں دوسرے کو گرا کر اور سے ذلیل کر کے اپنی بڑائی اور بلندی چاہنے والا۔ اور اس کے دوسرے معنے ہیں ٹوٹے ہوئے کی اصلاح کرنے والا۔ جبار کا لفظ جب اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں ٹوٹے کام بنانے والا اور جب انسانوں کے متعلق یہ لفظ استعمال ہو تو اس کے معنے ہوتے ہیں دوسروں کو گرا کر اپنی ترقی چاہنے والا۔ گویا جبار کا لفظ ایسا ہے جس کے مقابلہ میں نرم دل اور لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والے کے الفاظ آئیں گے۔ پس جب حضرت مسیح نے کہا کہ لَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا تو اس کے معنے یہ تھے کہ مجھے خدا تعالیٰ نے جو اخلاق بخشے ہیں ان کے لحاظ سے اس نے مجھے جبار نہیں بنایا یعنی اس نے مجھے نرم دل اور لوگوں کے ساتھ محبت کرنے والا وجود بنایا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ انجیل اس بارہ میں کیا کہتی ہیں۔ اس کے لئے متی باب ۱۱ آیت ۲۹ میں ہمیں حضرت مسیح ؑ کے یہ الفاظ نظر آتے ہیں کہ

''میرا جؤا اپنے اوپر لے لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم اور دل سے خاکسار ہوں تو تم اپنے جیوں میں آرام پاؤ گے کیونکہ میرا جؤا ملائم اور میرا بوجھ ہلکا ہے۔''

اس حوالہ میں وہ اپنے آپ کو دل کا حلیم اور خاکسار کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ میں لوگوں پر ظلم نہیں کرتا۔ ان کا حق نہیں چھینتا۔ بلکہ اگر کوئی حکم بھی دیتا ہوں تو اس لئے کہ لوگوں کا فائدہ ہو۔ محض اپنی حکومت جتانے کے لئے میں کوئی حکم نہیں دیتا۔

اسی طرح متی باب ۲۱ آیت ۵ میں آتا ہے

''صیہوں کی بیٹی سے کہو۔ دیکھ تیرا بادشاہ فروتنی سے گدھی پر بلکہ گدھی کے بچہ پر سوار ہو کے تجھ پاس آتا ہے۔''

اس حوالہ سے بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنے آپ کو فروتن کہتا ہے یعنی بجائے اس کے کہ لوگوں کو گرا کر اور ان کو کمزور کر کے وہ اپنی برتری کی کوشش کرتا وہ اپنے آپ کو لوگوں کا خادم بتاتا ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے وہ صورت نہایت مضحکہ خیز استعمال کرتا ہے۔ یعنی کسی غیر شخص کی گدھی کے بچہ پر سوار ہو کر شہر میں آتا ہے۔ چنانچہ انجیل میں لکھا ہے۔

''اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع

نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ۔ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ پاؤ گے انہیں کھول کر میرے پاس لے آؤ۔ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ خداوند کو ان کی ضرورت ہے۔'' (انجیل متی باب ۲۱ آیت ۱ تا ۳)

جبار کے ساتھ دوسرا لفظ شقی استعمال کیا گیا ہے شقی عربی زبان کا لفظ ہے جو سعادت کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کے معانی اپنی ذات میں بیان ہو سکتے ہیں لیکن بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کے معنے صرف نسبت سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ عربی زبان میں شقی اور سعید بھی ایسے ہی الفاظ ہیں جن کے معانی نسبت سے سمجھے جاتے ہیں ورنہ یوں لغت میں دیکھو کہ سعید کے کیا معنے ہیں تو وہاں لکھا ہوگا اَلسَّعِیْدُ مَنْ لَّمْ یَکُنْ شَقِیًّا۔ سعید وہ ہے جو شقی نہ ہو اور شقی کے معنے دیکھیں تو لکھا ہوگا الشَّقِیُّ مَنْ لَمْ یَکُنْ سَعِیْدًا۔ شقی وہ ہے جو سعید نہ ہو۔ پس یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں اور لغت دیکھنے والا حیران ہوتا ہے کہ میں ان کے معنے کہاں سے نکالوں۔ مگر جب وہ لغت کی وضع کی طرف جاتا ہے تو اس پر اس لفظ کے معنے کھل جاتے ہیں۔ درحقیقت سعید کے معنے ہوتے ہیں وہ شخص جو کسی دوسرے کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کر لے۔ اور یہ لفظ خدا تعالیٰ کے لئے نہیں بولا جاتا۔ کیونکہ سعید کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے کوئی دوسری طاقت کامیاب کروائے اور شقی وہ ہوتا ہے جس کی مدد سے کوئی دوسری طاقت انکار کر دے۔ پس شقی کے معنے ہوں گے جو شخص جائز مددگار اور جائز نصرت کرنے والے کی مدد سے محروم ہو اور اس کی تائید حاصل نہ کر سکے۔ اس کے لئے دیکھو یوحنا باب ۱۶ آیت ۳۳ جہاں حضرت مسیح فرماتے ہیں۔

''میں نے تمہیں یہ باتیں کہیں تا کہ تم مجھ میں اطمینان پاؤ۔ تم دنیا میں مصیبت اٹھاؤ گے لیکن خاطر جمع رکھو کہ میں نے دنیا کو جیتا ہے۔''

یعنی تم پر مصیبتیں آئیں گی اور لوگ تمہیں کچلنا چاہیں گے لیکن تم یقین رکھو کہ آخر مجھے فتح حاصل ہوگی۔ ہر نبی جو دنیا میں آیا اس نے لوگوں کے سامنے یہی دعویٰ کیا ہے کہ مجھے فتح حاصل ہوگی اور میرے مقابل میں کھڑے ہونے والے لوگ ناکام ہوں گے۔ مگر تعجب ہے آج ہم پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تم نے یہ کیوں کہا کہ ہم فتح پائیں گے۔ حالانکہ اگر کوئی جھوٹے طور پر دعوے کرے تو وہ بھی یہی کہا کرتا ہے کہ میں فتح پاؤں گا اور جس کو خدا تعالیٰ کہے کہ میں تجھے کامیاب کروں گا وہ اگر یہ نہ کہے کہ میں کامیاب ہوں گا تو اور کیا کہے۔ مسیح بھی یہی کہتا ہے کہ ''میں نے دنیا کو جیتا ہے۔'' اس کے یہی معنے ہیں کہ لَمْ یَجْعَلْنِیْ شَقِیًّا۔ میں شقی نہیں ہوں میں دنیا کو جیتنے

والا ہوں۔

اسی طرح لوقا باب ۱۰ آیت ۹ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں سے کہا کہ جب تم تبلیغ کے لئے کسی شہر میں جاؤ تو ''وہاں کے بیماروں کو چنگا کرو اور ان سے کہو کہ خدا کی بادشاہت تمہارے نزدیک آئی۔''

یعنی تم تسلی رکھو کہ تم جلدی فتح پالو گے اور کامیابی تمہیں حاصل ہو جائے گی۔

غرض وہ ساری باتیں جو قرآن کریم نے بیان کی ہیں انجیل میں بھی موجود ہیں۔ پس عیسائیوں کا یہ کہنا کہ اپنی طرف سے باتیں بنا کر مسیحؑ کے منہ میں ڈال دی گئی ہیں یا تو ان کے جھوٹ پر اور یا پھر ان کی اپنی کتب سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔

وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿۳۴﴾

اور جس دن میں پیدا ہوا تھا اس دن بھی مجھ پر سلامتی نازل ہوئی تھی اور جب میں مروں گا اور جب مجھے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا (اس وقت بھی مجھ پر سلامتی نازل کی جائے گی)

تفسیر ۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے یہی کہا ہے کہ وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا (مریم:۱۶) لیکن وہاں خود اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ کے متعلق کہا ہے کہ جس دن وہ پیدا ہوگا اس دن بھی اس پر سلامتی ہوگی۔ جس دن مرے گا اس دن بھی اس پر سلامتی ہوگی اور جس دن وہ دوبارہ زندہ کیا جائے گا اس دن بھی اس پر سلامتی ہوگی۔ اور یہاں حضرت مسیح نے اپنی زبان سے کہا ہے کہ وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا اس آیت سے دو نہایت غلط استدلال کئے جاتے ہیں۔ وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ سے تو یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ کہ حضرت مسیح کو شیطان نے نہیں چھوا اور وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کو صلیب پر نہیں لٹکایا گیا (فتح البیان زیر آیت و السلام علی)۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اگر اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت مسیحؑ کو شیطان نے نہیں چھوا تو یہی الفاظ حضرت یحییٰ کے متعلق بھی استعمال ہوئے ہیں ان کے متعلق یہ کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا کہ وہ مس شیطان سے پاک تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ ان کی عصمت پر دلالت نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیدائش سے ہی

اللہ تعالیٰ نے انہیں بابرکت بنایا ہے اور اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ موسیٰؑ اور داؤدؑ اور سلیمانؑ اور دوسرے ہزاروں ہزار انبیاء سب اپنی پیدائش کے وقت سے ہی بابرکت تھے۔ اور یَوۡمَ اَمُوۡتُ سے جو یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسیح صلیب پر نہیں لٹکا یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ صلیب پر لٹکنا سلامتی کے خلاف نہیں بلکہ صلیب پر لٹک کر مر جانا سلامتی کے خلاف ہے۔ بائبل میں لکھا ہے کہ

''جسے پھانسی ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ملعون ہے''۔ (استثناء ب ۲۱ آیت ۲۳)

پس یَوۡمَ اَمُوۡتُ کے یہ معنے ہیں کہ میری موت ایسی نہیں ہوگی جس کو لعنتی کہا جاسکے بلکہ میری موت خدا تعالیٰ کی رضاء میں ہوگی اور میرا رفع خدا تعالیٰ کی طرف ہوگا۔ پس یَوۡمَ اَمُوۡتُ میں صلیب کی موت کی تو نفی پائی جاتی ہے مگر اس سے صلیب پر لٹکائے جانے کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ حضرت یحییٰؑ شہید نہیں ہوئے۔ کیونکہ دشمن کے ہاتھوں سے خدا تعالیٰ کی راہ میں شہید ہونا سلامتی کے خلاف نہیں ہوتا۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کا پہلے یہی عقیدہ تھا کہ حضرت یحییٰؑ شہید نہیں ہوئے مگر جب آپ کے سامنے کثرت کے ساتھ حوالجات پیش کئے گئے جن سے حضرت یحییٰ کی شہادت ثابت ہوتی تھی تو آپ نے اپنے اس عقیدہ سے رجوع فرمالیا آپ بھی شروع میں حضرت یحییٰ کی شہادت کے خلاف یہی دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے وَالسَّلٰمُ عَلَیۡہِ یَوۡمَ وُلِدَ وَیَوۡمَ یَمُوۡتُ وَیَوۡمَ یُبۡعَثُ حَیًّا۔ حالانکہ موت سلامتی کے خلاف نہیں ہوتی خواہ وہ طبعی موت ہو یا تلوار کے ذریعہ ہو۔ اگر موت سلامتی کے خلاف ہوتی تب تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا لیکن جب موت سلامتی کے خلاف ہی نہیں تو چاہے کسی کو بخار نے مار دیا ہو یا تلوار نے مار دیا ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن صلیب پر لٹک کر مرنا یقیناً سلامتی کے خلاف ہے۔ اور حضرت یحییٰ کی موت صلیب پر نہیں ہوئی اس لئے ان الفاظ سے ان کے قتل ہونے کا رد نہیں ہوتا۔ لیکن یَوۡمَ اَمُوۡتُ سے حضرت مسیح کے صلیب پر لٹک کر مارے جانے کی ضرور نفی ہوتی ہے۔ کیونکہ بائبل کے بیان کے مطابق وہ لعنتی موت تھی۔ اس آیت سے بظاہر تو مسیح کی بڑی عظمت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسیح انسان تھا خدا نہیں تھا۔ کیونکہ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَیَوۡمَ اَمُوۡتُ دلالت کرتا ہے کہ سلامتی کہیں اور سے آئی ہے اور کسی پر نازل ہوئی ہے۔ سلامتی دینے والا کوئی اَور وجود ہے اور جس پر سلامتی نازل ہوئی ہے وہ اَور وجود ہے۔

خدا تعالیٰ کا ایک نام جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے اَلسَّلَامُ بھی ہے۔ اب اگر ہم اس نام کی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنے بچوں کا نام رکھیں گے تو عبدالسلام نام رکھیں گے یا کسی پر سلامتی پہنچانا چاہیں گے تو سَلَامٌ عَلَیۡہِ یا

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ کہیں گے۔ لیکن اس کے کبھی یہ معنے نہیں ہوں گے کہ تم قتل نہیں کئے جاؤ گے یا صلیب پر نہیں لٹکائے جاؤ گے۔ اسی طرح ہم نمازوں میں بھی کہا کرتے ہیں کہ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ۔ لیکن ہم یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ اَلسَّلَامُ عَلَی اللّٰہِ سوائے اس کے کہ کبھی استعارہ کے طور پر کوئی شخص اس لفظ کا استعمال کر لے۔ مثلاً کوئی شخص خدا تعالیٰ کا تصور اپنے ذہن میں لائے اور اس کی محبت میں محو ہو کر ایک ربودگی کی کیفیت میں اسے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ کہہ دے۔ اگر وہ ایسا کہے تو وہ محض ایک استعارہ ہوگا۔ اسے حقیقت پر محمول نہیں کیا جائے گا۔ بہر حال جب ہم کسی کے متعلق سلامتی کا لفظ استعمال کریں گے تو یہی مراد لیں گے کہ وہ شخص انسان ہے اور سلامتی کا محتاج ہے۔ اور ہمارے ذہن میں اس وقت یہ مضمون بھی ہوگا کہ سلامتی دینے والا صرف خدا ہے۔ وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ يَوْمَ اَمُوْتُ میں حضرت مسیح اپنی پیدائش اور موت دونوں وقتوں کے متعلق کہتے ہیں کہ مجھ پر سلامتی نازل کی گئی ہے ایک ایسی ہستی کی طرف سے جو سلام ہے وَ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا۔ اسی طرح جب میں زندہ کیا جاؤں گا تو اس دن بھی مجھ پر سلامتی نازل ہوگی اُبْعَثُ حَيًّا کے الفاظ بھی بتاتے ہیں کہ سلامتی بخشنے والا کوئی اور وجود ہے اور سلامتی حاصل کرنے والا کوئی اور ہے۔

بظاہر تو اس آیت میں حضرت مسیح کی بڑی شان نظر آتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ حضرت مسیح کا مقام کتنا بلند تھا کہ ان کی پیدائش پر بھی اور موت پر بھی اور دوبارہ حیات پر بھی سلامتی نازل کی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت اصل مفہوم اس آیت کا یہی ہے کہ مسیح انسان تھا، خدا نہیں تھا اور جبکہ یہ الفاظ مسیح کی انسانیت پر دلالت کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ وہ انسان تھا خدا نہیں تھا تو طبعی طور پر عیسائیوں کے دلوں میں اعتراض پیدا ہوگا کہ ہمارے خدا کو انسان ثابت کرنے کے لئے جھوٹے کلمے اس کے منہ میں ڈال دئے گئے ہیں۔ پس چونکہ اس آیت سے بھی عیسائیوں کے لئے اعتراض کا موقع پیدا ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم انجیل کو دیکھیں اور غور کریں کہ وہ اس بارہ میں کیا کہتی ہے۔

يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے دو معنے ہوں گے۔ ایک ہمارے نقطہ نگاہ سے اور ایک عیسائیوں کے نقطہ نگاہ سے کیونکہ ہمارے اور ان کے نقطہ نگاہ میں بڑا بھاری فرق ہے۔ ہمارے نزدیک مسیح صلیب پر مرا نہیں بلکہ وہ صلیب پر لٹک کر کَالْمَيِّت ہوا۔ پس ہمارے نزدیک يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا سے مراد وہ وقت ہوگا جب مسیحؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا اور اس پر ایک رنگ میں موت طاری ہوئی لیکن پھر وہ اس موت سے بچا لیا گیا۔ لیکن عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح صلیب پر سچ مچ مر گیا تھا اور تین دن کے بعد خدا نے اسے پھر زندہ کر دیا۔ پس عیسائی نقطہ نگاہ

سے یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا سے مراد وہ وقت ہوگا جب وہ صلیبی موت کے بعد دوبارہ زندہ ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک وہ بھی بعث ہے جب انسان اپنی حقیقی موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا لیکن اس سلامتی کا ہم دوسرے کو کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے اور اُبْعَثُ حَیًّا کے جو معنے میں نے کئے ہیں اس کا ثبوت ہم ہر عیسائی کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ انجیل سے ظاہر ہے کہ خدا نے اسے موت کی شکل سے نجات دی اور صلیب سے بچا لیا۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں پر ان کے نقطہ نگاہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس طرح حجت تمام کر سکتے ہیں کہ تم خود مانتے ہو کہ مسیح مر گیا تھا اور پھر وہ زندہ ہو گیا۔ گویا اسے سلامتی حاصل ہوئی۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ اگلے جہان میں مسیح پر سلامتی نازل ہوگی تو اس سلامتی کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی حالانکہ وہ چیزیں جن کو دشمن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ان کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے پاس دلائل ہوں ورنہ دشمن ان کو مان نہیں سکتا۔

بے شک بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی مگر وہ صرف ایسی ہی ہوتی ہیں جن کا عقائد کا ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر ہم یہ ثابت کر دیں کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے تو ایک غیر مومن کے لئے ہمارا اتنا ثابت کر دینا کافی ہے۔ آگے یہ کہ کیا کیا نعماء ہیں جو اسے جنت میں دی جائیں گی اور وہ نعمتیں کس شکل اور صورت میں ہوں گی۔ اس کے لئے ہمیں کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ صرف ہمارے ایمان میں شامل ہے۔ اس کا تعلق ان اعتقادات کے ساتھ نہیں جن کو دوسروں سے منوانے کے لئے دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہمارے پاس آئے اور کہے کہ ثابت کرو کہ جنت میں انسان جو کچھ خواہش کرے گا وہ پوری ہو جائے گی۔ تو ہم اسے کہیں گے کہ تمہارا یہ مطالبہ فضول ہے تمہارے ساتھ جو تعلق رکھنے والی چیز ہے وہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان زندہ ہو جاتا ہے۔ باقی یہ کہ زندہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ یہ ان باتوں میں سے نہیں جن کو ثابت کرنا ہمارے لئے ضروری ہو۔ بعض لوگوں نے ایسی باتوں کو ذوقیات قرار دیا ہے اور بعض نے انہیں ایمانیات کا حصہ قرار دیا ہے کہ مومن اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر خوش ہوتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگلے جہان میں ان کے لئے بڑی بڑی نعمتیں تیار کی ہوئی ہیں۔ بہرحال ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہم دلیل دے کر اپنے دشمن سے بھی ان باتوں کو منوانے کی کوشش کریں لیکن اس جگہ ایک دعویٰ کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مسیحؑ کی ولادت پر بھی اس کے لئے سلامتی نازل ہوئی اور بعد میں بھی وہ ہمیشہ سلامتی کا مورد رہا۔ پس ضروری ہے کہ ہمارے پاس اس سلامتی کے دلائل

موجود ہوں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس سلامتی کا انجیل میں کہیں ذکر آتا ہے۔ اس کے لئے جب ہم انجیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی جب پیدائش ہوئی تو وہ گڈریے جو شہر سے باہر اپنے جانور چرایا کرتے تھے اور جن کے قریب ہی جنگل میں حضرت مسیحؑ پیدا ہوئے تھے انہوں نے کشفی حالت میں دیکھا کہ فرشتے کہہ رہے ہیں کہ

''خدا کو آسمان پر تعریف اور زمین پر سلامتی اور آدمیوں سے رضامندی ہووے''

(انجیل لوقا باب ۲ آیت ۱۴)

اس فقرہ میں تین باتیں کہی گئی ہیں اول خدا تعالیٰ کی آسمان پر تعریف ہو۔ دوم خدا تعالیٰ کی زمین پر سلامتی ہو۔ سوم خدا تعالیٰ کی آدمیوں سے رضامندی ہو۔

اس فقرہ کا پہلا حصہ تو ہے ہی خدا تعالیٰ کے متعلق کہ آسمان پر اس کی تعریف ہو۔ اس لئے اس حصہ کے متعلق تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دوسرا حصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی زمین پر سلامتی ہو یہ فقرہ خدا تعالیٰ کے متعلق کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خدا تعالیٰ خود سلامتی والا ہے اور اس کے لئے ہر جگہ سلامتی ہے اس کے سلامت نہ رہنے کے متعلق کوئی خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ دعا مانگی جائے کہ اسے زمین پر سلامتی ہو۔ زمین پر سلامتی کے محتاج انسان ہوا کرتے ہیں اور انہی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی عطا کی جاتی ہے۔ تیسرا حصہ یہ ہے کہ اسے آدمیوں سے رضامندی ہو۔ یہ فقرہ تمام بنی نوع انسان سے تعلق رکھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلیں اور انہیں اس کی رضا حاصل ہو۔ بہرحال پہلے حصہ میں خدا تعالیٰ کا ذکر آ گیا کہ اس کے لئے آسمان پر تعریف ہو۔ تیسرے حصہ میں تمام بنی نوع انسان کا ذکر آ گیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہو۔ اب رہ گیا دوسرا حصہ جو زمین پر سلامتی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے سو ظاہر ہے کہ جب یہ کشف مسیح کی پیدائش پر دکھایا گیا تو لازماً ''زمین پر سلامتی'' کے الفاظ بھی حضرت مسیحؑ کے ساتھ ہی تعلق رکھتے ہیں ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کو آسمان پر تو سلامتی حاصل ہے لیکن زمین پر سلامتی حاصل نہیں حالانکہ خدا تعالیٰ کی سلامتی کو نہ پہلے کبھی کوئی خطرہ پیدا ہوا ہے اور نہ آئندہ پیدا ہو سکتا ہے۔ پس ''زمین پر سلامتی'' کے الفاظ کا یہی مفہوم ہے کہ مسیح کی پیدائش سلامتی کا موجب ہے گویا انجیل نے بھی بتا دیا کہ مسیح کی پیدائش کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے سلامتی نازل کی گئی تھی۔

پھر یوحنا ۱۶ آیت ۳۲ میں حضرت مسیحؑ کہتے ہیں

’’تو بھی میں اکیلا نہیں کیونکہ باپ میرے ساتھ ہے‘‘

آپ فرماتے ہیں اگر تم مجھ کو چھوڑنا چاہو تو بے شکل چھوڑ دو۔ تمہارے متعلق مجھے زیادہ سے زیادہ یہی خطرہ ہو سکتا ہے کہ اگر فتنے پیدا ہوئے اور مصائب کا دور آیا تو تم مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ گے لیکن اگر تم ایسا کرو تب بھی مجھے کوئی پروا نہیں کیونکہ میں اکیلا نہیں خدا میرے ساتھ ہے۔ تمہارے ساتھ ہونے سے مجھے کوئی تقویت نہیں پہنچتی اور تمہارے علیحدہ ہونے سے مجھے کوئی ضعف نہیں پہنچتا۔ گویا انجیل میں ان کی ولادت پر بھی سلامتی کا ذکر آتا ہے اور پھر زندگی میں بھی ہمیشہ ان کے سلامت رہنے کا ذکر موجود ہے۔

پھر واقعہ صلیب کے وقت بھی جو یہودیوں اور مسیحیوں کے نزدیک ان کی حقیقی موت کا وقت تھا اور ہمارے نزدیک اس وقت موت کی صرف ایک شکل ظاہر ہوئی ان پر سلامتی نازل ہوئی اور خدا نے انہیں نہیں چھوڑا۔ چنانچہ اعمال میں لکھا ہے

’’خدا نے یسوع ناصری کو روح القدس اور قدرت سے ممسوح کیا۔ وہ نیکی کرتا اور ان سب کو جو شیطان کے ہاتھ سے ظلم اٹھاتے تھے چنگا کرتا پھرا کیونکہ خدا اس کے ساتھ تھا۔‘‘

(اعمال باب ۱۰ آیت ۳۸)

پھر وہ وقت جب انسان پر حقیقی موت آتی ہے اس میں بھی مسیح پر سلامتی نازل ہونے کا ذکر ہے چنانچہ اعمال میں لکھا ہے

’’میں آسمان کو کھلا اور ابن آدم کو خدا کے داہنے ہاتھ کھڑے دیکھتا ہوں۔‘‘

(اعمال باب ۷ آیت ۵۶)

اسی طرح لوقا باب ۲۲ آیت ۶۹ میں حضرت مسیحؑ فرماتے ہیں

’’اب سے ابن آدم خدا کی قدرت کے داہنے ہاتھ بیٹھا رہے گا۔‘‘

یعنی واقعہ صلیب کو دیکھ کر دشمن یہ خیال کرے گا کہ اس نے مجھے تباہ کر دیا ہے مگر میں خدا کے داہنے ہاتھ جا بیٹھوں گا اور اس کا فضل میرے شامل حال ہوگا۔

یہ وہ سلامتی کے دعوے ہیں جو انجیل میں موجود ہیں اور بتاتے ہیں کہ مسیح انسان تھا خدا نہیں تھا۔ کیونکہ ان کی سلامتی کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ خدا ان کے ساتھ ہے پس معلوم ہوا کہ انہیں سلامتی خدا کی طرف سے آتی تھی۔ اگر وہ خود خدا ہوتے تو انہیں کہنا چاہیے تھا کہ میں تو خدا ہوں اور خدا مر ہی نہیں سکتا۔ مگر انہوں نے یہ نہیں کہا۔ اسی طرح

انہوں نے یہ بھی نہیں کہا کہ میں بالقوّہ سلامتی رکھتا ہوں بلکہ کہا کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ وہ انسان تھے خدا نہیں تھے۔

اس جگہ ایک اور امر بھی یاد رکھنے والا ہے اور وہ یہ کہ حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ذکر کو اللہ تعالیٰ نے ساتھ تو اس لئے ملایا تھا کہ یہ بتاتا کہ حضرت یحییٰ ؑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ارہاص کے طور پر آئے تھے مگر آگے ان دونوں کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ بھی آپس میں اتنی ملتی ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں وجود ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے تھے مثلاً

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم نے یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ ؕ وَ اٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا گویا وہاں بھی نبوت اور جوان عمر میں نبوۃ اور کتاب ملنے کا ذکر ہے اور یہاں بھی نبوت اور کتاب ملنے کا ذکر ہے۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آتا ہے وَ جَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا اور حضرت یحییٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَکٰوۃً ؕ وَ کَانَ تَقِیًّا۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ بَرًّۢا بِوَالِدَیْہِ وَ لَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں وَ السَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا اور حضرت یحیٰی علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ سَلٰمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا۔

یہ تمام الفاظ آپس میں بہت ہی مشابہ ہیں اور معانی کے لحاظ سے بھی ان میں اشتراک پایا جاتا ہے مثلاً حضرت مسیح کے متعلق کہا گیا ہے وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ اور اَوْصَاہُ بِکَذَا اور وَصَّاہُ بِکَذَا کے معنے ہوتے ہیں عَھِدَ اِلَیْہِ یعنی اس کے متعلق اس کو پختہ وصیت کی۔ ایسی وصیت جو عہد کی حد تک جا پہنچتی ہے اور ادھر حضرت یحییٰ ؑ کے متعلق کیا گیا ہے کہ خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ۔ یہ الفاظ بھی زور اور شدت پر دلالت کرتے ہیں۔

پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے کہ لَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا گیا کہ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا۔ یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق تو یہ کہا گیا ہے کہ وہ جبار نہ تھے اور نہ گنہگار۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ ان کو خدا نے جبار نہیں بنایا اور ناکام نہیں بنایا۔ گویا اس جگہ حضرت یحییٰ کی ذاتی خوبیوں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ گنہگار نہ ہونا یہ ذاتی خوبی پر دلالت کرتا ہے اور لَمْ یَجْعَلْنِیْ

جَبَّارًا شَقِيًّا میں شقی نہ ہونے پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور شقی نہ ہونا ایک قومی خوبی ہے کسی روحانی لیڈر اور نبی کی کامیابی کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کی جماعت دنیا پر غالب آ جائے اور پھیل جائے پس مسیح کی قومی خوبی بیان کی گئی ہے اور یحییٰ کی ذاتی خوبی بیان کی گئی ہے۔ اس میں درحقیقت حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ ان کی قوم بحیثیت قوم دنیا میں باقی نہیں رہے گی اور حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بتایا تھا کہ ان پر ایمان لانے والے لوگ بحیثیت جماعت دنیا میں قائم رہیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام درمیانی نبیوں میں سے ایک نبی ہے جن کی حیثیت ایک مجدد کی سی تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام سلسلہ موسویہ کی آخری کڑی تھے اور خدائی سنت یہ ہے کہ سلسلہ کی ابتدائی اور آخری کڑی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے اور ان کے نام اور کام اور سلسلہ کو باقی رکھا جاتا ہے لیکن درمیان میں آنے والے لوگوں کے کام بانی سلسلہ کے کام میں مدغم ہو جاتے ہیں اور ان کی کوئی علیحدہ حیثیت باقی نہیں رہتی۔ حضرت داؤد علیہ السلام ایک بڑے نبی تھے لیکن ان کا کام موسیٰ کے کام میں مدغم ہو گیا۔ حضرت یسعیاہؑ ایک بڑے نبی تھے۔ یرمیاہؑ ایک بڑے نبی تھے۔ حزقیلؑ ایک بڑے نبی تھے عزراؑ ایک بڑے نبی تھے لیکن ان سب کے کام موسیٰؑ کے کام میں مدغم ہو گئے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کام کو ایک علیحدہ حیثیت دی گئی۔ کیونکہ وہ سلسلہ موسویہ کی آخری کڑی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محی الدین صاحب ابن عربی لکھتے ہیں کہ آنے والا مسیحؑ قیامت کے دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے ایک اور چھوٹا سا جھنڈا لے کر کھڑا ہو گا (فتوحات مکیۃ السفر الثالث الباب الرابع والعشرون فی معرفۃ جاءت من العلوم الکونیۃ)۔ یعنی اس کا نام علیحدہ طور پر جماعتی لحاظ سے قائم رکھا جائے گا جبکہ باقی لوگوں کے کام کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام میں مدغم کر دیا جائے گا گویا اس کی تصویر کو ایک چھوٹے پیمانہ میں الگ بھی دکھایا جائے گا یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری میں اتنی اعلیٰ شان حاصل کی ہے کہ اس کو ایک مخصوص حیثیت بھی حاصل ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کے متعلق خدا کہتا ہے کہ ان پر سلامتی ہو گی اور حضرت مسیح اپنے متعلق خود کہتے ہیں کہ مجھ پر سلامتی ہو گی۔ یہ دونوں قول ایک ایک رنگ میں ایک دوسرے پر برتری رکھتے ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے تو اس رنگ میں برتری حاصل ہے کہ خدا کہہ رہا ہے کہ ان پر سلامتی ہو گی اور خدا کا کہنا ایک بڑی بات ہے۔ لیکن حضرت مسیح علیہ السلام کے قول کو اس رنگ میں برتری حاصل ہے کہ آخر کسی کو اپنی سلامتی کا اسی طرح پتہ چل سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے اسے خبر ملے کہ تو سلامت

رہے گا۔ پس گو زبان سے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے خدا نے کہا ہے کہ مجھ پر سلامتی ہوگی۔ لیکن بہرحال یہ امر ظاہر ہے کہ انہیں خدا تعالیٰ نے ہی بتایا ہوگا تبھی انہوں نے لوگوں سے یہ بات کہی۔ مگر انہوں نے اس سلامتی کو اپنی طرف منسوب کیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ان میں کُنْ فَیَکُوْنُ والی طاقت پائی جاتی تھی کہ میرے اوپر سلامتی ہوگی اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس سلامتی سے محروم نہیں کر سکے گی۔

اس تقابل سے یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی سلامتی والی بتائی گئی ہے اور حضرت مسیح کی پیدائش بھی سلامتی والی بتائی گئی ہے۔ اب اگر اس کے صرف اتنے ہی معنے ہوں کہ یحییٰ بھی بچ جائیں گے اور مسیح بھی بچ جائے گا تو اس میں یحییٰؑ اور مسیحؑ کی کوئی خاص خصوصیت نظر نہیں آتی اس طرح تو جتنے بچے زندہ رہتے ہیں وہ سب خدا تعالیٰ کی سلامتی کے نتیجہ میں ہی زندہ رہتے ہیں۔ درحقیقت ان الفاظ سے بتانا یہ مدنظر ہے کہ ان دونوں کی پیدائش اپنے ساتھ الٰہی نشان رکھنے والی ہوگی۔ گویا سلامتی یہ نہیں کہ ان کو جسمانی لحاظ سے سلامتی حاصل ہوگی اور یہ زندہ رہیں گے۔ وہ تو جو بچہ بھی زندہ رہتا ہے خدا تعالیٰ کی سلامتی کی وجہ سے ہی زندہ رہتا ہے۔ ان دونوں کے متعلق خصوصیت سے یہ کہنا کہ ان کی پیدائش سلامتی والی ہوگی بتاتا تھا کہ ان کے ذریعہ دنیا پر سلامتی نازل ہوگی یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسے نشانات لے کر آئیں گے کہ ان کی پیدائش دنیا کو کفر سے نجات دینے والی ہوگی، ان کی پیدائش دنیا کو بے ایمانی سے نجات دینے والی ہوگی۔ جو بھی یحییٰ کی معجزانہ پیدائش اور اس کے کارناموں کو دیکھے گا اور جو بھی عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش اور اس کے حیرت انگیز کاموں کا مشاہدہ کرے گا اور اس تغیر کو دیکھے گا جو انہوں نے دنیا میں پیدا کیا اور ان نشانات کو دیکھے گا جو ان کے ذریعہ ظاہر ہوئے اس کا ایمان تازہ ہوگا۔ اس کا کفر دور ہوگا۔ اس کی بے ایمانی اس سے جاتی رہے گی شکوک وشبہات اور وساوس کی تاریکیاں دور ہو جائیں گی خدا کا نور اس کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوگا اور وہ سمجھے گا کہ ہمارا خدا بڑا قادر خدا ہے۔ پس ایک تو یحییٰؑ اور مسیحؑ کی پیدائش کو خدا تعالیٰ نے سلامتی والا قرار دیا۔

پھر فرمایا کہ یحییٰ کی موت بھی سلامتی والی ہوگی اور مسیحؑ کی موت بھی سلامتی والی ہوگی۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کی موت انسانی دخل سے پاک ہوگی جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چونکہ اس جگہ سلامتی کا لفظ آتا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام قتل نہیں ہوئے۔ حالانکہ کوئی شخص شہادت حاصل کرے یا طبعی طور پر وفات پائے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب اس نے مرنا ہی ہے تو پھر وہ کسی طرح مر جائے بات ایک ہی ہوگی۔ یا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ موت سے محفوظ رہیں گے اور اگر انہوں نے موت سے ہی محفوظ رہنا تھا تو پھر اَمُوْتُ کا لفظ نہیں آنا

چاہیے تھا یہ کہنا چاہیے تھا کہ وہ ساری عمر موت سے محفوظ رہیں گے لیکن جب خدا تعالیٰ نے یہ کہا کہ اس کی موت کے وقت بھی سلامتی ہوگی تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ خدا تعالیٰ فنا ہونے کی نفی نہیں کر رہا اور جب اس نے فنا ہونے کی نفی نہیں کی تو پھر موت خواہ کسی آدمی کے ہاتھ سے ہو یا فرشتہ کے ہاتھ سے، بات ایک ہی ہے۔ پاس اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوسکتا۔ بہرحال کوئی ایسا مطلب ہونا چاہیے کہ موت کے باوجود یحییٰ ؑ اور مسیح ؑ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہو اور وہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ جس مقصد کو لے کر وہ دنیا میں کھڑے ہوئے تھے اور جس مدعا کے حصول کے لئے ان کی دنیا میں بعثت ہوئی تھی اس مقصد اور مدعا کے راستہ میں ان کی موت حائل نہیں ہوگی۔ وہ مر جائیں گے مگر ان کا نام زندہ رہے گا۔ وہ مر جائیں گے مگر ان کا کام زندہ رہے گا اور اس طرح ان کی موت بھی سلامتی والی موت ہوگی اور اس میں کیا شبہ ہے کہ اگر موت کے باوجود کسی شخص کا پیغام رکا نہیں۔ اگر موت نے اس کے کام کو نقصان نہیں پہنچایا بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور کے ساتھ جاری ہوگیا ہے تو یقیناً اس کی موت سلامتی والی ہے اور اگر موت کے ساتھ ہی اس کا کام بھی فنا ہوگیا ہے اور اس کا نام بھی مٹ گیا ہے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ اس کی موت ہلاکت اور بربادی والی موت ہے۔ لیکن اگر موت کے بعد بھی کسی کا کام جاری رہے تو ہم اس کو مردہ نہیں کہہ سکتے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ مامون نے اپنے دو بیٹوں کو فراء کے پاس جو ایک مشہور نحوی گزرے ہیں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بٹھایا۔ ایک دن فراء کسی کام کے لئے اٹھا تو دونوں شہزادے دوڑ پڑے تا کہ استاد کے سامنے اس کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھیں مگر چونکہ دونوں اکٹھے پہنچے تھے اس لئے ان کا آپس میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ ایک کہتا تھا میں ان کے آگے جوتیاں رکھوں گا اور دوسرا کہتا تھا میں رکھوں گا۔ آخر دونوں نے ایک ایک جوتی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ جب مامون کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو اس نے فراء سے کہا کہ مَاهَلَكَ مَنْ خَلَفَ مِثْلُكَ۔ جس شخص کے ایسے شاگرد باقی رہ جائیں جو اس کا اتنا ادب اور احترام کرنے والے ہوں وہ کبھی مر نہیں سکتا (تاریخ بغدادی للبغدادی جلد ۱۴ صفحہ ۱۵۰)۔ اسی طرح جس شخص کی جماعت دنیا میں قائم رہے۔ جس کے نام لیوا دنیا میں موجود ہوں جو اس کے نام اور کام کو زندہ رکھنے والے ہوں اس کی موت سلامتی والی موت کہلائے گی۔ کیونکہ موت تو آئی مگر موت نے اس کے کاموں میں تعطل پیدا نہیں کیا۔ پس جب ہم یہ کہیں گے کہ فلاں کی موت سلامتی والی ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوں گے کہ وہ کسی انسان کے ہاتھ سے مر نہیں سکتا۔ کیونکہ جب انسان مر گیا تو چاہے کسی طرح مرا اس سے کوئی فرق نہیں پڑسکتا۔ سلامتی والی موت وہ کہلاتی ہے۔ جس موت کے بعد بھی انسان کا نام زندہ رہے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے چنانچہ دیکھو حضرت یحییٰ علیہ السلام مر گئے۔ ان کی جماعت کا وجود تک باقی نہیں رہا

مگر آج سارے مسلمان کہتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام۔ وہ قرآن میں جب بھی یہ پڑھتے ہیں وَ سَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوْتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا تو حضرت یحییٰؑ کا ذکر تازہ ہو جاتا ہے۔ ان کی زندگی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور محبت اور احترام کے جذبات ان کے متعلق پیدا ہو جاتے ہیں۔ پس باوجود موت کے وہ زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے یہی حال حضرت مسیحؑ کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسیحؑ کے ماننے والے دنیا میں موجود ہیں لیکن حقیقتاً وہ اب ان کے ذریعہ زندہ نہیں۔ کیونکہ وہ مسیح کو نہیں بلکہ خدا کے بیٹے کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اصل میں مسیح اگر زندہ ہے تو اسلام کے ذریعہ سے۔ مسیحؑ زندہ ہے قرآن کے ذریعہ سے۔ مسیحؑ زندہ ہے ہماری جماعت کے ذریعہ سے۔ کیونکہ اسلام اور قرآن ہی ہیں جو حقیقی مسیح کو دنیا میں پیش کر رہے ہیں۔ پس اس سلامتی سے مراد یہ ہے کہ یحییٰؑ اور مسیحؑ کا نام دنیا میں زندہ رہے گا۔ ان کی سچی تعلیم دنیا میں قائم رہے گی۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں گے اور پھر قرآن اور اسلام کے ذریعہ ایک دائمی حیات کے وارث ہوں گے۔

آگے حضرت یحییٰؑ کے متعلق آتا ہے کہ ان پر اس دن بھی سلامتی ہوگی يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا اور حضرت مسیحؑ بھی کہتے ہیں کہ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ......... يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سلامتی کا ثبوت کیا ہے اور کون جا کر دیکھے گا کہ اس دن ان پر سلامتی نازل ہوتی ہے یا نہیں۔ اس طرح تو ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ جب میں مرنے کے بعد اٹھوں گا تو مجھے یہ یہ مدارج ملیں گے اور ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم تحقیق کر کے فیصلہ کر سکیں کہ کہنے والے کی بات صحیح ہے یا غلط۔

اس سوال کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ کہنے والے کی ہر بات کو اس کی سابق اور گزشتہ باتوں پر قیاس کیا جاتا ہے اور پھر ایک نتیجہ نکال لیا جاتا ہے یہ قانون دنیا میں ہر جگہ جاری ہے اور قرآن کریم نے بھی بعث بعد الموت کے ثبوت میں اسے دلیل کے طور پر پیش کیا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے کہا ہے کہ تم ان پیشگوئیوں پر غور کرو جو تمہاری تباہی اور اسلام کی ترقی کے متعلق کی گئی ہیں اور جن کے ساتھ اگلے جہان سے تعلق رکھنے والے بعض وعدے وابستہ کر دیئے گئے ہیں۔ ان دنیوی ترقیات کے ساتھ تعلق رکھنے والی پیشگوئیوں پر غور کر کے تم سمجھ سکتے ہو کہ جب وہ باتیں پوری ہو رہی ہیں جن کے متعلق کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ پوری ہو جائیں گی۔ تو اسی پر قیاس کر کے تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ آخرت کے متعلق ہماری طرف سے جو خبریں دی گئی ہیں وہ بھی ایک دن پوری ہو کر رہیں گی۔ یہی دلیل اس مقام پر دی گئی ہے اور تیسری بات کے ذکر سے پہلے دو اور باتیں بیان کی گئی ہیں جو اس دنیا کی

زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں اور پھر ان کی شہادت پیش کرتے ہوئے تیسری بات بیان کی گئی ہے تا کہ کسی شخص کو اس تیسری بات کے تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ نہ ہو اور وہ سمجھ لے کہ جب پہلی دو باتیں سخت مخالف حالات کے باوجود پوری ہو گئی ہیں تو یہ تیسری بات کیوں پوری نہ ہوگی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص دنیا میں آ کر اپنی قربانی اور ایثار سے اور اپنی نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگی سے کام لے کر ایسا تغیر پیدا کر دیتا ہے جس کی دنیا میں کوئی شخص بھی امید نہیں کر سکتا تھا اور وہ ان باتوں کی پہلے سے خبر دے دیتا ہے تو یقیناً یہ انقلاب اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اگلے جہان کے متعلق جو اس نے خبر دی ہے وہ بھی ضرور سچی ہوگی چنانچہ دیکھ لو حضرت یحییٰؑ اور حضرت مسیح پیدا ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ہمارے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کی بزرگی اور تقدیس ظاہر ہوگی اور ہم دنیا میں نیکی کا بیج قائم کر دیں گے اور کفر اور شیطنت کو دنیا سے نابود کر دیں گے۔ لوگوں نے ان کی مخالفت کی۔ حکومتوں نے ان کو کچلنا چاہا مگر باوجود اس کے کہ مخالفین نے انہیں مارا پیٹا۔ یہاں تک کہ ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا اور باوجود اس کے کہ ان کے راستہ میں ہر قسم کی روکیں پیدا کی گئی ہیں، پھر بھی جو تعلیم وہ لائے تھے وہ دنیا میں پھیل گئی۔ وہ لوگ جو بڑی بڑی طاقتیں رکھنے والے تھے تباہ ہو گئے یہاں تک کہ حکومتیں مٹ گئیں اور یحییٰ اور مسیح کامیاب ہوئے۔ جب آدھی بات اتنے مخالف حالات میں پوری ہو گئی ہے تو ہر شخص کہے گا کہ دوسری بات بھی ضرور سچی ہوگی۔ اگر حضرت مسیح صرف اتنا کہتے کہ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا تو ایک مخالف کے لئے شبہ کی گنجائش ہو سکتی تھی اور وہ کہہ سکتا تھا کہ میں اس بات کو کس طرح مان لوں کہ جب مسیح زندہ ہوگا تو اس پر سلامتی ہوگی۔ مگر خدا نے اسے تیسری جگہ رکھا ہے اس سے پہلے یہ دو باتیں بیان کی گئی ہیں وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ گویا بتایا کہ تین سلامتیاں آئیں گی۔ ایک پیدائش پر سلامتی ہوگی، ایک موت پر سلامتی ہوگی اور ایک دوبارہ حیات پر سلامتی ہوگی۔ اب غور کر کے دیکھو لو حضرت زکریاؑ کے گھر میں پیدا ہونے والے یحییٰ کے متعلق ان کے بچپن میں کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا انسان بنے گا اور دنیا کی نجات کا باعث ہوگا۔ حضرت عیسیٰ کے متعلق کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نبی ہوگا۔ اور مخالف حالات میں ترقی کی انتہائی منازل طے کر جائے گا یقیناً کوئی انسان اس قسم کی بات نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ دوسرے کے مستقبل سے ناواقف ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش سے بھی پہلے اس قسم کی خبریں دیں اور پھر ویسا ہی ہو گیا جیسے خدا نے کہا تھا۔ یہ پیدائش سے قبل خدا تعالیٰ کا خبریں دینا اور پھر ویسا ہی وقوع میں آ جانا بتاتا ہے۔ کہ ان کی پیدائش یقیناً معجزانہ تھی اور جو کچھ خدا نے کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ پھر انہوں نے کہا کہ ہم بے شک مر جائیں گے۔ مگر ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے وہ ہمیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔ جیسے سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گورنر پنجاب کی طرف سے مجھے

۱۹ مارچ ۱۹۵۳ء کونوٹس ملا اور ڈی۔ ایس۔ پی مجھے وہ نوٹس دینے کے لئے آیا تو میں نے اس سے کہا کہ میری گردن تمہارے گورنر کے ہاتھ میں ہے لیکن تمہارے گورنر کی گردن میرے خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تمہارے گورنر نے میرے ساتھ جو کرنا تھا وہ کر لیا اب میرا خدا اپنا ہاتھ دکھائے گا۔ جب وہ اٹھنے لگا تو میں نے پھر اسے کہا کہ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے جوش کی حالت میں نہیں کہا یہ ایک حقیقت ہے جو پوری ہو کر رہے گی اور جب میری یہ بات پوری ہوگی تو اس وقت میں تمہیں یاد دلاؤں گا کہ میں نے گورنر کے متعلق جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب اس گورنر کو پنجاب سے رخصت کیا گیا تو میں نے اپنا آدمی اس کی طرف بھیجا اور کہا کہ تمہیں یاد رہے میں نے اس روز تمہیں کیا کہا تھا۔ اس نے کہا مجھے خوب یاد ہے بلکہ میں دوسرے دوستوں سے بھی اس کا ذکر کرتا رہا ہوں۔ پھر ایک شخص کے سامنے اس نے یہ بھی کہا کہ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے میری گردن پر بھی اپنا ہاتھ ڈالا ہوا ہے۔ تو مرنے کو انسان مر جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کا نام زندہ رہتا ہے، اس کا کام زندہ رہتا ہے، اس کی تعلیم زندہ رہتی ہے، تو وہ مرتا نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے۔ یہی حقیقت حضرت مسیحؑ بیان فرماتے ہیں کہ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ۔ زندگی میں ہی نہیں میری موت کے بعد بھی مجھے اللہ تعالیٰ کی سلامتی حاصل ہوگی۔ موت کے بعد انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ زندگی میں تو دوسرے لوگ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بڑا چالاک تھا، بڑا ہوشیار اور فریبی تھا، اس نے اپنی چالاکی کی وجہ سے دنیا کو فتح کر لیا۔ لیکن مرنے کے بعد چالاکی بھی ختم ہو جاتی ہے، دھوکا بازی بھی ختم ہو جاتی ہے، رسوخ اور اقتدار بھی ختم ہو جاتا ہے، خدمت خلق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر تو خدا ہی کسی کا نام زندہ رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ دیکھ لو حضرت یحییٰؑ بھی مر گئے، حضرت مسیحؑ بھی مر گئے، مگر ان کے نام دنیا میں آج تک زندہ ہیں۔ جب یہ دو باتیں پوری ہو چکی ہیں تو اب تیسری بات میں کیا شبہ رہا۔ جب دو غیر ممکن باتیں ممکن ہو گئی ہیں تو تیسری بات کے سچا ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ پس بے شک وہ زندگی نظر نہیں آتی مگر ان دو دعووں کو جو ویسے ہی ناممکن تھے خدا تعالیٰ نے اس کے ساتھ ملا دیا اور اس طرح بتا دیا کہ جب یہ باتیں پوری ہو گئی ہیں تو وہ بات بھی ضرور پوری ہو کر رہے گی۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ علاوہ اس بعث کے جو مرنے کے بعد مقدر ہے ہر نبی کی ایک دوسری بعثت اس دنیا میں بھی ہوتی ہے اور ہر نبی اپنے بعد میں آنے والے ایک اَور نبی کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ ہر سچے نبی کے بعد ایک اَور نبی مبعوث ہوتا ہے جو کہتا ہے کہ فلاں نبی سچا تھا اور اس طرح اس پہلے نبی کی سچائی دنیا میں دوبارہ قائم کی جاتی ہے اور اس کی شہادت کے ذریعہ اسے دوبارہ سلامتی ملتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام

دنیا میں آئے اور عظیم الشان کارنامے انہوں نے سرانجام دئے۔ مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ جب ایک لمبا زمانہ آپ کی بعثت پر گزر گیا تو لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ پتہ نہیں موسیٰ سچا بھی تھا یا نہیں۔ تب خدا تعالیٰ کی طرف سے مسیحؑ آیا اور اس نے اعلان کیا کہ موسیٰ سچا تھا۔ پس موسیٰؑ کو دوبارہ زندگی مسیح ناصری کے ذریعہ سے ملی۔ اور یحییٰؑ اور مسیحؑ کو دوبارہ زندگی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ملی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ (ھود: ۱۸) فرماتا ہے کیا یہ شخص جھوٹا ہو سکتا ہے جس کی زندگی میں ہی خدا تعالیٰ کے ہزاروں نشانات جمع ہیں اور پھر موسیٰ کی خبریں اس کے متعلق پہلے سے موجود ہیں اور اس کی وفات کے بعد ہم ایک اور مامور بھیجیں گے جو اس امر کی تصدیق کرے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے تھے گویا اس کا ماضی وہ ہے حال یہ ہے اور مستقبل یہ ہے کہ ہم خود آسمان سے ایسے آدمی بھیجتے رہیں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت دیں گے اور گواہی دیں گے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کا سچا رسول ہے گویا یہ دوبارہ بعثت ہوگی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اس لئے سورۂ جمعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخرین میں مبعوث ہونے کا نام بھی بعثت ہی رکھا گیا ہے چنانچہ فرماتا ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الجمعة: ۳، ۴) یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو بعثتیں مقدر ہیں آپ کی ایک بعثت اولین میں ہوئی ہے اور آپ کی دوسری بعثت آخرین میں ہوگی۔ يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا میں وہی بعثت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو سورۂ جمعہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی محاورہ میں بعثت کا لفظ اس موقعہ پر بھی استعمال ہوتا ہے جب کوئی نبی آئے اور وہ اپنے وجود کے ذریعہ کسی پہلے آنے والے نبی کو دوبارہ زندہ کر دے اور اس کی صداقت کو دنیا پر ظاہر کر دے۔

پس وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ .... يَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا کے یہ معنی ہیں کہ جب کوئی دوسرا نبی اور مامور آئے گا اور وہ میری تصدیق کرے گا تو تم اس وقت سمجھ لو گے کہ جو باتیں میں کہہ رہا ہوں وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کہہ رہا ہوں۔ وہ ایک غیر ملک میں آئے گا اور غیر قوم میں سے آئے گا لیکن وہ کہے گا کہ میں سچا ہوں۔ چنانچہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تصدیق کر دی اور وہ بات پوری ہوگئی جو انہوں نے کہی تھی کہ

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَ یَوْمَ اَمُوْتُ وَ یَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بھی تصدیق کر دی اور وہ بات پوری ہوگئی جو خدا تعالیٰ نے ان کے متعلق کہی تھی کہ وَ سَلٰمٌ عَلَیْهِ یَوْمَ وُلِدَ وَ یَوْمَ یَمُوْتُ وَ یَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا۔ ان معنوں کی رو سے اس آیت کو قیامت پر چسپاں کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اسی دنیا میں ان کی دوبارہ بعثت پر خدا تعالیٰ کی سلامتی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ

(دیکھو) یہ (حقیقی) عیسیٰ ابن مریم ہے اور یہ (اس کا) (اصل) سچا واقعہ ہے جس میں وہ (لوگ)

یَمْتَرُوْنَ ﴿۳۵﴾

اختلاف کر رہے ہیں۔

حل لغات۔ اِمْتَرَاءٌ اختلاف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس میں ایک شخص دوسرے کی بات کو رد کرتا ہے اور دوسرا شخص اپنے مدمقابل کی بات کی تردید کرتا ہے۔ اس کو تردد ہوتا ہے اس کی باتیں ماننے میں اور اس کو تردد ہوتا ہے اس کی باتوں کے ماننے میں۔

تفسیر۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق خود عیسائیوں میں اور پھر عیسائیوں اور یہودیوں میں بھی آپس میں اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے خلاف عقائد رکھتے ہیں۔ یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ حق ان کے پاس نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مسیح کی ماں بھی خدا تھی اور کوئی کہتا ہے کہ وہ خدا نہیں تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ مسیح واقعہ میں خدا کا ایک حصہ تھا اور کوئی کہتا ہے کہ ایک روح پیدا کی گئی تھی جس پر خدا تعالیٰ نے اپنا فضل نازل کر دیا۔ حتیٰ کہ صلیب کے واقعہ کے متعلق بھی یہودیوں اور عیسائیوں میں اختلاف پاجاتا ہے۔ بلکہ خود عیسائیوں کا بھی آپس اتفاق نہیں۔

شاید دنیا میں سوائے مسیحؑ کے اور کوئی شخص ایسا نہیں جس کے متعلق اس قدر اختلاف پایا جاتا ہو مسلمانوں کو دیکھا جائے تو پھر ان میں بھی مسیحؑ کے متعلق بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مسیحؑ مر چکا ہے اور مسلمان کہتے ہیں کہ مسیحؑ مرا نہیں بلکہ وہ آسمان پر زندہ ہے۔ اسی طرح واقعہ صلیب کو لیا جائے تو اس میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مسلمان کہتے ہیں کہ مسیحؑ صلیب پر نہیں لٹکا ہم کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر تو لٹکایا گیا تھا مگر مرا نہیں۔ یہودی کہتے

ہیں کہ وہ صلیب پر لٹکایا گیا اور مر گیا۔عیسائی کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر لٹکایا گیا اور مرا لیکن پھر زندہ ہو گیا۔گویا دنیا کی چار بڑی جماعتیں صرف واقعہ صلیب کے بارہ میں ہی شدید اختلاف رکھتی ہیں۔غیر احمدی کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر لٹکائے ہی نہیں گئے۔ہم کہتے ہیں وہ لٹکائے تو گئے مگر صلیب پر فوت نہیں ہوئے۔یہودی کہتے ہیں وہ صلیب پر لٹکایا گیا اور مر گیا عیسائی کہتے ہیں وہ صلیب پر لٹکایا گیا اور مر گیا لیکن پھر زندہ ہو گیا۔غرض عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں میں مسیحؑ کے متعلق بڑا بھاری اختلاف پایا جاتا ہے۔پھر آگے یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا آپس میں اختلاف ہے۔اسی طرح مسیحؑ کی پیدائش لے لو تو اس میں جھگڑا ہے۔ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کاملہ سے معجزانہ طور پر بغیر باپ کے پیدا کر دیا۔غیر مبایعین کہتے ہیں کہ وہ یوسف کے نطفہ سے تھے۔عیسائی کہتے ہیں کہ وہ خدا کا نطفہ تھا۔یہودی کہتے ہیں کہ وہ حرام کا نطفہ تھا۔غرض اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ۔

یہ بھی درحقیقت ایک چوٹ ہے جو عیسائیوں پر کی گئی ہے۔خدا تعالیٰ کے وجود سے زیادہ سچی اور یقینی کوئی چیز نہیں۔مگر مسیحؑ کے متعلق ایک بات بھی قطعی طور پر ثابت نہیں۔پس ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ کہہ کر چوٹ کی گئی ہے کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا بنائے پھرتے ہیں۔حالانکہ انہیں ان کی کسی بات کے متعلق بھی یقین حاصل نہیں۔آؤ ہم تمہیں یقینی بات بتاتے ہیں کہ وہ کون تھا۔وہ ہمارا ایک رسول تھا جو دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا۔

یہاں حضرت مسیحؑ کو عیسیٰ بن مریم کہا گیا ہے۔عیسائی مصنف اس پر پھر چڑتے ہیں کہ ہمارے مسیحؑ کو ابن مریم کیوں کہا گیا ہے وہ تو خدا کا بیٹا تھا۔اسے ابن مریم محض ہمیں چڑانے اور دکھ دینے کے لئے اور دنیا پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ خدا نہیں تھا کہا گیا ہے۔حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انجیل میں بھی حضرت مسیح کو ابن مریم کہا گیا ہے۔

مرقس باب ۶ آیت ۳ میں آتا ہے:۔

> ’’کیا یہ مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں اور یعقوب اور یوسیس اور یہوداہ اور شمعون کا بھائی نہیں اور کیا اس کی بہنیں ہمارے پاس یہاں نہیں ہیں اور انہوں نے اس سے ٹھوکر کھائی۔‘‘

یعنی لوگوں نے جب مسیحؑ کو دیکھا تو کہا کہ یہ جو بڑے بڑے دعوے کرتا پھرتا ہے کہ میرے ساتھ خدا تعالیٰ کے یوں وعدے ہیں اور اس طرح مجھے اس نے اپنے فضلوں اور انعامات کا مورد بنایا ہے کیا یہ وہی مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں جو ہماری چارپائیاں اور میزیں درست کیا کرتا تھا اور آج ایسے دعوے کر رہا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں حضرت مولوی عبدالکریم صاحبؓ نمازیں پڑھایا کرتے تھے۔ ان کا لہجہ بڑا عمدہ تھا۔ آواز بڑی بلند تھی اوران کی تقریر میں بڑا جوش پایا جاتا تھا۔ میں اگرچہ بچہ تھا مگر مجھے خوب یاد ہے جب وہ اس مضمون پر پہنچتے تو بڑے جوش سے کہا کرتے تھے کہ کیا چیز ہے جو عیسائی ہمارے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو بڑی بلند شان ہے۔ آپ کا ایک نائب اس زمانہ میں احیاءِ اسلام کے لئے آیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بڑے اچھے خاندان میں سے ہے۔ شاہی نسل میں سے ہے ہزاروں سال کی تاریخ اس کے خاندان کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں میرے کانوں میں پہلے مسیح کی ابھی تک یہ آواز گونج رہی ہے کہ کسی نے چارپائیاں ٹھیک کروانی ہوں تو کروا لے کسی نے ٹوٹی ہوئی کرسیوں کی مرمت کروانی ہو تو کروا لے۔ انجیل کے اس حوالہ میں بھی یہی مضمون بیان کیا گیا ہے۔ کہ لوگوں نے کہا کیا یہ مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کیا یہ یوسف نجار کا بیٹا نہیں۔ بلکہ کہا کہ کیا یہ مریم کا بیٹا بڑھئی نہیں۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ مسیح نے اپنے طور پر بھی بڑھئی کا کام کیا ہے۔ مسیح بے شک انجیل میں اکثر جگہ اپنے آپ کو ابن آدم کہتا ہے لیکن ابن آدم ہونے میں تو تمام بنی نوع انسان اس کے شریک ہیں۔ اس میں مسیحؑ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ لیکن قرآن کریم ایک ایسا نام دیتا ہے جس سے مسیحؑ کی آسانی کے ساتھ شناخت ہو سکتی ہے۔ اگر قرآن کریم عیسیٰ ابن آدم کہتا تب بھی مشکل پیش آتی۔ کیونکہ ہزاروں لوگوں کے نام عیسیٰ ہیں اور وہ بھی ابن آدم ہی ہیں۔ اگر خالی ابن آدم کہا جاتا تو اس لحاظ سے اور بھی دقت پیش آتی۔ کیونکہ سارے انسان ابن آدم ہیں پھر وہ پہچانا کس طرح جاتا۔

مسیحی اسے خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایسا لفظ ہے جو بائبل میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پس یہ بھی مسیح کی شناخت کا کوئی قطعی ذریعہ نہیں تھا۔ کیونکہ بائبل کے رو سے سب نیک لوگ خدا کے بیٹے ہیں اور اگر وہ خدا کے بیٹے سے ظاہری بیٹا مراد لیں تو پھر خدا تعالیٰ کا ظاہری بیٹا ہونے کے کوئی ظاہری ثبوت بھی ہونے چاہئیں جو نہیں ہیں۔

درحقیقت حضرت مسیح کی صحیح شناخت اسی نام سے ہوتی ہے۔ جو خدا نے اس کے لئے تجویز کیا ہے یعنی ’’ابن مریم‘‘۔ اگر ہم اس کو صرف عیسیٰ کہیں تو ہر ضلع میں بیسیوں لوگ ایسے نکل آئیں گے جن کا نام عیسیٰ ہوگا۔ ہماری جماعت میں بھی کئی ایسے لوگ موجود ہیں جن کا نام عیسیٰ ہے۔ گو اب یہ نام کم رکھا جاتا ہے کیونکہ عیسیٰ کی نسبت محمدؐ اور احمدؐ کی محبت لوگوں کے دلوں میں زیادہ ہے اور وہ محمدؐ اور احمدؐ کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں لیکن پھر بھی ایسے کئی لوگ ہماری جماعت میں نکل آئیں گے جن کا نام عیسیٰ ہوگا اور پرانے غیر احمدیوں میں تو سینکڑوں لوگ اس نام

کے موجود ہیں۔ پس اگر صرف عیسیٰ کہا جاتا تو یہ حضرت مسیح کی شناخت کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں تھا۔ اگر عیسیٰ ابن آدم نام رکھا جاتا تب بھی مشکل پیش آتی کیونکہ ہر عیسیٰ آدم کا بیٹا ہے اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ اگر خدا کا بیٹا کہا جاتا تو سب لوگ کہتے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ ان مشکلات کو دور کرتے ہوئے قرآن نے مسیح کو عیسیٰ بن مریم کہہ دیا جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔ سب کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے اور مسیح کی شناخت کا ایک بڑا عمدہ ذریعہ ہے۔

پس قابل اعتراض انجیلوں اور مسیحیوں کا قول ہے نہ کہ قرآن کا۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى

خدا (تعالیٰ) کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے وہ اس بات سے پاک ہے۔ وہ جب کبھی کسی بات کا فیصلہ

اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ ﴿۳۶﴾

کرتا ہے تو کہتا ہے (ایسا) ہو تا جائے تو ویسا ہی ہونے لگتا ہے (پھر اسے مدد کے لئے بیٹا بنانے کی کیا ضرورت ہے)۔

حل لغات۔ عربی زبان میں جب مَا كَانَ لَهٗ کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں تو اس سے دوسرے شخص کی قابلیت یا اس کی شان کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے چنانچہ مَا كَانَ لَهٗ اَنْ يَّفْعَلَ كَذَا کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ وہ کہاں اس قابل ہوا کہ ایسا کرے یا اس کی شان اعلیٰ کے خلاف تھا کہ وہ ایسا کرتا۔ گویا یا تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ اس کی شان اتنی اعلیٰ ہے کہ ایسا ادنیٰ کام اس کی طرف منسوب ہی نہیں ہوسکتا اور یا پھر یہ معنے ہوں گے کہ یہ کام اتنا اعلیٰ ہے کہ اس میں یہ قابلیت ہی نہیں کہ وہ اس کو سرانجام دے سکے۔

تفسیر۔ اوپر جو تشریح کی جاچکی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معنے تو یہاں چسپاں ہی نہیں ہوسکتے یعنی یہ معنے کرنے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی شان کہاں کہ اس کا بیٹا ہو۔ یہ تو قطعی طور پر غلط ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتے۔ عورتیں تو کہہ دیتی ہیں کہ ہماری قسمت ایسی کہاں کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ لیکن خدا تعالیٰ کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ایسی شان کہاں کہ اس کے ہاں بیٹا ہو۔ اس جگہ صرف دوسرے معنے ہی چسپاں ہوں گے کہ خدا تعالیٰ کی شان اس سے بہت بالا ہے کہ ایسی ذلیل اور ادنی بات اس کی طرف منسوب کی جائے اور کہا جائے کہ اس نے بیٹا بنا لیا ہے۔ یہاں يَتَّخِذُ مِنْ وَّلَدٍ کہا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ اس کا بیٹا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں میں اس بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بیٹا ہونا اور بیٹا بنا لینا یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ عیسائیوں میں

سے بعض بیٹا بنا لینے کی تھیوری کے قائل ہیں اور بعض بیٹا ہونے کی تھیوری کے قائل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر ہم یہ کہیں گے کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے تو لوگ اس بات کو مانیں گے نہیں اور کہیں گے کہ کیا کوئی ایسی عورت تھی جس سے خدا نے تعلق پیدا کیا اور اس سے خدا تعالیٰ کا بیٹا پیدا ہوا۔ اس لئے وہ بیٹا ہونے کی بجائے بیٹا بنا لینے کی تھیوری کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی شان اور اس کی عظمت نے پسند کیا کہ اپنے لئے ایک بیٹا تجویز کرے۔ سو اس نے مسیح کو اپنا بیٹا بنا لیا پس چونکہ عیسائیوں میں اس بارہ میں اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے وہ الفاظ استعمال کئے جو دونوں قسم کے لوگوں پر چسپاں ہو جاتے ہیں اور آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا اختیار کرے۔ چاہے یہ کہا جائے کہ کوئی اس کا اپنا بیٹا ہے اور چاہے یہ کہا جائے کہ کسی کو اس نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اب یہ صاف بات ہے کہ جب کسی غیر کو اپنا بیٹا بنا لینا بھی اس کی شان کے خلاف ہے تو اس کا کوئی اپنا بیٹا ہونا تو اس کی شان اور عظمت کے بالکل منافی ہوگا۔

اس جگہ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص کسی امر کا مدعی ہوتا ہے ہمیشہ اپنے دعویٰ کا ثبوت پیش کرنا اس کے ذمہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ فلاں شخص کے دو سینگ ہیں اور جواب میں وہ شخص کہے کہ نہیں تم غلط کہتے ہو تو اس پر اگر پہلا آدمی یہ کہے کہ اچھا اگر تمہارے سر پر سینگ نہیں تو اس کا ثبوت دو۔ تو ہر شخص اسے پاگل قرار دے گا اور کہے گا کہ ثبوت پیش کرنا تمہارا کام ہے کیونکہ دعوےٰ تم کر رہے ہو اس کا کام نہیں کہ وہ ثبوت پیش کرے۔

حضرت مسیحؑ کے متعلق چونکہ عیسائی اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اس لئے ان کے ابن اللہ ہونے کا ثبوت پیش کرنا عیسائیوں کے ذمے ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ یہی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ چونکہ انجیل میں حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے اس لئے ہم بھی انہیں خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کرتے ہیں۔ پس ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم انجیل پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا اس میں خدا تعالیٰ کے بیٹے کے وہی معنے پائے جاتے ہیں جو عیسائی پیش کرتے ہیں۔

لوقا باب ۲۰ آیت ۳۵۔۳۶ میں لکھا ہے

''جو لوگ اس جہان کے اور قیامت کے شریک ہونے کے لائق ٹھہرتے نہ بیاہ کرتے ہیں اور نہ بیاہے جاتے۔ پھر نہیں مرنے کے کیونکہ وے فرشتوں کی مانند ہیں اور قیامت کے بیٹے ہو کے خدا کے بیٹے ہیں۔''

حضرت مسیحؑ کہتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی زندگیاں خدا تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتے ہیں ایسے

لوگوں پر روحانی موت نہیں آتی اور وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے کہلاتے ہیں گویا مسیح تمام نیک اور پاک لوگوں کے لئے ''خدا تعالیٰ کے بیٹے'' کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

پھر یرمیاہ باب ۳۱ آیت ۹ میں خدا تعالیٰ حضرت یرمیاہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

''میں اسرائیل کا باپ ہوں اور افرائیم میرا پلوٹھا ہے۔''

اس حوالہ میں سارے بنی اسرائیل کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا گیا ہے اور افرائیم جو بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ تھا اسے اپنا پلوٹھا قرار دیا گیا ہے۔

پھر متی باب ۵ آیت ۱۶ میں لکھا ہے۔

''تمہاری روشنی آدمیوں کے سامنے چمکے تا کہ وے تمہارے نیک کاموں کو دیکھیں اور تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے ستائش کریں۔''

اس میں حضرت مسیح نے اپنے سب مخاطبین کو خدا کا بیٹا قرار دیا ہے۔

پھر متی باب ۶ آیت ۸ میں لکھا ہے

''تمہارا باپ تمہارے مانگنے کے پہلے جانتا ہے کہ تمہیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے''

پھر حضرت مسیحؑ نے اپنے متبعین کو جو دعا سکھلائی ہے اس میں بھی یہی کہا ہے کہ خدا باپ ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں جب تم دعا مانگو تو اس طرح مانگو کہ

''اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرے نام کی تقدیس ہو۔'' (انجیل متی باب ۶ آیت ۹)

پھر متی باب ۶ آیت ۱۴ میں ہے

''اگر تم آدمیوں کے گناہ بخشو گے تو تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہیں بھی بخشے گا''

پھر متی باب ۶ آیت میں ۱۸ میں ہے

''تو آدمی پر نہیں بلکہ تیرے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکارا تجھے بدلہ دے۔''

اس سے پہلے آپ یہ مضمون بیان فرماتے ہیں کہ لوگ روزہ رکھتے ہیں تو لوگوں پر اپنے روزہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ چونکہ ریاکاری سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے وہ کسی بدلہ کے مستحق نہیں لیکن اگر تم محض خدا کے لئے روزہ رکھو تو تمہارا باپ جو تمہارے دل کے حالات سے واقف ہے وہ تمہیں بدلہ دے گا۔

متی باب ۱۰ آیت ۲۸ تا ۳۰ میں آتا ہے

''جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔ کیا پیسے کی دو چڑیاں نہیں بکتیں اور ان میں سے ایک بھی تمہارے باپ کی مرضی بغیر زمین پر نہیں گر سکتی۔ بلکہ تمہارے سر کے بال بھی سب گنے ہوئے ہیں پس ڈرو نہیں۔''

پھر مرقس باب ۱۱ آیت ۲۶ میں لکھا ہے

''اگر تم معاف نہ کرو گے تو تمہارا باپ جو آسمان پر ہے تمہارے قصور بھی معاف نہ کرے گا۔''

اس جگہ سارے انسانوں کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔

پھر لوقا باب ۶ آیت ۳۶ میں لکھا ہے

''جیسا تمہارا باپ رحیم ہے تم رحیم ہو۔''

لوقا باب ۱۲ آیت ۳۰ میں لکھا ہے

''تمہارا باپ جانتا ہے کہ تم ان کے محتاج ہو۔''

لوقا باب ۱۲ آیت ۳۲ میں لکھا ہے

''تمہارے باپ کو پسند آیا کہ بادشاہت تمہیں دے۔''

پھر یوحنا باب ۸ آیت ۴۱ میں لکھا ہے کہ یہود نے کہا

''ہمارا باپ ایک ہے یعنی خدا''

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ یہودیوں میں یہ محاورہ رائج تھا۔ کہ وہ اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا بیٹا کہا کرتے تھے۔ اسی طرح بائبل خود یہودیوں کو کہتی ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے بیٹے ہو اور حضرت مسیح سب لوگوں کو خدا تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم دعا کرو تو اس طرح کیا کرو کہ

''اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے۔ تیرے نام کی تقدیس ہو۔''

اسی طرح ہم حواریوں کے خطوط کو دیکھتے ہیں تو ان میں بھی ہمیں یہی مضمون نظر آتا ہے۔ چنانچہ افسیوں باب ۴ آیت ۶ میں لکھا ہے

''ایک خدا جو سب کا باپ کہ سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور تم سب میں ہے۔''

یعنی خدا تمام انسانوں کا باپ ہے اور بندے اس کے بیٹے ہیں۔

اسی طرح خروج باب ۴ آیت ۲۲ میں لکھا ہے

''اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے''

غرض تمام بائبل کیا عہد نامۂ قدیم اور کیا عہد نامۂ جدید اس قسم کے حوالجات سے بھری پڑی ہے کہ تمام بنی نوع انسان خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ خصوصاً نیک۔ خصوصاً مسیح کے حواری یا بنی اسرائیل سے تعلق رکھنے والے خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ وہ خدا تعالیٰ کو اپنا باپ کہتے ہیں اور خدا انہیں اپنا بیٹا کہتا ہے۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ بھی یہی تلقین فرماتے ہیں کہ تم اس محاورہ کو استعمال کیا کرو اور خدا تعالیٰ کو ''اے ہمارے باپ'' کہہ کر مخاطب کیا کرو۔ پس اگر انجیل میں مسیحؑ کے متعلق بھی کسی جگہ یہ الفاظ آ گئے ہیں کہ وہ خدا کا بیٹا ہے تو ہمیں اس کے وہی معنے کرنے پڑیں گے جو بائبل کے دوسرے مقامات سے ثابت ہیں۔ اس کے خلاف ہمارے لئے کوئی اور معنے کرنے جائز نہیں ہوں گے۔ اور نہ عیسائیوں کا حق ہے کہ وہ محض ان الفاظ کی وجہ سے انہیں خدا قرار دے دیں۔

غرض خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ۔ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا قرار دے ایک ہوتا ہے کسی کو بمنزلہ ولد قرار دینا یہ چیز بالکل الگ ہے۔ اس کے معنے محض اتنے ہوتے ہیں کہ اس شخص کو خدا تعالیٰ نے اپنا پیارا قرار دیا ہے لیکن ولد کے یہ معنے ہیں کہ کسی کو خدا تعالیٰ کا حقیقی بیٹا کہا جائے۔ اور حقیقی بیٹے کا درجہ خدا تعالیٰ کسی کو نہیں دیتا۔ حقیقی بیٹا اپنے باپ کا وارث ہوتا ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا تعالیٰ کسی کو اپنا وارث بنا دے۔ کیونکہ اس نے مرنا نہیں یا اپنی صفات اس کو دے دے۔ بیٹا اپنے باپ سے ورثہ کے طور پر اس کے ہاتھ پاؤں ناک کان منہ اور دوسرے تمام اعضاء لیتا ہے لیکن کوئی بندہ خدا تعالیٰ سے ورثہ میں اس کی صفات نہیں لے سکتا۔ صفات الٰہیہ کا اپنے اندر پیدا کر لینا اور چیز ہے اور ورثہ کے طور پر کسی چیز کا حاصل کرنا اور چیز ہے صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا کرنا کسب کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جیسا کہ شاگرد اپنے استاد سے جو کچھ حاصل کرتا ہے کسب کے ذریعہ حاصل کرتا ہے یہ چیز خدا تعالیٰ کے متعلق بھی جائز ہے مگر بیٹا اپنے باپ سے کئی چیزیں ورثہ کے طور پر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ سے کوئی چیز ورثہ کے طور پر نہیں لی جاتی اس سے اگر کوئی شخص لے گا تو کسباً یا عطیۃً ہی لے گا۔ مثلاً انگریزوں کا رنگ گورا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوگا اس کا رنگ گورا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ بچہ پیدا ہونے کے کچھ عرصہ بعد وہ اپنے لڑکے کو بلائیں اور کہیں کہ آ ؤ ہم تمہیں اپنے رنگ میں سے تھوڑا سا رنگ دے دیں۔ اسی طرح حبشیوں کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا تو سیاہ رنگ کا ہی پیدا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ باپ اپنے بیٹے کو بلائے اور

کہے کہ آؤ میں تم کو اپنے بالوں میں سے کچھ بال دے دوں۔ اپنے رنگ میں سے کچھ رنگ دے دوں یا تمہیں ناک، کان اور منہ وغیرہ دوں۔ یہ سب چیزیں وہ ورثہ میں پیدائش کے ساتھ ہی لے کر آتا ہے اس رنگ میں نہ خدا تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کی شان ہے کہ اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں۔ باقی رہا یہ کہ کسی کو خدا تعالیٰ کی طرف سے محبت اور پیار کے طور پر یا اس سے اپنے تعلق کے اظہار کے لئے بیٹا کہہ دیا جائے تو اس میں مسیح کی کوئی خصوصیت نہیں۔ انجیل بتاتی ہے کہ سب لوگ خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں یہاں تک کہ وہ گنہگاروں کو بھی اس کا بیٹا قرار دیتی ہے۔ (لوقا باب ٦ آیت ۳۵)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جو قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا اختیار کرے کیا اس کی شہادت بھی بائبل سے ملتی ہے یا نہیں ملتی۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں اس ہستی کا نام جو تمام صفات حسنہ سے متصف اور تمام دنیا کی خالق اور مالک ہے اللہ استعمال ہوا ہے جو خدا تعالیٰ کا اسم ذات ہے۔ سوائے عربی زبان کے اور کسی زبان میں بھی خدا تعالیٰ کا اسم ذات نہیں۔ بائبل میں یہوا کا لفظ اس رنگ میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اسم ذات ہوتا ہے لیکن حقیقتاً یہوا اسم ذات نہیں۔ اصل میں عربی اور عبرانی یہ دونوں زبانیں آپس میں بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے رہنے والے تھے جو عرب کا ہی ایک حصہ ہے۔ پھر آپ عراق سے ہجرت کر کے کنعان چلے گئے اور وہاں سے ان کی قوم آگے مصر کو نکل گئی مگر آپ کنعان میں ہی رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کنعان میں رہتے تھے تو ان کا ایک بیٹا جس کا نام اسماعیل تھا بچپن میں الٰہی حکمت کے ماتحت مکہ پہنچا دیا گیا۔ ان کا دوسرا بیٹا اسحاق تھا جو ان کے ساتھ رہا۔ اس وجہ سے ان کی زبانیں آپس میں ملتی جلتی تھیں اور عبرانی اور عربی میں بہت معمولی فرق تھا۔ یہوا کا لفظ بھی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا اسم ذات ہے اور جو بائبل میں استعمال ہوا ہے درحقیقت عربی زبان میں کا ہی ایک بگڑا ہوا لفظ ہے۔ بہر حال بائبل میں خدا تعالیٰ کے متعلق یہوا کے لفظ کا استعمال پایا جاتا ہے چنانچہ یسعیاہ باب ۴۲ آیت ۸ میں لکھا ہے۔

''یہوا میں ہوں یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا۔''

یہ بالکل وہی مضمون ہے جو اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ خدا تعالیٰ کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا اختیار کرے اس جگہ بھی کہا گیا ہے کہ ''یہوا'' میرا نام ہے اور میں اپنی شوکت کسی دوسرے کو نہ دوں گا۔ یعنی کوئی اور وجود ایسا نہیں جو میری عظمت اور میری قدرت اور میری شوکت میں شریک ہو سکے۔

یہ ’’یہوا‘‘ کا لفظ درحقیقت یَاھُوَ سے بنایا گیا ہے۔ یَاھُوَ کے معنے ہیں اے وہ ہستی جو غائب ہے اور نظر نہیں آتی۔ پس یہ بھی ایک صفاتی نام ہے ذاتی نام نہیں۔ اور صرف خدا تعالیٰ کے موجود ہونے اور اس کے آنکھوں سے غائب ہونے پر دلالت کرتا ہے یا خدا تعالیٰ کے موجود ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ یاء حرف ندا ہے اور اس چیز پر دلالت کرتا ہے جو موجود ہو۔ اور ھُوَ یہ بتاتا ہے کہ وہ ہے تو موجود مگر نظروں سے غائب ہے۔ پس یہ بھی اسم ذات نہیں اور یہوا کے معنے یہ ہیں کہ اے وہ ہستی جو ہے تو سہی مگر چونکہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی اس لئے وہ ھُوَ کہلا سکتی ہے اَنْتَ نہیں کہلا سکتی۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عربی اور عبرانی آپس میں کس حد تک ملتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک لمبا عرصہ گزرنے کے بعد اس زبان میں بہت کچھ تبدیلی پیدا ہو گئی لیکن باوجود اس زبان کے بدل جانے کے حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں بھی جو یہود کا آخری زمانہ تھا اور وہ جس کے بعد وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے عبرانی زبان عربی زبان سے اتنی ملتی تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ عبرانی عربی کی ہی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے جو آخری فقرہ صلیب پر کہا اور جس کے بعد انہیں ہوش نہیں رہا اور جو ایک ہی فقرہ ہے جس کے متعلق تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ یقیناً حضرت مسیحؑ کا ہی فقرہ ہے وہ یہ تھا کہ

ایلی ایلی لما سبقتانی (متی باب ۲۷ آیت ۴۶، مرقس باب ۵ آیت ۳۴)

یہ ایلی ایلی درحقیقت عربی زبان کا ایلی ایلی ہے عبرانی میں خدا تعالیٰ کو ایل کہتے ہیں اور عربی میں خدا تعالیٰ کو اِیل کہتے ہیں۔ عبرانی والے کہیں گے جبرا ایل اور عربی والے کہیں گے کہ جبر اِیل۔ وہ اسرافیل اور عربی والے کہیں گے اسرائیل پس ایلی ایلی کو اگر ہم عربی لہجہ میں ادا کریں گے تو کہیں گے۔

اِیْلِی اِیْلِی

یعنی اے میرے خدا۔ اے میرے خدا آگے ہے۔

’’لِمَا‘‘ یہ وہی عربی لم ہے۔ یعنی کس لئے یا کیوں؟ ’’سبقتانی‘‘ یہ بھی عربی کا ہی ایک بگڑا ہوا لفظ ہے۔ عربی میں کہیں گے سَبَقْتَنِیْ اور عبرانی میں کہیں گے سبقتانی پس

ایلی ایلی لم سبقتنی

کے یہ معنے ہوئے کہ اے میرے خدا۔ اے میرے خدا تو مجھے کیوں چھوڑ کر آگے چلا گیا سَبَقَ کے معنے ہوتے ہیں آگے نکل گیا۔ پس حضرت مسیحؑ دعا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے میرے خدا اے میرے خدا تو مجھے

سے کیوں آگے نکل گیا اور میں پیچھے رہ گیا اگر تو میرے پاس ہوتا تو میری مدد کرتا۔

یہ کتنا عربی زبان سے ملتا جلتا فقرہ ہے۔صرف إيلي إيلي کی جگہ ایلی ایلی اور لم کی جگہ لما اور سبقتنی کی جگہ سبقتانی کر دیا گیا ہے اور یہ ایک ہی فقرہ ہے جو حضرت مسیح کا انجیل میں موجود ہے۔ باقی الفاظ کے متعلق کوئی یقینی شہادتیں نہیں لیکن اس فقرہ کے متعلق بائبل کے تمام مفسرین متفقہ طور پر لکھتے ہیں کہ یہ فقرہ یقینی طور پر وہی ہے جو حضرت مسیحؑ نے کہا۔ پس عبرانی کوئی الگ زبان نہیں۔عربی زبان کی ہی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ ذرا عبرانی کو چست کر دو تو عربی بن جائے گی۔ بہر حال ان کے ہاں ایل کا لفظ خدا تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ کے لئے ''ایلوہیم'' کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ہیم جمع کی ضمیر ہے۔عربی میں جمع کے لئے هُمْ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔عبرانی میں اسے ہیم بنا دیا گیا ہے۔ بہر حال ایلوہیم کے لفظی معنے یہ ہیں کہ کئی خدا۔مگر اس لفظ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ بڑا خدا یا شاندار خدا۔

پہلے زمانہ میں جب کسی شخص سے مخاطب ہو کر کوئی بات کہی جاتی تھی تو عرب لوگ اسے اَنْتَ کہا کرتے تھے مگر آج کل اَنْتَ کی بجائے اَنْتُمْ کا لفظ استعمال ہونے لگ گیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عرب لوگ ہمیشہ اَنْتَ اَنْتَ کہا کرتے تھے (بخاری کتاب الجنائز باب الدخول علی المیت بعد الموت) مگر اب معمولی رئیس یا استاد یا افسر یا ڈپٹی کمشنر یا گورنر سے بھی ملاقات ہو تو اسے اَنْتَ کی بجائے اَنْتُمْ کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔اسی طرح عبرانی زبان میں تمدن اور تہذیب کا دور آ جانے کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے اعزاز کے لئے ایلوہیم کا لفظ استعمال ہوتا تھا جو جمع کا صیغہ ہے۔جس طرح غیر متمدن اقوام میں گفتگو کے وقت تو کا لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن تمدن آ جائے تو وہ تم کہنے لگ جاتے ہیں پھر اور زیادہ تمدنی شان پیدا ہو جائے تو آپ کہنے لگے جاتے ہیں۔اسی طرح خدا تعالیٰ کے ادب اور اس کے اعزاز کے لئے وہ ایلوہیم کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے جس کے معنے الٰہوں اور معبودوں کے ہیں۔ یہ اہلوہیم بھی عربی زبان کے لفظ اٰلِهَةٌ کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔ گویا جسے عربی میں اٰلِهَةٌ کہتے ہیں عبرانی میں اسے ایلوہیم کہتے ہیں۔ جسے عربی اِلٰهٌ کہتے ہیں عبرانی میں اسے ایلواہ کہتے ہیں اور جسے عربی میں اِیل کہتے ہیں عبرانی میں اسے ایل کہتے ہیں۔مگر جیسا کہ میں نے بتایا ہے ان میں سے کوئی بھی خدا تعالیٰ کا اسم ذات نہیں۔ یہ تمام نام خدا تعالیٰ کے صفاتی اسماء ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب میں یہ بتاتا ہوں کہ گو بائبل میں خدا تعالیٰ کے لئے اللہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن پھر بھی پرانے عہد نامہ میں خدا تعالیٰ کو وحدہ لاشریک تسلیم کیا گیا ہے چنانچہ استثناء باب ۶ آیت ۴ میں لکھا ہے۔

’’سن لے اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے۔‘‘

’’اکیلا خداوند‘‘ ہونے کے یہی معنے ہیں کہ وہ وحدہ لاشریک ہے اور جب وہ وحدہ لاشریک ہوا تو یہ بات بھی سچی ثابت ہوئی کہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ

پھر یسعیاہ باب ۴۲ آیت ۸ میں ہے

’’یہوا میں ہوں یہ میرا نام ہے اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا۔‘‘

اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا یہ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ پر دلالت کرتا ہے۔یعنی نہ صرف یہ کہ میرا بیٹا نہیں بلکہ میں کسی کو اپنا بیٹا بناؤں گا بھی نہیں۔گو یا تم اگر یہ کہو کہ میں نے کسی کو اپنا بیٹا بنالیا ہے اور اپنی طاقتیں اس کو دے دی ہیں تو یہ بھی غلط ہوگا۔میں اپنی صفات کسی اور کو نہیں دیتا۔

اب ہم انجیل کو دیکھتے ہیں جس پر مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کی بنیاد رکھی جاتی ہے تو اس میں بھی ہمیں یہی تعلیم نظر آتی ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔چنانچہ مرقس باب ۱۲ آیت ۲۹ میں لکھا ہے کہ ایک شخص حضرت مسیح کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ آپ مجھے وہ سب سے بڑا حکم بتائیں جس پر عمل کرنا میرے لئے سب سے زیادہ ضروری ہو۔حضرت مسیح نے اسے فرمایا

’’سب حکموں میں اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سن وہ خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے‘‘۔ (انجیل مرقس باب ۱۲ آیت ۲۹)

پھر مسیح کے حواریوں نے جو خطوط لکھے ہیں ان میں بھی یہی بات بیان کی گئی ہے۔چنانچہ رومیوں میں لکھا ہے

’’اسی واحد دانا خدا کو یسوع مسیح کے وسیلہ سے ہمیشہ حمد پہنچا کرے۔‘‘

(رومیوں باب ۱۶ آیت ۲۷)

گو یا مسیح کا ذکر کر کے اس کے مقابلہ میں ایک خدا کو پیش کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اسی واحد دانا یعنی علیم خدا کو یسوع مسیح کے وسیلہ سے ہمیشہ حمد پہنچا کرے۔

پھر ایک حواری کہتا ہے

’’لیکن مجھ پر اس لئے رحم ہوا کہ یسوع مسیح مجھ بڑے گنہگار پر کمال صبر ظاہر کرے تا کہ میں ان کے واسطے جو اس پر ہمیشہ کی زندگی کے لئے ایمان لاویں گے نمونہ بنوں۔اب انسانی بادشاہ۔غیر فانی۔نادیدنی۔واحد حکیم خدا کی عزت اور جلال ابدالاباد ہووے۔‘‘ (۱۔تمطاؤس باب ۱ آیت ۱۶ و ۱۷)

اس میں خدا تعالیٰ کو ازلی قرار دیا گیا ہے۔ بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ غیر فانی قرار دیا گیا ہے۔ نادیدنی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی جو نظر نہیں آتا لیکن مسیح تو نظر آتا تھا۔ واحد قرار دیا گیا ہے۔ حکیم قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان صفات کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے خدا کی ضرورت نہیں ہو سکتی۔

پھر یہوداہ کے خط میں لکھا ہے

''جو خدائے واحد حکیم اور ہمارا بچانے والا ہے'' (یہوداہ کا عام خط باب ۱ آیت ۲۵)

غرض ایک طرف پرانا عہد نامہ خدا تعالیٰ کو ''خدائے واحد'' قرار دیتا ہے اور دوسری طرف نیا عہد نامہ بھی اسے ''خدائے واحد'' قرار دیتا ہے پس مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ میں بائبل اور انجیل دونوں قرآن کریم کے ساتھ متفق ہیں جو کچھ قرآن نے کہا ہے وہی تورات نے کہا ہے اور وہی انجیل نے تعلیم دی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس تعلیم کے باوجود یہود اور نصاریٰ دونوں نے شرک کی کئی باتیں پیدا کر لیں اور وہ صداقت سے منحرف ہو گئے۔ یہود کی طرف جو انبیاء مبعوث ہوئے بائبل سے معلوم ہوتا ہے وہ یہی کہا کرتے تھے کہ ہم تمہیں کیا سمجھائیں۔ ہم ہمیشہ تمہیں سمجھاتے رہے مگر تم پھر شرک کرنے لگ جاتے ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت کی دلیل بیان فرماتا ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وہ پاک ہے۔ فرماتا ہے ہم اپنی توحید کا ذکر صرف بائبل کی نقل کی وجہ سے نہیں کر رہے بلکہ اس لئے کر رہے ہیں کہ اس مسئلہ کی دلیل پر بنیاد ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ سُبْحٰنَهٗ وہ پاک ہے۔

بیٹا دنیا میں کیوں ہوا کرتا ہے؟ تمام دنیا پر غور کر کے دیکھ لو بیٹے کا قانون صرف انہی چیزوں میں جاری ہے جو اپنے کام کے ختم ہونے سے پہلے فنا ہو جاتی ہیں۔ انسان کا کام دنیا میں موجود ہے۔ لیکن وہ مر رہا ہے۔ اس لئے اسے بیٹے کی ضرورت ہے۔ بکروں کی ضرورت دنیا میں موجود ہے لیکن بکرے مر رہے ہیں اس لئے بکروں کی نسل کی ضرورت ہے پہاڑوں کی ضرورت دنیا میں موجود ہے لیکن پہاڑ بھی موجود ہیں وہ فنا نہیں ہو رہے اس لئے پہاڑوں کے لئے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں۔ سورج کی ضرورت موجود ہے لیکن سورج بھی موجود ہے اس لئے سورج کے لئے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں۔ چاند اور ستاروں کی دنیا کو ضرورت ہے۔ پہلے بھی ضرورت تھی اور اب بھی ہے لیکن چاند اور ستارے بھی موجود ہیں۔ وہ فنا نہیں ہو رہے اس لئے چاند اور ستاروں کے لئے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں۔ پس تناسل کا سلسلہ انہی چیزوں کے ساتھ چلتا ہے جو اپنی ضرورت سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں اور جو چیزیں اپنی ضرورت تک جاری رہتی ہیں فنا نہیں ہوتیں ان میں تناسل کا سلسلہ بھی جاری نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی دلیل کا اس جگہ ذکر کرتا ہے

اور فرماتا ہے سُبۡحٰنَہٗ ۔ اگر تم سوچنا شروع کرو کہ بیٹے کیا کی وجہ ہوا کرتی ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ بیٹا ہونے کی تین وجوہات ہوا کرتی ہیں۔

اوّل شہوت نفسانی۔ یعنی انسان کے اندر بعض مادے ایسے جمع ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ رکے رہیں تو صحت کو نقصان پہنچانے کا موجب بن جاتے ہیں اس لئے ان کا نکالنا ضروری ہوتا ہے۔ پس یا تو اپنی بیوی کے ذریعہ نکلیں گے اور یا وہ رؤیا شہوانی کے ماتحت نکل جائیں گے۔ بہرحال نکل ضرور جائیں گے۔

دوسرے ہر انسان کو ایک مونس اور غمگسار کی ضرورت ہوتی ہے اور بغیر مونس اور غمگسار ساتھی کے وہ آرام محسوس نہیں کرتا۔ بائبل میں لکھا ہے کہ ہر قسم کے آراموں کے باوجود آدم افسردہ اور حیران پھرتا تھا تب خدا نے کہا کہ یہ بیوی کا محتاج ہے آؤ ہم اس کی بیوی پیدا کریں چنانچہ خدا نے آدم کے لئے حوا پیدا کی اور اس کی پریشانی اور افسردگی دور ہوئی (پیدائش باب ۲ آیت ۱۸ تا ۲۲)۔ پس جب انسان اپنی ذات میں خوش نہ رہ سکے اور اسے اطمینان حاصل نہ ہو تو اس کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔

تیسرے۔ اسی طرح جب اپنے کام کے ختم ہونے سے پہلے کوئی فنا ہو جائے گا تو لازماً اسے ضرورت ہوگی کہ اس کا کوئی بیٹا ہو جو اس کے کام کے تسلسل کو جاری رکھے اور اس کے فنا ہونے کی وجہ سے کام کو نقصان نہ پہنچے۔

یہ تین چیزیں ہیں جو بیٹے کی ضرورت کا بنیادی باعث ہوتی ہیں۔

(۱) انسان کے اندر ایسے مادوں کا جمع ہو جانا جو اس کی صحت کو نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں۔

(۲) انسان کے اندر ایسے ساتھی کی خواہش کا پایا جانا جس کے بغیر اسے اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) انسان کا اپنی ضرورت سے پہلے فنا ہو جانا

اور یہ تینوں چیزیں نقص پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ ماننا کہ خدا تعالیٰ کے اندر ایسا مادہ پیدا ہو جاتا ہے جس کا نکالنا ضروری ہوتا ہے اگر وہ نہ نکالے تو اس کی صحت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے نقص پر دلالت کرتا ہے۔

یہ ماننا کہ خدا تعالیٰ کو اپنے کسی مونس اور غمگسار کے بغیر اطمینان حاصل نہیں ہوتا اور وہ افسردہ رہتا ہے نقص پر دلالت کرتا ہے۔

یہ ماننا کہ خدا وقت سے پہلے مر جائے گا اور اس لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو نقص پر دلالت کرتا ہے پس فرماتا ہے مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنۡ يَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ۔ اگر تم غور کرو کہ بیٹا کیوں ہوا کرتا ہے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ بعض زائد مادوں کا انسانی جسم میں جمع ہو جانا۔ ساتھی کی خواہش اور موت۔ یہ تین وجوہ ہیں جن کی بناء پر بیٹے کا تقاضا کیا

جا تا ہے اور یہ تینوں نقص پر دلالت کرتی ہیں۔ نہ کسی کامل ذات میں ایسے مادے جمع ہو سکتے ہیں جو اس کی صحت کو خراب کرنے والے ہوں۔ نہ کسی کامل ذات کو اپنے لئے کسی مونس اور غمگسار ساتھی کی ضرورت ہوسکتی ہے اور نہ کسی کامل ذات پر موت آسکتی ہے۔ حالانکہ بیٹے کے لئے یہ تینوں باتیں ضروری ہیں۔

اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ممکن ہے کوئی کہہ دے کہ بیٹے کی ضرورت اسے مددگار کے طور پر ہے۔ سو اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا کہ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا اس بات کو بھی سوچ لو کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ وہ صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ كُنْ ایسا ہو جائے فَیَكُوْنُ پس وہ چیز عالم وجود میں آجاتی ہے۔

بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ كُنْ کس کو کہتا ہے۔ ان کے نزدیک كُنْ کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پہلے کوئی مادہ موجود ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ كُنْ کہتا ہے۔ سو یاد رہے کہ كُنْ کا لفظ عربی زبان میں کسی کو کہنے کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور محض اظہارِ خواہش کے لئے بھی بولا جاتا ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شام کی طرف لشکر کشی کی تو ابوخیثمہؓ ایک صحابی تھے جن پر آپ کو بڑا اعتماد تھا اور آپ ان سے بڑی محبت رکھتے تھے اور آپ سمجھتے تھے کہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں یہ شخص غفلت سے کام نہیں لے سکتا۔ لیکن جب آپ لشکر کے ساتھ شہر سے کچھ فاصلہ پر جا پہنچے اور آپ نے اپنے صحابہؓ کا جائزہ لیا تو آپ کو ابوخیثمہؓ نظر نہ آئے جس پر آپ کو بہت افسوس ہوا کہ مجھے اس پر اتنی حسن ظنی تھی اور وہ اس جہاد سے پیچھے رہ گیا ہے۔ جب آپ چلے تو کسی نے کہا حضور کوئی شخص پیچھے سے آرہا ہے۔ آپ نے اس طرف دیکھا اور فرمایا كُنْ اَبَا خَيْثَمَةَ۔ جب گرد ہٹی اور وہ شخص قریب پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ ابوخیثمہؓ ہی تھا۔ اس پر آپ نے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی کہ اس نے آپ کی خواہش کو اتنی جلدی پورا فرما دیا (سیرۃ حلبیۃ جزء ثالث غزوہ تبوک) اب كُنْ اَبَا خَيْثَمَةَ کے یہ معنے نہیں تھے کہ آتو کوئی اور رہا تھا۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا کہ وہ ابوخیثمہ بن جائے بلکہ كُنْ اَبَا خَيْثَمَةَ کے یہ معنے تھے کہ خدا کرے کہ یہ آنے والا شخص ابوخیثمہ ہی ہو تو عربی زبان میں یہ ایک محاورہ ہے کہ بعض دفعہ خواہش کے اظہار کے لئے بھی كُنْ کا لفظ بول لیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ جنس تبدیل کرنا مدنظر ہو اور اس کے لئے كُنْ کا لفظ استعمال کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ ہمارا یہ ارادہ ہے اور پھر وہ اسی طرح ہو جاتا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کا منشاء ہوتا ہے۔ پس یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ كُنْ فَیَكُوْنُ سے معلوم ہوتا ہے کہ روح اور مادہ ازلی ہیں خدا تعالیٰ روح اور مادہ کو حکم دیتا ہے اور وہ ایک شکل اختیار کر لیتے ہیں یہ عربی زبان کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ بے شک كُنْ کسی چیز کو مخاطب کر کے بھی کہا

جا تا ہے مگر محاورہ میں بغیر کسی کو مخاطب کرنے کے بھی اس لفظ کا استعمال کر لیا جا تا ہے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کُنْ اَبَا خَیْثَمَۃَ فرمایا۔ اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ اے زید تو بکر کی شکل بدل لے بلکہ اس کے صرف اتنے معنے تھے کہ اے کاش یہ آنے والا ابوخیثمہ ہی ہو۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ ایسا ہو جائے اور وہ چیز کسی شکل میں موجود ہو جاتی ہے ہاں خدا تعالیٰ کے لئے اے کاش کے الفاظ استعمال نہیں ہو سکتے بندے بے شک خواہش کا اظہار کریں گے تو اسی رنگ میں کریں گے کہ اے کاش فلاں بات اس طرح ہو جائے۔ لیکن خدا تعالیٰ صرف اس قدر اظہار کرتا ہے کہ ایسا ہو جائے اور وہ بات وقوع میں آ جاتی ہے یہاں بھی کُنْ فَیَکُوْنُ کے یہی معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ جب کسی خواہش کا اظہار کرتا ہے یا کسی بات کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی وہ خواہش اور وہ ارادہ فوراً پورا ہو جاتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ عربی زبان کی یہ خوبی ہے کہ اس میں الفاظ وہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ جو خود اپنے مقتضٰی پر دلالت کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ''جب وہ کسی چیز کو چاہتا ہے'' یا کہیں گے کہ ''جب وہ کسی بات کو چاہتا ہے تو ویسی ہی ہو جاتی ہے۔'' حالانکہ ''چیز'' اور ''بات'' حقیقت پر دلالت نہیں کرتے۔ دو چار دن ہوئے مجھے ایک شامی دوست کا خط آیا جس میں ایک فقرہ اس نے یہ لکھا کہ اِذَا اَرَادَاللّٰہُ بِشَیْءٍ۔ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے۔ مجھے اس وقت خیال آیا کہ اپنی طرف سے تو اس نے بڑا عمدہ فقرہ لکھا ہے لیکن عربی زبان کے لحاظ ''شیءٌ'' کے لفظ میں بھی ارادہ شامل ہوتا ہے چنانچہ شَیْءٌ کے معنے عربی میں یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز جس کو چاہا جائے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٍ۔ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے کیا وہ اپنی موت پر بھی قادر ہے حالانکہ شَیْءٌ کے معنے بات کے ہیں ہی نہیں۔ شَیْءٌ کے معنے مشیت کے ہیں۔ پس اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٍ کے یہ معنے ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ قَدِیْرٌ عَلٰی کُلِّ مَشِیَّتِہٖ اب کیا یہ خدا کی مشیت ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو مار ڈالے اگر یہ خدا کی مشیت نہیں ہو سکتی تو اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٍ پر یہ اعتراض بھی نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا اردو زبان کے لحاظ سے اس کا یہ ترجمہ ہوگا کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے۔ لیکن عربی کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جب وہ کسی ایسی چیز کا ارادہ کرے جس کا اس نے حکم دیا ہے۔ گویا امر کا لفظ مامور پر دلالت کرتا ہے اور شیءٌ کا لفظ مشیت پر دلالت کرتا ہے۔ پس یہ الفاظ ہی ایسے ہیں کہ ان پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا میں امر کے معنے مامور کے ہیں یعنی وہ چیز جس کا حکم دے۔ اور اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٍ میں یہ مضمون نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر بات پر قادر ہے بلکہ اس کے یہ

معنے ہیں کہ ہر بات جس کو وہ چاہے اس پر وہ قادر ہے پس اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا کے معنے یہ ہیں کہ جب وہ کسی ایسی چیز کا فیصلہ کرے جو اس کے احکام میں شامل ہو اور اس کی شان کے مطابق ہو تو فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ وہ صرف کُنْ کہہ دیتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔

غرض امر کے معنے جہاں بات کے ہیں وہاں عربی زبان کے لحاظ سے اس میں سر یہ ہے کہ بات وہ ہو جس کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ جسے پسند کر لیا گیا اور جو اس کی شان کے مطابق ہو۔ یہ نہیں کہ ہر لغو بات خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دی جائے اور کہنا شروع کر دیا جائے کہ کیا خدا ایسا نہیں کر سکتا۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر وہ چوری کا ارادہ کر لے تو کیا چوری کر لے گا۔ حالانکہ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی اپنے آپ کو یہ حکم دیا کرتا ہے کہ جا اور چوری کر۔ اور کیا چوری ان چیزوں میں سے ہے جو خدا تعالیٰ کی پسندیدہ ہیں۔ پس یہ سوال ہی احمقانہ ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ بیٹے کی اسے ضرورت ہوتی ہے جو خود کام نہ کر سکے اور جسے اپنی مدد کے لئے دوسروں کے سہارے کی ضرورت ہو۔ جب خدا تعالیٰ کو کسی مددگار کی ضرورت ہی نہیں اور جب وہ سارے کام خود کر لیتا ہے تو اس کے متعلق بیٹے اور روح القدس کا وجود کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ

اور اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اس کی عبادت کرو۔

مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۳۷﴾

یہی سیدھا راستہ ہے

تفسیر۔ فرماتا ہے یقیناً اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے فَاعْبُدُوْهُ پس تم اسی کی عبادت کرو۔ جب خدا باپ کے متعلق تم بھی سمجھتے ہو کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ قادر مطلق ہے تو قادر مطلق کو چھوڑ کر کسی اور کو خدا تعالیٰ کا بیٹا تسلیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

اللہ تمہارا بھی رب ہے اور میرا بھی۔ وہ تمہارا بھی مالک ہے اور میرا بھی جھگڑا کیسا اور رقابتیں کیسی۔ ان جھگڑوں کو چھوڑ و اور سمجھ لو کہ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ یہ سیدھا راستہ ہے۔ تم ان چیزوں کی طرف چلے گئے ہو۔ جن کی عدم ضرورت کو تم بھی تسلیم کرتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ پر موت نہیں آ سکتی کہ اسے بیٹے کی ضرورت ہو۔ تم

جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کو بیوی کی ضرورت نہیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس کے اندر ایسے مادے جمع نہیں ہوتے جو بیٹوں کی پیدائش کا موجب بنتے ہیں۔ پھر جب تم بھی ان باتوں کو تسلیم کرتے ہو تو آؤ اور سیدھے راستہ پر چلتے ہوئے خدائے واحد کی عبادت کرو۔ صراط مستقیم کو چھوڑ کر تم ٹیڑھے راستہ کو کیوں اختیار کر رہے ہو۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا

مگر مختلف گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا (اور سچائی کو چھوڑ دیا) پس جن لوگوں نے ایک بڑے دن میں حاضر

مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۸﴾

ہونے کا انکار کیا ان پر عذاب نازل ہوگا۔

تفسیر ۔ اَحْزَابٌ حِزْبٌ کی جمع ہے اس کے عام معنے تو اَلْجَمَاعَةُ مِنَ النَّاسِ کے ہوتے ہیں یعنی انسانوں کی کوئی جماعت۔ لیکن لغت والے لکھتے ہیں کہ اس سے مراد خالی گروہ نہیں ہوتا بلکہ كُلُّ قَوْمٍ تَشَاكَلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاَعْمَالُهُمْ فَهُمْ اَحْزَابٌ (اقرب)۔ وہ تمام قومیں جن کے افراد کے قلوب میں ہم رنگی پیدا ہو چکی ہو اور ان کے اعمال میں بھی ہم رنگی ہو احزاب کہتے ہیں یوں تو پچاس ساٹھ یا سو آدمی کہیں کھڑے ہوں تو انہیں حزب کہہ دیں گے ان معنوں میں کہ یہ ایک طائفہ یا گروہ ہے۔ لیکن استعمال میں آہستہ آہستہ اس لفظ کو یہ خصوصیت دے دی گئی ہے کہ صرف ایسے لوگوں کو حزب قرار دیا جائے گا جو ایک خیال اور ایک عقیدہ کے ہوں۔ اگر کسی جگہ بہت سے لوگ جمع ہوں جن میں عیسائی بھی ہوں، یہودی بھی ہوں، مسلمان بھی ہوں، دہریہ بھی ہوں، سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے بھی ہوں۔ تو محاورہ کے لحاظ سے ہم انہیں حزب نہیں کہیں گے۔ حزب اس وقت کہیں گے جب ان کے مذہبی اور تمدنی اور سیاسی خیالات اور اعمال ایک رنگ کے ہوں تو فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ میں اگر لوگوں کی عام جماعت مراد لی جائے تو یہ معنے درست نہیں ہوں گے۔ کیونکہ جن لوگوں کو مسیحؑ کے متعلق کوئی دلچسپی ہی نہیں انہوں نے اختلاف کیوں کرنا ہے اختلاف کرنے والے وہی ہو سکتے ہیں جن کی دلچسپی مسیحؑ کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن دوسری طرف اگر حزب کے معنے ان لوگوں کے لئے جائیں جن کے قلوب اور اعمال میں مشارکت پائی جاتی ہو تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ایک رنگ اور خیالات کے ہوں اور جن کے اعمال میں بھی یکجہتی پائی جاتی ہو انہوں نے اختلاف کیا کرنا ہے یہ بھی تضاد رکھنے والی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک طرف تو انہیں یک رنگ کہا جاتا ہے اور

دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اختلاف کیا۔سو یاد رکھنا چاہیے کہ اختلاف درحقیقت پیدا ہی یک رنگی کے بعد ہوتا ہے۔ جیسے میں نے بتایا ہے کہ اگر کسی امر کے متعلق لوگوں کو دلچسپی ہی نہ ہوتو انہوں نے اختلاف کیوں کرنا ہے۔ اسی طرح اختلاف بھی اسی وقت اہمیت رکھتا ہے جب خیالات اور اعمال میں مشارکت پائی جاتی ہو اور پھر اختلاف بھی نظر آ رہا ہو۔ مثلاً اگر مسلمانوں میں قرآن کریم کے بارہ میں اختلاف پیدا ہو جائے تو یہ اختلاف بڑی اہمیت رکھے گا کہ مسلمان ایک طرف قرآن کو بھی مانتے ہیں اور دوسری طرف اسی قرآن کے بارہ میں اختلاف بھی کرتے ہیں۔لیکن اگر عیسائیوں میں قرآن کریم کے بارہ میں اختلاف ہو تو ان کا اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھے گا۔ کیونکہ ہر شخص کہے گا کہ یہ تو قرآن کو مانتے ہی نہیں۔ان کا اختلاف کونسی اہمیت رکھتا ہے۔تو اختلاف وہی اہمیت رکھتا ہے جو ایک عقیدہ اور ایک خیال رکھنے والے لوگوں کے اندر پایا جاتا ہو مِنۢ بَیۡنِهِمۡ کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ یہاں حزب کے معنے اَلْجَمَاعَةُ مِنَ النَّاسِ کے نہیں بلکہ ہم خیال اور ہم عقیدہ لوگ مراد ہیں اور یہی قابل تعجب ہوا کرتا ہے کہ ایک کتاب پر ایمان رکھنے والے لوگ ہوں ایک رسول پر ایمان لانے والے لوگ ہوں۔ایک مقصد اور ایک مدعا اپنے سامنے رکھنے والے لوگ ہوں اور پھر ان میں اختلاف پیدا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۢ بَیۡنِهِمۡ ۔ یہ جو لوگ مسیح کو ماننے والے اور اس کے ساتھ عقیدت رکھنے والے ہیں ان کی کتاب ایک تھی۔ان کے عقائد ایک تھے۔ان کے اعمال ایک تھے۔مگر کتنی بدقسمتی ہے کہ پھر انہوں نے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔کسی نے کہا کہ مریم ایک بشر تھی جو خدا تعالیٰ کا بیٹا جنی (لوقا باب ۱ آیت ۲۶ تا ۳۵)اور کسی نے کہا کہ مریم خدا تعالیٰ کی بیوی تھی اور وہ خدائی صفات اپنے اندر رکھی تھی۔ چنانچہ سال ڈیڑھ سال کی بات ہے پوپ نے اعلان کیا تھا کہ یہ عقیدہ کہ مریم خدا تعالیٰ کی بیوی اور خدائی صفات اپنے اندر رکھتی تھی۔ یہی رومن کیتھولکس کا آفیشل عقیدہ سمجھا جائے گا۔ پھر بعض نے کہا کہ خدا ایک ہے مسیح اپنے اندر صرف خدائی صفات رکھتے تھے اور وہ انسان کی صورت میں اس دنیا میں ظاہر ہوئے۔بعض نے کہا کہ نہیں مسیحؑ خدا تھا اور مسیحؑ کا خدا ہونا بطور ایک مادی وجود کے تھا۔ وہ کہتے ہیں تین شخصیتیں ماننی ضروری ہیں۔اور بعض کہتے ہیں کہ تین شخصیتیں ماننی ضروری نہیں صرف اتنا ماننا ضروری ہے کہ ان تینوں میں خدائی حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ اس مسیح کو جو دنیا میں ظاہر ہوا انسان ہی سمجھتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ خدا بیٹا الگ تھا جس کا اس مسیح کے ساتھ جو دنیا میں ظاہر ہوا تعلق ہو گیا۔ یہ لوگ تین شخصیتوں کے نہیں بلکہ تین حیثیتوں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک حیثیت سے خدا باپ ہے ایک حیثیت سے خدا بیٹا ہے اور ایک حیثیت سے خدا روح القدس ہے۔مگر جو تین شخصیتیں مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ خدا باپ اپنی ذات

میں الگ وجود ہے خدا بیٹا اپنی ذات میں الگ وجود ہے اور خدا روح القدس اپنی ذات میں الگ وجود ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ خود انہی میں سے یہ گروہ جو عیسیٰ کو ماننے والا ہے باوجود اتحاد مذہب اور اتحاد عقیدہ اور اتحاد عمل کے اختلاف کا شکار ہو گیا۔

فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ اس اختلاف کے نتیجہ میں لازماً ایک گروہ کے متعلق یہ ماننا پڑے گا کہ وہ حق پر ہے اور ایک کے متعلق یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ضلالت پر ہے چاہے دس گروہ ہو جائیں۔ مگر بہرحال اختلاف کے نتیجہ میں دو فریق بن جائیں گے۔ ایک حق پر ہو گا اور ایک باطل پر۔ وہ لوگ جو باطل عقائد میں مبتلا ہو گئے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَوَیْلٌ خدائے واحد نے اپنا ایک بندہ توحید کے قائم کرنے کے لئے بھیجا تھا مگر ان لوگوں نے اسی کو خدا بنا لیا۔ یہ بہت بڑا جرم ہے جو ان سے سرزد ہوا پس ان پر عذاب اور لعنت ہے۔ وَیْلٌ کے معنے عذاب کے بھی ہوتے ہیں اور وَیْلٌ کے معنے لعنت کے بھی ہوتے ہیں۔ پس فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ کے یہ معنے ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے ایک بڑے دن میں حاضر ہونے کا انکار کر دیا ان پر ہمارا عذاب نازل ہو گا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے انہیں دوری کا پیغام دیا جائے گا۔ یوم عظیم کی انسان تمنا کیا کرتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس دن بدلے ملیں گے اور وہ کہتا ہے کاش اس دن مجھے بھی خدا نظر آ جائے لیکن اگر وہ اس طرح نظر آئے کہ انسان اس کے سامنے مجرم کی طرح پیش ہو تو اس سے زیادہ ذلت اور بدقسمتی کی بات اور کیا ہو گی۔

حضرت ضرارؓ ایک جنگ میں شامل تھے۔ قیصر کی فوجوں کے ساتھ لڑائی ہو رہی تھی کہ اس کی طرف سے ایک جرنیل نکلا جس نے بہت سے مسلمان سپاہی مار ڈالے حضرت ابو عبیدہؓ جو اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف تھے انہوں نے ضرار کو بلایا اور کہا۔ اب تم اس جرنیل کے مقابلہ کے لئے جاؤ۔ وہ نکلے اور جرنیل کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے مگر یک دم انہوں نے اپنی پیٹھ موڑی اور خیمہ کی طرف بھاگ پڑے۔ ان کا بھاگنا تھا کہ اسلامی لشکر میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور عیسائیوں نے خوشی سے نعرہ بلند کیا کہ اتنا بڑا آدمی ہمارے جرنیل کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر میدان سے بھاگ نکلا ہے۔ حضرت ضرار جب واپس بھاگے تو کمانڈر انچیف نے ایک شخص کو حکم دیا کہ جاؤ ضرار سے پتہ لو کہ کیا ہوا ہے اور وہ کیوں میدان سے بھاگا ہے؟ وہ شخص ان کے پاس پہنچا تو اس وقت ضرار اپنے خیمہ میں سے باہر نکل رہے تھے اس شخص نے کہا۔ ضرار آج تم نے سب مسلمانوں کو ذلیل کر دیا ہے اور سب میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ کیونکہ تم اس جرنیل کے مقابلہ سے بھاگ کھڑے ہوئے بتاؤ تمہیں کیا ہوا تھا اور تم کیوں بھاگے؟ اس

نے کہا بات یہ ہے کہ جب میں اس جرنیل کے مقابلہ کے لئے نکلا اور اس کے سامنے کھڑا ہوا تو یکدم مجھے یاد آیا کہ میں نے زرہ بکتر پہنی ہوئی ہے زرہ پہننے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ تلوار بھی جسم پر اثر نہ کرے اور نیزہ بھی جسم پر اثر نہ کرے۔ وہ لوہے کی ایک صدری ہوتی ہے اور اگر اچھی مضبوط زرہ ہو تو تلوار نہ صرف اسے کاٹ نہیں سکتی بلکہ زرہ پر لگنے کی وجہ سے خود خراب ہو جاتی ہے تو انہوں نے کہا آج صبح میں نے زرہ پہن لی تھی جو اس وقت بھی میں نے پہنی ہوئی تھی جب میں اس کے سامنے ہوا تو چونکہ یہ جرنیل نیزہ زنی اور تلوار چلانے کا بڑا مشاق ہے اس لئے میرے دل نے کہا اے ضرار کیا تجھے خدا تعالیٰ کی ملاقات سے اتنی نفرت ہے کہ اس بہادر جرنیل کے سامنے تو زرہ پہن کر کھڑا ہوا ہے تا کہ تو مارا نہ جائے اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اگر آج میں مارا گیا تو میرے لئے جہنم کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہو گا۔ کیونکہ خدا کہے گا کہ تجھے میرے ملنے کی خواہش نہیں تھی اگر خواہش ہوتی تو تو زرہ پہن کر کیوں لڑتا۔ چنانچہ میں دوڑا اور اپنے خیمہ میں آیا تا کہ میں زرہ اتار دوں اور اگر اس لڑائی میں مارا جاؤں تو اللہ تعالیٰ سے خوشی اور بشاشت کے ساتھ ملوں تو یوم عظیم وہی ہے جس میں خدا تعالیٰ کی ملاقات ہو اور خدا تعالیٰ کی ملاقات وہی ہے جس سے خوشی اور سکون حاصل ہو۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ کتنی بدقسمتی ہے، کتنی بڑی لعنت کی بات ہے کہ ایک شخص خدا سے ملے مگر بجائے خوش ہونے کے اس کا دل چاہے کہ میں یہاں سے دور بھاگوں۔ یہ ذلت اور رسوائی ان لوگوں کو اس لئے پہنچے گی کہ جس سے ان کو تعلق جوڑنا چاہیے تھا اس سے انہوں نے اپنا تعلق توڑا اور وہ شخص جو خدا تعالیٰ کا ایک بندہ اور ادنیٰ غلام تھا اسے انہوں نے خدا کی جگہ پر بیٹھا دیا۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ

جس دن وہ ہمارے حضور حاضر ہوں گے ان کی قوت شنوائی بہت تیز ہو گی اور نظریں بھی بہت تیز ہوں گی۔ لیکن وہ

الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۹﴾

ظالم آج بہت بھاری گمراہی میں مبتلا ہیں۔

تفسیر ۔ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ یہ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے اور عام طور پر ہمارے صرفی اور نحوی اس کے یہ معانی کرتے ہیں کہ ''وہ کیا ہی خوب سننے والے اور دیکھنے والے ہوں گے'' لیکن بعض نحویوں نے کہا ہے کہ اَسْمِعْ وَ اَبْصِرْ کلمہ تعجب کے طور پر نہیں بلکہ حقیقی امر کے طور پر استعمال ہوا ہے (املاء مامن بہ الرحمن زیر آیت ۳۹)۔ پس

اُن کے نزدیک اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ان لوگوں کو سناؤ اور انہیں اُن کی حالت دکھاؤ۔ یعنی ان لوگوں کی جو کیفیت ہے وہ ان پر اچھی طرح واضح کرو لیکن عربی محاورہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے پہلے معنے ہی قابل ترجیح ہیں کہ ''وہ کیا ہی خوب سننے والے اور کیا ہی خوب دیکھنے والے ہوں گے۔''

یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے۔ کیونکہ اُس روز تمام باتیں کھل جائیں گی۔ ہر قسم کے پیچ جو مذہبی مسائل میں پیدا ہو چکے ہیں دور ہو جائیں گے۔ پادریوں، پنڈتوں اور مولویوں کی جھوٹی روایتوں کی وجہ سے انسانی عقلوں پر جو پردہ پڑ گیا ہے وہ اُٹھ جائے گا۔ کان اس روز حقیقت کو سن رہے ہوں گے اور آنکھیں اس روز حقیقت کو دیکھ رہی ہوں گی۔ لیکن اس حقیقت کے کھلنے کا کیا نتیجہ ہوگا۔ ایک مومن پر جب حقیقت کھلے گی تو چونکہ چیز وہی ہوگی جس کو وہ اس دنیا میں مان رہا ہوگا۔ اس لئے وہ خوش ہوگا کیونکہ اس کے سامنے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی بلکہ وہی ہوگی جس کو وہ اس دنیا میں مان رہا تھا۔ ایک مومن جس نے خدا تعالیٰ کے متعلق یہ ایمان رکھا کہ وہ حمید ہے، وہ مجید ہے، وہ غفار ہے، وہ ستار ہے، وہ مہیمن ہے، وہ شکور ہے، وہ غفور ہے، وہ رب ہے وہ رحمٰن ہے وہ رحیم ہے، وہ مالک یوم الدین ہے۔ قیامت کے دن جب حقیقت کھلے گی اور وہ خدا تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا تو اسے رحمانیت کے بڑے وسیع معنے معلوم ہوں گے۔ رحیمیت کے بڑے وسیع معنے معلوم ہوں گے۔ مالک یوم الدین کے بڑے وسیع معنے معلوم ہوں گے اسی طرح خدا تعالیٰ کی باقی تمام صفات کے اُسے بڑے وسیع معنے معلوم ہوں گے لیکن اس کے باوجود وہ خوش ہوگا کہ میں نے صحیح راستہ اختیار کیا تھا۔ جیسے کوئی شخص دور سے سبزہ دیکھتا ہے تو اس کی اور کیفیت ہوتی ہے۔ اور جب قریب آ کر دیکھتا ہے تو اس کی اور کیفیت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اسے ہر چیز نظر آنے لگ جاتی ہے لیکن باوجود اس کے کہ اس کی کیفیات میں فرق ہوتا ہے سبزہ کے قریب پہنچ کر اس کی خوشی بڑھ جاتی ہے کم نہیں ہوتی لیکن ایک اور شخص ایسا ہوتا ہے جو دور سے اژدہا دیکھتا ہے اور نظر کی کمزوری کی وجہ سے خیال کرتا ہے کہ وہ کوئی ٹیلہ ہے اور اس کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے تا کہ رات کے وقت وہاں قیام کرے اور شیر اور چیتے کے حملہ سے محفوظ رہے لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ ٹیلہ نہیں بلکہ اژدہا ہے اور اس کا دل حسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن جب کفار پر حقیقت کھلے گی تو وہ حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ یہ کیا نکلا؟ ہم تو کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے۔

لٰکِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ اس کے یہ معنے نہیں کہ اَسْمِعْ بِهِمْ وَ اَبْصِرْ کے بعد ضلالت ملتی ہے کیونکہ جب آنکھیں کھل جائیں اور کان کھل جائیں تو اس کے بعد ہدایت ملتی ہے ضلالت نہیں ملتی۔ مطلب یہ ہے کہ

انہیں پتہ تو لگ جائے گا کہ جو کچھ وہ مان رہے تھے وہ بالکل غلط تھا مگر اس وقت وہی چیز انسان کے کام آسکتی ہے جس کو پہلے مانتا ہو۔ وہ عقیدہ کام نہیں آسکتا جو اس روز انسان پر روشن ہوا ہو۔ ایک عیسائی جسے خدائے واحد نظر آجائے گا اس کے دیکھنے سے وہ شرک سے پاک نہیں ہو جائے گا اگر وہ پاک ہو جاتا تو دوزخ میں کیوں جاتا پس اس کے یہ معنے نہیں۔ کہ اس دن ان کو گمراہی ملے گی بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس دن اُن کو گمراہی کا علم حاصل ہوگا۔

وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَ هُمْ فِيْ

اور اُن کو اس دن سے ڈرا جس دن (افسوس اور) مایوسی چھائی ہوئی ہوگی (یعنی قیامت کے دن سے) جب سب

غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۰﴾

معاملات کا فیصلہ ہو جائے گا اور (اب تو) یہ لوگ غفلت میں (پڑے ہوئے) ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر۔ ''حسرت کا دن'' اس لئے کہا کہ اس روز حقیقت کھل جائے گی مگر چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہوگا اور سامنے کچھ اور نظر آ رہا ہوگا اس لئے انہیں اپنے عقائد کی غلطی معلوم کر کے افسوس ہوگا اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ جس دن حقیقت کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا یا جس دن امر الٰہی کا اعلان کر دیا جائے گا اور یہ فیصلہ اور امر الٰہی کا اعلان سچائی کی تائید میں ہوگا جھوٹ کی تائید میں نہیں۔ پس جب اعلان ہوگا تو ان کے دلوں میں حسرت ہوگی کہ کاش ہم اس سے پہلے ایمان لا چکے ہوتے۔ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ مگر تمام حقائق کو سمجھ لینے کے باوجود پھر بھی وہ غفلت میں مبتلا رہیں گے اور ایمان لانے کے لئے اپنے قدم نہیں بڑھائیں گے۔

یہاں سے یہ ایک عجیب حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ صداقت کو دیکھ کر بھی دل کبھی یکدم نہیں بدلا کرتے۔ اَسْمِعْ وَ اَبْصِرْ میں بتایا تھا کہ وہ دیکھ بھی رہے ہوں گے اور وہ سن بھی رہے ہوں گے اور پھر يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا وہ ہمارے پاس بھی پہنچ چکے ہوں گے اور قُضِيَ الْاَمْرُ فیصلہ بھی ہو جائے گا لیکن وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّ هُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ پھر بھی بوجہ سابق کفر اور بداعمالیوں کے ان کا دل اتنا ملوث ہوگا کہ حقیقت کو دیکھنے کے باوجود اس کے اندر صفائی پیدا نہیں ہوگی اور وہ دوزخ میں داخل کئے جائیں گے جس کے معنے یہ ہیں کہ حقیقت کھل جانے کے بعد بھی بوجہ اپنی پرانی عادت کے انسان اپنے طریق کو نہیں چھوڑ سکتا اور پھر بھی اسے تاریکی اور ظلمت ہی پسند آتی ہے چنانچہ دیکھ لو ہر قسم کے نشانات دیکھنے کے باوجود کفار پھر بھی اعراض ہی کرتے رہتے ہیں ان کے دلوں میں اتنی صفائی پیدا نہیں ہوتی کہ خدا تعالیٰ کا نور ان

میں جذب ہو سکے۔ وہ نشانات دیکھتے ہیں مگر پھر بھی ہدایت سے دور رہتے ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿۴۱﴾ ع

ہم یقیناً ساری زمین کے بھی وارث ہونگے اوران لوگوں کے بھی جواس پر رہتے ہیں اور (آخرکار) سب لوگ ہماری طرف ہی لوٹا کر لائے جائیں گے۔

تفسیر ۔گذشتہ آیات میں عیسائیوں کا ذکر کر کے بتایا گیا تھا کہ ایک دن ان پر حقیقت کھل جائے گی اور انہیں پتہ لگ جائے گا کہ خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ نہیں بلکہ کسی اور دین کے ساتھ ہے لیکن باوجود اس علم کے وہ سچائی کو قبول کرنے سے اعراض کریں گے اب فرماتا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا وَ اِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ان لوگوں کو انسانوں اور مالوں پر حکومت حاصل ہوگی لیکن فیصلہ کے دن انسانوں اور مالوں کی بادشاہت مومنوں اور سچائی پر قائم ہونے والوں کو دے دی جائے گی اوران لوگوں سے چھین لی جائے گی گویا اس میں اسلام اور احمدیت کی ترقی کی طرف بھی اشارہ ہے اوراس طرف بھی کہ عیسائیت کا اس وقت ساری دنیا پر غلبہ ہوگا جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس وقت عیسائیت کے پاس بے شک حکومت تھی مگر ان کی حکومت بہت ہی محدود تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ایک زمانہ میں ساری دنیا کی حکومت ان سے چھین لی جائے گی جس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے ساری دنیا کی حکومت ان کے قبضہ میں چلی جائے گی اور پھر وہ حکومت ان سے چھینی جائے گی۔ کیونکہ کوئی چیز تبھی چھینی جاسکتی ہے جب وہ دوسرے کے پاس موجود ہو۔ پس یہ کہنا کہ دنیا کی حکومت ان سے چھین لی جائے گی اس میں دو پیشگوئیاں پائی جاتی تھیں۔ ایک یہ کہ ساری دنیا کی حکومت ان کو ملے گی اور دوسری یہ کہ دنیا کی حکومت ان سے چھین لی جائے گی۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے ہم کسی غریب آدمی کے متعلق کہیں کہ ایک سال کے بعد ہم ایک کروڑ روپیہ اس سے چھین لیں گے۔ اب اس فقرہ میں یہ بھی مفہوم پایا جاتا ہے کہ ایک کروڑ روپیہ اس غریب آدمی کے قبضہ میں آجائے گا اور یہ بھی کہ وہ کروڑ روپیہ اس سے چھین لیا جائے گا۔ اسی طرح اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ میں بھی دو پیشگوئیاں کی گئی ہیں ایک یہ کہ عیسائی ایک زمانہ میں ساری دنیا پر چھا جائیں گے اور ساری دنیا کے وارث ہو جائیں گے اور تمام بنی نوع انسان ان کے ماتحت ہو جائیں گے اور پھر یہ کہ ہم ہی اس کے وارث ہو جائیں گے یعنی ہم وہ زمین ان سے چھین لیں گے اور اپنے نیک بندوں کو دے دیں گے۔ وَ مَنْ عَلَيْهَا اور پھر زمین پر جتنے لوگ ہوں گے ان کے بھی ہم ہی وارث

ہو جائیں گے یعنی نہ صرف عیسائی اس وقت دنیا کے بادشاہ ہوں گے بلکہ لوگ بھی کثرت کے ساتھ عیسائی ہو جائیں گے۔ اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ میں بتایا کہ انہیں دنیوی شان وشوکت حاصل ہوگی اور مَنۡ عَلَيۡهَا میں بتایا کہ تعداد بھی ان کی زیادہ ہوگی چنانچہ اس کے بعد امریکہ دریافت ہوا جو عیسائیوں کے قبضہ میں ہے۔ اب اگر امریکہ چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا کیونکہ وہاں ان ہی کا غلبہ ہے اگر فلپائن چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا۔ اگر چین کے بہت سے علاقے چھینے جائیں تو عیسائیوں سے ہی چھینے جائیں گے۔ کیونکہ وہاں کئی کروڑ عیسائی پائے جاتے ہیں اگر آسٹریلیا چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا اگر روس چھینا جائے تو گو وہ دہریہ ملک ہے بہرحال عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا۔ اگر یورپ چھینا جائے تو عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا اگر افریقہ چھینا جائے تو چونکہ اس کا اکثر حصہ عیسائی ہے اس لئے وہ بھی عیسائیوں سے ہی چھینا جائے گا اگر جزائر چھینے جائیں تو عیسائیوں سے ہی چھینے جائیں گے غرض فرمایا اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَمَنۡ عَلَيۡهَا ہم وارث ہو جائیں گے زمین کے بھی اور ان کے بھی جو اس زمین پر رہتے ہیں اور ان کو اپنی ماتحتی میں لے آئیں گے۔ ماتحتی کے معنے یہ ہیں کہ وہ لوگ خدئے واحد کی بادشاہت کو قبول کرلیں گے پہلی آیت میں بتایا تھا کہ عیسائیت بحیثیت قوم ایمان نہیں لائے گی۔ اب بتاتا ہے کہ عیسائیت تو قیامت تک باقی رہے گی لیکن جہاں تک اکثریت کا سوال ہے زمین بھی ان سے چھین لی جائے گی۔ اور ان کی اکثریت بھی ان سے چھین لی جائے گی اور زمین خدا کی ہو جائے گی یعنی ان لوگوں کی ہو جائے گی جو خدائے واحد کے پرستار ہیں اور روئے زمین کے تمام لوگ بھی موحدین کے ماتحت آ جائیں گے۔ گویا اس میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ احمدیت دنیا کے اکثر افراد کو اپنے اندر جذب کرلے گی اور عیسائیت اس کے مقابلہ میں شکست کھا جائے گی۔

وَ اِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ اور عیسائی لوگ جو آج خدائے واحد سے منہ پھیرے بیٹھے ہیں اور ایک خدا کے بندے کی پرستش کر رہے ہیں مسیحؑ کے گرد ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے یعنی ان میں تبلیغ اسلام کی جائے گی اور وہ اسلام کو قبول کر کے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ کی طرف لوٹیں گے اور شرک کو چھوڑ کر خدا تعالیٰ کی توحید کے قائل ہو جائیں گے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۲﴾

اور تو قرآن کریم کے رو سے ابراہیم کا ذکر کر۔ وہ یقیناً بڑا راستباز تھا اور نبی تھا۔

تفسیر ۔ یوں تو اَلْکِتَاب ایک عام لفظ ہے جو کسی جگہ قرآن کریم کے لئے استعمال ہوا ہے اور کسی جگہ بائبل کے لئے مگر اس جگہ الکتاب سے مراد قرآن کریم ہی ہے اور اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تو قرآن کریم کے رو سے ابراہیم کا ذکر کر یعنی تو ابراہیم کو اس شکل میں پیش کر جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے نہ کہ اس شکل میں جو بائبل میں بیان کی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بائبل میں ابراہیم کو صدیق نہیں بتایا گیا بلکہ اس کی طرف یہ جھوٹ منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے بادشاہ سے ڈر کر اپنی بیوی کو بہن کہہ دیا چنانچہ اس بارہ میں بائبل کے الفاظ یہ ہیں کہ

''ابراہام وہاں سے جنوب کے ملک کی طرف چلا اور قادس اور شور کے درمیان ٹھہرا اور جرار میں قیام کیا اور ابراہام نے اپنی بیوی سارہ کے حق میں کہا کہ وہ میری بہن ہے اور جرار کے بادشاہ ابی ملک نے سارہ کو بلوا لیا لیکن رات کو خدا ابی ملک کے پاس خواب میں آیا اور اسے کہا کہ دیکھ تو اس عورت کے سبب سے جسے تو نے لیا ہے ہلاک ہوگا کیونکہ وہ شوہر والی ہے پر ابی ملک نے اس سے صحبت نہیں کی تھی سو اس نے کہا اے خداوند کیا تو صادق قوم کو بھی مارے گا۔ کیا اس نے خود مجھ سے نہیں کہا کہ یہ میری بہن ہے اور وہ آپ بھی یہی کہتی تھی کہ وہ میرا بھائی ہے میں نے تو اپنے سچے دل اور پاکیزہ ہاتھوں سے یہ کیا اور خدا نے اسے خواب میں کہا ہاں میں جانتا ہوں کہ تو نے اپنے سچے دل سے یہ کیا اور میں نے بھی تجھے روکا کہ تو میرا گناہ نہ کرے اسی لئے میں نے تجھے اس کو چھونے نہ دیا اب تو اس مرد کی بیوی کو واپس کر دے کیونکہ وہ نبی ہے اور وہ تیرے لئے دعا کرے گا اور تو جیتا رہے گا۔ پر اگر تو اسے واپس نہ کرے تو جان لے کہ تو بھی اور جتنے تیرے ہیں سب ضرور ہلاک ہوں گے تب ابی ملک نے صبح سویرے اٹھ کر اپنے سب نوکروں کو بلایا اور ان کو یہ سب باتیں کہہ سنائیں تب وہ لوگ بہت ڈر گئے اور ابی ملک نے ابراہام کو بلا کر اس سے کہا کہ تو نے ہم سے یہ کیا کیا اور مجھ سے تیرا کیا قصور ہوا کہ تو مجھ پر اور میری بادشاہی پر ایک گناہ عظیم لایا۔ تو نے مجھ سے وہ کام کئے جن کا کرنا مناسب نہ تھا ابی ملک نے ابراہام سے یہ بھی کہا کہ تو نے کیا سمجھ کر یہ بات کی ابراہام نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ خدا کا خوف تو اس جگہ ہرگز نہ ہوگا اور وہ مجھے میری بیوی کے سبب سے مار ڈالیں گے اور فی الحقیقت وہ میری

بہن بھی ہے کیونکہ وہ میرے باپ کی بیٹی ہے اگرچہ میری ماں کی بیٹی نہیں پھر وہ میری بیوی ہوئی اور جب خدا نے میرے باپ کے گھر سے مجھے آوارہ کیا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھ پر یہ تیری مہربانی ہوگی کہ جہاں کہیں ہم جائیں تو میرے حق میں یہی کہنا کہ یہ میرا بھائی ہے۔‘‘

(پیدائش باب ۲۰ آیت ۱ تا ۱۳)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ بائبل ابراہیم کو جھوٹا قرار دیتی ہے پس چونکہ بائبل میں ابراہیم کو صدیق نہیں بتایا گیا بلکہ اس کی طرف یہ جھوٹ منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے بادشاہ سے ڈر کر اپنی بیوی کو بہن کہا اور اپنی بیوی سے بھی یہی کہا کہ تو مجھے اپنا بھائی کہنا اس لئے فرماتا ہے کہ تو ابراہیم کو اس شکل میں پیش کر جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے نہ کہ اس شکل میں جو بائبل میں بیان کی گئی ہے ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ یہ بیان بالکل غلط ہے اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ابراہیم صدیق بھی تھا اور نبی بھی تھا۔

صدیق کے کئی معنے ہوتے ہیں ایک معنے صدیق کے یہ ہیں کہ مَنْ كَثُرَ مِنْهُ الصِّدْقُ جو شخص زیادہ سچ بولے۔ کبھی کبھار بے احتیاطی ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ اپنی طرف سے وہ سچ بولنے کی کوشش کرے۔

دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ مَنْ لَا يَكْذِبُ قَطُّ جس کے منہ سے کسی صورت میں بھی جھوٹ نہ نکلے گویا وہ بہت زیادہ احتیاط سے اپنی زبان سے الفاظ نکالنے کا عادی ہو اور غلطی سے بھی جھوٹ نہ بولتا ہو۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ مَنْ لَا يَتَاَتّٰى مِنْهُ الْكِذْبُ لِتَصَوُّرِهِ الصِّدْق جو شخص سچ کا اتنا عادی ہو کہ جھوٹ اس کے منہ سے نکل ہی نہ سکے گویا دوسرے معنے تو یہ تھے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا لیکن تیسرے معنے یہ ہیں کہ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا۔ سچائی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔

چوتھے معنے اس کے یہ ہیں کہ مَنْ صَدَقَ بِقَوْلِهٖ وَ اِعْتَقَادِهٖ وَ حَقَّقَ صِدْقَهٗ بِفِعْلِهٖ جو شخص اپنے قول اور اعتقاد سے دونوں باتوں میں سچائی بیان کرے یعنی اس کی بات بھی سچی ہو اور اس کا عقیدہ بھی سچا ہو۔ مثلاً ایک عیسائی دیکھتا ہے کہ اس کے بیٹے نے زید کو مار ڈالا ہے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوتا ہے اور اسے گواہی کے لئے بلایا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ واقعہ میں میرے بیٹے نے اس شخص کو مارا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی جان کی پروا نہیں کرتا اور سچ بولتا ہے اب ایسے شخص کو ہم صادق تو کہیں گے لیکن اسے صدیق نہیں کہیں گے۔ کیونکہ صدیق میں یہ شرط ہے کہ مَنْ صَدَقَ بِقَوْلِهٖ وَ اِعْتَقَادِهٖ وہ اپنے قول میں بھی سچا ہو اور اپنے اعتقاد میں بھی سچا ہو۔ اس نے بے شک سچ بولا مگر اعتقادی لحاظ سے وہ سچائی پر قائم نہیں تھا پس وہ صادق تو ہے مگر صدیق نہیں وَحَقَّقَ صِدْقَهٗ بِفَضْلِهٖ اور پھر اس کا

عمل بھی اس کی قولی اور اعتقادی سچائی کی تائید کر رہا ہو یہ گویا کمال صدیقیت ہوتا ہے۔ پھر لکھا ہے فَالصِّدِّيْقُوْنَ هُمْ قَوْمٌ دُوَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ فِي الْفَضِيْلَةِ یعنی اللہ تعالیٰ کے انعامات جو انبیاء کو حاصل ہوتے ہیں وہ ان سے نیچے اتر کر صدیقین کو حاصل ہوتے ہیں۔ (مفردات)

چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی نسبت یہ لفظ بولا ہے۔ اس لئے لازماً ہمیں اس کے وہی معنے کرنے پڑیں گے جو شان ابراہیمی کے مطابق ہوں اور وہ تیسرے اور چوتھے معنے ہی ہو سکتے ہیں یعنی سچ کی اسے اتنی عادت تھی کہ وہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ سچ اس کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا وہ ایسا راستباز تھا کہ اس کی بات بھی سچی تھی اس کا اعتقاد بھی سچا تھا اور اس کا عمل بھی سچا تھا۔

اس جگہ ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کا حل کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیق نچلا درجہ ہے اور نبوت اس سے بڑا مقام ہے۔ جب کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ نبی ہے تو صدیقیت کے معنے اجمالی طور پر اسی میں آجاتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صِدِّيْقًا نَّبِيًّا کیوں کہا کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ صدیق ہو کر نبی ہو گیا۔ یا وہ صدیق اور نبی ایک وقت میں تھا؟

اس کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ نہ صرف صدیق کا لفظ بلکہ درحقیقت تمام صفات حسنہ اپنے اندر ۲ معنے اور دو استعمال رکھتی ہیں ایک استعمال بطور صفت کے ہوتا ہے ایک استعمال بطور درجہ کے ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کسی شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ کاذب ہے۔ تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جھوٹ اور کذب بیانی کی صفت اس میں پائی جاتی ہے۔ لیکن کبھی کاذب کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس شخص نے جھوٹ اور کذب بیانی کی اتنی عادت ڈال لی ہے کہ کاذب اس کا ایک درجہ اور مقام ہو گیا ہے۔ غرض جتنے بھی صفاتی الفاظ آتے ہیں وہ سب دو رنگ میں استعمال ہوتے ہیں کبھی وہ صفاتی الفاظ صدور فعل پر دلالت کرتے ہیں اور کبھی حصول مقام پر دلالت کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ بھی فعل صادر ہو جائے تو وہ لفظ اس شخص کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ چیز اسے مقام کے طور پر حاصل ہے یا وہ اس چیز کا اتنا عادی ہو چکا ہے کہ یہ اس کی حیثیت ذاتیہ بن گئی ہے جب اس قسم کے الفاظ صفات کے طور پر استعمال ہوں تو ہر بڑے درجہ کے لئے چھوٹا درجہ استعمال ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہر نبی مومن بھی ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (یونس: ۱۰۵) مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ اور مقام مومن کا تھا۔ پس صالح شہید اور صدیق کے الفاظ بطور صفات بھی استعمال ہوتے ہیں اور بطور درجہ بھی جب صفات کے طور پر

استعمال ہوں تو ہر بڑے درجہ کے لئے چھوٹا درجہ استعمال ہوسکتا ہے مثلاً ہر شہید صالح ہے، ہر صدیق صالح اور شہید ہے اور ہر نبی صدیق، شہید اور صالح ہے لیکن جب درجہ کے معنوں میں استعمال ہو تو پھر ہر لفظ اپنے درجہ کے لئے بولا جائے گا دوسرے کے لئے نہیں کیونکہ درجہ کے معنے یہ ہوتے ہیں یہی خصوصیت مسلّمہ اس میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص صدیق کے درجہ کو حاصل کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے صدیقیت کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ ایسی صورت میں شہید کا لفظ اس کے ساتھ درجہ اور مقام کے بیان کے لئے استعمال نہیں کیا جائے گا۔ یا نبی کی اہم حیثیت چونکہ نبوت کی ہوتی ہے اور یہی اس کا مقام ہوتا ہے اس لئے جب اس کے مقام کا اظہار کیا جائے گا تو صرف نبی کا لفظ استعمال کیا جائے گا نبی کے ساتھ صدیق کا لفظ استعمال نہیں کیا جائے گا کیونکہ نبوت کا درجہ صدیقیت کے مقام پر مشتمل ہوتا ہے پس جب کسی بڑے درجہ کے ساتھ چھوٹا درجہ استعمال کیا جائے تو وہ درجہ اور مقام کے بیان کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ صفت بیان کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ اس جگہ بھی صدیق کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ مقام صدیقیت حاصل کرنے والا تھا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ ہمارا نبی تھا جس کی صفات میں سے ایک اہم صفت یہ تھی کہ وہ سچ بولنے میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھا پس یہاں صدیق سے مراد درجہ نہیں بلکہ راستبازی کا اعلیٰ نمونہ مراد ہے۔

ابراہیمؑ کون شخص تھا اور کیوں یہاں ابراہیمؑ کا ذکر کیا گیا؟ یہ ایک سوال ہے جو طبعی طور پر پیدا ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سورۃ میں پہلے زکریاؑ کا ذکر کیا گیا۔ پھر یحییٰؑ کا ذکر کیا گیا۔ پھر مسیحؑ کا ذکر کیا گیا اور مسیحؑ کے بعد اب ابراہیمؑ کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ ابراہیمؑ کے بعد اسحاقؑ یعقوبؑ اور موسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر اسمٰعیلؑ کا ذکر کیا گیا ہے عیسائی کہتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انبیاء کا آگے پیچھے ذکر اس لئے کیا ہے کہ انہیں پتہ نہیں تھا کہ پہلے کون نبی ہوا ہے اور بعد میں کون نبی آیا تھا۔ چنانچہ اسی لئے انہوں نے مسیحؑ کے بعد ابراہیم کا ذکر کر دیا۔ حالانکہ حضرت ابراہیمؑ بہت پہلے گذرے تھے اور موسیٰؑ کے بعد اسمٰعیلؑ کا ذکر کر دیا حالانکہ موسیٰؑ بعد میں ہوئے ہیں اور اسماعیلؑ پہلے گذر چکے تھے (تفسیر القرآن از وہیری)۔ پس ان کے نزدیک اس آگے پیچھے ذکر کی وجہ یہ ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم نہیں تھا کہ کونسا نبی پہلے گذرا ہے اور کونسا نبی بعد میں آیا ہے۔ حالانکہ جس ترتیب سے انبیاء گذرے ہیں قرآن کریم نے اس ترتیب کے ساتھ ہی ان کو بیان کیا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن کریم کو نبیوں کی تاریخ کا علم تھا بلکہ خود بعض یوروپین مصنفین نے لکھا ہے کہ یہ کہنا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم نہیں تھا کہ انبیاء کس ترتیب سے آئے ہیں غلط ہے۔ قرآن کریم نے اس ترتیب سے بھی انبیاء کا ذکر کیا ہے جس

ترتیب کے ساتھ وہ آئے ہیں پس اگر کسی جگہ قرآن کریم نے اس ترتیب سے اختلاف کیا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی اور وجہ ہوگی گویا عیسائیوں کے اعتراض کو انہوں نے خود ہی رد کر دیا ہے اور کہا ہے کہ جہاں قرآن کریم انبیاء کا تاریخی طور پر ذکر کرتا ہے وہاں اسی ترتیب سے ذکر کرتا ہے جس ترتیب سے وہ دنیا میں آئے ہیں اور جہاں اس نے آگے پیچھے ذکر کیا ہے وہاں اس کا کوئی اور مقصد ہوگا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبیوں کی تاریخ کا علم نہیں تھا۔

میرے نزدیک حضرت مسیحؑ کے ذکر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسیحیت اپنے آپ کو شاخ قرار دیتی ہے موسویت کی اور موسویت اپنے آپ کو کڑی قرار دیتی ہے ابراہیمی سلسلہ کی گویا مسیحؑ کا تعلق آخر ابراہیمؑ سے جا کر ثابت ہوتا ہے اور یہی بات ہمیں انجیل بتاتی ہے چنانچہ انجیل میں کہیں ابراہیمی تخت کا حضرت مسیح کو وارث بتایا گیا ہے اور کہیں داؤدی تخت کا اس کو وارث بتایا گیا ہے (لوقا باب ۱ آیت ۳۲)۔ پس مسیحؑ کی صداقت جب بھی زیر بحث آئے گی ابراہیم کا ذکر ضرور کیا جائے گا کیونکہ جب مسیحیت ابراہیمی سلسلہ کی ایک شاخ ہے اور جڑ یہ ثابت کرتی ہو کہ خدا ایک ہے اور شاخ یہ کہتی ہو کہ خدا دو یا تین ہیں تو لازماً ہمیں ماننا پڑے گا کہ شاخ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ غلط ہے جب بانی سلسلہ موسویہ یا بانی سلسلہ اسرائیلی شرک کا دشمن تھا تو اس کی نسل کا ایک فرد شرک کو قائم کرنے والا کس طرح ہوسکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پہلے زکریا کا ذکر کیا جو یحییٰ کے والد تھے پھر یحییٰؑ کا ذکر کیا جو مسیحؑ کے لئے ارہاص کے طور پر آئے تھے پھر مسیح کا ذکر کیا اور اس بات کے دلائل دیئے کہ وہ ہمارا موحد بندہ تھا۔ اس نے شرک کی تعلیم نہیں دی بلکہ ہمیشہ خدائے واحد کی پرستش کی تاکید کی ہے۔ اب فرماتا ہے ہم تمہارے سامنے ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں تم کہتے ہو کہ مسیح کے اندر خدائی پائی جاتی تھی اور مسیح دنیا کا آخری نجات دہندہ تھا، اس کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا ہم تمہیں ابراہیم کی طرف لے چلتے ہیں اور تمہیں بتاتے ہیں کہ وہ ایک خدا مانتا تھا اور شرک کا شدید ترین دشمن تھا اور تم سمجھ سکتے ہو کہ جب جڑ ایک بات کا انکار کرتی ہو تو شاخ کس طرح کہہ سکتی ہے کہ میرے اندر وہ بات پائی جاتی ہے پس یہ ایک طبعی ترتیب ہے جس کے ماتحت خدا تعالیٰ نے مسیح کا ذکر کرنے کے بعد ابراہیم کا ذکر کیا اور عیسائی قوم کو اس طرف توجہ دلائی کہ تم سوچو کہ ابراہیم کیا کہتا ہے ابراہیم کا کام بائبل میں دیکھو اس نے جو تعلیم دی ہے اس کو پڑھو اور پھر غور کرو کہ وہ باتیں جو تم کہتے ہو کہ مسیح نے کہی ہیں کیا وہ ابراہیم کی باتوں سے ملتی ہیں یا وہ اس کے خلاف ہیں اگر وہ اس کے خلاف ہیں تو معلوم ہوا کہ وہی باتیں مسیح کے متعلق سچ ہیں جو ہم مسیح کے متعلق کہتے ہیں پس مسیح کے بعد ابراہیم کا ذکر قابل اعتراض نہیں بلکہ طبعی ترتیب یہی تھی کہ ابراہیم کا ذکر کیا جاتا اور یہ ترتیب

دو وجوہ سے اختیار کی گئی ہے۔

اول یہ بتانے کے لئے کہ بانی سلسلہ موسویہ یا اسرائیلی شرک کا دشمن تھا۔ پھر اس کی نسل کا ایک فرد شرک کا قائم کرنے والا کس طرح ہوسکتا ہے۔

دوم یہ بتانے کے لئے کہ ابراہیمؑ نے دو بیٹوں کے متعلق خبر دی تھی ایک اسحاق کی جس میں سے موسیٰ نے سلسلہ کی بنیاد رکھی دوسرے اسماعیل کی موسوی سلسلہ کو کبھی ختم ہونا چاہیے تھا تا کہ اسماعیلی سلسلہ کے وعدے شروع ہوتے۔ پس مسیح کی آمد سے جو بغیر باپ کے تھا اسرائیلی سلسلہ ختم ہوا تا کہ اسماعیلی سلسلہ شروع ہو اسی وجہ سے اس سورۃ میں پہلے زکریا کا ذکر کیا جو مسیح کے لئے بطور ارہاص آنے والے وجود کے والد تھے۔ پھر حضرت یحییٰ کا ذکر کیا کیونکہ وہ مسیح کے لئے بطور ارہاص آئے تھے پھر مسیح کا ذکر کیا اور اس بات کے دلائل دئے کہ وہ خدا تعالیٰ کی توحید کے قائل تھے اس کے بعد ابراہیم کا ذکر کیا اور بتایا کہ جب مسیحیت ایک شاخ ہے ابراہیمی سلسلہ کی تو تم سوچو کہ کیا یہ شرک کی تعلیم جڑ میں بھی پائی جاتی تھی یا نہیں جب ابراہیم جس کی تم ایک شاخ ہو موحد تھا تو اس کی نسل کا ایک فرد شرک کو قائم کرنے والا کس طرح ہو گیا اس کے بعد اسحاق اور یعقوب اور موسیٰ کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ وعدے جو اسحاق کے ساتھ کئے گئے تھے پورے ہو گئے اور تمہارا سلسلہ ختم ہو گیا اب ہم تمہیں ان وعدوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو ابراہیم کے دوسرے بیٹے اسماعیل کے متعلق کئے گئے تھے اور تمہیں بتاتے ہیں کہ انہی وعدوں کے مطابق اسماعیل کی نسل میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے ہیں پھر تمہیں ان پر کیا اعتراض ہے اگر اوپر کا مضمون مدنظر نہ ہوتا تو اس ترتیب کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ کیونکہ مسیح کے بعد ابراہیم نہ تھے اور موسیٰ کے بعد اسماعیل نہ تھے پس مسیح کے بعد ابراہیم پھر موسیٰ اور پھر اسماعیل کی طرف چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ اس جگہ وہی مضمون مراد ہے جو میں نے بیان کیا ہے دوسرا کوئی مضمون اس جگہ مراد نہیں انبیاء کی ترتیب کے بارہ میں یہ وہ علم ہے جو خدا تعالیٰ نے صرف مجھے ہی عطا فرمایا ہے چنانچہ تیرہ سو سال میں جس قدر تفاسیر لکھی گئی ہیں ان میں سے کسی تفسیر میں بھی یہ مضمون بیان نہیں کیا گیا اور کوئی نہیں بتاتا کہ نبیوں کا ذکر کرتے وقت یہ عجیب ترتیب کیوں اختیار کی گئی ہے صرف مجھ پر خدا تعالیٰ نے اس نکتہ کو کھولا ہے جس سے اس ترتیب کی حکمت اور اہمیت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

بائبل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام ابرام آتا ہے اور لکھا ہے کہ

’’جب ابرام ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابرام کو نظر آیا اور اس سے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے

نہایت بڑھاؤں گا تب ابرام منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہمکلام ہو کر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں میرا عہد تیرے ساتھ ہے اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابراہام ہوگا۔ کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا۔'' (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱ تا ۵)

انسائیکلو پیڈیا ببلیکا میں لکھا ہے کہ ابراہام کے کوئی معنے نہیں۔ صرف ضلع جگت کے طور پر ابرام کو ابراہام کہہ دیا گیا ہے (زیر لفظ Abraham) ضلع جگت کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایک لفظ سن کر اسی کے مشابہ کوئی اور لفظ اس سے نکال لیا جائے مثلاً تاش کا ایک پتہ اینٹ ہوتا ہے اور ایک پتے کا نام پان ہوتا ہے۔ فرض کرو دو شخص آپس میں تاش کھیل رہے ہیں اور ایک نے اینٹ کا پتہ پھینکا ہے دوسرا کہتا ہے ''گلوری کھائیں گے'' اور یہ کہہ کر وہ پان کا پتہ پھینک دیتا ہے اس کو ضلع جگت کہیں گے یعنی لفظ سے لفظ کی طرف اشارہ کرنا یعنی وہ پان کے پتہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے اسی کے مشابہ ایک اور لفظ اس سے نکال لیتا ہے اور کہتا ہے ''گلوری کھائیں گے'' اسی طرح انسائیکلو پیڈیا ببلیکا والا لکھتا ہے کہ ابرام سے ابراہام بھی ضلع جگت کے طور پر کر دیا گیا ہے پہلے ابرام نام تھا پھر کہہ دیا کہ اب چونکہ تو بڑا ہو گیا ہے اس لئے تو ابرام نہیں بلکہ ابراہام ہوگا ورنہ اس کے معنے کوئی نہیں مگر یہ درست نہیں حقیقت یہ ہے کہ عربی اور عبرانی زبانیں آپس میں بہت حد تک ملتی ہیں صرف فرق یہ ہے کہ عبرانی زبان کئی سو سال تک بولی نہیں گئی اور بوجہ اس کے کہ وہ بولی نہیں گئی لوگ اس زبان کی باریکیاں بھول گئے ہیں لیکن عربی زبان ہمیشہ بولی جاتی رہی ہے اور اس وجہ سے عربی زبان کے الفاظ کی باریکیاں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں اگر لوگ عبرانی کو نہ بھولتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ عبرانی زبان عربی میں سے ہی نکلی ہوئی ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لو کہ عبرانی زبان عربی کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے مثلاً حضرت مسیح کا یہ فقرہ کہ ایلی ایلی لما سبقتانی (متی باب ۲۷ آیت ۴۶)۔ یہ عربی سے کتنا مشابہ ہے سَبَقْتَنِیْ عربی زبان کا لفظ ہے جسے عبرانی میں ذرا لمبا کر کے سبقتانی بنا دیا گیا ہے اور ایل بھی عربی زبان کا ہی لفظ ہے جو خدا کے لئے استعمال ہوتا ہے اور لِمَا دراصل لِمَ ہے پس جبکہ عربی اور عبرانی آپس میں اتنی ملتی ہیں تو ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا عربی زبان میں بھی اس کے کوئی معنے پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں اَبْرَمَ کے معنے بات کو پکا کرنے کے ہوتے ہیں چنانچہ اَبْرَمَ الْکَلَامَ کے معنے ہوتے ہیں اَحْکَمَہٗ اس نے کلام کو خوب پکا کیا اور اَبْرَمَ عَلَیْہِ فِی الْجِدَالِ کے معنے ہوتے ہیں اَلَحَّ قَاصِدًا اِفْحَامَہٗ (اقرب) اس نے بات کو خوب پکا کیا اور نہایت عمدگی سے بحث کی جس میں اس نے غرض یہ رکھی کہ دوسرا سمجھ جائے یعنی اس کا مقصد اسکاتِ خصم نہیں تھا بلکہ اسے سمجھانا مراد تھا پس ابرام کے معنے ہوئے ایسی عمدہ بات کرنے والا

اور ایسی اچھی بحث کرنے والا جو دوسرے کو اپنا مافی الضمیر اچھی طرح سمجھا دے اور اسے ساکت کر دے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے انبیاء کے جو نام رکھے جاتے ہیں وہ ان کی آئندہ زندگی کے کاموں کی طرف اشارہ کرنے والے ہوتے ہیں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نام رکھنے والے مومن نہیں ہوتے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ تعالیٰ نے نہیں رکھا بلکہ آپ کے دادا نے رکھا اور آپ کی والدہ نے اس نام کو پسند کیا لیکن ان کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ نے تصرف کیا۔ اور اس نے ان سے وہی نام رکھوایا جو پیشگوئیوں میں موجود تھا یہی حال دوسرے نبیوں کے ناموں کا ہے۔ مثلاً اسحاق ضحک سے ہے اس میں یہ اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ بڑا ہنسوڑ اور خوش مزاج ہوگا۔ چنانچہ بائبل میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق کی پیدائش کی خوشخبری دی گئی تو ''سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہوسکتی ہے حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے۔'' (پیدائش باب ۱۸ آیت ۱۲)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس نام کا ہنسنے کے ساتھ تعلق ہے لیکن چونکہ بائبل کے لکھنے والے لغت کے واقف نہیں تھے انہوں نے اضحاک کی بجائے اضحاق لکھ دیا لیکن عربی میں وہی معرّب کر کے استعمال ہوگیا۔

اسی طرح اسماعیل سَمِعَ سے ہے اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا اس کی دعا کو سنے گا چنانچہ حضرت اسماعیل نے پیر مارے اور چشمہ پھوٹ پڑا اب بظاہر یہ ویسے ہی نام تھے جیسے اور لوگوں کے نام ہوتے ہیں مگر یہ وہ نام تھے جو الہاماً رکھے گئے اور خاص مقصد اور مدعا کے ماتحت رکھے گئے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام بے شک الہام سے نہیں رکھا گیا ماں باپ نے آپ کا نام رکھا تھا مگر ان کی زبانوں پر خدا نے تصرف کیا اور اس نے ان سے وہی نام رکھوایا جس کا پیشگوئیوں میں ذکر آتا تھا اسی طرح ابراہیم کا باپ یا چچا بے شک مشرک تھا مگر جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام الٰہی تصرف کے ماتحت رکھا گیا اسی طرح خدا تعالیٰ نے ابراہیم کے باپ کی زبان پر بھی تصرف کیا اور اس نے وہی نام رکھا جو ان کی آئندہ زندگی کا ایک اجمالی نقشہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق میں پیدا ہوئے تھے جو عرب کا ایک حصہ ہے اور وہاں عربی زبان ہی بولی جاتی تھی۔ عبرانی تو عربی سے بگڑ کر بنی ہے پس خدا نے آپ کا نام آپ کے باپ سے ابرام رکھوایا جس میں یہ پیشگوئی مخفی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو بڑی اچھی بحث کرنے کی توفیق دے گا اور صداقت کے اظہار کے لئے یہ اپنے مدِ مقابل کے سامنے اس عمدگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرے گا کہ وہ ساکت اور لاجواب ہو کر رہ جائے گا چنانچہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جو واقعات بتائے گئے ہیں ان سے ابراہیم کی یہی صفت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک موقعہ پر آپ نے

بادشاہ سے بحث کی اور سورج کے طلوع وغروب سے استدلال کیا تو قرآن کریم کہتا ہے کہ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ (البقرۃ:۲۵۹) وہ کافر بادشاہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اور آپ کے دلائل کا کچھ بھی جوب نہ دے سکا اسی طرح ستاروں۔ چاند اور سورج کے نظام سے آپ نے خدائے قادر کی ذات پر استدلال کیا اور مشرکین کے سامنے دلیلیں دیں تو وہ گھبرا اٹھے بت توڑے تو ایسی دلیلیں دیں کہ وہ لاجواب ہو کر رہ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اس شخص نے ہمارے مذہب کا ستیاناس کر دیا ہے۔

یہودی روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بچپن سے ہی بڑی عمدہ بحث کرنے کے عادی تھے چنانچہ انہی روایات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ باپ نے انہیں دوکان پر بٹھا دیا کہ اگر کوئی بت خریدنے کے لئے آئے تو اسے بت دے دینا ابھی تھوڑی دیر ہی گذری تھی کہ ایک بڈھا شخص آیا اور اس نے کہا میں کوئی بت خریدنا چاہتا ہوں انہوں نے پوچھا کونسا بت لیں گے اس نے ایک بت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ فلاں بت مجھے چاہیے وہ اٹھے اور بت لا کر اس کے سامنے رکھ دیا اور پھر پوچھا کہ آپ کی عمر کیا ہے اس نے کہا میری عمر ستر سال کی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا یہ بت تو ابھی کل ہی بن کر آیا ہے اور آپ ستر سال کے ہو چکے ہیں کیا اتنی بڑی عمر کے ہو کر آپ کو شرم نہیں آئے گی کہ اس بت کے آگے سر جھکائیں جو ابھی کل ہی بن کر آیا ہے (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Abram) اس بڑھے پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ وہ اس بت کو وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ جب ان کے بھائیوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے باپ سے شکایت کی کہ یہ تو ہمارے گاہک خراب کرتا ہے۔ باپ نے حضرت ابراہیمؑ سے پوچھا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے یہ بت تو ابھی کل بن کر آیا تھا۔ کیا وہ بڈھا اس بت کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے اچھا لگ سکتا تھا؟ تو صداقت کی تائید کے لئے دلائل پیش کرنا اور اپنے مخالف سے نہایت عمدہ بحث کرنا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا ایک نمایاں وصف ہے۔ قرآن کریم پڑھ کر دیکھ لو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور بائبل پڑھ کر دیکھ لو تو اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم اعلیٰ درجہ کی بحث کرنے والا تھا۔ اور وہ اپنے مخالف کو چپ کرا دیتا تھا۔ پس ابراہیم بے معنی نام نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ بڑی عمدہ بحث کرنے والا ہوگا نہایت اعلیٰ درجہ کے دلائل پیش کرنے والا ہوگا اور ایسی باتیں کرے گا جن سے دوسرا شخص حقیقت کو سمجھ جائے گا جیسے اس بڈھے سے آپ نے گفتگو کی تو پھر وہ ٹھہر انہیں بلکہ اسی وقت بت چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور اس نے سمجھ لیا کہ میرا اس کے آگے سر جھکانا درست نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عبرانی زبان میں بھی اس کے یہی معنے ہوں گے اور خدا تعالیٰ نے ابرام اسی لئے ان کا نام رکھوایا تا کہ یہ بتائے کہ یہ بڑی بحث کرنے والا ہوگا مگر عبرانی زبان کا علم کم ہو جانے کی وجہ سے اسرائیلی علماء کو دھوکا لگا اور انہوں نے خیال

کرلیا کہ یہ بے معنی لفظ ہے حالانکہ ابرام سے ابرہام میں تبدیلی کی وجہ خود بائبل نے بھی بتادی ہے کہ چونکہ تو ’’بہت قوموں کا باپ‘‘ ہوگا۔ اس لئے آئندہ تیرا نام ابرام ایک فرد نہیں ہوگا بلکہ ابراہام ہوگا اور یہ عبرانی کا قاعدہ ہے کہ ھا لگانے سے جمع بن جاتی ہے گویا وہ ایک فرد نہ رہا بلکہ بہت سے افراد کا مجموعی ہوگیا۔ قرآن کریم نے بھی فرمایا ہے کہ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً (النحل:۱۲۱) ابراہیم ایک امت تھا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ وہ ابرام سے ابراہام بن گیا تھا گویا جو بات قرآن کریم نے بیان کی ہے وہی بات بائبل بھی بیان کرتی ہے مگر یہ جاہل لوگ جن کی زبان مٹ چکی ہے کہتے ہیں کہ ابرام کو ابراہام محض قافیہ بندی کے طور پر کہہ دیا گیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ذومعانی لفظ ہے اور بہت بڑی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ تو ایک مشرک نے نام رکھا تھا یہ کوئی دلیل نہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خدا نے نہیں رکھا لیکن اس نے نام رکھنے والوں کی زبانوں پر تصرف کر دیا۔ اور چاہے کوئی سچے مذہب کو نہ مانے اس حقیقت سے تو انکار نہیں کرسکتا کہ ہر چیز خدا تعالیٰ کے تصرف کے ماتحت ہے۔ اگر درخت خدا تعالیٰ کے تصرف کے نیچے ہیں۔ اگر آم کی گٹھلی خدا تعالیٰ کے تصرف کے نیچے ہے اگر خربوزہ کی بیل خدا تعالیٰ کے تصرف کے نیچے ہے تو ابراہیم کا باپ کیوں خدا تعالیٰ کے تصرف کے نیچے نہیں تھا اور کیوں وہ اس سے ایسا نام نہیں رکھوا سکتا تھا جس میں ابراہیم کی آئندہ زندگی کے کارناموں کی طرف اشارہ ہوتا۔ پھر ابرام سے ابراہام اس لئے بنا کہ عبرانی زبان کا قاعدہ ہے کہ ھا لگانے سے جمع بنتی ہے اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ھا میں بھی اس کے مشابہ خصوصیت ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں ھم جمع کے لئے آتا ہے پس یہ خیال کہ اس لفظ کے کوئی معنے نہیں اور ابرام کو ابراہام صرف ضلع جگت کے طور پر کہہ دیا گیا ہے حقیقت لغت کے نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

بائبل سے پتہ لگتا ہے کہ ابراہیم اُور کے رہنے والے تھے جو چلڈیا کا ایک شہر تھا یعنی وہ عراق میں پیدا ہوئے۔ ان کی قوم ستارہ پرست تھی ان کے والد کا نام تارہ تھا قرآن کریم نے سورۂ انعام میں ان کا نام آزر بتایا ہے (الانعام:۷۵) لیکن یہ تعجب کی بات نہیں ابراہام کو ابراہیم یسوع کو عیسیٰ حنوک کو ادریس اور یوحنا کو یحییٰ لکھنا اگر اعتراض کی بات نہیں تو تارہ کو آزر کہنا بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہوسکتی یہ صرف ان کے ناموں کو عربی بنانے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ وہی نام استعمال کرتا ہے جو عربوں کی زبان سے آسانی کے ساتھ ادا ہوسکیں اور یا پھر قرآن مجید اصل نام کا ترجمہ کرلیتا ہے جیسے حنوک کے جو معنے ہیں وہی معنے ادریس کے ہیں پس ہوسکتا ہے کہ تارہ سے قرآن نے آزر بنالیا ہو کیونکہ **ت**، **ز** سے بدل جاتی ہے۔ اور قلب کے ذریعہ الف پہلے آجاتا ہے اور اس طرح آزر بن جاتا ہے **ہ** ادب کے لئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی زبان پر تارہ نہیں چڑھتا تھا

انہوں نے تارہ کو زارَ کہنا شروع کر دیا اور زارَ سے آزَر بن گیا۔ اور یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آزران کے کسی اور عزیز کا نام ہو بہر حال قرآن کریم چونکہ معرب نام استعمال کرتا ہے اس لئے تارہ کی بجائے آزر ہونا کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تارہ اور آزر آپس میں معنوی اشتراک رکھتے ہوں ہمیں چونکہ تارہ کے معنے معلوم نہیں اس لئے ہم اس بارہ میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن ممکن ہے اگر تحقیق کی جائے تو تارہ اور آزر آپس میں معنوی اشتراک بھی رکھتے ہوں۔ بہر حال آزر ایک معرب نام ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو اپنے والد سے اختلاف ہوا تو وہ اسے چھوڑ کر مصر چلے گئے اور وہاں سے پھر واپس کنعان آگئے (جیوش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Abram) حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کو اصرار تھا کہ آزران کے باپ کا نہیں بلکہ چچا کا نام تھا اور باپ فوت ہو چکا تھا۔ بعض یہودی روایات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ یتیم تھے۔ اَبٌ کے متعلق آپ قرآن کریم سے استدلال کرتے تھے کہ چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے چنانچہ ابناء یعقوب کے متعلق سورۂ بقرہ میں آتا ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ تم کس کی عبادت کروگے تو انہوں نے کہا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (البقرۃ: ۱۳۴) اس میں اسمٰعیل کو بھی انہوں نے اپنا اَبٌ قرار دیا ہے حالانکہ وہ ان کے چچا تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں اَبٌ کا لفظ چچا کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے یہ سب کچھ درست ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ہے؟ حضرت خلیفہ اولؓ کے اس خیال کی بڑی بنیاد یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنا بڑا مشرک ابراہیم کا باپ کس طرح ہو گیا یہ ایک ذوقی بات ہے۔ ہو تو حرج نہیں، نہ ہو تو حرج نہیں اصل میں ہمیں تاریخ پر بنیاد رکھنی چاہیے جو اس بارہ میں زیادہ تر اس شخص کے باپ ہونے پر ہی دلالت کرتی ہے باقی رہا نام کا سوال سو قرآن عربی شکل میں نام دیتا ہے یا معنوں کا ترجمہ کرتا ہے پس بائبل کے تارہ اور قرآن کے آزر کا فرق قرآن کے بیان کو غلط نہیں بناتا کہ ہمیں ان دو کو الگ الگ ہستیاں ثابت کرنے کی ضرورت ہو۔

ابراہیم روحانی عالم کا باپ تھا اور آئندہ اصلاح اس کی ذریت کے ساتھ خواہ جسمانی ہو خواہ روحانی مخصوص کی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ (العنکبوت: ۲۸) یعنی ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کئے اور اس کی ذریت میں ہم نے نبوت اور کتاب رکھ دی۔ گویا یہ وعدہ کیا کہ آئندہ نبی ابراہیم کی اولاد میں سے آئیں گے بائبل میں بھی اسحاق کے متعلق پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۵ تا ۱۸ میں وعدہ کیا گیا ہے کہ اس کی نسل کو ترقی دی جائے گی اور زمین کی سب قومیں اس سے برکت پائیں

گی اسی طرح اسماعیل کے متعلق پیدائش باب ۲۱ آیت ۱۳ و ۱۸ میں لکھا ہے۔

''اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کروں گا اس لئے کہ وہ تیری نسل ہے'' (آیت ۱۳)

اسی طرح لکھا ہے۔

''خدا کے فرشتہ نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے اُٹھ اور لڑکے کو اُٹھا اور اُسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا'' (آیت ۱۸)

اس سے پتہ لگتا ہے کہ عہد صرف ایک بیٹے کے متعلق نہیں تھا بلکہ دونوں کے متعلق تھا۔ اسی طرح پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۹ تا ۲۲ میں لکھا ہے

''تب خدا نے فرمایا کہ بے شک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہوگا تو اس کا نام اضحاق رکھنا اور میں اس سے اور پھر اس کی اولاد سے اپنا عہد جو اَبدی عہد ہے باندھوں گا اور اسماعیل کے حق میں بھی میں نے تیری دعا سُنی ۔ دیکھو میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا لیکن میں اپنا عہد اضحاق سے باندھوں گا جو اگلے سال اسی وقت معین پر سارہ سے پیدا ہوگا اور جب خدا ابراہام سے باتیں کر چکا تو اس کے پاس سے اوپر چلا گیا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ دونوں کے متعلق یہ عہد تھا کہ انہیں برکت دی جائے گی مگر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ کا عہد پہلے اسحاق کے ذریعہ سے پورا ہوگا اور پھر اسماعیل کے ذریعہ سے۔

پیدائش باب ۱۷ آیت ۷ و ۸ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ عہد دونوں بیٹوں کے لئے تھا چنانچہ لکھا ہے۔

''میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لئے اپنا عہد جو اَبدی عہد ہوگا باندھوں گا تا کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے اور میں ان کا خدا ہوں گا''

اس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عہد صرف بنو اسحاق کے ساتھ نہیں تھا بلکہ ابراہیم کی ساری نسل اور ان کی سب

پشتوں کے ساتھ تھا صرف اس قدر تصریح کر دی گئی تھی کہ اس کے وعدے پہلے بنو اسحاق کے ساتھ پورے ہوں گے اور پھر بنو اسمٰعیل کے ساتھ پس موسیٰ کا سلسلہ کبھی ختم ہونا چاہیے تھا۔ تا کہ بنو اسماعیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جو وعدے تھے وہ بھی پورے ہوتے۔

اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا ملک دوں گا۔ اگر کنعان کی حکومت کبھی مسلمانوں کے پاس نہ آئی ہوتی تو عیسائی کہہ سکتے تھے کہ اسحاق کی نسل کو تو کنعان کی حکومت ملی لیکن مسلمان اس سے محروم رہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ کنعان جتنا عرصہ مسلمانوں کے پاس رہا ہے اس سے کم عرصہ یہود کے پاس رہا ہے فلسطین پر یہود کا موجودہ قبضہ ۱۳۶۷ھ میں ہوا ہے ۱۶ ہجری میں مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کیا تھا اور اس وقت سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمان اس پر قابض رہے ہیں صرف حروب صلیبیہ کے زمانہ میں باون سال عیسائی پھر اس پر قابض ہو گئے تھے بہرحال ایک سو آٹھ سال اگر نکال بھی دئے جائیں تو ۱۲۵۹ سال مسلمان کنعان پر قابض رہے ہیں اس کے مقابلہ میں موسیٰؑ سے مسیحؑ تک کا زمانہ بھی تیرہ سو سال ہے لیکن اس عرصہ میں یہود دو سو سال بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ کنعان کی حکومت سے محروم رہے ہیں ۷۳۳ قبل مسیح میں اسورین حکومت نے فلسطین کو فتح کیا اور یہود کو اپنا باجگذار بنالیا اس کے بعد ۶۰۸ قبل مسیح میں ایک مصری بادشاہ ''نیکو'' نے اسوریوں کو شکست دی اور یہود اسوریوں کی بجائے مصریوں کے باجگذار بن گئے۔

۵۸۷ قبل مسیح میں شاہ بابل نبوکدنضر نے یروشلم پر چڑھائی کی اور اس نے یہود کو جلاوطن کر دیا یہی عرصہ ایک سو چھیالیس سال بن جاتا ہے پھر ستر سال کے قریب وہ عرصہ ہے جس میں یہود جلاوطن رہے اور جس کے بعد میداور فارس کے بادشاہ نے انہیں واپس یروشلم جانے کی اجازت دی گویا یہود ۱۰۸۴ سال کنعان پر قابض رہے اور مسلمان ۱۲۵۹ سال قابض رہے (فتوح للبلدان للبلاذر، امر فلسطین صفحہ ۱۴۴، الکامل فی التاریخ لابن اثیر مجلد ۲ ذکر فتح البیت المقدس صفحہ ۴۹۹، ۲۔ تواریخ باب ۳۵ آیت ۲۰ و ۲۱، ۲۔ سلاطین باب ۲۵ آیت ۸ تا ۱۱، قاموس الکتاب اردو صفحہ ۵۷ و ۵۸، History of Egypt pg 61,69) پس جہاں تک اس پیشگوئی کا تعلق ہے اس نے بھی بتادیا کہ وہ ابراہیمی عہد جو اسحاق کی نسل سے پورا ہونا تھا اب ختم ہو چکا ہے اور کنعان بنو اسحاق کی بجائے خدا تعالیٰ کے سچے دین کے پیروؤں کو دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ پہلے ابراہیمی دور میں موسیٰ سے مسیح تک وہ اس سے تھوڑا عرصہ یہود کے پاس رہا جتنا دوسرے ابراہیمی دور میں وہ مسلمانوں کے پاس رہا۔ اور اب جو واپس ہوگا تو پھر کبھی ان کے ہاتھ سے نہیں جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ مسیح ابراہیمی وعدوں میں سے ایک وعدہ کی آخری کڑی تھا اور ابراہیم موحد تھا پس مسیحؑ کے ذکر کے بعد مورث اعلیٰ کا ذکر کیا۔ تا بتائے کہ اس منبع سے دو دریا نکلنے تھے ایک کا آخری حصہ مسیح تھا اس کے بعد لازماً دوسرے دریا نے اپنا بہاؤ مکمل کرنا تھا پس واپس ابراہیم کا ذکر لا کر اسحاق اور یعقوب اور موسیٰ کا ذکر کیا تا کہ بنی اسرائیل کے سلسلہ کی طرف اشارہ کرے۔

میں بتا چکا ہوں کہ بائبل کے رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اُور میں جو چلڈیا کا ایک شہر تھا پیدا ہوئے یعنی عراق میں ان کی پیدائش ہوئی تھی اور ان کی قوم ستارہ پرست تھی قرآن کریم کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آبٌ یا والد مشرک تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر شرک کی برائی قرآن کریم کی رو سے اپنے باپ کی زندگی میں ہی ظاہر ہو گئی تھی اور وہ ان کو نصیحت کرتے رہتے تھے نصیحت پر وہ خفا ہو گئے اور ان کو دھمکی دی اور غصہ کی شدت دیکھتے ہوئے نصیحت کی کہ کچھ مدت تک کہیں باہر چلے جاؤ اور میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاؤ تا کہ میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے ورنہ ممکن ہے کہ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچا دوں۔ ان کی اس شدید ناراضگی کو دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام اس ملک سے ہجرت کر گئے (الصّٰفٰت:۱۰۰) قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ لوط بھی ان کے ساتھ گئے (العنکبوت:۲۷) اسی طرح حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ بھی ان کے ساتھ تھیں جاتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ یہ وعدہ کر گئے کہ میں آپ کے لئے دعا کروں گا (الممتحنة:۵) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مشرک کے لئے زندگی میں دعا کرنا جائز ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ایسے مشرک کے لئے دعا کرنا جائز ہے جس پر اتمام حجت کی سند نہ ملے جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی والدہ حضرت آمنہ کو مشرکہ قرار دیا ہے لیکن آپ نے ان کے لئے دعا بھی کی۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۳۵۵ بروایت عبد اللہ بن بریدةؓ) وہاں سے جانے کے بعد ان کے گھر میں اولاد پیدا ہوئی پہلے ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی بائبل کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد اُور کلدی سے ہجرت کر کے اور ابراہیم اور لوط کو ساتھ لے کر حران نامی جگہ چلے گئے تھے۔ گویا قرآن کریم تو یہ بتاتا ہے کہ جہاں ان کے والد تھے وہاں سے حضرت براہیم علیہ السلام ہجرت کر کے چلے آئے۔ مگر بائبل بتاتی ہے کہ ان کے والد نے ہی وہ ملک چھوڑ دیا تھا اور ان کا ارادہ کنعان آنے کا تھا لیکن حران پہنچ کر وہ ٹھہر گئے اور وہیں مر گئے۔ (پیدائش باب ۱۱ آیت ۳۱و۳۲)

اس کے بعد پیدائش باب ۱۲ میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیم سے کہا کہ وہ اپنے باپ اور قرابتیوں کو چھوڑ کر نکل چلے تا کہ خدا تعالیٰ تجھے وہ ملک دکھائے جس میں تجھے رہنا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم لوط کو اور اپنی بیوی کو اور نوکروں چاکروں کو لے کر وہاں سے نکلے اور کنعان گئے جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے بتایا کہ یہاں آپ

نے رہنا ہے۔اس کے بعد ملک میں قحط پڑا تو قحط کی تکلیف سے بچنے کے لئے حضرت ابراہیم مصر چلے گئے جہاں بعض ایسے واقعات گزرے جن کے نتیجہ میں حضرت ہاجرہ جو آپ کی دوسری بیوی بنیں وہیں سے آپ کو ملیں اور آپ پھر واپس کنعان آ گئے۔

بائبل اپنے اس بیان میں خاموش ہے کہ ابراہیم کے والد کلدیا سے کیوں نکلے تھے؟ قرآنی بیان سے تو پتہ لگتا ہے کہ صرف ابراہیم نکلے اور اس لئے نکلے کہ ان کا اپنے باپ کے مذہب اور اپنی قوم کے مذہب سے اختلاف تھا اور یہ ایک طبعی بات ہے سوال یہ ہے کہ ابراہیم کے والد کیوں نکلے۔آخر ہر کام کی کوئی وجہ ہوتی ہے مگر بائبل یہ نہیں بتاتی کہ ابراہیم کے ساتھ ان کے والد نے بھی کلدیہ کو کیوں چھوڑ دیا۔

پھر بائبل اس پر بھی خاموش ہے کہ ابراہیم کے والد کنعان کیوں جانا چاہتے تھے حضرت ابراہیم تو کنعان میں اس لئے گئے کہ وہ ان کے لئے اور ان کی آئندہ نسل کے لئے موعود تھا لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ملک جس کا ابراہیم کے لئے وعدہ تھا اس کا ان کے باپ کو کیوں خیال پیدا ہوا اور وہ وہاں کس لئے جانا چاہتے تھے؟

پھر بائبل اس بارہ میں بھی خاموش ہے کہ جب ان کے باپ کنعان جانے کے ارادہ سے نکلے تھے تو حران میں کیوں ٹھہر گئے۔

پھر بائبل کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے کہا کہ تو اپنے باپ اور قبیلے کو چھوڑ کر نکل چل سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ کیوں حکم دیا؟ بائبل بھی یہی کہتی ہے کہ ماں باپ سے حسن سلوک کرنا چاہیے (امثال باب ۲۳ آیت ۲۲ تا ۲۵) اور قرآن کریم بھی یہی کہتا ہے (البقرۃ: ۸۴) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ ان کے والد مشرک تھے (مریم: ۴۳ تا ۴۹)۔لیکن بائبل انہیں مشرک قرار نہیں دیتی اور دوسری طرف یہ بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ اپنے باپ اور قبیلے کو چھوڑ کر نکل چل۔

پھر بائبل یہ تو کہتی ہے کہ اپنے قبیلے کو چھوڑ کر نکل چل لیکن یہ نہیں بتاتی کہ وہ قبیلہ تھا کون سا؟ بائبل کی کتاب پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ اُور کلدی سے تارہ صرف ابراہیم اس کی بیوی اور لوط ہی کو لے کر نکلا تھا (پیدائش باب ۱۱ آیت ۳۱)۔قرآنی بیان کے مطابق حضرت ابراہیم، ان کی بیوی اور لوط اس ہجرت میں شریک تھے ان کا باپ ان کے ساتھ نہیں تھا لیکن اس سے قطع نظر سوال یہ ہے کہ وہ قبیلہ کونسا تھا؟ جس کو چھوڑنے کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا قبیلہ صرف ابراہیم، لوط اور سارہ تھے اور یہ کنعان جاتے وقت بھی ابراہیم کے ساتھ تھے پھر وہ کن کو چھوڑ کر نکلا۔

پس بائبل اول تو یہی نہیں بتاتی کہ باپ جس سے شریعت نے حسن سلوک کا حکم دیا ہے اسے خدا تعالیٰ نے

چھوڑنے کا کیوں حکم دیا۔ پھر یہ نہیں بتاتی۔ کہ وہ قبیلہ کون سا تھا جسے چھونے کا حکم دیا گیا۔صرف چار آدمی تھے جواُور سے نکلے۔ باپ حران میں پہنچ کر فوت ہو گیا تھا۔ پھر وہ کونسے رشتہ دار تھے جنہیں وہ چھوڑ کر نکلا۔

غرض بائبل کا بیان بہت مبہم ہے اوراس کے اندر ایسی کئی باتیں پائی جاتی ہیں جو خلاف عقل نظر آتی ہیں۔

حران شہر کلدی علاقہ اور شام کے درمیان میں تھا جب چلڈیا سے چلیں تو فلسطین کی طرف راستہ میں یہ شہر آتا ہے۔ یہ بڑا بھاری شہر تھا تمام تجارتی قافلے یہاں ٹھہرا کرتے تھے اوراس سے تجارتی دروازہ کہتے تھے اس کے علاوہ یہ مذہبی سنٹر بھی تھا اور یہاں ایک بہت بڑا مندر چاند دیوتا کا تھا۔ وہ لوگ جو چاند کے پرستار تھے وہ اس جگہ آتے اور نذرانے وغیرہ چڑھاتے تھے۔

طالمودی روایات یعنی وہ احادیث جو یہود میں پائی جاتی ہیں وہ بھی قرآنی بیان کی تصدیق کرتی ہیں چنانچہ طالمودی روایات سے پتہ لگتا ہے کہ ابراہیمؑ کا باپ مشرک تھا بلکہ طالمودی روایات بتاتی ہیں کہ وہ اتنا مشرک تھا کہ مشرکانہ عبادت گاہوں کا متولی بھی تھا اسی طرح طالمودی روایات سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بت بھی فروخت کیا کرتا تھا (طالمود صفحہ ۳۵) اوران سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ اس ملک کا بادشاہ بھی بت پرست تھا اور وہ ابراہیم کو جلانے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر آتا ہے۔

بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں تین قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں اول قرآنی روایات دوم بائبل کی روایات سوم طالمودی روایات۔

بائبل کی روایات اتنی مجروح اور غیر معقول ہیں کہ کوئی بات بھی یقین کے ساتھ درست نہیں کہی جاسکتی بائبل اتنا تو بتادیتی ہے کہ ابراہیم کے باپ نے بھی اپنا ملک چھوڑ دیا مگر کوئی وجہ نہیں بتاتی کہ آخر انہوں نے اپنا ملک کیوں چھوڑا لیکن قرآن بتاتا ہے کہ ابراہیم نے ہجرت کی اوراس لئے کی کہ اس کا باپ مشرک تھا اس کی قوم ستارہ پرست تھی اور یہ اختلاف اس قدر ترقی کر گیا کہ آخر حضرت ابراہیم ہجرت پر مجبور ہو گئے پھر بائبل کہتی ہے کہ تارہ نے بھی کنعان جانا چاہا مگر یہ نہیں بتاتی کہ کنعان جانے کا اسے کیوں خیال پیدا ہوا پھر یہ نہیں بتاتی کہ جب کنعان جانے کے ارادہ سے نکلے تھے تو حران میں کیوں ٹھہر گئے اس کے بعد یہ نہیں بتاتی کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے جو یہ کہا کہ تو اپنے باپ اور قبیلہ کو چھوڑ کر نکل چل، تو وہ کونسا قبیلہ تھا جسے انہوں نے چھوڑا۔ لوط اور سارہ تو ان کے ساتھ ہی رہے ہیں اوران کے علاوہ اور رشتہ دار ساتھ تھا نہیں پھر وہ قبیلہ کونسا تھا جسے چھوڑنے کا حکم دیا گیا اسی طرح بائبل یہ بھی نہیں بتاتی کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو یہ کیوں حکم دیا کہ تو اپنے باپ کو چھوڑ دے جبکہ بائبل یہ بھی نہیں بتاتی کہ ان کا باپ

مشرک تھا۔

غرض قرآنی بیان زیادہ صحیح ہے گو اس کا بائبل کی روایت سے اختلاف ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ

(اور تو اس وقت کو بھی یاد کر اور لوگوں کے سامنے بیان کر) جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ اے میرے

وَ لَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا ﴿۴۳﴾

باپ تو کیوں ان (چیزوں) کی پرستش کرتا ہے جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ تیری کسی تکلیف کو دور کرنے پر قادر ہیں۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ابراہیم کے ان واقعات کو یاد کرو جبکہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے اور نہ تیرے لئے کسی چیز کا قائم مقام ہوسکتا ہے۔

اَبَتِ منادیٰ کے طور پر آتا ہے اور تا۔ ی کے قائم مقام ہوتی ہے گویا اَبَتِ اَبِیْ کا قائمقام ہے عرب لوگ یہ دونوں لفظ استعمال کر لیتے ہیں یعنی اَبِیْ بھی کہہ دیتے ہیں اور اَبَتِ بھی کہہ دیتے ہیں مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ جو نہیں سنتا اور نہیں دیکھتا۔

اس سے پتہ لگتا ہے کہ الٰہی صفات میں سے اہم صفات اس کا سننا اور دیکھنا ہے۔ باقی ساری صفات اس کے تابع ہیں اگر سننے اور دیکھنے کی صفت اس میں نہ پائی جائے تو کوئی مشاہدہ والی دلیل خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق نہیں رہ جاتی سب سے بڑی دلیل خدا تعالیٰ کی ہستی کے متعلق یہی ہوتی ہے کہ ہم نے خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ خدایا ہمارا فلاں کام ہوجائے اور وہ کام ہوگیا جس سے پتہ لگ گیا کہ خدا موجود ہے۔ اگر اس کا سننا اور دیکھنا ثابت نہ ہو تو پھر بنی نوع انسان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ کسی غیر سے دو ہی ذریعہ سے تعلق ہوسکتا ہے یا کانوں کے ذریعہ اور یا پھر آنکھوں کے ذریعہ۔ یا تو انسان دوسرے کی آواز سن کر پتہ لگا لیتا ہے کہ اسے کوئی ضرورت درپیش ہے اور وہ اس کی مدد کے لئے پہنچ جاتا ہے اور یا پھر آنکھوں سے دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ فلاں شخص مصیبت میں گرفتار ہے اور وہ اس کی مدد کے لئے بیتاب ہوجاتا ہے پس ایک تعلق رکھنے والا خدا تبھی ہوسکتا ہے جب اس میں سننے اور دیکھنے کی صفت موجود ہو حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کو بتوں کے ناقابل پرستش ہونے کی یہی دلیل دیتے ہیں کہ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ اے میرے باپ تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے جب یہ دونوں

صفات اس میں نہیں پائی جاتیں تو اس کی عبادت کرنے کا فائدہ کیا؟ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا اور نہ وہ کسی بات میں کفایت کرتا ہے مَا اَغْنَى فُلَانٌ شَيْـًٔا کے معنے ہوتے ہیں لَمْ يَنْفَعْ فِيْ مُهِمٍّ وَلَمْ يَكْفُ مَؤُوْنَةً کسی کام میں اس نے نفع نہ پہنچایا اور کسی ضرورت کے موقعہ پر اس نے کفایت نہ کی مثلاً اگر کسی پر قرضہ ہو اور دوسرا شخص وہ قرض اتار دے یا کوئی بیمار ہو اور دوسرا اس کے علاج کے لئے جدوجہد کرے تو وہ اس کا قائم مقام ہو جاتا ہے اور اس کے بوجھ کو ہلکا کرنے کا موجب بن جاتا ہے مگر فرمایا لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا یہ بت تو وہ ہیں جو تیرے لئے کسی قسم کا بوجھ بٹانے کا موجب نہیں ہو سکتے پھر ان کی عبادت کا فائدہ کیا؟ یہ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا دراصل دلیل کا ایک ٹکڑا ہے جو لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ کے ساتھ مل کر مکمل ہوتی ہے اگر کسی شخص کے کان ہوں او وہ دوسرے کی آواز بھی سن لے کہ دوڑو اور میری مدد کے لئے پہنچو لیکن لولا لنگڑا ہو تو خالی سن لینا دوسرے کو کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے یا کیسی نے دیکھ تو لیا کہ فلاں شخص کنوئیں میں گرنے لگا ہے لیکن اتنی ہمت نہیں کہ دوڑ کر اسے بچا سکے تو اس کے دیکھنے کا کیا فائدہ۔ سننا اور دیکھنا تبھی فائدہ پہنچا سکتا ہے جب دوسرے کی مدد کرنے کی طاقت بھی موجود ہو پس لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ والی دلیل لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا کے ساتھ مل کر مکمل ہوتی ہے کیونکہ کسی کی تکلیف معلوم کرنے کے دو ہی ذرائع ہوتے ہیں۔ یا تو انسان سن کر پتہ لگا تا ہے یا دیکھ کر پتہ لگا تا ہے لیکن دیکھنا اور سننا کافی نہیں ہوتا جب تک ایسی طاقت بھی موجود نہ ہو کہ دوسرے کی مدد کا ارادہ انسان پورا کر سکے جب وہ ایسا کر لے تو اس کی دوستی کی زنجیر مکمل ہو جاتی ہے مگر فرمایا یہ بت تو ایسے ہیں کہ نہ یہ تمہاری آوار سنتے ہیں نہ تمہاری تکلیف کو دیکھتے ہیں اور نہ یہ کسی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں پھر ان کی عبادت کرنا کتنی بڑی حماقت کی بات ہے۔

یہاں کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ وہ کیوں نہیں سنتے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ سنتے ہیں۔ کیوں نہیں دیکھتے ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ دیکھتے ہیں اگر یہ بت دیکھتے اور سنتے نہیں تو تمہارے خدا کے دیکھنے اور سننے کا کیا ثبوت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے خدا کے سننے کا ثبوت یہ ہے کہ ہم اسے پکارتے ہیں تو وہ ہمیں جواب دیتا ہے۔ اور اس کے دیکھنے کا ثبوت یہ ہے کہ ہم مصیبت میں مبتلا ہوتے ہیں تو وہ ہماری مدد کرتا ہے پس اس کا ہماری مدد کرنا اور ضروریات کو پورا کرنا ثبوت ہے اس کے سمع اور بصر کا لیکن بت چونکہ کوئی ضرورت پوری نہیں کرتے اور وہ کسی تکلیف کے موقعہ پر انسان کی مدد نہیں کرتے اس لئے یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ سمع اور بصر نہیں رکھتے۔ ورنہ یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ ان کے کانوں تک بات پہنچے وہ اپنی آنکھوں سے کوئی نظارہ دیکھیں اور پھر مدد نہ کریں۔

حدیثوں میں آتا ہے ایک صحابی کہتے ہیں میرے مسلمان ہونے کی وجہ ہی یہ ہوئی کہ ہم جاہلیت کے زمانہ میں

بتوں کے اس قدر شائق ہوا کرتے تھے کہ جب ہم گھر سے باہر کسی سفر پر جاتے تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی بت بھی رکھ لیتے تھے تا کہ اس کی برکت سے بلائیں اور مصیبتیں ہم سے دور رہیں ایک دفعہ میں سفر پر گیا اور بت اپنے ساتھ لے لیا راستہ میں اتفاقاً مجھے کوئی کام یاد آ گیا اور میں نے کہیں جانا چاہا۔ مگر اسباب میرے پاس بہت تھا اور کسی دوسری جگہ اسے اٹھا کر لے جانا میرے لئے مشکل تھا میں نے وہیں جنگل میں اسباب رکھا بت کو پاس بٹھایا اور اسے کہا حضور والا آپ ذرا میرے اسباب کا خیال رکھیں میں ایک ضروری کام کے لئے جا رہا ہوں چنانچہ میں اطمینان کے ساتھ خوش خوش چلا گیا کہ میں اپنا اسباب اللہ میاں کے سپرد کر آیا ہوں واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک گیدڑ ٹانگ اٹھا کر اس بت پر پیشاب کر رہا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت غصہ آیا اور میں نے آتے ہی اس بت کو اٹھا کر پرے پھینک دیا اور کہا کمبخت گیدڑ کے پیشاب سے تو تو اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا میرے اسباب کو کیا بچائے گا اس وقت مجھے خیال آیا کہ مسلمان جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک ہے اور میں واپس آ کر مسلمان ہو گیا۔

اسی طرح ایک اور صحابی کہتے ہیں کہ ہم ایک دفعہ سفر پر گئے تو میں نے خیال کیا کہ پتھر کا بت اٹھانا تو مشکل ہوگا اسباب بھی زیادہ ہے۔ آٹے کا بت بنا کر ساتھ رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے آٹے کا بت بنایا اور ساتھ رکھ لیا اتفاقاً راستہ میں آٹا ختم ہو گیا اور کھانے کے لئے کوئی چیز نہ رہی جب سخت بھوک لگی تو اسی بت کو کوٹ کر ہم نے آٹا گوندھا اور روٹی پکا کر کھالی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ جس خدا کو میں کھا گیا ہوں اور وہ مجھے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکا وہ کیسا خدا ہے اور میں مسلمان ہو گیا یہی حقیقت لَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا میں بیان کی گئی ہے کہ وہ کسی قسم کا تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

کوئی شخص اس پر بھی اعتراض کر سکتا ہے کہ لوگوں کی کئی خواہشات اتفاقی طور پر بھی پوری ہو جاتی ہیں پھر یہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت کس طرح ہوا۔ مثلاً بعض لوگوں کے ہاں بیٹا ہو جائے تو وہ کہتے ہیں کہ فلاں پیر کی قبر پر سجدہ کرنے کی وجہ سے ہوا ہے یا فلاں جگہ چڑھاوا چڑھایا تھا تو اس کی وجہ سے یہ کام ہوا ہے سو اس کے متعلق یاد رکھنا چاہیے کہ لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں اور یہ تینوں باتیں آپس میں جوڑ رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر دلیل بنتی ہیں یعنی سمع اور بصر اور اغناء جب یہ تینوں چیزیں ملتی ہیں تب دلیل مکمل ہوتی ہے اور جب یہ زنجیر مکمل ہو جائے تو اس کے بعد کوئی کام نہ اتفاقی قرار پا سکتا ہے اور نہ کسی بت وغیرہ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کام کے متعلق دعائیں کی گئی ہیں اور پھر کوئی نتیجہ برآمد ہوا ہے تو ہم یہ نتیجہ نکالیں گے کہ یہ کام خدا نے کیا ہے لیکن اگر دعائیں نہیں کی گئیں اور وہ کوئی غیر معمولی کام بھی نہیں تو وہ خدا تعالیٰ کی

طرف منسوب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ دنیا میں کچھ نہ کچھ کام اتفاقی بھی ہوا کرتے ہیں۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ

اے میرے باپ مجھے ایک خاص علم عطا کیا گیا ہے جو تجھے نہیں ملا پس (باوجود اس کے کہ میں تیرا بیٹا ہوں) تو میری

اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۴﴾

اتباع کر میں تجھے سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔

حل لغات۔ سَوِيًّا کے معنے اَلْاِسْتِوَاءُ وَالْاِنْصَافُ کے بھی ہیں یعنی کسی چیز کا توازن ٹھیک ہونا۔ اور اس کے معنے مستوی کے بھی ہیں یعنی جس میں کسی قسم کی کجی نہ ہو۔

تفسیر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ مجھے یقیناً خدا تعالیٰ کی طرف سے اس قسم کا علم ملا ہے جو تجھ کو نہیں ملا پس تو میری اتباع کر میں تجھے ایک ایسا رستہ دکھاؤں گا جس میں نہ زیادتی پائی جاتی ہے نہ کمی۔ نہ افراط ہے نہ تفریط۔

میں سمجھتا ہوں سب سے بڑا ابتلا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے یہی تھا کہ باپ کہہ لو یا چچا کہہ لو جو بھی وجود تھا بہرحال وہ ان کے پالنے والا تھا اسے جا کر آپ کو یہ کہنا پڑا کہ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ اور دعویٰ کرنا پڑا کہ مجھے وہ علم حاصل ہے جو آپ کو حاصل نہیں اپنے بڑوں کے سامنے بات کرنی بڑی دوبھر ہوتی ہے پس میرے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بڑے ابتلاؤں میں سے ایک ابتلا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے زمانہ میں مبعوث کیا جب ان کو پالنے والا یا جننے والا باپ موجود تھا اور اسے بتانا پڑا کہ تمہاری غلطی ہے اور کہنا پڑا کہ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۔ آج سے میں تمہارا روحانی باپ ہوں اور تم میری روحانی اولاد ہو۔ بچے تو بعض دفعہ بیوقوفی سے ایسی بات کہہ دیتے ہیں چنانچہ میرے نواسے کبھی میرے پاس آجائیں تو میں پیار سے اپنی لڑکی کو پکڑ کر ان سے کہتا ہوں یہ میری بیٹی ہے اس پر وہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی کہہ دیتے ہیں یہ میری بیٹی ہے پس بچے تو بعض دفعہ بیوقوفی سے ایسی بات کہہ دیتے ہیں لیکن ایک جوان اور بالغ مرد کا جا کر کہنا کہ والد صاحب آج سے آپ والد نہیں رہے ہیں میں آپ کا والد بن گیا ہوں آپ کی تربیت کا وقت گذر چکا اب میں آپ کی غلطیاں نکالوں گا آپ میری غلطیاں نہیں نکال سکتے۔ یہ زبان سے کہنا بڑا مشکل کام ہے۔

يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ

اے میرے باپ شیطان کی عبادت نہ کر شیطان یقیناً (خدائے) رحمٰن کا

عَصِيًّا ﴿۴۵﴾

نافرمان ہے۔

حل لغات ۔لَا تَعْبُدْ نہی کا صیغہ ہے جو عَبَدَ سے بنا ہے اور عَبَدَ اللہَ کے معنے ہیں طَاعَ لَهٗ وَخَضَعَ وذَلَّ وَخَدَمَهٗ یعنی اللہ کی اطاعت کی اس کی فرمانبرداری کی (اقرب) پس لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ کے معنے ہوں گے تو شیطان کی فرمانبرداری نہ کر۔

تفسیر ۔اس آیت میں کہا گیا ہے کہ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ تو شیطان کی عبادت نہ کر حالانکہ شیطان کی عبادت دنیا میں کوئی نہیں کرتا اس سے پتہ لگتا ہے کہ عبادت خالی سجدہ کرنے کا نام نہیں بلکہ کسی کی بات کو بلا دلیل پورے طور پر ماننا بھی عبادت ہی کہلاتا ہے اگر کوئی شخص اپنے برے ساتھیوں کی بات اس طرح مانتا ہے کہ عقل سے کام نہیں لیتا تو وہ بھی مشرک ہے اگر کوئی شخص اپنے نفس کی بات اس طرح مانتا ہے کہ عقل سے کام نہیں لیتا تو وہ بھی مشرک ہے ابراہیم کا باپ آخر شیطان کو نہیں پوجتا تھا بلکہ بتوں کو پوجتا تھا مگر قرآن کہتا ہے کہ جن کی تو پوجا کرتا ہے یہ شیطان ہیں اس کے معنے یہ ہیں کہ کسی کی اگر خلاف عقل اتباع ہو تو وہ بھی شیطان کی ہی عبادت ہوتی ہے۔خواہ یہ شیطان نفس کی صورت میں ہو خواہ برے ساتھیوں کی صورت میں ہو اور خواہ بدارواح کی صورت میں ہو شیطان انسان کا نفس بھی ہوتا ہے اور شیطان انسان کے برے ساتھی اور دوست بھی ہوتے ہیں اور شیطان وہ بدروحیں بھی ہوتی ہیں جو بدی کا عادی ہو جانے کے بعد انسان پر غالب آجاتی ہیں اور اسے بری باتیں سکھاتی ہیں جس وقت انسان اپنے نفس کے برے مشوروں پر جرح کرنا چھوڑ دے جس وقت انسان اپنے دوستوں کی بری باتوں پر تنقید کرنا چھوڑ دے جس وقت انسان اپنی بداعمالی سے ایسے گند میں جا پڑے کہ شیطانی روحوں کا اس کے ساتھ واسطہ ہو جائے تو اس وقت قرآنی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان کی عبادت کر رہا ہے درحقیقت بلاوجہ تنقید چھوڑ دینا اور بری باتوں کو قبول کرتے جانا بھی ایک رنگ کی عبادت ہی ہے پس لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب کسی شخص کے سامنے بری باتیں آتی ہیں اور وہ ان پر تنقید نہیں کرتا ان پر جرح قدح نہیں کرتا اور

بغیر جرح اور بغیر غور اور بغیر فکر کے ان کو قبول کر لیتا ہے تو درحقیقت وہ ان کو خدا کا مقام دیتا ہے کیونکہ خدا کا مقام ہی ایسا ہے جس کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا بہرحال جب یہ ثابت ہو جائے کہ خدا ہے تو بلا چون و چرا اس کی بات ماننی ضروری ہوتی ہے لیکن جب کوئی ہستی خدا ثابت نہ ہو یا خدا کی قائم مقام ثابت نہ ہو تو اس وقت ہر بات جرح کر کے ماننی چاہیے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ اس جگہ بت مراد نہیں کیا تم نے کبھی پتھروں کو دیکھا کہ وہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا انکار کر رہے ہوں پتھروں نے خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا کیا انکار کرنا ہے وہ تو بے جان چیزیں ہیں پس یہ الفاظ بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہاں بت مراد نہیں۔ فرماتا ہے شیطان رحمٰن کی نافرمانی ہی کیا کرتا ہے۔

عَصِيٌّ کے معنے عاصی اور گنہگار کے ہیں عَصٰی کا فاعل عاصی بھی آجاتا ہے اور بعض دفعہ فَعِيْلٌ کے وزن پر عَصِيٌّ آجاتا ہے۔

اگر بت مراد لئے جائیں تو اس آیت کا یہ ترجمہ ہوگا کہ بت خدا تعالیٰ کے نافرمان ہیں حالانکہ بت نافرمان ہیں ہی نہیں وہ بے جان چیزیں ہیں انہیں تو اتنا بھی پتہ نہیں کہ انہیں کسی نے پاخانہ میں ڈال دیا ہے یا کوئی شخص ان کے آگے جھک کر سجدہ کر رہا ہے پس عَصِيًّا نے اس بات کو حل کر دیا کہ تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ سے بلا دلیل بات مان لینا مراد ہے بت مراد نہیں۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ

اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ تجھے (خدائے) رحمٰن کی طرف سے (نافرمانی کی وجہ سے) کوئی عذاب نہ پہنچے

فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۶﴾

جس کے نتیجہ میں تو شیطان کا دوست ہو جائے۔

تفسیر ۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کے لئے رحمٰن کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ عذاب نازل کرنا خدائے رحمٰن کا کام نہیں عذاب نازل کرنے والی خدا تعالیٰ کی بعض اور صفات ہیں مثلاً جبار خدا عذاب نازل کرتا ہے قہار خدا عذاب نازل کرتا ہے ذوالانتقام خدا عذاب نازل کرتا ہے اسی طرح بعض اور نام ہیں جو خدا تعالیٰ کی صفت

عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور جن کے ماتحت اس کی نافرمانی کرنے والوں پر عذاب نازل ہوتا ہے مگر یہ رحمٰن کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ میں ڈرتا ہوں کہ خدائے رحمٰن کی طرف سے تجھے عذاب نہ پہنچ جائے پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟

سو یاد رکھنا چاہیے کہ ہر عذاب کی صفت کسی نہ کسی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے کبھی انسان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی رحیمیت کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی مالکیت کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی صفت احیاء کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے کبھی صفت اغناء کا انکار کرتا ہے تو عذاب کی صفت ظاہر ہوتی ہے غرض عذاب کی صفات مستقل نہیں۔ یعنی آپ ہی آپ بلا وجہ عذاب کی صفت ظاہر نہیں ہوتی بلکہ کسی نیک صفت کے انکار یا اس کے رد کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے اگر عذاب کی صفت کو ہم مستقل سمجھیں تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہمارا خدا نعوذ باللہ ظالم ہے اور آپ ہی آپ اس کا دل چاہتا ہے کہ میں لوگوں کو پیس ڈالوں، ان پر عذاب نازل کروں اور انہیں تباہ اور برباد کر دوں اور یہ جابرانہ اور ظالمانہ طریق ہے جو خدا تعالیٰ جیسی رحیم و کریم ہستی کے بالکل منافی ہے پس جبکہ اس کی سزا والی صفات صفاتِ مستقلہ نہیں۔ بلکہ کسی دوسری صفت کی مناسبت سے ظاہر ہوتی ہیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کی صفت عذاب کبھی رحمانیت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے کبھی رحیمیت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے کبھی غفاریت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے، کبھی ستاریت کی وجہ سے نازل ہوتی ہے، کبھی خدا تعالیٰ کی صفت ستار ایک انسان کے عیبوں کو چھپاتی چلی جاتی ہے مگر وہ پھر بھی باز نہیں آتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عذاب نازل ہو جاتا ہے اب اس پر عذاب تو آیا مگر خدا تعالیٰ کی صفت ستاری کی وجہ سے کبھی وہ ایک شخص کو رزق دیتا چلا جاتا ہے مگر باوجود کثرت رزق کے وہ نافرمانی میں بڑھتا چلا جاتا ہے جب خدا تعالیٰ اس کی متواتر نافرمانیوں کو دیکھتا ہے تو اس پر عذاب نازل کرتا ہے اب اس پر عذاب تو آیا مگر صفت رزّاق کی وجہ سے جب اس نے خدا تعالیٰ کی اس صفت کی ہتک کی تو اس پر عذاب آ گیا پس اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ کے یہ معنے ہیں کہ میں ڈرتا ہوں کہ تجھ پر وہ عذاب نازل نہ ہو جو رحمانیت کی صفت کی وجہ سے نازل ہوتا ہے تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا پتھروں کا، تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا آگ کا، تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا ہوا کا، تمہیں خدا نے مالک بنایا تھا پانی کا اور یہ ساری چیزیں وہ ہیں جو خدا تعالیٰ نے اپنی رحمانیت کی وجہ سے تم کو دیں مگر انہیں چیزوں کو تم نے اس کا شریک بنا لیا۔

دنیا میں جس قدر بت پائے جاتے ہیں وہ سارے کے سارے رحمانیت کے ماتحت آتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ

کو خدا تعالیٰ نے بھیجا اور اس لئے بھیجا کہ وہ اس کے بندوں کی خدمت کریں مگر لوگوں نے انہی کو خدا کا بیٹا بنا لیا تو شرک ہمیشہ رحمانیت کی صفت کے انکار کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اسی لئے ہندو اور عیسائی خدا تعالیٰ کو رحمٰن نہیں مانتے ہندوؤں نے جب اپنی تعلیم پر غور کیا تو انہیں ماننا پڑا کہ خدا روح اور مادہ کا خالق نہیں۔ اگر وہ اسے خالق مانیں تو ساتھ ہی اسے رحمٰن بھی ماننا پڑے گا اور رحمٰن ماننے سے ہندو مذہب ختم ہوجاتا ہے اسی طرح عیسائی خدا تعالیٰ کو رحمٰن مانیں تو انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت لعنت نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت کا تقاضا ہے کہ اس کی طرف سے ہدایت آئے اور جب شریعت لعنت نہیں بلکہ اس پر عمل کر کے انسان نجات پا سکتا ہے تو کفارہ کا انکار کرنا پڑا کفارہ کے انکار سے مسیح کی ابنیت ختم ہوگئی اور جب مسیح کی ابنیت ختم ہوگئی تو عیسائیت بھی فنا ہوگئی۔ پس شرک میں سب سے بڑا انکار خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا ہی کرنا پڑتا ہے اس لئے جو قومیں شرک کرتی ہیں ان کے متعلق خدا تعالیٰ کی رحمانیت کی صفت کہتی ہے کہ میری ہتک انتہاء تک پہنچ چکی ہے اب ان پر عذاب نازل ہونا چاہیے پس اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ کا یہ مطلب نہیں کہ رحمانیت عذاب نازل کرتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رحمانیت کی صفت اس عذاب کا موجب ہوجاتی ہے۔

فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا پس تو شیطان کا دوست ہوجائے یہ الفاظ بھی اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں شیطان سے بت مراد نہیں کیونکہ بتوں سے تو وہ پہلے ہی دوستی کر رہا تھا۔

میں اوپر بتا چکا ہوں کہ شیطان کے ساتھ تین ذرائع سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اول نفس کے ذریعہ سے یعنی نفس انسان کو گمراہ کرتا ہے اور اس کا شیطان سے تعلق ہوجاتا ہے دوسرے برے ساتھیوں کے ذریعہ سے اور تیسرے جب شیطان کے ساتھ براہ راست تعلق ہوجائے تو بدارواح اس کے نفس پر پرتو ڈالتی ہیں اور اسے گمراہی میں بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔

پہلے یہ کہا تھا کہ تو شیطان کی عبادت نہ کر کیونکہ شیطان خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے اس کے بعد یہ کہا کہ اگر تم عبادت شیطان سے باز نہ آؤ گے تو خدا تعالیٰ کی رحمانیت کی صفت تم پر عذاب لانے کا موجب بن جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم شیطان کے دوست ہوجاؤ گے۔ گویا عبادت شیطان سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ انسان شیطان کا دوست بن جائے کیونکہ پہلے صرف اتنی بات تھی کہ یہ اپنے نفس کے گمراہ کن خیالات کی وجہ سے شیطان کی بات مانتا تھا یا اپنے برے دوستوں کی وجہ سے شیطان کی بات مانتا تھا مگر پھر ترقی کر کے اس کا شیطان سے براہ راست تعلق ہوجاتا ہے جس طرح مومنوں کی نیکیوں میں ترقی کرتے کرتے فرشتوں سے براہ راست تعلق ہوجاتا ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ

اس پر (ابراہیم کے باپ نے) کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے متنفر ہو رہا ہے؟ اے ابراہیم اگر تو باز نہ

تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۷﴾

آئے گا تو میں تجھے ضرور سنگسار کردوں گا اور (بہتر ہے کہ) تو کچھ دیر کے لئے میری نظروں سے اوجھل ہو جا (تا کہ غصہ میں کچھ کر نہ بیٹھوں)

حل لغات۔ رَغِبَ عَنْهُ کے معنے ہوتے ہیں اعراض کرنا یا نفرت کرنا جس طرح رَغِبَ اِلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف رغبت اور شوق کے ساتھ جانا۔ گویا نفرت اور اعراض کے لئے رَغِبَ عَنْهُ کے الفاظ آتے ہیں اور کسی کی طرف شوق اور محبت کے ساتھ جانے کے لئے رَغِبَ اِلَيْهِ کے الفاظ آتے ہیں (اقرب)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے کہا کہ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ۔ اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے نفرت کرتا ہے لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ اگر تو اس طریق سے باز نہیں آئے گا تو میں تجھے رجم کروں گا۔

رَجَمَهُ کے معنے ہوتے ہیں رَمَاهُ بِالْحِجَارَةِ اس کو پتھر مار مار کر مار دیا (۲) قَتَلَهُ اس کو قتل کر دیا (۳) قَذَفَهُ اس کو الزام یا تہمت لگائی (۴) لَعَنَهُ اس کو لعنت کی اور اس کے لئے بددعائیں کیں (۵) شَتَمَهُ اس کو گالیاں دیں (۶) هَجَرَهُ اس سے قطع تعلق کر لیا (۷) طَرَدَهُ اس کو دور کر دیا (اقرب) پس لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ کے یہ معنے ہوئے کہ اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں تجھ کو سنگسار کردوں گا اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں تجھ کو قتل کردوں گا اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں تجھے سب میں بدنام کردوں گا کہ یہ اپنی قوم کا مذہب نہیں مانتا۔ یا اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں لوگوں کے سامنے تجھ سے نفرت کا اظہار کروں گا یا اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں تجھے گالیاں دوں گا یا اگر تو باز نہیں آئے گا تو میں تجھے چھوڑ دوں گا اور اپنے گھر سے نکال دوں گا۔

وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا لیکن پھر بھی میں تیرا باپ ہوں۔ میرے نفس کی حالت یہ ہے کہ میرا دل چاہتا ہے تجھے سنگسار کردوں۔ میرا دل چاہتا ہے تجھے قتل کردوں میرا دل چاہتا ہے تجھے بدنام کروں میرا دل چاہتا ہے تجھ پر لعنتیں ڈالوں کہ معبود تجھے تباہ کردیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تجھے خوب پیٹ بھر کر گالیاں دوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں تجھے

اپنے گھر سے نکال دوں۔ مگر پھر میری باپ والی محبت جوش میں آ جاتی ہے۔ اس لئے میں تجھے کہتا ہوں کہ کچھ مدت کے لئے میرے سامنے سے ہٹ جا۔ تا کہ میرا غصہ دور ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ میں کوئی حرکت کر بیٹھوں اور تجھے نقصان پہنچ جائے۔

تفسیر ۔اس سے پتہ لگتا ہے کہ جب کوئی شخص غلطی سے یا اپنے ماں باپ کی سنی سنائی باتوں کی وجہ سے کوئی ایسی بات ماننے لگ جائے جو خلاف حقیقت ہوتی ہے تو اس کے انکار پر بھی اسے غیرت آ جاتی ہے لیکن جب انکار دلیل اور عقل کے ماتحت ہوتا ہے۔ تو غیرت بھی دلیل اور عقل کے ماتحت ہوتی ہے۔ اور جب غصہ دلیل اور عقل کے ماتحت نہیں ہوتا تو سلوک بھی دلیل اور عقل کے ماتحت نہیں ہوتا چنانچہ دیکھ لو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی آپ کے مخالف آتے اور کہتے تھے کہ ہم آپ کی بات نہیں مانتے خود ابو جہل آپ کا قریبی رشتہ دار تھا جو آپ کا شدید ترین دشمن تھا اسی طرح آپ کے بعض دوست تھے جو آپ پر ایمان نہیں لائے حکیم بن حزام آپ کا ایک بڑا گہرا دوست تھا جو مشرک تھا اور بہت بعد میں ایمان لایا وہ آپ سے اتنی محبت رکھتا تھا کہ ایک دفعہ وہ تجارت کے لئے شام گیا تو اس نے ایک اعلیٰ درجے کا کوٹ دیکھا باوجود اس کے کہ وہ کافر تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے گئے تھے پھر بھی اس نے کہا یہ کوٹ اتنا اچھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی کے جسم پر نہیں سج سکتا۔ چنانچہ وہ کوٹ خرید کر مکہ میں لایا اور پھر مکہ سے تین سو میل کا سفر کر کے مدینہ پہنچا اور آپ کی خدمت میں اس نے وہ کوٹ پیش کیا اور کہا کہ مجھے یہ کوٹ اتنا پسند آیا تھا کہ میں نے سمجھا سوائے آپ کے اور کسی کو یہ سج نہیں سکتا۔ چنانچہ اب میں یہ کوٹ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے لایا ہوں آپ نے فرمایا اس کی کیا قیمت ہے؟ اس نے کہا قیمت کیسی! میں تو محض دوستی کی خاطر لایا ہوں آپ نے فرمایا تمہاری دوستی کی میرے دل میں قدر تو بہت ہے مگر میں نے عہد کیا ہوا ہے کہ میں کسی مشرک کا تحفہ قبول نہیں کروں گا۔ اب چاہو تو یہ واپس لے جاؤ اور چاہو تو قیمت لے لو۔ اس کو صدمہ تو بہت ہوا مگر اس نے کہا میں اتنی دور سے یہ چیز آپ کے لئے خرید کر لایا تھا اور دوستی کے طور پر لایا تھا مگر آپ واپس کرتے ہیں میں یہ تو پسند نہیں کرتا کہ کوئی اور شخص اس کوٹ کو پہنے، آپ قیمت ہی دینا چاہتے ہیں تو دے دیں چنانچہ اس نے قیمت لے لی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کوٹ رکھ لیا (مسند احمد بن حنبل مسند المکیین رقم الحدیث ۱۴۷۸۴)۔ اب دیکھو دشمن آپ کے بھی تھے بلکہ ایسے ایسے دشمن تھے کہ حضرت عمرو بن العاص کہتے ہیں میں جن دنوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف تھا ان دنوں میرے دل میں آپ کا اتنا بغض تھا اور آپ سے مجھے اتنی شدید نفرت تھی کہ میں اس بغض اور نفرت کی وجہ سے آپ کی شکل تک نہیں دیکھ

سکتا تھا (مسلم کتاب الایمان باب کون الاسلام یھدم ما قبلہ و کذا الھجرۃ و الحج) لیکن اس ساری مخالفت کے باوجود جب طائف میں آپ پر پتھر پڑے تو آپ نے غصہ میں دشمن سے یہ نہیں کہا کہ لَاَرْجُمَنَّكَ بلکہ اس وقت جب دشمن پتھر مار رہا تھا خدا تعالیٰ کا ایک فرشتہ ظاہر ہوا اور اس نے کہا خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس قوم پر عذاب نازل کروں۔ سامنے پہاڑی تھی فرشتہ نے اس پہاڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا خدا نے مجھے کہا ہے کہ میں یہ پہاڑی ان پر الٹا دوں اور زلزلہ سے انہیں تباہ کر دوں آپ نے فرمایا نہ ایسا ہرگز نہ کرنا اگر تم ان لوگوں کو تباہ کر دو گے تو مجھ پر ایمان کون لائے گا۔ پھر آپ نے دعا کی اور فرمایا اے میرے خدا میری قوم جانتی نہیں کہ میں کون ہوں اس لئے میرا انکار کر رہی ہے تو ان کی خطاؤں کو معاف فرما اور ان کی غلطیوں سے درگذر کر (بخاری کتاب بدء الخلق باب اذا قال احدکم اٰمین)۔

غرض رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس عقیدہ پر قائم تھے چونکہ اس کی دلیل آپ کے پاس موجود تھی اس لئے آپ کو اگر غصہ بھی آتا تھا تو اس کی بھی دلیل ہوتی تھی اور اگر درگذر فرماتے تھے تو اس کی بھی دلیل ہوتی تھی اسی طرح حضرت ابراہیم کے پاس چونکہ دلیل تھی ان کا غصہ بھی دلیل کے ماتحت تھا اور ابراہیم کے باپ کے پاس چونکہ دلیل نہیں تھی اس لئے اس کا غصہ بھی بے دلیل تھا۔ آخر ابراہیم نے اسے کہا کیا تھا۔ یہی کہا تھا کہ یہ باتیں اچھی نہیں بری ہیں۔ آخر کسی بات کو بلا دلیل آپ کیوں مانتے ہیں۔ جس چیز کو بھی مانیں اس پر ماننے سے پہلے جرح کریں، تنقید کریں، غور و فکر کریں اور پھر اسے قبول کریں۔ یہ تو شرک ہے کہ انسان بغیر کسی دلیل کے دوسرے کی بات مان لے اس پر وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ یہ کل کا بچہ مجھے آج سمجھانے لگا ہے۔ مگر اس کے طیش کی یہ حالت ہے کہ وہ کہتا ہے۔ میں تجھے مار ڈالوں گا میں تجھ پر پتھراؤ کروں گا میں تجھ پر لعنتیں ڈالوں گا۔ میں تجھے گالیاں دوں گا۔ میں تجھے لوگوں میں بدنام کروں گا، میں تجھ سے قطع تعلق کر لوں گا، میں تجھے اپنے گھر سے نکال دوں گا۔ مگر اس قدر طیش اور غضب کے باوجود وہ آج کل کے مولویوں سے پھر بھی اچھا تھا کیونکہ غصہ آیا تو ساتھ ہی یہ بھی خیال آ گیا کہ یہ میرا بیٹا ہے اور اسے کہا کہ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جا ایسا نہ ہو کہ میں تجھے کوئی نقصان پہنچا دوں لیکن پنجاب کی ۵۳ء والی شورش میں مولویوں نے احمدیوں کو تلاش کر کر کے مارا ہے۔ ابراہیمؑ کا باپ مشرک تھا جس کے لئے خدا تعالیٰ نے دعا سے بھی منع کر دیا۔ مگر وہ کہتا ہے مجھے غصہ آ گیا ہے میرا نفس اس وقت قابو میں نہیں تو تھوڑی دیر کے لئے میرے سامنے سے ہٹ جا۔ لیکن اس فتنہ وفساد کے دنوں میں مولویوں نے لوگوں سے یہ کہا کہ احمدیوں کی عورتوں کو بے شک پکڑ کر لے جاؤ تم پر کوئی گناہ نہیں۔

غرض ابراہیم کے باپ نے تو غصہ کی حالت میں ذرا سوچنے کی مہلت چاہی مگر بعض بڑے علماء نے ۱۹۵۳ء میں سوچنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں سمجھی۔

مَلِیًّا کے معنے عربی زبان میں لمبے زمانہ کے ہوتے ہیں مگر لمبے زمانہ سے مراد صدی دو صدی نہیں کیونکہ عربی کا محاورہ ہے کہتے ہیں مَرَّ مَلِیٌّ مِنَ الَّیْلِ رات میں سے ایک مَلِیٌّ گذر گئی ہے (المنجد)۔ گویا اگر بارہ گھنٹے کی رات ہو اور چھ سات گھنٹے گذر جائیں تو کہیں گے کہ ایک مَلِیٌّ گذر گئی ہے پس وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا کے یہ معنے نہیں کہ سالوں کے لئے مجھ سے جدا ہو جاؤ۔ بلکہ یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ دو چار گھنٹہ کے لئے میری آنکھوں سے پرے ہو جاؤ تا کہ میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۸﴾

اس پر ابراہیم نے) کہا اچھا میری طرف سے تجھ پر ہمیشہ سلامتی کی دعا پہنچتی رہے (یعنی میں تجھ سے الگ ہو جاتا ہوں) میں اپنے رب سے تیرے لئے ضرور مغفرت کی دعا کروں گا وہ مجھ پر بہت ہی مہربان ہے۔

تفسیر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے باپ کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے کہا کہ آپ کو تو اس بات پر غصہ آیا ہوا ہے کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا لیکن میں اس بات کو دیکھ کر بھی کہ آپ میرے سچے معبود کو نہیں مانتے آپ سے یہی کہتا ہوں کہ خدا آپ پر رحم کرے۔ آپ مجھے اس لئے رجم کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا۔ آپ مجھے اس لئے قتل کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا آپ مجھے اس لئے لوگوں میں بدنام کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا آپ مجھ پر اس لئے لعنتیں ڈالنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا آپ مجھے اس لئے گالیاں دینا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا۔ آپ مجھ سے اس لئے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا آپ مجھے اس لئے گھر سے نکال دینا چاہتے ہیں کہ میں آپ کے جھوٹے معبودوں کو کیوں نہیں مانتا لیکن اے میرے باپ آپ میرے سچے معبود کو نہیں مانتے اور پھر بھی میں یہی کہتا ہوں کہ خدا آپ پر رحم کرے۔ گناہ آپ نے کیا ہے لیکن میرا رب اب بھی معاف

کرنے والا ہے۔ میں آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا۔

اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا۔ حَفِیٌّ کے معنے ہوتے ہیں اَلْعَالِمُ یَتَعَلَّمُ الشَّیْءَ بِاِسْتِقْصَاءٍ ایسا شخص جو کوشش اور جدوجہد کے ساتھ کوئی بات نکالتا ہے اور حَفِیٌّ کے معنے اَلْمُبَالِغُ فِی الْاِکْرَامِ وَالْبِرِّ وَالْمُظْهِرُ السُّرُوْرِ وَالْفَرْحَ وَالْمُکْثِرُ السُّؤَالِ عَنْ حَالِ الرَّجُلِ کے بھی ہیں یعنی ایسا شخص جو دوسرے کی عزت اور اس کا احترام کرنے میں اور اس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنے میں کمال کر دے اور اس کو دیکھ کر انتہاء درجہ کی خوشی اور فرحت کا اظہار کرے اور کثرت کے ساتھ پوچھے کہ آپ کا کیا حال ہے۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔ یعنی لوگوں کی خیر خواہی میں جو شخص انتہائی درجہ رکھتا ہو اسے حَفِیٌّ کہتے ہیں پس اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا کے یہ معنے ہوئے کہ میرا رب میرے اعزاز اور اکرام کے لئے بے انتہاء کوشش کرتا ہے وہ میری کامیابی کو دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہے اور ہر وقت میرا حال پوچھتا رہتا ہے اور اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ بے تاب ہو جاتا ہے۔ جب میں اپنے اس محسن خدا کو دیکھتا ہوں اور اس کے متعلق میرے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے تو ساتھ ہی مجھے خیال آتا ہے کہ اس محبت اور حسن سلوک کا ایک چھوٹا سا نمونہ میرے ماں باپ بھی ہیں۔ پس میرا فرض ہے کہ میں ان سے بھی محبت کروں اور ان سے بھی عزت اور احترام کے ساتھ پیش آؤں۔ گویا اس وجہ سے کہ ماں باپ مجھ سے حسن سلوک کرتے ہیں یا ماں باپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں۔ میرے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا نہیں ہوتی بلکہ جب میں اپنے خدا کو دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے اور میری ضروریات کا اتنا خیال رکھتا ہے تو مجھے خیال آتا ہے کہ اسی قسم کی محبت کا ایک نمونہ میرے ماں باپ بھی ہیں۔ پس خدا کی محبت تقاضا کرتی ہے کہ میں اپنے ماں باپ سے بھی محبت کروں یہ تقویٰ کا کیا ہی لطیف معیار ہے۔ بعض لوگ نیکیوں میں نیچے سے اوپر جاتے ہیں اور بعض اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اوپر سے نیچے کی طرف آتے ہیں آپ فرماتے ہیں میں اپنے ماں باپ کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا بلکہ خدا تعالیٰ کے الطاف کریمانہ کو دیکھ کر کہتا ہوں کہ میں اپنے ماں باپ سے بھی پیار کروں۔ پس اِنَّہٗ کَانَ بِیْ حَفِیًّا میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کا پیار اور اس کا حسن سلوک دیکھنے کی وجہ سے میرا دل کہتا ہے کہ جب میرا محسن اور مربی خدا مجھ سے اتنا پیار کرتا ہے تو اسی کی رحمت کا ایک نمونہ میرے ماں باپ بھی ہیں پس میرا فرض ہے کہ میں اپنے والدین سے بھی حسن سلوک کروں۔ اسی لئے میں آپ کا اعزاز کرتا ہوں اور آپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کا گناہ معاف کرے اور آپ پر اپنا رحم نازل فرمائے۔

وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ

اور (اے باپ) میں تم کو اور جن (وجودوں) کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو سب کو چھوڑ دوں گا اور صرف اپنے رب کے

عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا ﴿۴۹﴾

حضور دعائیں مانگوں گا (اور) یقیناً میں اپنے رب کے حضور دعا کرنے کی وجہ سے بدنصیب نہیں بنوں گا۔

تفسیر ۔آپ نے کہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ آپ نے ٹھیک کہا ہے۔میرا گذارہ آپ کے ساتھ مشکل ہے آپ نے بتوں کو پوجنا ہے اور میں نے خدا کو پوجنا ہے آپ کو خدا کی پرستش پر غصہ آتا ہے اور مجھے بتوں کی پرستش پر غصہ آتا ہے۔

اَعۡتَزِلُکُمۡ کے یہ معنے نہیں کہ میں آئندہ بت نہیں پوجوں گا۔کیونکہ وہ تو پہلے ہی بتوں کی پرستش نہیں کرتے تھے اَعۡتَزِلُکُمۡ کے معنے یہ ہیں کہ میں اس جگہ کو چھوڑ دوں گا۔ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اور ان بتوں کو بھی چھوڑ دوں گا جن کی آپ پرستش کرتے ہیں وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ اور میں ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں خدا ہی خدا نظر آئے گا عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا اس طرح بظاہر میں اپنے اوپر موت وارد کرلوں گا کیونکہ میرا ملک مجھ سے چھوٹ جائے گا میری قوم مجھ سے الگ ہوجائے گی میرا قبیلہ مجھ سے جدا ہوجائے گا مرے دوست اور ساتھی میرے ساتھ نہیں رہیں گے مگر میں امید کرتا ہوں کہ جب میں اپنے محبت کرنے والے خدا کو پکاروں گا تو اپنے مقاصد کو پالوں گا مجھے دوست بھی مل جائیں گے مجھے ساتھی بھی مل جائیں گے۔مجھے ہمدرد بھی مل جائیں گے اور مجھے قوم بھی مل جائے گی۔

فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَ مَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبۡنَا لَهٗۤ

اور پھر جب (ابراہیم) ان (یعنی اپنے) لوگوں سے بھی اور جن کی وہ اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے (ان سے بھی)

اِسۡحٰقَ وَ يَعۡقُوۡبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ﴿۵۰﴾

جدا ہوگیا تو ہم نے اسے اسحاق اور (اس کے بعد) یعقوب عطا فرمائے۔اور ان سب کو ہم نے نبی بنایا۔

تفسیر ۔جب اس نے ان کو چھوڑ دیا اور ان کو بھی چھوڑ دیا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش کرتے تھے تو

ہم نے اسے اسحاق دیا اور یعقوب دیا وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا اور پھر ہم نے ان سب کو نبی بنا دیا۔ یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ كُلًّا کا لفظ دو پر بھی بولا جا سکتا ہے چنانچہ بعض اور مقامات پر بھی كُلًّا کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر مراد صرف دو ہی ہیں۔ اس جگہ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ذکر ہے حضرت ابراہیمؑ پہلے سے نبی ہو چکے تھے پس یہاں كُلًّا سے یہ دو نبی مراد ہیں اسحاقؑ اور یعقوبؑ۔

وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۱﴾

اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں سے ایک (وافر) حصہ عطا فرمایا اور ہم نے ان کے لئے ہمیشہ قائم رہنے والا اعلیٰ درجہ کا ذکرِ خیر مقرر فرمایا۔

تفسیر ۔قرآنی محاورہ میں رحمت سے دو چیزیں مراد ہوتی ہیں۔اول وہ چیزیں جو خدا تعالیٰ کی رحمت عام کے نتیجہ میں ملتی ہیں۔مثلاً ایک شخص اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہے کہ خدایا مجھے رحم کر کے بیٹا دیجئے اور اسے بیٹا مل جاتا ہے اب اسے رحم کی وجہ سے کیا ملا؟ بیٹا ملا۔ یا ایک شخص دعا کرتا ہے کہ خدایا تو اپنے رحم سے مجھے مقدمہ میں فتح دیجیئو اور اسے مقدمہ میں کامیابی ہو جاتی ہے اسے رحم کی وجہ سے کیا ملا؟ اسے رحم کی وجہ سے مقدمہ میں کامیابی ملی۔ یا ایک اور شخص دعا کرتا ہے کہ خدایا رحم کر کے میری تنگی دور کیجیئے اور اس کی مالی تنگی دور ہو جاتی ہے تو اسے رحم کی وجہ سے کیا ملا؟ رزق کی کشائش ملی اور اس کی تنگی دور ہوئی۔ یہ خدا تعالیٰ کی رحمت کا عام ظہور ہے۔اور یہ سلوک کافر کے ساتھ بھی ہوتا ہے، منافق کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور مومن کے ساتھ بھی ہوتا ہے مگر بعض انعامات ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور عام لوگ ان میں شریک نہیں ہوتے۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص سلوک کا ذکر کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ہم نے ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے ساتھ عام سلوک نہیں کیا بلکہ اپنی رحمت ہی ان کے حوالے کر دی یہاں موہوب چیز بیٹا نہیں، موہوب چیز روپیہ نہیں موہوب چیز کوئی عہدہ اور رتبہ نہیں بلکہ خود رحمت ہے فرماتا ہے وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا ہم نے اپنی رحمت ہی ان کے قبضہ میں دے دی اور کہہ دیا جو بھی مانگو گے تمہیں مل جائے گا۔ جیسے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے حج کیا اور مجھے پہلی دفعہ خانہ کعبہ نظر آیا تو مجھے یاد آیا کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ خانہ کعبہ جب

پہلی دفعہ نظر آئے تو اس وقت جو دعا بھی کی جائے وہ قبول ہوجاتی ہے اس وقت میں نے سوچنا شروع کیا کہ میں کون سی دعا مانگوں ۔ آخر مجھے خیال آیا کہ اگر آج میں کوئی دعا مانگوں اور وہ قبول بھی ہوجائے تو ممکن ہے کل مجھے کوئی اور ضرورت پیش آجائے اس لئے کیوں نہ کوئی ایسی دعا کروں جو اپنی ذات میں میری ساری ضرورتوں کو پورا کرنے والی ہو ۔ چنانچہ میں نے دعا کی کہ الٰہی جو بھی دعا میں تجھ سے مانگا کروں وہ قبول ہوجایا کرے میں نے بھی حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کی اتباع میں خانہ کعبہ کو دیکھ کر یہی دعا کی تھی کہ الٰہی جو بھی دعا میں تجھ سے کروں اسے تو اپنے فضل سے قبول فرمالیا کر۔

تو فرماتا ہے وَ وَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا ہم نے اپنی رحمت ہی ان کے حوالے کردی ہم نے کہا ایک ایک چیز کیا دینی ہے چلو ہم اپنی رحمت ہی تمہارے حوالے کرتے ہیں گویا انہیں عمر عیار کی زنبیل مل گئی کہ جس چیز کی ضرورت ہوئی ہاتھ ڈالا اور نکل آئی ۔ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا صدق کی طرف جب کسی شیئے کو اضافت دی جائے تو اس کے معنے ہوتے ہیں صَادِقٌ وَ مَرْضِيٌّ یعنی ایسی چیز جو اپنے مفہوم میں کامل اور پسندیدہ ہو مثلاً اگر کہا جائے کہ آم صادق ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آم کی جس قدر خصوصیات ہوتی ہیں وہ اس میں کامل طور پر پائی جاتی ہیں اور وہ نہایت ہی پسندیدہ اور مرغوب الطبع ہے یا اگر کہا جائے کہ خربوزہ صادق ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ایک اچھے خربوزہ میں جو لذت اور خوشبو اور ذائقہ پایا جانا چاہیے وہ اس میں کامل طور پر پایا جاتا ہے اور اس کے کھانے سے لذت حاصل ہوتی ہے پس وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ کے یہ معنے ہوئے کہ (۱) ان کو وہ زبان ملی جو اپنی جگہ کامل اور پسندیدہ تھی یعنی خدا تعالیٰ نے ان کو ایسی توفیق دی کہ ان کی باتیں نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوا کرتی تھیں ان میں تلخی نہیں ہوتی تھی ۔ بغض اور کینہ کا اظہار نہیں ہوتا تھا اور پھر حکمت والا کلام ہوتا تھا ہر شخص جو ان کی باتیں سنتا تھا کہتا تھا کہ یہ کیا ہی اچھی باتیں ہیں لیکن لسان کے معنے جس طرح ان کی اپنی زبان کے ہیں اسی طرح ان کے متعلق دوسروں کی زبان کے بھی ہوسکتے ہیں اس صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ (۲) ہم نے ان کو ایسی جماعتیں دیں یا ان کو ایسے افراد عطا فرمائے جو ان کے متعلق ایسی باتیں کرتے تھے جو بڑی اچھی ہوتی تھیں بڑی پسندیدہ اور قابل تعریف ہوتی تھیں گویا خود ان کا کلام بھی بڑا اعلیٰ درجے کا تھا اور ان کو ایسے مطیع اور فرمانبردار لوگ بھی ملے جو ان کی سچی کامل اور پسندیدہ تعریفیں کرنے والے تھے۔

پھر صدق کی طرف اضافت کسی چیز کے قائم رہنے پر بھی دلالت کرتی ہے یعنی صدق کی طرف جب کسی شیئے کو اضافت دی جائے تو اس کے معنے دائمی کے بھی ہوتے ہیں.

اس صورت میں وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ سے یہ مراد ہوگا کہ (۳) ان کو ایسی باتیں ملیں جو ہمیشہ قائم رکھی جائیں گی۔ اور اگر دوسرے معنے لیں یعنی لسان سے ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی زبان نہ ہو بلکہ دوسروں کی زبان ہو تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہمیشہ ہی (۴) ان کی تعریف کرنے والے لوگ دنیا میں موجود رہیں گے جو کہیں گے کہ ابراہیمؑ بڑا اچھا تھا۔ اسحاق بڑا اچھا تھا یعقوب بڑا اچھا تھا گویا خدا تعالیٰ ہمیشہ دنیا میں ایسے لوگ پیدا کرتا رہے گا جو ان کے نیک ذکر کو قائم رکھیں گے اور ان کی پُر حکمت اور اعلیٰ درجہ کی باتیں لوگوں میں پھیلاتے رہیں گے۔

عَلِيًّا لِسَانَ کی صفت ہے اور اس کے تین معنے ہیں اول اَلْمُرْتَفِعُ یعنی بلند دوم الشَّرِيْفُ سوم الشَّدِيْدُ ان معنوں کے لحاظ سے وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے یہ معنے بن جائیں گے:

اوّل (۵) ان کو بلند زبان ملی۔ یعنی وہ بڑی اعلیٰ درجہ کی باتیں کرتے تھے نہایت پُر حکمت، ہر قسم کے بُغض اور کینہ سے پاک، دلوں میں نورِ ایمان پیدا کرنے والی اور اخلاق اور پاکیزگی کو ترقی دینے والی یا ان کو بلند تعریف ملی یعنی لوگ ان کی تعریف کرتے تھے تو (۶) وہ بڑی بلند تعریف ہوتی تھی۔ جیسے امت محمدیہ کو بھی یہ دعا سکھائی گئی کہ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ گویا زبان بھی ملی تو بلند ملی اور تعریف بھی ملی تو بلند ملی۔

دوسرے معنوں کے لحاظ سے وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے یہ معنے ہوں گے کہ (۷) ان کو شریف زبان دی گئی یعنی ان کی زبان بڑی شستہ تھی ان کی باتوں میں گند نہیں تھا ان کی باتوں میں کینہ، کپٹ اور بُغض نہیں تھا نہایت پاکیزہ اور شائستہ گفتگو کے وہ عادی تھے اور یا پھر اس کے یہ معنے ہوں گے کہ (۸) ہماری طرف سے ان کو شریف تعریف ملی یعنی لوگ ان کی تعریف کرتے تھے تو کہتے تھے کہ ان کے اخلاق نہایت اعلیٰ درجہ کے ہیں بڑے بزرگ اور مقدس انسان ہیں۔

عَلِيًّا کے تیسرے معنے شدید کے ہیں اس لحاظ سے وَ جَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے یہ معنے ہوں گے کہ (۹) ہم نے ان کو شدید زبان دی یعنی ایسی زبان جو صداقت کے اظہار کے لئے بڑی دلیر تھی۔ اگر کوئی مشرک یا خدا تعالیٰ کی ہتک کرنے والا ان کے سامنے آتا تو وہ اسے صاف کہہ دیتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھ سکتے تمہارا راستہ الگ ہے اور ہمارا الگ۔ اور یا پھر اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہماری طرف سے ان کو شدید تعریف ملی یعنی ان کو ایسے تعریف کرنے والے لوگ ملے کہ اگر ان کی گردنوں پر چھریاں بھی رکھ دی جائیں تو وہ یہی کہیں گے کہ

ابراہیمؑ بڑا اچھا تھا۔ اسحاقؑ بڑا اچھا تھا یعقوبؑ بڑا اچھا تھا۔ چنانچہ دیکھ لو مسلمان جب بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام یا حضرت اسحاق علیہ السلام یا حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام لیتے ہیں تو ہمیشہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کہتے ہیں اسی طرح وہ ہر نماز کے آخر میں اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ پر اور اس کی اولاد پر بڑی سلامتی نازل کی تھی اور اس کو بہت برکت دی تھی گویا اس زمانہ میں یہ پیشگوئی صرف مسلمانوں کے ہاتھوں پوری ہو رہی ہے۔

غرض لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا کے دس معنے ہو گئے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ

اور تو قرآن کے مطابق موسیٰ کا بھی ذکر کر وہ ہمارا منتخب بندہ تھا

رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۲﴾

اور رسول (اور) نبی تھا۔

تفسیر ۔ حضرت اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے ذکر کے بعد اب اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرماتا ہے۔ درحقیقت حضرت اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کا ذکر صرف ضمناً کیا گیا تھا اصل مقصود حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر تھا جس کی طرف وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ کے الفاظ بھی اشارہ کرتے ہیں حضرت اسحاق اور یعقوبؑ کا ذکر عہد ابراہیمی کے صرف اس حصہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا تھا جس کا تعلق بنو اسحاق کے ساتھ تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسوی سلسلہ کو لے لیا اور اس طرف اشارہ کیا کہ ابراہیمی نسل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا اور جس کا ایک ظہور اسحاق اور اس کی اولاد کے ساتھ وابستہ تھا اس میں ایک خاص روحانی مقام کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو موسوی مقام ہے کیونکہ اس عہد کا ایک نشان جیسا کی بائبل میں ذکر آتا ہے کنعان پر قبضہ قرار دیا گیا تھا (استثناء باب ۱ آیت ۵ تا ۹) اور یہ قبضہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہی تشریعی نبوت کی بنیاد بنی اسرائیل میں پڑی غرض عیسوی سلسلہ کے سمجھنے کے لئے پہلے ابراہیمؑ کی طرف توجہ دلائی پھر اس طرف توجہ دلائی کہ ابراہیمؑ کی نسل میں سے اسحاقؑ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جو وعدے تھے وہ پورے ہونے شروع ہوئے اور پھر انہی وعدوں کے سلسلہ میں موسیٰ آ گئے اس مناسبت سے اللہ تعالیٰ ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے ذکر کے بعد موسیٰؑ کا ذکر فرمایا ہے۔

فرماتا ہے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى تو کتاب میں موسیٰ کو بھی یاد کر۔ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا وہ ہمارا ایک مخلص بندہ اور ہمارا رسول اور نبی تھا۔

اَخْلَصَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کو خالص کر لینا اور تمام قسم کی ملونیوں اور خرابیوں سے بچا لینا۔

ایک ہوتا ہے مُخْلِصٌ اور ایک ہوتا ہے مُخْلَصٌ۔ کہتے ہیں فلاں شخص بڑا مخلِص ہے مخلص وہ ہوتا ہے جو اپنے تعلقات کے سلسلہ میں ہر قسم کی مداہنت اور نفاق کو اپنے دل سے دور کر دے۔ اور مخلَص وہ ہوتا ہے جسے خدا تعالیٰ ہر قسم کے بدخیالوں، وہموں اور قسم قسم کے شبہات اور وساوس سے خود باہر نکال لے گویا مخلَص وہ ہوتا ہے جسے خدا تعالیٰ محض اپنے لئے انسانوں میں سے منتخب کر لیتا ہے اور اسے ہر قسم کی گندگی سے پاک کر دیتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ جیسے عورتیں آٹا پسوانے لگتی ہیں تو وہ آٹا پسوانے سے پہلے گندم کو صاف کرتی اور اس میں سے مٹی وغیرہ نکالتی ہیں یا جب گوشت پکانے لگتی ہیں تو اس کے چھیچھڑے وغیرہ دور کرتی ہیں اب جہاں تک گندم کا سوال ہے وہ ان کے گھر میں پہلے سے موجود ہوتی ہے گوشت بھی صبح سے آیا ہوا ہوتا ہے۔ مگر جب وہ کسی خاص مقصد کے لئے ان چیزوں کو استعمال کرنے لگتی ہیں۔ تو ان کی صفائی کے لئے خاص توجہ سے کام لیتی ہیں۔ گندم پڑی ہوئی ہوتی ہے لیکن جب پسوانے لگیں تو کنکر اور تنکے وغیرہ اس میں سے نکال دیتی ہیں یا جب آٹا پکانے لگتی ہیں تو اس وقت اسے چھانتی ہیں اسی طرح گوشت پہلے سے موجود ہوتا ہے مگر جب گوشت پکانے کا وقت آئے تو اس وقت عورت اس کے چھیچھڑے وغیرہ دور کرتی ہے یا مثلاً ترکاری گھر میں پڑی ہوئی ہوتی ہے اور اس پر مٹی وغیرہ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ مگر جب ترکاری پکانے کا وقت آتا ہے تو پھر عورتیں اسے پانی سے دھوتی اور چھیلتی ہیں اور اس کی مٹی وغیرہ دور کرتی ہیں تو مخلَص ہونے کا وقت وہ ہوتا ہے جب کسی چیز کے استعمال کا وقت آ جائے۔ یوں اچھی چیز ہمیشہ اچھی ہی ہوتی ہے۔ جو طیب ہے وہ طیب ہی ہوگی مگر اس کی پوری صفائی اس وقت کی جاتی ہے جب اس کے استعمال کا وقت آئے۔ پس کان مُخْلَصًا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایسے وقت میں پیدا ہو جب خدا نے اسے انسانوں میں سے الگ کر لیا اور اسے اچھی طرح پاک کر لیا تا کہ وہ کام جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس کے سپرد ہونے والا تھا اسے عمدگی کے ساتھ سرانجام دے سکے اس سے معلوم ہوا کہ نبی آپ ہی آپ اتفاقاً نہیں ہو جاتا بلکہ الٰہی انتخاب سے ایک روح کو اس کے لئے الگ کیا جاتا ہے گویا مخلَص کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خدمت کے لئے اسے مامور کرنا چاہتا تھا۔

وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا پہلے مخلص بن گیا اور پھر کام کیا سپرد کیا؟ کام صالحیت کا بھی سپرد ہو سکتا تھا۔ شہادت کا بھی

سپرد ہوسکتا تھا۔صدیقیت کا بھی سپرد ہوسکتا تھا مگر ہم نے اسے چنا اور پھر رسالت اور نبوت کے مقام پر فائز کر دیا۔

عام طور پر ہمارے مفسرین بھی یہی لکھتے ہیں اور ہمارے متکلمین بھی یہی لکھتے ہیں کہ رسول وہ ہوتا ہے جو کتاب لاتا ہے اور نبی وہ ہوتا ہے جو کتاب نہیں لاتا۔لیکن وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت کے لئے مامور ہوتا ہے (فتح البیان)۔ چنانچہ کوئی تفسیر اُٹھا کر دیکھ لو اس میں یہی لکھا ہوگا کہ رسول وہ ہوتا ہے جو مامور ہو اور کتاب لائے۔اب اگر رسول کے یہی معنے ہیں تو نَبِیًّا کے کیا معنے ہوئے نبی ان کے نزدیک وہ ہوتا ہے جو مامور ہو مگر کتاب نہ لائے اب جو مامور ہوا اور کتاب لایا وہ جب رسول ہو گیا تو نبی تو آپ ہی آپ ہو گیا پھر رَسُوْلًا کہنے کے بعد نَبِیًّا کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے نزدیک نبی ہونے کے بعد رسول ہونا ضروری نہیں مگر رسول ہونے کے ساتھ تو نبی ہونا ضروری ہے۔یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص مامور بھی ہو اور کتاب بھی لائے اور نبی نہ ہو مگر یہ ہوسکتا ہے کہ ہم ایک شخص کے متعلق لفظ نبی بولیں مگر اس کے پاس کتاب نہ ہو مگر قرآن نے رُسُوْلًا کو پہلے رکھا ہے اور نَبِیًّا کو پیچھے رکھا ہے۔اگر درجہ مراد ہوتا تو اللہ تعالیٰ کہتا کہ کَانَ نَبِیًّا رَّسُوْلًا وہ نبی بھی تھا اور پھر ہم نے اسے کتاب بھی دی مگر وہ پہلے اسے رسول کہتا ہے اور پھر نبی کہتا ہے پس اگر رسول اور نبی کی وہی تعریف ہے جو عام مسلمان کرتے ہیں تو پھر اس کا مطلب کیا ہوا۔یہ تو جاہل آدمی کا طریق ہے کہ وہ کہے کہ صاحب یہ چالیس سال کے ہیں اور یہ دس سال کے بھی تھے۔ہاں اگر کوئی کہنا چاہے تو یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی عمر دس سال ہے اور مجھے خدا نے بتایا ہے کہ یہ چالیس سال کی عمر تک زندہ رہیں گے۔قرآن تو ایک حکیم اور علیم ہستی کا کلام ہے۔یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ اس کے کلام میں یہ بات آجائے کہ فلاں شخص رسول بھی ہے اور نبی بھی جبکہ رسالت میں ہی نبوت بھی شامل ہے کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص مامور ہو اور کتاب بھی لائے مگر وہ نبی نہ ہو۔

پس معلوم ہوا کہ یہ معنے یہاں چسپاں نہیں ہو سکتے یہاں بہرحال کوئی اور معنے کرنے پڑیں گے اور وہ معنے وہی ہیں جو ہماری جماعت کیا کرتی ہے کہ رسول کے معنے ہوتے ہیں بھیجا ہوا۔اور نبی کے معنے ہوتے ہیں خبر دینے والا۔اور یہ بالکل صحیح بات ہے کہ پہلے انسان رسول ہوگا اور پھر نبی ہوگا پہلے خدا اسے بھیجے گا اور پھر وہ لوگوں کو خدا کی باتیں بتائے گا پس رسالت پہلا مقام ہے اور نبوت اس کے بعد کا۔کوئی شخص نبی نہیں ہوسکتا جب تک وہ پہلے رسول نہ ہو مثلاً جب خدا نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں تجھے دنیا کی اصلاح کے لئے بھجواتا ہوں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول بن گئے اور جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ اے مکہ والو! میں تمہیں خدا کی طرف سے یہ خبر دیتا ہوں تو وہ نبی بن گئے۔جب خدا نے یہ کہا کہ اے عیسیٰ میں تجھ کو بنی نوع انسان کی طرف بھیجتا ہوں تو

عیسیٰ رسول بن گئے اور جب عیسیٰ نے یہ کہا کہ اے لوگو میں تمہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام دیتا ہوں تو وہ نبی بن گئے کیونکہ رسول کے معنے ہیں بات سننے والا اور نبی کے معنے ہیں بات بتانے والا۔ پہلے وہ سنے گا تو پھر لوگوں کو کچھ بتائے گا۔ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ وہ سنے بعد میں اور پہنچائے پہلے۔ اسی لئے قرآن کریم نے جہاں بھی بیان کیا ہے رسول کا لفظ پہلے رکھا ہے اور نبی کا بعد میں سورۂ احزاب میں ہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب:۴۱) اسی طرح سورۂ اعراف میں فرماتا ہے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ (الاعراف:۱۵۸) پھر اسی سورۂ اعراف میں دوسری جگہ آتا ہے فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (الاعراف:۱۵۹)۔

غرض ہر جگہ رسول کا لفظ پہلے رکھا ہے اور نبی کا لفظ پیچھے آگے چل کر انہی آیات میں حضرت اسمٰعیل کے متعلق آتا ہے کہ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا حالانکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق سب لوگ مانتے ہیں کہ انہیں کوئی کتاب نہیں ملی۔ وہ اسی شریعت پر چلتے تھے جو حضرت ابرہیم علیہ السلام کی تھی اور حضرت ابراہیمؑ پر ایمان لانے والے صرف اسماعیلؑ، اسحاقؑ، لوطؑ اوران کے چند خادم ہی تھے۔ اگر حضرت ابراہیم کے معاً بعد حضرت اسماعیلؑ کو الگ کتاب مل گئی تھی تو ان کی شریعت پر عمل کس نے کیا پس حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق جو یہ الفاظ آئے ہیں یہ بھی غیر احمدیوں کے خیالات کی تردید کرتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ رسول اور نبی ایک ہی چیز ہے کیونکہ رسول کے معنے Messenger کے ہوتے ہیں اور نبی کے معنے بہت خبریں دینے والے کے ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس شخص کو خدا تعالیٰ Messenger بنا کر بھیجے گا لازماً اسے کوئی پیغام بھی دے گا اور جو شخص لوگوں پر امور غیبیہ کو ظاہر کرے گا وہ لازماً خدا تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہوگا۔ پس درحقیقت ایک مامور من اللہ کا وہ نقطہ جو خدا سے ملتا ہے اس کے لحاظ سے اسے رسول کہتے ہیں کیونکہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے لیکن اس کا وہ نقطہ جو بندوں سے ملتا ہے اس کے لحاظ سے وہ خدا کا نبی کہلاتا ہے یعنی ان کو خدا کی خبریں دیتا ہے پس جو رسول ہو وہ نبی بھی ضرور ہوگا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ بغیر پیغام کے کسی کو نہیں بھیج سکتا۔ اور جو نبی ہو وہ ضرور رسول بھی ہوگا کیونکہ اگر خدا نے اسے نہیں بھیجا تو وہ جھوٹا ہوگا اور مامور من اللہ جھوٹے نہیں ہوتے۔

وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۳﴾

اور ہم نے موسیٰ کوطور کی دائیں جانب سے پکارا اور اس کو اپنے اسرار بتاتے ہوئے اپنے قریب کرلیا۔

حلّ لُغَات۔ جَانِبِ کے معنے پہلو اور کنارا کے ہیں (اقرب)۔

طُوْر ایک خاص پہاڑ کا بھی نام ہے جو سیناء میں ہے اور طور کے معنے عربی زبان میں صرف پہاڑ کے بھی ہوتے ہیں۔ (اقرب)

اَلْاَيْمَن کے معنی اَلْيَمِيْنُ یعنی دائیں کے بھی ہیں اور ذُوْالْيُمْنِ یعنی برکت والے کے بھی ہیں (اقرب)۔

اَيْمَنُ کا لفظ اس جگہ جانب کی بھی صفت ہوسکتا ہے اور طور کی بھی اگر اَيْمَنُ کے معنے دائیں کے کئے جائیں تو جانب کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے طور پہاڑ کی دائیں جانب سے پکارا اور طور کی صورت میں یہ معنے ہوں گے کہ طور سے جو اس کے دائیں جانب تھا ہم نے اسے آواز دی مگر چونکہ اس میں کوئی خاص حکمت نظر نہیں آتی اس لئے مبارک کے معنے زیادہ درست ہیں اس صورت میں اس آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے طور پہاڑ کی برکت والی جانب سے اسے پکارا یعنی جہاں اللہ تعالیٰ کے الہامات پہلے نازل ہو چکے تھے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لو کہ ہم نے بابرکت طور سے اسے پکارا۔

تفسیر۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہی کلام جس جگہ نازل ہوتا ہے وہ جگہ بھی بابرکت ہوجاتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے بعض لوگ جب ہماری جماعت میں نئے نئے داخل ہوتے ہیں اور وہ جماعت کے دوستوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ میرے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا ہاتھوں کو بوسہ دینا شرک تو نہیں؟ خصوصاً اہل حدیث میں سے جو لوگ ہماری جماعت میں داخل ہوتے ہیں وہ بعض دفعہ اس قسم کا سوال کر دیتے ہیں حالانکہ حدیثوں سے صاف ثابت ہے کہ صحابہؓ بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ چوما کرتے تھے (ابن ماجہ کتاب الادب باب الرجل یقبل ید الرجل)۔ وہ اہل حدیث کہلاتے ہیں مگر اس قسم کی حدیثوں کو بھول جاتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ بے جان چیز بھی اگر کسی بابرکت وجود سے وابستہ ہوجائے۔ تو وہ برکت والی ہوجاتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کا کلام جب کسی جگہ پر نازل ہوتا ہے تو وہ جگہ بھی بابرکت ہوجاتی ہے۔

گذشتہ فسادات کے دنوں میں میرے پاس گورنمنٹ کے بعض افسر پیغامات وغیرہ دینے یا چٹھیاں وغیرہ پہنچانے کے لئے آتے رہے ہیں وہ جب بھی میرے پاس آتے ہمیشہ معذرت کرتے کہ ہم مجبور ہو کر آپ کی خدمت

میں آئے ہیں کیونکہ گورنمنٹ نے ہمیں بھیجا ہے۔ ہم شرمندہ بھی ہیں مگر کیا کریں گورنمنٹ نے یہ نازک ذمہ داری ہمارے سپرد کردی ہے اور اب ہم مجبور ہیں کہ اسی طرح کریں۔ ایک دفعہ ایک افسر نے جب اسی قسم کے الفاظ میں معذرت کی تو میں نے اسے کہا کہ بتایئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتی برکت والی تھی یا نہیں؟ اس نے کہا کیوں نہیں وہ بڑی برکت والی تھی کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں تھی میں نے کہا اب بتایئے کیا ابوجہل کی جوتی منحوس تھی یا نہیں؟ اس نے کہا یقیناً منحوس تھی کیونکہ وہ ابوجہل کے پاؤں میں تھی۔ میں نے کہا اس جوتی کی اس میں کیا خوبی تھی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں میں تھی اور اس جوتی کا اس میں کیا قصور تھا جو ابوجہل کے پاؤں میں تھی کہ ایک جوتی کو ہم نے برکت والی بنادیا اور دوسری جوتی کو ہم نے منحوس کہہ دیا؟ میں نے کہا بغیر کسی ارادہ کے بھی اگر کسی اچھے آدمی کا انسان ہتھیار بن جائے تو اچھا ہوجاتا ہے اور کسی برے آدمی کا ہتھیار بن جائے تو برا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ کا الہام جب اس پہاڑ پر نازل ہوا تو وہ پہاڑ بھی بابرکت ہوگیا جیسے خانہ کعبہ میں کیا خصوصیت ہے کہ اسے برکت والا کہا جاتا ہے خانہ کعبہ میں یہی خصوصیت ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ کا الہام نازل ہوا اور خدا تعالیٰ کے نبیوں نے وہاں عبادتیں کیں اور دعائیں کیں اور ان پر اس کے انعامات نازل ہوئے اسی طرح جس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ کی برکت نازل ہوجائے وہ برکت ہمیشہ کے لئے چلتی چلی جاتی ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں ایک دفعہ بتاچکا ہوں انسان کی برکت بدل سکتی ہے کیونکہ انسان جب نیکی کا رستہ ترک کرکے گنہگار ہوجاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی برکت اٹھ جاتی ہے لیکن بے جان چیز چونکہ گناہ نہیں کرتی اس لئے جب وہ ایک دفعہ بابرکت ہوجاتی ہے تو ہمیشہ کے لئے مبارک رہتی ہے اور کبھی بھی اس کی برکت اس سے جدا نہیں ہوتی ضمنی طور پر اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ طور کی وحی موسیٰ اور اس کی قوم کے لئے بڑی مبارک تھی۔

نَجِیًّا کے تین معنے ہوتے ہیں۔

اوّل جس سے مخفی بات کی جائے۔

دوم جس سے بات کی جائے۔

سوم نَجِیًّا کے ایک معنے السَّرِیْعُ کے بھی ہیں النَّاقَةُ النَّجِیَّةُ تیز چلنے والی اونٹنی کو کہتے ہیں۔ (اقرب)

یہ تینوں معنے اس آیت پر چسپاں ہوجاتے ہیں یعنی (۱) ہم نے اس کو قریب کیا اس کے ساتھ اسرار کی بات کرتے ہوئے۔ یعنی علوم روحانیہ اور عرفانیہ اس پر ظاہر کئے شریعت چونکہ لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کی جاتی ہے اس لئے اگر اس کے معنے مخفی بات کے کئے جائیں گے تو تورات مراد نہیں ہوگی کیونکہ وہ کوئی مخفی چیز نہیں تھی بلکہ وہ

تو نازل ہی اسی لئے کی گئی تھی کہ اسے لوگوں تک پہنچایا جائے پس نَجِيًّا سے صرف وہ پیغام مراد ہے جس میں موسیٰؑ کے علاوہ دوسرے لوگ شریک نہیں تھے اور عقلاً بھی وہی بات مخفی کہلا سکتی ہے جس میں دوسرے شریک نہ ہوں پس اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ ہم نے موسیٰ کو قریب کیا اور اس سے وہ باتیں کیں جن میں دوسرے لوگ شریک نہیں تھے۔ اس پر ہم نے اپنے علوم روحانیہ نازل کئے اس سے محبت اور پیار کی باتیں کیں اور اسے اپنے خاص اسرار بتائے اس میں بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ جن لوگوں پر اپنی شریعت یا روحانیت کے راز کھولتا ہے ان کو اپنا مقرب بنا لیتا ہے۔

(۲) نَجِيًّا کے دوسرے معنے بات کرنے کے ہیں اس لحاظ سے آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے اس کو قریب کیا بات کرتے ہوئے چنانچہ تورات نازل ہوئی جس سے دو ہزار سال تک لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔

(۳) نَجِيًّا کے تیسرے معنے سَرِيْعًا کے ہیں پہلے فرمایا تھا کہ كَانَ مُخْلَصًا موسیٰ کو ہم نے انسانوں میں سے چن لیا اور اب فرماتا ہے کہ جب بات کرنے کا وقت آیا تو وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ہم نے کہا موسیٰ آہستہ آہستہ نہیں تیز قدم کے ساتھ چل کر ہماری طرف آؤ۔ چنانچہ موسیٰ دوڑتے ہوئے ہماری طرف آیا۔ جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں ہی ذکر آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے کہا وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى (طه:۸۵) یعنی اے میرے رب میں اس لئے تیرے پاس جلدی جلدی آیا ہوں تا کہ تو میرے اس فعل سے خوش ہو جائے۔

دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم نے اس کو قریب کیا جبکہ ہم سرعت کے ساتھ اس کی طرف چل رہے تھے یعنی موسیٰ کو بھی ہم نے کہا کہ تیز تیز ہماری طرف آ اور ہم نے بھی اس کی طرف محبت میں دوڑنا شروع کر دیا۔ گویا اس میں وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو ایک حدیث میں آتا ہے کہ بندہ جب خدا تعالیٰ کی طرف چل کر جاتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے (مسلم کتاب الذکر و الدعا و التوبة و الاستغفار باب فضل الذکر و الدعا و التقرب الی اللہ و حسن انطن به)۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ اُدھر سے موسیٰ خدا کی طرف دوڑا اور ادھر سے خدا موسیٰ کی طرف دوڑا اور دونوں آپس میں مل گئے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۴﴾

اور ہم نے اس (یعنی موسیٰ) کو اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی بنا کر (مددگار کے طور پر) دیا۔

حل لغات۔ اَخَاهُ وَهَبْنَا کا مفعول ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ کو اس کا بھائی بخشا۔

تفسیر ۔قرآن کریم میں دوسری جگہ سورۂ طٰہٰ میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ (طٰہٰ:۳۰) میرے اہل میں سے مجھے ایک مددگار عطا فرمایا جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ دعا سنی اور حضرت ہارونؑ کو بھی نبوت کے مقام پر فائز کر دیا۔اس جگہ وَھَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِیًّا میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اور انبیاء کا مقام نبوت ایک الگ رنگ رکھتا ہے اور ہارون کا مقام نبوت اور رنگ رکھتا ہے ہارون ہم نے موسیٰ کو اپنی رحمت سے عطا کیا تھا گویا وہ نبی تو تھا مگر موسیٰ کا ایک خادم اور آپ کے ماتحت کے طور پر تھا۔

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ

اور تو قرآن کے مطابق اسماعیل کا بھی ذکر کر۔وہ بھی یقیناً سچے وعدوں والا تھا

كَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۚ﴿۵۵﴾

اور رسول (اور) نبی تھا۔

تفسیر ۔اب اللہ تعالیٰ اس تمام ذکر کو پھر اسماعیلؑ کی طرف واپس لوٹاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ عیسوی سلسلہ کوئی الگ سلسلہ نہیں بلکہ موسوی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور موسوی سلسلہ کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہے جن کے دو بیٹے تھے اسماعیل اور اسحٰق۔اسحاق کے متعلق بھی وعدہ تھا کہ خدا اسے اور اس کی نسل کو ترقی دے گا اور اپنا عہد اس کے ذریعہ سے پورا کرے گا اور اسماعیل کے متعلق بھی وعدہ تھا کہ خدا اسے برکت دے گا اسے بڑھائے گا اور اسے ایک بڑی قوم بنائے گا لیکن بائبل سے یہ بھی ظاہر ہوتا کہ عہد ابراہیمی گو اسحاق کے ذریعہ شروع ہونا تھا مگر پورا ان کے دونوں بیٹوں کے ذریعہ سے ہونا تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی حکمت کے ماتحت پہلے ابراہیم اور اسحاق کا ذکر کیا اور پھر موسیٰ کا ذکر کر کے بتایا کہ عیسیٰ تو نسل ابراہیمی کے دو سلسلوں میں سے صرف ایک سلسلہ کی آخری کڑی ہے اسے تم نے آسمان پر کیوں چڑھا رکھا ہے اور کیوں یہ سمجھتے ہو کہ دنیا کا جو آخری نجات دہندہ آنا تھا وہ مسیح کی شکل میں آ چکا۔تم جانتے ہو کہ ہم نے ابراہیمؑ سے اسحاق کے متعلق بھی وعدہ کیا تھا اور اسماعیل کے متعلق بھی وعدہ کیا تھا۔اسحٰق اور اس کی نسل کے ساتھ ہمارا جو وعدہ تھا وہ پورا ہوا جس کی آخری کڑی کے طور پر مسیح دنیا میں آیا اب تم ابراہیم کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کو بھی یاد کرو اس کے متعلق ہم نے ابراہیم سے جو وعدے کئے

تھے وہ وعدے بھی ہم نے پورے کرنے تھے یا نہیں ہم نے بنو اسحاق کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہوئے موسیٰ جیسا عظیم الشان نبی ان میں پیدا کر دیا۔ اب اسماعیلی وعدوں کے پورا ہونے کا وقت آیا تو ہم نے اس کی نسل میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کر دیا۔

غرض اسماعیل کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ابراہیمی عہد کے دوسرے ظہور کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کیا ہے اور عیسائیوں کو بتلایا ہے کہ جس قسم کا درجہ تم عیسیٰ ؑ کو دیتے ہو اگر وہ درست ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اسماعیل کے متعلق جو وعدے کئے گئے تھے وہ بھی ختم ہو گئے ہیں اور ابراہیمی دعائیں بھی ضائع ہو گئی ہیں حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ دو وعدے کئے گئے تھے ایک اسحاق کے متعلق اور ایک اسماعیل کے متعلق گویا بتایا گیا تھا کہ نسل ابراہیمی سے برکتوں کے دو سلسلے جاری ہوں گے ایک سلسلہ اسحاق کے ذریعہ چلے گا اور ایک سلسلہ اسماعیل کے ذریعہ چلے گا اسماعیل اگرچہ بڑا لڑکا تھا مگر خدا نے فرمایا کہ میں اپنا عہد اسحاق سے شروع کروں گا چنانچہ وہ سلسلہ شروع ہوا اور اللہ تعالیٰ نے دو ہزار سال تک بنو اسحاق کو نبوت اور حکومت عطا فرمائی اب اگر مسیح پر آ کر یہ تمام سلسلہ ختم ہو جانا تھا تو اس کے معنے یہ تھے کہ اسماعیل کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا وہ بالکل جھوٹ تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ تمہارا یہ کہنا کہ عیسیٰ ایسے مقام پر تھا کہ جس کے بعد عہد ابراہیمی ختم ہو گیا بائبل کے صریح خلاف ہے تمہیں اب اس دوسرے سلسلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے جو ہم نے ابراہیم کے دوسرے بیٹے اسماعیل کی نسل میں سے جاری کیا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ان الفاظ میں عیسائیوں اور یہودیوں پر ایک سخت چوٹ کی گئی ہے فرماتا ہے اسماعیل بڑے سچے وعدے کرنے والا تھا مگر تمہارے نزدیک مَیں ہی جھوٹے وعدے کرنے والا ہوں۔ وہ ہمارے لئے اپنی جان تک دینے کے لئے تیار رہتا تھا۔ خود بائبل میں لکھا ہے کہ

> ’’اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا‘‘ (پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۲)

یعنی اس کی زندگی ہمیشہ تلواروں کے سایہ تلے گذرے گی اور وہ دین کے لئے ہمیشہ اپنے بھائیوں سے نبرد آزما رہے گا۔

اسی طرح بائبل میں حضرت اسماعیل کے متعلق آتا ہے کہ

> ’’خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا‘‘ (پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰)

گویا بائبل کی شہادت بھی اس امر پر موجود ہے کہ حضرت اسماعیل خطرناک حالات میں سے بھی گذرے مگر پھر بھی انہوں نے خدا کو نہ چھوڑا۔ جب وہ دین کے لئے اس قدر فدائیت کی روح اپنے اندر رکھتا تھا اور خدا تعالیٰ کی خاطر خطرناک سے خطرناک حالات میں اپنے آپ کو ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا تو اے عیسیٰ کے ماننے والو! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اسے چھوڑ دوں اور ان خبروں کو پورا نہ کروں جو اس کی آئندہ نسل کے متعلق میں نے دی تھیں۔ حالانکہ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا اسے میں نے دنیا کی طرف بھیجا تھا اور پھر میں نے اسے خبریں بھی دی تھیں۔ گویا میں نے اسماعیل کے متعلق دوہری خبریں دیں۔ ایک دفعہ میں نے ابراہیم کے ذریعہ اسماعیل اور اس کی نسل کی ترقی کی خبر دی اور دوسری دفعہ خود اسماعیل کو میں نے اس بارہ میں الہامات کئے اور اسماعیل وہ تھا جو بڑے سچے وعدے کرنے والا تھا مگر اب تم یہ چاہتے ہو کہ میں ابراہیم کو بھی جھوٹا ثابت کروں اور اسماعیل جو بڑا راست باز انسان تھا اس کو بھی جھوٹا ثابت کروں اور خود بھی جھوٹا بنوں۔

وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ

اور اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا رہتا تھا اور اپنے رب

مَرْضِيًّا ﴿۵۶﴾

کے نزدیک پسندیدہ وجود تھا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے جب میں نے اس کو کہا کہ میں آئندہ تیری نسل میں سے ہدایت اور رشد کا ایک سلسلہ جاری کرنے والا ہوں تو اس نے اس امید میں تہیّہ کر لیا کہ اب میں اپنی اولاد کو ہمیشہ نیکی کی باتیں سکھلاؤں گا تاکہ خدائی وعدوں کے پورا ہونے میں آسانی ہو۔ چنانچہ وہ اپنی اولاد کو ہمیشہ نمازوں اور دعاؤں کی تاکید کیا کرتا تھا اور زکوٰۃ دیا کرتا تھا اور خدا نے جو کام اس کے سپرد کیا تھا اس کو وہ پورا کرنے والا تھا اور خدا اس سے بڑا خوش تھا۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود تم کہتے ہو کہ خدا نے حضرت مسیح کو اپنا بیٹا بنا کر بھیج دیا اور اب دنیا کی نجات کے لئے آئندہ کوئی نیا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ عقل کی بات ہے کہ اتنے عرصہ سے ہماری پیشگوئیاں چلی آ رہی ہوں اور پھر وہ پوری نہ ہوں۔ افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین نے اس حکمت کو نہیں سمجھا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے یہاں اسماعیل کا ذکر کیا ہے کیوں اس سے پہلے موسیٰ اور ہارون کا ذکر کیا ہے پھر موسیٰ اور ہارون کے ذکر سے پہلے کیوں اسحٰق اور یعقوب کا ذکر

کیا ہے اور اسحاق اور یعقوب کے ذکر سے پہلے کیوں ابراہیم کا ذکر کیا ہے۔ وہ صرف اتنا لکھ دیتے ہیں کہ برسبیل تذکرہ ابراہیم کا ذکر آ گیا برسبیل تذکرہ موسیٰ کا ذکر آ گیا برسبیل تذکرہ اسماعیل کا ذکر آ گیا۔ گویا جس طرح ہم بعض دفعہ غلطی سے دوسروں کا آگے پیچھے ذکر کر دیتے ہیں اسی طرح خدا تعالیٰ سے بھی نعوذ باللہ غلطی ہوگئی ہے کہ اس نے ترتیب سے ذکر کرنے کی بجائے ان نبیوں کا آگے پیچھے ذکر کر دیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک ایک نبی کا ذکر اپنے مقام پر ہے کسی ایک نبی کا ذکر بھی آگے پیچھے نہیں پہلے زکریاؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیے تھا پھر یحییٰ کا ہی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ پھر مسیح کا ہی ذکر ہونا چاہیے تھا پھر ابراہیم کا ہی ذکر ہونا چاہیے تھا پھر اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا ہی ذکر ہونا چاہیے تھا پھر موسیٰ اور ہارون کی ہی ذکر ہونا چاہیے تھا اور پھر اسماعیل کا ہی ذکر ہونا چاہیے تھا یہ بتانے کے لئے کہ ایک سلسلہ تو مکمل ہو گیا۔ اب دوسرے سلسلہ کی طرف چلو جس خدا نے اتنا بڑا سلسلہ چلایا ہے کیا وہ دوسرا سلسلہ نہیں چلائے گا؟

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۷﴾ ۙ

اور تو قرآن (کریم) کے رو سے ادریس کا بھی ذکر کر وہ بھی صدیق نبی تھا۔

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۸﴾

اور ہم نے اسے نہایت اعلیٰ مقام تک پہنچایا تھا

تفسیر۔ اس آیت کے متعلق دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ادریسؑ کون تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ادریسؑ کا ذکر اس جگہ کیوں آیا؟

مفسرین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ ادریس حنوک کا نام تھا اور حنوک حضرت آدم علیہ السلام کے پڑپوتے اور حضرت نوح علیہ السلام کے دادا تھے (فتح البیان زیر آیت ھذا) انگریزی میں حنوک کو (Enoch) لکھتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ الیاس ہیں اور ان کے الیاس لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ الیاس کے متعلق بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں۔ دوسرے حضرت مسیح کے متعلق یہ خبر تھی کہ ان کے آنے سے پہلے ایلیاہ نبی آسمان سے دوبارہ آئے گا۔ پس انہوں نے اس خیال سے کہ مسیحؑ کے ساتھ الیاس کی مشابہت ہے یہ قیاس کیا ہے کہ اس جگہ ادریس سے الیاس ہی مراد ہے مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں اور یوں بھی یہ خیال اس وجہ سے غلط ہے کہ قرآن کریم میں الیاس کا نام آتا ہے پس الیاس کا ہی کسی دوسرے نام سے ذکر کرنا غیر معقول تھا یا تو عرب لوگ

الیاس کا تلفظ ادا کرنے سے قاصر ہوتے تب بے شک کہا جا سکتا تھا کہ اس جگہ ادریس سے الیاس مراد ہے مگر جب الیاس کا نام قرآن کریم نے استعمال کیا ہے تو ادریس سے الیاس مراد لینا یقیناً غلط ہے اور اس کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔حنوک کے معنے اور ادریس کے معنے آپس میں ملتے جلتے ہیں ۔حنوک کے معنے عبرانی زبان میں Dedication یا Instruction کے ہیں یعنی سکھانا یا کسی چیز کی طرف منسوب کر دینا (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۲ زیر لفظ Enoch) اور ادریس کے معنے بھی اسی رنگ کے ہیں ۔دَرَسَ کے معنے ہیں پڑھا اور دَرَّسَ کے معنے ہیں پڑھایا۔پس ادریس کے معنے ہوئے بڑا پڑھنے والا یا بڑا پڑھانے والا گویا Instruction کے معنے بھی اس میں آجاتے ہیں اور Dedication کے معنے بھی اس میں آجاتے ہیں کیونکہ جو شخص کسی کام میں لگا رہتا ہے وہ اس میں ماہر ہو جاتا ہے اور اسی کام کے لئے وقف ہو جاتا ہے ۔پس ادریس کے معنوں میں بھی یہ پایا جاتا ہے کہ ''بڑی مہارت رکھنے والا اور فن کے لئے وقف ہو جانے والا'' گویا جو معنے عبرانی میں حنوک کے پائے جاتے ہیں وہی ادریس کے عربی میں پائے جاتے ہیں۔

اقرب الموارد والا لکھتا ہے کہ یہ لفظ عَلَم عجمی ہے یعنی عجمی نام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ غیر منصرف ہے اور غیر منصرف اگر عَلَم ہو تو اس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ عجمی ہو چونکہ ادریس غیر منصرف ہے اس لئے بوجہ عَلَم ہونے کے یہ عجمی لفظ بھی ہے ورنہ یہ غیر منصرف نہ ہوتا۔

ابن السکیت کا خیال ہے کہ یہ غیر منصرف ہے اور عربی ہے وہ کہتے ہیں کہ ادریس کے معنے عربی زبان میں پائے جاتے ہیں جیسے اَبْلَسَ سے اِبلِیس ہے اسی طرح اَدْرَسَ سے اِدرِیس ہے۔پس یہ لفظ عربی ہے اور انہوں نے اس پر اصرار کیا ہے اور کہا ہے کہ جیسے یعقوب عقب سے اور اسرائیل اسر ال سے نکلا ہے اسی طرح ادریس اَدْرَسَ سے نکلا ہے اور گو انہوں نے یہ نہیں لکھا مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض اور نام بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو عربی زبان سے نکلے ہیں مثلاً اضحاق ضحك سے ہے اسماعیل سمع سے ہے پس ان کے نزدیک ادریس عربی لفظ ہی ہے لیکن جو دوسرے ماہرین زبان ہیں ان کے نزدیک یہ ناقابل قبول بات ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ عربی ہوتا تو غیر منصرف نہیں ہو سکتا تھا۔اس صورت میں یہ عربی عَلَم قرار دیا جائے گا اور عربی عَلَم غیر منصرف نہیں ہوتا۔پس انہوں نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس لفظ کو عربی قرار دینے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں ایک یہ کہ عَلَم ہو اور دوسری یہ کہ غیر منصرف نہ ہو۔

اصمعی نے اور قرطبی نے اور صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ جس زبان کا یہ لفظ ہے اس زبان میں

قریباً قریباً انہی معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہو جن معنوں میں عربی میں استعمال ہوتا ہے۔اس وجہ سے ابن السکیت کو غلطی لگ گئی ہو اور انہوں نے سمجھ لیا ہو کہ یہ عربی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ہم بھی یہی مانتے ہیں کہ یہ عربی نہیں اگر عربی ہوتا تو غیر منصرف نہ ہوتا لیکن ہم یہ سمجھیں گے کہ اس زبان میں بھی اس کے یہی معنے ہوں گے اس وجہ سے ابن السکیت کو دھوکہ لگ گیا مگر میرے نزدیک دونوں فریق کو دھوکہ لگا ہے۔ابن السکیت نے جو یہ کہا ہے کہ یہ عربی لفظ ہے یہ غلط ہے (تفسیر قرطبی)۔اگر قاعدہ کی رو سے یہ عربی ہوتا تو غیر منصرف نہیں ہوسکتا تھا۔اور جو دوسرے علماء نے کہا ہے کہ عجمی لفظ ہے اور عجمی لفظ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہوگیا ہے۔انہوں نے بھی حقیقت کو پورے طور پر نہیں سمجھا اس لئے کہ وہ بھی مانتے ہیں کہ اس کا نام حنوک تھا اور جب اس کا نام حنوک تھا تو پھر ادریس اس کا ترجمہ ہوا اور جب یہ ترجمہ ہوا تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ اس میں علمیت نہ رہی اور اس کے غیر منصرف ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ رہی کیونکہ غیر منصرف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اگر عَلَم ہو تو وہ عجمی ہو اگر ادریس ترجمہ ہے حنوک کا تو پھر علمیت نکل گئی اور اگر یہ عَلَم ہے تو پھر ادریس حنوک کا نہیں بلکہ کسی اور نبی کا نام ہوگا۔اور اگر وہ حنوک ہی ہے تو ادریس اس کا ترجمہ ہوا اور جب یہ ترجمہ ثابت ہوگیا تو علمیت سے بھی نکل گیا۔پس جن لوگوں نے اسے غیر منصرف قرار دیا ہے انہیں بہر حال غلطی لگی ہے۔ورنہ اسے غیر منصرف قرار دینے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

اب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ جب ادریس حنوک کا ترجمہ ہے تو پھر عربوں نے اسے غیر منصرف کیوں قرار دے دیا آخر عربوں میں ادریس کا نام پہلے بھی پایا جاتا تھا اور وہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے ہی اس کے غیر منصرف ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے۔پس جب نزول قرآن سے پہلے ہی وہ اسے غیر منصرف قرار دے چکے تھے تو ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ ان کو یہ غلطی کیوں لگی اور وہ اس دھوکہ میں کس طرح مبتلا ہوگئے۔کہ یہ غیر منصرف ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کو یہ دھوکہ رہا ہے کہ وہ عربی زبان کے بھی بڑے ماہر ہیں اور غیر زبانوں کا بھی بڑا مطالعہ رکھتے ہیں حالانکہ وہ عربی زبان کے تو بے شک ماہر ہوں گے مگر غیر زبانوں کے متعلق ان کا مطالعہ بہت ہی محدود تھا۔اور نہ صرف غیر زبانوں کے متعلق بلکہ غیر مذاہب کے متعلق بھی ان کے معلومات نہایت سطحی تھے ہم جب تفاسیر پڑھتے ہیں اور ان میں بائبل کے حوالے آتے ہیں تو ہمیں ان حوالوں کو پڑھ کر شرم آجاتی ہے کیونکہ وہ اتنے غلط اور خلاف واقعہ ہوتے ہیں کہ توراۃ اور انجیل سے انہیں کوئی دور کی بھی نسبت نہیں ہوتی بالکل غلط اور سرتاپا غلط حوالہ جات ان تفسیروں میں آجاتے ہیں۔اور لکھا ہوتا ہے کہ یہ بات تورات میں ہے۔یہ بات انجیل میں ہے۔حالانکہ وہ بات نہ توراۃ میں موجود ہوتی ہے نہ انجیل میں موجود ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محض یہودیوں سے

بات سن کر اپنی کتابوں میں درج کر لیتے تھے۔اور یہودی ان سے کھیل کھیلتے تھے۔وہ بالکل جھوٹی باتیں اپنی طرف سے بنا کر انہیں بتا دیتے تھے۔اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ یہودی بڑے دیانتدار ہیں۔جب انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق ایک بات بتائی ہے تو وہ ضرور سچی ہوگی۔چنانچہ جب بھی انہیں بائبل کے متعلق کوئی بات دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ یہودی علماء کے پاس چلے جاتے۔اور وہ انہیں بالکل من گھڑت قصے اور واقعات بتا دیتے۔اور یہ ان قصوں کو اپنی تفسیروں میں درج کر لیتے۔جب یہودیوں کو اس کا علم ہوتا تو وہ اور زیادہ ہنسی اُڑاتے کہ دیکھو ہم نے تو ان سے مذاق کیا تھا اور انہوں نے اس کو اپنی کتابوں میں درج کر لیا اب یہ لوگوں کی نگاہ میں خوب رسوا ہوں گے۔اس سے بے شک ہمارے علماء کی دیانتداری اور نیکی تو ثابت ہوتی ہے۔مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ غیر مذاہب کے متعلق ان کا علم بہت محدود اور ناقص تھا۔اگر خدا تعالیٰ کسی وقت مسلمانوں کو توفیق دے اور وہ تفاسیر میں سے تورات اور انجیل کا باب نکال دیں تو گو یہ ایک غیر معمولی بات ہوگی مگر اس کے نتیجہ میں ہمیں غیر مذاہب والوں کے سامنے وہ ذلت محسوس نہیں ہوگی جو اب محسوس ہوتی ہے اتنی غلط باتیں تورات اور انجیل کے متعلق تفسیروں میں پائی جاتی ہیں کہ جن کی کوئی حد ہی نہیں۔حدیثوں میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباس سے کسی نے پوچھا کہ فلاں بات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا میں پھر بتاؤں گا۔چنانچہ وہ شخص چلا گیا اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے مجھے بلایا اور کہا کہ فلاں یہودی کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ تمہاری کتابوں میں اس کے متعلق کیا لکھا ہے۔اُس نے ایک نہایت ہی لغو اور فضول اور بیہودہ قصہ بیان کر دیا۔دوسرے دن وہ شخص آیا تو راوی کہتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اسے وہی لغو اور بے ہودہ قصہ بتا دیا جو اس یہودی نے بتایا تھا۔اب اس میں حضرت ابن عباسؓ کا قصور نہیں قصور اس یہودی کا ہی ہے مگر حضرت ابن عباسؓ کا اتنا قصور ضرور ہے کہ انہوں نے مومنانہ طور پر یہ یقین کر لیا کہ وہ خبیث اور بے ایمان یہودی جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔مگر باوجود اس کے کہ حضرت ابن عباس نے جو کچھ کیا اپنی سادگی اور نیکی کے نتیجہ میں کیا، پھر بھی ہماری کتابوں میں ان باتوں کا موجود ہونا ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے۔آج کل ہم بھی تحقیقات کرتے ہیں۔مگر اس تحقیق میں ہم عربی کی کتابوں سے مدد لیتے ہیں۔عبرانی اور یونانی کتابیں دیکھتے ہیں۔لغت کو مدنظر رکھتے ہیں تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر کوئی بات پیش کرتے ہیں ممکن ہے کہ کسی وقت ہماری تحقیق میں بھی کوئی غلطی ثابت ہو جائے۔مگر بہر حال ہماری باتیں سچ کے گرد چکر لگا رہی ہیں۔کیونکہ ہماری بنیاد حقیقت لغت اور اسرار لغت اور تاریخی واقعات پر ہے۔اور بعض مفسرین کی بنیاد محض جھوٹے واقعات اور جھوٹے قصوں پر ہے۔اور ان دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ان

مفسرین میں سے بعض کا یہ طریق تھا کہ وہ یہودیوں کے پاس جاتے اور ان سے دریافت کرتے کہ فلاں بات کس طرح ہے اور یہودی ان سے مذاق کر دیتے تھے۔ مثلاً رعد کا لفظ آیا تو وہ کسی یہودی عالم کے پاس چلے گئے اور اس سے پوچھا کہ بتایئے رعد کیا چیز ہے؟ اس نے کہا کہ رعد ایک فرشتہ ہے جو آسمان پر ہوتا ہے۔ اس کے اتنے پر ہوتے ہیں وہ اس طرح پر ہلاتا ہے تو اس سے سیٹیوں کی آواز پیدا ہوتی ہے سیٹیوں کی آواز سے مور پیدا ہوتے ہیں۔ مور کے پروں سے آگ نکلتی ہے اور آگ سے کڑک اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اس شخص نے تو ایک مذاق کیا تھا مگر انہوں نے اپنی سادگی سے یہ سمجھ لیا کہ اس نے جو کچھ بکواس کیا ہے وہ بالکل درست ہے اور یہی رعد کی تفسیر ہے۔ اس چیز نے ان تفاسیر کے علمی پایہ کو بہت گرا دیا ہے۔ بہر حال یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ادریس کا نام اسلام سے پہلے عربوں میں پایا جاتا تھا اور حنوک کا مفہوم ادریس سے ملتا جلتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس کا نام حنوک تھا اسے ادریس کیوں کہتے تھے؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ بعض لوگوں کے دو نام بھی ہوتے ہیں۔ ہم نے کئی لوگ ایسے دیکھے ہیں جن کو بعض دفعہ دوسرے ناموں سے بھی بلایا جاتا ہے اور جب پوچھا جائے کہ یہ کیا؟ تو لوگ کہتے ہیں کہ ان کا فلاں نام بھی ہے۔ پس ہو سکتا تھا کہ یہ توجیہہ کر لی جاتی کہ حنوک کا ادریس بھی نام تھا۔ مگر اس میں ہمارے لئے دقت یہ ہے کہ یہودی لٹریچر میں کہیں بھی ادریس کا نام نہیں آتا۔ یہودی نیم مسلمہ عہد نامہ قدیم یعنی ایپوکریفا (The Apocrypha An American Translation pg.xi) میں ایک ایڈراس Esdras نام آتا ہے مگر اس کی باتیں حنوک پر چسپاں نہیں ہوتیں۔ جو باتیں قرآن کریم نے حضرت ادریس کے متعلق بیان کی ہیں وہ حنوک پر ہی چسپاں ہوتی ہیں۔ ایڈراس (Esdras) پر نہیں۔ پس اس مسئلہ کو ہم اس طرح بھی حل نہیں کر سکتے کہ ادریس حنوک کا دوسرا نام تھا۔

میرے نزدیک اس کا ایک اور حل ہے اور وہ یہ کہ بعض دفعہ دوسری قوم کے لوگ سمجھانے کے لئے نام کا ترجمہ کر دیتے ہیں یہی طریق حنوک کے بارہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کسی یہودی نے اپنے کسی عرب دوست کے سامنے حنوک کا نام لیا تو وہ حیران ہوا کہ یہ حنوک کیا چیز ہے۔ وہ یہودی کوئی ذہین شخص تھا اور عربی بھی جانتا تھا۔ خود مدینہ میں بھی یہود آباد تھے اس نے حنوک کا عربی میں ترجمہ کر کے بتا دیا کہ حنوک کو تم ادریس سمجھ لو۔ یوں حنوک کا نام بھی عربی میں موجود ہے مگر ایک اور شکل میں چنانچہ عربی زبان میں حنک کا لفظ پایا جاتا ہے اور اس سے حنوک کا سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں تھا۔ مگر چونکہ یہ لفظ عربی میں اس شکل میں نہیں پایا جاتا اس لئے اس کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ بہر حال اس یہودی عالم نے عربوں کو سمجھانے کے لئے حنوک کا ترجمہ ادریس کر دیا۔ اب یہ لازمی

بات ہے کہ جب ایک عرب اس نام کو سنے گا تو وہ خیال کرے گا کہ یہ عَلَم بھی ہے اور عجمی بھی ہے کیونکہ اس کا بتانے والا عجمی ہوگا۔ پس میرے نزدیک اس کو غیر منصرف اس لئے کہا گیا ہے کہ یہودیوں نے کسی زمانہ میں اسلام سے پہلے عربوں کو یہ بتانے کے لئے کہ حنوک کیا چیز ہے۔ ایسے الفاظ میں جو اہل عرب کے لئے قریب اِلی الفہم تھے اس کا ترجمہ کرکے ادریس بتادیا۔ جیسے اس شخص کو جو بڑے عزم اور ارادے والا ہو انگریزی میں ولیم (William) کہتے ہیں۔ ولیم مجموعہ ہے Will اور Helm کا اور Will کے معنے ارادہ اور Helm کے ایک معنے Helmet کے ہیں اور Helmet کے معنے لوہے کی خود کے ہوتے ہیں۔ پس ولیم کے معنے ہوئے زرہ جیسی یا خود جیسی نیت اور عزم رکھنے والا۔ اس کا عربی میں ترجمہ کریں گے تو اولوالعزم کہہ دیں گے۔ اب اگر کسی انگریز کے سامنے ہم اس کا ذکر کریں اور وہ ہم سے پوچھے کہ اولوالعزم کیا ہوتا ہے؟ تو ہم کہیں گے ولیم۔ گویا اس کو سمجھانے کے لئے ہم اسی کی زبان میں اس کا ترجمہ کردیں گے اور یہ طریق نہ صرف دنیا میں رائج ہے بلکہ خدا تعالیٰ بھی اسی طرح کرتا ہے۔

میں نے ایک دفعہ رؤیا میں دیکھا کہ میں انگلستان گیا ہوں اور ایک فاتح جرنیل کی طرح اس میں داخل ہوا ہوں اور میں اس وقت سمجھتا ہوں کہ میں ولیم دی کنکرر ہوں (یہ رؤیا تفصیل کے ساتھ الفضل ۲۴ جون ۱۹۲۴ء میں چھپا ہوا ہے) چونکہ الہاموں میں میرا ایک نام اولوالعزم بھی آیا ہے اس لئے خدا تعالیٰ نے مجھے اس کا ترجمہ کرکے دکھا دیا۔ تو اصل حقیقت یہ ہے کہ عربوں کو حنوک کا ترجمہ کرکے ادریس بتایا گیا۔ اور چونکہ ان کے سامنے اسے نام کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس لئے انہوں نے سمجھا کہ یہ عَلَم ہے۔ اور چونکہ بتانے والا عجمی تھا انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ عجمی ہے۔ اصل میں عربی اور عبرانی دونوں ایک ہی زبانیں ہیں مگر رفتہ رفتہ عرب بھی اس بات کو بھول گئے اور یہودی بھی بھول گئے کہ عربی اور عبرانی تو ایک ہی چیز ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے عبرانی کو بالکل غیر زبان سمجھ لیا۔ یہودیوں کے نزدیک عربی غیر زبان تھی اور عربوں کے نزدیک عبرانی غیر زبان تھی۔ حالانکہ عربی زبان اصل تھی اور عبرانی ایک قبیلہ کی زبان تھی باقی رہا عربی اور عبرانی کا اختلاف سو یہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض دفعہ زبان ایک ہی ہوتی ہے مگر ایک علاقہ والا اور طرح بولتا ہے اور دوسرے علاقہ والا اور طرح بولتا ہے۔

میں جب حج کے لئے گیا تو سیٹھ ابوبکر صاحب کے ہاں جدہ میں ٹھہرا۔ اُن کا ایک یمنی نوکر تھا۔ میں اس سے عربی زبان میں گفتگو کرتا رہا اور میں نے دیکھا کہ وہ میری باتوں کو خوب سمجھتا تھا مگر کسی کسی بات پر وہ حیران ہوکر میرا منہ دیکھنے لگ جاتا اور اسے پتہ نہ لگتا کہ میں نے کیا کہا ہے آخر میں نے کسی سے پوچھا کہ یہ بات کیا ہے؟ تو اس نے کہا کہ یمنیوں اور حجازیوں کے بعض الفاظ میں بڑا بھاری فرق ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ وہ آپ کی بات کو سمجھ

نہیں سکتا پھر اس نے لطیفہ سنایا کہ مکہ میں ایک امیر عورت تھی جس کا ایک یمنی ملازم تھا۔ یمن کے لوگ اکثر مکہ میں علم حاصل کرنے کے لئے آجاتے ہیں اور چونکہ ان کی معاش کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اس لئے وہ گھروں میں ملازم ہوجاتے ہیں۔ اسی وجہ سے مکہ میں یمنی نوکر بڑی کثرت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ بہرحال وہ اس عورت کے ہاں ملازم تھا۔ وہ عورت حقہ پینے کی عادی تھی۔ یوں بھی مکہ والے حقہ پینے کے بڑے شائق ہوتے ہیں وہ بڑے بڑے خوبصورت حقے پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سو سو روپیہ میں خریدتے ہیں اور حقہ کے نیچے جو پانی والا برتن ہوتا ہے وہ بھی مٹی کا نہیں بلکہ شیشے کا ہوتا ہے۔ ہمارا ملک چونکہ غریب ہے اس لئے یہاں لوگ معمولی حقہ پر گذارہ کر لیتے ہیں اور حقے کا برتن جس میں پانی ڈالا جاتا ہے وہ بھی مٹی کا ہی ہوتا ہے۔ مگر ان کے بڑے بڑے نفیس حقے ہوتے ہیں۔ شیشے کا برتن ہوتا ہے جس میں سے پانی اُوپر کو اٹھتا ہوا نظر آتا ہے اور لمبے لمبے پیچوان ہوتے ہیں جن میں پانچ پانچ چھ چھ گز کا چکر پڑا ہوا ہوتا ہے۔ ایک دن جبکہ اس عورت نے حقہ کا پانی بدلنا چاہا تو اس نے اپنے نوکر کو بلایا اور کہا غَیِّرِ الشَّیْشَۃَ۔ شیشہ کا پانی بدل دو۔ لفظی لحاظ سے تو اس کے اتنے ہی معنے ہیں کہ شیشہ بدل دو۔ مگر محاورہ میں اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ شیشہ کا پانی بدل دو۔ لیکن یمنی زبان میں غَیِّرِ الشَّیْشَۃَ کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ شیشے کا برتن توڑ دو۔ جب اس عورت نے نوکر سے کہا کہ غَیِّرِ الشَّیْشَۃَ تو وہ حیران ہو کر کہنے لگا کہ سِتِّیْ ھٰذَا طَیِّبٌ۔ آقا یہ تو بڑی اچھی چیز ہے۔ سِتِّیْ، سَیِّدَتِیْ سے بگڑا ہوا ہے۔ اسے غصہ آیا کہ میں کہہ رہی ہوں پانی بدل دے اور یہ کہتا ہے کہ یہ تو بڑا اچھا ہے چنانچہ وہ اسے ناراض ہوئی کہ قُلْتُ لَکَ غَیِّرِ الشَّیْشَۃَ میں جو تجھ سے کہتی ہوں کہ شیشے کا پانی بدل دے پھر تو کیوں نہیں بدلتا۔ اس نے پھر ڈرتے ڈرتے کہا سِتِّیْ ھٰذَا طَیِّبٌ۔ بیگم صاحبہ! یہ تو بڑا اچھا ہے اس پر عورت نے اسے ڈانٹ کر کہا کہ جب میں تمہیں بار بار ایک بات کہہ رہی ہوں تو تم کیوں نہیں مانتے۔ اس پر اس نے شیشے کا برتن اٹھایا اور زور سے دیوار کے ساتھ مار کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ عورت نے شور مچادیا کہ کم بخت تو نے یہ کیا کر دیا۔ اتنا قیمتی برتن تو نے ضائع کر دیا ہے۔ اس نے کہا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ برتن بڑا اچھا ہے اسے ضائع مت کریں مگر آپ ماننے میں ہی نہیں آتی تھیں۔ اب میں نے آپ کے حکم کو مان کر اسے توڑ دیا ہے تو آپ خفا ہو رہی ہیں۔ اس پر عورت اور زیادہ خفا ہوئی۔ مگر آخر کسی یمنی زبان کے واقف نے اسے بتایا کہ اس میں نوکر کا کوئی قصور نہیں۔ یمن میں تَغْیِیْر کے معنے تَکْسِیْر یعنی توڑ دینے کے ہی ہوتے ہیں۔

تو زبان میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے ہی بڑے بڑے تغیرات پیدا ہوجاتے ہیں۔ عربی اور عبرانی میں بھی اسی وجہ سے فرق نظر آتا ہے ورنہ اسماعیل اور اسحاق دونوں ابراہیم کی اولاد میں سے ہی تھے۔ مگر چونکہ اسماعیل اور

جگہ رہے اور اسحاق اور جگہ۔ اس لئے عربی اور عبرانی میں فرق پیدا ہو گیا۔ لیکن اس فرق کے باوجود کوئی لفظ نکال لو وہ عربی سے ضرور ملتا جلتا ہوگا۔ مجھے تو بہت ہی کم کوئی ایسا لفظ نظر آیا ہے جو عربی سے نہ ملتا ہو حنوک کو ہی دیکھ لو۔ عبرانی میں حنوک کہا جاتا ہے اور عربی میں حنک کا لفظ موجود ہے یا مثلاً حضرت مسیحؑ نے صلیب کے وقت کہا کہ ایلی ایلی لما سبقتانی۔ یہ سبقتانی عربی کا سَبَقْتَنِیْ ہی ہے۔ صرف عبرانی میں ت کو لمبا کر دیا گیا ہے۔ یا مثلاً اسمٰعیل جو سمع اور ایل سے مرکب ہے اسے عبرانی میں یشمائیل کہتے ہیں (پیدائش باب ۶ آیت ۱۵)۔ پس عربی اور عبرانی دراصل ایک ہی زبانیں ہیں مگر سوال یہ نہیں کہ حقیقت کیا ہے بلکہ سوال یہ ہے کہ عرب والے کیا سمجھتے ہیں۔ عرب والے عبرانی کو غیر زبان سمجھتے ہیں اور عبرانی زبان والے عربی کو غیر زبان سمجھتے ہیں پس چونکہ وہ شخص جس نے حنوک کا عربوں کو نام بتایا اور جس نے ان کی آسانی کے لئے اس کا عربی میں ترجمہ کر دیا وہ ایک ہبرو تھا۔ اس لئے عربوں نے اس کو غیر منصرف بنالیا اور سمجھ لیا کہ یہ عَلَم عجمی ہے۔ بہر حال جس وجہ سے اسے غیر منصرف بنایا گیا وہ یہی تھی ورنہ ادریس ایک عربی لفظ ہے جو دَرَسَ سے نکلا ہے ابن السکیت نے تو صرف چند مثالیں دی ہیں اور کہا ہے کہ یعقوب عقب سے اور اسرائیل اسرال سے نکلا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی اور عبرانی کے سارے ہی الفاظ آپس میں ملتے ہیں درحقیقت عربی اور عبرانی دو بہنیں ہیں یا یوں کہو کہ عربی ماں ہے اور عبرانی بیٹی۔ یوں تو سنسکرت وغیرہ بھی عربی زبان ہی کی بیٹی ہیں۔ مگر وہ زبانیں ایسی ہیں جیسے پڑپوتی ہوتی ہیں۔ اور عبرانی وہ زبان ہے جو عربی کے پیٹ میں سے نکلی ہوئی ہے۔ پس چونکہ عبرانیوں نے حنوک کا ادریس کی شکل میں ترجمہ کر کے عربوں کو بتایا۔ اس لئے عربوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ عَلَم بھی ہے اور عجمی بھی۔ اصمعی قرطبی اور صاحب کشاف کا یہ کہنا کہ وہ لوگ جو ادریس کو عربی لفظ قرار دیتے ہیں جاہل ہیں، یہ دراصل ان کی اپنی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یعقوب بھی عَقَبَ سے نکلا ہے۔ اسماعیل بھی سَمَعَ اِیل سے نکلا ہے ادریس بھی دَرَسَ سے نکلا ہے یسوع بھی سَاعَ یَسُوْعُ سے نکلا ہے جس کے معنے ہلاکت اور زوال کے ہیں چونکہ حضرت مسیح کے لئے صلیب مقدر تھی اس لئے پہلے سے ہی آپ کا یہ نام رکھ دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ یہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوگا جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خدا تعالیٰ نے آپ کی والدہ اور دادا سے محمد رکھوایا اور آپ کی کامیابی اور اعلیٰ درجہ کی زندگی کی طرف اس نام میں ہی اشارہ کر دیا۔

غرض یہ ساری غلطی عربی اور عبرانی کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کو عجمی قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ادریس کے کوئی معنے نہیں۔ جیسے ان کے نزدیک اسمٰعیل کے بھی کوئی معنے نہیں۔ اضحاق کے بھی کوئی معنے نہیں حالانکہ ادریس کے بھی معنے ہیں۔ اسمٰعیل کے بھی معنے ہیں۔ اضحاق کے بھی معنے ہیں اور اسرائیل کے بھی معنے

ہیں۔ ابن السکیت نے لکھا ہے کہ اسرائیل اسرال سے نکلا ہے مگر یہ درست نہیں۔ اسرائیل کا عبرانی تلفظ یسرائیل ہے جو یسرا اور ایل سے مرکب ہے یسر کے معنے جنگجو اور بہادر سپاہی کے ہیں اور ایل کے معنے خدا کے ہیں۔ پس اسرائیل کے معنے ہیں خدا کا بہادر سپاہی حنوک جسے انگریزی میں اینوخ لکھتے ہیں اس کے معنے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے خوب سکھانے والے کے ہیں اور ادریس کے معنے خوب پڑھانے والے کے ہیں خوب پڑھانے والا اور سکھانے والا ہم معنے الفاظ ہیں۔ پس ادریس یقیناً حنوک کا عربی ترجمہ ہے۔ مگر عربوں کو جب حنوک کے معنے بتائے گئے تو انہوں نے ادریس کو نام سمجھا اور چونکہ انہوں نے یہ یہودیوں سے سنا تھا اس لئے انہوں نے اس کو عجمی نام سمجھا اور اس کو غیر منصرف قرار دے دیا۔

حنوک (یعنی) ادریس کا ذکر بائبل میں کتاب پیدائش میں آتا ہے۔ چنانچہ پیدائش باب ۴ میں اسے قائن کی نسل سے لکھا ہے (قائن وہی ہے جسے عربی میں قابیل کہتے ہیں اور جو ہابیل کا قاتل تھا) گویا ایک حنوک قائن کا بیٹا تھا۔ اس کا بیٹا عیراد۔ اس کا بیٹا محویا ایل۔ اس کا بیٹا مقوسا ایل۔ اس کا بیٹا لمک اس کے بیٹے یابل یوبل ایک بیوی سے اور دوسری سے توبلقائن۔ (آیت ۱۷ تا ۲۲)

باب ۵ میں لکھا ہے کہ جب ہابیل مارے گئے تو آدم کو اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ سیت بیٹا دیا۔ سیت وہی ہیں جن کو ہمارے مفسر شیثؑ کہتے ہیں سیت سے انوس۔ انوس سے قینان قینان سے محلل ایل اور محلل ایل سے یارد اور یارد سے حنوک اور حنوک سے متوسلح۔ متوسلح سے لمک پیدا ہوا اور لمک سے نوح پیدا ہوا۔ (پیدائش باب ۵ آیت ۳ تا ۲۹)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے ہی حنوک کا نام مقبول ہو گیا تھا چنانچہ آدم کی پانچ سات پشتوں میں ہی دو آدمیوں کا نام حنوک رکھا گیا۔ ایک قائن کا بیٹا تھا اور ایک سیت نبی کا پانچویں پشت میں پوتا تھا اور یہی حنوک ہے جسے ادریس کہا گیا ہے جو حضرت نوحؑ کے دادا تھے۔ اسلامی روایات کے مطابق آدمؑ کے نسب نامہ میں پہلے نبی آدم تھے جو باپ تھے دوسرا نبی شیث تھا جو آدم کا بیٹا تھا۔ تیسرا نبی حنوک تھا جو آدم کا پانچوں پڑپوتا تھا اور چوتھا نبی نوح تھا جو پانچویں پڑپوتے کا پوتا تھا۔

حنوک کے حالات۔ بائبل کی کتاب پیدائش باب ۵ آیت ۲۱ تا ۲۴ میں لکھا ہے کہ حنوک ۳۶۵ سال تک زندہ رہا اور متوسلح کی پیدائش پر جو اس کا پہلا بیٹا تھا اور ۶۵ سال کی عمر میں پیدا ہوا حنوک خدا کا مقرب بنا اور تین سو سال تک اس مقام پر قائم رہا بائبل کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ تین سو سال تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ (یعنی خدا تعالیٰ کی معیت اسے حاصل ہوئی) پھر لکھا ہے کہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہی وہ غائب ہو گیا۔ اس لئے کہ

خدا نے اسے لے لیا۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ حنوک یعنی ادریس موت تک نیکی پر قائم رہا اور ایسی حالت میں اس پر موت آئی مگر الفاظ پرستی کا برا ہو بعض یہود اور مسلمانوں نے عجوبہ پرستی سے کام لے کر اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ گویا خدا تعالیٰ نے اسے آسمان پر اٹھا لیا (ایسے مسلمانوں کے نزدیک وہ آسمان پر اٹھائے جانے والوں کی فہرست میں شامل ہے جن میں الیاس اور مسیح ناصری کا وجود بھی ہے)

بائبل کہتی ہے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اگر ''لے لیا'' کے معنے لفظی کئے جائیں تو ''ساتھ ساتھ چلتا تھا'' کے معنے بھی لفظی کرنے ہوں گے۔ اور اس صورت میں یا تو ان آیات کا یہ ترجمہ کرنا ہوگا کہ ادریس آسمان میں ساری عمر رہا اور وہاں خدا اور وہ ساری عمر چہل قدمی کرتے رہے اور یا یہ معنی کرنے ہوں گے کہ حنوک کے ۶۵ سال کی عمر کو پہنچے پر خدا تعالیٰ زمین پر آ گیا اور حنوک کے ساتھ رہتا رہا بہر حال ۳۶۵ سال کی عمر میں آسمان پر اٹھائے جانے کا مسئلہ یہاں سے نہیں نکلتا یا یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۶۵ سال کی عمر میں حنوک آسمان پر چلا گیا۔ اور اس کی بیوی بھی وہیں چلی گئی اور آسمان پر اس کے کئی بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ (باب ۵ آیت ۲۳) کیونکہ اسی وقت سے اس کے خدا کے ساتھ ساتھ چلنے کا بھی ذکر ہے اور اس کے بیٹے بیٹیاں پیدا ہونے کا بھی ذکر ہے اور یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ حنوک یا ادریس آسمان پر گیا ہی نہیں بلکہ خدا آسمان سے زمین پر اتر کر اس کے پاس آ گیا اور چونکہ خدا کا پھر آسمان پر جانا بائبل سے ثابت نہیں اس لئے یہی کہنا پڑے گا کہ خدا پھر زمین پر ہی رہا۔

خلاصہ یہ کہ غیر طبعی اور خلاف سنت الٰہیہ بائبل کی آیتوں کے معنے کر کے ایسا تمسخرانہ مضمون خدا تعالیٰ کی طرف اور بائبل کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے جسے کوئی عقل تسلیم نہیں کر سکتی۔ سیدھی سادی بات تھی کہ حنوک آخری دم تک خدا تعالیٰ کا مقرب رہا اور خدا تعالیٰ کا قرب اسے زندگی میں بھی حاصل رہا اور مرنے کے بعد بھی وہ اس کے مقربوں میں شمار ہوا۔

یہی محاورہ خدا تعالیٰ کے ساتھ چلنے کا اور جگہوں میں بھی بائبل میں آیا ہے لیکن وہاں اس کے معنے آسمان پر جانے کے کوئی نہیں کرتا۔ مثلاً نوح علیہ السلام کے بارہ میں آتا ہے

''نوح خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا'' (پیدائش باب ۶ آیت ۹)

پھر حضرت ابراہیمؑ کے بارہ میں آتا ہے

''تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو'' (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱)

اسی طرح تمام بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے آتا ہے کہ اے انسان خدا تجھ سے کیا چاہتا ہے یہی کہ

''اپنے خدا کے ساتھ فروتنی سے چلے'' (میکاہ باب ۶ آیت ۸)

اب کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تمام بنی اسرائیل سے یہ کہا گیا ہے کہ تم اپنا سر نیچا کر کے خدا کے ساتھ ٹہلا کرو۔ پس خدا کے ساتھ چلنے کے ہرگز یہ معنے نہیں کہ خدا تعالیٰ کسی مقام پر ہے جہاں انسان اس کے ساتھ چلتا ہے اور نہ اٹھا لینے کے معنے مقام بدلنے کے ہیں بلکہ اس کے معنے بھی صرف نیک انجام پانے اور موت کے بعد خدا تعالیٰ کا مقرب ہونے کے ہیں نئے عہد نامے میں بھی حنوک یا ادریس کا ذکر ہے مگر وہاں اپنی علمیت جتانے کے لئے ک کو ق سے بدل کر لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے میں بتا چکا ہوں کہ عربی میں بھی حنک کا لفظ موجود ہے۔ پس اس کا تلفظ حنوک ہی ہے۔ حنوق نہیں۔ بہرحال عبرانیوں باب ۱۱ آیت ۵ میں لکھا ہے

''ایمان کے سبب سے حنوق اٹھایا گیا تا کہ موت کو نہ دیکھے اور نہ ملا اس لئے کہ خدا نے اسے اٹھا لیا تھا''۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ پولوس یہود کے اس عام عقیدے سے متاثر تھا کہ حنوک بوجہ نیک ہونے کے موت سے بچ گیا اور آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ حالانکہ یہ عقیدہ مسیحی عقیدہ کے خلاف ہے۔ مسیحی عقیدہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ موت گناہ سے ہے اور گناہ ورثہ سے ہے اور آدم کے گناہ کی وجہ سے تمام بنو آدم گنہگار ہیں انہیں مسیح نے کفارہ کے ذریعہ ورثہ کے گناہ سے نجات دی لیکن پولوس نے یہ نہ سوچا کہ حنوک مسیح کے بغیر موت سے نجات پا گیا اور نیک ہو گیا اور مسیحی بلکہ حواری بھی باوجود کفارہ پر ایمان لانے کے موت سے نجات نہ پا سکے۔ یا دوسرے لفظوں میں نیک نہ ہو سکے۔ پس جب مسیحی کفارہ پر ایمان لانے کے باوجود موت سے نہیں بچے جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ گناہوں سے پاک نہیں ہوئے اور حنوک مسیح پر ایمان لائے بغیر موت سے بچ گیا۔ اور نیک ہو گیا تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کفارہ کی ساری تھیوری ہی باطل ہے۔

بائبل کے بعض ماہرین حزقیل باب ۱۴ آیت ۱۴ اور حزقیل باب ۲۸ آیت ۳ میں جو دانی ایل کا نام آتا ہے اسے درحقیقت حنوک یعنی ادریس قرار دیتے ہیں۔

حزقیل باب ۱۴ آیت ۱۴ میں لکھا ہے

''ہرچند یہ تین شخص نوح اور دانی ایل اور ایوب اس میں موجود ہوتے تو خداوند یہوواہ کہتا ہے کہ وے اپنی صداقت سے فقط اپنی ہی جانوں کو بچاتے۔''

یعنی یہود آج کل اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ اگر نوح اور دانی ایل اور ایوب بھی ان میں موجود ہوتے تب بھی خدا ان کی وجہ سے یہود کو اپنے عذاب سے نہ بچاتا وہ صرف اپنی ہی جانوں کو بچا سکتے تھے یہود ان کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچ سکتے تھے۔ ان الفاظ پر بائبل کے عالم ہیلی وے (Halevi) نے اور بعد میں شین (Cheyne) نے انسائیکلو پیڈیا ببلیکا کی جلد ۲ میں یہ ثابت کیا ہے کہ دانی ایل اس جگہ پر غلط لکھ دیا گیا ہے اصل میں اس جگہ پر حنوک (یعنی ادریس) مراد ہے (زیر لفظ Enoch)۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ حزقیل کا زمانہ مسیح سے قریباً پونے چھ سو سال سے چھ سو سال قبل تھا اور یہی زمانہ دانی ایل کا بھی ہے۔ پس ان علماء کا خیال ہے کہ چونکہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اس جگہ پر سابق انبیاء کا ذکر ہے اس لئے دانی ایل کا نام غلطی سے لکھا گیا ہے درحقیقت اس جگہ پر حنوک کا ذکر ہے ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ یہاں دانی ایل کا نام ہے یا حنوک کا ہم اس بحث سے جو فائدہ اٹھا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہودی علماء تسلیم کرتے ہیں بائبل میں غلط باتیں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ایک معین غلطی یہ ہے کہ بائبل میں دانی ایل کا نام لکھا ہے۔ لیکن یہودی اور عیسائی علماء کہتے ہیں کہ یہاں دانی ایل غلط لکھا گیا ہے اصل میں حنوک کا نام چاہیے۔

اسی طرح حزقیل کی کتاب کے باب ۲۸ کی آیت ۳ میں لکھا ہے۔

''دیکھ تو دانی ایل سے زیادہ دانشمند ہے''

یہاں بھی دانی ایل غلط لکھا گیا ہے اور اس جگہ بھی درحقیقت حنوک کا لفظ تھا اگر یہ استدلال درست ہے اور بظاہر حالات اس کی تائید میں ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کے انبیاء کی زبانوں پر حنوک کا نام اپنی دانائی اور اپنے تقویٰ میں بطور ایک ضرب المثل کے جاری رہتا تھا یعنی علاوہ اس نتیجہ کے کہ بائبل میں دانی ایل کا نام آتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد دانی ایل نہیں بلکہ حنوک ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ بائبل میں دیدہ ودانستہ یا جہالت سے تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ایک یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جب بائبل دانی ایل کو دانشمندی میں نمونہ قرار دیتی ہے اور بائبل کے علماء کہتے ہیں کہ اس سے حنوک مراد ہے تو بائبل کے اصل الفاظ یہ ہوئے کہ

''دیکھ تو حنوک سے زیادہ دانشمند ہے''

گویا حنوک کا نام اپنی دانائی کی وجہ سے قدیم انبیاء کی زبانوں پر بطور ایک ضرب المثل کے جاری رہتا تھا۔

حنوک کا ذکر یہودی اور مسیحی احادیث ولٹریچر میں۔ یہودیوں کی مشہور مذہبی کتاب ٹارگم (Targum) میں جو ان کی احادیث کا مجموعہ ہے جیسے ہمارے ہاں مشکوٰۃ ہے لکھا ہے کہ حنوک خدا کا نیک بندہ تھا اور اس کو متاترن

(Metatron) اور سفرا ربّہ (Safra Rabba) یعنی بڑے عالم یا مذہبی علوم کے عالم کا خطاب دے کر خدا نے آسمان پر اٹھالیا۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا زیر لفظ Enoch)

سفر کے معنے عربی زبان میں کتاب کے ہوتے ہیں اور اسفار اس کی جمع ہے۔ پس سفرا کے معنے ہوئے کتابیں اور سفرا ربہ کے معنے ہوئے خدائی علوم والا متاترن کے متعلق میں نے تحقیقات نہیں کی، لیکن اس کے معنے بھی بڑے عالم کے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال ٹارگم میں لکھا ہے کہ حنوک کو خدا تعالیٰ نے متاترن اور سفرا ربہ کا خطاب دے کر آسمان پر اٹھالیا۔ لیکن بعض یہودی کتابوں میں لکھا ہے کہ حنوک آخری عمر میں نیکی کے رستہ سے ہٹ گیا تھا اور خدا نے اسے اس لئے اٹھالیا تا کہ وہ بدکار ہو کر برا انجام نہ دیکھے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ آسمان پر نہیں اٹھایا گیا بلکہ طاعون سے مرا تھا۔ (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵۔۱۷۸ Enoch)

یہودی کتب میں یہ بھی آتا ہے کہ لکھنے کا علم حنوک نے ایجاد کیا تھا۔ اسی طرح علم ہیئت اور حساب بھی اسی نے ایجاد کیا تھا (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ صفحہ ۱۷۸ بحوالہ سفر یوہاسین Sefer Yuhasin) مسلمانوں میں بھی اسی قسم کی روایات آتی ہیں (قصص الانبیاء از عبدالوہاب النجار) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہودی کتب سے ہی یہ باتیں نقل کی ہیں۔

یہودیوں کی ابتدائی تاریخ میں حنوک کا نام قریباً مٹ گیا تھا لیکن کچھ صدیوں کے بعد حنوک کا ذکر ان کی کتابوں میں آنے لگا۔ چنانچہ بعد میں ایک الہامی کتاب حنوک کی کتاب کے نام سے ان میں شائع ہوتی رہی۔ سفر حنوک (یعنی کتاب حنوک) میں لکھا ہے کہ لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے خدا نے زمین کو چھوڑ دیا اور حنوک کو آسمان پر اٹھالیا اور آسمانی خزانوں کا اس کو نگران مقرر کر دیا۔ اور فرشتوں کا سردار مقرر کر دیا اور خدا کے تخت کے سامنے خاص مصاحب کے طور پر وہ مقرر کیا گیا۔ اس کو سب راز معلوم ہیں اور فرشتے اس کی پشت پر ہیں اور وہ خدا کا منہ ہے اور وہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتا ہے وہ روحانی علوم سکھاتا ہے وہ آرام کی جگہ پر روحوں کو لے جاتا ہے اور خدا کے منہ کا شہزادہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح اس کا نام تورات کا شہزادہ، دانائی کا شہزادہ، عقل کا شہزادہ اور شان وشوکت کا شہزادہ بھی ہے۔ موسیٰؑ پر خدا کا پیغام لانے والا وہی تھا (گویا ایک طرح اسے جبریل کا عہدہ دیا گیا تھا)

سفر حکالوت (Sefer Hekalot یعنی تذکرۂ انبیاء و اولیاء) میں لکھا ہے کہ ربّی اسماعیل جب آسمان پر گیا تو وہ ساتویں آسمان پر جا کے ادریس کو ملا جس کو متاترن کا عہدہ دیا گیا ہے۔ وہاں حنوک نے اپنے اٹھائے جانے کا قصہ مندرجہ ذیل الفاظ میں اس سے بیان کیا۔

زمین کی بدی کی وجہ سے جوشمہا زائی (Shamzai) اور عزائیل (Azael) نے پیدا کی حنوک کو خدا نے آسمان پر اٹھایا تا کہ وہ دیکھ لے کہ خدا ظالم نہیں۔

یہ عزائیل وہی ہے جسے عربی میں عزازیل کہتے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جب شیطان نے دنیا میں شرارتیں شروع کیں اور لوگوں نے خدائی احکام کو نہ مانا تو اللہ تعالیٰ نے دیکھا کہ حنوک کو یہ برا لگا ہے۔ چنانچہ اس نے حنوک کو آسمان پر اُٹھا لیا وہاں اسے متاترن کا عہدہ دیا گیا اور دانائی کے سب دروازے اس کے لئے کھولے گئے۔ اور سب فرشتوں کا اسے سردار مقرر کیا گیا اور اس کے مادی جسم کو نورانی جسم میں تبدیل کر دیا گیا۔

حیٔ حنوک (Hayye Hanok) نامی کتاب جسے عربی میں حیاۃ حنک کہیں گے یعنی حنوک کی زندگی کے حالات (حنک عربی میں اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی عمر کے مختلف کاموں سے تجربات حاصل کر لے گویا صاحب تجربہ آدمی) اس پہلی کتاب سے بعد میں لکھی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حنوک ایک نیک راہب تھا اسے آسمانی آواز نے دنیا کے لوگوں کی طرف بھیجا اور پھر اس نے ان کو آکر توبہ کی تعلیم دی بہت سے شاگرد اس کے گرد جمع ہو گئے اور دانائی میں ترقی کرتے کرتے وہ بادشاہ منتخب کیا گیا۔ ۲۴۳ سال تک اس نے دنیا میں امن قائم رکھا لیکن آخر اس نے خلوت کی خواہش کی اور اپنا تخت چھوڑ دیا مگر کبھی کبھی لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے ظاہر ہو جا تا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد خدا تعالیٰ نے اسے زمین چھوڑنے کا حکم دیا اور آسمان پر خدا کے بیٹوں کی حکومت اس کے سپرد کی (خدا کے بیٹوں سے یہودیوں کے نزدیک خدا کے فرشتے مراد ہیں) وہ آسمان پر ایک گھوڑے پر سوار ہو کر گیا جس طرح ایلیاہ نبی آسمان پر گیا تھا بہت سے لوگ اس کو آسمان پر چڑھتے ہوئے دیکھنے کے لئے جمع ہوئے اور انہوں نے اس کی سخت منتیں کیں کہ وہ آسمان پر نہ جائے اور ان میں رہے لیکن اس نے ان کی نہ سنی اور آسمان پر چلا گیا۔

بعض یہودیوں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اس نے موسوی قانون کے نازل ہونے پر اسے اختیار کر لیا گو قانوناً وہ صرف نوح کی شریعت کا پابند تھا جس میں صرف سات احکام تھے (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ زیر لفظ Enoch)

یہ ایسی ہی روایت ہے جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا

اَلَا یَا اَیُّهَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاْسًا وَّنَاوِلْهَا

یعنی سعدی نے زلیخا میں کیا ہی اچھا کہا ہے کہ ؎

اَلَا یَا اَیُّهَا السَّاقِیْ اَدِرْ کَاْسًا وَّنَاوِلْهَا

حالانکہ زلیخا سعدی نے نہیں لکھی بلکہ ملاں جامیؒ نے لکھی ہے۔اور پھر جو بات بیان کی ہے وہ نہ سعدی نے کہی ہے نہ ملاں جامی نے بلکہ حافظ شیرازی نے کہی ہے (دیوان حافظ)۔اسی طرح اس روایت میں کہا گیا ہے کہ وہ نوحؑ کی شریعت کا پابند تھا۔حالانکہ نوحؑ اس کا پوتا تھا۔عیسائی لٹریچر میں سے کتاب عبرانیوں کا حوالہ پہلے درج کیا جاچکا ہے۔اس کے علاوہ عیسائیوں میں حنوک کے متعلق دو کتابیں پائی جاتی ہیں جن کو الہامی صحیفے قرار دیا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ مسیح سے پہلے لکھی گئی تھیں مگر ان کا وجود صرف مسیحیوں میں ملتا ہے۔اس لئے اسے مسیحی لٹریچر کا حصہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ان میں سے ایک صحیفہ حنوک مطابق حبشی کلیسیاء کے ہے اور ایک صحیفہ حنوک مطابق روسی کلیسیاء (Slavonic) کے ہے حبشی کتاب تو مختلف روایتوں کے ٹکڑوں کا مجموعہ ہے۔لیکن Slavonic یعنی روسی کتاب حنوک ایک زیادہ تفصیلی کتاب ہے ان دونوں کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حنوک اپنی زندگی میں ہی آسمان پر چلا گیا اور وہ خدا کے فرشتوں کے ساتھ آسمان اور زمین میں چلتا پھرتا تھا۔پھر وہ اپنے رشتہ داروں کے پاس آیا اور اس نے ان کو وہ باتیں بتائیں جو اس نے آسمان پر دیکھی تھیں اور پھر آخر میں وہ آسمان پر اٹھالیا گیا۔اپنے آسمانی سفر میں (۱) اس نے آسمان اور زمین کے راز معلوم کئے اور (۲) طبیعات کے تمام قانون اس پر کھولے گئے (۳) اس نے خدا کے بیٹوں یعنی فرشتوں کو بھی دیکھا جن کو کہ انسان کی بیٹیوں سے بدکاری کرنے کے جرم میں سزا دی گئی تھی (۴) اس نے ان سزا یافتہ فرشتوں کی سفارش کی۔(جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ زیر لفظ Enoch)

حنوک کی کتاب کا ذکر یہودی اور عیسائی لٹریچر میں عام طور پر پایا جاتا ہے گو کسی معین شکل میں اس کا ذکر نہیں۔ تیسری صدی عیسوی میں عیسائی علماء نے اس کتاب کو غلط قرار دینا شروع کیا نویں صدی عیسوی کے بعد اس کا ذکر بالکل ہی عیسائیت کے لٹریچر سے اڑ گیا لیکن ۱۷۷۳ء میں بروس (Bruce) نامی سیاح نے ایبے سینیا میں اس کے دو نسخے دریافت کئے اور انیسویں صدی میں اس کے کئی اڈیشن شائع کئے گئے ان نسخوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشی نسخہ اصل میں عبرانی میں لکھا گیا تھا۔اور پھر اس کا یونانی میں ترجمہ کیا گیا اس یونانی نسخے سے حبشی زبان میں اور پھر لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔۸۷۔۱۸۸۶ء میں یونانی نسخہ کے بھی کچھ ٹکڑے مل گئے اور وہ چھاپے گئے۔ یہ کتاب عیسائی لٹریچر میں نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔کیونکہ اس کتاب سے قبل از مسیح یہودی مذہبی تاریخ پر اور مذہبی خیالات پر اہم روشنی پڑتی ہے۔(جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ زیر لفظ Enoch)

سلافی زبان یعنی روسی زبان میں ایک کتاب حنوک کے رازوں کی کتاب کے نام سے ملتی ہے اس کتاب کا وجود صرف سلافی زبان میں پایا جاتا ہے۔لیکن اب اس کے جرمنی اور انگریزی میں ترجمے ہو گئے ہیں اس میں زیادہ

تفصیل کے ساتھ حنوک کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور مختلف ٹکڑوں کو ایک ترتیب دے دی گئی ہے۔ یہ کتاب اصل میں یونانی میں لکھی گئی تھی اس کے بعد سلافی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا۔ کچھ حصے عبرانی سے ترجمہ کئے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ بائبل کے مشہور عالم چارلس (Charles) کا خیال ہے کہ اس کتاب کا اکثر حصہ ایک ہی مصنف کا لکھا ہوا ہے۔ اور غالباً وہ مصر کا رہنے والا تھا کیونکہ مصری خیالات کا پرتو اس میں نظر آتا ہے۔ یہ کتاب علماء کے نزدیک پچاس سے ستر سال قبل مسیح لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں ایک نئے خیال کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ یعنی دوزخ کو بھی آسمان پر ہی قرار دیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ دوزخ تیسرے آسمان پر ہے اور گنہگار فرشتے دوسرے آسمان پر رکھے گئے ہیں۔ (The Lost Books of the Bible p.83,84)

حنوک کے متعلق جو واقعات اوپر بیان ہوئے ہیں یہ مختلف انبیاء کے واقعات سے مشابہت رکھتے ہیں۔ بلکہ مختلف قوموں کے بزرگوں کے واقعات سے مشابہت رکھتے ہیں مثلاً الیاس کے واقعات سے اسی طرح حرقیول (Hercules) گینی میڈ (Ganymede) سیمی رامیس (Semiramis) زی سوتھروس (Xisuthrus) اور بادشاہ اناکوس (Annacus) کے واقعات بھی اسی قسم کے بتائے جاتے ہیں (جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد ۵ زیر لفظ Enoch) بابل کے بادشاہ ایمی دورانکی Enmendurana کے حالات بھی جو بابل کے ابتدائی بادشاہوں میں سے ساتواں تھا اسی طرح کے بتائے جاتے ہیں۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حنوک اصل میں سورج دیوتا کا نام ہے۔ آہستہ آہستہ یہ ایک انسان کا نام قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ اس کی عمر ۳۶۵ سال بتائی گئی ہے۔ اور ۳۶۵ دن سورج کے سال کے ہوتے ہیں (جیوش انسائیکلوپیڈیا زیر لفظ Enoch)۔ تعجب ہے کہ مسیحی مصنفوں کو ۳۶۵ سال کی بناء پر حنوک کو سورج دیوتا قرار دینے کا خیال تو آ گیا لیکن یہ خیال نہ آیا کہ حنوک کے بیٹوں بیٹیوں اور دادوں پڑ دادوں کی عمریں نوسو اور دس سو اِسی بائبل میں بیان کی گئی ہیں۔ پس بجائے اس کے کہ ۳۶۵ کی بناء پر آدمی کو خیالی قرار دیا جائے دوسری لمبی عمروں کو دیکھتے ہوئے آدمیوں کی بجائے عمروں کو کیوں نہ خیالی قرار دیا جائے اگر ۳۶۵ کا ایک عدد حنوک کو خیالی قرار دینے کے لئے کافی ہے تو وہ دس بارہ عمریں جو آٹھ سو، نوسو اور ہزار سال کی بیان کی گئی ہیں ان کی بناء پر ان اعداد کو ہی کیوں نہ خیالی قرار دے دیا جائے؟ اسلامی لٹریچر میں حنوک کا ذکر ادریس کے نام سے کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ادریس اور حنوک کے معنے ایک ہی ہیں۔ اس لئے مفسرین قرآن کا یہ نظریہ کہ ادریس سے مراد حنوک ہی ہے بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح ادریس کے حالات کی طرف جو اشارہ قرآن کریم میں پایا جاتا ہے وہ بھی اس سے

ملتا جلتا ہے۔

احادیث میں ذکر آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادریس کو اپنے معراج میں چوتھے آسمان پر دیکھا (ابن کثیر جلد ۶ زیر آیت مریم ۵۶،۵۷) تفاسیر میں اسرائیلی روایتوں کے ذریعہ سے یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ ادریسؑ اپنے ایک دوست فرشتہ کے ذریعہ سے چوتھے آسمان پر گئے اور وہاں عزرائیل نے ان کی جان نکالی۔لیکن بعض دوسرے مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ ادریسؑ کی جان نہیں نکالی گئی چنانچہ مجاہد کا قول ہے کہ ادریسؑ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا اور وہ مرے نہیں جس طرح کہ عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ ان کو چھٹے آسمان پر اٹھا لیا گیا حسنؒ کی روایت ہے کہ ان کو جنت کی طرف لے جایا گیا (ابن کثیر جلد ۶ زیر آیت مریم ۵۶و۵۷۔روح المعانی زیر مریم آیت ۵۷) یہ تمام روایات اسرائیلی ہیں یعنی کوئی بھی روایت ایسی نہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہو سوائے معراج کی حدیث کے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ انہوں نے چوتھے آسمان پر ادریسؑ کو دیکھا پس جہاں تک اسلامی روایتی لٹریچر کا سوال ہے بہت سی وہ لغو باتیں جو اسرائیلی لٹریچر میں پائی جاتی ہیں مسلمانوں نے بھی نقل کی ہیں لیکن جہاں تک اسلامی مذہبی لٹریچر کا سوال ہے حدیثوں میں صرف ادریس کے چوتھے آسمان پر ہونے کا ذکر ہے اور قرآن کریم میں صرف یہ ذکر ہے کہ وہ راست باز تھے اور نبی تھے اور ان کو بلند مقام پر خدا تعالیٰ نے اٹھایا۔اور حقیقتاً حنوک کے اتنے ہی حالات ہیں جن کو سچا کہا جا سکتا ہے اور کتاب پیدائش سے بھی اتنا ہی پتہ لگتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ چلتا تھا یعنی راستباز تھا اور یہ کہ خدا نے اس کو ایک بلند مقام پر اٹھا لیا یعنی اس کا انجام بخیر ہوا۔اور اللہ تعالیٰ نے اس کو مرنے کے بعد بھی اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔

ادریسؑ کے متعلق یہ جو ذکر آتا ہے کہ آسمان سے ان کے لئے گھوڑا آیا اور اس پر وہ چڑھ کر گئے بعینہٖ ایسا ہی ذکر مسلمانوں کی معراج کی روایتوں میں بھی ہے مسلمانوں میں بھی یہ روایت پائی جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سواری آسمان سے لائی گئی جس کا نام براق تھا اور آپ اس پر چڑھ کر آسمانوں پر گئے (بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائک)۔درحقیقت یہ آسمان پر جانا ایک اعلیٰ درجہ کا کشف ہے۔انسان نورانی جسم کے ذریعہ سے آسمانوں پر بھی جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کو بھی دیکھتا ہے لیکن یہ مادی جسم ان کاموں کے قابل نہیں ہے۔نہ یہ آسمانوں پر جاتا ہے نہ یہ خدا کو دیکھتا ہے۔عجوبہ پرست لوگ ان باتوں کو مادیات کی طرف لے جاتے ہیں اور غیر معقول باتیں بنانے لگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے اور وہ سائنس اور مذہب کے

اختلاف کی الجھنوں میں پڑ جاتے ہیں۔ کاش کہ یہ لوگ حقیقت کو اس کی حد تک رکھتے اور مذہب کو کھیل اور تمسخر نہ بنا لیتے۔

حنوک کا خدا کے ساتھ چلنا۔ حنوک کے متعلق جو یہ آتا ہے کہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اس کے مشابہ الفاظ حضرت اسماعیلؑ کے متعلق بھی آتے ہیں لکھا ہے کہ

''خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا'' (پیدائش باب ۲۱ آیت ۲۰)

بلکہ درحقیقت یہ الفاظ خدا کے ساتھ چلنے سے بھی زیادہ زوردار ہیں۔ کیونکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ خدا ہر وقت اس کے ساتھ تھا۔ خواہ وہ چلتا تھا یا لیٹتا تھا یا سوتا تھا۔ یہی مشابہت ہے جس کی وجہ سے قرآن کریم میں اسماعیل اور ادریس کا ذکر اکٹھا آتا ہے۔ قرآن کریم میں دو جگہ پر ادریسؑ کا ذکر ہے۔ ایک اسی جگہ سورۂ مریم میں اور دوسرا سورۂ انبیاء میں۔ سورۂ انبیاء میں ان الفاظ میں ذکر ہے وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ (الانبیاء:۸۶) اور اس سورۃ میں حضرت اسماعیلؑ کے ذکر کے معاً بعد حضرت ادریس کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ یہ آیات یوں ہیں۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۔ وَ كَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۔ وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم:۵۵ تا ۵۸)

ان آیات میں اسماعیلؑ کو صادق الوعد اور ادریس کو صدیق اسماعیل کو بھی نبی اور ادریس کو بھی نبی قرار دیا گیا ہے۔

غرض چونکہ الٰہی صحیفوں میں ان دونوں نبیوں کے لئے ''خدا کے ساتھ'' کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ اس مشابہت کی وجہ سے قرآن کریم میں ان کا اکٹھا ذکر آتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسماعیلؑ اور ادریسؑ کا ذکر تو ان کی باہمی مشابہت کی وجہ سے اکٹھا ہو گیا۔ یہاں جس مضمون کو بیان کیا جا رہا ہے اس کے لحاظ سے ادریسؑ کی طرف توجہ دلانے میں کیا حکمت ہے؟ ذکر یہ تھا کہ حضرت زکریا نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ انہیں بیٹا عطا فرمائے۔ چنانچہ اس دعا کے نتیجہ میں حضرت یحییٰ پیدا ہوئے جن کا مسیح سے پہلے ارہاص کے طور پر آنا ضروری تھا پھر اللہ تعالیٰ نے مسیح کا ذکر کیا جو اصل مقصود تھا اور بتایا کہ مسیح کے متعلق عیسائی دنیا کے جو عقائد ہیں وہ غلط ہیں مسیح خدا یا خدا کا بیٹا نہیں تھا بلکہ موسوی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ پھر بتایا کہ موسوی سلسلہ پیدا ہوا تھا ابراہیم کی دعا سے اور ابراہیم کے ساتھ دو وعدے تھے۔ ایک وہ جو اسماعیلؑ اور اس کی نسل کے ساتھ تعلق رکھتے تھے اور دوسرے وہ جو اسحاقؑ اور اس کی نسل کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسیحؑ

کے ذکر کے بعد پہلے ابراہیم کا ذکر کیا پھر اسحاق اور یعقوب کا ذکر کیا اور پھر موسیٰؑ کا ذکر کیا اور بتایا کہ بنو اسحاق کی ترقی کے متعلق میں نے ابراہیم کے ساتھ جو وعدے کئے تھے وہ پورے ہو گئے اس کے بعد اسماعیل کا ذکر کیا اور فرمایا کہ یہ خیال کر لو کہ جس خدا نے اتنی دیر تک بنو اسحق کے ساتھ اپنے وعدے پورے کئے ہیں کیا وہ اسماعیل کے وعدوں کو پورا نہیں کرے گا جو بڑا راست باز اور صادق الوعد تھا اور جس کے کاموں کی وجہ سے خدا اس سے بڑا خوش تھا جس شخص نے ہمارے ساتھ اتنی وفاداری کی کیا ہم اس کے ساتھ بے وفائی کریں گے اور اس کے متعلق اپنے وعدوں کو جھوٹا ہونے دیں گے۔ چنانچہ اس مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارونؑ کے ذکر کے بعد اسماعیلؑ کا ذکر کیا اور بتایا کہ ابراہیمی وعدوں کی ایک کڑی تو مسیحؑ پر آ کر ختم ہو گئی مگر اس کا ایک دوسرا وعدہ بھی ہے تم اس کو بھی یاد کرو چنانچہ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے وہ اسماعیل والا وعدہ یاد دلا دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس جگہ نہیں کیا گیا کیونکہ آپ اسی اسماعیلی وعدہ میں آ جاتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ اسماعیل کے ذکر کے بعد ادریسؑ کا ذکر کیوں کیا گیا اور اس میں کیا حکمت مدنظر ہے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ مسیح کے متعلق وہ خیال جس پر اس کی خدائی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس کا آسمان پر چلے جانا ہے اور یہ ایک ایسا خیال ہے جس میں بدقسمتی سے مسلمان بھی عیسائیوں کے ساتھ متفق ہیں اور وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ زندہ ہیں اور آسمان پر بیٹھے ہیں۔ عیسائی مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کی وجہ سے اس کی خدائی کا استدلال نہیں کرتے۔ خود عیسائیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ یوسف کا بیٹا تھا اور اس میں وہ کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں اگر مریم کا بیٹا ہونے سے اس کی خدائی میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا تو یوسف کا بیٹا ہونے سے اس کی خدائی میں کیا نقص واقع ہو سکتا ہے۔ پس وہ اس کی خدائی کی بنیاد واقعہ پیدائش پر نہیں بلکہ آسمان پر زندہ چلے جانے کے عقیدہ پر رکھتے ہیں اور یہ ایک ایسا نقطہ نگاہ ہے جس کی ابھی تک تردید نہیں کی گئی تھی۔ عیسائیوں کے باقی سب اعتراضات کی تردید کی جا چکی ہے مگر ان کے اس خیال کی تردید ابھی باقی تھی کہ مسیحؑ آسمان پر زندہ چلا گیا۔ چنانچہ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ادریسؑ کا ذکر فرمایا اور اس طرف اشارہ کیا کہ انجیل میں حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے کے متعلق جو الفاظ پائے جاتے ہیں ویسے ہی الفاظ بلکہ ان سے بھی زیادہ شاندار الفاظ حضرت ادریس یا حنوک کے متعلق پائے جاتے ہیں۔ مسیحؑ کے متعلق تو صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ

''وہ انہیں برکت دے رہا تھا تو ایسا ہوا کہ ان سے جدا ہو گیا اور آسمان پر اٹھایا گیا''

(لوقا باب ۲۴ آیت ۵۱)

مگر ادریس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ

’’خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور وہ غائب ہو گیا کیونکہ خدا نے اسے اٹھا لیا۔‘‘

(پیدائش باب ۵ آیت ۲۴)

پس اگر مسیحؑ آسمان پر جانے کی وجہ سے خدا یا خدا کا بیٹا کہلا سکتا ہے تو ادریسؑ کی الوہیت کا بھی مسیحی دنیا کو اقرار کرنا چاہیے کیونکہ بائبل کی رو سے وہ بھی آسمان پر اٹھایا گیا تھا۔

بہرحال ادریس ایک ایسا وجود ہے جس کے ذریعہ مسیحی دنیا کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے جس پر مسیح کی الوہیت کی بنیاد رکھی گئی ہے یعنی مسیحؑ کا آسمان پر زندہ چلے جانا۔ اور صرف یہی ایک حصہ تھا جس کی ابھی تک تردید نہیں ہوئی تھی۔ باقی سب باتوں کی خدا تعالیٰ نے تردید کر دی تھی مگر عیسائیوں کے اس خیال کی ابھی تردید باقی تھی کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات تھی جو پہلے کسی نبی میں تسلیم نہیں کی جاتی۔ نہ زکریاؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ یحییٰؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ ابراہیمؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ موسیٰؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ ہارونؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے نہ اسماعیلؑ کے متعلق لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمان پر گئے۔ صرف ادریس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آسمان پر گئے اور روایات کے مطابق جس شان سے ادریسؑ کا آسمان پر جانا بتایا گیا ہے اس شان سے مسیح کا بھی آسمان پر جانا ثابت نہیں۔ پس وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ٝ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔ وَّ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا۔ میں بتایا کہ مسیحؑ کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ آسمان پر گیا۔ ہم تمہارے سامنے ادریسؑ کو پیش کرتے ہیں۔ ادریسؑ کے حالات مسیح کے حالات سے بہت زیادہ شاندار ہیں پس اگر ان حالات کی وجہ سے جو مسیح کو پیش آئے وہ الوہیت میں شریک ہو سکتا ہے تو ادریس اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے خدا تعالیٰ کی الوہیت میں شریک قرار دیا جائے۔

قرآن کریم میں بھی مسیح کے متعلق تو صرف اتنا ہی آتا ہے کہ رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ(النساء:۱۵۹) خدا نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا مگر ادریس کے متعلق فرماتا ہے کہ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ہم نے اسے ایک بلند مقام پر اٹھا لیا چنانچہ معراج کی حدیث میں بھی آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسیح کو دوسرے آسمان پر اور ادریسؑ کو چوتھے آسمان پر دیکھا (دلائل النبوۃ للبھیقی جلد ۲ باب الدلیل علی ان النبی عرج بہ الی السماء)۔ گویا وہ مسیح سے بھی اونچا اٹھایا گیا۔ پس اگر ان الفاظ پر بنیاد رکھتے ہوئے تم مسیح کو خدا قرار دیتے ہو تو ادریسؑ کو کیوں خدا قرار نہیں دیتے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ

یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جن پر خدا (تعالیٰ) نے نبیوں میں سے انعام کیا تھا۔ ان (نبیوں) میں سے جو آدم کی

ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ

اولاد تھے اور جو ان لوگوں کی اولاد تھے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں بچایا اور ابراہیم اور یعقوب کی (اولاد

اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْرَآءِيْلَ ۫ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا

تھے) اور ان (لوگوں) میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور اپنے لئے منتخب کر لیا جب ان کے اوپر (خدائے

تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ۩ ﴿۵۹﴾

سجدہ ۵

) رحمن کا کلام پڑھا جاتا تھا تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔

تفسیر ۔اب اوپر کی بحث کا اللہ تعالیٰ ایک نتیجہ نکالتا ہے اور فرماتا ہے کہ باوجود ان انعامات کے جو زکریاؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو یحیٰی پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو عیسیٰ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو ابراہیمؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو اسحاقؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو یعقوبؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو موسیٰؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو ہارونؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو اسماعیلؑ پر نازل ہوئے۔ باوجود ان انعامات کے جو ادریسؑ پر نازل ہوئے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ یہ سارے کے سارے انسان ہی تھے۔ بے شک یہ خدا کے نبی تھے مگر خدا یا خدا کے بیٹے نہیں تھے اگر تم مسیح کی زندگی کے حالات اور موسیٰ اور ابراہیم اور دوسرے انبیاء کے حالات پر غور کرو تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ یہ ذریت آدم میں سے تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کیا۔ اور ابراہیم کی اولاد میں سے تھے اور اسرائیل کی اولاد میں سے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور انہیں برگزیدہ بنا لیا۔ ان لوگوں پر جب خدائے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو یہ لوگ خدا تعالیٰ کے حضور میں گر جاتے تھے۔ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے۔ کیونکہ وہ خدا کو ہی اپنا رب سمجھتے تھے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ ذریۃ آدمؑ سے ادریسؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وَ مِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ سے ابراہیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ سے اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسی طرح وہ اسرائیل سے پہلے وَ مِنْ ذُرِّيَّةِ کو محذوف سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذُرِّيَّةُ اِسْرَاۗءِيْلَ سے موسیٰ اور ہارونؑ اور زکریاؑ اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (صفوۃ التفاسیر زیر آیت ھذا) گویا ان الفاظ میں پچھلے انبیاء کی ایک لسٹ بیان کر دی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ یہ سب کے سب ہمارے بندے تھے۔ وَ مِمَّنْ هَدَيْنَا وَ اجْتَبَيْنَا اور ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت دی اور جنہیں اپنے قرب کے لئے مخصوص کر لیا۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مِمَّنْ کا عطف کس پر ہے سو میرے نزدیک یہ مِنَ النَّبِيّٖنَ پر ہے۔ یعنی وہ نبی ایسے تھے جن کو ہم نے ہدیت دی اور انہیں برگزیدہ بنا لیا اس پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ کیا نبی ہدایت یافتہ نہیں ہوتے۔ جب خدا تعالیٰ نے انہیں نبی کہہ دیا تھا تو ان کا مہدی اور مجتبیٰ ہونا تو اسی میں آ گیا تھا پھر اس کا علیحدہ ذکر کیوں کیا گیا؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ کبھی صفت ایک خاص خیال کے دور کرنے کے لئے بھی بیان کر دی جاتی ہے۔ اسرائیلی اور مسیحی مذہب میں نبیوں کو عام طور پر گنہگار اور خطا کار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ بائبل پڑھ کر دیکھ لو یہود نے حضرت نوحؑ پر بھی الزام لگائے۔ حضرت لوطؑ کی طرف بھی گندے افعال منسوب کئے۔ حضرت داودؑ کو بھی گنہگار ٹھہرایا حضرت ہارونؑ کو بھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا قرار دیا۔ غرض کوئی نبی ایسا نہیں جسے انہوں نے گنہگار نہ کہا ہو (پیدائش باب ۹ آیت ۲۴)۔ اسی طرح عیسائی اللہ تعالیٰ کے سب ابنیاء کو گنہگار قرار دیتے ہیں بلکہ انجیل میں یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے کہا

''جتنے مجھ سے آگے آئے چور اور بٹ مار ہیں'' (یوحنا باب ۱۰ آیت ۸)

گویا عیسائی اور یہودی دونوں قومیں انبیاء کو گنہگار قرار دیتی ہیں۔ یہودی تو اپنے گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ان کی طرف گناہ منسوب کرتے ہیں۔ اور عیسائی اس لئے ان کو گنہگار قرار دیتے ہیں۔ تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ چونکہ وہ گنہگار تھے اس لئے نجات کا موجب نہیں ہو سکتے۔ نجات صرف مسیح پر ایمان لانے کے ساتھ وابستہ ہے۔ غرض انبیاء کو گنہگار ثابت کرنے کے لئے ایک ایک غرض ان دونوں قوموں کے مدنظر ہے۔ ایک غرض یہودیوں کے سامنے ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء کو گنہگار قرار دیتے ہیں۔ اور ایک غرض عیسائیوں کے سامنے ہے جس کی وجہ سے وہ سب انبیاء کو گنہگار قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مِمَّنْ هَدَيْنَا وَ اجْتَبَيْنَا میں یہودیوں اور مسیحیوں کے انہی خیالات کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کو ہماری طرف سے صرف لفظی طور پر نبی کا نام نہیں دیا گیا بلکہ وہ

فی الحقیقت خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے۔ اور برگزیدہ بھی تھے تم کہتے ہو کہ وہ خدا کے نافرمان تھے۔ حالانکہ ان کی حالت یہ تھی کہ جب رحمٰن خدا کی نشانیاں ان پر پڑھی جاتیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے خدا تعالیٰ کے حضور گر جاتے تھے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا

پھر ان کے بعد ایک ایسی نسل آئی جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے۔ پس وہ

الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ﴿۶۰﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ

عنقریب گمراہی کے مقام تک پہنچ جائیں گے۔ سوائے اس کے جو توبہ کرلے گا اور ایمان لائے گا۔ اور نیک عمل

عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ

کرے گا۔ یہ (لوگ) جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (یعنی ان جنتوں میں) جو ہمیشہ

شَيْـًٔا ۙ﴿۶۱﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ اِۨلَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ

رہنے والی ہیں اور جن کا (خدائے) رحمٰن نے اپنے بندوں سے ایسے وقت میں وعدہ کیا ہے جبکہ وہ ان کی نظروں

اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۲﴾

سے ابھی پوشیدہ ہیں۔ یقیناً خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔

حلّ لُغَات۔ غَيٌّ کے معنے ہیں (۱) اَلضَّلَالُ گمراہی (۲) اَلْخَيْبُ ناکامی (۳) اَلْاِنْهِمَاكُ فِي الْجَهْلِ جہالت کی باتوں میں انہماک (۴) اَلْهَلَاكُ ہلاکت۔ (اقرب الموارد)

مفردات میں لکھا ہے اَلْغَيُّ جَهْلٌ مِنْ اِعْتِقَادٍ فَاسِدٍ غیّ اس جہالت کو کہتے ہیں جو غلط عقیدہ سے پیدا ہوتی ہے۔

تفسیر۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کی امتیں بگڑتے بگڑتے ایسی حالت پر پہنچ گئیں کہ نمازوں کی پابندی انہوں نے ترک کردی۔ یادعاؤں کی رغبت ان کے دلوں میں سے جاتی رہی۔ اور انہوں نے شہوات کی پیروی کی۔

شہوات سے لازماً بدکاری مراد نہیں ہوتی۔ بے شک بعض جگہ بدکاری بھی معنے ہوتے ہیں اور ہمیں ان معنوں کا انکار نہیں۔مگر یہاں اس کے یہ معنے نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنے غلط اجتہادات کے تابع ہو گئے اور کلام الٰہی کی وہ غلط تاویلات جو انہوں نے اپنی نفسانیت کے ماتحت کی تھیں۔ان کے پیچھے چل پڑے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہ ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انسان خدا تعالیٰ کی کتاب کی تفسیر خود اس کتاب کے ذریعے نہیں کرتا بلکہ اپنے اجتہادات سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔تو اس کا قدم غلط تاویلات کی طرف اٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔کیونکہ ہدایت اور کامیابی اور علم اور نجات کا دروازہ صرف اس کتاب نے کھولا ہوتا ہے اب کتاب خواہ موجود ہو لیکن انسان اپنی عقل اور اپنے اجتہاد سے اس میں نئی نئی باتیں داخل کرنا شروع کر دے تو خدا تعالیٰ کی ہدایت مشتبہ ہو جائے گی اور بوجہ اس کے کہ وہ اپنے نفس کے پیچھے چل رہا ہوگا ہلاکت اور بربادی اس کا احاطہ کر لے گی۔

اِنْہِمَاکُ فِی الْجَھْلِ کی ایک یہ بھی قسم ہے کہ انسان ان باتوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے جن کا روحانیت کی اصلاح یا خدا تعالیٰ کے قرب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا محض نئے نئے لطیفے نکالنا اس کا کام رہ جاتا ہے۔حقیقت اور معرفت سے وہ زیادہ سے زیادہ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرت خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ ایک مولوی صاحب آئے اور کہنے لگے مولوی صاحب میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ میرا کام لوگوں میں وعظ کرنا ہے اور وعظ کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک المبکیات کی اور ایک المضحکات کی۔یعنی ایک ان باتوں کی جو لوگوں کو رلانے والی ہوں اور ایک ان باتوں کی جو لوگوں کو ہنسانے والی ہوں۔آپ نے چونکہ بڑی بڑی کتابیں پڑھی ہوئی ہیں اس لئے اب مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں کچھ رلانے والی باتیں ہوں۔اور کچھ ہنسانے والی باتیں ہوں تاکہ میں اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو رلا یا ہنسا سکوں۔

غرض انسان جب گرتا ہے تو پھر ایسی ہی لغو باتوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔اسی طرح جب خدا تعالیٰ کی کتاب پر غور کرنے کی عادت نہیں رہے گی تو عجیب وغریب قصوں کی طرف توجہ ہو جائے گی۔اور انہیں قصوں کو خدا تعالیٰ کی کتاب کی تفسیر سمجھ لیا جائے گا۔

میں نے بعض پرانے مفسرین کو دیکھا ہے ایسے ایسے لغو قصے وہ اپنی تفسیروں میں لاتے ہیں کہ یوں معلوم

ہوتا ہے انہیں قرآن کریم پر غور کرنے کی عادت ہی نہیں۔ان کا انہاک محض اِنْہِمَاكٌ فِي الْجَهْلِ ہوتا ہے اَلْاِنْہِمَاكُ فِي الْحِكْمَتِ نہیں ہوتا مثلاً ایک نے لکھ دیا کہ فرشتے کے دس پَر ہوتے ہیں۔اس پر دوسرا تلاش کرتا ہے کہ کوئی پندرہ پَروں والی بھی روایت ہے یا نہیں۔جب کوئی یہودی بتا دیتا کہ ہاں پندرہ پَروں والی بھی ایک روایت ہے۔تو وہ لکھتا کہ فرشتے کے دس نہیں پندرہ پَر ہوتے ہیں اور فلاں روایت سے ثابت ہے۔پھر کوئی اور یہودی کہہ دیتا کہ فرشتے کے سو پَر بھی ہوتے ہیں اس پر وہ سو پَروں والا قصہ لے بیٹھتے ہیں۔مگر پھر اس پر بھی تسلی نہیں ہوتی۔اور پوچھتے ہیں کہ کیا ہزار پَروں والی بھی کوئی روایت ہے اس پر یہودی پھر ایک روایت گھڑ کر بتا دیتے۔اور ہمارے مفسر بڑے خوش ہوتے کہ اب ہزار پَر ثابت ہو گئے ہیں۔اور لوگ ہیں کہ مزے لے رہے ہیں۔اور کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰہِ فلاں مولوی صاحب تو بڑے علامہ ہیں۔انہوں نے ایک ہزار پَروں والی روایت بیان کی ہے۔غرض حقیقت کو چھوڑ کر لغویات کے پیچھے پڑ گئے حالانکہ ان لغویات کا نہ مذہب سے تعلق ہے نہ ایمان سے تعلق ہے، نہ خدا سے تعلق ہے۔محض جاہلانہ اور احمقانہ باتیں ہیں اگر مسلمان قرآن پر غور کرتے جیسے یہودی اگر تورات پر غور کرتے۔عیسائی اگر انجیل پر غور کرتے۔تو خواہ تورات اور انجیل اب بگڑی ہوئی حالت میں ہیں پھر بھی وہ اس جہالت سے بچ جاتے۔مگر چونکہ مسلمانوں نے قرآن پر غور کرنا ترک کر دیا اور عیسائیوں اور یہودیوں نے تورات اور انجیل پر غور نہ کیا اس لئے خدا کی کتاب ان کے لئے ہدایت کا موجب نہ ہوئی اور وہ گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

مفردات والوں نے بھی غیٌّ کی لطیف تفسیر کی ہے کہ اَلْغَيُّ جَهْلٌ مِنْ اِعْتِقَادٍ فَاسِدٍ یعنی جب انسان جھوٹے اعتقادات اور غلط روایات خدا تعالیٰ کی کتاب اور اس کے دین کی طرف منسوب کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں جو جہالت پیدا ہوتی ہے اس کو غیّ کہتے ہیں۔اگر یہ لوگ نمازیں پڑھتے اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری کرتے دعاؤں اور انابت سے کام لیتے اور اپنے غلط اجتہادات کے پیچھے چلنے کی بجائے خدا تعالیٰ کے الہام اور اس کے کلام سے راہنمائی حاصل کرتے تو ان کا یہ انجام نہ ہوتا۔مگر چونکہ انہوں نے دونوں باتیں چھوڑ دیں اس لئے ان حالات کا نتیجہ گمراہی اور ناکامی اور جہالت دینی اور ہلاکت ہی پیدا ہونا تھا جو ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نمازوں میں سستی کی وجہ سے خدا تعالیٰ کا وصال ہاتھ سے جاتا ہے۔اور اس کی صفات کا علم انسان کو حاصل نہیں ہوتا۔پس اس کے نتیجے میں ضلال پیدا ہوتا ہے۔دعا کی کمی کی وجہ سے ناکامی آتی ہے۔اتباعِ شہوات سے علم اور دلیل سے رغبت کم ہو کر جہالت میں انہماک پیدا ہوتا ہے۔اور ان سب چیزوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ہلاکت پیدا ہوتی ہے۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے۔ اور مناسب حال عمل کئے۔

صالح کے معنے نیک عمل کے نہیں بلکہ مناسب حال عمل کے ہوتے ہیں اگر کوئی شخص جہاد کے وقت نماز پڑھنے لگ جائے تو وہ بے شک عمل نیک کر رہا ہوگا۔ مگر وہ عمل صالح نہیں ہوگا۔ اگر کوئی نماز کے وقت وعظ شروع کر دے تو گو وہ وعظ ایک عمل نیک ہے مگر وہ عمل صالح نہیں کہلائے گا۔ اگر ایک شخص عید کے دن کھانے سے پرہیز کرتا ہے۔ (روزہ تو عید کے دن شیطان رکھتا ہے) یا نہانے دھونے کی طرف توجہ نہیں کرتا تو بے شک یہ تو کہا جا سکے گا کہ اس شخص کے اندر زہد پایا جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ عمل عمل صالح نہیں کہلائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم جہاں بھی زور دیتا ہے خالی نیک عمل پر زور نہیں دیتا بلکہ ایسے عمل پر زور دیتا ہے جو مناسب حال ہو۔ وہ کہتا ہے چندے کا موقع ہو تو چندہ دو نماز کا موقع ہو تو نماز پڑھو راز داری سے کام لینے کا موقع ہو تو راز داری سے کام لو۔ جہاد کا موقع ہو تو جہاد کرو ذکر الٰہی کا موقع ہو تو ذکر الٰہی کرو۔ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا یہ لوگ ہیں جو جنت میں داخل کئے جائیں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ وہ کیا ہے جنت؟ وہ جنتیں ہیں عدن والی۔ یعنی ہمیشہ رہنے والی عدن سے وہ عدن مراد نہیں جو عرب کا ایک حصہ ہے۔ اور اس کے جنوب مغرب میں واقعہ ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ایسی جنتیں ہوں گی جو ہمیشہ رہنے والی ہوں گی۔ عَدْنٍ کے معنے عربی زبان میں قائم رہنے کے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ عَدَنَ بِالْمَكَانِ اَقَامَ بِهٖ وَعَدَنَ الْبَلَدَ تَوَطَّنَهٗ قِيْلَ وَمِنْهُ جَنّٰتُ عَدْنٍ اَیْ جَنّٰتُ اِقَامَةٍ لِمَكَانِ الْخُلُوْدِ (اقرب) یعنی عَدَنَ بِالْمَكَانِ کے معنے کسی جگہ مستقل رہائش اختیار کر لینے کے ہوتے ہیں۔ عَدَنَ الْبَلَدَ کے معنے شہر کو اپنا وطن بنا لینے کے ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ جَنَّاتُ عَدْنٍ بھی اسی لئے کہتے ہیں کہ جنت مستقل رہائش گاہ کا نام ہوگا۔ اور اس میں انسان دائمی طور پر رہے گا پھر فرماتا ہے۔ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ یہ وہ جنتیں ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے غیب کے ساتھ یا غیب کے مطابق وعدہ کیا ہے۔

بِالْغَيْبِ سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس وقت ان سے ان جنتوں کا وعدہ کیا جب کہ وہ نظر نہیں آتی تھیں۔ یعنی بظاہر ان جنتوں کے ملنے کے کوئی آثار نہیں تھے مگر پھر بھی وہ مل گئیں۔ یہ جنتیں دنیا میں بھی مسلمانوں کو ملی ہیں اور آخرت میں بھی خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ جنتیں دینے کا وعدہ کیا ہے جب دنیا میں وہ جنتیں مل گئیں جن کے کوئی آثار نہیں تھے تو یہ ثبوت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعویٰ کیا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور جس طرح ایک وعدہ پورا ہو گیا ہے اسی طرح اس کا دوسرا وعدہ بھی ضرور پورا ہوگا۔

لیکن بِالْغَیْبِ کے ایک یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے ایمان بالغیب کی وجہ سے خدائے رحمٰن نے یہ وعدہ کیا ہے۔یعنی انہوں نے خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھا تھا۔دلائل سنے تو کہا خدا ہے اور اس پر ایمان لے آئے۔انہوں نے فرشتے نہیں دیکھے تھے۔دلائل سنے تو کہا فرشتے ہیں اور ان پر ایمان لے آئے۔انہوں نے حیات بعد الموت کو نہیں دیکھا تھا۔دلائل سنے تو کہا کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔اور ایمان لے آئے پس فرماتا ہے چونکہ ایک غیب انہوں نے دکھایا ہے۔یعنی جو چیزیں ان کی نظروں سے پوشیدہ تھیں ان پر وہ ہماری خاطر ایمان لے آئے اس لئے ہم نے بھی ان کو وہ جنتیں دیں جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آ سکتی تھیں ان لوگوں نے اپنی زندگیوں میں غیب کا ایک اعلیٰ نمونہ دکھایا ہم نے کہا اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ اور یہ لوگ ایمان لے آئے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ کو انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ہم نے کہا فرشتوں پر ایمان لے آؤ۔اور یہ لوگ ایمان لے آئے۔حالانکہ فرشتے انہوں نے نہیں دیکھے تھے۔ہم نے کہا جنت پر ایمان لے آؤ اور یہ لوگ ایمان لے آئے۔حالانکہ جنت انہوں نے نہیں دیکھی تھی۔ پس چونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی ان باتوں پر یقین کیا جو نظر نہیں آتی تھیں۔خدا تعالیٰ نے بھی ان کو وہ جنتیں دیں جو انہیں نظر نہیں آتی تھیں۔

اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا وعدہ نظروں کے سامنے لا کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔مَاْتِيًّا کے معنے ہوتے ہیں ''لایا گیا'' اور مراد یہ ہے کہ وہ وعدہ یعنی جنت ایسا ہے کہ اس کے پاس یہ لوگ لائے جائیں گے۔گویا جنت انہیں جبراً دی جائے گی۔یعنی وہ لوگ تو صرف خدا کے وصال کے بھوکے ہوں گے۔جنت کی خواہش ان کے دلوں میں نہیں ہوگی مگر چونکہ خدا نے وعدہ کیا تھا۔اس لئے خدا نے کہا کہ تمہیں بہر حال جنت لینی پڑے گی۔پس اس کا وعدہ سامنے لایا گیا اور انہیں جنت میں داخل کر دیا گیا۔

یہ کلام احسان کے کمال پر دلالت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ان میں جنت لینے سے انکار کرنے کی طاقت ہی نہیں ہوگی۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا

وہ ان (جنتوں) میں کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔بلکہ صرف سلامتی (اور امن کی باتیں سنیں گے)۔اور

بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۶۳﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا

ان (جنتوں) میں ان کو صبح اور شام رزق ملے گا۔ یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں

مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۴﴾

سے ان کو کریں گے جو متقی ہوں گے۔

تفسیر ۔ اِلَّا سَلٰمًا استثناء متصل بھی ہوسکتا ہے اور استثناء منقطع بھی۔ استثناء متصل کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ وہاں کا زائد کلام بھی اگر ہوگا تو وہ بھی سلامتی ہی ہوگا۔ لغو کے معنے ہوتے ہیں ایسا کام جو فضول ہو (مفردات) مثلاً اگر کوئی بات مَیں ایک منٹ میں کرسکتا ہوں لیکن اس پر مَیں دو منٹ خرچ کر دیتا ہوں تو ایک منٹ کی گفتگو لغو سمجھی جائے گی میں نے دیکھا ہے بعض لوگ مجھ سے ملنے کے لئے آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ جس مقصد کے لئے وہ آئے ہیں اس کے متعلق گفتگو شروع کریں وہ آتے ہی ایک لغو اور بے ہودہ قصہ شروع کر دیں گے۔ جس کا ان کے مقصد کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ہوگا۔ کہیں گے ہم میرٹھ گئے تھے۔ وہاں ہمارے فلاں شخص کے ساتھ بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ اس سے ایک روز میں ملنے کے لئے چلا گیا اور اس نے مجھ سے یہ یہ باتیں کیں پھر میرا فلاں شخص سے جھگڑا شروع ہوگیا اسی سلسلہ میں مجھے لاہور آنا پڑا یہاں آ کر فلاں سے ملا پھر فلاں سے ملنے چلا گیا۔ اس کے بعد ایک ضرورت پیش آئی اور میں نے چاہا کہ آپ سے بھی ملاقات کرلوں۔ غرض اس طرح ایک لمبا قصہ بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کا ان کی بات کے ساتھ کوئی بھی تعلق نہیں ہوتا۔ تو انسان جب باتیں کرتا ہے تو خواہ وہ ضروری ہی ہوں ان کے ساتھ بعض زائد باتیں بھی لگا لیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں سنیں گے جو لغو ہو کوئی کہے فرض کرو کوئی لغو بات ہوجائے تو اس کا جواب یہ دیا کہ اگر ایسا فرض بھی کرلیا جائے تو وہ بھی اچھی بات ہی ہوگی۔ بری بات نہیں ہوگی۔ گویا اگر کوئی زائد لفظ بھی ان کی زبان سے نکلے گا تو وہ خیر کا ہی ہوگا شر کا نہیں ہوگا۔ یا یوں کہو کہ وہاں ضرورت سے زیادہ اگر کوئی شے ہوگی تو سلامتی ہی ہوگی۔ اور سلام ہی وہاں کا زائد کلام ہوگا۔ استثناء منقطع کی صورت میں اس کے یہ معنے ہوں گے کہ لغو تو ان کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔ ہاں سلامتی کی باتیں ہر جگہ ہوں گی کیونکہ خدائے سلام کے پاس ہوں گے دارالسلام میں ہوں گے۔ اور فرشتے سلام کہہ رہے ہوں گے۔

اس آیت میں ایک اور نقطہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔اور وہ یہ کہ اس جگہ لغو کام کرنا نہیں کہا۔ بلکہ لغو باتیں سننا فرمایا ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی نسبت تو حسن ظنی سے کام لیتا ہے لیکن دوسرے کی نسبت عیب کو جلد سنتا اور مشہور کرتا ہے۔مگر وہاں لوگوں کی نیکی اس قدر ترقی یافتہ ہوگی کہ کوئی شخص دوسرے پر بدظنی نہیں کرے گا۔ اور جس مقام پر کوئی شخص دوسرے کی نسبت ادنیٰ سے ادنیٰ بری بات بھی نہ سنے وہ جگہ یقیناً نیکی کا ایک اعلیٰ مقام ہوگی۔

وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا اور اُن کے لئے اس میں رزق ہوگا صبح بھی اور شام بھی۔بعض نے اس کے یہ معنے کئے ہیں کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے رزق کے متعلق اسراف منع کیا ہے اس لئے انہیں صرف دو وقت کھانا ملے گا ایک صبح کو اور ایک شام کو۔مگر یہ صحیح نہیں۔ بُكْرَةً اور عَشِيًّا دونوں وسیع لفظ ہیں۔ بُكْرَةً کے معنی صرف صبح کے نہیں بلکہ اوّل النہار یعنی دن کے ابتدائی حصہ کے بھی ہیں (لسان) اور عَشِيًّا صرف شام کو نہیں کہتے بلکہ زوال شمس سے صبح تک کے وقت کو کہتے ہیں (اقرب) پس بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا سے یہ مراد ہے کہ ہر وقت ان کو رزق ملے گا۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ ہر وقت کوئی کس طرح کھا سکتا ہے؟۔سو اس کا جواب یہ ہے کہ رزق کے معنے ہیں ''دی جانے والی چیز'' اور وہ چیز جو انہیں وہاں ہر وقت ملے گی وہ دیدار الٰہی کلام الٰہی اور خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے۔اور کلام الٰہی یا دیدار الٰہی کوئی ایسی چیز نہیں کہ اس سے کسی کو بدہضمی ہونے کا ڈر ہو۔ پھر یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وَلَهُمُ الرِّزْقُ بلکہ فرمایا ہے وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ ان کو وہ رزق ملے گا جو ان کے مناسب حال ہوگا پس تم اس سے صرف روٹی مراد نہ لو خدا تعالیٰ ان کے مناسب حال انہیں رزق عطا فرمائے گا۔اور وہ رزق صرف صبح شام نہیں دے گا بلکہ ہر وقت دے گا۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا یہ وہ جنت ہے جس کا ہم اپنے ان بندوں کو وارث کر دیں گے جو متقی ہیں۔

وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَ مَا

اور فرشتے ان سے کہیں گے کہ ہم تو صرف تمہارے رب کے حکم سے اترتے ہیں اور جو کچھ ہمارے آگے اور ہمارے

خَلْفَنَا وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ﴿۶۵﴾

پیچھے ہے اور جو کچھ ان دونوں (جہالت) کے درمیان میں ہے سب کچھ خدا کا ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں۔

تفسیر ۔ ہمارے مفسرین اس جگہ یہ معنے کرتے ہیں کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ جب اصحاب کہف

اور ذوالقرنین اور روح کے متعلق لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے ان سوالات کے جلد جواب دینے کا وعدہ کیا مگر جبرائیل کے آنے میں دیر ہوئی جس سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ جب کچھ مدت کے بعد وہ پھر آیا تو آپ نے اس سے شکایت کی کہ ارے میاں تم نے ہمیں کیوں چھوڑ دیا؟ اس نے کہا ہم اپنی مرضی سے تھوڑا آتے ہیں ہمیں خدا بھیجتا ہے تو ہم آجاتے ہیں نہیں بھیجتا تو ہم نہیں آتے (روح المعانی زیر آیت ھٰذا)۔

قطع نظر اس سے کہ ایسا ہوا ہے یا نہیں سوال یہ ہے کہ اس گفتگو کے ذکر کا یہ موقع کونسا ہے؟ ذکر یہ تھا کہ عیسیٰؑ ہمارا ایک پیارا بندہ تھا مگر وہ خدا یا خدا کا بیٹا نہیں تھا۔ اسی جیسی خوبیاں رکھنے والے اور بھی کئی انبیاء دنیا میں آئے اور پھر عیسیٰؑ تو محض ایک کڑی تھا اس سلسلہ کی جو نسل اسحاق سے شروع ہوا اسے تم آخری نجات دہندہ کس طرح قرار دے سکتے ہو۔ اگر وہ آخری وجود تھا تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ اسماعیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے کئے تھے وہ سب کے سب جھوٹے ہو گئے پھر بتایا کہ ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب اور موسیٰ اور ہارون اور اسماعیل اور ادریس یہ سب کے سب ہمارے نیک اور برگزیدہ بندے تھے اور ہماری جنت کے محتاج تھے۔ اسی طرح عیسیٰ بھی ہماری جنت کا محتاج ہے مگر اس کے بعد ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ فرشتوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تو خدا کے حکم سے نازل ہوئے ہیں وہ اگر ہمیں نازل نہ کرے تو ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔ حالانکہ اس کا پہلے مضمون سے کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا۔ اگر وہ قرآن کریم پر غور کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں کرتے اور قصے کہانیوں کے پیچھے نہ چلتے تو خدا ان کی راہنمائی کرتا اور ایسی خطرناک غلطیوں سے انہیں بچا لیتا مگر مصیبت یہی ہے کہ انہوں نے قرآن کریم پر غور کرنے کی بجائے قصوں اور کہانیوں کو اختیار کر لیا اور حقیقت سے دور ہوتے چلے گئے۔

میں جب سورہ کہف کا درس دینے لگا اور میں نے اس سورۃ پر غور کیا تو اور سورۃ تو سب حل ہو گئی مگر ایک آیت کی مجھے سمجھ نہ آئی۔ میں نے بہت سوچا اور غور کیا مگر وہ آیت مجھے بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی تھی۔ آخر میں نے درس دینا شروع کر دیا۔ جوں جوں وہ آیت قریب آتی جائے میری گھبراہٹ بڑھتی چلی جائے کہ اب اس آیت کے متعلق کیا ہوگا۔ یہاں تک کہ صرف دو یا تین آیتیں رہ گئیں مگر پھر بھی وہ میری سمجھ میں نہ آئی اس وقت میری گھبراہٹ بہت زیادہ ہو گئی مگر جس وقت میں اس سے پہلی آیت پر پہنچا تو مجھے یوں معلوم ہوا کہ وہ آیت تو بالکل حل شدہ ہے اور اس کے نہایت صاف اور سیدھے معنے ہیں جن میں کسی قسم کی الجھن نہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اگر قرآن کریم کی ترتیب کو مدنظر رکھا جائے اور اس پر غور اور تدبر کرنے کی عادت ڈالی جائے تو اس کی بہت سی مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں۔ مگر جو شخص قصوں اور کہانیوں کے پیچھے چل پڑتا ہے اور تدبر فی القرآن کو ترک کر دیتا ہے وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور

خدا تعالیٰ کی طرف بھی ایسی باتیں منسوب کر دیتا ہے جو اس کی شان کے منافی ہوتی ہیں۔

اب میں بتاتا ہوں کہ یہ کتنا سیدھا سادہ مضمون ہے جس کو ہمارے مفسرین نے اتنا بے جوڑ بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیات میں بیان فرمایا تھا کہ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا یعنی لغو تو جنتیوں کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا ہاں سلام ہر جگہ ہوگا۔ یہ سلام کیا ہوتا ہے؟ ہر شخص جانتا ہے کہ السلام علیکم کو سلام کہا جاتا ہے۔ پس لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا کے یہ معنے تھے کہ انہیں کثرت کے ساتھ سلام پہنچایا جائے گا مگر یہاں یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کا سلام ہوگا۔ اس لئے ہم قرآن کریم کے دوسرے مقامات کو دیکھتے ہیں تو وہاں ہمیں اس کی تشریح نظر آتی ہے۔ سورۂ فرقان میں آتا ہے يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا (الفرقان:۷۶) جنتیوں کو تحیہ اور سلام پہنچایا جائے گا۔ گویا وہی مضمون جو اس جگہ بیان کیا گیا ہے اسی کو ایک دوسرے پیرایہ میں سورۂ فرقان میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ رعد میں آتا ہے وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (الرعد:۲۴، ۲۵) یعنی وہاں ہر دروازے سے ملائکہ جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں کہیں گے کہ تم نے دنیا میں جو خدا تعالیٰ کے لئے صبر کیا تھا اس کے بدلہ میں ہم تمہیں سلامتی پہنچاتے ہیں اور یہ آخری گھر جو تم کو ملا ہے کیا ہی اچھا گھر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے جنتیوں کے پاس آئیں گے اور انہیں سلام پہنچائیں گے اب جہاں تک یہ سوال تھا کہ سلام کون پہنچائے گا یہ تو حل ہو گیا اور پتہ لگ گیا کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے مومنوں کو سلام پہنچائیں گے۔ مگر یہاں ایک نئی بات پیدا کر دی گئی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا یہ وہ جنتیں ہیں جن کا ہم اپنے متقی بندوں کو وارث بنائیں گے اور وارث ہمیشہ بیٹا ہوتا ہے کوئی غیر نہیں ہوتا۔ پس درحقیقت اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ بتایا ہے کہ ہر متقی خدا کا بیٹا ہے اور جنت خدا کا گھر ہے جس میں ان متقیوں کو اتارا جائے گا گویا یہاں ایک نیا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ پہلے سلام کا ذکر کیا اور پھر بتایا کہ ہمارا مومن اور متقی بندہ مہمان کے طور پر جنت میں نہیں جائے گا۔ دوست کے طور پر جنت میں نہیں جائے گا۔ سائل کے طور پر جنت میں نہیں جائے گا بلکہ ہم اسے اپنا بیٹا قرار دے کر اور وارث بنا کر جنت میں داخل کریں گے اور کہیں گے کہ جاؤ اور اس میں ہمیشہ کے لئے رہو۔

اس میں ایک طرف تو مسیح کے بیٹے ہونے کی خصوصیت کو رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر مومن خدا تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ دوسرے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جنت کی جو نعمتیں ملیں گی وہ بطور حق اور اکرام کے ہوں گی۔ ورنہ عطاء تو فقیر کو بھی ملتی ہے۔ پس یہ عطاء اپنے اندر صدقہ کا رنگ نہیں رکھے گی۔ بلکہ یہ عطاء میراث ہوگی اور اس کے لینے والے پر ظاہر

کیا جائے گا کہ یہ تمہارا حق ہے۔جس طرح اولاد کا باپ کے مال پر حق ہوتا ہے۔صرف یہ فرق ہوگا کہ وہ اپنے باپ کی زندگی میں ہی وارث ہوں گے۔

پس چونکہ اس جگہ نُوْرِثُ کہہ کر ہر مومن کو خدا تعالیٰ کا بیٹا اور جنت کو عطاء میراث قرار دیا گیا تھا اس لئے جب خدا تعالیٰ نے یہ بتایا کہ وہاں مومنوں کو سلام پہنچایا جائے گا تو طبعاً ہر مومن کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا تھا کہ جب میں بیٹا بن گیا تو یہ سلام تو باپ کی طرف سے ہونا چاہیے۔سو اس طبعی خیال کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان سلام پہنچانے والے ملائکہ کی طرف سے یہ جواب دیا کہ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ اے مومن ہم یہ سلام تیرے باپ کی طرف سے ہی تجھے پہنچا رہے ہیں، ہم اپنی طرف سے نہیں کر رہے۔بے شک جنت میں سلام ہم پہنچائیں گے مگر ہوگا تمہارے باپ کی طرف سے ہی۔کیونکہ ہم فرشتے تو خود کوئی بات کر ہی نہیں سکتے پس تم نُوْرِثُ پر گھبرا کر یہ خیال نہ کرو کہ جب خدا ہمارا باپ بن گیا اور ہم اس کے بیٹے بن گئے تو پھر فرشتے یہ سلام کیوں پہنچا رہے ہیں۔یہ سلام تو ہمارے باپ کی طرف سے آنا چاہیے، یہ سلام تمہارے باپ کی طرف سے ہی ہے ہم تو صرف اس کا سلام پہنچانے والے ہیں۔یہ مضمون ہے جو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔یہاں اس ذکر کا کوئی موقع ہی نہیں کہ جبریل کچھ عرصہ نہ اُترا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھبرا گئے اور اس پر آپ کو یہ الہام ہوا۔یہ بالکل بے جوڑ بات ہے۔اصل مضمون یہی ہے کہ جب فرشتے سلام لائیں گے تو مومنوں کے دلوں میں خیال پیدا ہوگا کہ یہ کیسا سلام ہے۔آیا یہ ہمارے باپ کی طرف سے ہے یا کسی اور کی طرف سے۔اس کا فرشتے یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ سلام تمہارے روحانی باپ نے ہی بھیجا ہے ہم تو صرف ایک پیغامبر ہیں۔لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ اور یہ اتنا قیمتی تحفہ اس کی طرف سے آیا ہے کہ اس نے اس کی حفاظت کے لئے ہمارے آگے اور پیچھے پہریدار مقرر کر دیئے ہیں تا کہ یہ ضائع نہ ہو جائے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا اور یہ کس طرح ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ اپنی روحانی اولاد کو اپنے گھر میں اتارے اور اس کو سلام بھجوانا بھول جائے جس طرح تم نے خدا سے محبت کی اور اسے نہیں بھلایا اسی طرح اس نے بھی تم کو یاد رکھا اور اپنے فرشتوں کو بھیجا کہ جاؤ اور میری طرف سے سلام پہنچا آؤ۔

لیکن اس مضمون کے علاوہ ایک اور بھی مضمون ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر ان کی اولاد تک کے انبیاء کا ذکر ہے جن میں حضرت موسیٰؑ بھی شامل ہیں جن کی کتاب میں علاوہ اپنی وحی کے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد کے کوائف بھی درج ہیں۔جب

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ فرمایا تو عیسائیوں اور یہودیوں نے اعتراض کیا کہ نبی تو بنی اسرائیل میں سے آنا چاہیے اور یعقوب کی نسل میں سے ہونا چاہیے۔ یہ نبی عربوں میں سے کس طرح آ گیا؟ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی زبانی دیا کہ ہم تو اپنے رب کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔ اس نے عرب کی طرف ہم کو بھیجا ہم ان کی طرف آ گئے وہ اسرائیل کی طرف بھیجتا تھا تو ہم ادھر چلے جاتے تھے۔ پس یہ اعتراض کیا ہے؟ یہ اعتراض تو ہوسکتا تھا کہ نبیوں والی باتیں اس میں نہیں پائی جاتیں لیکن یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ ایک عرب پر کلام کیسے نازل ہو گیا۔ کیونکہ کلام خدا کے حکم سے اترتا ہے اور جن پر خدا کا کلام اترتا ہے ان کو جنات ارضی واخروی عطا کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کو کنعان ملا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارا عرب بھی ملا فلسطین بھی ملا اور ساری دنیا بھی ملی۔

اس کے آگے فرمایا۔ ''تیرا رب بھولنے والا نہیں'' یعنی اس نے موسیٰ کے ذریعہ خبر دی تھی کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے بھی یعنی بنو اسماعیل میں سے ایک نبی بھیجا جائے گا۔ اور یسعیاہ نبی کے ذریعہ سے اس نے کہا تھا کہ عرب میں بھی خدا کا کلام اترے گا پھر یہ کس طرح ہوسکتا تھا کہ خدا کی دونوں باتیں جھوٹی ہوتیں۔ خدا تعالیٰ بھولتا نہیں۔ عیسائی اور یہودی بے شک بھول جائیں مگر خدا تعالیٰ نہیں بھولا کہ اس نے موسیٰ سے کیا کہا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ ''میں ان کے لئے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا'' (استثناء باب ۱۸ آیت ۱۸ و ۱۹) تو وہ اس کو کس طرح بھول سکتا تھا۔ اسی طرح وہ اس وحی کو نہیں بھول سکتا تھا جو یسعیاہ نبی پر نازل ہوئی کہ عرب میں بھی الہامی کلام اترے گا (یسعیاہ باب ۲۱ آیت ۱۳ تا ۱۷ اور باب ۹ آیت ۶ و ۷)

اسی طرح وہ اس وحی کو بھی نہیں بھول سکتا تھا جو اس نے عیسیٰ علیہ السلام کو کی اور جس کے مطابق انہوں نے اپنے حواریوں سے کہا کہ

> ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لئے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔'' (یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۲، ۱۳)

پس اس نبی کا آنا ضروری تھا جو سب روحانی راز دنیا کو بتا دے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فَاعۡبُدۡہُ وَ اصۡطَبِرۡ

(وہ) آسمانوں کا (بھی) رب (ہے) اور زمین کا بھی (رب) اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے۔ پس

لِعِبَادَتِہٖ ؕ ہَلۡ تَعۡلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ﴿۶۶﴾ ع

(اے مسلمان) اس کی عبادت کر اور اس کی عبادت پر ہمیشہ قائم رہ کیا تو اس کا کوئی ہم صفت جانتا ہے۔

تفسیر۔ عربی زبان میں اِصۡطَبَرَ عَلَیۡہِ ایک محاورہ ہے جس کے معنے ہیں کسی بات پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ اور اس کے متعلق جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرنا مگر یہاں واصۡطَبَرَ عَلٰی عِبَادَتِہٖ نہیں کہا کہ عبادت کر مضبوطی سے قائم رہ بلکہ یہ کہا ہے کہ وَ اصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِہٖ تو اس کی عبادت کے لئے ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کر۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ لوگ تجھے عبادت خالص نہیں کرنے دیں گے۔ پس تو مخالفت کی پروا نہ کر بلکہ بہادری اور استقلال کے ساتھ اس پر قائم رہ۔ اور پھر لِعِبَادَتِہٖ کہہ کر یہ بتایا کہ ان اوصاف کا مظاہرہ محض عبادت کی خاطر کر عبادت پر قائم تو انسان اور کئی وجوہ سے بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت کی خاطر جرأت اور عبادت کی خاطر بہادری اور عبادت کی خاطر استقلال دکھا۔ گویا عبادت کو دوسری اشیاء کے لئے نہیں بلکہ دوسری اشیاء کو عبادت کے لئے پسند کر اور عبادت تیرے لئے ذریعہ کا کام نہ دے بلکہ تیرا مقصود اور مدعا بن جائے۔ پس وَ اصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِہٖ کے یہ معنے ہوئے کہ تو عبادت کی خاطر جرأت اور بہادری سے کام لے۔ یہ نہیں کہ عبادت پر قائم رہنے کے لئے جرأت دکھا بلکہ عبادت کی خاطر جرأت دکھا عبادت کی خاطر دلیری دکھا عبادت کی خاطر استقلال دکھا۔ تا کہ تیری عبادت زیادہ اعلیٰ سمجھی جائے اور عبادت تیرے لئے ایک ذریعہ نہ بنے۔ بلکہ عبادت ہی تیرا مقصود بن جائے۔

اسی طرح رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ کہہ کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اب خدا رب العالمین کی حیثیت سے کلام کرے گا صرف بنی اسرائیل کو مخاطب نہیں کرے گا۔

وَ يَقُوۡلُ الۡاِنۡسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوۡفَ اُخۡرَجُ حَيًّا ﴿۶۷﴾ اَوَ

اور انسان ہمیشہ یہ کہتا رہے گا کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو پھر زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا کیا انسان کو یہ بات یاد نہیں

لَا يَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ يَكُ شَيۡـًٔا ﴿۶۸﴾

کہ ہم نے اس کو اس سے پہلے پیدا کیا تھا۔ اور (اس وقت) وہ کوئی چیز نہیں تھا۔

تفسیر ۔ مرنے کے بعد کی زندگی ہمیشہ ہی لوگوں کے لئے شبہات اور تردد کا موجب رہی ہے۔ کیونکہ وہ نظر نہیں آتی اور مرنے والے لوگوں سے سوائے اس کے کہ کوئی اعلیٰ درجے کے روحانی انسان ہوں کسی قسم کا تعلق باقی نہیں رہتا۔ اس لئے خواہ کسی قوم اور مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوں مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق ان کے دلوں میں ہمیشہ شبہات قائم رہتے ہیں مگر عجیب بات یہ ہے کہ جہاں سب سے زیادہ شبہ اس زندگی پر کیا جاتا ہے وہاں سب سے زیادہ یقین بھی اسی زندگی کے متعلق پایا جاتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر لوگ مُردوں کے نام پر کھانا کھلاتے ہیں مُردوں کے نام پر کپڑے تقسیم کرتے ہیں۔ اور مُردوں سے ملنے کی خواہش ان کے دلوں میں پائی جاتی ہے۔ ان کی اپنی زندگی دیکھو تو انہیں حیات بعد الموت پر کوئی یقین نہیں ہوتا کیونکہ اس زندگی پر ایمان رکھنے کا کوئی اثر ان کے اعمال میں نظر نہیں آتا۔ جب انسان کو سچے دل سے یہ یقین ہو کہ مرنے کے بعد اس نے خدا تعالیٰ کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے حاضر ہونا ہے تو لازماً اس کی زندگی پر اس کا اثر پڑنا چاہیے اس کے اعمال میں اصلاح ہونی چاہیے۔ اس کے خیالات میں درستی ہونی چاہیے۔ لیکن جہاں ان کی اپنی زندگی پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا وہاں مرنے والوں کی ارواح کو ثواب پہنچانے کے لئے وہ کئی قسم کے کام کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ مردوں کے لئے غرباء کو روٹی کھلا دی یا ان کے ثواب کی خاطر کپڑے تقسیم کر دیئے یہ عجیب قسم کا متضاد مقام ہے۔ جو انسانی عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور درحقیقت انسان کی یہ شبہ والی حالت ایسی ہے کہ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتا اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ یقین رکھتا ہے۔ جب ہم اس کی اپنی زندگی کو دیکھتے ہیں تو مابعد الموت زندگی کا جو اثر اس کے اعمال پر پڑنا چاہیے وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔ لیکن جب ہم مرنے والوں کے متعلق اس کے جذبات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مرنے والے رشتہ داروں کے متعلق اس کے دل میں اس قسم کی تڑپ اور تمنا پائی جاتی ہے۔ کہ وہ زندہ ہوں تو میں ان سے ملوں لیکن ایک طبقہ دنیا کا ایسا بھی

ہے جو کہتا ہے کہ مرنے کے بعد ہم نے نہیں جینا اور ایک طبقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم نے جینا ہے۔مگر جو طبقہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے مرنے کے بعد جینا ہے اس کی زندگی کے حالات میں کبھی کبھی اس خیال کی بھی جھلک آجاتی ہے۔ کہ ہم نے نہیں جینا۔اور جو طبقہ یہ کہتا ہے کہ ہم نے نہیں جینا اس کی زندگی کے حالات میں کبھی کبھی اس خیال کی بھی جھلک آجاتی ہے کہ ہم نے جینا ہے۔گویا جو ہاں کہتا ہے اس پر نہ کا زمانہ آتا رہتا ہے اور جو نہ کہتا ہے اس پر ہاں کا زمانہ آتا رہتا ہے۔لیکن عام طور پر جہاں تک انسان کی اپنی زندگی کا سوال ہوتا ہے وہ اسے اگلی زندگی کے خیالات سے متاثر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور جہاں تک مرنے والوں کے متعلق اپنے جذبات کے اظہار کا سوال ہوتا ہے۔وہ ان کے لئے قربانی کرنے کو تیار ہوجاتا ہے۔کیونکہ ان کے لئے اسے جو قربانی کرنی پڑتی ہے وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ کوئی مر گیا تو اس کے نام پر غرباء کو روٹی کھلا دی یا کپڑے تقسیم کر دیئے یا خیرات دے دی لیکن اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے بہت بڑا بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔مثلاً سچ بولنا پڑتا ہے جھوٹ اور فریب سے بچنا پڑتا ہے۔نفسانی خواہشات کو ترک کرنا پڑتا ہے۔خدا تعالیٰ کے احکام کو ماننا پڑتا ہے۔اور یہ کام ایسے ہیں جو قربانی چاہتے ہیں۔پس وہ ان کے لئے تیار نہیں ہوتا لیکن روٹی یا کپڑا دے دینا چونکہ اتنا بڑا کام نہیں ہوتا۔اس لئے وہ ان کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا میں جس انسان کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق بھی خدا تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ وہ کہتا ہے میں نے مرنے کے بعد زندہ نہیں ہونا بلکہ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا میں استفہامیہ رنگ اختیار کیا گیا ہے اور اس پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے۔یہ نہیں کہ وہ مرنے کے بعد زندہ نہ ہونے پر متیقّن ہے۔ بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق وہ متردد ہے اور کہتا ہے کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو ضرور زندہ کیا جاؤں گا گویا اس کی شبہ والی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے۔اس سے یہ مضمون نہیں نکلتا کہ وہ لازماً قیامت کا منکر ہے۔

اوپر کی تمہید مَیں نے اسی لئے بیان کی تھی کہ دنیا کے عقائد دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی کا کلی انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔لیکن یقینی اقرار بھی بہت کم پایا جاتا ہے۔لوگوں کا بہت سا حصہ ایسا ہے کہ خواہ بعث بعد الموت کو وہ مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں ان کی حالت ہمیشہ تردّد والی رہتی ہے۔کہ ایسا ہونا ہے یا نہیں ہونا۔

عیسائیوں میں مذہباً یہ بات پائی جاتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک اور زندگی انسان کو حاصل ہوگی چنانچہ حضرت مسیحؑ نے ایک دفعہ یہودیوں سے اس کے متعلق بحث بھی کی۔ یہودیوں میں دو گروہ پائے جاتے تھے۔ایک وہ جن کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد زندگی ہوتی ہے۔اور دوسرے وہ جن کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد زندگی نہیں ہوتی۔وہ

گروہ جس کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی نہیں اس کے بعض افراد حضرت مسیحؑ کے پاس آئے اور اس بارے میں سوال کیا تو آپ نے انہیں فرمایا کیا تم نے تورات (خروج باب۳، ۶) میں نہیں پڑھا کہ خداوند کو ابراہام کا خدا اور اضحاق کا خدا اور یعقوب کا خدا کہا گیا ہے۔اور تم جانتے ہو کہ ’’خدا مردوں کا خدا نہیں بلکہ زندوں کا ہے۔کیونکہ اس کے نزدیک سب زندہ ہیں‘‘ (لوقا ب ۲۰ آیت ۳۸ و متی ب ۲۲ آیت ۳۲)

یعنی تمہیں بائبل سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی روحیں زندہ ہیں اور ان کے باپ دادا کی روحیں بھی زندہ ہیں ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارا خدا زندوں کا نہیں بلکہ مردوں کا خدا ہے۔

اسی طرح فرماتے ہیں

’’قیامت میں بیاہ شادی نہ ہو گی بلکہ لوگ آسمان پر فرشتوں کی مانند ہوں گے‘‘

(متی باب ۲۲ آیت ۳۰)

پھر پولوس لکھتا ہے۔

’’ہم جانتے ہیں کہ جب ہمارا خیمہ کا گھر جو زمین پر ہے گرایا جائے گا تو ہم کو خدا کی طرف سے آسمان پر ایک ایسی عمارت ملے گی جو ہاتھ کا بنا ہوا گھر نہیں بلکہ ابدی ہے‘‘۔

(۲ کرنتھیوں باب ۵ آیت ۱)

اسی طرح لوقا میں ایک غریب اور دولت مند کا قصہ بیان کرتے ہوئے حضرت مسیحؑ مرنے کے بعد کی زندگی کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتے ہیں۔آپ فرماتے ہیں۔

’’ایک دولت مند تھا جو ارغوانی اور مہین کپڑے پہنتا اور ہر روز خوشی مناتا اور شان و شوکت سے رہتا تھا اور لعزر نام ایک غریب ناسوروں سے بھرا ہوا اس کے دروازہ پر ڈالا گیا تھا اسے آرزو تھی کہ دولت مند کی میز سے گرے ہوئے ٹکڑوں سے اپنا پیٹ بھرے۔ بلکہ کتے بھی آکر اس کے ناسور چاٹتے تھے اور ایسا ہوا کہ وہ غریب مر گیا۔اور فرشتوں نے اسے لے جا کر ابراہام کی گود میں پہنچا دیا اور دولتمند بھی موا اور دفن ہوا اس نے عالم ارواح کے درمیان عذاب میں مبتلا ہو کر اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابراہام کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو اور اس نے پکار کر کہا کہ اے باپ ابراہام مجھ پر رحم کر کے لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی میں بگھو کر میری زبان تر کرے کیونکہ میں اس آگ میں تڑپتا ہوں ابراہام نے کہا بیٹا یاد کر کہ تو اپنی زندگی میں اپنی اچھی چیزیں لے چکا اور اسی طرح لعزر

بری چیزیں ۔لیکن اب وہ یہاں تسلی پاتا ہے ۔اور تو تڑپتا ہے ۔اور ان سب باتوں کے سوا ہمارے تمہارے درمیان ایک بڑا گڑھا واقع ہے ۔ایسا کہ جو یہاں سے تمہاری طرف پار جانا چاہیں نہ جاسکیں ۔اور نہ کوئی ادھر سے ہماری طرف آسکے ۔اس نے کہا پس اے باپ میں تیری منت کرتا ہوں کہ تو اسے میرے باپ کے گھر بھیج کیونکہ میرے پانچ بھائی ہیں تاکہ وہ ان کے سامنے ان باتوں کی گواہی دے ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اس عذاب کی جگہ میں آئیں ۔ابراہام نے اس سے کہا ان کے پاس موسیٰ اور انبیاء تو ہیں ان کی سنیں ۔اس نے کہا نہیں اے باپ ابراہام ہاں اگر کوئی مردوں میں سے ان کے پاس جائے ۔تو وہ توبہ کر لیں گے ۔اس نے اس سے کہا کہ جب وہ موسیٰ اور نبیوں ہی کی نہیں سنتے تو اگر مردوں میں سے کوئی جی اٹھے تو اس کی بھی نہ مانیں گے ۔'' (لوقا باب ۱۶ آیت ۱۹ تا ۳۱)

''مکاشفہ'' میں بھی لکھا ہے ۔

''پھر میں نے آسمان میں سے یہ آواز سنی کہ لکھ ۔مبارک ہیں وہ مردے جو اَب سے خداوند میں مرتے ہیں روح فرماتا ہے بے شک کیونکہ وہ اپنی محنتوں سے آرام پائیں گے اور ان کے اعمال ان کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں'' (مکاشفہ باب ۱۴ آیت ۱۳)

غرض حضرت مسیحؑ نے بعث بعد الموت کی تائید کی ہے اور عیسائی لٹریچر بھی سارے کا سارا اس تعلیم سے بھرا پڑا ہے کہ مرنے کے بعد ہر انسان کو ایک نئی زندگی حاصل ہوگی صرف اس قدر فرق ہے کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے دوبارہ آنے پر اسی دنیا میں ساری روحیں آجائیں گی ۔اور یہیں ان کو جزا و سزا دی جائے ۔چنانچہ متی میں لکھا ہے ۔

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے اور جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا ۔'' (متی باب ۱۹ آیت ۲۹)

اسی طرح مکاشفہ میں لکھا ہے کہ وہ لوگ

''جنہوں نے نہ اس حیوان کی پرستش کی تھی نہ اس کے بت کی اور نہ اس کی چھاپ اپنے ہاتھوں اور ماتھے پر لی تھی وہ زندہ ہو کر ہزار برس تک مسیح کے ساتھ بادشاہی کرتے رہے اور جب تک یہ ہزار

برس پورے نہ ہولئے باقی مردے زندہ نہ ہوئے۔پہلی قیامت یہی ہے۔‘‘

(مکاشفہ باب ۲۰ آیت ۴ تا ۵)

مگر باوجود اس کے کہ ہر مذہب نے اُخروی حیات کو تسلیم کیا ہے اس زمانے میں سب سے بڑا انکار بعث بعد الموت کا ہی کیا جاتا ہے۔اور اس زندگی کے متعلق ایک قسم کے تذبذب اور شک والی کیفیت لوگوں کے قلوب میں پائی جاتی ہے۔پس ’’الانسان‘‘ سے مراد عام انسان نہیں کیونکہ ان میں تو وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کو اس زندگی پر کامل یقین ہے۔اس جگہ ’’الانسان‘‘ سے وہی انسان مراد ہے جو اُخروی حیات پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا واقعہ میں مَیں نے مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے اور یا پھر ’’الانسان‘‘ سے مراد جنس انسان ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ شخص جو جنس انسان سے تعلق رکھتا ہے۔وہ یہ بات کہتا ہے۔اور یہ سخت قابل تعجب ہے کیونکہ انسان تو دو اُنسوں سے مرکب ہے اور اس کی فطرت بعث مابعد الموت پر دلالت کرتی ہے۔پھر انسان ہو کر وہ یہ کیونکر کہہ سکتا ہے۔کہ کیا واقعہ میں مَیں نے مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے۔جب ہم ’’کیا‘‘ کا لفظ بولیں تو اس میں دونوں باتیں آجاتی ہیں یعنی نامعلوم ایسا ہونا ہے یا نہیں ہونا۔

اَوَ لَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ يَكُ شَيْـًٔا فرماتا ہے کیا یہ انسان اس بات کو نہیں جانتا کہ اس سے پہلے ہم نے اس کو پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔لَمْ يَكُ شَيْـًٔا سے مراد یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جو قابل ذکر ہو۔جیسے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (الدھر:۲) پس لَمْ يَكُ شَيْـًٔا سے یہ مراد ہے کہ وہ کسی ایسی حیثیت میں نہیں تھا جو قابل ذکر ہو۔یا جس کو کوئی اہمیت دی جاسکے۔یعنی وہ نطفہ کی حالت میں تھا۔یا جمادات اور نباتات کی حالت میں تھا۔گویا اس وقت ایک شئے تو تھی مگر شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا نہیں تھی۔شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا وہ چیز ہوتی ہے جو اہمیت رکھتی ہو اور توجہ کے قابل ہو۔اگر ایک ذلیل اور حقیر اور ناقابل ذکر چیز کو ترقی دے کر اللہ تعالیٰ نے انسان بنادیا تو وہی انسان اگر مرنے کے بعد مٹی ہوجاتا ہے تو اس مٹی سے دوبارہ انسان بنادینا کوئی تعجب کی بات نہیں ہوسکتی۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ

پس تیرے رب کی قسم ہم (جو تیرے رب ہیں) ان لوگوں کو (پھر ایک دفعہ) اٹھائیں گے اور شیطانوں کو بھی (اٹھائیں

حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۹﴾

گے اور) پھر اُن سب کو جہنم کے گرد ایسی صورت میں حاضر کریں گے کہ وہ زانوؤں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔

حل لغات۔ جِثِيٌّ جَثَا الرَّجُلُ يَجْثُوْ کے معنے ہوتے ہیں۔ جَلَسَ عَلٰى رُكْبَتَيْهِ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اَوْ قَامَ عَلٰى اَطْرَافِ اَصَابِعِهٖ یا اپنے پاؤں کی انگلیوں پر کھڑا ہوا جَثَا سے اسم فاعل جَاثٍ آتا ہے یعنی اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھنے والا جِثِيٌّ جَاثٍ سے جمع کا صیغہ ہے (اقرب) مفردات میں ہے کہ یہ مصدر بھی ہوسکتا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ہم تیرے ہی رب کی قسم کھا کر کہتے ہیں لَنَحْشُرَنَّهُمْ کہ ہم ضرور ان کو اکٹھا کریں گے وَالشَّيٰطِيْنَ اور ان شیطانوں کو بھی اکٹھا کریں گے جو ان کو ورغلا رہے ہیں اس سے پتہ لگتا ہے کہ انسان سے مراد وہی انسان ہے جس کا پہلے ذکر ہے ورنہ اگر اعلیٰ درجہ کے مومن اور صدیق اور شہداء اور انبیاء وغیرہ مراد ہوتے تو شیطانوں کا یہاں کیا ذکر تھا؟ شیاطین کا ذکر کرنا صاف بتاتا ہے کہ ''الانسان'' سے وہی انسان مراد ہیں جو حیات بعد الموت پر پورا ایمان نہیں رکھتے۔ فرماتا ہے ہم ان کو بھی اکٹھا کریں گے اور شیاطین کو بھی اکٹھا کریں گے یعنی وہ فلسفی لوگ جو حیات بعد الموت کے متعلق ان کو شبہات میں مبتلا کرتے رہے ہیں ان سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا پھر ہم ان سب کو جہنم کے گرد حاضر کریں گے اس حال میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے۔

جہنم کے متعلق تمام مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ عجمی لفظ ہے عربی زبان میں اس کا کوئی مادہ نہیں پایا جاتا (الاتقان زیر لفظ جہنم) اور عجمی زبانوں کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ارمیک (Aramaic) لفظ ہے جو ''مقام سزا بعد الموت'' کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عبرانی زبان میں یہ لفظ جِهِنَّۃ (Gehenna) استعمال ہوتا ہے جو ارمیک زبان میں اصل میں ھِنُّوْم (Hinnom) تھا مگر پھر اسے جِهِنُّوْم (Ge-Hinnom) بنا لیا گیا۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ھِنُّوْم کسی لمبے لفظ کا ٹکڑا ہے اور اس کے معنے ''وادی خون ریزی'' یا ''قتل عام'' کے سمجھے جاتے ہیں (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا زیر لفظ ھنوم ویلی کالم ۲۰۷۰)

جہاں تک میرا خیال ہے یہ ’’جِهِنُّوم ‘‘(Gehinnom) عربی زبان کا ہی ایک بگڑا ہوا لفظ ہے۔عربی میں ’’هِنَمٌ ‘‘ کے معنے چیتے کے ہوتے ہیں اور ’’ذُوْهِنَمٍ ‘‘ کے معنے ہوتے ہیں چیتوں والی جگہ ارمیک والوں نے بھی کہا ہے کہ یہ کسی لمبے لفظ کا ٹکڑا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کے معنے ’’وادی خونریزی‘‘ یا ’’قتل عام‘‘ کے ہیں پس میرے نزدیک یہ اصل میں ’’ذُوْهِنَمٍ ‘‘ تھا یعنی وہ جگہ جہاں چیتے رہتے ہیں اور لوگوں کو پھاڑتے اور زخمی کرتے ہیں۔ عجمی لوگ چونکہ عربی کی ذال کو عموماً جیم سے بدل دیا کرتے ہیں اس لئے ارمیک والوں نے ’’ذُوْهِنَمٍ ‘‘ کو ’’جِهِنُّوم ‘‘ بنالیا اور عربی والوں نے پھر اس لفظ کو عجمیوں سے لے کر جہنم بنالیا۔اس قسم کی مثالیں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ ایک زبان سے بعض دفعہ دوسری زبان میں کوئی لفظ گیا اور اس نے بگڑ کر کوئی اور شکل اختیار کر لی۔پھر اس بگڑی ہوئی شکل کو اصل زبان والوں نے واپس لے کر ایک اور لفظ کا جامہ پہنالیا یہ لفظ بھی اصل میں ’’ذُوْهِنَمٍ ‘‘ تھا یعنی چیتوں والی جگہ اور یہ عربی زبان کا لفظ تھا (المنجد)۔عربوں سے عجمیوں نے یہ لفظ لیا اور اس کو ’’جِهِنُّوم ‘‘ بنالیا پھر عربوں نے عجمیوں سے ’’جِهِنُّوم ‘‘ لفظ لے کر جہنم بنالیا۔

اس کے علاوہ میرے نزدیک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کا لفظ دو ثلاثی لفظوں کو ملا کر بنایا گیا ہو یعنی جہن اور جہم کو۔ جہن کے معنے عربی زبان میں قریب ہونے کے ہیں اور جہم کے معنے برا منہ بنا کر ملنے کے ہیں۔پس جہنم اصل میں جہن جہم ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ چیز جس کی طرف انسان شوق سے جاتا ہے مگر جب پاس جاتا جاتا ہے تو منہ بناتا ہے۔ درحقیقت اس نام میں ہی جہنم کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔اور بتایا گیا ہے کہ انسان پہلے دوزخ میں لے جانے والے افعال کا ارتکاب ان کو اچھا سمجھ کر کرتا ہے مگر ان افعال کی وجہ سے جب وہ دوزخ کے قریب پہنچتا ہے تو منہ بنانے لگ جاتا ہے کہ یہ تو بڑا برا مقام ہے گویا اس کیفیت کے اظہار کے لئے جو دوزخ دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور ان کاموں کی وجہ سے جن کو بظاہر انسان اچھا سمجھتا ہے مگر وہ اسے دوزخ کے قریب کرتے چلے جاتے ہیں اس مقام کا نام جہنم رکھا گیا ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی اسی رنگ میں ایک لفظ کی تشریح کی ہے۔آپ ’’اسلامی اصول کی فلاسفی‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں کہ خنزیر کا لفظ دراصل خنز اور ار سے مرکب ہے خنز کے معنے ہیں ’’بہت برا‘‘ اور اَر کے معنے ہیں ’’دیکھتا ہوں‘‘۔پس خنزیر کے معنے یہ ہیں کہ میں اس کو بہت برا، فاسد اور خراب دیکھتا ہوں (روحانی خزائن جلد ۱۰ صفحہ ۳۳۸)۔ یعنی اس جانور کے اندر بعض ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جو اس کی گندگی اور خرابی ظاہر کرنے والی ہیں۔اس شکل میں مَیں سمجھتا ہوں کہ جہنم بھی جہن اور جہم سے مرکب ہے یعنی جہنم ایک ایسی چیز ہے جس کے قریب جانے کی انسان

کوشش کرتا ہے یعنی وہ ایسے افعال پسند کرتا ہے جو اسے جہنم کے قریب لے جانے کا موجب ہوتے ہیں۔مگر جب جہنم اسے نظر آتا ہے تو اس کی بری شکل ہو جاتی ہے اور وہ کہتا ہے او ہو یہ تو بہت برا مقام ہے۔

جیسا کہ حل لغات میں بتایا جا چکا ہے جَثَا یَجْثُوْ کے معنے ہوتے ہیں گھٹنوں کے بل گر جانا یا انگلیوں کے بل کھڑا ہو جانا یعنی انسان جب کسی چیز کو اپنی ایڑیاں اٹھا کر اور انگلیوں کے بل کھڑے ہو کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس حالت کو جِثِیًّا کہتے ہیں اور جب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے جیسے تشہد کی حالت میں بیٹھتے ہیں تو اس حالت کو بھی جِثِیًّا کہتے ہیں اس جگہ یہ دونوں معنے چسپاں ہو جاتے ہیں کیونکہ جہنم کا ذکر ہے اور انسانی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو پہلے وہ اسے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اور انگلیوں کے بل کھڑے ہو کر جھانکتا ہے کہ کیا چیز آ رہی ہے یا کونسی مصیبت ہے جس میں مَیں گرفتار ہونے والا ہوں مگر جب وہ مصیبت کو دیکھ لیتا ہے تو اس کی طاقت زائل ہو جاتی ہے اور وہ گھٹنوں کے بل گر جاتا ہے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ

پھر ہم ہر ایک گروہ میں سے ایسے لوگوں کو الگ کر لیں گے جو (خدائے) رحمٰن کے سخت دشمن تھے۔اور ہم

عِتِيًّا ۝۷۰ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ۝۷۱

خوب جانتے ہیں کہ ان میں سے کون دوزخ میں جانے کے زیادہ قابل ہے۔

حلّ لُغَات۔ الشِّيْعَةُ کے معنے ہیں اَلْفِرْقَةُ گروہ۔(اقرب)

ثُمَّ حَرْفُ عَطْفٍ۔يَدُلُّ عَلَى التَّرْتِيْبِ وَالتَّرَاخِيْ یعنی ثُمَّ حرف عطف ہے جو کبھی ترتیب کے بیان کرنے کے لئے آتا ہے اور کبھی یہ بتانے کے لئے کہ یہ کام دیر سے ہوا ہے۔(اقرب)

صِلِيًّ صَلِيَ النَّارَ کے معنے ہوتے ہیں قَاسٰى حَرَّهَا وَ احْتَرَقَ بِهَا وَ دَخَلَ فِيْهَا کہ آگ کی گرمی برداشت کی اور اس میں جلا اور اس میں داخل ہوا (اقرب) صِلِيٌّ مصدر ہے گویا اس کے معنے ہوں گے آگ میں جلنا یا اس کی گرمی برداشت کرنا۔

تفسیر۔اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جہنم میں داخل ہونے سے پہلے ہر گروہ کفار میں سے ان کے سرکردہ لوگوں کو خاص سزا دینے کے لئے الگ کر لیا جائے گا۔ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا میں علٰی کے معنے خلاف کے ہیں

یعنی وہ لوگ جو خدائے رحمٰن کے خلاف سب سے زیادہ سرکشی اور تمرد اختیار کرنے والے ہوں گے۔

اس کے بعد فرمایا ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا اور ہم ان لوگوں کو خوب جانتے ہیں جو آگ کے عذاب کے زیادہ مستحق ہیں۔ان آیات میں پہلا ثُمَّ ترتیب کے لحاظ سے ہے اور دوسرا ثُمَّ خالص عطف پر دلالت کرتا ہے اور یہ پہلے مضمون کی تشریح ہے کہ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا یہ ثُمَّ ایسا ہی ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ ''اور بات یہ ہے'' اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلی بات کے بعد یہ بات ہوئی بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس بات کے ساتھ ہی ایک یہ بات بھی ہے اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ایک یہ بات بھی ہے کہ ہم سب سے زیادہ ان لوگوں کو جانتے ہیں جو اس آگ میں پڑنے کے زیادہ مستحق ہیں۔

غرض پہلا ثُمَّ یعنی ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ میں جو ثُمَّ آیا ہے وہ ترتیب کے لحاظ سے ہے یعنی پہلے واقعہ کے بعد یہ ہوگا لیکن ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ میں درجہ مراد ہے کیونکہ ثُمَّ کا لفظ عربی زبان میں زمانہ اور مکان اور وضع کی ترتیب کے لئے بھی آتا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ان کے مدارج کفر کیا ہیں اور کون کس مقام پر رکھے جانے کے قابل ہے۔کیونکہ علم الٰہی نزوع کے بعد نہیں آتا بلکہ وقت کے لحاظ سے علم عمل سے پہلے ہوتا ہے۔پس یہاں ثُمَّ سے مراد بعد نہیں ہوسکتا کیونکہ فرماتا ہے ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ پس یہ جاننا درجہ کے لحاظ سے ہے وقت کے لحاظ سے نہیں۔پہلے فرمایا کہ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ہم کفار کے ہر گروہ میں سے ان کے بڑے بڑے لیڈروں کو نکال لیں گے۔پھر کہا کہ بات تو یہ ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ کون اس عذاب کا زیادہ مستحق ہے اور جاننا ہمیشہ کام سے پہلے ہوتا ہے۔تم پہلے ایک بات کو جانتے ہو اور پھر کام کرتے ہو۔تم نے لاہور جانا ہے تو پہلے تمہارے دل میں لاہور جانے کا خیال آئے گا اور پھر تم لاہور جاؤ گے۔تم نے مدرسہ جانا ہے تو پہلے مدرسہ جانے کا خیال آئے گا اور پھر تم مدرسہ جاؤ گے۔تم نے کھانا کھانا ہے تو پہلے تمہارے دل میں کھانا کھانے کا خیال آئے گا اور پھر کھانا کھاؤ گے۔تو جب بھی انسان کوئی کام کرنے لگے گا علم پہلے ہوگا اور کام بعد میں ہوگا۔مگر یہاں علم سے پہلے ثُمَّ کا لفظ ہے اور چونکہ علم ہمیشہ پہلے ہوتا ہے اور کام بعد میں ہوتا ہے اس لئے پتہ لگ گیا کہ یہ ثُمَّ درجہ کے لحاظ سے ہے یعنی ہم اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ کون کس عذاب کا مستحق ہے۔پس یہاں یہ مراد نہیں کہ یہ بات پہلے فعل کے بعد ہوگی۔بلکہ یہ مراد ہے کہ جو لوگ درجہ کفر میں بڑے ہیں ان کو پہچاننا تو ہمارے علم کا حصہ ہے۔

اَيُّهُمْ اَشَدُّ کے متعلق مفسرین نے بحث کی ہے کہ یہاں اَيَّهُمْ چاہیے تھا لیکن آیا اَيُّهُمْ ہے اس کے متعلق

خلیل کہتا ہے کہ یہ رفع حکایت کی وجہ سے آیا ہے اور مراد یہ ہے ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ الَّذِیْنَ یُقَالُ مِنْھُمْ اَیُّھُمْ اَشَدُّ یعنی ہم ایسے لوگوں کو جن کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ وہ سب سے زیادہ سرکش اور متمرد ہیں دوسروں سے علیحدہ کرلیں گے لیکن بعض نے کہا ہے کہ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ کُلِّ شِیْعَةٍ میں نَنْزِعَنَّ کا مفعول مِنْ کُلِّ شِیْعَةٍ آچکا ہے اور اَیُّھُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا ایک زائد مستقل جملہ ہے۔اور مراد یہ ہے کہ پوچھنے والا پوچھتا ہے ''وہ کون ہیں'' تو اس کا جواب ملتا ہے اَیُّھُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا یعنی جب خدا تعالیٰ نے کہا کہ ہم ہر گروہ کفار میں سے ایک جماعت کو الگ کرلیں گے تو پوچھنے والا پوچھتا ہے وہ کون لوگ ہیں اس پر وہ کہتا ہے اَیُّھُمْ اَشَدُّ عَلَی الرَّحْمٰنِ عِتِیًّا

بعض نے کہا ہے کہ اس کی ایک قرأت اَیَّھُمْ بھی آتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہر گروہ میں سے جو خدا کے زیادہ منکر ہیں ان کو نکال لیا جائے گا۔(التفسیر القرطبی زیر آیت ھٰذا)

صِلِیًّا کے معنے صرف آگ میں جل جانے کے نہیں بلکہ جو شخص آگ کی گرمی سے متاثر ہو اس کے لئے بھی یہ لفظ استعمال کرلیا جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں صَلِیَ النَّارَ وَبِھَا قَاسٰی حَرَّھَا اَوِ احْتَرَقَ یعنی صَلِیَ النَّارَ وَبِھَا کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس نے آگ کی گرمی محسوس کی یا اس سے جل گیا۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا کیوں کہا اَوْلٰی بِھَا صِلِیًّا کے یہاں دو معنے ہوسکتے ہیں۔ایک یہ کہ یہ لوگ دوسروں سے زیادہ مستحق ہیں آگ میں پڑنے کے اور دوسرے یہ کہ بہ نسبت دوسری چیزوں کے یہ لوگ آگ میں پڑنے کے زیادہ مستحق ہیں یعنی اَوْلٰی بِالنَّارِ صِلِیًّا یا اَوْلَی النَّاسِ بِالنَّار بہ نسبت اور چیزوں کے یہ آگ میں پڑنے کے زیادہ مستحق ہیں یا بہ نسبت اور لوگوں کے یہ آگ کے عذاب کے زیادہ مستحق ہیں۔ پس سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسرے کون ہیں جن کے مقابل پر یہ آگ کے زیادہ مستحق ہیں یا دوسری کونسی عذاب کی اقسام ہیں جن کے مقابل پر یہ آگ کے زیادہ مستحق ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ اصحاب تثلیث کا ذکر ہے اور قرآن کریم سے پتہ لگتا ہے کہ اصحاب تثلیث کی ترقی کا زیادہ تر تعلق آلات نار سے ہوگا اور وہ اپنے مخالفوں کو بھی زیادہ تر آلات نار سے ہی ڈرائیں گے۔مثلاً بندوق ہے۔توپ ہے، بم ہے، یا اب ایٹم بم نکل آیا ہے۔ان سب میں آگ سے کام لیا جاتا ہے۔اس سے پہلے لوگ لوہے سے کام لیتے تھے مثلاً تلوار تھی، نیزہ تھا، ہتھوڑے تھے، گرز تھے اور یا پھر پتھر اور غلیل وغیرہ سے کام لیتے تھے لیکن یاجوج وماجوج کا زمانہ آیا تو انہوں نے آگ سے کام لینا شروع کردیا۔ان کے ناموں میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا تھا۔چنانچہ یہ دونوں لفظ اَجَّ سے نکلے ہیں جس کے معنے آگ کے ہیں (اقرب) گویا یاجوج وماجوج ان کا اس

لئے نام رکھا گیا تھا کہ انہوں نے آگ سے زیادہ کام لینا تھا اور آتشین اسلحہ کے استعمال سے ہی انہوں نے دنیا پر غلبہ پانا تھا چنانچہ دیکھ لو پستول ۔ ریوالور ۔ بندوق ۔ رائفل ۔ بم اور پھر ایٹم بم یہ سارے کے سارے آگ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور اپنے مخالفوں کو مغلوب کرنے کا ان کے پاس یہی ایک ذریعہ ہے مسلمانوں کو بھی انہوں نے انہی آلات حرب سے مغلوب کیا ہے ۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے یہ چیزیں استعمال نہ کیں ۔ کیونکہ ان کے مولویوں نے ان کو خراب کیا اور کہا کہ آگ سے کسی کو عذاب دینا سوائے خدا تعالیٰ کے اور کسی کے لئے جائز نہیں ۔ یا کہہ دیا کہ یہ کوئی جادو ہے جس کے زور سے یکدم بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں ۔ ورنہ ہتھیار ہوتا تو اس کے استعمال سے ایک ایک آدمی مرتا ۔ پس چونکہ یہ جادو ہے اور جادو سیکھنے سے شیطان کے ساتھ تعلق ہو جاتا ہے اس لئے ان آلات کا استعمال جائز نہیں ۔ پس مسلمانوں پر جو تباہی آئی اس کی زیادہ تر وجہ یا مولویوں کے فتوے ہیں اور یا پھر مغربی اقوام کے آتشین اسلحہ ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دن جب ہماری سزا کا وقت آئے گا تو یہ لوگ دوسروں سے زیادہ آگ کے مستحق ہوں گے ۔ کیونکہ باقی لوگوں نے آگ سے اتنا کام نہیں لیا جتنا ان لوگوں نے لیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں اگر باقی ساری دنیا کے آلات حرب جمع کر لئے جائیں تو وہ ان لوگوں کی ایک چھوٹی سے چھوٹی حکومت کے اسلحہ سے بھی کم ہوں گے ۔ اگر ہندوستان ، پاکستان اور چین کی حکومتوں کے پاس جس قدر سامان حرب ہے وہ جمع کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ جتنی بندوقیں اور گولیاں ان تینوں ممالک کے پاس مجموعی طور پر ہوں گی وہ شائد فرانس کے برابر بھی نہیں ہوں گی پس چونکہ ان لوگوں نے سب سے زیادہ آگ کی کھیل کھیلی ہوگی اس لئے ہم بھی سب سے زیادہ انہی لوگوں کو آگ کا عذاب دیں گے اور اس دن انہیں معلوم ہو جائے گا کہ آگ کے عذاب کے یہ لوگ زیادہ مستحق ہیں یا دوسرے ۔

عذاب کے لحاظ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ کئی قسم کے عذاب ہو سکتے ہیں ۔ مثلاً پانی کا بھی عذاب ہو سکتا ہے ۔ بیماریوں کا بھی عذاب ہو سکتا ہے ۔ سردی کا بھی عذاب ہو سکتا ہے اور خوفناک نظاروں کا بھی عذاب ہو سکتا ہے ۔ مگر انہوں نے چونکہ لوگوں کو آگ کا عذاب دیا ہوگا اس لئے آگ کا عذاب ہی ان کے زیادہ مناسب ہوگا یعنی ان پر ایسے عذاب نازل ہوں گے جن میں سوزش اور جلن اور آگ پائی جاتی ہوگی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سوزش کا عذاب ان لوگوں کے لئے مقدر ہے ۔

وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿۷۲﴾

اور تم میں سے ہر شخص اس (یعنی دوزخ) میں جانے والا ہے یہ خدا (تعالیٰ) کا ایسا پکا وعدہ ہے جو ہو کر رہے گا۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۳﴾

اور ہم متقیوں کو بچا لیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

تفسیر - وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے لفظی معنے یہ ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص نہیں مگر وہ اس آگ میں داخل ہونے والا ہے۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ ہر انسان دوزخ میں ڈالا جائے گا (تفسیر مجاهد زیر آیت ھذا) مگر یہ غلط ہے اس لئے کہ یہاں ذکر ہی کافروں کا ہے مومنوں کا ذکر نہیں چنانچہ فرمایا تھا وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا انسان کہے گا کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو پھر زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا اب کیا یہ مومن کہا کرتے ہیں کہ ہم نے مر کر نہیں اٹھنا۔ اس میں بہر حال انہی لوگوں کا ذکر ہے جو کہتے ہیں کہ ہم نے مر کر نہیں اٹھنا یا اس زندگی کے متعلق ان کے دلوں میں شبہ والی کیفیت پائی جاتی ہے اسی طرح فَوَ رَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَ الشَّيٰطِيْنَ میں بھی کفار کا ذکر ہے ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا میں بھی انہی کا ذکر ہے پس جبکہ اس جگہ پر ذکر ہی کفار کا ہے تو اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے بھی کفار ہی مراد ہوں گے اور انہی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا یہ تیرے رب کا وعدہ ہے جو ضرور پورا ہونے والا ہے حَتْمًا مَّقْضِيًّا کے معنے ہیں وعدًا واجبًا مقْضِيًّا ایسا وعدہ جو واجبی ہے اور لازمی ہے اور ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کے عام تفسیری معنے قبول کئے ہیں اور آئینہ کمالات اسلام (صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴) میں تحریر فرمایا ہے کہ اِنْ مِّنْكُمْ سے سب انسان مراد ہیں اور ہر انسان دوزخ میں جائے گا لیکن معنے یہ کئے ہیں کہ دوزخ دو قسم کی ہے ایک اس دنیا کی اور ایک اگلے جہاں کی کفار تو اگلے جہان کی دوزخ میں گرائے جائیں گے مگر مومنوں کو اگلے جہان کی دوزخ میں نہیں گرایا جائے گا۔ بلکہ اسی دنیا میں ان کو خدا تعالیٰ کی راہ میں جو تکالیف پہنچتی ہیں وہ اس دوزخ کا قائم مقام ہو جائیں گی۔ گویا آپ نے اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کو پچھلی آیات کے ساتھ ملا کر اس کے معنے نہیں کئے بلکہ مستقل طور پر اس آیت سے ایک نتیجہ نکالا ہے اور فرمایا ہے کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا

وَارِدُهَا کے یہ معنے ہیں کہ تم میں سے ہر شخص اس دوزخ میں داخل ہونے والا ہے۔مگر کفار تو اگلے جہاں کی دوزخ میں ڈالے جائیں گے اور مومنوں کو اس دنیا میں جو تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں وہ اس جہنم کا قائم مقام ہو جائیں گی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ معنے بھی درست ہیں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومنوں کو کافروں سے بہت زیادہ دنیا کی تکالیف پہنچتی ہیں بلکہ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ کا کوئی شخص جتنا زیادہ پیارا ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ اسے دنیا کی تکلیفیں پہنچتی ہیں پس یہ معنے بھی صحیح ہیں۔

احادیث میں بھی اس آیت پر بحث آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو معنے میں نے کئے ہیں اور جو معنے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کئے ہیں وہ دونوں احادیث سے ثابت ہیں چنانچہ حضرت حفصہؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ بدر اور حدیبیہ کے صحابہؓ میں سے کوئی شخص دوزخ میں نہیں جائے گا۔حضرت حفصہؓ کہتی ہیں میں نے کہا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَ اَیْنَ قَوْلُ اللّٰہِ تَعَالٰی اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُهَا یعنی اگر یہ بات درست ہے تو پھر خدا تعالیٰ کا یہ قول کہاں گیا کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا یعنی اس میں تو یہ ذکر ہے کہ سب لوگ دوزخ میں جائیں گے اس پر آپ نے فرمایا مَهْ یعنی بس بس! جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ چپ بھی کر وہ آیت کہاں گئی کہ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (مسلم کتاب فضائل اصحابہ بحوالہ تفسیر جامع البیان) اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہاں ثُمَّ کے معنے اور کے ہیں۔ورنہ حضرت حفصہؓ کی بات کی تردید نہیں ہوتی بلکہ اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ اگر اس کے یہ معنے کئے جائیں کہ پھر ہم متقیوں کو نجات دیں گے تو اس کے معنے یہ بنتے ہیں کہ متقی بھی دوزخ میں ڈالے جائیں گے گویا وہی بات ثابت ہو جاتی ہے جو حضرت حفصہؓ نے کہی تھی مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی بات کی تردید فرماتے ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ آپ نے یہاں ثُمَّ کے معنے اور کے کئے ہیں اور اسے ایک الگ جملہ قرار دیا ہے گویا نجات پانے والے وہ ہیں جو جہنم میں نہیں جائیں گے اور اگر یہ الگ جملہ نہ ہو تو حضرت حفصہؓ کی بات ٹھیک ہو جاتی ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا کو ایک الگ قول قرار دیا ہے اور یہ مراد لی ہے کہ ہم دوزخیوں کو دوزخ میں ڈالیں گے اور مومن کو دوزخ میں ڈالے بغیر جنت میں لے جائیں گے۔

زجاج کہتے ہیں کہ ایک دوسری آیت بھی اس مضمون کی تائید کرتی ہے کہ مومن دوزخ میں ڈالے بغیر جنت میں داخل کئے جائیں گے اور وہ آیت یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (الانبیاء:۱۰۲)

یعنی وہ لوگ جن کے متعلق ہماری طرف سے یہ فیصلہ کیا جا چکا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا وہ دوزخ کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو نہ صرف یہ کہ دوزخ میں نہیں ڈالا جائے گا بلکہ دوزخ کے قریب بھی نہیں جائے گا۔ پس زجاج کہتے ہیں کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے یہی مراد ہے کہ کفار دوزخ میں جائیں گے اور ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ایک الگ قول ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم مومنوں کو دوزخ میں ڈالے بغیر جنت میں لے جائیں گے زجاج کے علاوہ مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کی جو تشریح فرمائی ہے اس کی تصدیق بھی حدیثوں سے ہوتی ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ بخار کے متعلق بتایا کہ یہ کیا چیز ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هِيَ نَارِيْ اُسَلِّطُهَا عَلٰى عَبْدِيَ الْمُؤْمِنِ لِتَكُوْنَ حَظَّهٗ مِنَ النَّارِ یہ میری آگ ہے جو میں اپنے مومن بندہ پر اس لئے مسلّط کرتا ہوں کہ اگلے جہان کی دوزخ کا حصہ اس کو یہیں مل جائے۔ یہی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ مومن کو اس دنیا میں جو تکلیفیں پہنچتی ہیں وہ درحقیقت اگلے جہان کی دوزخ کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلْحُمّٰى حَظُّ الْمُؤْمِنِ مِنَ النَّارِ بخار دوزخ میں سے مومن کا حصہ ہے یعنی مومن اگلے جہان کی دوزخ میں تو نہیں ڈالا جاتا لیکن جب یہاں اسے بخار چڑھ جاتا ہے یا اور بیماریاں آجاتی ہیں تو اسے بھی اس آگ سے ایک حصہ مل جاتا ہے۔ گویا کافر اگلے جہان میں مرنے کے بعد آگ کے عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اور مومن اسی دنیا میں مختلف تکالیف سے حصہ لے کر جو درحقیقت دوزخ کا ہی ایک حصہ ہے اگلے جہان میں جنت میں چلا جائے گا۔ یہ دونوں حدیثیں قرطبی نے تہذیب التہذیب اور طبری کے حوالہ سے بیان کی ہیں۔ اور یہ جو میں نے معنے کئے ہیں کہ یہاں اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے کافر مراد ہیں اور جو درحقیقت حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کیا کرتے تھے (حقائق الفرقان جلد ۳ زیر آیت ھذا) حدیثوں سے بھی یہ معنے ثابت ہیں اور حضرت ابن عباسؓ بھی اسی کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ هٰذَا خِطَابٌ لِلْكُفَّارِ (قرطبی) اس سے مومن مراد نہیں بلکہ کافر مراد ہیں اور وہ اس آیت کی تشریح اِنْ مِّنْكُمْ کی جگہ اِنْ مِّنْهُمْ پڑھ کر کیا کرتے تھے (قرطبی) یعنی وہ کافر جن کا پہلے ذکر ہے ان میں سے ہر شخص دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ عکرمہ اور ایک اور تابعین کی جماعت بھی اس قرأت کو جائز قرار دیتی تھی کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کی جگہ اِنْ مِّنْهُمْ اِلَّا وَارِدُهَا پڑھا جائے قرطبی کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے کہ مِنْكُمْ ہو مگر ضمیر غائب مراد ہو جیسے قرآن کریم میں دوسری جگہ آتا ہے کہ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا (الدھر: ۲۲۔۲۳) یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ

شَرَابًا طَهُوْرًا اور پلائے گا ان کو ان کا رب ایک پاک کرنے والا شربت مگر آگے فرماتا ہے اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا یہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزاء ہے اور تمہاری کوششوں کی قدر کی گئی ہے اس جگہ پہلے سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ کہہ کر غیب کی ضمیر استعمال کی گئی ہے اور پھر ساتھ ہی کہا گیا ہے کہ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً یہ تمہارے لئے جزاء ہے كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا اور تمہاری سعی کی قدر کی گئی ہے اس مثال کو پیش کر کے علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا میں بھی غائب کی ضمیر کی طرف مِنْكُمْ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے اور مراد کافر ہی ہیں مومن نہیں۔

غرض دونوں معنے جو میں نے اوپر کئے ہیں وہ حدیثوں سے بھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے اقوال سے بھی ثابت ہیں۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور جب انہیں ہماری کھلی کھلی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں (بتاؤ تو) ہم دونوں فریق

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿۷۴﴾

میں سے کون سا فریق درجہ کے لحاظ سے اور ہم جلیسوں کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔

حل لغات۔ النَّدِيُّ کے معنے ہیں النَّادِيْ۔ مجلس۔ (اقرب)

تفسیر۔ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ کا لوگ عموماً غلط ترجمہ کرتے ہیں۔ شاہ رفیع الدین صاحب نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ کہ "جب پڑھی جاتی ہیں اوپر ان کے نشانیاں ہماری ظاہر"۔ حالانکہ یہ نہ اردو ہے اور نہ اس کے کوئی معنے ہیں تَلَا عَلَيْهِ کے معنے ہوتے ہیں "اس کو پڑھ کر سنایا" جب انسان ایسی طرز پر پڑھے کہ اس کی غرض یہ ہو کہ دوسرا بھی سن سکے تو اس کے لئے عربی زبان میں تلا علیہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ پس وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جب ہماری آیات ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جو بَيِّنَات بھی ہوتی ہیں۔

عربی زبان اور قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ جو الفاظ وہ کسی مضمون کی طرف اشارہ کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے ان میں نہ صرف اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ اس مضمون کی وضاحت بھی انہیں الفاظ میں موجود ہوتی ہے۔ مثلاً اردو میں عام طور پر نشانات الٰہیہ کے متعلق معجزہ یا نشان وغیرہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں حالانکہ ان میں سے کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو معجزات کی غرض و غایت اور ان کے حقیقی مقصد کو واضح کرنے والا ہو معجزہ بھی یوں تو عربی

زبان کا ہی لفظ ہے مگر قرآن کریم نے اس لفظ کو کہیں استعمال نہیں کیا۔اسی طرح حدیث میں بھی یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ یہ لفظ لوگوں نے خود وضع کیا ہے مگر یہ بھی اس مفہوم کو ادا نہیں کرتا جس کے لئے اسے تجویز کیا گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے آیت کا لفظ استعمال کیا ہے آیت کے معنے علامت اور نشان کے ہوتے ہیں۔اسی سے نشان کا لفظ بنایا گیا ہے مگر نشان کا لفظ بھی وہ مضمون ادا نہیں کرتا جو آیت کا لفظ ادا کرتا ہے آیت کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے۔کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی طرف اشارہ کرتی اور اس کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نشان ظاہر کئے جاتے ہیں وہ بغیر کسی مقصد کے نہیں ہوتے کوئی نہ کوئی مقصد اور کوئی نہ کوئی غرض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے معجزہ کا لفظ صرف ایک طاقت کا اظہار کرتا ہے جیسے کسی کو ڈنڈا مارا جائے اور وہ بھاگ جائے تو اس ڈنڈا مارنے والے کی طاقت کا اندازہ ہوجاتا ہے لیکن آیت یہ بتاتی ہے کہ کسی خاص مقصد کو سامنے رکھا گیا ہے اور اس مقصد کو واضح کرنے اور لوگوں کو سمجھانے کے لئے اسے ایک دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دنیا میں جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مذہب لوگوں کے سامنے بعض ایسی چیزیں بھی پیش کرتا ہے جو نظر نہیں آتیں۔اور چونکہ وہ پوشیدہ ہوتی ہیں ان کے ثبوت کے لئے بعض دوسری دلیلیں پیش کرنی پڑتی ہیں۔ان میں سے بعض دلیلیں تو خالص عقلی ہوتی ہیں اور بعض دلیلیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طاقت اور اس کی قدرت اور اس کے علم غیب کا بھی ثبوت رکھتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا سمجھنا لوگوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے۔مثلاً انبیاء کی نبوت کا مسئلہ ہے۔آج تک دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا کہ آسمان سے فرشتہ آیا ہو اور اس نے کسی نبی سے باتیں کی ہوں۔پس چونکہ یہ ایک مخفی چیز ہے اس لئے اس کی تصدیق آیات سے کی جاتی ہے جو اس بات کی علامت ہوتی ہیں کہ یہ نبی جو کچھ کہہ رہا ہے اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہہ رہا ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کا وجود آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔پس اس کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے بعض دلائل دیئے جاتے ہیں جن سے وہ وجود ہماری آنکھوں کے قریب آجاتا ہے اور عقل قبول کر لیتی ہے کہ خدا تعالیٰ موجود ہے اور اس کے اندر یہ یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ایسی دلیلیں قرآن کریم کی رو سے آیات کہلاتی ہیں۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ کے علم غیب یا اس کی قدرت یا اس کے حی و قیوم ہونے کے ثبوت کے طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک نبی غیب کی خبر دیتا ہے اور ساتھ ہی کہتا ہے کہ خدا نے مجھے یہ خبر بتائی ہے۔اب ہر شخص جانتا ہے کہ انسان میں غیب معلوم کرنے کی طاقت نہیں۔اگر ہوتو یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ وہ اس طاقت کو اپنی طرف منسوب نہ کرے۔ہم تو

دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنی شہرت کے لئے دوسروں کی خوبیاں بھی اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔کتاب پڑھیں گے اور اس کے مضامین اپنے نام پر شائع کرنے شروع کر دیں گے مصنف کہیں بیٹھا ہوا ہوتا ہے اور اس کی محنت اپنی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی اچھا کام ہو لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے اپنی طرف منسوب کر لیں۔

ہمارے سکول کی ٹیم ایک دفعہ امرتسر کھیلنے کے لئے گئی۔میں اس وقت اگرچہ تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا لیکن میرا مدرسہ سے ابھی تعلق قائم تھا کیونکہ میں نیا نیا نکلا تھا اس لئے میں بھی ساتھ چلا گیا۔وہاں خالصہ کالج والوں سے میچ مقرر تھا۔وہ دوست جنہوں نے کھیل میں حصہ لینا تھا وہ تو وہیں رہے اور میں لاہور چلا آیا۔جب واپس گیا تو بعض دوست جو مجھ سے زیادہ تعلق رکھنے والے تھے وہ میرے استقبال کے لئے سٹیشن پر آ گئے۔ان میں سے ایک نے بتایا کہ ہمارا میچ بڑا شاندار رہا۔لوگوں نے خوب داد دی اور ہم نے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

اس خبر سے مجھے طبعاً خوشی ہوئی اور میں نے کہا الحمدللہ۔پھر وہ کہنے لگا یوں تو سب کی ہی تعریف ہوئی مگر ہمارے کیپٹن کی لوگوں نے اس قدر تعریف کی کہ جس کی کوئی حد ہی نہیں۔مجھے اس سے اور زیادہ خوشی ہوئی کیپٹن میاں بشیر احمد صاحب کے سالے تھے اور وہ واقعہ میں بہت اچھے کھلاڑی تھے۔مگر اس کے بعد کہنے لگا ایک عجیب بات آپ کو یہ بتاؤں کہ ٹیم کا کیپٹن سب لوگ مجھے سمجھتے تھے۔گویا جس قدر کیپٹن کی تعریف ہوئی وہ سب اس نے اپنی طرف منسوب کر لی۔تو دنیا میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی کی اچھی چیز لوگوں کو نظر آئے تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے اپنی طرف منسوب کر لیں لوگ شاعروں کے شعر چرا کر اپنے نام سے شائع کروا دیتے ہیں مگر ایسا کون بے وقوف ہوگا جو اعلیٰ درجہ کا شاعر ہو بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں سے خراجِ تحسین حاصل کرنے والا ہو اور پھر وہ اپنے شعر کے متعلق کہے کہ یہ میرا نہیں بلکہ فلاں شاعر کا ہے۔ہاں ادنیٰ درجہ کے لوگ ایسا کر لیتے ہیں کہ خود شعر بنایا اور لوگوں کی تعریف حاصل کرنے کے لئے کہہ دیا کہ یہ انوری کا ہے یا خاقانی کا ہے یا سعدی کیا ہے یا حافظ کا ہے۔

غرض یہ تو ہو جاتا ہے کہ دوسروں سے تعریف کروانے کے لئے بعض دفعہ اپنی چیز لوگ مشہور آدمیوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں مثلاً حدیث خود بنائی اور کہہ دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے لیکن یہ مثال کہیں نظر نہیں آئے گی کہ کوئی قادر الکلام انسان اپنا کلام دوسرے کی طرف منسوب کر دے۔خود اعلیٰ درجہ کا شعر کہے اور منسوب اسے کسی اور کی طرف کر دے کیونکہ کوئی شخص ایسی بات دوسرے کی طرف منسوب کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا جس سے اس کی اپنی شہرت میں اضافہ ہوتا ہو۔

اب اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کرو کہ ایک نبی جب دنیا میں آتا ہے اور غیب کی خبریں لوگوں کو بتاتا ہے تو وہ یہ نہیں کہتا کہ میں ایسا کہتا ہوں۔ بلکہ کہتا ہے کہ خدا نے مجھے یہ بات کہی ہے۔ اگر اسے ذاتی طور پر غیب کا علم حاصل ہو تو غیب کی خبریں اسے خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اسی لئے ان خبروں کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے کہ اسے کامل یقین ہوتا ہے کہ خدا نے ہی اسے یہ خبریں بتائی ہیں ورنہ وہ اپنی خوبی کسی اور کی طرف کیوں منسوب کرے پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ غیب کی خبریں پوری بھی ہو جاتی ہیں اور اس طرح جہاں اس کی اپنی نبوت کی سچائی دنیا پر ظاہر ہو جاتی ہے اور پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے وہاں یہ بھی پتہ لگ جاتا ہے کہ ایک ایسی ہستی موجود ہے جو علم غیب جانتی ہے۔

اسی طرح خدا تعالیٰ کا حی و قیوم ہونا ہے۔ ایک بیمار مرنے لگتا ہے۔ اس کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں کہ خدا تعالیٰ کا ایک بندہ اسے ہاتھ لگاتا ہے اور اس میں زندگی کے آثار از سر نو ظاہر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کا سانس درست ہو جاتا ہے۔ اس کے حواس قائم ہو جاتے ہیں اور اس کی کھوئی ہوئی طاقت پھر واپس آ جاتی ہے۔ دیکھنے والا دیکھتا ہے اور اس بات پر ایمان لاتا ہے کہ ہمارا خدا حی و قیوم ہے۔ کیونکہ اس شخص میں طاقت نہیں تھی کہ اسے اچھا کرتا لیکن اس کی دعا اور توجہ سے ایک مردہ جسم میں بھی جان پڑ گئی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا خدا حی و قیوم ہے یا مثلاً ایک شخص کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی سالہا سال گذر گئے اور اس کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ خدا تعالیٰ کے ایک نبی یا اس کے کسی برگزیدہ بندہ نے اس کے لئے دعا کی اور اس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ یہ نشان اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ہمارا خدا خالق ہے پس آیات ان نشانات کو کہتے ہیں جو کسی اعلیٰ شئے کے ثبوت کے لئے ظاہر ہوتے ہیں مثلاً خدا تعالیٰ کی ہستی کے ثبوت کے لئے یا نبوت انبیاء وغیرہ کے سمجھانے کے لئے گویا کوئی اہم مقصد ان کے سامنے ہوتا ہے۔ بے موقع اور لغو طور پر وہ ظاہر نہیں ہوتے۔ جیسے لوگوں میں مشہور ہے کہ مکہ میں گدھوں والے جب مکہ سے باہر جاتے ہیں تو گدھوں پر پتھر لاد کر لے آتے ہیں مگر جب مکہ میں پہنچتے ہیں تو وہ پتھر تربوز بن جاتے ہیں اب پتھروں اور تربوز کا آپس میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا اور نہ اس نشان کی کوئی ضرورت نظر آتی ہے لیکن اس نشان میں ہمیں ضرور جوڑ نظر آتا ہے کہ خدا نے کہا کہ خانہ کعبہ محفوظ رہے گا۔ ابرہہ آیا اور وہ اپنی ساری طاقت اور قوت کے باوجود شکست کھا گیا یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں جبکہ کوئی بھی آپ کے ساتھ نہیں تھا خبر دی کہ میں جیت جاؤں گا اور پھر مکہ والوں کی سر توڑ مخالفت کے باوجود آپ جیت گئے اور آپ کے دشمن ناکام و نامراد رہے یہ آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ خدا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں اور ایک طاقتور ہستی ان کی

مدد کر رہی ہے۔

پھر آیتیں دنیا میں ایسی بھی ہوتی ہیں جو نشان تو ہوتی ہیں لیکن وہ اپنی غرض و غایت بیان نہیں کرتیں لیکن فرماتا ہے یہ وہ آیات ہیں جو بیّنات ہیں یعنی نہ صرف کسی مقصد کو اپنے سامنے رکھتی ہیں بلکہ اس مقصد کو کھول کر بیان بھی کرتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں کہ وہ نشان اپنی ذات میں کیوں ظاہر ہوگا گویا وہ کوئی بے معنی کام نہیں ہوتا۔ بلکہ جو بھی نشان آتا ہے وہ نہ صرف خدا اور اس کے انبیاء وغیرہ کے لئے ثبوت ہوتا ہے بلکہ خود اپنی ذات میں بھی موقع کے مناسب اور برمحل ہوتا ہے۔ پس آیت بیّنہ وہ ہے جو

(۱) کسی اعلیٰ شئے کو دکھانے اور قریب کرنے کے لئے ظاہر ہو۔ اور۔

(۲) وہ بے معنی نہ ہو بلکہ موقع کی مناسبت ہو اور کسی مفید مقصد کے لئے ظاہر ہو۔

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک دفعہ لدھیانہ تشریف لے گئے۔ حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ کے خسر صوفی احمد جان صاحب جو ایک مشہور پیر اور بزرگ انسان تھے اور جنہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب ''براہین احمدیہ'' بھی پڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے جب آپ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو بڑے خوش ہوئے اور اپنے ایک مرید سے جو کابل کے شہزادوں میں سے تھے آپ کی دعوت کروائی۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور جب کھانے سے فارغ ہوئے تو صوفی صاحب آپ کو مکان تک پہنچانے کے لئے آپ کے ساتھ ہی چل پڑے۔ صوفی احمد جان صاحب رتڑ چھتڑ والوں کے مرید تھے (رتّڑ چھتّڑ گورداسپور کے علاقہ میں ہے) حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے راستہ میں دریافت فرمایا کہ صوفی صاحب سنا ہے رتّڑ چھتّڑ والوں کی آپ نے بارہ سال تک خدمت کی ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ نے ان کی صحبت سے کیا فیض حاصل کیا؟ انہوں نے کہا حضور! وہ بڑے بزرگ اور باخدا انسان تھے۔ میں بارہ سال ان کی صحبت میں رہا اور بڑا فائدہ حاصل کیا۔ پھر انہوں نے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو ان کے پیچھے آرہا تھا اور کہا حضور! ان کی برکت سے اب مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہو چکی ہے کہ اگر میں اس شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھوں تو فوراً زمین پر گر پڑے اور تڑپنے لگ جائے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ سنتے ہی کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر اس سوٹی کو جو آپ کے ہاتھ میں تھی زمین پر رگڑتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ میاں صاحب پھر اس کا آپ کو کیا فائدہ پہنچا اور اگر ایسا ہو جائے تو اس شخص کو کیا فائدہ پہنچے گا (تاریخ احمدیت جلد دوم صفحہ ۴۹ تا ۵۳) وہ چونکہ اہل اللہ میں سے تھے اس لئے آپ نے ابھی اتنا ہی فقرہ کہا تھا کہ وہ فوراً سمجھ گئے اور کہنے لگے حضور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میں ایسا نہیں

کروں گا میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ ایک بے فائدہ چیز ہے۔اس کا دین اور روحانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اب بظاہر یہ ایک آیت تو تھی کیونکہ طاقت ظاہر ہوئی اور ایک چلتے ہوئے آدمی کو گرالیا مگر اس کا نیکی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کسی کو مکا مار کر گرالیا جائے۔ کیونکہ جس طرح مکا مارنے سے دوسرا گر جاتا ہے اسی طرح ایک مسمریزم کی مشق رکھنے والا آدمی دوسرے پر نظر ڈال کر اسے گرا سکتا ہے۔پس اس سے اتنا تو ثابت ہوجاتا ہے کہ جس نے نظر ڈالی ہے اس میں بڑی طاقت ہے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس نے نظر سے دوسرے کو گرالیا ہے اس کا خدا تعالیٰ سے تعلق ہے پس یہ ایک آیت تو تھی مگر بیّنہ نہیں تھی۔بیّنہ وہ آیت ہوتی ہے جو اپنی غرض بھی بیان کرتی ہے۔اور بتاتی ہے کہ اس نشان کا مقصد کیا ہے۔

زیر تفسیر آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہی بیان فرمایا ہے کہ الٰہی معجزات خالی آیت نہیں ہوتے۔ بلکہ ساتھ ہی وہ بیّنات بھی ہوتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کی غرض کیا ہے۔ان سے کونسا فائدہ مدنظر ہے اور دنیا کو کیا نفع پہنچانا مقصود ہے مثلاً حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر اعلان فرمایا کہ پنجاب میں طاعون آئے گی (ایام الصلح روحانی خزائن جلد ۱۴ صفحہ ۳۶۱)۔اب یہ ایک آیت تو تھی مگر ساتھ ہی بیّنہ بھی تھی۔ کیونکہ آپ نے تشریح کردی کہ چونکہ ان لوگوں نے الٰہی تعلیم کو چھوڑ کر دوزخ کی طرف اپنا قدم بڑھالیا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ ان پر دنیا میں ہی اپنا عذاب نازل کرے گا تاکہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوسکیں۔اگر اس کی بجائے آپ صرف یہ کہہ دیتے کہ طاعون آئے گی جس سے دشمن کے آدمی بھی مرجائیں گے اور کچھ میرے آدمی بھی مریں گے تو یہ ایک آیت تو ہوتی مگر بیّنہ نہ ہوتی۔

غرض ان دو الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے اسلامی معجزات کی حقیقت بیان کردی ہے اور بتایا ہے کہ الٰہی آیات کسی اہم مقصد کے لئے ظاہر ہوتی ہیں اس مقصد کو خوب کھول کر بیان کرتی ہیں اور پھر وہ آیات موقع کے مناسب اور برمحل ہوتی ہیں۔

اب بتاتا ہے کہ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا جب ہماری آیات ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں کہ ’’نو نقد نہ تیرہ ادھار‘‘ تم خبریں دے رہے ہو ’’تیرہ ادھار‘‘ کی اور ہم خبریں دے رہے ہیں ’’نو نقد‘‘ کی تم کہتے ہو کہ اگر ہمارے پیچھے چلو گے تو تمہیں جنت ملے گی۔ تمہیں بڑے بڑے انعامات ملیں گے۔اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی اور ہم کہتے ہیں کہ جوتیاں تمہاری ٹوٹی ہوئی ہیں۔ کپڑے تمہارے پھٹے ہوئے ہیں کھانے کو تمہارے پاس کچھ نہیں اور ہم

میں سے ہرایک کے پاس دس دس نوکر اور غلام ہیں۔گھروں میں دولت بھری ہوئی ہے۔عزت ہماری زیادہ ہے۔ اختیارات ہمارے زیادہ ہیں۔تعداد ہماری زیادہ ہے۔تم ان باتوں میں ہمارا مقابلہ کر کے دیکھو۔آئندہ کے متعلق تم کیا وعدے کرتے ہو۔یہ دلیل یقیناً ایسی ہے کہ اگر اس کا کوئی توڑ نہ ہوتو دوسرے کو ساکت اور لاجواب کرنے کے لئے بالکل کافی۔وہ کہتے ہیں تم اور باتوں کو جانے دو۔تم یہ بتاؤ کہ تمہارا گھر اچھا ہے یا ہمارا؟ تمہارے پاس سامان زیادہ اچھا ہے یا ہمارے پاس؟ معزز لوگ ہماری مجلسوں میں آتے ہیں یا تمہاری مجلسوں میں؟ مدد حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں یا تمہارے پاس۔اگر مال ہمارے پاس زیادہ ہے، دولت ہمارے پاس زیادہ ہے اختیارات ہمارے پاس زیادہ ہیں، تعداد میں ہم زیادہ ہیں، معزز لوگ ہمارے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، مدد حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمارے پاس آتے ہیں، بڑے بڑے عہدے ہمارے پاس زیادہ ہیں، ہر قسم کا ساز وسامان ہمارے پاس موجود ہے۔تو ہم اچھے ہوئے یا تم اچھے ہوئے۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا

اور ہم نے ان سے پہلے بہت سے زمانوں کے لوگوں کو ہلاک کیا ہے جو سامانوں کے لحاظ سے اور ظاہری

وَّ رِءْيًا ﴿۷۵﴾

شان وشوکت کے لحاظ (ان لوگوں سے) اچھے تھے۔

حلّ لُغات۔ اَلْاَثَاثُ اَلْاَثَاثُ کے معنے ہیں مَتَاعُ الْبَيْتِ گھر کا سامان۔وَقِيْلَ هُوَ مَا يُتَّخَذُ لِلْاِسْتِعْمَالِ وَ الْمَتَاعُ لِلتِّجَارَةِ اور بعض اہل زبان یہ کہتے ہیں کہ اَثَاثٌ اس سامان کو کہتے ہیں جو استعمال میں آتا ہے وَقِيْلَ الْمَالُ كُلُّهُ اور بعض اہل زبان کہتے ہیں کہ سارے گھر کے سامان کو خواہ وہ کیسا ہوا ثاث کہتے ہیں۔ (اقرب)

الرِّئْيُ اَلرِّئْيُ کے معنے ہیں اَلْمَنْظَرُ۔منظر۔(اقرب)

تفسیر۔ فرماتا ہے اگر تو دولت موجودہ کا تمہارے پاس ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آئندہ یہ حالات بدلیں گے نہیں تو پھر تو یہ دلیل ٹھیک ہے اور ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ چیزیں تمہارے پاس ہیں، ہمارے پاس نہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ کبھی تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ ہم تم سے پہلے کتنے قرن

ہلاک کر چکے ہیں۔

قرن کے معنے ایک صدی کے بھی ہوتے ہیں اور صدی کے قریب زمانہ یعنی اسی نوے سال کو بھی قرن کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک زمانہ یا ایک نسل کے لوگوں کو بھی قرن کہتے ہیں زمانہ کے دور کو بھی قرن کہتے ہیں اور ہر ایسی قوم جو تمام کی تمام ہلاک ہوگئی اور اس میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا اسے بھی قرن کہتے ہیں۔ (اقرب)

رِءْيًا کے معنے منظر یا اچھے منظر کے ہوتے ہیں۔

فرماتا ہے اگر وہ غور کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ کتنے ہی قرن ایسے گذرے ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ یعنی دنیا میں اب تک کتنی ہی قومیں ایسی گذر چکی ہیں جو تمام کی تمام ہلاک ہوگئیں اور ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ حالانکہ ان کے پاس ان سے زیادہ اچھے سامان تھے اور ان کی مجلسوں میں ان سے زیادہ قیمتی سامان ہوا کرتے تھے۔ گویا ان کی طاقت ان سے زیادہ تھی ان کی شوکت ان سے زیادہ تھی۔ ان کا دبدبہ اور رعب ان سے زیادہ تھا مگر پھر بھی وہ ہلاک ہوگئیں۔ جب ان سے زیادہ سامان اور زیادہ طاقت اور زیادہ شوکت رکھنے والی قومیں ہلاک ہو چکی ہیں تو کم سے کم یہ لوگ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم ہلاک نہیں ہو سکتے۔ یہ الگ سوال ہے کہ انہوں نے ہلاک ہونا ہے یا نہیں ہونا مگر بہرحال ہلاک نہ ہو سکنے والی بات غلط ہوگئی۔ کیونکہ ان سے زیادہ طاقتور اور شاندار قومیں اس سے پہلے ہلاک ہو چکی ہیں۔

اس جگہ چونکہ عیسائیوں کا ذکر ہے اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیسائیوں سے زیادہ سامان رکھنے والے اور عیسائیوں سے زیادہ شان وشوکت کے مالک اور کون لوگ ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ جو سامان ان کے پاس ہیں اور جو طاقتیں اور قوتیں ان کو حاصل ہیں۔ نہ یہ سامان پہلی حکومتوں کے پاس تھے اور نہ ایسی طاقتیں اور قوتیں ان کو حاصل تھیں پھر وہ کون لوگ ہیں جنہیں زیادہ ساز وسامان والا اور زیادہ شان وشوکت رکھنے والا قرار دیا گیا ہے؟

سو یاد رکھنا چاہیے کہ طاقت اور قوت بھی ایک نسبتی امر ہے۔ مثلاً ایک شخص ایسا ہے جس کے پاس ہزار روپیہ ہے اور اس کے مخالف کے پاس دوسو روپیہ ہے۔ اور ایک اور شخص ایسا ہے جس کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے اور اس کے مخالف کے پاس ننانوے لاکھ ننانوے ہزار روپیہ ہے اب گو اس کے پاس ہزار روپے والے سے بہت زیادہ روپیہ ہے مگر نسبتی طور پر یہ اس سے طاقت میں کمزور ہے۔ کیونکہ جس دشمن سے ہزار روپے والے کا مقابلہ ہے اس سے وہ پانچ گنا طاقتور ہے اور جس دشمن سے اس کا مقابلہ ہے اس سے صرف ایک ہزار روپیہ اس کے پاس زیادہ ہے۔ پس گو اس کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے سو دوسرے کے پاس ایک ہزار مگر دشمن کی طاقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نسبتی لحاظ سے

جس کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے وہ زیادہ طاقتور ہے اور جس کے پاس ایک کروڑ روپیہ ہے وہ کم طاقتور ہے۔ پس طاقتوں کا مقابلہ ہمیشہ نسبتی طور پر ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں دیکھا جاتا کہ کسی کے پاس روپیہ کی کتنی مقدار ہے۔ بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اس کے دشمن کے پاس کتنا روپیہ ہے اور پھر نسبت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس نقطہ نگاہ سے جب ہم تاریخ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں فرعون کو طاقت حاصل تھی اس زمانہ میں دنیا میں اور کوئی بادشاہ ایسا نہیں تھا جو فرعون کے مقابلہ میں کھڑا ہو سکتا جس زمانہ میں سکندر کو طاقت حاصل تھی اس زمانہ میں ساری دنیا میں کسی کو سکندر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں تھی جس زمانہ میں چنگیز خاں کو طاقت حاصل تھی اس زمانہ میں ساری دنیا میں اور کوئی طاقت ایسی نہیں تھی جو چنگیز خاں کا مقابلہ کر سکتی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں تک نقدی اور سامانوں کا سوال ہے یا جہاں تک فوج کی تنظیم کا سوال ہے آج امریکہ یقیناً چنگیز اور سکندر اور نپولین سے ہزاروں گنا زیادہ طاقتور ہے مگر اس کے مقابلہ میں امریکہ کے دشمن کو جو طاقت حاصل ہے وہ بھی سکندر اور چنگیز اور نپولین کے دشمنوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ سکندر یونان سے اٹھا اور چار ہزار میل کا سفر کر کے ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور کوئی حکومت اس کا مقابلہ نہ کر سکی مگر یہیں امریکہ والے کوریا میں ہی گئے تو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ آج چین اور روس کی طاقت بھی امریکہ کے برابر برابر ہو چکی ہے۔ پس امریکہ آج سارے ساز و سامان کے باوجود نسبتی طور پر سکندر سے کمزور ہے۔ نسبتی طور پر وہ چنگیز سے بھی کمزور ہے۔ کیونکہ چنگیز اور سکندر کا مدمقابل امریکہ کے مدمقابل سے بہت زیادہ کمزور تھا۔ اسی طرح میدا اور فارس کے بادشاہوں کو لے لو۔ بخت نصر کو لے لو۔ ہزاروں میل تک ان کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا جس طرف بھی یہ اپنی فوجوں کو بڑھا دیتے تھے لوگ ان کے مقابلہ میں ہتھیار ڈالتے چلے جاتے تھے مگر اب امریکہ ذرا قدم بڑھاتا ہے تو چین سامنے کھڑا ہو جاتا ہے کچھ اور قدم بڑھاتا ہے تو روس نکل آتا ہے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں ایسا توازن قائم رہتا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے یہ برابر کی ٹکر ہیں یا اگر کچھ فرق بھی ہے تو دو اور پونے دو کا۔ لیکن پہلے زمانہ میں دو اور پونے دو کا فرق نہیں تھا۔ بلکہ دو اور 1/10 کا تھا۔ پس بے شک ظاہری شان و شوکت ان میں زیادہ پائی جاتی ہے مگر نسبتی لحاظ سے یہ پہلوں کے مقابلہ میں کمزور ہیں سکندر ساری دنیا میں نکل جاتا تو کوئی اس کے مقابلہ میں نہیں اٹھتا تھا اور اگر کوئی مقابلہ کے لئے کھڑا ہوتا تو شکست کھاتا، مگر امریکہ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے پس فرماتا ہے جب تم سے زیادہ شان و شوکت رکھنے والی حکومتیں ہم نے تباہ کر دیں ہیں جب تم زیادہ ساز و سامان رکھنے والی قومیں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں تو تم کس طرح یہ خیال کر سکتے ہو کہ تم تباہ نہیں ہو گے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى

تو کہہ دے کہ جو شخص گمراہی میں (پڑا) ہو (خدائے) رحمن اُسے ایک عرصہ تک ڈھیل دیتا جاتا ہے یہاں تک کہ

اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ

جب ایسے لوگوں کے سامنے وہ عذاب آجائے گا جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا (یعنی) یا دنیوی عذاب یا (قومی)

فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ۝۷۶

کامل تباہی۔ اس وقت وہ جان لیں گے کہ کون شخص مکان کے لحاظ سے بدتر ہے اور دوستوں کے لحاظ سے کمزور ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے دنیا میں قائم رہنے کا ذریعہ یہ ہوتا ہے کہ انسان سیدھے راستہ پر چل رہا ہو اگر وہ سیدھے راستے پر نہیں چلتا۔تو ہر عقلمند سمجھ لیتا ہے کہ یہ آج گرا یا کل کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص غلط راستے پر چل رہا ہو۔تباہی اور ہلاکت کی طرف جا رہا ہو اور پھر تباہی اور ہلاکت کے گڑھے میں نہ گرے۔اگر کوئی شخص غلط راستے پر چل رہا ہے اور پھر بھی یہ امید رکھتا ہے کہ وہ کامیاب ہو گا تو اس کی ایسی ہی مثال ہو گی جیسے کہتے ہیں کہ شیخ چلی ایک درخت پر چڑھ کر اسی شاخ کو کاٹنے لگ گیا جس پر وہ بیٹھا تھا۔کوئی شخص نیچے سے گذرا تو اس نے کہا میاں یہ کیا کر رہے ہو کہ جس شاخ پر تم بیٹھے ہو اسی شاخ کو تم کاٹ رہے ہو تم تو نیچے گر پڑو گے۔اس نے کہا جاؤ جاؤ بڑا نبی بن کر آیا ہے۔تمہیں کیا پتہ کہ میں نیچے گروں گا یا نہیں۔وہ کہنے لگا صاف نظر آ رہا ہے کہ جب تم اسی شاخ کو کاٹ رہے ہو جس پر بیٹھے ہو تو جب شاخ کٹی تو تم بھی نیچے آ گرو گے۔کہنے لگا جاو اور اپنا کام کرو ہم نے بہت لوگ ایسے دیکھے ہوئے ہیں جو اس قسم کے دعوے کیا کرتے ہیں۔چنانچہ وہ چلا گیا۔اب یہ سیدھی بات تھی کہ اس نے بہر حال نیچے گرنا تھا چنانچہ جب شاخ کٹ گئی تو وہ نیچے آ پڑا۔اب وہ اس شخص کی طرف بھاگا جس نے کہا تھا کہ ایسا مت کرو ورنہ گر جاؤ گے اور اسے کہنے لگا کہ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے تمہاری بات نہ مانی۔اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم خدا تعالیٰ کے نبی ہو اس نے کہا میں بالکل نبی نہیں۔میں نے تو اپنی عقل سے ایک قیاس کیا تھا کہ جب تم اسی شاخ کو کاٹ رہے ہو جس پر بیٹھے ہو تو ضرور گرو گے۔کہنے لگا نہیں تم ضرور نبی ہو۔اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں کب مروں گا۔اس نے کہا مجھے کیا پتہ کہ تم کب مرو گے مگر وہ پیچھے پڑ گیا کہ مجھے ضرور بتاؤ۔آخر اس نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہہ دیا کہ جس دن تمہارے منہ سے خون آیا اس دن تم مر جاؤ گے۔وہ یہ سن کر واپس آ گیا۔وہ جلاہا تھا۔ایک دن تانی تن رہا

تھا کہ سرخ تاگا اس کے دانتوں میں پھنس گیا۔ جس کا رنگ دانتوں پر لگ گیا اور اس نے یہ سمجھا کہ میرے منہ سے خون آ گیا ہے چنانچہ وہ اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ میں اب مرنے لگا ہوں میرے کفن دفن کی تیاری کرو۔ ایسی ہی جہالت ان لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ جب واقعات نظر آتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ یہ لوگ غلط راستے پر جارہے ہیں۔ تو یہ کہنا کہ اس غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ کس طرح نکلے گا۔ اور ہم ہلاک اور برباد کس طرح ہو سکتے ہیں۔ بالکل شیخ چلی والی بات ہے۔ ایک طرف روس کی طاقت دیکھی جائے اور دوسری طرف امریکہ کی طاقت دیکھی جائے تو صاف پتہ لگتا ہے کہ۔ یہ دونوں مقابل کی طاقتیں ہیں۔ اور جب ان میں ٹکر ہوئی تو یہ دونوں تباہ ہو کر رہیں گی۔ جس طرح گذشتہ جنگ میں جرمنی تباہ ہوا۔ اٹلی برباد ہوا فرانس ختم ہوا اسی طرح اب جنگ ہوئی تو روس اور امریکہ ختم ہو جائیں گے اسی مضمون کی طرف اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ جس کی گمراہی ثابت ہو چکی ہو اس کے انجام کے متعلق کوئی دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ تم یہ دیکھو کہ تم میں ضلالت پائی جاتی ہے یا نہیں اور اگر تم میں ضلالت پائی جاتی ہے تو پھر ہم ٹھیک کہتے ہیں کہ خواہ تمہاری کتنی بھی طاقت ہو تم ایک دن ختم ہو جاؤ گے۔ کیونکہ تم غلط راستہ پر جارہے ہو۔

فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا یہ امر کا صیغہ ہے یعنی چاہیے کہ رحمٰن اس کو اور مہلت دے مگر مراد یہ ہے کہ رحمٰن اس کو اور مہلت دے گا۔ یعنی امر اس جگہ خبر کے معنوں میں زور دینے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ ایسا ضرور ہوگا۔ عربی زبان کا طریق ہے کہ اس میں بعض دفعہ امر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے اور مراد زور دینا ہوتا ہے۔ اس جگہ بھی امر کا صیغہ استعمال کرنے میں یہی حکمت مدنظر ہے یعنی بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ضرور مہلت دے گا۔ اور پھر اسے سزا دے گا تا کہ دنیا بڑی دیر تک اس کی شان وشوکت دیکھنے کے بعد اس کی عبرتناک تباہی کو دیکھے۔ اور اس نشان کی اہمیت کی قائل ہو۔ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا کے معنے یہ ہیں کہ چاہیے کہ رحمٰن اس کو اور مہلت دے مگر مراد یہ ہے کہ شان معجزہ اسی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ کہ خدائے رحمٰن ابھی اس کو اور ڈھیل دے۔ گویا بظاہر تو اس قوم کے حالات کو دیکھ کر یہ کہنا چاہیے کہ خدا اس قوم کو غارت کرے۔ خدا اس قوم کو تباہ اور برباد کرے۔ مگر اس نشان کی عظمت اور اہمیت اتنی عظیم الشان ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ خدا اس قوم کو غارت کرے۔ ایک عقلمند اور روحانی انسان یہ کہے گا کہ یہ قوم ابھی اور اونچی ہو۔ کیونکہ یہ جتنی زیادہ اونچی ہوگی اتنا ہی اس کا گرنا زیادہ عظیم الشان ہوگا۔

حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے وہ چیز جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے یا عذاب کا اور پھر ساعت کا اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی شک کا اظہار کیا جارہا ہو کہ معلوم نہیں کیا چیز

دیکھیں گے؟ عذاب دیکھیں گے یا ساعت دیکھیں گے بلکہ مراد یہ ہے کہ مختلف قوموں اور حکومتوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آیا کرتے ہیں وہ خدائی سنت کے مطابق سب کے لئے ایک وقت میں ظاہر نہیں ہوتے بلکہ پہلے ایک قوم پر عذاب آتا ہے پھر کچھ وقفہ کے بعد دوسری قوم پر آتا ہے پھر کچھ وقفہ کے بعد تیسری قوم پر آتا ہے اور بعض قومیں ایسی ہوتی ہیں جن پر عذاب نہیں بلکہ ساعت کی گھڑی آجاتی ہے اور یہ دونوں سلسلے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ پچھلی لڑائی قیصر جرمنی کے لئے ساعت تھی۔ مگر فرانس اور انگلستان کے لئے عذاب تھی۔ یہ دونوں بچ گئے۔ مگر کمزور بھی ہوگئے۔ پس اِمَّا الۡعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَۃَ کے یہ معنے نہیں کہ یا عذاب آئے گا اور یا پھر ساعت آئے گی بلکہ مراد یہ ہے کہ کسی قوم کے لئے ہمارا عذاب نازل ہوگا۔ اور کسی قوم پر ساعت آجائے گی۔ اور یہی دنیا میں ہوتا چلا آیا ہے۔ پہلی جنگ عظیم ہوئی تو اس میں قیصر جرمنی ختم ہوگیا۔ زار روس ختم ہوگیا۔ بادشاہ ٹرکی ختم ہوگیا۔ اور انگلستان، فرانس اور بیلجئم پر عذاب آیا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم ہوئی تو اس میں ہٹلر اور مسولینی پر ساعت آگئی اور وہ تباہ ہوگئے۔ لیکن فرانس اور انگلستان کے لئے عذاب آگیا۔ اور وہ کمزور ہوگئے۔ پس فرماتا ہے جس دن ہمارے وعدہ کی گھڑی آپہنچی اس دن کسی کے لئے عذاب کا وعدہ پورا ہوجائے گا۔ اور کسی کے لئے ساعت کا وعدہ پورا ہوجائے گا۔ ساعت کے معنے ہمیشہ قیامت یا آخری فیصلہ کے ہوتے ہیں۔ مگر یہاں قیامت مراد نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہ عذاب کے ساتھ متبادل نہیں یہاں مراد قومی فیصلہ ہی ہے۔ جو عذاب سے متبادل شئے ہے۔ کیونکہ سب قوموں کا ایک وقت میں فیصلہ نہیں ہوتا۔ بعض ایک وقت میں عذاب دیکھیں گی اور بعض بالکل ختم ہوجائیں گی۔ اس طرح باری باری سب کا فیصلہ ہوجائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دنیا کی باقی سب قوموں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ اسی طرح مسیحیوں سے بھی ہوگا اور بعض پر اس کی طرف سے عذاب نازل ہوگا اور بعض کی ساعت آجائے گی۔

فَسَيَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضۡعَفُ جُنۡدًا اس وقت ان کو معلوم ہوجائے گا کہ کس کا مقام رہائش برا ہے۔ اور کون اپنے لشکروں کے لحاظ سے زیادہ کمزور ہے۔ یعنی اس وقت جب وہ مومنوں کے حق میں خدا تعالیٰ کی تائیدات دیکھیں گے تو یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوں گے کہ گو یہ کمزور تھے مگر ان میں ترقی کرنے کا مادہ پایا جاتا تھا۔ اور گو ہم طاقتور تھے مگر ہمارے اندر ہلاکت اور بربادی کا مادہ پایا جاتا تھا۔ ایک درخت ایسا ہوتا ہے جو بظاہر بڑا پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر وہ سو سال کا بڈھا ہوتا ہے۔ اور اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک گٹھلی ہوتی ہے جس میں سے ایک کونپل نکل رہی ہوتی ہے۔ بظاہر وہ کونپل ایک حقیر سی چیز نظر آتی ہے اور درخت بڑا مضبوط دکھائی دیتا ہے۔ مگر ہر عقلمند جانتا ہے کہ اب آئندہ یہ کونپل ہی ترقی کرے گی۔ کیونکہ ابھی سارا مستقبل اس کے سامنے

پڑا ہے۔اور وہ درخت جو سو سال کا بڈھا اور اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے وہ آج نہیں تو کل گر جائے گا۔پس اس دن جب نتائج ظاہر ہوں گے تو یہ لوگ اقرار کریں گے کہ ہم تو مرنے والے تھے۔بڑھنے اور ترقی کرنے کا مادہ تو انہی لوگوں میں پایا جاتا تھا۔اسی طرح فرماتا ہے اس دن ان پر یہ حقیقت بھی کھل جائے گی کہ کس کا لشکر کمزور تھا۔آیا خدا کا لشکر کمزور تھا۔یا ان کا لشکر کمزور تھا۔اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے اعلیٰ درجے کے تمدن اور بڑے بڑے لشکروں پر ناز ہوگا۔مومنوں کی طاقت اس وقت نظر نہیں آئے گی۔وہ مشرقیوں کو اچھی رہائش نہ ہونے کا طعنہ دیں گے اور ساتھ ہی کہیں گے کہ ہمارے پاس بڑے بڑے لشکر ہیں اور ہماری طاقت تم سے بہت زیادہ ہے۔مگر آخر ان کی یہ دولت بھی چھن جائے گی۔کیونکہ خدا مومنوں کے ابھارنے اور کافروں کے مٹانے کا فیصلہ کر چکا ہوگا۔پس یہ دن بدن اونچے ہوتے چلے جائیں گے اور وہ دن بدن نیچے ہوتے چلے جائیں گے۔اور آخر ایک دن دنیا یہ تسلیم کرلے گی کہ یہ لوگ ترقی کی طرف جا رہے تھے۔اور وہ تنزل کی طرف جا رہے تھے۔

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ

اور اللہ (تعالیٰ) ہدایت یافتہ لوگوں کو ہدایت میں بڑھاتا جائے گا۔اور باقی رہنے والے (یعنی) نیک اعمال

خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ۝۷۷

خدا کی نظر میں سب سے بہتر شے ہیں جزا کے لحاظ سے بھی اور انجام کے لحاظ سے بھی۔

تفسیر۔اس میں بتایا گیا ہے کہ جوں جوں حالات میں تغیر پیدا ہوتا ہے مومن کا ایمان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے گویا کوئی تغیر اس کے قدم کو سست اور اس کے ایمان کو کمزور نہیں کرتا بلکہ ہر نیا تغیر اس کی طاقت اور قوت کو بڑھانے والا ہوتا ہے۔ہم اپنی جماعت میں بھی دیکھتے ہیں کہ جب بھی کوئی تغیر پیدا ہوا اس کے نتیجہ میں ہمیشہ جماعت نے ترقی کی ہے۔کتنا بڑا صدمہ تھا جو قادیان سے نکلنے پر جماعت کو پہنچا۔اول تو قادیان کے متعلق ہماری جماعت میں ایک قسم کا شرک پایا جاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے قادیان سے کبھی نہیں نکلنا اس شرک کے ٹوٹنے پر جماعت کو ایک بڑا دھکا لگا اور کئی کمزور ایمان والے متزلزل ہو گئے بعض لوگ بے شرمی سے اپنے منہ سے تو یہ کہتے تھے کہ احمدیت سچی ہے لیکن ان کے دل کہتے تھے کہ اگر احمدیت سچی ہوتی تو ہم قادیان سے کیوں نکلتے مگر اب دیکھو قادیان سے نکل کر ہماری جماعت کو کتنی بڑی طاقت حاصل ہوئی ہے۔قادیان میں سالوں بعد کبھی کوئی غیر ملکی آیا

کرتا تھا مگر قادیان سے ہجرت کے بعد متواتر کئی ممالک سے لوگوں نے یہاں تعلیم کے لئے آنا شروع کر دیا۔ اب بھی دس بارہ غیر ممالک کے لوگ یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ابھی کئی لوگوں کی چٹھیاں آتی رہتی ہیں کہ ہمیں بھی وہاں آنے کی اجازت دی جائے مگر بوجہ مالی تنگی کے ان کی درخواستوں کو رد کرنا پڑتا ہے اسی طرح قادیان میں ہمارے بہت تھوڑے مشن تھے مگر اب کئی نئے ممالک میں مبلغین بھجوائے جا چکے ہیں اور کثرت سے لوگ احمدیت سے روشناس ہو رہے ہیں۔ اسی طرح قادیان کے بجٹ سے اب ہمارا یہاں کا بجٹ بھی بڑھ گیا ہے۔ غرض سلسلہ کے تمام کاموں میں جس قدر ترقی اور زیادتی ہوئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ یہی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی ہے کہ ہم مومنوں کو ترقی دیتے چلے جاتے ہیں یہ نہیں کہ انہیں صدمات نہیں پہنچتے صدمات ان کو بھی پہنچیں گے مگر جس وقت مخالفت کے بادل چھٹیں گے دشمنِ صداقت کمزور نظر آئے گا اور مومن پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔

وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا اور باقی رہنے والی نیک باتیں ہی تیرے رب کے نزدیک سب سے اچھی ہیں یعنی انسان کے وہ اعمال جو خدا تعالیٰ کے حضور مقبول ہو جائیں وہی اس کا حقیقی سرمایہ ہیں یا یوں سمجھ لو کہ باقیات الصالحات وہ چیزیں ہیں جو خدا تعالیٰ کے خزانہ میں چلی گئیں۔ حضرت مسیحؑ نے کہا ہے کہ

> ''اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو۔ جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں'' (متی باب ۶ آیت ۱۹۔۲۰)

پس چونکہ حضرت مسیح نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ اپنے لئے زمین پر مال جمع نہ کرو بلکہ آسمان پر مال جمع کرو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ عیسائیوں کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ تم اپنی جس قدر طاقتیں پیش کرتے ہو وہ اسی زمین سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ تمہارا ایٹم بم بھی اسی دنیا کا ہے۔ تمہاری توپیں بھی اسی دنیا کی ہیں۔ تمہارے گولے بھی اسی دنیا کے ہیں۔ تمہاری تجارتیں بھی اسی دنیا کی ہیں۔ تمہارے جتھے بھی اسی دنیا کے ہیں مگر مومن جن کے متعلق تم کہتے ہو کہ وہ کمزور اور ناطاقت ہیں ان کا بینک آسمان پر کھلا ہوا ہے۔ کیا مسیحؑ کی بات تمہیں یاد نہیں رہی کہ جو چیز آسمان پر ہے وہی محفوظ ہے اور جو زمین پر ہے وہ غیر محفوظ ہے۔ ان کی باقیات الصالحات خدا کے بینک میں ہیں جس کا دیوالہ نہیں نکل سکتا۔ اور وہ بہت بہتر ہیں ثواب کے لحاظ سے بھی اور پھر واپسی کے لحاظ سے بھی۔ یعنی اصل مال بھی انہیں وہیں سے ملے گا اور ثواب بھی وہیں سے ملے گا یا یوں کہو کہ مول بھی وہیں سے ملے گا اور بیاج بھی وہیں سے ملے گا

ثواب بیاج ہو گیا اور خیرٌ مردًا مول ہو گیا۔ گویا اس طرف اشارہ کیا کہ تمہیں اپنے بنکوں پر بڑا ناز ہے اور تم سمجھتے ہو کہ تمہارا روپیہ بنکوں میں ضرور ہونا چاہیے کیونکہ تمہیں انٹرسٹ ملے گا لیکن تم اس حقیقت کو بھول گئے کہ اصل مال وہی ہے جو خدا تعالیٰ کے بنک میں محفوظ ہے اور اسی کا دیا ہوا انٹرسٹ حقیقی انٹرسٹ ہے۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر کبھی غور نہیں کیا جس نے ہمارے نشانوں کا انکار کیا اور کہا کہ مجھے یقیناً بہت سا مال اور

وَلَدًا ﴿۷۸﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۹﴾

بہت سے بیٹے دیئے جائیں گے۔ کیا اس نے غیب (کا حال) معلوم کر لیا ہے یا (خدائے) رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے۔

تفسیر۔ فرماتا ہے ذرا بتاؤ تو سہی وہ شخص جو ہماری آیتوں کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے مال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے بدلہ میں مجھے اور مال ملے گا۔ میں اسے تجارت پر لگاؤں گا اور اپنے مال میں اضافہ کرتا چلا جاؤں گا اور میرے بیٹوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میرا خاندان اور میری نسلیں ترقی کریں گی۔ گویا افزائش نسل کے لئے جس قدر سامانوں کی ضرورت ہے وہ میرے پاس ہیں تمہارے پاس نہیں۔ فرماتا ہے اَطَّلَعَ الْغَيْبَ تم بتاؤ کہ کیا اس نے غیب دیکھ لیا ہے۔ کیا پہلے لوگوں کے پاس مال نہیں تھا اور پھر وہ تباہ نہیں ہو گئے۔ کیا پہلے لوگوں کے پاس اولادیں نہیں تھیں اور کیا وہ اولادیں ان کے کام آئیں؟ عاد کے پاس کتنی بڑی طاقت تھی سارے عرب اور عراق اور فلسطین اور شام پر ان کی حکومت تھی۔ مگر اب زمینیں کھود کھود کر عاد قوم کے آثار تلاش کئے جاتے ہیں اور اگر کسی کو کوئی نشان مل جاتا ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے۔ کہ میں نے ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے اسی طرح فراعنہ کو دیکھ لو ان کی کتنی بڑی طاقت تھی۔ لوگ ان کا نام سن کر لرزتے تھے اور خود ان کی یہ حالت تھی کہ اگر وہ دربار میں آتے تو اپنے منہ پر نقاب ڈال لیتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہم اتنی بڑی شان کے مالک ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمارا چہرہ دیکھ لے گا تو وہ کوڑھی ہو جائے گا۔ مگر اب ان کی لاشیں نکال نکال کر عجائب گھروں میں رکھی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ فلاں فرعون کی لاش ہے اور یہ فلاں فرعون کی لاش ہے۔ میں نے خود مصر کے عجائب گھر میں ایسی لاشیں دیکھی ہیں۔ فرانس کے عجائب گھر میں بھی لاشیں ہیں۔ اور اب امریکہ والے کوشش کر رہے ہیں کہ وہ بھی کسی فرعون کی لاش لے جائیں گویا فراعنہ مصر

کی لاشوں کی اب ایسی ہی حیثیت رہ گئی ہے جیسے پرانے برتنوں کی ہوتی ہے کہ لوگ انہیں تماشہ کے طور پر عجائب گھروں میں رکھ دیتے ہیں۔انہیں کیا خبر تھی کہ ایک زمانہ میں ہماری لاشوں کے ساتھ یہ سلوک ہونے والا ہے۔پس فرماتا ہے تم جو دعوے کرتے ہو کہ ہم تباہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پاس مال ہے اور ہماری نسلیں خوب ترقی کر رہی ہیں کیا تمہیں غیب کا علم حاصل ہے۔ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا خدا نے تم سے کوئی عہد کیا ہوا ہے کہ وہ تمہیں ہلاک نہیں کرے گا، یہی دو باتیں ہی جن پر تم اپنے اس دعویٰ کی بنیاد رکھ سکتے ہو لیکن اگر تمہیں غیب کا علم حاصل نہیں اور خدا نے تمہارے ساتھ کوئی عہد بھی نہیں کیا۔تو صرف اموال اور اولاد کا تمہارے پاس ہونا تمہیں تباہی سے نہیں بچا سکتا کیونکہ دنیوی لحاظ سے بڑی بڑی طاقتیں آج تک تباہ ہو چکی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غیب کی خبریں یا تو نجومی، رمال اور ارڑ پوپو وغیرہ بتایا کرتے ہیں اور یا پھر اللہ تعالیٰ کے انبیاء بتایا کرتے ہیں۔یوں تو بعض دفعہ بچے بھی ضد میں آکر کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں فلاں چیز کا پتہ ہے۔حالانکہ انہیں پتہ نہیں ہوتا۔مگر بچوں کی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔توجہ یا تو نجومیوں اور ارڑ پوپوں کی بات کی طرف کی جاتی ہے اور یا پھر اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی طرف کی جاتی ہے۔پس چونکہ انہی دو ذرائع سے لوگ غیب کی خبریں حاصل کیا کرتے ہیں۔اس لئے اس جگہ بھی انہی دونوں باتوں کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ کرتا ہے اور فرماتا ہے اَطَّلَعَ الْغَيْبَ کیا تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ نجومیوں اور ارڑ پوپوں کی پیشگوئی ہے۔ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا یا خدا تعالیٰ کے کسی نبی نے ایسا کہا ہے؟

كَلَّا ؕ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۙ﴿۸۰﴾

ایسا ہرگز نہیں ہوگا ہم اس کے اس قول کو محفوظ رکھیں گے اور اس کے عذاب کو لمبا کر دیں گے۔

حلّ لُغَات۔مفردات میں لکھا ہے کہ كَلَّا رَدْعٌ وَ زَجْرٌ وَ اِبْطَالٌ لِقَوْلِ الْقَائِلِ کے لئے آتا ہے یعنی اس کے معنے دھتکارنے کے بھی ہوتے ہیں۔زجر کے بھی ہوتے ہیں۔اور یہ پہلے قول کو رد کرنے کے لئے بھی آتا ہے۔گویا جہاں كَلَّا کا لفظ استعمال ہوگا وہاں مراد یہ ہوگی کہ پہلے جو کچھ کہا گیا ہے وہ غلط ہے۔صحیح بات وہ ہے جو ہم آگے بیان کرتے ہیں۔

تفسیر۔فرماتا ہے یہ بالکل غلط بات ہے نہ انہیں غیب کا علم حاصل ہے اور نہ خدا نے ان سے کوئی عہد کیا

ہوا ہے۔ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ ہم ضرور وہ بات لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہے ہیں۔ اور وہ کہتے یہ ہیں کہ لَأُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ہمیں مال بھی ملے گا اور ہمیں اولاد بھی ملے گی۔ ان کا یہ قول معاف نہیں ہوگا بلکہ ان کا حساب لینے کے لئے اسے یاد رکھا جائے گا اور ہم اس بات کو کبھی بھولیں گے نہیں کہ انہوں نے ہمارے بندوں کے سامنے یہ دعویٰ کیا تھا۔ اور اب ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بندوں کے سامنے ہی ان کو جھوٹا ثابت کریں۔

وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا اور جس طرح ہم نے ان کے آرام کی مدت لمبی کر دی اور انہوں نے مومنوں کو طعنہ دیا کہ ہمیں طاقت اور شوکت حاصل ہے اور تم ہمارے مقابلہ میں بالکل کمزور اور ذلیل ہو۔ اسی طرح اب ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے عذاب کو بھی لمبا کریں۔ ہم نے انہیں ایک لمبی مہلت دے کر اپنے مومن بندوں کو لمبے عرصہ تک شرمندہ کروایا اور وہ کمزوروں اور ناطاقتوں کی طرح ان کے سامنے کھڑے رہے۔ پس چونکہ ہم نے ہی ان لوگوں کو مہلت دے کر اپنے مومن بندوں کو شرمندہ کروایا تھا اور اسلام پر لوگوں کے لئے اعتراض کا موقع پیدا ہوا تھا اس لئے اب ہمارا ہی فرض ہے کہ ہم اس کے بدلہ میں ان کے عذاب کو بھی لمبا کریں تا کہ مومن کو یہ تسلی ہو کہ میرا ابھی کوئی ہمدرد اور نگران ہے۔

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۱﴾

اور جس (چیز) پر وہ فخر کر رہا ہے اس کے ہم وارث ہو جائیں گے اور وہ ہمارے پاس اکیلا ہی آئے گا۔

تفسیر - مَا يَقُوْلُ کی تشریح پہلی آیت میں موجود ہے۔ فرماتا ہے وقال لَأُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا وہ کہتا ہے کہ مجھے مال بھی ملے گا اور اولاد بھی ملے گی۔ یہ دعویٰ تھا جو اس نے لوگوں کے سامنے کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ یعنی نَرِثُ مِنْهُ مَا يَقُوْلُ جو کچھ وہ کہا کرتا تھا اس کے ہم وارث ہو جائیں گے یعنی وہ مال جو اس کو حاصل ہے اور وہ اولاد جس کی وجہ سے وہ دعوے کر رہا ہے ہم یہ دونوں چیزیں اس سے چھین لیں گے۔

اسی طرح پہلی آیات میں یہ گذر چکا ہے کہ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا یعنی کافر مومنوں سے یہ کہتے ہیں کہ تم ہمیں بتاؤ کہ مال اور دولت اور عزت اور رتبہ کس کو حاصل ہے اگر یہ چیزیں ہمیں حاصل ہیں تمہیں حاصل نہیں تو ہم دونوں میں سے کون اچھا ہوا پس مَا يَقُوْلُ سے مراد مال اور عزت اور رتبہ اور اولاد ہے۔ فرماتا ہے ہم ان چیزوں میں اس کے وارث ہو جائیں گے یعنی ان سے مال بھی چھین لیں گے۔

ان کی دولت بھی چھین لیں گے ان کی عزت بھی چھین لیں گے۔ان کا رتبہ بھی چھین لیں گے۔ان کی اولادیں بھی چھین لیں گے۔وَ يَأْتِيْنَا فَرْدًا اور وہ ایک فرد کی حیثیت میں ہمارے پاس آئیں گے۔

يَأْتِيْنَا فَرْدًا میں مال کا ذکر نہیں کیا گیا۔صرف اس کی ذاتی حیثیت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کیونکہ انسان کے دو قسم کے ساتھی ہوتے ہیں۔ایک وہ ہوتے ہیں جو رشتہ داری کی وجہ سے انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔جیسے ماں باپ ہوئے یا اولاد ہوئی یا بہن بھائی ہوئے یا بیوی ہوئی۔اور ایک وہ ہوتے ہیں جو حصول فائدہ کے خیال سے جو مال اور رتبہ کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔انسان کے اردگرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔گویا وہ دولت اور عزت کے بھوکے ہوتے ہیں۔یا شہرت کے خواہش مند ہوتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ کسی کے پاس مال ہے اور وہ بڑا صاحب رسوخ انسان ہے تو مختلف قسم کے فوائد کے حصول کے لئے وہ اس کی خوشامدیں کرنے لگ جاتے ہیں اور اس کے ساتھی اور دوست بن جاتے ہیں۔مگر فرمایا جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو وہ صرف ایک فرد کی حیثیت میں ہوگا کسی قسم کے ساتھی اس کے ساتھ نہیں ہوں گے۔

پہلے فرمایا تھا کہ ہم مال اور اولاد دونوں کے وارث ہو جائیں گے۔اب بتاتا ہے کہ چونکہ ہم ان کی اولادیں چھین لیں گے اس لئے وہ اکیلے رہ جائیں گے اور چونکہ ہم مال بھی لے لیں گے۔اس لئے وہ لوگ جو مال کی وجہ سے ان کے اردگرد اکٹھے تھے اور جو رات دن خوشامدیں کرتے رہتے تھے وہ بھی بھاگ جائیں گے۔غرض يَأْتِيْنَا فَرْدًا میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ہم ان کے مال اور اولاد دونوں لے لیں گے فرداً میں اولاد اور خدم و مصاحب سب کی نفی کر دی اور جو حصول فائدہ کے لئے ساتھ ہوتے ہیں ان کی نفی میں مال و دولت کی نفی خود بخود آ گئی کیونکہ وہ لوگ تبھی ساتھ چھوڑتے ہیں جبکہ مال اور رتبہ نہ رہے۔

کفار مکہ کو ہی دیکھ لو ان لوگوں کو اپنی اولادوں پر کتنا بڑا ناز تھا مگر پھر وہی اولادیں خدا تعالیٰ نے ان سے چھین کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیں اور سردارانِ کفار ذلیل ہو کر رہ گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بنو مصطلق پر لشکر کشی کی تو وہاں انصار اور مہاجرین میں کنوئیں سے پانی نکالنے پر جھگڑا ہو گیا اور اس جھگڑے نے اس قدر طول کھینچا کہ انصار اور مہاجرین نے تلواریں نکال لیں اور وہ ایک دوسرے سے لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔عبداللہ بن ابی ابن سلول نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا چنانچہ وہ آگے بڑھا اور اس نے کہا اے انصار! یہ تمہاری ہی غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ آج تمہیں یہ دن دیکھنا پڑا۔میں تمہیں پہلے ہی سمجھاتا تھا کہ تم ان مہاجرین کو اپنے سر نہ چڑھاؤ ورنہ کسی دن تکلیف اٹھاؤ گے مگر تم نے میری بات نہ مانی۔اب خدا کا شکر ہے کہ

تمہیں بھی اس حقیقت کا احساس ہوا۔ مگر گھبراؤ نہیں اور مجھے مدینہ پہنچ لینے دو۔ پھر دیکھو گے کہ مدینہ کا سب سے معزز انسان یعنی وہ کمبخت خود مدینہ کے سب سے زیادہ ذلیل انسان یعنی نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے نکال دے گا اور یہ فتنہ پھر کبھی سر نہیں اٹھائے گا جب اس نے یہ الفاظ کہے تو انصار اور مہاجرین دونوں سمجھ گئے کہ ہمارے جوش سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا ہے۔ چنانچہ وہ سنبھل گئے اور انہوں نے آپس میں صلح کر لی۔ مگر اس دوران میں کسی نے دوڑ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دے دی کہ یا رسول اللہ عبداللہ بن ابی ابن سلول نے آج اس اس طرح کہا ہے۔ آپ نے عبداللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے دوستوں کو بلا لیا اور فرمایا کہ کیا بات ہوئی ہے انہوں نے اس واقعہ سے بالکل انکار کر دیا اور کہا کہ یہ بالکل غلط بات ہے ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لیکن بات سچی تھی پھیلنی شروع ہوئی اور عبداللہ کے بیٹے تک بھی یہ بات جا پہنچی کہ آج اس کے باپ نے ایک جھگڑے کے موقع پر یہ کہا ہے کہ مجھے مدینہ پہنچ لینے دو پھر وہاں کا معزز ترین انسان یعنی وہ خود مدینہ کے ذلیل ترین انسان یعنی نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں سے نکال کر رہے گا۔ وہ ایک مخلص نوجوان تھا وہ یہ سنتے ہی بیتاب ہو گیا اور اسی وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا اور کہنے لگا یا رسول اللہ میں نے سنا ہے کہ آج میرے باپ نے یہ الفاظ کہے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں میرے پاس بھی رپورٹ پہنچ چکی ہے اس نے کہا یا رسول اللہ اس جرم کی سزا سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ میرے باپ کو قتل کرنے کا حکم دے دیں۔ اور یہ بالکل جائز اور درست سزا ہے مگر یا رسول اللہ میں یہ درخواست کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ اگر آپ میرے باپ کے قتل کا حکم نافذ فرمائیں تو کسی اور کو قتل کرنے کا حکم نہ دیں بلکہ مجھے حکم دیں کہ میں اپنے باپ کو قتل کروں۔ کیونکہ اگر آپ نے کسی اور مسلمان کو حکم دیا اور اس نے میرے باپ کو قتل کر دیا تو ممکن ہے کہ شیطان کسی وقت مجھے ورغلا دے کہ یہ میرے باپ کا قاتل ہے اور میں جوش میں اس پر حملہ کر بیٹھوں۔ اس لئے آپ کسی اور کو حکم دینے کی بجائے مجھے ہی یہ حکم دیں کہ میں اپنے باپ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ہم اسے کوئی سزا دینا نہیں چاہتے اس نے کہا یا رسول اللہ یہ ٹھیک ہے کہ آپ اس وقت اسے کوئی سزا دینا نہیں چاہتے لیکن اگر پھر کسی وقت اسے سزا دینا مناسب سمجھیں تو میری درخواست ہے کہ آپ رحم فرما کر مجھے ہی حکم دیں کہ میں اپنے باپ کو قتل کر دوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ ہمارا اسے سزا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہم تمہارے باپ کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کا ہی سلوک کریں گے وہ وہاں سے اٹھا اور خاموشی کے ساتھ چلا آیا مگر اس کا دل ان الفاظ کی وجہ سے جل رہا تھا اور اسے کسی پہلو قرار اور اطمینان نہیں آتا تھا جب لشکر مدینہ کی

طرف واپس لوٹا اور عبداللہ بن ابی ابن سلول اندر داخل ہونے لگا تو اس کا بیٹا اپنی سواری سے کود کر اپنے باپ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور اس نے تلوار اپنی میان سے نکال لی اور باپ سے کہا تمہیں یاد ہے تم نے وہاں کیا الفاظ کہے تھے تم نے کہا تھا کہ مدینہ کا معزز ترین انسان میں ہوں اور مدینہ کا ذلیل ترین انسان نعوذ باللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ خدا کی قسم میں تمہیں اس وقت تک مدینہ میں داخل نہیں ہونے دوں گا جب تک تم میرے سامنے یہ اقرار نہ کرو کہ مدینہ کا ذلیل ترین انسان میں ہوں اور مدینہ کا معزز ترین انسان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ورنہ میں اسی تلوار سے تمہارا سر اڑا دوں گا۔ عبداللہ نے جب یہ نظارہ دیکھا کہ اس کا بیٹا اس کے سامنے تلوار لے کر کھڑا ہے اور وہ کہتا ہے کہ کہو میں مدینہ کا ذلیل ترین انسان ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے معزز ترین انسان ہیں تو اس کا دل لرز گیا اور اس نے سمجھ لیا کہ اگر آج میں نے یہ الفاظ نہ کہے تو میرے بیٹے کی تلوار میرا خاتمہ کئے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے تمام دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے جن میں وہ اپنی بڑائی کے گیت گایا کرتا تھا اقرار کیا کہ میں مدینہ کا ذلیل ترین انسان ہوں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے معزز ترین انسان ہیں اور پھر اس نے اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے کے لئے رستہ دیا۔

اس سے زیادہ بھلا يَأْتِيْنَا فَرْدًا کی صداقت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ بیٹے جن پر ناز کیا کرتے تھے وہ ان سے چھینے گئے اور ان کے بیٹے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے بن گئے اسی طرح ابو جہل کا بیٹا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا بنا۔ عاص کا بیٹا (عمرو بن العاص) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا بنا۔ ولید کا بیٹا خالد آپ کا بیٹا بنا۔ ابوسفیان کا بیٹا معاویہ آپ کا بیٹا بنا۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی اولادوں پر فخر کیا کرتے تھے۔ اپنے مال اور دولت پر فخر کیا کرتے تھے مگر خدا تعالیٰ نے ان کا مال بھی ان سے لے لیا اور ان کی اولادیں بھی ان سے لے لیں۔

اسی طرح فرماتا ہے آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ وَ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَأْتِيْنَا فَرْدًا نہ مال ان کے پاس رہیں گے نہ اولادیں ان کے کام آئیں گی۔ نہ خوشامدی ان کے ارد گرد رہیں گے۔ یہ ساری چیزیں ہم لے کر اپنے مومن بندوں کو دے دیں گے اور یہ لوگ لنڈورے کے لنڈورے رہ جائیں گے۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۲﴾

اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا بہت سے معبود بنا چھوڑے ہیں اس امید سے کہ وہ ان لوگوں کے لئے عزت کا موجب بنیں (گے)۔

حل لغات۔ اَلْعِزُّ خَلَافُ الذُّلِّ (اقرب الموارد) عزت کا لفظ ہمیشہ ذلت کے مقابل میں استعمال ہوتا ہے۔ پس ذلت کے مقابل جو چیز ہے اسے عزت کہا جائے گا۔

تفسیر۔ بت پرستوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بت بنانے کی ایک بڑی وجہ لوگوں میں عزت اور شہرت حاصل کرنے کی تمنا ہوا کرتی تھی وہ لوگ بڑے بڑے بت بناتے تھے جیسے مصریوں نے ابوالہول بنایا سینکڑوں فٹ اونچا ہے اور ساری دنیا میں اس کی شہرت ہے۔ دور دور سے لوگ آتے اور اس کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ گویا خالی بت نہیں بلکہ وہ ایسی شان کا بت بناتے تھے کہ اس کی طرف خود بخود توجہ پھر جاتی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ فلاں بت بڑا عظیم الشان ہے یا ان کے ایسے ایسے شاندار معبد بناتے تھے کہ دیکھنے والے دیکھتے اور حیران ہوکر رہ جاتے۔ پھر ان بتوں پر میلے کئے جاتے۔ ہزاروں ہزار روپیہ خرچ کیا جاتا اور وہ اپنے ہمسایوں پر فخر کرتے کہ ہم نے کتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ مثلاً سومنات کا بت بنایا اور اس پر لاکھوں روپیہ خرچ کر دیا۔ اب ایک دیکھنے والا جب بت کو دیکھتا ہے کہ اس کی آنکھیں ہیرے کی ہیں۔ اس کے سر پر تاج ہے۔ اس کے ہاتھ میں سونے کا گرز ہے اور اس کا قد اتنا بڑا ہے کہ سر چھت سے لگا ہوا ہے تو وہ مرعوب ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جتنا سونا اور چاندی اور ہیرے اور جواہر اس بت کے پاس ہیں اتنی دولت تو میری سات پشتوں کے پاس بھی نہیں ہوسکتی پس اس پر ہیبت طاری ہوجاتی ہے۔ اور بت بنانے والوں کی عظمت کا اسے قائل ہونا پڑتا ہے۔ پس چونکہ بت پرست بڑے بڑے بت بناتے تھے اور پھر اپنے ہمسایوں پر فخر کرتے تھے کہ ہم نے اتنا روپیہ خرچ کیا ہے اور جتنا زیادہ وہ روپیہ خرچ کرتے تھے اتنی ہی ان کی عزت بڑھتی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ خدا کے بنانے پر تو ان کو کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا کیونکہ وہ ازل سے موجود ہے۔ یہ لوگ صرف اپنی عزت اور شہرت کے لئے بڑے بڑے بت بناتے ہیں ان پر سونا اور چاندی اور ہیرے اور جواہرات خرچ کرتے ہیں اور ان کے بڑے بڑے معبد بناتے ہیں تا کہ لوگوں میں فخر کر سکیں کہ ہمارا معبد اتنا شاندار ہے ہمارا بت اتنا بڑا ہے اور ہم نے اس پر اتنا روپیہ خرچ کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی مساجد کو

دیکھو کہ وہ کتنی سادہ ہوتی ہیں۔ خانہ کعبہ کتنی سادگی کا مظہر ہے۔ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کتنی سادہ ہے۔ ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص اس مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے جائے گا وہ خالص خدا تعالیٰ کی عبادت کے لئے جائے گا۔ ہیرے اور جواہرات اور سونے اور چاندی کے لئے نہیں جائے گا۔ اسی طرح جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر دعا کرنے کے لئے جائے گا وہ صرف عقیدت اور محبت کے جذبات کے ساتھ وہاں جائے گا۔ کوئی بلند و بالا اور شاندار عمارت دیکھنے کے لئے وہاں نہیں جائے گا۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے بھی اب مساجد کو فخر و مباہات کا ذریعہ بنالیا ہے۔ مسجد کی ضرورت ہو یا نہ ہو وہ محض اپنے نام اور نمود کے لئے بڑی بڑی مسجدیں بنادیتے ہیں اور پھر ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ان پر نقش و نگار کرتے اور بڑے بڑے بیل بوٹے بناتے ہیں۔ حالانکہ ان کے اندر نماز پڑھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

میں مصر کی جامع مسجد دیکھنے کے لئے گیا تو میں نے دیکھا کہ محراب کو چھوڑ کر مسجد کے ایک کونہ میں چند آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ امام سمیت غالباً وہ چار یا پانچ آدمی تھے جب وہ نماز پڑھ چکے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا یہاں نماز ہو چکی ہے اور آپ لوگ پیچھے رہ گئے تھے؟ انہوں نے کہا نہیں یہی امام صاحب اس مسجد کے امام ہیں اور ہم ان کے مقتدی ہیں۔ میں نے کہا تو پھر آپ محراب چھوڑ کر ایک کونہ میں نماز کیوں پڑھ رہے تھے؟ کہنے لگے کیا کریں شرم آتی ہے کہ اتنی بڑی مسجد میں ہم صرف تین یا چار آدمی نماز پڑھنے والے ہیں۔ اسی شرم کے مارے ہم محراب میں کھڑے نہیں ہوتے ایک کونہ میں نماز پڑھ لیتے ہیں تا کہ اگر کوئی شخص ہمیں دیکھ لے تو وہ یہی سمجھے کہ یہ نماز سے پیچھے رہ گئے تھے۔ غرض مسلمانوں میں بھی آج کل یہ نقص پیدا ہو چکا ہے کہ وہ نماز کی طرف تو توجہ نہیں کرتے اور بڑی بڑی مسجدیں بنادیتے ہیں حالانکہ مسجد کی خوبی اس کی سادگی میں ہے اور اسلام نے اسے روحانی زینت کا موجب بنایا ہے اس لئے نہیں بنایا کہ اسے فخر و مباہات کا موجب بنالیا جائے۔ ہاں نمازیوں کے لئے صفائی اور گنجائش اور صحت کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ یہ زینت نہیں ضرورت ہے۔

غرض فرماتا ہے وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا یہ لوگ بڑے بڑے بت بناتے ہیں ان بتوں کے معبد بناتے ہیں ان پر میلے لگاتے ہیں تا کہ لوگوں میں ان کی شہرت ہو اور وہ تعریف کریں کہ فلاں کا بت بڑا شاندار ہے یا فلاں نے بڑا شاندار میلہ لگایا ہے۔

اس کے علاوہ لِيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بت پرست بت کو ذریعۂ شفاعت قرار دیتا ہے اور اسے خدا تعالیٰ کے حضور میں قرب کا موجب بناتا ہے اس کے نزدیک وہ خود حضور دربار کا اہل نہیں اس

لئے وہ کسی درباری کا درباری بن جاتا ہے تا کہ اس کے خادموں میں شامل ہوکر خدا کے دربار میں چلا جائے ۔وہ سمجھتا ہے میں بہت گنہگار ہوں میں خدا کے دربار میں کہاں پہنچ سکتا ہوں ۔ یہ بت بڑی شان رکھتے ہیں میں ان کی عبادت کروں گا تو ان کے غلاموں اور خادموں میں شامل ہوکر میں بھی خدا تعالیٰ کے دربار میں پہنچ جاؤں گا۔ جیسے ڈپٹی کمشنر کہیں جاتا ہے تو اس کا چپڑاسی بھی اس کی وجہ سے بڑے بڑے افسروں تک پہنچ جاتا ہے۔ بت پرست بھی سمجھتا ہے کہ میں اس بت کی عبادت کر کے اس قابل ہو جاؤں گا کہ خدا تعالیٰ کے دربار میں بیٹھ سکوں مگر خدا تعالیٰ جو حاضر وناظر ہے وہ اس کا حاجت مند نہیں اس کا دروازہ ہر اک کے لئے کھلا ہے اسی مضمون کی طرف قرآن کریم میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۬ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ (الزمر:۴) یعنی دوسرں کی شرکت میں میں عبادت قبول کرنے کو تیار نہیں خدا تعالیٰ کے سوا جو لوگ دوسروں کو پوجتے ہیں سمجھتے ہیں کہ ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں وہ خدا تعالیٰ کے قریب کر دیں یعنی وہ خدا کے مقرب ہیں جب ہم ان سے تعلق پیدا کریں گے تو ان کے ذریعہ سے ہم بھی خدا کے دربار میں چلے جائیں گے فرماتا ہے یہ اچھے درباری ہیں کہ ایک دوسرے سے لڑائی ہو رہی ہے اور ایک بت کے نام پر دوسرے پر چڑھائی کی جارہی ہے۔ خدا کے قرب میں تو وہ جائیں گے مگر درباری کے طور پر نہیں بلکہ ملزم کے طور پر اور خدا تعالیٰ فیصلہ کرے گا کہ ان کے دعوے کیا حقیقت رکھتے تھے اور یہ لوگ دو جرموں کے مرتکب ہیں۔ اول جھوٹے کہ اپنے منہ سے بتوں یا اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جو ان میں نہیں ہیں۔ دوسرے خدا تعالیٰ کے احسانوں کے سخت منکر ہیں کہ وہ تو ایسا بلند شان ہو کر ان کو نوازتا ہے اور یہ جھوٹے معبودوں کی پناہ لیتے پھرتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ میں کاذب کہہ کر ان کو جھوٹا بتایا کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے بتوں میں کوئی طاقت نہیں پائی جاتی اور پھر ان کی طرف خدائی طاقتیں منسوب کرتے ہیں اور کفار کہہ کر بتایا کہ وہ بڑے ناشکرے ہیں وہ خدا تعالیٰ کے متواتر احسانات کو دیکھتے ہیں اور پھر خدا تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی بجائے اپنے جھوٹے معبودوں کی پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔

كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۳﴾ ع ۱۷

ایسا ہرگز نہیں ہوگا وہ معبود ایک دن ان کی عبادتوں کا انکار کریں گے اور ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔

حلّ لُغَات۔ ضِدًّ کے معنے مخالف کے بھی ہیں اور ضد کے معنے معاون کے بھی ہیں مگر دونوں صورتوں میں معنے ایک ہی ہیں یعنی ان کے خلاف ان کے دشمن بن کر کھڑے ہوں گے یا ان کے خلاف سچائی کے مددگار بن کر کھڑے ہوں گے۔

تفسیر۔ کَلَّا کہہ کر بتایا کہ ان بت پرستوں کی بڑی غرض تو یہ ہے کہ انہیں عزت حاصل ہو مگر یہ بت ان کے لئے عزت کا موجب نہیں بلکہ ذلت کا موجب ہوں گے اور یہ لوگ خود اپنے منہ سے ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور یہ بھی کہ وہ معبود ان کی عبادت کا انکار کریں گے گویا سَيَكْفُرُوْنَ میں جو ضمیر استعمال کی گئی ہے یہ بتوں کی پرستش کرنے والوں کی طرف بھی جاتی ہے اور ان کے معبودوں کی طرف بھی جاتی ہے اس کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ سَيَكْفُرُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں سَيَكْفُرُوْنَ الْمَعْبُوْدُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ یعنی بتوں کی عبادت کرنے والے خود اپنے منہ سے ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے ان کی کبھی عبادت نہیں کی یا یہ کہ معبود ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور کہیں گے یہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں انہوں نے ہماری عبادت نہیں کی بلکہ ان کے سامنے ان کی اپنی اغراض اور شہرتیں تھیں جن کے لئے یہ عبادت کرتے رہے قرآن کریم میں یہ دونوں معنے استعمال کئے گئے ہیں چنانچہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ۔ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا (البقرۃ: ۱۶۷، ۱۶۸) یعنی جس دن وہ لوگ جن کی فرمانبرداری اور اطاعت کی جاتی تھی ان لوگوں سے جو ان کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اپنی برات اور نفرت کا اظہار کریں گے اور وہ خدائی عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ہر قسم کے اسباب کو منقطع پائیں گے تو وہ لوگ جو اس دنیا میں ان کی اتباع کرتے رہے ہیں۔ اس نظارہ کو دیکھ کر کہیں گے کہ اگر ہمیں دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم ان سے اسی طرح بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں جس طرح آج یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں۔

اسی طرح سورۂ قصص میں فرماتا ہے کہ معبود ان باطلہ کہیں گے تَبَرَّاْنَاۤ اِلَيْكَ ؗ مَا كَانُوْۤا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ (القصص: ۶۴) یعنی اے خدا ہم تیرے سامنے اپنی برات کا اظہار کرتے ہیں یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ اپنے نفسوں کی

عبادت کیا کرتے تھے۔

غرض اس آیت میں ضمائر دونوں طرف جاسکتی ہیں۔ یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ مشرک اپنی عبادت کا انکار کریں گے اور اپنے معبودوں کے خلاف کھڑے ہوجائیں گے اور ان کا انکار کریں گے جیسا کہ سورۂ اعراف میں آتا ہے کہ جب فرشتے مشرکوں کی جان نکالتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں کہ ماسوی اللہ معبود اب کہاں ہیں تو وہ کہتے ہیں ضَلُّوْا عَنَّا (الاعراف:۳۸) وہ تو کہیں بھاگ گئے ہیں آج ہمیں نظر نہیں آتے۔

اسی طرح یہ معنے بھی ہوسکتے ہیں کہ معبودان باطلہ ان لوگوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور مشرکوں کے خلاف گواہی دیں گے جیسا کہ سورۂ قصص ہی کی آیت اوپر لکھی جاچکی ہے۔

اسی طرح معبودوں کے متعلق قرآن کریم میں ایک اور جگہ آتا ہے کہ وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ (النحل:۸۷) یعنی جب وہ مشرک لوگ جو شرک کیا کرتے تھے اپنے معبودان باطلہ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ حضور! یہ ہیں وہ معبود جن کو ہم تیرے سوا پوجا کرتے تھے۔ انہوں نے ہم کو خراب کیا ہے۔ وہ معبود کہیں گے کہ یہ خبیث بالکل جھوٹ بولتے ہیں ہم نے انہیں خراب نہیں کیا۔ یہ آپ اپنی اغراض کے لئے شرک کرتے رہے ہیں۔ گویا وہی معبود جن کو آج عزت کا موجب سمجھا جاتا ہے اس دن ان کے لئے ذلت کا موجب ہوجائیں گے۔

اسی طرح سورۂ انعام میں آتا ہے

وَ يَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ۔ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (الانعام:۲۳، ۲۴) یعنی اس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے اور پھر ہم مشرکوں سے کہیں گے کہ کہاں ہیں تمہارے معبود جن کے متعلق تم کہا کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شریک ہیں اس پر سوائے اس کے ان کا اور کوئی جواب نہیں ہوگا کہ حضور ہم ان خبیثوں کو کیا جانتے ہیں ہم نے تو کبھی شرک نہیں کیا۔

اسی طرح سورۂ یونس میں آتا ہے۔ وَ قَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (یونس:۲۹)

یعنی اس روز معبودان باطلہ ان سے کہیں گے کہ تم نے تو ہماری کبھی پرستش نہیں کی۔

سورۂ روم میں بھی مشرکوں کے متعلق آتا ہے کہ وَ كَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ (الروم:۱۴) مشرک اپنے معبودان باطلہ کا انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نے ان کو کبھی اپنا خدا نہیں مانا۔

وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا میں اوپر بتاچکا ہوں کہ ضد کے ایک معنے معاون کے بھی ہیں۔ پس اس آیت کے معنے

یہ ہوں گے کہ وہ معبود اس دن مشرکوں کے خلاف خدا تعالیٰ کے معاون ہوجائیں گے یا اس دن مشرک اپنے معبودوں کے خلاف خدا تعالیٰ کے معاون ہوجائیں گے۔یعنی اس دن معبودان باطلہ اور مشرک جہاں ایک دوسرے کے مخالف ہوجائیں گے وہاں وہ دونوں سچائی اور راستی کے معاون بھی ہوجائیں گے۔مشرک کہیں گے کہ ہم معبودوں کی عبادت نہیں کرتے اور معبود کہیں گے کہ مشرک ہماری عبادت نہیں کرتے تھے۔

اس جگہ ایک اور امر بھی یاد رکھنا چاہیے اور وہ یہ کہ یَکُوْنُوْنَ عَلَیْھِمْ ضِدًّا میں ضد کا لفظ جمع ہونا چاہیے تھا مگر آیا مفرد ہے۔اس میں حکمت یہ ہے کہ مفرد کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کے کمال اتحاد کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ گو وہ مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے والے ہوں گے مگر اس معاملہ میں ان کا اختلاف بالکل ختم ہوجائے گا اور وہ یک زبان ہوکر کہیں گے کہ ہمارا ان معبودان باطلہ سے کوئی تعلق نہیں۔اور معبودان باطلہ بھی یک زبان ہوکر کہیں گے کہ ہماران مشرکوں سے کوئی تعلق نہیں۔یعنی اس دن اس قسم کی حالت ہوگی کہ اس دن کی سختی کو دیکھ کر اور اس دن کی مایوسی کو دیکھ کر اور اس دن کے خطرات کو دیکھ کر مشرک بھی فرد واحد کی طرح یک زبان ہوکر کہیں گے کہ ہم ان معبودان باطلہ سے بیزار ہیں اور معبودان باطلہ بھی یک زبان ہوکر فرد واحد کی طرح کہیں گے کہ ہم ان مشرکوں سے بیزار ہیں۔گویا اس امر کے اظہار کے لئے کہ باوجود لاکھوں اور کروڑوں ہونے کے وہ فرد واحد کی طرح متفقہ طور پر غیر اللہ کی عبادت کا انکار کریں گے۔جمع کی بجائے مفرد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مشرک بھی انکار کر کے اپنی جان بچانا چاہیں گے اور معبودان باطلہ بھی انکار کر کے اپنی جان بچانا چاہیں گے (املاء مامن بہ الرحمٰن زیر آیت ھذا) یہ عربی زبان کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس تھوڑے سے فرق سے کہ جمع کی جگہ مفرد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ایک وسیع مضمون اللہ تعالیٰ نے اس جگہ بیان کر دیا ہے اور نہ صرف یہ بتایا ہے کہ یہ بت جن کو وہ اپنے لئے عزت کا موجب سمجھ رہے ہیں ان کے لئے ذلت کا موجب ہوں گے بلکہ اس میں ان کی بے بسی بھی بیان کردی گئی ہے۔خطرہ کی سختی بھی بیان کردی گئی ہے اور یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ خطرہ اس وقت اتنا قریب پہنچ چکا ہوگا کہ انہیں سوچنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوگی معبودان باطلہ کے دماغ بھی ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے اور مشرکوں کے دماغ بھی ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے اور وہ بغیر سوچنے اور غور کرنے کے اور بغیر کسی قسم کا مشورہ کرنے کے یک زبان ہوکر ان کی عبادت سے انکار کردیں گے اور سمجھیں گے کہ یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر ہم بچ سکتے ہیں۔

غرض بتایا کہ اس وقت خطرہ سخت ہوگا بے بسی انتہاء درجہ کی ہوگی اور مشرک بھی اور معبودان باطلہ بھی سوائے

اس نتیجہ کے اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچیں گے کہ وہ غیر اللہ کی پرستش کا انکار کر دیں۔ وہ اس وقت تعداد کے لحاظ سے لاکھوں اور کروڑوں ہوں گے۔ مگر نتیجہ پر پہنچنے کے لحاظ سے فرد واحد کی حیثیت اختیار کر لیں گے اور یک زبان ہو کر مشرک معبودوں کی اور معبود مشرکوں کی تردید کریں گے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثر معبود تو بے جان ہوتے ہیں پھر وہ کیسے بات کریں گے اس کے تین جواب ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ کچھ معبود جو جاندار ہیں۔ جیسے ملائکہ اور مسیحؑ وغیرہ وہ ایسا کریں گے بے جانوں کی طرف سے خود ہی جواب آ جائے گا۔

(۲) دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ کبھی کبھی روحانی دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے جان چیزیں بھی متمثل ہو کر جواب دے دیتی ہیں۔ چنانچہ خوابوں اور کشوف میں کثرت کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ درخت بولنے لگ جاتے ہیں۔ بعض دفعہ مکان بولنے لگ جاتے ہیں بعض دفعہ دیوار بولنے لگ جاتی ہے اور انسان ان کے کلام سے ویسا ہی اثر قبول کرتا ہے جیسے زندہ اور جاندار چیزوں کے کلام سے اثر قبول کرتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک دفعہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مکان مجھے کہتا تھا کہ یہاں سے جلدی نکلو میں گرنے والا ہوں۔ پس اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ بے جان بت کس طرح کلام کریں گے۔ وہ بے شک بے جان ہیں مگر اس وقت متمثل ہو کر اُنہیں ذلیل کرنے کے لئے یہ جواب دیں گے۔ اور چونکہ اس وقت روحانیت تیز ہو جائے گی وہ سمجھ جائیں گے کہ حقیقت یہی ہے۔

(۳) تیسرا جواب اس کا یہ ہے کہ بت درحقیقت پرانے بزرگوں یا ملائکہ کے تمثیلی وجود ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ بت اصل میں پتھر نہیں بلکہ یہ قوم کے بزرگوں کی ایک تمثیل اور نقل ہیں (بخاری کتاب التفسیر سورۃ نوح باب ودا و لا سواعا و لا یغوث و یعوق)۔ جیسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قوم نے عزت کی تو ان کا ایک بت بنا لیا۔ یا فرشتوں کی عزت کی تو ان کے نام پر بت بنا لئے۔ پس چونکہ یہ بت ایک تمثیلی وجود ہیں۔ اس لئے جن کی وہ تمثیل ہیں وہ جواب دیں گے اور وہی جواب بتوں کا سمجھا جائے گا۔ اور چونکہ اصل معبود وہی ہیں اس لئے انہی کا جواب حقیقی جواب ہوگا۔ مثلاً جس فرشتے کا بت بنا کر پوجا جاتا ہے وہ فرشتہ کھڑا ہوگا اور سب کے سامنے انہیں ذلیل کرے گا یا حضرت اسماعیل علیہ السلام جن کا بت بنا کر اس کی پرستش کی جاتی تھی کہیں گے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں میں تو آپ خدا تعالیٰ کو ماننے والا اور اس کی پرستش کرنے والا تھا۔ پس باوجود اس کے کہ بتوں کی

اکثریت بے جان ہے یعنی لوگ یا تو پتھروں کو پوجتے ہیں۔ یا درختوں کو پوجتے ہیں یا دریاؤں کو پوجتے ہیں۔ چونکہ وہ ان بتوں کو بعض پرانے بزرگوں یا ملائکہ وغیرہ کا قائم مقام سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بت فلاں دیوتا کا قائم مقام ہے۔ یہ بت فلاں فرشتہ کی تمثیل ہے یہ بت فلاں بزرگ کا مجسمہ ہے۔ اس لئے وہی فرشتہ اور بزرگ ان کے سامنے آئیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو خدا تعالیٰ کے عبادت گذار تھے۔ مگر تم نے ہماری ہی پرستش شروع کردی۔ ہم تمہارے اس فعل سے بیزار ہیں اور تمہیں کسی قسم کی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھتے اور چونکہ اصل معبود وہی ہیں اس لئے ان کے جواب میں سب کے سب بت بھی شریک ہو جائیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۴﴾

کیا تجھے معلوم نہیں کہ ہم نے شیطانوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ وہ کافروں کو اکساتے رہیں۔

حلّ لُغَات۔ اَزٌّ کے اصل معنے ہنڈیا کے ابال کے ہوتے ہیں لیکن عام طور یہ کسی کو جوش دلانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پس تَؤُزُّهُمْ اَزًّا کے معنے یہ ہیں کہ وہ ان کو خوب جوش دلاتے ہیں ھَزٌّ کے معنے بھی ہلانے اور جوش دلانے کے ہوتے ہیں لیکن اَزٌّ کا لفظ ھَزٌّ سے معنوں میں زیادہ قوی ہوتا ہے۔ (مفردات)

اَرْسَلَ کے معنے عام طور پر بھیجنے کے ہوتے ہیں لیکن اس کے ایک معنے علاوہ بھیجنے کے خَلّٰی کے بھی ہوتے ہیں یعنی اس کو چھوڑ دیا اور اس کے ارادوں میں مزاحم نہ ہوا چنانچہ عربی میں کہتے ہیں اَرْسَلْتُ الْبَعِيْرَ اور اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ خَلَّيْتُهٗ (قرطبی) یعنی جب اونٹ کے رسے کھول دیئے جائیں اور اسے آزادانہ طور پر بلا روک ٹوک پھرنے دیا جائے تو کہتے ہیں اَرْسَلْتُ الْبَعِيْرَ اور مراد یہ ہوتی ہے کہ خَلَّيْتُهٗ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ ہمارا اصل کام تو یہ ہوتا ہے کہ ہم شیطانوں سے اپنے بندوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ہی اللہ تعالیٰ ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے کہ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الحجر: ۴۳) ہم نے اپنے بندوں پر شیطان کے لئے غلبہ مقدر نہیں کیا لیکن یہ قسم کفار کی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں ہم اپنی حفاظت واپس لے لیتے ہیں اور شیطانوں کو ان پر حملہ کرنے کے لئے کھلا چھوڑ دیتے ہیں کہ اب تمہارا جو جی چاہے کرو ہم تمہارے معاملات میں کوئی دخل دینے کے لئے تیار نہیں۔ گویا اَرْسَلَ کے یہ معنے نہیں کہ ہم ان پر حملہ کرنے کے لئے شیطانوں کو بھیجتے ہیں یا خود انہیں کفار کے پیچھے لگا دیتے

ہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ پہلے تو ہم شیطانوں کو باندھے رکھتے ہیں یا جب وہ حملہ کرتے ہیں تو ہم ان کے اور اپنے بندوں کے درمیان کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن یہ قسم کفار کی ایسی ہے کہ جب شیطان حملہ کرتے ہیں تو ہم انہیں کہتے ہیں کہ جو کچھ تمہاری مرضی ہے کرو اور ہم ان دونوں کے درمیان سے اپنے وجود کو نکال لیتے ہیں کیونکہ دونوں میں ایسی موانست ہو جاتی ہے کہ وہ شوق سے ایک دوسرے کی طرف بھاگتے ہیں۔

غرض اس جگہ اَرْسَلَ کے یہ معنے نہیں کہ ہم انہیں حملہ کرنے کے لئے بھیجتے ہیں بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ پہلے تو ہم انہیں باندھے رکھتے ہیں یا اگر وہ حملہ کرتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ ہم ان دونوں کے درمیان آنے سے رک جاتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں ایسا اتحاد ہو جاتا ہے اور اس قسم کی محبت باہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ انتہائی شوق سے ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے کے لئے دوڑتے ہیں اس لئے ہم ان کے معاملات میں دخل دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

تو تَؤُزُّهُمْ اَزًّا کے تین معنے ہیں:

اول یہ کہ وہ ان کو معاصی کی طرف رغبت دلاتے ہیں۔ کیونکہ بہرحال جب شیطان کسی کو اکسائے گا تو ایسے ہی کاموں پر اکسائے گا جو اس کی طبیعت کے مطابق ہوں اور چونکہ شیطان کا معاصی سے ہی تعلق ہے اس لئے شیطان کا کسی کو اکسانا یہی معنے رکھتا ہے کہ وہ اسے معاصی کی رغبت دلائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ استاد لڑکے کو بہت اکساتا ہے تو فوری طور پر انسانی ذہن اسی طرف جائے گا کہ وہ لڑکے کو تعلیم کی ترغیب دیتا ہے اور اسے بار بار اس طرف متوجہ کرتا ہے۔ یا اگر کہا جائے کہ کرکٹ کا کپتان بہت اکساتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ لڑکوں کو کرکٹ کھیلنے کی ترغیب دیتا ہے شیطان چونکہ شیطانی کاموں پر ہی اکسا سکتے ہیں اس لئے تَؤُزُّهُمْ اَزًّا کے ایک معنے یہ ہوں گے کہ وہ ان کو معاصی کی ترغیب دلاتے ہیں۔

دوسرے معنے یہ ہوں گے کہ وہ ان کو اتنا اکساتے جاتے ہیں کہ آخر وہ جہنم میں جا گرتے ہیں یعنی وہ انہیں معاصی کی رغبت دلاتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ قدم بڑھاتے بڑھاتے وہ جہنم میں جا گرتے ہیں۔

تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ وہ ان کو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر حملہ کرنے کے لئے جوش دلاتے ہیں کیونکہ شیطان اپنے مدمقابل کے خلاف ہی انہیں اکسا سکتا ہے۔ اور اس کا اصل مقابلہ اسلام اور مسلمانوں سے ہی ہے شیطان چونکہ براہ راست حملہ نہیں کر سکتا اس لئے وہ اپنے ساتھیوں کو ابھارتا اور انہیں اکساتا ہے کہ اٹھو اور مسلمانوں پر حملہ کرو۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۵﴾

پس تو ان کے خلاف جلدی میں کوئی قدم نہ اٹھا ہم نے ان کی تباہی کے دن گن رکھے ہیں۔

تفسیر ۔فرماتا ہے جب حالات یہ ہیں تو تم کو کیا ضرورت ہے کہ تم ان کی سزا کے متعلق سکیمیں سوچو اور ان کے خلاف مختلف قسم کی تدابیر عمل میں لاؤ۔ ہماری ہدایت تمہیں یہی ہے کہ لَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ تم ان کے خلاف اپنے ارادوں میں یا ان کے خلاف اپنے حملوں میں یا ان کے خلاف اپنی تدبیروں میں یا ان کے خلاف اپنی دعاؤں میں ہرگز جلدی نہ کرو اور چونکہ اس جگہ کسی خاص بات کی تعیین نہیں کی گئی ۔اس لئے جتنی باتیں دوسروں کے خلاف کی جاسکتی ہیں وہ ساری کی ساری اس جگہ مراد ہوسکتی ہیں ۔اس جگہ تدبیریں بھی مراد ہوسکتی ہیں خیالات بھی مراد ہوسکتے ہیں غم وغصہ اور رنج کے جذبات بھی مراد ہوسکتے ہیں۔ دعائیں بھی مراد ہوسکتی ہیں ان سب باتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ تم کسی قسم کی تدبیر میں بھی ان کے خلاف جلد بازی مت کرو۔ کیوں؟ اس لئے کہ پہلی آیت بتا رہی ہے کہ خدا نے ان پر شیطانوں کو چھوڑا ہوا ہے۔ خدا میں طاقت تھی کہ جب وہ حملہ آور ہوتے تو اپنے بندوں کو ان کے حملہ سے بچا لیتا۔ خدا میں طاقت تھی کہ وہ ان کے حملوں کو ناکام کر دیتا مگر وہ خدا جس کی عادت میں یہ بات داخل ہے کہ جب شیطان حملہ کرنے کے لئے آتا ہے تو وہ اس حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے شیطان اور بندہ کے درمیان آکر کھڑا ہوتا ہے جب اس نے اپنے آپ کو درمیان سے نکال لیا ہے تو معلوم ہوا کہ اس میں کوئی خدائی حکمت ہے۔ اور جب خدائی حکمت ایک اور بات کا تقاضا کرتی ہے تو مومن کی شان کے خلاف ہے کہ وہ اسی چیز کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہو جائے جسے خدائی مشیت کے ماتحت ڈھیل دی جارہی ہے ۔مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دشمنانِ اسلام کے خلاف کسی قسم کی تدبیریں کرنا جائز نہیں ۔ یہ مطلب بھی نہیں کہ سچائی سے عناد رکھنے والوں کے خلاف کسی قسم کے جذبات غیرت جوش میں نہیں آنے چاہئیں ۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اگر کوئی جماعت اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہی ہو تو تم اس کی کوششوں کو باطل کرنے کے لئے کوئی جائز تدبیر نہ کرو۔ بلکہ صرف اس چیز کا مقابلہ کرنے سے روکا ہے جس کا ذکر پہلی آیت میں آچکا ہے۔

اَلَمْ تَرَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ حالات ظاہر ہیں اور اگر تم غور کرو تو تم سمجھ سکتے ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ الٰہی مشیت کے ماتحت ہو رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بات ایسی ہو کہ ہمیں یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ اس کے متعلق خدائی تدبیر کیا ہے یا وہ کوئی ایسا واقعہ ہو جو قانون قدرت کے عام قوانین کے ماتحت ہے تو اس وقت ہمیں

اجازت ہے کہ ہم دشمن کے حملوں کا دفاع کریں۔ہمیں اجازت ہے کہ ہم اس کے خلاف جائز اور مطابق قانون تدابیر اختیار کریں لیکن جب نظر آ جائے کہ خدا اپنی عام سنت کے خلاف ایک کام کر رہا ہے تو اس وقت یہی حکم ہوتا ہے کہ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ۔اس وقت بد دعا کرنا بھی منع ہوتا ہے۔اس وقت تدبیریں کرنا بھی منع ہوتا ہے۔اس وقت صرف اتنا ہی حکم ہوتا ہے کہ دشمن کے حملوں کو برداشت کرو اور صبر سے کام لو۔

حقیقت یہ ہے کہ دشمن جب شرارت میں حد سے بڑھ جاتا ہے تو مومن گھبرا جاتے ہیں اور کبھی گھبرا کر اظہار غیرت کرتے ہیں کبھی نبی یا اس کے خلفاء سے کہتے ہیں کہ دشمن کی تباہی کی دعا مانگو کبھی جہاد کا فتویٰ دیتے ہیں۔لیکن بسا اوقات ان کی تباہی ایک سکیم کے ساتھ مقدر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ تسلی دیتا ہے کہ جلدی نہ کرو وقت پر سب کام ہو جائے گا اور ان کی سزا خدا تعالیٰ کی طرف سے آ جائے گی۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا تمہاری یہ حالت ہے کہ تم سو بھی جاتے ہو۔تم دشمن سے غافل بھی ہو جاتے ہو لیکن ہمیں تو ان کی یہ باتیں اتنی بری لگ رہی ہیں کہ ہم خود ان کی تباہی کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔جب ہماری حالت یہ ہے کہ ہم خود ان کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔کہ کب وقت آئے اور ہم ان کی گردن مروڑ کر رکھ دیں تو تم کیوں جلدی کرتے ہو۔تم میں تو طاقت ہی نہیں کہ ان کا مقابلہ کر سکو۔

دیکھو اس جگہ جہاد کے متعلق کیسی واضح اور اہم ہدایت دی گئی ہے اور کس طرح اس عظیم الشان نظریہ کی تائید کی گئی ہے جو بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موجود زمانہ میں جہاد کے متعلق پیش فرمایا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جب مسلمانوں کا ایک حصہ یہ کہے گا کہ اسلام کی ترقی اب اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ان کفار سے جہاد کیا جائے اور انہیں تلوار کے زور سے مٹانے کی کوشش کی جائے۔مگر ان کی یہ رائے بالکل غلط ہوگی۔صحیح اور درست راستہ یہی ہوگا کہ ان کے مقابلہ میں جلد بازی سے کام نہ لیا جائے اور ان کے حملوں کو صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے اور صرف روحانی تدابیر اختیار کی جائیں یعنی تبلیغ اسلام اور دعائیں وغیرہ۔چنانچہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام جو خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے تھے انہوں نے لوگوں کے سامنے یہی اعلان فرمایا کہ ؎

یہ حکم سن کے بھی جو لڑائی کو جائے گا
وہ کافروں سے سخت ہزیمت اٹھائے گا

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۷۸)

آپ نے فرمایا کہ جب مسلمانوں کے پاس کسی قسم کی طاقت ہی نہیں تو ان پر جہاد بالسیف کس طرح فرض ہوسکتا ہے۔ جب وہ وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ جس رنگ میں چاہے گا مسلمانوں کو ان کے مقابلہ کی طاقت عطا فرما دے گا۔ بہر حال آپ نے جہاد کے متعلق مسلمانوں کے رائج الوقت خیالات کی تردید فرمائی اور یہی وہ حقیقت ہے جو لَا تَعْجَلْ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس سورۃ میں مسیحیوں کی جن ترقیات کا ذکر کیا گیا ہے وہ آئندہ زمانہ میں ہونے والی تھیں بلکہ حدیثوں اور قرآن میں انہیں آخری زمانہ کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے پس لَا تَعْجَلْ سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود نہیں بلکہ آئندہ زمانہ کا مسلمان مراد ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ایک وقت مسیحیوں کی ترقی کو دیکھ کر ان سے جہاد کرنے کے شوق میں مبتلا ہو جائے گا چنانچہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ جس زمانہ میں مسیحیت مسلمانوں کا شکار تھی اور ان کو اس سے مقابلہ کرنے کی طاقت تھی اس وقت تک تو مسلمان ان کی طرف سے غافل رہے اور جب مسیحیت دنیا میں پھیل گئی تو انہیں جہاد کا خیال آیا حالانکہ اس وقت خدا کی مشیت نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا والی ظاہر ہو چکی تھی اور اس علم کے بعد مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ سابق غفلت پر استغفار کرتے اور آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے مجملاً دعا کرتے کہ ان کے فتنہ سے مسلمانوں کو بچائے اور جہاد بالقرآن شروع کر دیتے تا کہ سابق غفلت کا ازالہ ہو جاتا اور قرآن کریم کی برکت سے مسیحیت کی طاقت ٹوٹ جاتی مگر انہوں نے جہاد بالسیف کا بے موقع اظہار کر کے مسیحیوں کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کا موقع دیا اور اس سے متاثر ہو کر ہزاروں مسلمان مسیحی ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔ حضرت مسیح موعودؑ ایک ہی شخص تھے جنہوں نے اس نقص کی طرف توجہ دلائی۔ مگر اس وجہ سے ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے اور کہا گیا کہ یہ شخص اسلامی ترقی کا دشمن ہے (اشاعۃ السنۃ النبویۃ جلد ۱۳ نمبر ۴ تا ۱۲ ۱۸۹۰ء صفحہ ۵ تا ۱۴۸)۔ حالانکہ اسلامی ترقی کا واحد ذریعہ اس زمانہ میں اسلام کی صحیح تعلیم کی اشاعت تھا تا کہ خود مسیحیوں میں سے ایک حصہ کو جیتا جائے اور باقی حصہ کے دل سے غلط فہمیاں دور کی جائیں مگر افسوس کہ اس خدمت کی وجہ سے آپ کو اتنی گالیاں مسلمانوں نے دیں کہ شاید کسی مامور کو اتنی کثرت سے اور اس مقدار میں گالیاں نہ ملی ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنی گالیاں اس زمانہ کے علماء نے ایک ایک دن اور ایک ایک جلسہ میں بانیٔ سلسلہ احمدیہ کو دی ہیں اس قدر گالیاں سابق ماموروں کو شاید دس دس سال میں بھی نہ ملی ہوں گی۔ بلکہ گذشتہ زمانہ کے علماء کی زبان پر ایسا گند کبھی آیا ہی نہ ہوگا۔ اس ظلم کا بدلہ قیامت کے دن ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے لیں گے۔ وہ خود ان ظالموں پر اپنی ناراضگی کا اظہار کریں گے اور ہمارے دلوں پر تسکین کا مرہم رکھیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ کے یہ معنے نہیں کہ ان کے خلاف کسی قسم کی دعا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ مومنوں کو گھبرانا نہیں چاہیے اور مایوس نہیں ہونا چاہیے ورنہ بعض قسم کی دعائیں ایسی ہیں جو اصولی رنگ میں جائز ہیں ۔مثلاً یوں کہنا کہ اللہ تعالیٰ عیسائیوں کی طاقت کو توڑ دے بالکل جائز ہوگا جیسے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی دعا کی اور فرمایا کہ ؎

يَارَبِّ سَحِّقْهُمْ كَسَحْقِكَ طَاغِيًا
وَ اَنْزِلْ بِسَاحَتِهِمْ بِهَدْمِ مَكَانِهِمْ

(نور الحق حصہ اول، روحانی خزائن جلد ۸ صفحہ ۱۲۶)

مگر یہ اصولی دعا ہے ان کے کسی خاص فعل کے متعلق نہیں کہ چونکہ انہوں نے فلاں حملہ کیا ہے اس لئے انہیں تباہ کیا جائے ۔محض اصولی رنگ میں خدا تعالیٰ سے اس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ عیسائیوں کی طاقت کو توڑ دے۔ اس رنگ میں عیسائیت کے خلاف دعائیں بھی کی جا سکتی ہیں مگر ان کے کسی خاص فعل پر بد دعا کرنا جائز نہیں ہوگا۔

بہر حال فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ میں جہاد کے مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ہم نے ان کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہوا ہے اور ہم ان کی ہلاکت کی گھڑیاں گن رہے ہیں جب وہ وقت آئے گا تو ہم خود پکڑ لیں گے تم ان کے مقابلہ میں کیا کر سکتے ہو تم سے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا جو کچھ کرنا ہے ہم نے ہی کرنا ہے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۶﴾

جس دن ہم متقیوں کو زندہ کر کے (خدائے) رحمٰن کے حضور میں اکٹھا کر کے لے جائیں گے۔

حلّ لُغَات۔ وَفْدٌ کی تشریح کرتے ہوئے مفردات والے لکھتے ہیں کہ هُمُ الَّذِيْنَ يَقْدَمُوْنَ عَلَى الْمُلُوْكِ مُسْتَنْجِزِيْنَ الْحَوَائِجَ یعنی وفد سے وہ لوگ مراد ہوا کرتے ہیں جو بادشاہوں کے پاس اس غرض کے لئے جاتے ہیں کہ اپنی حوائج اور ضروریات ان سے پوری کروائیں۔

تفسیر۔ جہاں تک اگلے جہان کا سوال ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ آیت بھی اور اس سے اگلی آیات بھی اگلے جہان پر چسپاں ہو جاتی ہیں اور اس صورت میں ہم اس آیت کے یہ معنے لے لیں گے کہ قیامت کے دن سب مومن خدا تعالیٰ کے سامنے اجتماعی طور پر پیش ہوں گے لیکن سوال یہ ہے کہ اس جگہ ان دنیوی ترقیات کا ذکر ہے جو

عیسائیوں نے حاصل کیں اور دنیوی ترقیات کے متعلق ایک مومن کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ جب یہ لوگ مرجائیں گے تو انہیں اگلے جہان میں عذاب دیا جائے گا بلکہ اس کے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو میرے سامنے ذلیل کرے اور اسلام کو فتح عطا فرمائے بیشک وہ معنے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے لیکن جب ساری سورۃ میں عیسائیوں کے دنیوی عروج اور ان کی شان وشوکت کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کے بعد یہ بات کتنی پھسپھسی نظر آتی ہے کہ الٰہی ان کا قیامت کے دن بیڑہ غرق ہو۔ اگر ان کا اگلے جہان میں ہی بیڑہ غرق ہونا ہے تو دنیا ہماری اس بات کو کس طرح مانے گی۔ وہ تو یہی کہتی رہے گی کہ انہوں نے بڑے مزے اٹھائے ہیں۔ پس لازماً ہمیں اس کے ایسے معنے کرنے پڑیں گے جو اس دنیا پر بھی چسپاں ہو سکیں لیکن چونکہ الفاظ ایسے ہیں جو اگلے جہان پر بھی چسپاں ہو جاتے ہیں اس لئے ہم یہ معنے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس دن مومن خدا تعالیٰ کے حضور اجتماعی طور پر حاضر ہوں گے اور انعام واکرام سے نوازے جائیں گے لیکن پہلے ہمیں اسی دنیا پر اس آیت کو چسپاں کرنا پڑے گا اور جب ہم اس آیت کو دنیا پر چسپاں کریں تو يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کے سوائے اس کے اور کوئی معنے نہیں ہو سکتے کہ جب ہمارے فیصلہ کا وقت آئے گا تو اس وقت ہم خود مومنوں کے دلوں میں القاء کریں گے کہ اب ان کی ہلاکت کے لئے اجتماعی طور پر دعائیں مانگو۔ ہم روزانہ نمازیں پڑھتے ہیں جن میں تمام مومن اکٹھے ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور حاضر ہو جاتے ہیں یہی حشر ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس دن ہم سب مسلمانوں کو خدائے رحمٰن کی طرف اکٹھا کر کے لے جائیں گے یعنی اس دن ان کے دلوں میں ہم ایک آگ لگا دیں گے اور انہیں کہیں گے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔ آؤ اور ہم سے دعائیں مانگو تا کہ ہم اس قوم کے خلاف اپنے فیصلہ کو نافذ کر دیں۔

وَفْدٌ کا لفظ عربی زبان میں اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی جماعت کسی بادشاہ کے سامنے اپنی حاجات لے کر پیش ہو اور نماز میں روزانہ پانچ وقت مسلمان اجتماعی طور اپنی اغراض لے کر خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں گویا وفد کے اندر جتنی باتیں ضروری ہوتی ہیں وہ مسلمانوں کی نماز میں پائی جاتی ہیں وفد کا لفظ چاہتا ہے کہ جماعت ہو۔ وفد کا لفظ چاہتا ہے کہ اس جماعت کی کوئی غرض ہو اور پھر وفد کا لفظ اس بات کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ وفد میں شامل ہونے والوں کا اچھا لباس ہو۔ کیونکہ انہوں نے بادشاہ کے دربار میں پیش ہونا ہوتا ہے اور یہ ساری باتیں نماز میں پائی جاتی ہیں نماز جماعت کے ساتھ ہوتی ہے نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی حاجات پیش کی جاتی ہیں اور پھر نماز کے متعلق یہ بھی حکم ہے کہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر نماز پڑھنی چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ

خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۲) اے بنی نوع انسان ہر نماز کے وقت زینت کا خیال رکھا کرو اسی لئے شریعت نے حکم دیا ہے کہ نماز سے پہلے وضو کیا جائے صاف ستھرے کپڑے پہنے جائیں۔ کوئی بودار چیز نہ کھائی جائے۔ پھر جب نماز میں انسان کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پس وفد کے طور پر پیش ہونے کی بہترین صورت نماز ہے۔ اور آیت کے یہ معنے ہیں کہ اس دن ہم مومنوں کے دلوں میں خود تحریک پیدا کریں گے کہ ان کی تباہی کے لئے ہم سے دعائیں کرو۔

اگر اس آیت کو مرنے کے بعد کی زندگی پر چسپاں کیا جائے تو يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعث بعد الموت دو قسم کی ہے ایک بعثت فردی اور ایک بعثت اجتماعی۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو مرنے کے بعد ایک زندگی ملتی ہے مگر وہ فردی زندگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ قرآن کریم سے بھی ثابت ہے اور حدیثوں میں بھی اس کی تفصیل آتی ہے ایک ایسی بعثت ہوگی جس میں تمام کے تمام انسان اللہ تعالیٰ کے حضور اکٹھے کئے جائیں گے۔ اور وہ بعثت اجتماعی اس بعثت فردی سے کچھ فرق رکھتی ہوگی (ترمذی ابواب صفۃ القیامۃ باب ما جاء فی شان الحشر)۔ وہ لوگ جنہوں نے پورا غور نہیں کیا ان کے دماغ مشوّش ہو جاتے ہیں کہ ادھر تو کہتے ہیں کہ موت کے معاً بعد ایک نئی زندگی شروع ہو جاتی ہے اور اُدھر کہتے ہیں کہ ایک دن ساری دنیا اکٹھی ہوگی ان دونوں باتوں کا آپس میں جوڑ کیا ہوا؟ یہ اعتراض اسی لئے پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ بعثتیں دو قسم کی ہیں ایک بعثت وہ ہے جو موت کے معاً بعد شروع ہو جاتی ہے اور جس میں انسان اگلے جہان کے انعامات یا عذاب محسوس کرنے کے لئے نئی طاقتیں حاصل کرتا ہے۔ مگر اس کی یہ حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی کی طفولیت یا بچپن کا زمانہ ہوتا ہے اس کے بعد جب سارے انسانوں کو مجموعی طور پر ایسی طاقت حاصل ہو جائے گی کہ وہ وہاں کے ثواب اور عذاب کو کامل طور پر محسوس کر سکیں اور ان کی حالت ایک جوان بالغ مرد کی سی ہو جائے گی جو دنیا کی نعمتوں سے پوری طرح حظ اٹھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس وقت تمام انسانوں کا حشر ہوگا جس میں مومن بھی شامل ہوں گے اور کافر بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں آل فرعون کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۟ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (المومن: ۴۷) یعنی آل فرعون پر صبح اور شام آگ پیش کی جاتی ہے لیکن جب قیامت کا دن آئے گا تو ہماری طرف سے حکم دیا جائے گا کہ آل فرعون کو اس سے بھی زیادہ شدید عذاب میں داخل کر دو۔ اسی طرح حدیثوں میں آتا ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگوں کو دوزخ پر سے گذرنا پڑے گا جہاں ایک پل بچھایا جائے گا جو تلوار سے زیادہ

تیز اور بال سے زیادہ باریک ہوگا بعض لوگ تو اس پر سے بجلی کی طرح گذر جائیں گے۔ بعض ہوا کی سی تیزی اختیار کریں گے اور گذر جائیں گے بعض پرندوں کی طرح اڑتے ہوئے گذر جائیں گے بعض گھوڑوں کی طرح دوڑتے ہوئے گذر جائیں گے بعض گھسٹتے ہوئے لولوں لنگڑوں کی طرح گزر جائیں گے اور کافر اور منافق کٹ کر نیچے گریں گے اور جہنم میں جا پڑیں گے (مستدرک کتاب التفسیر)۔ غرض ایک حشر اکٹھا ہوگا اور ایک انفرادی ہوگا یہ آیت اجتماعی حشر پر دلالت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ صرف انفرادی بعث ہی نہیں بلکہ ایک اجتماعی بعث بھی مقدر ہے۔

نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کے متعلق مفسرین نے بحث کی ہے کہ کیا وہ جنت کی طرف جائیں گے یا اللہ تعالیٰ کی طرف۔ بعض نے کہا ہے کہ جنت کی طرف اور چونکہ وہ خدا تعالیٰ کا گھر ہے اس لئے اِلَی الرَّحْمٰنِ کے الفاظ استعمال کر لئے گئے ہیں اور مراد یہ ہے کہ جو جنت کی طرف گئے وہ ایسے ہی ہیں۔ گویا وہ خدا تعالیٰ کی طرف گئے اور اس کی مثال میں وہ سورۂ صافات میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ وَ قَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (الصفت:۱۰۰) حضرت ابراہیم علیہ السلام کنعان کی طرف ہجرت کر کے جاتے ہیں مگر کہتے یہ ہیں کہ میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں کیونکہ وہ مقام خدا نے ان کے لئے چنا تھا جس طرح خدا تعالیٰ کے منتخب کردہ مقام کی طرف ہجرت کر کے جانے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا کہ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ اسی طرح ان کے جنت کی طرف جانے کو نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح حدیث بخاری میں آتا ہے کہ مَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُه اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (بخاری کتاب الایمان والنذور باب النیة فی الایمان) یعنی جس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہے وہ اللہ اور رسول کی طرف جاتا ہے حالانکہ درحقیقت وہ مدینہ کی طرف گیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی موعود مقام یا چنے ہوئے مقام کی طرف جانا بھی خدا کی طرف جانا کہلاتا ہے پس وہ کہتے ہیں کہ درحقیقت اس کے معنے جنت کی طرف جانے کے ہیں (تفسیر قرطبی زیر آیت ھذا و تفسیر بغوی)۔ مگر چونکہ وہ خدا کا گھر ہے اس لئے ان کا جنت کی طرف جانا گویا خدا کی طرف جانا ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں وہ خدا تعالیٰ کی طرف ہی جائیں گے بعض احادیث میں یہ آتا ہے کہ پہلے وہ خدا تعالیٰ کی طرف جائیں گے اور پھر جنت کی طرف (ترمذی کتاب صفة الجنة باب ما جاء فی خلو د اھل الجنة اھل النار)۔

یہ سب اختلاف اس وجہ سے ہے کہ خدا تعالیٰ کو مجسم مانا گیا ہے اور پھر اسے ایک مقام میں محدود کیا گیا ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر جگہ ہے۔ مدینہ کو ہجرت ہو تو وہ مدینہ میں ہے۔ حبشہ کو ہجرت ہو تو وہ حبشہ میں ہے اور خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے جہاں جائیں وہیں خدا تعالیٰ موجود ہوتا ہے بلکہ

کفار کے لئے بھی وہ ہر جگہ ہوتا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ (النور: ۴۰) یعنی کافروں کے اعمال سراب کی طرح ہوتے ہیں جیسے کسی وادی میں سراب نظر آئے تو پیاسا آدمی اسے پانی سمجھ لیتا ہے۔مگر جب وہ پانی سمجھ کر وہاں جاتا ہے تو اسے پانی نہیں ملتا لیکن اسے خدا نظر آجاتا ہے اور وہ اس سے سارا حساب لے لیتا ہے گویا اس کا تباہی اور بربادی کے مقام پر پہنچنا خدا کا ملنا قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح مومنوں کے متعلق آتا ہے کہ جہاں وہ جاتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نظر آجاتا ہے جیسے فرماتا ہے فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (البقرۃ:۱۱۶) جس طرف بھی تم اپنا منہ کرو وہیں تم اللہ تعالیٰ کو موجود پاؤ گے یا جیسے قرآن کریم میں ہی ہے ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:۱۱) وہ لوگ جو تیری بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بیعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے جو ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔اب وہ ہاتھ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا مگر اسے خدا نے اپنا ہاتھ قرار دے دیا۔اس میں بھی درحقیقت وہی مضمون بیان کیا گیا ہے کہ مومن جہاں جاتا ہے اسے خدا نظر آجاتا ہے۔اسی طرح کافر کو بھی خدا نظر آجاتا ہے مگر وہ اسے عذاب کی شکل میں نظر آتا ہے۔بہرحال اللہ تعالیٰ کا وجود کسی خاص جگہ میں محدود نہیں اور پھر وہ مجسم بھی نہیں قرآن کریم میں ہی آتا ہے کہ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (قٓ:۱۷) کہ ہم انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔پس وہ چیز جو ہمارا احاطہ کئے ہوئے ہے اور جو تجسم سے پاک ہے اور غیر محدود ہے۔اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی خاص جگہ پر بیٹھا ہوا ہوگا اور مومن گھوڑوں پر چڑھ کر اس کی ملاقات کے لئے جارہے ہوں گے بالکل نامعقول بات ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت علیؓ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے تو وفد سواری دیکھے ہیں یہ خدا تعالیٰ کی طرف جانے والے وفد کیسے ہوں گے۔یعنی جب بادشاہوں کی طرف ان کی ملاقات کے لئے وفد جاتے ہیں تو گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں نہایت اچھے اور قیمتی لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور بڑی شان کے ساتھ جاتے ہیں خدا تعالیٰ کی طرف جو لوگ وفد کی صورت میں جائیں گے وہ کس طرح جائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ جنت کے اونٹ ان کی سواری کے لئے لائے جائیں گے۔(قرطبی)

الثعلبی نے اسی روایت کو اس طرح نقل کیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کو مل کر مومن نکلیں گے تو ان کے لئے سواریاں لائی جائیں گی یعنی پہلے وہ سوار ہو کر نہیں جائیں گے بلکہ پیدل جائیں گے۔لیکن جب ملاقات کرکے

نکلیں گے تو انہیں سواریاں دی جائیں گی (قرطبی)۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یَآاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّکُمْ لَتُحْشَرُوْنَ اِلَی اللّٰہِ حُفَاۃً عُرَاۃً غُرْلًا (قرطبی بحوالہ بخاری کتاب الانبیاء باب قول اللہ تعالیٰ عزو جل واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا) کہ اے لوگو! تم کو جب خدا کے سامنے اٹھایا جائے گا تو تم ننگے ہو گے اپنے پاؤں سے بھی اور ننگے ہو گے جسم سے بھی اور بے ختنہ کے ہو گے اب جو بے ختنہ ننگے پاؤں اور ننگے بدن ہوں گے ان کے لئے گھوڑوں یا اونٹوں پر سوار ہو کر جانے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہر حال یہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ پیدل جائیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مومن جب خدا تعالیٰ کو مل کر نکلیں گے تو ان کے لئے سواریاں لائی جائیں گی وہ اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ جائیں گے ننگے اور پیدل اور آئیں گے سوار اور ملبوس۔

یہاں بھی وہی غلطی کی گئی ہے۔ یہ سب محاورے ہیں جن کو ظاہر پر محمول کیا گیا ہے۔ وہاں کے لباس اور روح کی سواریاں اس دنیا کی نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بعث کے معاً بعد ایک گھبراہٹ ہوگی۔ اس کے بعد فوراً مومن سنبھل جائیں گے اور اکرام اور اعزاز سے نوازے جائیں گے۔ اور حدیث شفاعت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لوگ سخت گھبرائے ہوئے ہوں گے مگر آہستہ آہستہ مومنوں کے دلوں میں ایک سکون اور اطمینان پیدا کر دیا جائے گا اور انہیں تسلی دی جائے گی (بخاری کتاب التفسیر سورۃ بنی اسرائیل باب قولہ تعالیٰ ذریۃ من حملنا مع نوح) اور خدا کے ملنے سے مراد اسی طرح ملنا ہے جس طرح ایک محدود شے غیر محدود سے مل سکتی ہے یہ نہیں کہ خدا عرش پر بیٹھا ہوا ہوگا اور مومن گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر اس سے ملنے کے لئے جائیں گے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مومن وہاں خدا تعالیٰ سے ملیں گے۔ مگر یہ ملاقاتیں اسی طرح کی ہوں گی جس طرح اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اسی دنیا میں اس سے ملاقات کیا کرتے ہیں صرف اس قدر فرق ہوگا کہ اگلے جہان میں چونکہ ہمارا مادی جسم نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ ملاقات زیادہ مکمل اور شاندار ہوگی یہ نہیں ہوگا کہ اگلے جہان میں خدا محدود ہو جائے۔ جب ہم جو محدود ہیں وہاں غیر محدود ہو جائیں گے تو خدا جو غیر محدود ہے اس کے متعلق یہ خیال کر لینا کہ وہ محدود ہو جائے گا یہ عقل کے بالکل خلاف ہے اگر ہم نے بھی وہاں ان جسمانی بندشوں سے آزاد ہو جانا ہے تو خدا تعالیٰ کو محدود سمجھ لینا عقل کے صریح خلاف ہے بے شک حُفَاۃً عُرَاۃً کے الفاظ ایسے ہیں جن سے بظاہر شبہ پڑتا ہے کہ شاید وہاں مومن اسی طرح ملاقات کے لئے جائیں گے جس طرح یہاں پیدل اور سوار بادشاہوں کی ملاقات کے لئے لوگ جایا کرتے ہیں۔ مگر یہ شبہ بھی درست نہیں۔ رات کو انسان سویا ہوا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ننگے پاؤں ہوتا ہے اور پھر کپڑے بھی اس نے

زیادہ ترا تارے ہوئے ہوتے ہیں مگر پھر بھی اسے خدا مل جاتا ہے۔

میں نے کئی دفعہ سنایا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک تحریر میں نے ایک دفعہ دیکھی جس میں یہ لکھا تھا کہ اے خدا! لوگ کہتے ہیں کہ میں تجھے چھوڑ دوں مگر میں تجھے کس طرح چھوڑ دوں جب ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے جب میرے دوست اور رشتہ دار مجھ سے علیحدہ ہوجاتے ہیں بلکہ میرا نفس بھی مجھے چھوڑ کر الگ ہوجاتا ہے اس وقت تو میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ گھبراؤ نہیں میں تیرے ساتھ ہوں۔ اگر حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ السلام کی سوئے ہوئے بھی خدا تعالیٰ سے ملاقات ہوجاتی تھی تو روحانی طور پر اس میں کون سی تعجب کی بات ہے کہ سب مومن خدا تعالیٰ سے اجتماعی طور پر ملیں اور وہ انہیں اپنے اکرام و انعام سے نوازے جب آدمی نیم بے ہوشی یا غنودگی کی حالت میں خدا تعالیٰ سے مل سکتا ہے تو ننگے بدن یا ننگے پیر ہونے کی حالت میں خدا تعالیٰ سے کیوں نہیں مل سکتا؟ روحانی نقطہ نگاہ سے ایک ہی وقت میں انسان کا ننگے پیر ہونا ننگے بدن ہونا اور اس کا نامختون ہونا بھی ممکن ہے۔ اور پھر خدا تعالیٰ سے اس کا اعزاز و اکرام کے ساتھ ملنا بھی ممکن ہے۔ صرف اتنی بات ضروری ہے کہ ان امور کو ظاہری طور پر دیکھنے کی بجائے انسان روحانی طور پر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے۔

بعض دفعہ انسان پیاسا لیٹتا ہے اور کشف میں اسے محبت الٰہی کا پیالہ پلایا جاتا ہے۔ جس سے اس کے مادی جسم میں بھی طراوت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اس کی پیاس دور ہوجاتی ہے۔ اب گو اسے ایک پیالہ پلایا گیا جس سے اس کی پیاس بھی بجھ گئی مگر روحانی نقطہ نگاہ سے اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کر دی ہے اسی طرح جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کشفی حالت میں پانی اور شراب اور دودھ کے پیالے پیش کئے گئے اور آپ نے صرف دودھ کا پیالہ لے لیا اور پانی اور شراب کا پیالہ رد کر دیا۔ تو گو دودھ کے پیالہ کی یہ تعبیر تھی کہ آپ کی امت ہلاکت سے بچی رہے گی اور اسے الٰہی علوم سے ہمیشہ حصہ ملتا رہے گا (دلائل النبوۃ للبھیقی جلد ۲ باب الاسراء برسول اللہ) مگر ہم تمثیلی طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آپ کے جسم نے اس وقت پیاس محسوس کی جس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو دودھ کا پیالہ دیا گیا اور اس کے پینے سے آپ کو اس قدر سیری ہوئی کہ آپ کی پیاس بالکل جاتی رہی۔ سارے جھگڑے صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ انسان ان باتوں کو جسمانیات کی طرف لے آتا ہے حالانکہ ان کا تعلق جسمانیات سے نہیں بلکہ روحانیات سے ہے۔

اگر انسان ہر بات کو روحانی نقطہ نگاہ سے دیکھے اور سمجھے کہ ننگے پیر ہونا بھی روحانی دنیا میں ایک مفہوم رکھتا ہے۔ ننگے بدن ہونا بھی ایک مفہوم رکھتا ہے۔ نامختون ہونا بھی ایک مفہوم رکھتا ہے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہونا بھی ایک

مفہوم رکھتا ہے تو خواہ اس سے بھی بڑھ کر عجیب وغریب حدیثیں آ جائیں وہ فوراً سمجھ لیتا ہے کہ وہاں کی روحانی کیفیات کا یہ ایک ظاہری نقشہ صرف ہمیں سمجھانے کے لئے کھینچا گیا ہے۔ ورنہ ہر ظاہر ایک باطن بھی رکھتا ہے اور اصل چیز وہی باطن ہے جو خالص روحانی چیز ہے اور مادیات سے بہت بالا ہے۔

وَّ نَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۷﴾

اور مجرموں کو ہانکتے ہوئے جہنم کی طرف لے جائیں گے۔

حلّ لُغَات۔ سَاقَ الْمَاشِيَةَ سَوْقًا وَسِيَاقَةً وَمَسَاقًا کے معنی ہوتے ہیں حَثَّهَا عَلَى السَّيْرِ مِنْ خَلْفٍ (اقرب) اس نے سواری کو پیچھے کی طرف سے ہانکا یعنی اسے سونٹا مار مار کر چلایا۔ اس لئے وہ شخص جو اس لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ مجرموں کے پیچھے پیچھے چلے اور ان کی نگرانی رکھے یا اونٹوں وغیرہ کے پیچھے چلے اسے سائق کہا جاتا ہے۔ اور سَاقَ الْحَدِيْثَ کے معنے ہوتے ہیں سَرَدَهٗ (المنجد) یعنی اس نے بے تحاشا لمبی باتیں شروع کر دیں۔

تفسیر۔ عربی زبان میں جرنیل کو قائد کہتے ہیں اور قائد وہ ہوتا ہے جو فوج کے آگے آگے چلتا ہے۔ یورپین افواج میں جرنیل کا مقام بالعموم پیچھے ہوتا ہے پس عربی کے لحاظ سے وہ سائق کہلائے گا قائد نہیں سائق جانوروں کے لئے ہوتا ہے یا مجرموں کے لئے کیونکہ وہ آگے بڑھنے میں خوشی محسوس نہیں کرتے۔ جانور کی مرضی ہوتی ہے کہ میں جہاں جانا چاہوں جاؤں اور آدمی کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اس سے کام لے یا اسے پانی وغیرہ پلانے کے لئے لے جائے۔ پس جانور اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اپنے مالک کی مرضی سے چلتا ہے۔ اسی طرح مجرموں کا بھی جی نہیں چاہتا کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوں اس لئے ان کے لئے بھی ایک سائق ہوتا ہے جو انہیں اپنی نگرانی میں مجسٹریٹ کی طرف لے جاتا ہے۔ غرض مجرموں کے لئے اور یا پھر جانوروں کے لئے سَاقَ کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ سَائِقُ الْاِبِلِ۔ اونٹوں کے چرواہے کو کہا جاتا ہے اسی طرح کمزوروں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب جنگ کے احکام نازل ہوئے تو مومنوں میں سے ایک گروہ کی یہ حالت تھی کہ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ (الانفال: ۷) وہ سمجھتے تھے کہ گویا وہ موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے دلوں میں بار بار یہ خیال اٹھتا تھا کہ ہمیں کہا جاتا تھا کہ رحم کرو۔ ہر ایک سے محبت کے

ساتھ پیش آوٴ۔ حسن سلوک کرو۔ نرمی اور ملاطفت سے کام لو مگر اب کہتے ہیں کہ جنگ کرو۔ پس اس وقت یہ انہیں ایسی چیز نظر آتی تھی جو عام تعلیم کے خلاف تھی اس لئے جب انہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان کی طبیعتوں پر گراں گذرا۔ یہ نہیں کہ وہ نافرمانی کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ انہیں یہ عجیب چیز نظر آئی کیونکہ اس میں ان کے لئے بڑی تلخی تھی اور انہیں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں سے ہی لڑنا پڑتا تھا جن سے لڑنا ان پر طبعاً گراں گذرتا تھا مگر اسی فعل کے نتیجہ میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی اور وہ جنت کی طرف دھکیل دئے گئے۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں صرف مجرموں اور کمزوروں کے لئے نہیں بلکہ مومنوں کے لئے بھی سَاقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ سورۃ زمر میں ہے وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا (الزمر:۷۲) اگر سِيْقَ کے معنے زور سے اور دھکیل کر آگے کرنے کے ہیں تو اس کے کیا معنے ہوئے؟ مفسرین نے تو یہ جواب دیا ہے کہ کفار کے لئے جو نُسُوْقُ کا لفظ آیا ہے اس کے معنے کفار کو دھکیل کر لے جانے کے ہیں لیکن مومنوں کے لئے یہ لفظ ان کی سواریوں کو دھکیلنے کی مناسبت سے ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ ان کی آمد کا منتظر ہوگا اور فرشتے ان کی سواریوں کو مار مار کر بھگا رہے ہوں گے تا کہ جلد پہنچیں۔ (تفسیر کبیر لامام رازی زیر آیت زمر ۷۱)

میرے نزدیک اس کے دو جواب اور ہیں۔ اول تو یہ کہ کفار کی نسبت اس سے پہلے آیا ہے کہ وَ سِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا (الزمر:۷۲) پس آگے جوار کے لحاظ سے وہی لفظ مومنوں کی نسبت بھی استعمال کر دیا ہے پس اس جگہ اس کے معنے صرف چلانے کے ہیں آگے یا پیچھے کا ذکر نہیں۔ اور نہ اہانت عزت کی طرف اشارہ ہے صرف پہلے سیق کی متابعت میں یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کفار کی موجودہ حالت اور مومنوں کی سابق حالت کا اس لفظ سے نقشہ کھینچا گیا ہے کافر عذاب سے بھاگتا ہے۔ مومن نعمتوں اور آسائشوں سے بچتا ہے وہ تو صرف زیارت باری تعالیٰ کا خوہشمند ہوتا ہے۔ پس مومنوں کی نسبت یہ لفظ رکھ کر بتایا ہے کہ جس طرح کافر تکلیف سے بچتا ہے، مومن آرام کی زندگی سے بچتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ اسے زبردستی دیتا ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا کہ سید عبد القادر صاحب جیلانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اچھا کھانا یا کپڑا استعمال نہیں کرتا جب تک کہ خدا تعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھا کر مجھے مجبور نہیں کرتا کہ میں اچھا کھانا کھاوٴں یا اچھا کپڑا پہنوں (قلائد الجواہر فی مناقب شیخ عبد القادر صفحہ ۱۳۶ از محمد بن یحیٰ)۔ پس مومنوں کے دلوں کی اس کیفیت کا نقشہ کھینچنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ نہ یہ کہ ظاہری طور پر ان کو دھکیل کر جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔

سائق کے مقابلہ میں قائد کا لفظ استعمال ہوتا ہے قائد کا لفظ ایک طرف افسر کی بہادری پر اور دوسری طرف فوجوں کی بشاشت پر دلالت کرتا ہے۔

تیسرے اچھا نمونہ دکھا کر دوسروں کو تحریص دلانے کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ درحقیقت عمدہ لیڈر وہی ہوتا ہے جس میں یہ تینوں باتیں پائی جائیں یعنی وہ اپنے نمونہ کے ساتھ فوج کو رغبت دلائے اور انہیں بتائے کہ میں بھی قربانی کرتا ہوں تم بھی ہر قسم کی قربانی سے کام لو۔ پھر خود اس کے اندر ایسی بشاشت پائی جائے کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں مرنے میں ایک لذت محسوس کرے۔ کیونکہ قائد وہی ہوتا ہے جو اپنے ساتھیوں سے آگے دوڑ رہا ہوتا ہے۔ سپاہی اس کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں اور وہ دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے آگے آگے جا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح کامیاب جرنیل وہ ہوتا ہے جس کے سپاہیوں میں بھی بشاشت پائی جائے۔ چنانچہ قائد کے لفظ میں اس طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے پیچھے دیکھنے کی ضرورت نہیں میرے ماتحت اپنے فرائض کا ایسا احساس رکھتے ہیں کہ وہ خودبخود میرے پیچھے چلے آئیں گے۔ غرض سائق اور قائد دو متقابل الفاظ ہیں۔ سائق پیچھے پیچھے چلتا ہے او قائد فوج کے آگے آگے چلتا ہے اور اپنے نمونہ سے سپاہیوں کی ہمت بڑھاتا اور ان کے اندر ایک نیا ولولہ اور نئی زندگی پیدا کرتا ہے۔

امریکن تاریخ میں ایک نہایت ہی لطیف واقعہ بیان ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب لیڈر کس طرح اپنے نمونہ سے اپنے ساتھیوں کے دلوں کو فتح کیا کرتے ہیں۔

یونائیٹڈ سٹیٹس امریکہ پہلے انگریزوں کے ماتحت ہوا کرتا تھا ایک عرصہ کی غلامی کے بعد ان میں آزادی کی تحریک پیدا ہوئی مگر اس وقت ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے پاس مقابلہ کے لئے فوجیں نہیں تھیں اور نہ ہی کافی مقدار میں سامان جنگ موجود تھا اور انگریزوں کے پاس فوجیں بھی تھیں اور ہر قسم کا سامان جنگ بھی تھا۔ بہرحال جب تحریک آزادی شروع ہوئی تو زمینداروں اور مزدوروں وغیرہ نے اپنے آپ کو والنٹیر ز کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا اور سارے ملک میں انگریزوں کے خلاف ایک آگ لگ گئی۔ جب یہ تحریک زیادہ مضبوط ہوگئی تو انہوں نے اپنے میں سے ایک افسر مقرر کیا جس کا نام واشنگٹن تھا اسی کے نام پر بعد میں امریکہ میں واشنگٹن شہر بنایا گیا ہے یہ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا۔ جنگی فنون میں کچھ زیادہ مہارت نہیں رکھتا تھا مگر اخلاص اور دردِ قومی اس کے اندر موجود تھا۔ وہ سارے ملک میں چکر لگاتا تقریریں کرتا اور لوگوں کو ابھارتا کہ آزادی بڑی نعمت ہے اس کے لئے جدوجہد کرو۔ ایک دفعہ وہ اپنے ملک کا چکر لگا رہا تھا کہ اس نے ایک جگہ پر دیکھا کہ کوئی قلعہ بن رہا ہے اور کارپورل نگرانی کے لئے پاس کھڑا ہے۔ کام کرنے والے صرف چار پانچ سپاہی تھے اتفاقاً ایک دو شہتیر ایسے آ گئے کہ ان کا اوپر چڑھانا مشکل

ہو گیا۔ وہ زور لگا لگا کر اوپر کھینچتے مگر وہ پھر نیچے گر جاتے اور وہ کارپورل پاس کھڑا انہیں کہتا جاتا کہ شاباش خوب زور لگاؤ۔ شاباش ہمت نہ ہارو مگر آگے بڑھ کر ان کی مدد نہیں کرتا تھا۔ اسی دوران میں واشنگٹن وہاں سے گذرا۔ وہ اس وقت ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے جب یہ نظارہ دیکھا تو اپنا گھوڑا روک لیا اور پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے لوگوں نے بتایا کہ انگریزی فوج آرہی ہے اس کے مقابلہ کے لئے ہم یہ قلعہ بنا رہے ہیں۔ تاکہ سپاہی اس میں ٹھہر سکیں اس نے کہا پھر اس قلعہ کے بننے میں دقت کیا ہے؟ انہوں نے کہا دقت یہ ہے کہ شہتیر بہت بھاری ہیں اور ہم سے اوپر چڑھائے نہیں جاتے اس نے کارپورل سے پوچھا کہ تم ان کی کیوں مدد نہیں کرتے؟ اس نے کہا کہ میں تو افسر ہوں۔ میرا فرض یہ ہے کہ میں ان سے کام لوں اور ان کی نگرانی کروں واشنگٹن نے یہ بات سنی۔ تو فوراً اپنے گھوڑے پر سے اترا۔ اور سپاہیوں کے ساتھ مل کر اس نے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ شہتیر اوپر چڑھ گئے۔ جب کام ہو چکا اور وہ گھوڑے پر سوار ہو کر واپس جانے لگا تو کارپورل نے اسے کہا۔ کہ میں آپ کا اپنی طرف اور اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کہ آپ نے اس مشکل کام میں ہماری مدد کی۔ واشنگٹن نے جواب میں کہا آپ کی مہربانی میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ جب کبھی آپ کسی ایسی مصیبت میں پھنس جائیں کہ آپ کو دوسرے کی مدد کی ضرورت ہو۔ تو اپنے کمانڈر انچیف واشنگٹن کو بلا لیا کرنا۔

یہ قائد کی مثال ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر کام کے لئے پیش کر دیتا ہے اور قربانی کے وقت وہ دوسروں سے پیچھے نہیں بلکہ ان کے آگے آگے ہوتا ہے اور اپنے نمونہ سے ان کے اندر کام کی تحریص پیدا کرتا ہے۔ اگر کسی اعلیٰ درجہ کے قائد کے ہوتے ہوئے بھی لوگ اس کے نمونہ سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ ان کی بڑی بدقسمتی ہوتی ہے۔

ہم نے خدام کے افسروں کا نام بھی قائد اسی لئے رکھا ہے کہ وہ اپنے نمونہ سے لوگوں کے دل فتح کریں۔

وِرْدًا کے معنے پانی پر آنے کے ہوتے ہیں چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْوِرْدُ الْاِشْرَافُ عَلَى الْمَاءِ اسی طرح اس کے معنے پیاس کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے معنے پانی کے حصہ کے بھی ہوتے ہیں اور وِرْدٌ کے معنے اس پانی کے گھاٹ کے بھی ہوتے ہیں جس پر لوگ آتے جاتے ہیں تاکہ پانی وغیرہ پئیں اور اس کے معنے اس قوم کے بھی ہوتے ہیں جو کسی پانی والی جگہ پر جمع ہو جاتی ہے (اقرب)۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کفار کا حشر بھی اجتماعی ہوگا۔ مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھ ہونے سے گھبرائیں گے۔ اس لئے ان کو مار مار کر اکٹھا رکھا جائے گا۔ اور آخر وہ جہنم کی طرف دھکیلے جائیں گے اس حالت میں کہ وہ ایسی جگہ پر جانے کے محتاج ہوں گے جہاں ان کی پیاس بجھے۔ یہ الفاظ ان کے عذاب کی شدت پر دلالت کرتے ہیں

یعنی وہ اس بات کے محتاج ہوں گے کہ ان کو کوئی ایسا مقام ملے جہاں وہ آرام کریں اور انہیں پینے کے لئے پانی ملے۔ مگر باوجود اس شدید احتیاج کے ان کو مار مار کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ اتنا خطرناک اور تکلیف دہ مقام ہوگا کہ وہ اس کی طرف رخ کرنا بھی پسند نہیں کریں گے۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ

اس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا سوائے اس کے جس نے (خدائے) رحمٰن سے

عَهْدًا ﴿۸۸﴾

عہد لے چھوڑا ہے۔

حلّ لُغَات۔ لغت میں لکھا ہے الشَّفْعُ ضَمُّ الشَّيْءِ اِلٰى مِثْلِهٖ یعنی شفع اس بات کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اپنی ہم جنس اور مشابہ چیز کے ساتھ ملا لیا جائے وَقِيْلَ الشَّفْعُ الْمَخْلُوْقَاتُ اور شفع کے معنے مخلوقات کے بھی ہوتے ہیں مِنْ حَيْثُ اَنَّهَا مُرَكَّبَاتٌ کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ ساری کی ساری مرکب ہیں کَمَا قَالَ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔

اسی طرح شفاعت کے متعلق لکھا ہے۔ الشَّفَاعَةُ الْاِنْضِمَامُ اِلٰى اٰخَرَ نَاصِرًا لَّهٗ وَسَائِلًا عَنْهُ وَاَكْثَرُ مَا يُسْتَعْمَلُ فِي انْضِمَامِ مَنْ هُوَ اَعْلٰى حُرْمَةً وَّمَرْتَبَةً اِلٰى مَنْ هُوَ اَدْنٰى وَمِنْهُ الشَّفَاعَةُ فِي الْقِيَامَةِ قَالَ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَقَوْلُهٗ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (مفردات) یعنی شفاعت کے معنے ہیں کسی شخص کا دوسرے کے ساتھ اس طرح پر مل جانا کہ وہ اس کا مددگار ہو جائے اور اس کے متعلق سوال کرنے والا بن جائے اور اس لفظ کا اکثر استعمال کسی اعلیٰ چیز کے ساتھ ادنیٰ چیز کو ملانے پر کیا جاتا ہے۔ یعنی دوسری چیز جس کو ساتھ ملایا جاتا ہے وہ مثل تو ہوتی ہے لیکن درجہ اور مقام کے لحاظ سے وہ ادنیٰ ہوتی ہے انہی معنوں میں وہ شفاعت بھی ہے جو قیامت کے دن ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (الانبیاء :۲۹) یا فرماتا ہے لَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (الانبیاء:۲۹) اسی طرح فرماتا ہے مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس:۴)

تفسیر۔ اوپر کے معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شفاعت کی تھیوری بالکل حل ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں

عام طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ ہر مسلمان جس نے کلمہ پڑھ لیا اس کی قیامت کے دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں گے بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ شفاعت ہے ہی گنہگاروں کے لئے اور وہ بڑے فخر سے کہا کرتے ہیں۔ ؎

کہ مستحق شفاعت گنہگار انند

حالانکہ شفاعت کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مثیل ہونا ضروری ہے۔ اور وہی شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا مستحق ہوسکتا ہے جس نے پوری کوشش کی کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا بنے مگر بعض کوتاہیوں کی وجہ سے وہ اپنے اس ارادہ میں سوفی صدی کامیاب نہ ہوسکا اس کی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے حضور درخواست فرمائیں گے کہ خدایا اس شخص نے میرا مثیل بننے کے لئے پوری کوشش کی ہے مگر بعض کمزوریوں نے اسے اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہونے دیا۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ تو اس پر رحم فرما اور اس کی کوتاہیوں کو نظر انداز فرماتے ہوئے اسے بھی اپنے قرب سے حصہ دے۔ پس شفاعت گنہگار کے لئے نہیں بلکہ اس کے لئے بھی قانون مقرر ہیں۔ چنانچہ پہلا قانون یہی ہے کہ وہ شفاعت کرنے والے کا مثیل ہو۔ اگر وہ مثیل نہیں ہوگا تو اس کی شفاعت نہیں کی جائے گی۔

دوسرا قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو۔ چنانچہ لَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (الانبیاء:۲۹) میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ شفاعت کا مستحق بننے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے راضی ہو۔

تیسرا قانون یہ ہے کہ شفاعت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اذن حاصل ہو جیسا کہ وہ فرماتا ہے مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس:۴) کوئی شخص اس وقت تک شفیع نہیں بن سکتا جب تک شفاعت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن نہ ہو اگر محض گناہ شفاعت کا موجب ہوتا جیسا کہ مسلمانوں میں عام طور پر خیال پایا جاتا ہے تو شفاعت کے لفظ اور رضا اور اذن کی شرط کی کیا ضرورت تھی پھر تو کہنا چاہیے تھا کہ جو بھی گنہگار ہوگا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن اس کی شفاعت فرمادیں گے۔

حقیقت یہی ہے کہ جب تک کوئی شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مثیل نہ بن جائے اس وقت تک وہ آپ کی شفاعت کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے تم بازار میں جاؤ اور دوکاندار سے کہو کہ مجھے اچھی قسم کے لنگڑے آم دو۔ وہ چند اچھے آم نکال کر تمہیں دے دیتا ہے اور تم انہیں ٹوکری میں ڈال لیتے ہو۔ اب اگر تمہیں ضرورت زیادہ ہے اور ویسے آم تمہیں اور نہیں مل سکتے تو تم دوکاندار سے کہو گے کہ اس سے ملتے جلتے اگر کچھ چھوٹے سائز کے آم ہوں تو وہ بھی رکھ دو۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ لنگڑے آم کا سائز اور ہوگا اس وجہ سے کہ تمہیں ضرورت

ہوگی تم ذرا چھوٹے سائز کے آم بھی لے لو گے اور کہو گے کہ یہ آپس میں ملتے ہی ہیں اگر ان کا سائز کچھ چھوٹا ہے تو کیا ہوا۔ لیکن تم اس کی جگہ کوئی ٹوٹی ہوئی جوتی نہیں رکھو گے تم اس کی جگہ کیلے کا چھلکا نہیں لے آؤ گے۔ تم اس کی جگہ آم کی گٹھلیاں نہیں لے آؤ گے تم بہر حال آم ہی لاؤ گے خواہ وہ سائیز میں کچھ کم ہی ہوں۔ اسی طرح شفاعت میں بھی ایک مشابہت کا پایا جانا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنے یہ ہیں کہ ایسے انسان جو کوشش کریں گے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مثیل ہو جائیں لیکن ان کی تکمیل روحانی میں کچھ کمی باقی رہ جائے گی قیامت کے دن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے متعلق خدا تعالیٰ کے حضور عرض کریں گے کہ خدایا انہوں نے میرا مثیل بننے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے اعمال میں کچھ کمی رہ گئی اب اس کمی کو تو اپنے فضل سے پورا فرمادے۔ یہ نہیں کہ حرام کاری کر رہے ہیں فساد کر رہے ہیں۔ قتل کر رہے ہیں جھوٹے نعرے لگا رہے ہیں نا کردہ گناہ لوگوں پر الزام لگا رہے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ کہہ رہے ہیں ؎

کہ مستحق شفاعت گنہگار انند

جو شخص پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے جو شخص پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ صحابہؓ کے نقش قدم پر چلے لیکن باوجود اس کوشش اور جدوجہد کے اس کے اعمال میں کچھ کمی باقی رہ جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس جدوجہد اور کوشش کا محمد رسول اللہ پر انکشاف فرمائے گا اور آپ اللہ تعالیٰ کے حضور اس کے لئے رحم کی درخواست کریں گے اور فرمائیں گے کہ اس شخص نے کوشش تو کی تھی لیکن پیچھے رہ گیا۔ اب تو اپنے فضل سے اس کی کمی کو پورا فرمادے یہی لغت والے لکھتے ہیں کہ شفاعت کے لئے ہم مثل ہونا ایک لازمی امر ہے۔ کیونکہ ایک قسم کی جب دو چیزیں ہوں جن میں سے ایک ادنیٰ ہو اور ایک اعلیٰ، تو ادنیٰ کو اعلیٰ سے ملانے کو شفاعت کہا جاتا ہے۔ یہی حقیقت اللہ تعالیٰ اس آیت میں بیان فرماتا ہے کہ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا اس دن کسی کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا۔ سوائے اس کے جس نے خدائے رحمٰن سے عہد لے چھوڑا ہے اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسیحؑ جس کو عیسائی خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں اس کو شفاعت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ شفاعت کے ذکر کے ساتھ ہی یہ کہا گیا ہے کہ خدا کا بیٹا قرار دینا بڑے گناہ کی بات ہے۔ پس یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ جس چیز کا خیال بھی خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہو وہی چیز جس شخص کی طرف منسوب کی جارہی ہو اسے شفاعت کا حق حاصل ہو۔ اس جگہ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کو خدا کی وحی نے بتایا کہ قیامت کے دن ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ خصوصیتیں ایسی عطا فرمائی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے اور کسی نبی کو نہیں ملیں (۱) مجھے ایسا رعب عطاء فرمایا گیا ہے کہ مہینہ بھر کی مسافت پر بھی دشمن مجھ سے لرزہ براندام رہتا ہے۔(۲) میرے لئے زمین کے چپہ چپہ پر خدائے واحد کی عبادت کرنا جائز قرار دیا گیا ہے (۳) غنائم کے اموال میرے لئے حلال کئے گئے ہیں (۴) سابق انبیاء صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر مجھے اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کے لئے مبعوث فرمایا ہے۔(۵) اور مجھے قیامت کے دن شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔(بخاری کتاب الصلوۃ باب قول النبی جعلت لی الارض مسجدا و طھورا)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب تمام انبیاء شفاعت سے انکار کریں گے اور میں خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ میں جھکا ہوا ہوں گا تو مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ اے محمد رسول اللہ سجدہ سے اپنا سر اٹھا اور اللہ تعالیٰ سے مانگ کہ تجھے دیا جائے گا اور اس کے بندوں کی شفاعت کر کہ تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔(بخاری کتاب التفسیر سورۃ بنی اسرائیل باب ذریۃ من حملنا مع نوح)

سورۂ زخرف میں بھی اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شفیع ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے وَ تَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۚ وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ وَ لَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ (الزخرف:۸۶،۸۷) یعنی وہ بڑی ہی برکت والی ذات ہے جس کے قبضہ وتصرف میں زمین و آسمان کی بادشاہت ہے۔اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اس کا بھی وہی بادشاہ ہے اور قیامت کا علم بھی صرف اسی کو حاصل ہے اور تم سب کو اسی کی طرف لوٹایا جائے گا۔اور وہ معبودان باطلہ جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں ہرگز شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے۔صرف وہی شفاعت کا حق رکھتا ہے جو سچ کی گواہی دے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار اس حقیقت کو اگر وہ غور کریں تو خوب سمجھ سکتے ہیں اس آیت سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کا مقام صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوگا۔اور کسی کو نہیں اور یہی بات اس جگہ بیان کی گئی ہے۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۹﴾

اور یہ (لوگ) کہتے ہیں کہ (خدائے) رحمٰن نے بیٹا بنالیا ہے

تفسیر ۔فرماتا ہے یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ انہیں مسیح کی شفاعت حاصل ہوگی ۔حالانکہ ان کو مسیح کی شفاعت کس طرح حاصل ہوسکتی ہے مسیحؑ تو ہمارا موحّد بندہ تھا اور یہ مسیح کو خدا تعالیٰ کا شریک ٹھہرا رہے ہیں جب یہ ہمارے موحد مسیحؑ کے ساتھ مشابہت ہی نہیں رکھتے تو انہیں اس کی شفاعت کس طرح حاصل ہوسکتی ہے ۔شفاعت مثیل کے لئے ہوسکتی ہے اور یہ اس کے مثیل نہیں ۔یہ لوگ مسیح کی تعلیم کے سراسر خلاف خدائے رحمٰن کی طرف ولد منسوب کرر ہے ہیں ۔حالانکہ رحمٰن اور ولد ہونا متضاد ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ رحمٰن ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کو رحمٰن مانتے ہیں وہ ایسا نہیں مانتے لیکن دلیل کا ایک طریق یہ بھی ہوتا ہے کہ خواہ مخالف مانے یا نہ مانے جب ایک واقعہ ظاہر ہو تو اس واقعہ ثابتہ کے ساتھ نتیجہ کو ملا دیا جاتا ہے ۔یہاں بھی اسی طرح کیا گیا ہے ۔بے شک وہ نہیں مانتے کہ خدا رحمٰن ہے مگر چونکہ حقیقت یہی ہے کہ وہ رحمان ہے اور رحمن خدا ولد کا محتاج نہیں ہوسکتا اس لئے عیسائیوں کا دعویٰ یقیناً غلط ہے اور اس غلط ادّعا کے بعد یہ امید رکھنا کہ ہمارے حق میں شفاعت ہوگی بڑی بھاری غلطی ہے۔

لَقَدۡ جِئۡتُمۡ شَيۡـًٔا اِدًّا ﴿۹۰﴾

(تو کہہ دے) تم ایک بڑی سخت بات کہہ رہے ہو۔

حلّ لُغَات ۔اِدًّا کے معنی ہیں اَمۡرًا مُنۡکَرًا یَقَعُ فِیۡهِ جَلۡبَةٌ (مفردات) ایسا ناپسندیدہ امر جس پر لوگوں میں شور مچ جائے ۔دنیا میں ناپسندیدہ اعمال کئی قسم کے ہوتے ہیں ۔ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو ہنس کے چلے جاتے ہیں ۔ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو اغماض کر لیتے ہیں ۔ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو گھورتے ہوئے چلے جاتے ہیں لیکن ایک ناپسندیدہ امر ایسا ہوتا ہے جس کو لوگ دیکھتے ہیں تو شور مچا دیتے ہیں کہ یہ کیا ہوا ۔اِدًّا کے معنے ایسے ہی ناپسندیدہ فعل کے ہیں جس کو فطرت تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور لوگوں میں شور برپا ہو جائے کہ یہ کیا ہو گیا۔

تفسیر۔شرک کی انتہائی برائی بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نے ایک ایسا کام کیا ہے جو فطرت صحیحہ کے خلاف ہے اور جس کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کے جذبات کے اظہار سے کوئی شریف آدمی رک نہیں سکتا۔ یہ کسی فعل کی حد درجہ کی ناپسندیدگی کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس کے خلاف ہر انسان بے تحاشا احتجاج کرنے پر تیار ہوجائے اور اسے کسی صورت میں بھی برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو۔اس میں بتایا گیا ہے کہ شرک ایک ایسا فعل ہے جس کو ماننے سے فطرت انکار کرتی ہے اور یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب عیسائیت اسلام کے اعتراضات سے ڈر کر خود تثلیث کے اور معنے کرنے لگ گئی ہے۔مگر عجیب بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو کہتا ہے کہ اس کے خلاف ہر انسان کو آواز اٹھانی چاہیے مگر اس زمانہ میں جو لوگ اس فتنہ کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں اور خدا تعالیٰ کی توحید کے قیام کے لئے رات دن کوششیں کر رہے ہیں وہی مسلمان کہلانے والوں کی نگاہ میں کافر اور بے دین اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔وہ عیسائیوں کے ساتھ جو مسیح کو خدا کا شریک قرار دیتے ہیں تو محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں مگر جو توحید کے قیام کے لئے عیسائیوں کو تبلیغ کرتے ہیں ان کو کافر قرار دیتے ہیں۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ

قریب ہے کہ (تمہاری بات سے) آسمان پھٹ کر گر جائیں اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے۔اور پہاڑ ریزہ ریزہ

الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۱﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

ہوکر زمین پر جا پڑیں۔اس لئے کہ ان لوگوں نے (خدائے) رحمان کا بیٹا قرار دیا ہے۔

حلّ لُغات۔ تَفَطَّرَ کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کا اپنے اندر سے ضعف کی وجہ سے ٹوٹ جانا۔چنانچہ تَفَطَّرَ الشَّیْءُ کے معنے ہوتے ہیں۔اِنْشَقَّ وہ چیز پھٹ گئی اور تَفَطَّرَتِ الْاَرْضُ بِالنَّبَاتِ کے معنے ہوتے ہیں تَصَدَّعَتْ یعنی زمین پھٹ کر اندر سے سبزی نکل آئی اور تَفَطَّرَتِ الْقَضِیْبُ کے معنے ہوتے ہیں بَدَاءَ نَبَاتُ وَرَقِہٖ شاخ کے پتے نکلنے شروع ہوگئے (اقرب) گو یا کسی چیز کے اندر سے جب کوئی چیز باہر نکلنی شروع ہوجائے تو اس کیلئے تَفَطَّرَ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز آپ ہی آپ پھٹ گئی ہے اور فَطَرَ کے معنی کسی چیز کو نئے سرے سے شروع کرنے کے ہوتے ہیں۔

هَدًّا کے متعلق لغت میں لکھا ہے کہ اَلْهَدَّةُ صَوْتُ وَقْعِ الْحَائِطِ یعنی دیوار کا اس زور سے گرنا کہ اس کے

گرنے سے آواز پیدا ہوا سے ھدا کہتے ہیں اگر کوئی دیوار آہستگی سے گر جائے اور آواز پیدا نہ ہو تو اس کے لئے هَدًّا کا لفظ استعمال نہیں ہوگا۔ ھدا کا لفظ اسی وقت استعمال ہوگا جب وہ اس زور سے گرے کہ ساتھ ہی آواز بھی پیدا ہو۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ شرک کے خلاف آسمانوں کے اندر ایسا جوش پیدا ہو گیا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے وہ اس جوش کی وجہ سے پھٹ جائیں گے اور زمین میں بھی ایسا اندرونی جوش پیدا ہو چکا ہے کہ اس کا سینہ چاک ہو جائے گا اور پہاڑوں پر بھی اس کا اتنا اثر ہے کہ قریب ہے کہ وہ بھی بیتاب ہو کر یکدم گر جائیں اور ان کے گرنے سے ایک شور برپا ہو جائے۔ یعنی یہ دعویٰ آسمان اور زمین اور پہاڑوں کے لئے گراں ہے آسمانوں کے لئے اس لئے گراں ہے کہ یہ آسمانی تقاضوں کے خلاف ہے۔ صفات الٰہیہ اور ملائکہ کا تصور سب اس کے متباعد ہیں اور زمین بھی اس کے خلاف ہے یعنی فطرت صحیحہ بھی اس کے خلاف ہے اور پہاڑوں کا وجود یعنی ترقی کے جذبات اور احساسات جو فطرت کا ایک اعلیٰ مقام ہے وہ بھی اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ ابنیت کفارہ کی مستلزم ہے اور کفارہ انسان کی اعلیٰ درجہ کی ترقیات کے خلاف ہے اور انسان کی پستی پر دلالت کرتا ہے۔ جو کچھ عیسائیت کفارہ اور ابنیت سے ثابت کرتی ہے اسلام اسے انسان کی اعلیٰ ترقیات سے قابل حصول قرار دیتا ہے۔ پس جِبَالٌ بھی اس کے وجود کے خلاف ہیں گویا آسمان اور زمین اور جبال اپنے مطابق روحانی وجودوں کی طرف اشارہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اور جہاں بھی انسان کی اعلیٰ ترقیات کے حصول پر اعتراض کیا جائے گا اور جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے رحم اور اس کے عفو اور اس کی مہربانی کی صفات کو نظر انداز کیا جائے گا لازماً اس سے آسمان بھی پھٹے گا کیونکہ خدا بھی اسے ناپسند کرے گا اور فرشتے بھی اسے ناپسند کریں گے اور زمین بھی پھٹے گی کیونکہ انسان بھی اس کو ناپسند کرے گا اور جبال بھی پھٹیں گے کیونکہ انسانوں میں سے جو اعلیٰ درجہ کے انسان ہیں یعنی خدا تعالیٰ کے انبیاء وہ بھی اس کو ناپسند کریں گے۔

عام انسان اس تعلیم کو اس لئے ناپسند کرے گا کہ وہ کہے گا یہ تعلیم میرے لئے ہر قسم کی ترقی کے راستہ کو بند کر دیتی ہے۔

اعلیٰ انسان اس لئے اس تعلیم کو ناپسند کرے گا کہ وہ کہے گا یہ تو میری تجربہ شدہ چیز ہے اور مجھے مل چکی ہے اب یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ ایسی ترقی کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور اللہ اور اس کے فرشتے اس لئے ناراض ہوں گے کہ ہم تو اپنی نعمتیں ان کو دے رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایسا نہیں کر سکتا پس انسان اس کی مخالفت کرے گا اور کہے کہ عجیب بات ہے میرے لئے ایک ہی امید کا سہارا تھا وہ بھی اس تعلیم نے توڑ دیا۔ اعلیٰ انسان اس

تعلیم کی مخالفت کرے گا اور کہے گا میں نے تو اپنی آنکھوں سے خدا تعالیٰ کے انعامات کو نازل ہوتے دیکھا ہے یہ کیا بکواس ہے کہ ایسے انعامات کسی انسان کو حاصل نہیں ہوسکتے اور پھر خدا اور اس کے ملائکہ بھی ناراض ہوں گے کہ ہم تو اپنی نعمتوں سے انہیں حصہ دے رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی کو معاف نہیں کرسکتا۔ کسی کی توبہ قبول کر کے اسے اپنے قرب میں جگہ نہیں دے سکتا پس آسمان اور زمین اور جبال تینوں اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے یعنی آسمانی ہستیاں اس کو ناپسند کریں گی اور ان کے دل پھٹ جائیں گے۔ اسی طرح انسان کی فطرت بھی اس کو دیکھ کر چلا اٹھے گی۔ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اور پھر اس صدمہ سے جو اعلیٰ درجہ کی روحانی ہستیاں ہیں وہ بھی گھبرا کر کہیں گی کہ یہ کیا ظلم ہو رہا ہے ہمیں ایک چیز ملی ہوئی ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مل ہی نہیں سکتی۔

منکرین الہام سے جب بھی میری گفتگو ہوتی ہے میں انہیں کہا کرتا ہوں کہ میں تمہاری دلیلوں کو کیا کروں جبکہ خدا مجھ سے خود ہم کلام ہوتا ہے اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر الہامات نازل نہ ہوتے تو شاید میں خیال کر لیتا کہ تمہاری دلیلوں میں کچھ وزن ہوگا لیکن اب ان دلائل کا مجھ پر کیا اثر ہوسکتا ہے جبکہ خود مجھ پر الہامات نازل ہوتا ہیں۔ مجھے تو یہ دلیلیں سنکر ہنسی آتی ہے کہ خدا موجود ہے اس کا کلام ہم پر نازل ہوتا ہے اور دلائل یہ دیئے جا رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ پھر جو چیز میں نے دیکھ لی ہے حالانکہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادموں میں سے ہوں اس کے متعلق میں یہ کس طرح تسلیم کرسکتا ہوں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہیں دیکھی ہوگی جب نیچری کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات عالیہ کا نام قرآن ہے (تفسیر القرآن مع تحریر اصول التفسیر از سید احمد خان زیر آیت و ان کنتم فی۔۔البقرۃ: ۲۳) تو سن کر ہنسی آتی ہے کہ جب ہمیں معین الفاظ میں الہام ہوتے ہیں تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت بالا ہے۔ آپ پر خدائی الفاظ میں ہی قرآن کیوں نازل نہیں ہوسکتا تھا تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو اعلیٰ درجہ کے روحانی لوگ ہیں اور جنہوں نے ان تمام انعامات کا مشاہدہ کیا ہوا ہے وہ اس بات کو سن کر ایسا محسوس کریں گے کہ گویا وہ سارے مقامات جو ان کو حاصل ہیں ان کو انہوں نے گرا دیا ہے۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۳﴾

اور (خدائے) رحمن کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔

تفسیر۔ عیسائیوں کا عقیدہ ابنیّت خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت کے بالکل خلاف ہے یہی وجہ ہے کہ

عیسائیت خدا تعالیٰ کو رحمٰن تسلیم نہیں کرتی اور وہ دنیا کی نجات کے لئے بیٹے کی قربانی کا تصور پیش کرتی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ خدا تعالیٰ لوگوں کے گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا تھا اور اس نے اپنے بیٹے کو قربان کر کے لوگوں کو بچا لیا تو اس کی رحمانیت کہاں گئی۔ یہ بخشش کا کام تو اس کی رحمانیت نے کرنا تھا اس لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ دوسری جگہ فرماتا ہے کہ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَّمَ الۡقُرۡاٰنَ (الرحمٰن:۲،۳) یعنی کلام الٰہی جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی گمراہی کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی صفت رحمانیت جوش میں آتی ہے اور جس طرح ظاہری عالم میں بغیر مانگنے کے اس نے ہزاروں ہزار نعمتیں پیدا کر دی ہیں اسی طرح روحانی عالم میں وہ کلام الٰہی نازل کرتا ہے جس پر عمل کر کے دنیا نجات پا جاتی ہے۔

اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ

کیونکہ ہر ایک جو آسمانوں اور زمین میں ہے وہ (خدائے) رحمٰن کے حضور میں غلام کی صورت

عَبۡدًا ﴿۹۴﴾

میں حاضر ہونے والا ہے۔

تفسیر ۔یعنی جب ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے تو پھر بیٹے کی کیا ضرورت ہے بیٹا تو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنے باپ کی مدد کرے یا باپ کی موت کے بعد اس کے نام کو زندہ رکھے جب خدا تعالیٰ کی کسی کی مدد کی احتیاج نہیں اور ہر چیز پر اس کی دائمی حکومت ہے تو پھر بیٹے نے کس پر حکومت کرنی ہے۔

لَقَدۡ اَحۡصٰىہُمۡ وَ عَدَّہُمۡ عَدًّا ﴿۹۵﴾

(خدا نے) ان کو گھیر رکھا ہے اور گن رکھا ہے۔

تفسیر ۔ یہ پہلی آیت کی تشریح ہے اور مراد یہی ہے کہ جب ان میں سے ایک ایک کی گنتی خدا تعالیٰ کے پاس محفوظ ہے تو اسے بیٹے کی کیا ضرورت ہے بیٹے کی احتیاج تو تب ہوتی جب کوئی کام ایسا بھی ہوتا جسے وہ خود سرانجام نہ دے سکتا۔

وَ كُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا ﴿۹۶﴾

اور وہ سب کے سب قیامت کے دن (فرداً) فرداً اس کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

تفسیر ۔عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح نے ہمارا بوجھ اٹھالیا ہے اللہ تعالیٰ اس کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اس دنیا میں بھی خدا تعالیٰ کا قانون چل رہا ہے اور مرنے کے بعد بھی اسی کا قانون جاری ہوگا اور ہر شخص فرداً فرداً اس کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے حاضر ہوگا۔پس یہ غلط خیال ہے کہ تمہاری جگہ مسیحؑ صلیب پر لٹک گیا اور اس نے تمہارا بوجھ اٹھالیا ہر شخص کو اپنی صلیب آپ اٹھا کر چلنا پڑے گا جیسا کہ مسیح ناصری نے بھی کہا ہے۔

''جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہوسکتا۔''

(لوقا باب ۱۴ آیت ۲۷)

اسی طرح انہوں نے کہا۔

''اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہولے'' (مرقس باب ۸ آیت ۳۴)

میں سمجھتا ہوں کہ اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب مسیحؑ خود اس امر کی وضاحت کر چکا ہے کہ ہر شخص کو اپنی صلیب آپ اٹھانی پڑے گی تو تم کس طرح سمجھتے ہو کہ تمہارے سب بوجھ اس نے اٹھا لئے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں (خدائے) رحمٰن ان کے لئے

الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۷﴾

ود پیدا کر دے گا۔

حل لغات ۔وُدًّا اس محبت کو کہتے ہیں جو محبوب کے ساتھ گہرا اور مضبوط تعلق پیدا کر دے اور دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں جس طرح جانور کو کیلے کے ذریعہ زمین کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اسی طرح وُدًّا میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا انسان سے ایسا مضبوط تعلق قائم ہو جائے کہ وہ کٹ نہ سکے۔ یہ لفظ وَدٌّ کی شکل میں

بھی استعمال ہوتا ہے وِدٌّ کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے اور وُدٌّ کی شکل میں بھی استعمال ہوتا ہے او تینوں شکلوں میں محبت شدید کے معنوں میں ہی آتا ہے۔

اس کے معنوں کی حقیقت اس طرح واضح ہوتی ہے کہ وَدٌّ عربی زبان میں وَتَدٌ یعنی میخ کو بھی کہتے ہیں (مفردات) اس وجہ سے کہ اس کے ذریعہ جانور کو زمین کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ پس وُدٌّ ایسی محبت کا نام ہے جو محب اور محبوب دونوں کو اس طرح جوڑ دیتی ہے جیسے کیلا گاڑ کر جانور کو باندھ دیا جاتا ہے اور وہ زمین کے ساتھ متعلق ہوجاتا ہے۔ بے شک رغبت اور انس کے الفاظ بھی عربی زبان میں اظہار محبت کے لئے استعمال ہوتے ہیں مگر ان میں وہ شدت محبت نہیں پائی جاتی جو وُدٌّ میں پائی جاتی ہے رغبت کے معنے صرف اتنے ہوتے ہیں کہ میرے دل میں شوق پیدا ہوگیا ہے اس میں یہ مفہوم داخل نہیں ہوتا کہ محبوب کے دل میں بھی کوئی شوق پیدا ہوا ہے یا نہیں۔ اور انس میں یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ میرے دل میں بھی شوق پیدا ہوگیا ہے اور میرے محبوب پر بھی میری محبت کا اتنا اثر ہوا ہے کہ اس نے اپنا منہ میری طرف کرلیا ہے مگر ود میں یہ مفہوم داخل ہے کہ اس نے صرف منہ ہی نہیں کیا بلکہ محبت نے ہماری آپس میں گرہ باندھ دی ہے اور ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ کردیا ہے قرآن کریم میں جو کفار کے بتوں کے نام آئے ہیں ان میں سے ایک بت کا نام وَدٌّ بھی آیا ہے (نوح: ۲۴) کیونکہ مشرکین کا خیال تھا کہ جیسے کیلے کا زمین سے تعلق ہوتا ہے ایسا ہی اس بت کا خدا تعالیٰ سے تعلق ہے یہ لفظ مدارج محبت کے لحاظ سے رغبت اور انس سے بڑھ کر لیکن خلة سے نچلے مقام پر ہے کیونکہ خلة کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ ایسی محبت جو جسم کے سوراخ سوراخ میں داخل ہوجائے۔ ود میں یہ کیفیت تو پیدا نہیں ہوتی لیکن ایسا مستقل تعلق ضرور پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ کٹ نہیں سکتا۔

تفسیر ۔ حضرت مسیحؑ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا کہ ہم اسے لوگوں کے لئے ایک نشان اور اپنی طرف سے رحمت کا ذریعہ بنائیں گے گویا مسیح کے لئے رحمت کا لفظ آیا تھا مگر مسلمانوں کے لئے ود کا لفظ اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمایا ہے اور جیسا کہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے ود اس محبت کو کہتے ہیں جو کیلے کی طرح گڑی ہوئی ہو۔

قرآن کریم کی یہ خوبی ہے کہ وہ بعض جگہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کو چکر دے کر کئی کئی مضامین نکل آتے ہیں یہاں بھی اسی قسم کا طریق اختیار کیا گیا ہے کیونکہ یہاں لھم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے ہی ان کے فائدہ کے لئے کیونکہ لام فائدہ کے لئے آتا ہے مگر یہ کہ کس کس امر کے متعلق اللہ تعالیٰ ود پیدا کرے گا اسے اللہ تعالیٰ

نے مخفی رکھا ہے تا کہ جتنے معانی پیدا ہو سکتے ہوں وہ اس ایک لفظ سے ہی پیدا ہو جائیں۔

اس نقطۂ نگاہ سے جب ہم غور کرتے ہیں تو سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے معنے عربی زبان کے لحاظ سے یوں بنتے ہیں کہ مومنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اپنی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا یا یہ کہ اپنے دل میں مومنوں کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا یا یہ کہ مومنوں کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا یا یہ کہ بنی نوع انسان کے دل میں مسلمانوں کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا یہ چار معنے ہیں جو اس آیت سے مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) پہلے معنے اس کے یہ ہیں کہ مومنوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اپنی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا چنانچہ دیکھ لو وہ شخص جو خدا تعالیٰ کے انعامات پر غور کرے گا۔ اس کی رحمانیت کی وجہ سے فیضان کو دیکھے گا اور اس کے بے شمار احسانات کا مطالعہ کرے گا اس کے دل میں لازمی طور پر خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو گی اور وہ اس کے قرب میں بڑھنے کی کوشش کرے گا۔ عیسائی کہتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنا بیٹا دنیا کی نجات کے لئے بھیجا ہے اس لئے بنی نوع انسان کا فرض ہے کہ وہ اس سے محبت کریں مگر خدا کہتا ہے کہ ہم تو آپ تم سے رات دن محبت کر رہے ہیں ہم رحمٰن ہیں اور اپنی صفت رحمانیت سے تم کو ہر وقت حصہ دے رہے ہیں کیا تم ہمارے ان انعامات کو دیکھ کر ہم سے محبت نہیں کر سکتے؟ مسیح کو صلیب پر چڑھتے ہم نے نہیں دیکھا اور پھر ہمارے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ ہماری خاطر صلیب پر چڑھا۔ لیکن خدا تعالیٰ کا سورج ہم ہر روز چڑھتا ہیں۔ خدا تعالیٰ کا چاند ہم ہمیشہ آسمان پر چمکتا دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ دریا ہمیں اس دنیا میں اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ نے ہمیں آنکھیں دیں جن سے ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ یہ آنکھیں ہمارے ماں باپ نے ہمیں نہیں دیں نہ ہم نے کہیں سے خریدی ہیں صرف خدا نے اپنی رحمانیت کے طفیل ہمیں عطا کی ہیں۔ اسی طرح اس نے ہمیں زبان دی ہے جس سے ہم بولتے ہیں۔ غلہ دیا ہے جو ہم رات دن کھاتے ہیں چاول دیئے ہیں۔ گوشت دیا ہے ، ترکاریاں دی ہیں، مال دیا ہے، صحت دی ہے عزت دی ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی رحمانیت کے ہزاروں ہزار نظارے ہم روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور ہمارا دل انتہائی محبت کے ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف جھک جاتا ہے مگر تعجب ہے عیسائی کہتے ہیں کہ ہم محبت الٰہی اس واقعہ کی بنا پر کریں جو ہم نے نہیں دیکھا اور ان ہزاروں ہزار انعامات کی بنا پر نہ کریں جو ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔

(۲) دوسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے دل میں مومنوں کی محبت کے لئے کیلے کی طرح گاڑ دے گا اور ایسی محبت کرنے والوں سے خاص تعلق پیدا کرے گا یہ معنے بھی مسلمانوں کے وجود سے ظاہر ہوئے۔ چنانچہ

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ مسلمانوں کا خدا تعالیٰ نے ایسا ساتھ دیا اور اپنی محبت اور پیار کا ان سے ایسا سلوک کیا کہ جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔

(۳) تیسرے معنے اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے دلوں میں بنی نوع انسان کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا۔ حضرت مسیحؑ نے بھی انجیل میں بار بار یہی تعلیم دی ہے کہ دوسروں سے محبت کرو اور ان سے نیکی اور حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ (متی باب ۵ آیت ۴۳)۔ مگر اس محبت کے پیدا کرنے کا یہ ذریعہ نہیں کہ مسیحؑ پر ایمان لایا جائے بلکہ حقیقی محبت بنی نوع انسان کی تب پیدا ہوتی ہے جب انسان خود اپنے آپ کو ایک رنگ میں خدا کا بیٹا سمجھ لے۔ مسیح کو خدا کا بیٹا سمجھنے سے یہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ محبت تب پیدا ہوتی ہے جب انسان وُد کا مقام حاصل کرلے۔ اور جس طرح جانور کیلے کے ذریعہ زمین کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہوجائے جب اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوجاتی ہے تو اس کے بعد اس کے بندوں کی محبت بھی اس دل میں لازمی طور پر جاگزیں ہوجاتی ہے صرف مسیح پر ایمان لانے سے یہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی۔

(۴) چوتھے معنے اس کے یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کے دل میں مسلمانوں کی محبت کیلے کی طرح گاڑ دے گا۔ یہ بھی محبت کا ایک لازمی نتیجہ ہے کیونکہ جب کسی کی محبت ہوگی تو انسان اس کی خدمت بھی کرے گا اور اس کے ساتھ حسن سلوک بھی کرے گا اور اس سے محبت اور پیار کے ساتھ بھی پیش آئے گا اور جب وہ ایسا کرے گا تو لوگوں کے دلوں میں بھی اس کی محبت پیدا ہوجائے گی پس سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا کے ایک یہ بھی معنے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی محبت بنی نوع انسان کے دل میں کیلے کی طرح گاڑ دے گا۔ چنانچہ اس کی مثال ہمیں رومی فتوحات میں ملتی ہے۔ ایک موقعہ پر جب عیسائی لشکر بڑی تعداد میں آگے بڑھا اور مسلمانوں نے سمجھا کہ اب ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تو جو روپیہ مسلمانوں نے ملک کی حفاظت کے ٹیکس کے طور پر وصول کیا تھا وہ سب ملک کے لوگوں کو واپس کردیا اور اس کا اثر عیسائیوں اور یہودیوں پر اتنا ہوا کہ وہ روتے ہوئے مسلمانوں کے لشکر کو وداع کرنے گئے اور پادری بھی اور دوسرے لوگ بھی دعا کرتے جاتے تھے کہ خدا مسلمانوں کو واپس لائے۔ اور یہودی اتنے متاثر تھے کہ وہ کہتے تھے کہ خدا کی قسم ہم اپنی جانیں دے دیں گے مگر عیسائی لشکر کو شہر میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ (فتوح البیان) محبت کا یہ عملی وعظ مسیحؑ کی محبت کی تعلیم سے کتنا زیادہ شاندار ہے۔ مسیحؑ نے تو صرف منہ سے کہا تھا کہ خدا محبت ہے مگر مسلمانوں نے عملاً ثابت کیا کہ خدا محبت ہے اور مسیح کے لئے تو رحمت کا لفظ استعمال ہوا تھا مگر قرآن نے مسلمانوں کے لئے وُد کا لفظ استعمال کیا جو اس سے بہت زیادہ شدید ہے کیونکہ وُدّ کے معنے ہیں کہ

محبت اتنی شدید ہوگئی کہ وہ کیلے کی طرح گڑگئی پس کجا انجیل کی محبت کی تعلیم اور کجا قرآن کی محبت کی تعلیم دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔

غور کرو کہ اس جگہ تھوڑے سے لفظوں میں خدا تعالیٰ نے کتنا وسیع مضمون بیان کر دیا ہے اس مضمون کا اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے ساتھ یہ جوڑ ہے کہ (۱) ایمان اور (۲) مناسب حال عمل سے لوگ محبت کرتے ہیں۔

ایمان میں چونکہ امن دینے کے معنے پائے جاتے ہیں اس لئے مومن وہ ہے جو لوگوں کے لئے برکات اور امن کا موجب ہو اور عمل صالح کے معنے ہیں ایسا عمل جو ضرورت کے مطابق اور مناسب حال ہو پس جس شخص میں یہ دو خوبیاں پائی جائیں گی کہ وہ لوگوں کے لئے امن کا باعث ہوگا اور اس کے تمام اعمال مناسب حال ہوں گے اس سے لوگ لازمی طور پر محبت کریں گے۔

(۲) پھر ایمان اور عمل صالح کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی پیدا ہوگا کہ اس کے دل میں لوگوں کی محبت پیدا ہوجائے گی۔ کیونکہ جو شخص سب سے نیک سلوک کرتا ہے لازمی طور پر اس کے دل میں بھی لوگوں کی محبت پیدا ہوتی ہے۔

(۳) اور پھر جو شخص لوگوں سے حسن سلوک کرے گا اور ان کے بوجھوں کو بٹائے گا اور ان کی ترقی میں حصہ لے گا اور ان کے دکھوں کو دور کرے گا لازماً اس کی محبت بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوجائے گی۔

(۴) اسی طرح جو شخص بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہے اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت بھی پیدا ہوجاتی ہے جیسے وہ شخص جو کسی بچہ سے محبت رکھتا ہے وہ اس کے ماں باپ سے بھی محبت کرتا ہے یہ ناممکن ہے کہ وہ بچے سے محبت کرے اور ماں باپ سے نفرت رکھے۔

(۵) پھر جو شخص خدا تعالیٰ کے عیال سے محبت کرتا ہے خدا تعالیٰ بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

غرض ایمان اور عمل صالح کے نتیجہ میں بنی نوع انسان کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور بنی نوع انسان کی محبت کا لازمی نتیجہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوگ بھی اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں پھر جو شخص بنی نوع انسان سے محبت کے ساتھ پیش آتا ہے اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ تم یہ کس طرح کر سکتے ہو کہ ایک اچھی کتاب پڑھو تو کتاب سے تو تم محبت کرو اور کتاب لکھنے والے سے محبت نہ کرو۔ یا ایک تصویر کو تو تم پسند کرو لیکن مصور کو تم پسند نہ کرو جو شخص بنی نوع انسان سے محبت رکھتا ہے اس کی محبت لازمی طور پر خدا تعالیٰ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے اور وہ مخلوق کے بعد خالق سے بھی محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے صوفیاء کی اصطلاح میں عشق مجازی کہا جاتا ہے یعنی انسانوں کی محبت کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی محبت کا پیدا ہونا مگر بدقسمتی سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ

ظاہری حسن کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے ظاہری حسن کے نتیجہ میں نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی محبت کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور پھر جو شخص خدا تعالیٰ کے عیال سے محبت کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ بھی اس کے لئے اپنی محبت کو مخصوص کر دیتا ہے اور ان چاروں امور کے نتیجہ میں کسی کفارہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ

پس ہم نے تو اس (قرآن) کو تیری زبان میں آسان کر کے اتارا ہے تا کہ تو اس کے ذریعہ سے متقیوں کو

قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۸﴾

بشارت دے اور اس کے ذریعہ سے جھگڑالو قوم کو ہوشیار کرے۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ شریعت لعنت نہیں ہم نے اسے سلجھے ہوئے آسان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ لعنت تب ہوتی جب یہ قابل عمل نہ ہوتی یا ہم کوئی ایسا حکم دیتے جس پر عمل کرنا لوگوں کے لئے نقصان دہ ہوتا۔ اگر ہم نے ایسے ہی احکام دئے ہیں جن پر عمل ہوسکتا ہے اور پھر ایسے احکام دیئے ہیں جن پر عمل کرنے میں لوگوں کا اپنا فائدہ ہے تو پھر شریعت لعنت کس طرح ہوئی؟ پس يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ میں بتایا کہ ہم نے اسے سلجھے ہوئے آسان الفاظ میں بیان کر دیا ہے جس کو مومن خوب سمجھ سکتے ہیں اور اسے قابل عمل یقین کرتے ہیں۔ اگر قابل عمل نہ ہو تو تبشیر نہیں انذار ہوتا ہے۔ اور جب یہ بات ہے تو شریعت کو لعنت قرار دینا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ ہاں جو جھگڑالو ہوں وہ بے شک نہیں مانتے۔ مگر وہ تو شریعت کو لعنت کہو یا رحمت بہر حال نہیں مانیں گے۔

اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم ہر صحیح الفطرت انسان کے نزدیک قابل عمل کتاب ہے اور وہ عمل کرنے والوں کے لئے رحمت اور بشارت ہے۔ لیکن جو شخص ارادہ کر لے کہ میں نے نہیں ماننا اس کے لئے آسان یا مشکل کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے تو جو چیز بھی رکھی جائے گی اس کا وہ انکار کر دے گا۔ کیونکہ اس کی فطرت میں مخالفت ہے۔ لیکن جس کی فطرت میں کجی نہیں اور جو فطرت صحیحہ رکھنے والا انسان ہے وہ جانتا ہے کہ شریعت خدا تعالیٰ کی رحمت ہے اور اس کے تمام احکام بنی نوع انسان کے فائدہ کے لئے ہیں۔ اور خدا نے اس کو آسان اور قابل عمل بنایا ہے۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو ان سے پہلے گذری ہیں (کہ ہم ان کو ہلاک کر چکے ہیں) کیا تو ان میں سے کسی کو بھی کسی

اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۹﴾ ع

حس کے ذریعہ سے محسوس کرتا ہے یا ان کی بھنک سنتا ہے؟

حلّ لُغَات۔ تُحِسُّ حَسَّ الشَّيْءَ وَبِالشَّيْءِ کے معنے ہوتے ہیں عَلِمَهٗ وَشَعَرَبِهٖ وَاَدْرَكَهٗ یعنی کسی چیز کو جاننا اور اسے خوب اچھی طرح پہچاننا اور اَحَسَّ کے معنے ہوتے ہیں رَاٰی (اقرب) اس نے دیکھا اس جگہ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ کے مقابلہ میں تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا کے الفاظ آئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس جگہ تُحِسُّ میں رؤیت والے معنوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

رکزاً رِكْزًا کے معنے ہیں اَلصَّوْتُ الْخَفِيُّ ایسی آواز جو بہت آہستہ ہو۔

تفسیر۔ فرماتا ہے عیسائیوں کا سارا غرور اس وجہ سے ہے کہ ان کو طاقت حاصل ہے شریعت کو لعنت قرار دینا اور کفارہ وغیرہ مسائل کا ایجاد کرنا سب غلط ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ عیاشیاں کرنا چاہتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے قانون پر عمل کرنا نہیں چاہتے انہیں اپنی طاقتوں پر گھمنڈ ہے اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ان پر کبھی زوال نہیں آ سکتا حالانکہ ان کو مغرور نہیں ہونا چاہیے ہم ان سے پہلے کتنی ہی قوموں کو تباہ کر چکے ہیں۔ کیا آج ان میں سے کسی قوم کے نشان تمہیں نظر آتے ہیں۔ یا ان کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دیتی ہے؟ یعنی آج ان کے نشان تک نظر نہیں آتے اُن کی تاریخ تک مشتبہ ہو گئی ہے اور ان کی آہٹ تک سنائی نہیں دیتی۔ یعنی ان کے کام بالکل مخفی ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے وجود کے آثار تک مٹ گئے ہیں اگر پہلی قوموں کے لوگ اس طرح صفحہ ہستی سے ناپید ہو چکے ہیں تو ان کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری طرف سے ان کے لئے اما العذب اما الساعة کا اعلان ہو چکا ہے۔ جن کے لئے عذاب مقدر ہے وہ عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد خدائے واحد پر ایمان لائیں گے۔ اور جن کے لئے عذاب مقدر نہیں بلکہ کامل تباہی مقدر ہے وہ اس طرح تباہ کر دئے جائیں گے کہ نہ وہ خود نظر آئیں گے اور نہ ان کے آثار تک دکھائی دیں گے۔ ایمان غالب آجائے گا اور کفر دنیا سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔

❁❁❁❁

سُوْرَۃُ طٰہٰ مَکِّیَّۃٌ

سورۃ طہٰ۔ یہ سورۃ مکی ہے

وَھِیَ مَعَ الْبَسْمَلَۃِ مِائَۃٌ وَّ سِتٌّ وَّ ثَلٰثُوْنَ اٰیَۃً وَّ ثَمَانِیَۃُ رُکُوْعَاتٍ

اور بسم اللہ کو شامل کر کے اس کی ایک سو چھتیس (۱۳۶) آیات ہیں۔ اور آٹھ رکوع ہیں۔

سورۃ طہٰ مکی ہے یہ سورۃ بلا اختلاف مکی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسے ابتدائی سورتوں میں سے قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے جو سورتیں میں نے حفظ کیں ان میں سے ایک یہ بھی سورۃ ہے اس کے ساتھ انہوں نے سورۂ بنی اسرائیل، کہف، مریم اور انبیاء کو بھی گنا ہے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الانبیاء)

وہیری نے اسے مکی زندگی کے تیسرے دور یعنی قبل از ہجرت کے سالوں میں شمار کیا ہے (تفسیر القرآن از وہیری) کیونکہ اس میں انبیاء بنو اسرائیل کے ذکر تفصیل سے آئے ہیں روایت اور تاریخ کی موجودگی میں محض انبیاء کے ذکر کی وجہ سے جو سورۂ مریم میں بھی موجود ہے اور جسے ابتدائی کہا جاتا ہے اسے آخری زمانہ کی مکی قرار دینا بہت بڑی جرأت ہے۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو ابتدائی صحابی ہیں اس سورۃ کو اپنی ابتدائی یاد کی ہوئی سورتوں میں سے قرار دیتے ہیں۔

تعلق و ترتیب اس سورۃ کا سورۂ مریم سے قریبی تعلق یہ ہے کہ سورۃ مریم کے آخر میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا یعنی یہ کلام تجھ پر تیری زبان میں اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ تو آسانی سے اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو تبلیغ کر سکے اور وہ تیری بات کو سمجھ سکیں اور شریروں پر حجت تمام ہو۔

اسی مضمون کو اس سورۃ کے شروع میں پھیلایا گیا ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ سورۂ مریم اصولی طور پر مسیحیت کے بارہ میں ہے جن کا ایک نقطہ مرکزی یہ ہے کہ شریعت لعنت ہے۔ اس سورۃ میں اس مرکزی نقطہ کا رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ شریعت رحمت ہوتی ہے لعنت نہیں۔ وہ بوجھ نہیں ہوتی بلکہ انسان کے لئے سہولت پیدا کرتی ہے چنانچہ فرماتا ہے مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى یعنی قرآن کا نزول تجھے عزت بخشنے اور خدا تعالیٰ کا سپرد کردہ کام آسان کرنے کے لئے ہے تجھے تکلیف اور دکھ میں ڈالنے کے لئے نہیں۔ اس لئے لفظاً و معناً ہر قسم کی سہولتیں اس کتاب کے نزول میں مدنظر رکھی گئی ہیں۔ زبان تیری اپنی ہے عبارت سلیس ہے مطلب مطابق فطرت و عقل ہے اور عمل آسان

ہے غرض ہر رنگ میں اس کتاب کو بوجھ ہونے سے بچایا گیا ہے۔

سورۃ طٰهٰ کا سورۃ مریم سے تعلق اس سورۃ کا وسیع تعلق پہلی سورۃ سے یہ ہے کہ سورۃ مریم میں مسیحیت کی ابتدائی تاریخ بیان کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ مسیحؑ کی آمد تو توحید کے قیام کے لئے تھی مگر مسیحیوں نے اسے شرک کا ذریعہ بنا دیا اور شریعت کو اڑا دیا اور اسے لعنت قرار دے دیا۔اب سورۃ طٰهٰ میں ابتدائے اسرائیلیت کی طرف مضمون کو منتقل کیا گیا ہے۔اور بتایا ہے کہ موسیٰؑ کا بڑا کارنامہ اس کی شریعت تھی۔چنانچہ موسوی سلسلہ کی طرف اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے توجہ دلائی اور بتایا کہ موسوی سلسلہ شریعت اور توحید پر قائم تھا۔اس کی شاخ عقلاً توحید کے خلاف نہیں ہوسکتی۔پس توحید کے خلاف مسیحی تعلیم بعد کی داخل شدہ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ موسیٰؑ سے ابتدائے آفرینش تک شریعت اور گناہ کی حقیقت بیان کرنے کے لئے مضمون لے گیا ہے جس کا نہ سمجھنا درحقیقت لاشرعیت اور شرک مسیحی کی جڑ اور منبع ہے۔لاشرعیت کی اس لئے کہ اگر ابتدائے عالم سے وحی کو جاری نہ سمجھا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسان کسی زمانہ میں بغیر شریعت کے بھی رہ سکتا ہے اور شرک کا منبع اس لئے کہ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں آئی تو پھر انسان کو کوئی قانون اپنے لئے بنانا پڑے گا اور وہی خدا کا قائم مقام ہو جائے گا یعنی خدا کا شریک بن جائے گا۔

خلاصہ مضامین اس سورۃ کے مضامین کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن آسانیاں پیدا کرنے کے لئے آیا ہے نہ کہ تکلیف میں ڈالنے کے لئے اس کا سمجھنا آسان ہے مگر دل کی کھڑکی کھولنی ضروری ہے اس میں بنی نوع انسان کے ادنیٰ اور اعلیٰ احساسات اور ان کی تمام ضرورتوں کا ذکر ہے اور خدا تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے انسانی پیدائش میں یہ بات مدنظر رکھی تھی کیونکہ وہ فطرت کے باریک رازوں سے واقف ہے اور ہر قسم کی ضرورتوں کے سامان مہیا کرنے اس کے اختیار میں ہیں۔پس جو قانون خدا تعالیٰ دے وہ عذاب نہیں بلکہ رحمت ہے (آیت ۳ تا ۹)

مسیحیوں کو چاہیے کہ ان صداقتوں کے سمجھنے کے لئے موسیٰؑ کے حالات پر غور کریں اور سوچیں کہ کس طرح مایوسی کے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی مدد کی اور اسے ہدایت بخشی اور اس پر اپنا وجود ظاہر کیا جو توحید کے رنگ میں ہی تھا۔غرض موسیٰؑ کو برگزیدہ بنایا گیا اور وہ وحی الٰہی کا حامل ہوا اور اسے سب سے پہلا حکم شریعت توحید کا ہی دیا گیا اور کہا گیا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا۔یعنی تمام جہان میں صرف میں ہی ایک معبود ہوں۔اور عبادت الٰہی کی تاکید کی گئی اور برے بھلے عمل کی جزا وسزا کا وعدہ دیا گیا اور بتایا گیا کہ جزا وسزا مطابق اعمال ہوگی نہ کہ مطابق کفارہ۔(آیت ۱۰ تا ۱۶)

پھر موسیٰ کو بتایا گیا کہ اصلاح قوم کا حقیقی ذریعہ صحبت صلحاء ہے (آیت ۱۷ تا ۲۴)

پھر فرماتا ہے ہم نے موسیٰؑ کو اس کی قوم کے لئے صحیح ذریعہ اصلاح بتا کر اسے فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا اور اس کے لئے دعا کا طریق سکھایا جو خدا تعالیٰ سے کی جاتی ہے نہ کہ کسی غیر اللہ سے اور اس کے بھائی کو اس کی درخواست پر اس کے ساتھ مقرر کیا اور خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرا دوسرا احسان ہے۔ پہلا احسان وہ تھا کہ فرعونیوں سے بچانے کے لئے تجھے دریا میں ڈالا گیا اور میں نے تجھے اس سے نجات دلوائی اور تیرے رشتہ داروں کو تیرے پاس جمع کر دیا (آیت ۲۵ تا ۴۱)

پھر جب تیری جنگ فرعونی حکومت سے چھڑی تو ہم نے تجھے بچایا اور تجھے نجات دی۔ اور میں تیری روحانی پرورش کرتا رہا یہاں تک کہ تو اصل کام کے قابل ہو گیا اور ہم نے کہا اب جا اور فرعون کو سمجھا اور اپنی قوم کو اس سے لے کر کنعان کے ملک کی طرف لے جا۔ چنانچہ وہ گئے اور فرعون کو سمجھایا (آیت ۴۱ تا ۷۷)

جب فرعون نے نہ مانا تو ہم نے موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کے نکال لے جانے کا حکم دے دیا فرعون نے پیچھا کیا مگر سزا پائی (آیت ۷۸ تا ۸۰)

پھر طور پر کلام الٰہی کا سلسلہ شروع ہوا اور شریعت نازل ہوئی اور توبہ کا دروازہ کھولا گیا (آیت ۸۱ تا ۸۳)

مگر باوجود اس کے بنی اسرائیل نے شرک کیا جس پر ان کو سزا ملی اور توحید کی طرف ان کو کھینچ کر لایا گیا۔ (آیت ۸۴ تا ۹۹)

یہ مسیحؑ سے پہلے کے مذہبی حالات ہیں اور بعد میں تو آیا ہے۔ تو بھی وہی تعلیم لایا ہے۔ پھر یہ درمیان میں بے جوڑ تعلیم کیسی آ گئی جو شریعت کو لعنت کہتی ہے اور خدا کے شریک قرار دیتی ہے۔ (آیت ۱۰۰ تا ۱۰۳)

اس کے بعد مسیحیوں کے عذاب اور ان کی ہزار سالہ ترقی کا ذکر کیا۔ یعنی چوتھی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک جس میں سے تین صد اعلیٰ ترقی کے سال ہوں گے۔ جس طرح مسلمانوں کے ہزار سال میں تین صد اعلیٰ ترقی کے سال تھے۔ اس فرق سے کہ مسلمانوں کے پہلے تین صد اعلیٰ تھے اور مسیحیوں کے آخری تین صد اعلیٰ ہوں گے۔ اور اس فرق سے کہ عیسائیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے چھ سو سال مذہب کے قیام کے ملے اور مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تیرہ سو سال گذرنے کے بعد چھ سو سال اسلام کے روحانی استحکام کے ملیں گے۔ (آیت ۱۰۴ و ۱۰۵)

فرماتا ہے اس وقت لوگ سوال کریں گے کہ یہ پہاڑ اڑیں گے کس طرح؟ یعنی یہ عیسائی حکومتیں جو اتنی

زبردست ہوگئی ہیں کس طرح تباہ ہوں گی ؟ مگر ہم بتاتے ہیں کہ وہ اڑ جائیں گے اور مسلمان ترقی پا جائیں گے(آیت ۱۰۶ تا ۱۱۳)

اس کے بعد پھر ابتدائے سورۃ کے مضمون کی طرف رجوع کیا کہ اس قرآن کا سمجھنا آسان ہے۔کیونکہ یہ قرآن ملکی زبان میں ہے(غالباً مسیحیوں کو طعنہ ہے جو انجیل کے یونانی میں ہونے پر زور دیتے ہیں)اور پھر اس میں مضمون بھی خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے اس لئے تمثیل والی مصیبت سے محفوظ ہے جس کا کثرت سے اور مبالغہ آمیز طور پر استعمال انجیل میں کیا جاتا ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بھی مَثَل کا لفظ استعمال ہوا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَ لَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (بنی اسرائیل:۹۰)اور یہی مضمون سورۃ کہف رکوع ۸ میں بھی بیان ہوا ہے مگر وہاں مَثَل کا لفظ تمثیل کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ بیان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن کریم میں ہر قسم کے مضامین مختلف پیرایوں میں عمدگی کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں(آیت ۱۱۴)

پھر بتایا کہ شریعت لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے اس لئے احکام سماوی کے متعلق خود فیصلے نہیں کرنے چاہئیں بلکہ وحی کا انتظار کرنا چاہیے(آیت ۱۱۵)

اس کے بعد موسیٰ ؑ سے اوپر عروج کیا اور بتایا کہ آدم کا وہ واقعہ جس پر مسیحیت کی ساری بنیاد ہے محض ایک غلط فہمی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور اس سے زیادہ حقیقت ہو بھی نہیں سکتی کیونکہ آدم جس سے یہ واقعہ پیش آیا تھا اس کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سکیم کے ماتحت تھی پھر کس طرح ممکن تھا کہ خدا تعالیٰ کی سکیم ناکام ہو جاتی۔چنانچہ بائیبل میں بھی لکھا ہے کہ

خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا '' (پیدائش باب ۱ تا آیت ۲۷)

لیکن ساتھ ہی بائیبل یہ بھی کہتی ہے کہ آدم نے حوا کے ورغلانے پر گناہ کیا(پیدائش باب ۳ آیت ۱۲)اس کے مقابلہ میں قرآن کہتا ہے کہ آدم نے گناہ نہیں کیا بلکہ صرف ایک لغزش تھی جو بغیر ارادہ کے اس سے ظہور میں آئی جیسا کہ فرماتا ہے کہ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا(طٰہٰ:۱۱۶)پس قرآن کریم کا مضمون عقل کے بھی مطابق ہے اور بائیبل کے بھی اس بیان کے مطابق ہے کہ آدم کو خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا لیکن بائیبل کا بیان آپس میں تضاد رکھتا ہے بائیبل نے پہلے خود کہا کہ آدم خدا کی شکل پر پیدا کیا گیا تھا لیکن بعد میں اس کے افعال کو شیطانی قرار دے دیا حالانکہ اگر آدم نے فی الواقعہ گناہ کیا تھا تو درحقیقت خدا تعالیٰ کی سکیم فیل ہوئی اور نعوذ باللہ اس کی کمزوری ثابت ہوئی(آیت ۱۱۶ تا ۱۲۴)

پس شریعت سے مونہہ موڑنا تباہی کا موجب ہے اور وہی ایسا کرتا ہے جو بینائی سے محروم ہوتا ہے (آیت ۱۲۵ تا۱۲۹)

پھر بتایا کہ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ صداقت کے منکر بھی دنیا میں موجود ہیں اور انہیں سزا نہیں مل رہی آسمانی قانون کے مطابق ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے تو اپنے لوگوں کی اصلاح میں لگارہ انجام کار تیری ہی فتح ہوگی (آیت ۱۳۰ تا ۱۳۳)

اس کے بعد فرمایا کہ جب تیرے دلائل لوگ سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نشان کیوں نہیں دکھاتے؟ تو کہہ نشان وہی ہے جو پہلے نبیوں نے دکھایا۔ تمہارے تجویز کردہ نشان کیا حقیقت رکھتے ہیں پہلے نبیوں کے دشمنوں کو بھی مہلت ملی تھی مگر حجت تمام ہونے پر عذاب آیا اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ ورنہ خدا تعالیٰ پر ظلم کا الزام عائد ہوتا ہے (آیت ۱۳۴ تا۱۳۶)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۱﴾

(میں) اللہ (تعالیٰ) کا نام لے کر جو بے حد کرم کرنیوالا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے (پڑھتا ہوں)

طٰهٰ ﴿۲﴾ج

اے کامل قوتوں والے مرد۔

تفسیر ۔ **طٰہٰ مقطعات میں سے نہیں ہے** ہم نے سورۃ یونس کی تفسیر کے ابتداء میں قرآنی مقطعات پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ طٰہٰ بھی حروف مقطعات میں سے ہے لیکن بعد میں لغت اور مفسرین کے اقوال پر اور اس سورۃ کے مضامین پر مزید غور سے معلوم ہوا کہ چونکہ حروف مقطعات کی طرح طاء اس جگہ کسی مستقل لفظ کا قائم مقام نہیں اور نہ ھاء اس جگہ کسی اور مستقل لفظ کی قائم مقام ہے بلکہ ھاء طاء کے ساتھ مل کر ایک مستقل معنے دیتی ہے اور وہ معنے یَارَجُلُ کے ہیں اس لئے اسے ایک مستقل لفظ قرار دینا چاہیے۔ حروف مقطعات میں سے نہیں سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ تفسیر فتح البیان میں لکھا ہے کہ اِنَّهَا بِمَعْنٰى يَا رَجُلُ فِيْ لُغَةِ عُكْلٍ وَ فِيْ لُغَةِ عَكٍّ قَالَ الْكَلْبِيُّ لَوْ قُلْتُ لِرَجُلٍ مِّنْ عَكٍّ يَا رَجُلُ لَمْ يُجِبْ حَتّٰى تَقُوْلُ طٰهٰ وَ قَالَ قُطْرُبُ هِيَ كَذٰلِكَ فِيْ لُغَةِ طَيٍّ ءٍ (تفسیر فتح البیان جلد ۶ صفحہ ۴۹ زیر آیت ھذا) یعنی عکل اور عک جو قبائل عرب میں سے ہیں ان کی زبان میں طٰہٰ کے

معنے یَارَجُلُ کے ہیں کلبی کہتے ہیں کہ اگر تم کسی عک قبیلہ کے شخص کو یَارَجُلُ کہہ کر پکارو تو وہ بالکل جواب نہیں دے گا ہاں اسے طٰہٰ کہو تو وہ بول پڑے گا قطرب جو ایک مشہور لغوی اور نحوی ہیں اور سیبویہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے کہتے ہیں کہ یہ لفظ طے قبیلہ میں بھی اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔لسان العرب میں بھی اس استعمال کا ذکر کیا گیا ہے پس طٰہٰ کے معنے عرب کے مختلف قبیلوں میں چونکہ اے مرد کامل القویٰ کے پائے جاتے ہیں۔اس لئے ہم نے طٰہٰ کا ترجمہ اسی نظریہ کے ماتحت کیا ہے اور اسی نظریہ کے ماتحت اب ہم سورۂ طٰہٰ کو سورۂ مریم کے مضمون کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔

طٰہٰ کے لفظ سے آنحضرتؐ کے کامل ہونے کی طرف اشارہ کامل قوتوں والے مرد سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مردانگی کی تمام اعلیٰ صفات یعنی شجاعت اور سخاوت اور بدی کا مقابلہ وغیرہ کامل طور پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی ہیں اور اسی وجہ سے تمام عالم انسانی میں صرف آپ ہی کامل انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔ چنانچہ جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حقیقتاً ایک کامل انسان تھے اور آپ میں وہ تمام اوصاف بدرجہ اتم پائے جاتے تھے جو ایک کامل قوتیں رکھنے والے مرد کے اندر پائے جانے چاہئیں۔مثلاً بدی کے مقابلہ کی قوت کو ہی لے لو۔اس نقطہ نگاہ سے جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو آپؐ کے پاکیزہ ومطہر قلب میں ہمیں بدی کے مقابلہ کی اس قدر شدید تڑپ دکھائی دیتی ہے کہ جس کی دنیا میں اور کہیں نظیر نہیں آتی۔آپ ابھی نبوت کے مقام پر فائز بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپ نے اس فطری جذبہ کے مطابق اس راستہ کی تلاش اور جستجو شروع کر دی جس پر چل کر اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا عرفان حاصل ہوسکتا ہو اس وقت حالت یہ تھی کہ آپ کا گردو پیش سارے کا سارا کفر اور شرک سے بھرا ہوا تھا۔کوئی قوم ایسی نہ تھی جو شرک اور بت پرستی میں مبتلا نہ ہو۔ایک طرف آپ کے ملنے والے عیسائی اور یہودی لوگ تھے جو شرک میں مبتلا ہو چکے تھے اور دوسری طرف مکہ کے لوگ تھے جو سرتاپا شرک میں ملوث تھے آپ نے ان تینوں قوموں کو دیکھا اور آپ کو محسوس ہوا کہ ان قوموں کے اندر معرفت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے کفار مکہ شرک کے اندر سر سے پاؤں تک غرق تھے یہاں تک کہ خانہ کعبہ کے اندر بھی تین سو ساٹھ بتوں کی پرستش ہوتی تھی (بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی الرایۃ یوم الفتح)۔ادھر یہودی اور عیسائی بھی شرک میں مبتلا تھے اور خدا کا خانہ بالکل خالی ہو چکا تھا۔ یہودی لوگ یوں تو زبان سے شرک کے قائل نہ تھے مگر وہ ایک نبی کو خدا کا بیٹا قرار دیتے تھے جیسا کہ قرآن کریم میں ہی آتا ہے کہ یہودی کہتے تھے عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ (التوبۃ:۳۰) یعنی عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔بہر حال یہ تینوں قومیں یعنی

کفار مکہ اور یہودی اور عیسائی خدا تعالیٰ کی معرفت اور صداقت پر قائم نہ تھیں۔ یہود کو تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی نافرمانیوں اور مخالفت کی وجہ سے مجرم قرار دے دیا تھا۔ پس وہ قوم جو مجرم قرار پا چکی تھی وہ کس طرح کسی کی رہنمائی کر سکتی تھی عیسائی مشرک تھے کیونکہ وہ ایک خدا کی بجائے تین خدا مانتے تھے اور مکہ والے بت پرست تھے پس جب آپؐ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور تفرید ان تینوں قوموں کے اندر مفقود ہے اور یہ سارے کے سارے کفر اور شرک کے تاریک گڑھوں میں گر چکے ہیں تو آپ کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی کہ میں کوئی ایسا رستہ تلاش کروں جو اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق ہو۔ یہ تڑپ آپ پر اتنی غالب آئی کہ آپ کو دنیا سے نفرت ہوگئی اور آپ نے اپنے گردوپیش کے شرک سے نفرت ظاہر کرتے ہوئے ان لوگوں کی مجالس میں شرکت سے پرہیز کرنا شروع کر دیا جو دن رات بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے مگر چونکہ آپ کے چاروں طرف ایسے لوگ بستے تھے جو بتوں پر چڑھاوے چڑھاتے تھے اور بتوں کی تعریف میں شعر کہتے تھے اور ان سے کلی علیحدگی ایک ناممکن امر تھا اس لئے آپ نے ارادہ کیا کہ کہیں الگ ہو کر خدائے واحد سے مدد طلب کی جائے تا کہ اس کی طرف سے ہدایت کے سامان پیدا ہوں چنانچہ آپ حضرت خدیجہؓ سے کئی کئی دن کا کھانا ساتھ لے کر مکہ سے باہر تین چار میل کے فاصلہ پر غار حرا میں تشریف لے جاتے اور وہاں یاد الٰہی میں مشغول رہتے اس زمانہ میں اور تو کوئی خاص کھانا نہ ہوتا تھا صرف کچھ کھجوریں ستو اور سوکھا گوشت آپ اپنے ساتھ لے جاتے اور متواتر کئی کئی دن اس غار میں عبادت الٰہی اور دعاؤں میں مشغول رہتے تا کہ آپ کو اور دوسرے بنی نوع انسان کو وہ رستہ مل جائے جو خدا تک پہنچاتا ہے۔ یہ تڑپ جو آپ کے دل میں پیدا ہوئی ایک غیر معمولی تھی اور پھر یہ ایسی تڑپ تھی جس میں کسی انسانی مدد کا کوئی سوال نہ تھا کیونکہ دنیا کا کوئی انسان اس میں آپ کا ہاتھ نہیں بٹا سکتا تھا۔ دوسرے کاموں میں تو عزیزوں اور دوستوں کی مدد کام دے سکتی ہے یا روپیہ کام دے سکتا ہے لیکن اس کام میں کوئی انسانی طاقت آپ کی مدد نہ ہو سکتی تھی اگر تو آپ کے زمانہ میں کوئی مذہب حقہ موجود ہوتا تو اس کی مدد ایک ذریعہ بن سکتی تھی۔ مگر آپ کے زمانہ میں کوئی مذہب حقہ موجود نہ تھا اور تمام کی تمام قومیں شرک میں مبتلا تھیں اس لئے وحدانیت کی تلاش کی تڑپ ایک ایسی چیز تھی جس میں سوائے خدا تعالیٰ کے دنیا کی کوئی طاقت آپ کی مدد نہ کر سکتی تھی۔ حضرت خدیجہؓ آپ کی وفادار اور غمگسار بیوی تھیں مگر وہ بھی اس معاملہ میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتی تھیں آپ کے دوست بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے آپ کے اقرباء بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے عیسائی راہب بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے اور مکہ کے کاہن بھی اس میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے بلکہ وہ تو خود گم گشتہ راہ تھے انہوں نے آپ کی کیا مدد کرنی تھی ان سب سے بہتر خود

آپ کی اپنی فطرت تھی جو بچپن سے ہی ایسی تھی کہ شرک سے سخت متنفر تھی چنانچہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے چچا زید بن عمرو جنہوں نے زمانہ جاہلیت میں ہی شرک چھوڑ دیا تھا اور جو اپنے آپ کو شرک کے خلاف ایک بڑے مقام پر سمجھتے تھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے گفتگو کے بعد آپؐ نے ان سے فرمایا کہ آؤ کھانا کھالو۔ اس پر زید نے کہا میں مشرکوں کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھایا کرتا۔ یہ سن کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے کبھی شرک نہیں کیا (بخاری کتاب مناقب الانصار باب حدیث زید ابن عمرو بن ثقیل)۔ مگر زید نے تو یہودیوں کی صحبت میں رہ کر شرک کی تھوڑی بہت مخالفت سیکھی تھی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں پیدائشی طور پر یہ بات موجود تھی یوں احکام الٰہی اور شریعت کی تفاصیل الہام الٰہی کے ذریعہ آپ کو معلوم ہوئیں لیکن جہاں تک توحید سے محبت اور شرک سے انتہائی نفرت کا سوال ہے یہ چیز بچپن سے ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت میں موجود تھی۔ آپ اتنا تو جانتے تھے کہ خدا ایک ہے اور ایک ہی ہونا چاہیے لیکن خدا تک پہنچنے کے لئے اور معرفت کے حصول کے لئے رستہ کون سا ہے یہ آپ کو معلوم نہ تھا۔ اسی چیز کی تلاش میں آپ غار حرا میں عبادت کے لئے تشریف لے جایا کرتے تھے ایک دن آپ اپنے معمول کے مطابق عبادت الٰہی میں مشغول تھے کہ خدا تعالیٰ کا فرشتہ آپ پر ظاہر ہوا اور اس نے کہا اقرء یعنی پڑھ آپ نے فرمایا۔ مَاۤ اَنَا بِقَارِیءٍ یعنی میں تو پڑھ نہیں سکتا فرشتے نے یہ سنا تو آپ کو زور کے ساتھ اپنے سینے سے لگا کر بھینچا اور چھوڑ کر پھر کہا اِقْرَاْ مگر آپ نے پھر وہی جوب دیا کہ مَاۤ اَنَا بِقَارِیءٍ فرشتہ نے پھر آپ کو پکڑا اور زیادہ زور کے ساتھ سینہ سے لگا کر بھینچا اور چھوڑ کر کہا اقرء مگر آپ نے پھر فرمایا مَاۤ اَنَا بِقَارِیءٍ اس پر فرشتہ نے تیسری بار پھر آپ کو پکڑا اور نہایت زور کے ساتھ سینہ سے لگا کر بھینچا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے دنیا کی تمام اشیاء کو پیدا کیا ہے اور جس نے انسان کو ایک خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا ہے۔ ہم پھر تجھے کہتے ہیں کہ پڑھ۔ تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ساتھ سکھایا ہے اور اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ پہلے نہیں جانتا تھا۔ (بخاری کتاب بدء الوحی باب کیف کان بدء لوحی)

یہ آیات آپ پر پہلے دن غار حرا میں نازل ہوئیں اور اس طرح خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ کو بتایا گیا کہ اب آپ کو وہ علوم عطا کئے جانے والے ہیں جو اس سے پہلے دنیا میں کوئی انسان نہیں جانتا۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم تجھے وہ علوم عطا کریں گے جن کو انسان بھول چکا ہے۔ بلکہ فرمایا ہم تجھ پر وہ علوم ظاہر کریں گے جن کو پہلے کوئی نہیں جانتا اگر اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ میں تجھے وہ علوم عطا کروں گا جو انسان بھول چکا تھا تو اس کے معنے یہ

ہوتے کہ میں تجھے وہ علم اور ہدایت دے رہا ہوں جو میں نے ابراہیم کو دی تھی اور اب انسان اس کو بھول چکا ہے یا میں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو میں نے نوح کو دیئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے۔ یا میں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو میں نے موسیٰ کو دیئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے۔ یا میں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو میں نے عیسیٰ کو دیئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے۔ یا میں تجھے وہ علوم عطا کر رہا ہوں جو میں نے اور انبیاء کو عطا کئے تھے اور اب انسان ان کو بھول چکا ہے بلکہ اس نے یہ فرمایا کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ میں تجھے وہ علوم عطا کرنے والا ہوں جو نہ آدمؑ کو ملے نہ ابراہیمؑ کو ملے نہ موسیٰ کو ملے نہ عیسیٰ کو ملے اور نہ کسی اور نبی کو ملے۔ پس درحقیقت ان پہلی آیتوں میں ہی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا تھا کہ آپ خاتم النبیین کے مقام پر فائز ہونے والے ہیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تعلیم ملنے والی ہے جو پہلے کسی نبی کو حاصل نہیں تھی۔ گو یا طٰہٰ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس کی طرف اس ابتدائی الہام میں بھی اشارہ کر دیا گیا اور بتا دیا گیا کہ آپ روحانی نقطہ نگاہ سے اپنے اندر کامل قوتیں رکھنے والے ہیں اور اسی وجہ سے آپ کو ایک کامل اور غیر متبدل تعلیم عطا کی جانے والی ہے۔

اب اس کے بعد ایک اور مرحلہ شروع ہوا جس نے ثابت کر دیا کہ آپ حقیقۃً طٰہٰ تھے اور ایک کامل انسان میں جس قدر اوصاف پائے جانے چاہئیں وہ سب کے سب آپ میں پائے جاتے تھے جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اقرء یعنی جا اور دنیا کو میرا پیغام پہنچا دے تو یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ جا اور فرعون تک میرا پیغام پہنچا دے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گھبرا کر کہا کہ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ اے خدا یہ ایسا بوجھ نہیں جس کو میں اکیلا برداشت کر سکوں اس لئے میری مدد کے لئے میرے ہی اہل میں سے ایک آدمی میرے ساتھ مقرر کر دیں۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کہا۔ بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہا کہ جا اور دنیا تک میرا پیغام پہنچا دے تو آپ نے اکیلے ہی اس بوجھ کو برداشت کر لیا اور خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے لئے اپنے گھر کی طرف چل پڑے آپ نے گھر پہنچ کر حضرت خدیجہؓ کو یہ تمام واقعہ سنایا اور پھر کہا لَقَدْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ یعنی خدا تعالیٰ نے ایک بہت بڑا کام میرے سپرد کیا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ میں اس عظیم الشان کام کو سرانجام بھی دے سکوں گا یا نہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو آپ کی پاکیزہ زندگی کی شاہد تھیں انہوں نے یہ سنتے ہی کہا کَلَّا وَاللّٰہِ مَا یُخْزِیْكَ اللّٰہُ اَبَدًا نہیں نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْکَلَّ وَتَکْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَتَقْرِی الضَّیْفَ وَتُعِیْنُ عَلٰی نَوَائِبِ الْحَقِّ کیونکہ آپ ہمیشہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں اور لوگوں کے بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ

اخلاق فاضلہ جو دنیا سے مٹ چکے ہیں ان کو از سر نو قائم کر رہے ہیں اور ہمیشہ مہمان نوازی کرتے ہیں اور اگر کوئی شخص بغیر کسی شرارت کے مصیبت میں پھنس جائے تو آپ اس کی اعانت فرماتے ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے عظیم الشان اوصاف رکھنے والے انسان کو خدا چھوڑ دے۔(بخاری باب بدء الوحی)

دنیا میں انسان کے اخلاق اور اس کے کردار کی سب سے بڑی گواہ اس کی بیوی ہوتی ہے۔ جو رات دن اس کے حالات کو دیکھتی رہتی ہے۔ پس یہ گوہی سب سے زیادہ معتبر گواہی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں طٰہٰ تھے یعنی ایک کامل مرد میں جو فضائل اور اوصاف پائے جانے چاہئیں وہ سب کے سب آپ میں اپنی پوری شان کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ چنانچہ جب ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی پر تفصیلی طور پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی پیدائش سے قبل ہی اللہ تعالیٰ نے آپ میں وہ تمام اوصاف ودیعت فرما دیئے تھے جو ایک کامل القویٰ مرد میں پائے جانے چاہئیں تا کہ آپ ہر قسم کے لوگوں کے لئے نمونہ بن سکیں ہمیں اس سے انکار نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام بھی ایک اعلیٰ درجہ کے نبی تھے لیکن وہ ہر زمانہ اور ہر قسم کے لوگوں کے لئے نمونہ نہیں تھے۔ مثلاً انجیل سے آپ کی شادی ثابت نہیں۔ اس لئے شادی شدہ لوگوں کی متاہلانہ زندگی میں آپ کوئی راہنمائی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح آپ بادشاہ نہیں ہوئے کہ آج بادشاہ یہ کہہ سکیں کہ مسیحؑ ہمارے لئے بھی نمونہ ہے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حالات میں سے گذرے جن کے نتیجہ میں آپ دنیا کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لئے ایک بے مثال نمونہ بن گئے اور پھر زندگی کے ہر مرحلہ میں آپ نے اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاق اور بلند کردار کا اظہار کر کے ثابت کر دیا کہ آپ کے اندر کامل روحانی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد آپ کی پیدائش سے قبل ہی فوت ہو چکے تھے اور بہت چھوٹی عمر میں آپ کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ مگر دادا کی زیر نگرانی جو باپ کا قائم مقام تھا آپ نے بتا دیا کہ اخلاق کیسے ہونے چاہئیں۔ یتیم کی حالت دو قسم کی ہوتی ہے۔ یا تو بچہ بہت ہی سر چڑھ جاتا ہے یا بہت ہی پژمردہ رہنے لگتا ہے اگر اس کے نگران ایسے لوگ ہوں جو اس کی دلجوئی کے خیال سے ہر وقت پیار ہی کرتے رہیں تو اس کی اخلاقی حالت بہت ہی گر جاتی ہے اور اگر وہ ایسے لوگوں کی تربیت میں ہو جو سمجھیں کہ ہمارا بچہ تو یہ ہے ہی نہیں تو یتیم کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے مگر بچپن میں ہی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ایسا اعلیٰ تھا کہ آپ کے ہمجولی بیان کرتے ہیں کہ گھر میں کسی چیز کے لئے آپ چھینا جھپٹی نہیں کرتے تھے بلکہ وقار کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے حتیٰ کہ چچی خود بلا کر آپ کا حصہ دیتیں پھر آپ وقار کے ساتھ ہی اس کا استعمال کرتے۔ آپ کی رضاعی والدہ کا بیان ہے کہ آپ میں ایسی سعادت

تھی کہ بچے بھی حیران رہ جاتے تھے۔ رضاعی بھائی بیان کرتے ہیں کہ آپ لغو کھیلیں نہیں کھیلتے تھے۔ مذاق کر لیتے تھے مگر جھوٹی باتوں سے سخت نفرت تھی اس زمانہ میں ایسی ہمدردی آپ کے اندر پائی جاتی تھی کہ چھوٹے بچے بھی آپ کو اپنا سردار سمجھتے تھے (تاریخ الخمس جلد ا زیر ذکر شق صدر صفحہ ۲۲۵) پھر جس قسم کا حسن سلوک آپ نے ابوطالب اور اپنی چچی سے کیا ہے اس کی نظیر سگے بیٹوں میں بھی نہیں ملتی فتح مکہ کے بعد لوگوں نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! آپ کس مکان میں ٹھہریں گے اس پر آپ نے بغیر کسی قسم کے غصہ کے فرمایا عقیل نے کوئی مکان باقی چھوڑا ہے کہ اس میں ٹھہریں یعنی چچازاد بھائیوں نے سب مکان بیچ دیئے ہیں۔ اب ہمارا کون سا مکان ہے جس میں ہم ٹھہریں۔ پھر آپ نے نہ صرف باپ کی محبت کو ابوطالب کے متعلق قائم رکھا بلکہ دوسروں کو بھی تعلیم دی کہ ماں باپ کو اف بھی نہ کہو (بخاری کتاب المغازی باب این رکز النبی الرایۃ یوم الفتح)۔

اس کے بعد آپ جوان ہوئے لوگ اس عمر میں کیا کچھ نہیں کرتے۔ عرب میں اس وقت کوئی قانون نہ تھا کوئی اخلاقی ضابطہ نہ تھا۔ لوگ اس پر فخر کرتے تھے کہ ہمارا فلاں کی عورت یا لڑکی سے ناجائز تعلق ہے اس ماحول میں رہنے والے نوجوانوں سے کوئی شخص بلند کردار کی توقع نہیں کرسکتا مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی گندی فضا کے باوجود جوانی میں ایسا اعلیٰ نمونہ دکھایا کہ لوگ آپ کو امین اور صدوق کہتے تھے (سیرۃ النبی لابن ھشام جلد ا اختلاف قریش فی من یضع الحجر) یہ کہنا کہ آپ جھوٹ نہ بولتے تھے آپ کی ہتک ہے کیونکہ آپ صداقت کا ایسا اعلیٰ نمونہ تھے کہ جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اور صداقت کا مقام جھوٹ نہ بولنے سے اوپر ہے پس آپ کا یہی کمال نہیں کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے تھے بلکہ آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ صدوق کہلاتے تھے۔ آپ کے کلام میں کسی قسم کا اخفاء اور پردہ دری یا فریب نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جو کچھ کہہ دیتے تھے لوگ اسے تسلیم کر لیتے آپ نے اہل مکہ سے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک بڑا لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم یقین کر لو گے۔ سب نے کہا ہاں ہم مان لیں گے (بخاری کتاب التفسیر سورۃ الشعراء باب وانذر عشیرتک الاقربین) حالانکہ ویران علاقہ تھا اور صفا اور مروہ پر چڑھ کر دور دور نظر جاتی تھی ایسی حالت میں آپ کی بات ماننے کے صاف معنے یہی تھے کہ وہ اپنی آنکھوں کو جھوٹا سمجھتے حالانکہ وہ دیکھ رہے ہوتے کہ کوئی لشکر نہیں مگر وہ سب کے سب اپنی آنکھوں کو جھوٹا سمجھنے کے لئے تیار تھے لیکن یہ کہنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں اور جب سب نے یہ اقرار کر لیا تو آپ نے فرمایا۔ خدا نے مجھے تمہاری ہدایت واصلاح کے لئے بھیجا ہے۔

پھر آپ کی صداقت کے متعلق ایک شدید ترین دشمن کی گواہی موجود ہے اہل مکہ کو جب خیال ہوا کہ حج کے

موقعہ پر لوگ جمع ہوں گے تو عین ممکن ہے کہ آپ ان میں سے بعض کو اپنے ساتھ ملا لیں تو وہ لوگوں کو آپ سے بدظن کرنے کی تجویزیں سوچنے لگے کسی نے کہا یہ مشہور کر دو کہ یہ شاعر ہے کسی نے کہا یہ مشہور کر دو کہ یہ مجنون ہے۔ اتنے میں ایک شخص بولا اور کہنے لگا اس میں گھبراہٹ کی کونسی بات ہے۔ ہم کہہ دیں گے کہ یہ جھوٹا ہے اس پر انہی میں سے ایک مخالف نضر بن الحارث بڑے جوش سے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان جوان ہوا، اس کے اخلاق تم سب سے زیادہ اچھے تھے وہ تم سب سے زیادہ راستباز تھا۔ وہ تم سب سے زیادہ امین تھا مگر جب تم نے اس کی کنپٹیوں میں سفید بال دیکھے اور وہ تمہارے پاس وہ تعلیم لے کر آیا جس کا تم انکار کر رہے ہو تو تم نے کہہ دیا کہ وہ جھوٹا ہے خدا کی قسم وہ ہرگز جھوٹا نہیں۔ (شفاء قاضی عیاض جزء اول صفحہ ۵۱)

پھر ہم آپ کی زندگی کے اخلاقی پہلو اور غرباء کی امداد کو لیتے ہیں تو اس میں بھی ہمیں آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔

مکہ کے بعض اشخاص نے مل کر ایک ایسی جماعت بنائی تھی جو غریب لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے اور چونکہ اس کے بانیوں میں سے اکثر کے نام میں فضل آتا تھا اس لئے اسے حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ اس میں آپ بھی شامل ہوئے یہ زمانہ نبوت سے بہت پہلے کی بات ہے۔ بعد میں صحابہؓ نے ایک دفعہ اس کے متعلق دریافت کیا۔ تو آپ نے فرمایا یہ تحریک جو مظلوموں کی امداد اور غرباء کے حقوق کے لئے جاری کی گئی تھی مجھے ایسی پیاری تھی کہ اگر آج بھی مجھے کوئی شخص اس کی طرف بلائے تو میں اس میں شامل ہونے کے لئے تیار ہوں (السیرۃ الحلبیۃ جزء اول باب شھودہ حلف الفضول)۔ گویا غرباء کی امداد کے لئے دوسرں کی ماتحتی سے بھی آپ کو کوئی عار نہیں تھا۔

پھر آپ نے جب حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تو اس وقت آپ کے پاس کوئی مال نہ تھا۔ بعض لوگوں نے روایت کی ہے کہ آپ کے والد نے چند بکریاں اور ایک دو اونٹ آپ کے لئے چھوڑے تھے (طبقات ابن سعد ذکر وفات عبداللہ ابن عبد المطلب) مگر یہ جائیداد ایسی قلیل تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامل قوتوں کے ساتھ پیدا فرمایا تھا اور آپ صحیح معنوں میں طٰہٰ کے مصداق تھے اس لئے آپ کی طبیعت میں حرص بالکل نہ تھی اور سیر چشمی کمال کو پہنچی ہوئی تھی یہاں تک کہ آپ کی قوم نے آپ کو امین کا خطاب دے دیا اور آپ کی دیانت وامانت کا سکہ تسلیم کر لیا۔

ایک دفعہ صدقات کا کچھ روپیہ آیا اور اسے تقسیم کرتے ہوئے ایک دینار کسی کونے میں گر گیا جسے اٹھانے کا آپ کو خیال نہ رہا۔ نماز کے بعد یاد آیا تو لوگوں کے اوپر سے پھاندتے ہوئے آپ جلدی سے اپنے گھر تشریف لے گئے صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا بات تھی آپ نے فرمایا اس اس طرح ایک دینار تقسیم کرنے سے

رہ گیا تھا میں نے چاہا کہ جس قدر جلدی ممکن ہو اسے بھی تقسیم کر دوں (بخاری کتاب الزکوۃ باب من احب تعجیل الصدقۃ من یومھا) غرض مال و دولت کے باوجود آپ نے ایسی سیر چشمی اور استغناء ظاہر کی کہ دیکھ کر حیرت آتی ہے۔ جو کچھ آتا آپ خدا تعالیٰ کی راہ تقسیم کر دیتے حالانکہ گھر کی یہ حالت تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں کہ بعض دفعہ ایک ایک مہینہ تک ہمارے گھروں میں آگ نہیں جلتی تھی ہم اونٹنی کا دودھ پی لیتے یا کھجوریں کھا لیتے تھے یا بعض دفعہ کوئی ہمسایہ دودھ یا کوئی اور چیز بھیج دیتا تو وہ استعمال کر لیتے اور کبھی فاقہ سے ہی رہتے تھے (شمائل ترمذی باب ماجاء فی عیش النبی)

یہ اس زمانہ کی حالت ہے جب کثرت سے دولت آ رہی تھی۔ غرض آپ نے ہر حالت میں اعلیٰ نمونہ دکھایا آپ کو روپیہ ملا مگر پھر بھی آپ نے غربت کو قائم رکھا۔ آپ مجرد رہے اور ایسا اعلیٰ نمونہ دکھایا کہ دنیا حیران ہے آپ نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی جبکہ عرب میں سولہ سترہ برس کا لڑکا پورا بالغ ہو جاتا ہے اور اس عمر میں بھی ایک بڑی عمر کی بیوہ کے ساتھ شادی کی۔ پھر شادی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ نے جب اپنی ساری دولت آپ کے حوالے کر دی جو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سب غلاموں کو آزاد کر دیا۔

دشمنوں کے ظلم سہنے میں بھی آپ نے ایسا نمونہ دکھایا جو بے نظیر ہے طائف میں تبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تو پتھروں کی بوچھاڑ کی وجہ سے سر سے پاؤں تک آپ زخمی ہو گئے مگر ایسی حالت میں بھی جب خدا تعالیٰ کا فرشتہ آیا اور اس نے کہا کہ اگر چاہو تو ابھی ان لوگوں کو سزا دے دی جائے تو آپ نے فرمایا نہیں یہ لوگ نادانی سے ایسا کر رہے ہیں (بخاری کتاب بدء الخلق باب اذا قال احدکم امین)۔ پھر جب کبھی ضرورت پیش آتی آپ فوراً ان دشمنوں کی امداد کرنے کے لئے تیار ہو جاتے جو آپ کی ایذا رسانی پر ہمیشہ کمر بستہ رہتے تھے۔ کوئی نہیں جو آپ کے پاس اپنی حاجت لے کر آیا ہو اور آپ نے اس کی حاجت روائی سے انکار کر دیا ہو وہ شہر جہاں سے رات کے وقت چھپ کر آپ کو بھاگنا پڑا تھا اس شہر کے شدید ترین معاند جب مغلوب ہونے کے بعد آپ کے سامنے پیش کئے گئے تو آپ نے فرمایا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ جاؤ آج تم پر کوئی گرفت نہیں (زاد المعاد دخول النبیؐ و المسلمین مکۃ)۔ میں نے تم سب کو معاف کر دیا ہے حالانکہ ان لوگوں میں سے بعض ایسے تھے جنہوں نے آپ کے صحابہؓ کو اونٹوں سے باندھ باندھ کر چیر ڈالا۔ بعض ایسے تھے جنہوں نے عورتوں کی شرمگاہوں میں نیزے مار مار کر انہیں شہید کر ڈالا بعض ایسے تھے جنہوں نے صحابہؓ کو جلتی ریت پر لٹا لٹا کر انہیں دُکھ دیا اور ان کا جینا دوبھر کر دیا (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب باب السین سمیۃ ام عمار بن یاسر و اسد الغابۃ حرف الباء، بلال)۔ مگر آپ نے ان

سب کو معاف کر دیا اور اس طرح بتا دیا کہ آپ کے اندر کتنا عدیم المثال عفو پایا جاتا ہے۔

آپ نے تجارت بھی کی اور ایسی کہ حضرت خدیجہؓ کے غلام کہتے ہیں ہم نے ایسا ایماندار کوئی نہیں دیکھا۔ سب سے زیادہ نفع آپ کو ہوتا تھا اور آپ کی چیز میں اگر کوئی نقص ہوتا تو آپ خود ہی اس کو ظاہر کر دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ گاہک تلاش کر کر کے آپ سے مال خریدتے تھے۔

آپ کا غریبوں سے معاملہ ایسا احسان کا تھا کہ ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی گردن میں پٹکا ڈال لیا اور کہا مجھے کچھ مال دو آپ نے اسے کچھ نہیں کہا بلکہ صرف یہ جواب دیا کہ میں ۔بخیل نہیں ہوں اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں ضرور دے دیتا۔ اس وقت دس ہزار آدمی آپ کے ہاتھ پر اپنی جان و مال کو قربان کرنے کا عہد کر چکا تھا۔ اگر آپ ذرا بھی اشارہ کر دیتے تو وہ اس کی گردن اڑا دیتے مگر آپ نے اس پر خفگی کا اظہار نہیں کیا (کتاب الشفا للقاضی جلد ا صفحہ ۴۱)۔

پھر شجاعت اور دلیری آپ میں اس قدر تھی کہ مکہ کی مخالفت جب انتہا کو پہنچ گئی تو رؤسائے قریش نے ابو طالب کو دھمکی دی کہ اگر تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ روکا تو تمہیں بھی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اور ہم تمہیں اپنی سرداری سے الگ کر دیں گے۔ ابو طالب اس دھمکی سے گھبرا گئے اور جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر آئے تو انہوں نے بلا کر کہا کہ مکہ کے رئیس اس اس طرح کہتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ کوئی ایسی پالیسی اختیار کر لو جس سے ان کی بھی دلجوئی ہو جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ چچا میں ساری تکالیف برداشت کر لوں گا مگر میں خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے سے کبھی رک نہیں سکتا۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر رکھ دیں تب بھی میں خدائے واحد کی توحید پھیلانے سے باز نہیں رہ سکتا میں اس کام میں مشغول رہوں گا اور اس کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ (سیرۃ النبی ابن ھشام جلد ا صفحہ ۲۸۴، ۲۸۵)

غرض ایک کامل قوتوں والے انسان کے اندر جس قدر اوصاف پائے جانے چاہئیں وہ سارے کے سارے اپنی پوری شان اور عظمت کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے تھے۔ آپ کے اندر شجاعت بھی پائی جاتی تھی سخاوت بھی پائی جاتی تھی احسان بھی پایا جاتا تھا، وفاداری بھی پائی جاتی تھی۔ تحمل بھی پایا جاتا تھا، رحم بھی پایا جاتا تھا، حلم بھی پایا جاتا تھا، ایثار بھی پایا جاتا تھا، دیانت بھی پائی جاتی تھی، اخوت بھی پائی جاتی تھی، تواضع بھی پائی جاتی تھی، غیرت بھی پائی جاتی تھی ،شکر بھی پایا جاتا تھا، استقلال بھی پایا جاتا تھا، وقار بھی پایا جاتا تھا، بنی نوع انسان

کی خیر خواہی بھی پائی جاتی تھی، بلند ہمتی بھی پائی جاتی تھی، صبر بھی پایا جاتا تھا، رافت بھی پائی جاتی تھی، بدی کے مقابلہ کی طاقت بھی پائی جاتی تھی۔ قوت برداشت بھی پائی جاتی تھی، جفاکشی بھی پائی جاتی تھی، سادگی بھی پائی جاتی تھی، صلہ رحمی بھی پائی جاتی تھی سچائی بھی پائی جاتی تھی، غرباء پروری بھی پائی جاتی تھی، مصیبت زدوں کی مدد کی خواہش بھی پائی جاتی تھی، مہمان نوازی بھی پائی جاتی تھی، بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بھی پائی جاتی تھی، محبت الٰہی بھی پائی جاتی تھی، توکل بھی پایا جاتا تھا۔ عبادات کی محافظت بھی پائی جاتی تھی۔ غرض کونسی خوبی تھی جو آپ میں نہ پائی جاتی ہو۔ اور کون سا کمال تھا جو آپ میں موجود نہ ہو۔ یہی حکمت ہے جس کے ماتحت سورۂ مریم کے بعد اس سورۃ کو رکھا گیا ہے اور ایک لطیف پیرایہ میں اس طرف اشارہ کیا گیا کہ جب حضرت مریمؑ کے پیٹ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پڑے تھے تو گو جس فرشتے نے آپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تھی وہ بَشَرًا سَوِیًّا کی شکل میں آیا تھا۔ یعنی ایک تندرست مرد کی شکل میں ظاہر ہوا تھا جیسا کہ سوۂ مریم میں آتا ہے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خبر کسی فرشتہ نے ایک تندرست بشر کی شکل میں ظاہر ہو کر نہیں دی بلکہ آپ خود ایک کامل القویٰ مرد تھے جن کے اندر تمام مردانہ صفات اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر تھیں۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو یہ صفات بالواسطہ اور وہ بھی نامکمل شکل میں ملیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خبر دینے والا فرشتہ بشر کہلاتا تھا رجل نہیں۔ اور بشر کا وجود متمدن انسان کے دور سے پہلے تھا یعنی بشر انسان کا پہلا درجہ تھا لیکن ''رجل'' انسان کا آخری درجہ ہے۔ پس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل قوائے انسانی کے ظہور تھے جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سورۃ مریم اور بائیبل کے بیان کے مطابق صرف بشری طاقتوں کے ظہور تھے اسی وجہ سے بقول انجیل جب ان پر جبریل نازل ہوا تو وہ ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہوا (متی باب ۳ آیت ۱۶) جو ایک کمزور اور نحیف جانور ہے اور بلی بھی اس کو کھا جاتی ہے۔ مگر جب وہی جبریل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تو ایک قوی ہیکل انسان کی صورت میں نازل ہوا جس نے اپنی پوری طاقت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا والے واقعہ کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب فرشتہ میرے پاس آیا اور میں نے مَآ اَنَا بِقَارِیءٍ کہا تو فَغَطَّنِي حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ (بخاری کتاب الوحی باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ) اس نے مجھے ایسا بھینچا کہ میری مقابلہ کی طاقت بالکل جاتی رہی۔

یہ حدیث اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا فرشتہ ایک قوی ہیکل انسان کی صورت میں ظاہر ہوا تھا جبکہ مسیحؑ پر نازل ہونے والا فرشتہ ایک کبوتر کی شکل میں ظاہر ہوا کیونکہ محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم خود کامل قوائے انسانی کے ظہور تھے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی طرف طٰہٰ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۳

ہم نے تجھ پر (یہ) قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تو دکھ میں پڑ جائے۔

حلّ لُغَات۔ تَشْقٰى شَقِيَ سے مضارع واحد مخاطب کا صیغہ ہے اور شَقِيَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں کَانَ شَقِيًّا وہ شقی ہو گیا دراصل شقاوۃ کا لفظ سعادۃ کے مخالف معنے ظاہر کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ (اقرب) اور سعادۃ کے معنے ہیں مُعَاوَنَةُ الْاُمُوْرِ الْاِلٰهِيَّةِ لِلْاِنْسَانِ عَلٰى نَيْلِ الْخَيْرِ بھلائی اور برکت حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا کردہ اسباب کی امداد (مفردات) پھر مفردات میں شقاء کے معنے کرتے ہوئے امام راغبؒ لکھتے ہیں قَالَ بَعْضُهُمْ قَدْ يُوْضَعُ الشِّقَاءُ مَوْضَعَ التَّعَبِ یعنی بعض اہل زبان کہتے ہیں کہ تھکان اور تکلیف کے معنوں میں بھی شقاوۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پس لِتَشْقٰٓى کے معنے ہوں گے (۱) تجھ کو تھکان اور تکلیف لاحق ہو۔ (۲) تو اپنے مقصد کے حصول میں خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ اسباب کی امداد سے محروم رہے۔

تفسیر۔ یہ آیت اسی مضمون کی تصدیق کرتی ہے جو سورۂ مریم میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسان کر کے اتارا ہے تا کہ متقیوں کے لئے بشارت ہو اور مسیحی قوم کے اس عقیدہ کی تردید کی گئی تھی کہ شریعت لعنت ہے۔ اب فرماتا ہے کہ قرآن کا نزول اس لئے نہیں کہ تو مشقت میں پڑے بلکہ اس لئے ہے کہ تجھ کو تیرے فرائض یاد کرائے جائیں اور جو شریعت انسان کو اس کی ذمہ واری یاد کراتی ہے وہ لعنت نہیں کہلا سکتی وہ تو ایک اچھا ساتھی ہے جو وقت پر انسان کو صحیح طریقہ بتاتا رہتا ہے پس مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم میں جتنی تعلیم نازل ہوئی ہے وہ انسان کے لئے رحمت اور برکت کا موجب ہے اس کی کوئی تعلیم ایسی نہیں جو اس کی فطرت کے خلاف ہو اور اس طرح اسے دکھ اور تکلیف میں ڈالنے والی ہو۔

اسی طرح اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب تو کامل القویٰ انسان ہے جو ہمارے سپرد کردہ فرائض کو اچھی طرح ادا کر سکتا ہے اور کر رہا ہے تو کس طرح ہو سکتا تھا کہ ہم تجھے تباہ کرتے کیونکہ کوئی شخص اپنی قیمتی چیز کو تباہ نہیں کیا کرتا۔ پس ہم نے یہ قرآن تجھے تباہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ تجھے اور تیری قوم کو اپنے فرائض کی طرف توجہ دلانے کے لئے نازل کیا ہے اور اس لئے نازل کیا ہے تا کہ تم گمراہی سے بچ جاؤ۔

اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ۙ﴿۴﴾

(یہ تو) صرف (خدا سے) ڈرنے والے انسان کے لئے راہنمائی اور ہدایت (کے لئے) ہے

حلّ لُغَات۔ يخشٰى خَشِيَ سے مضارع واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور خشی کے معنے ہیں خَافَه اس سے ڈرا (اقرب) مفردات میں ہے اَلْخَشْيَةُ خَوْفٌ يَشُوْبُه تَعْظِيْمٌ وَ اَكْثَرُ مَا يَكُوْنُ ذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ بِمَا يُخْشٰى مِنْهُ کہ خشیت کا لفظ خوف کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن ایسے خوف کے لئے جو کسی کی عظمت کی وجہ سے لاحق ہو اور یہ عام طور پر اس لئے ہوتا ہے کہ جس سے ڈرا جاتا ہے اس کی شخصیت اور اس کے مقام کا علم ہوتا ہے کہ وہ کس مرتبہ کا ہے (مفردات) پس یخشی کے معنے ہوں گے جو خدا تعالیٰ کی عظمت سے ڈرتا ہو۔ اور اس کے مقام اور مرتبہ کا خوف رکھتا ہو۔

تفسیر۔ فرماتا ہے یہ قرآن دوسری کتابوں کی طرح محض انسان کے دل میں خدا کا ڈر ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ ڈر پیدا کرنے کے بعد انسان کو اوپر لے جاتا ہے اور خدا سے ملا دیتا ہے۔ یعنی اس کا دوست بنا دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے شروع میں بھی فرمایا ہے کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے یعنی جو لوگ متقی ہوتے ہیں ان کو مزید راستہ دکھا کر خدا تعالیٰ تک پہنچا دیتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مقرب لوگ صرف ڈرا نہیں کرتے بلکہ انعامات کے امیدوار بھی ہوتے ہیں اور محبت کے شعلے ان کے دلوں میں بھڑک رہے ہوتے ہیں اور یہی وہ عالی مقام ہے جس کو قرآن کریم کے سوا اور کوئی کتاب پیش نہیں کرتی۔

تَنۡزِيۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰى ؕ﴿۵﴾

(قرآن) اس کی طرف سے اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور اونچے آسمان کو پیدا کیا ہے

حل لغات۔ تَنْزِيْلًا نَزَّلَ کا مصدر ہے اور یہ اس لئے منصوب ہے کہ اس سے پہلے فعل محذوف ہے یعنی اَنْزَلْنٰه تَنْزِيْلًا کہ ہم نے اس کو خوب اچھی طرح اتارا ہے۔ العُلٰى العُلْيَا۔ کی جمع ہے اور اَلْعُلْيَا الاعلیٰ کا مونث کا صیغہ ہے (مفردات) پس السمٰوٰت العلیٰ کے معنے ہوں گے بلند آسمان۔

تفسیر۔ اس آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس خدا نے مادہ کو پیدا کیا اور بے انتہا درجوں میں

پیدا کیا ہے یہاں تک کہ اس کے بالائی حصے نظر تک نہیں آتے تو وہ خدا اگر روحانی دنیا پیدا کرے گا تو اس کو بھی اسی شکل میں پیدا کرے گا یعنی ایسے ایسے بلند روحانی مقامات اس میں رکھے گا کہ وہ روحانی آسمان کہلانے کے مستحق ہوں گے۔اور جس طرح یہ جسمانی آسمان دنیا کی خدمت میں لگا ہوا ہے اسی طرح وہ روحانی آسمان دنیا کی روحانی خدمت میں لگا رہے گا۔اور لوگ اس کی مدد سے بلند سے بلند تر ہوتے چلے جائیں گے۔اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ خادم حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ نے فرمایا کہ ؎

دمبدم روح القدس اندر معینے می دمد من نمی گویم مگر من عیسیٰ ثانی شدم

یعنی جبریلؑ ہر گھڑی معین الدین چشتیؒ کے کان میں بول رہا ہے پس گو میں منہ سے نہیں کہتا مگر واقعہ یہی ہے کہ میں عیسیٰؑ کا نظیر ہو گیا ہوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تو پادری اور پوپ پیدا کئے جن میں ہزاروں عیوب پائے جاتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معین الدین صاحب چشتیؒ جیسے وجود پیدا کئے یعنی خود عیسیٰؑ پیدا کئے۔

اسی طرح آپؐ کے ایک اور خادم یعنی بانی سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں کہ

الا اے منکر از شان محمدؐ۔ہم از نور نمایان محمدؐ کرامت گرچہ بے نام ونشاں است بیا بنگر زغلمان محمدؐ

(آئینہ کمالات اسلام روحانی خزائن جلد ۵ صفحہ ۶۴۹)

یعنی اے وہ شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور آپ کے چمکتے ہوئے انوار کا منکر ہے کان کھول کر سن لے کہ اگرچہ کرامت اس زمانہ میں ہر جگہ مفقود ہے مگر تو آ اور اسے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں دیکھ لے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۶

(وہ) رحمن (ہے جو) عرش پر مستحکم طور پر قائم ہو گیا ہے۔

حلّ لُغات۔ العرش سَرِيْرُ الْمَلِكِ۔بادشاہ کا تخت۔العِزُّ۔عزت وغلبہ۔قِوَامُ الْأَمْرِ معاملات اور امور کی درستی کا ذریعہ اور مدار۔عَرْشٌ مِنَ الْبَيْتِ: سَقْفُهُ مکان کی چھت۔اَلْعَرْشُ۔الْمُلْكُ بادشاہت (اقرب) مفردات میں ہے۔وَسُمِّيَ مَجْلِسُ السُّلْطَانِ عَرْشًا اِعْتِبَارًا بِعُلُوِّهٖ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ یعنی تخت کو

بھی عرش کہتے ہیں اس وجہ سے کہ وہ بلند ہوتا ہے اور عرش میں بلندی کے معنے پائے جاتے ہیں۔ وَ كُنِّيَ بِهٖ عَنِ الْعِزِّ وَ السُّلْطٰنِ وَالْمَمْلِكَةِ اور عرش کے لفظ کو عزت اور غلبہ اور بادشاہت کے مفہوم کے ادا کرنے کے لئے بھی استعمال کرلیا جاتا ہے وَقَوْلُه ذُوالْعَرْشِ.... وَمَا يَجْرِيْ مَجْرَاهُ قِيْلَ هُوَ اِشَارَةٌ اِلٰى مَمْلِكَتِهٖ وَ سُلْطٰنِهٖ لَا اِلٰى مَقَرٍّ لَّه يَتَعَالٰى عَنْ ذٰلِكَ اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لئے جو یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ وہ عرش والا ہے اس سے خدا تعالیٰ کی بادشاہت اور غلبہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی خاص تخت ہے جس پر وہ قرار فرما ہوتا ہے کیونکہ اس سے تجسم لازم آتا ہے اور اللہ تعالیٰ تجسم سے پاک ہے۔(مفردات)

استوٰی اِسْتَوَى الرَّجُلُ اِنْتَهٰى شَبَابُهٗ وَ بَلَغَ اَشُدَّهٗ اَوْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَاسْتَقَامَ اَمْرُهٗ یعنی جب استویٰ کا لفظ کسی انسان کے لئے استعمال کریں تو یہ معنے ہوں گے کہ وہ عین عنفوان شباب کو پہنچ گیا۔ اور اس عمر کو جا پہنچا جبکہ اس کی ساری طاقتیں اور قوتیں پختہ ہوکر ظاہر ہوگئیں اور کام کرنے لگیں۔ اور جب اِسْتَوٰى عَلٰى سَرِيْرِ الْمُلْكِ کہیں تو یہ معنے ہوں گے کہ وہ کسی جگہ کا مالک ہوگیا۔ تو وہ کسی خاص تخت پر نہ بیٹھا ہو۔ اور اسْتَوٰى عَلَى الشَّيْءِ کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَوْلٰى وَظَهَرَ وہ کسی چیز پر غالب آ گیا۔(اقرب)

تفسیر ۔ فرماتا ہے کلام الٰہی کا نزول صفت رحمٰن کے ماتحت ہوتا ہے ۔ یعنی خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی کمزوری دیکھ کر خود ہی ان کی ہدایت کے لئے جوش میں آتا ہے ۔ اس آیت میں عیسائیت کا رد کیا گیا ہے کیونکہ عیسائیت کفارہ کی قائل ہے اور کفارہ اور رحمانیت اکٹھے نہیں ہو سکتے ۔ کیونکہ کفارہ تبھی سچا ہوسکتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ بغیر کسی کام کے کسی پر رحم نہ کر سکے لیکن رحمٰن کے معنے یہ ہیں کہ بغیر کسی سابقہ خدمت کے رحم کرنے والی ہستی چنانچہ مسلمانوں کی سب کتابوں پر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھا ہوتا ہے۔ لیکن عیسائی مصنف اپنی کتابوں سے پہلے اول تو کچھ لکھتے نہیں اور اگر بعض لوگ کچھ لکھتے بھی ہیں تو اپنی اپنی مرضی کے مطابق الفاظ منتخب کر کے لکھ لیتے ہیں ۔ چنانچہ بعض لوگ تو

''بِسْمِ الْاَبِ وَالْاِبْنِ وَالرُّوْحِ''

لکھتے ہیں (ستم ہامان منظومہ منشی کیدار ناتھ صاحب) بعض

''بِسْمِ اللّٰهِ الْهَادِي الْجَوَّادِ''

لکھ دیتے ہیں (شہادۃ القرآن) اور بعض یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں کہ ''خدا تعالیٰ کے نام پر جو ہادی لاشریک ہے'' (بہت بیش قیمت عطر کی شیشی مصنفہ پادری ٹسڈل صاحب) گویا اور الفاظ تو وہ استعمال کرتے ہیں لیکن رحمٰن کا لفظ چھوڑ دیتے

ہیں کیونکہ رحمٰن کا لفظ ان کے مذہب کے خلاف ہے مگر دنیا کا ذرہ ذرہ بتا رہا ہے کہ خدا رحمٰن ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے تو کوئی نیکی کر کے تو نہیں آتا مگر خدا تعالیٰ اس کی ماں کی چھاتیوں میں دودھ اتار دیتا ہے اور یہ انعام بغیر کسی نیکی کے ہوتا ہے۔ اسی طرح جوانی تو پیدائش کے بڑے عرصہ بعد آتی ہے لیکن اس کے جسم کو سردی گرمی سے بچانے کے لئے کپڑے اور مکان کا سامان پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ پس دنیا کا ذرہ ذرہ خدا تعالیٰ کی رحمانیت پر دلالت کر رہا ہے ۔اسی طرح ہر مذہب بھی اس کی رحمانیت کا ثبوت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا کلام جب نازل ہوتا ہے تو کسی نیکی کے بدلہ میں نازل نہیں ہوتا بلکہ بطور احسان نازل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی قرآن کریم کے نزول کا ذکر ہے یہی فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم کو رحمٰن خدا نے نازل کیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ تو نہیں جانتا تھا کہ ایمان کیا ہوتا ہے اور کتاب کیا ہوتی ہے پس قرآن جو تجھ پر نازل ہوا ہے نہ کسی ایمان کے نتیجہ میں نازل ہوا ہے اور نہ کسی کتاب پر عمل کرنے کے نتیجہ میں نازل ہوا ہے۔ بلکہ محض اس محبت کی مخفی چنگاری کے بدلہ میں نازل ہوا ہے جو تیرے دل میں خدا کے لئے اس طرح سلگ رہی تھی جس طرح بچہ کے دل میں ماں کے لئے محبت کی مخفی چنگاری سلگ رہی ہوتی ہے۔

عرش کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ عرش کوئی مادی چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات تنزلی کا نقطۂ مرکزی ہے یعنی خدا تعالیٰ کی جو صفات بندوں سے تعلق رکھتی ہیں ان کو خدا تعالیٰ عرش پر سے ظاہر کرتا ہے جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کے لئے اپنے تخت حکومت پر سے احکام دیتے ہیں۔ (عرش کی مفصل بحث کے لئے دیکھیں سورۃ یونس آیت ۴) چونکہ کلام الٰہی خدا تعالیٰ کی طرف سے مختلف قسم کے احکام پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى یہ قرآن ہے تو رحمانیت کی صفت کے ماتحت یعنی انسانوں کی کسی خدمت کے نتیجہ میں نازل نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کے غیر محدود رحم نے بندوں کی ہدایت کے لئے نازل کیا ہے مگر خدا کے رحمٰن ہونے کی وجہ سے یہ دھوکا نہ کھا لینا کہ اس کلام کو رد کر دینا معمولی بات ہے بلکہ یاد رکھنا کہ رحمٰن خدا نے اپنے تخت شاہی پر بیٹھ کر یہ اعلان کیا ہے اور اس کو رد کرنا اس کی بادشاہت کا انکار کہلائے گا اور تمہیں سزا کا مستحق بنا دے گا۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اور وہ بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے اسی کا ہے۔ نیز (وہ بھی) جو

الثَّرٰى ۞

گیلی مٹی کے نیچے ہے۔

حل لغات۔ الثریٰ التُّرَابُ النَّدِيُّ گیلی مٹی الارض زمین۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس میں عرش پر قائم ہونے کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ دنیا کے بادشاہ جب اپنے تخت حکومت پر بیٹھتے ہیں تو ان کی حکومت محدود ہوتی ہے مگر خدا تعالیٰ کی حکومت آسمانوں پر بھی ہے زمیں پر بھی ہے اور زمین کے نچلے طبقوں پر بھی ہے پس اس کے احکام کو رد کرنا دنیا کی چوٹی سے لے کر اس کے نچلوں سے نچلے طبقہ تک ساری مخلوقات کو اپنا مخالف بنانا ہے۔ اسی طرح اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جو لوگ اس کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ آسمانوں اور زمین کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کے نچلے طبقات میں ہے سب کو ان کی تائید میں لگا دیتا ہے۔

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى ۞

اگر تو اونچی آواز سے بولے تو خدا اسکو بھی سنتا ہے اور اگر آہستہ آواز سے بولے تو اس کو بھی سنتا ہے۔ کیونکہ وہ پوشیدہ بات کو بھی جانتا ہے اور جو بہت ہی پوشیدہ ہوتی ہے (اسے بھی جانتا ہے)

حل لغات۔ تجهر تَجْهَرْ جَهَرَ سے ہے اور جَهَرَ بِالْقَوْلِ کے معنے ہیں رَفَعَ بِهٖ صَوْتَهٗ بات کرتے ہوئے اپنی آواز بلند کی (اقرب) پس اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ کے معنے ہوں گے اے مخاطب اگر تو بات کرتے وقت اپنی آواز بلند کرے۔

تفسیر۔ یہ آیت پہلی آیت کی مزید تشریح ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بلندیوں کا مالک ہے وہ اونچی آواز کو بھی سنتا ہے اور جو زمین کے نچلے طبقہ کا مالک ہے وہ آہستہ آواز کو بھی سنتا ہے۔ ورنہ ان دونوں حصوں پر حکومت کس طرح کر سکتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۹

اللہ (وہ ذات ہے کہ اس) کے سوا کوئی معبود نہیں اسکی بہت سی اچھی صفات ہیں۔

حل لغات۔ الاسماءُ اَلْاَسْمَاءُ اسم کی جمع ہے اور اسم کے لفظ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابوالبقاء اپنی کتاب کلیات میں لکھتے ہیں أَلْاِسْمُ ذَاتُ الشَّيْءِ وَالْاِسْمُ اَيْضًا الصِّفَةُ (اقرب) کہ اسم اس کو بھی کہیں گے کہ جو کسی چیز کی حقیقت اور ذات کو بیان کرے اور اس کو بھی کہیں گے جو اس چیز کی صفات کو بیان کرے۔

الحسنی اَحْسَنُ۔ سے مونث کا صیغہ ہے اور الحسن کے معنے ہیں عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مُبْهِجٍ مَرْغُوْبٍ فِيْهِ ہر وہ چیز یا حالت جو خوش کرے اور انسان کے دل میں اس کے لینے کی خواہش پیدا ہو پھر لکھا ہے کہ حسن کا لفظ عام لوگوں کے استعمال میں ان چیزوں کی خوبصورتی کے لئے استعمال ہوتا ہے جن کو آنکھ دیکھ سکتی ہے لیکن قرآن مجید میں جن چیزوں کے لئے حسن کا لفظ استعمال ہوا ہے اس سے بصیرت کے ساتھ معلوم کئے جانے والا حسن مراد ہے۔ (مفردات) پس الاسماء الحسنیٰ کے معنے ہوں گے بہترین صفات۔

تفسیر۔ فرماتا ہے کہ جب خدا تعالیٰ ہی آسمانوں کا مالک ہے اور خدا تعالیٰ ہی زمین کے نچلے طبقوں کا بھی مالک ہے تو پھر اور کوئی معبود ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کے سوا اور کونسی جگہ رہ جائے گی جو اس معبود کی ملکیت ہو گی۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۱۰

اور (اس کے ثبوت میں ہم کہتے ہیں کہ) کیا تیرے پاس موسیٰ کا واقعہ پہنچا ہے (یا نہیں)

حلّ لُغَات۔ الحدیث اَلْحَدِيْثُ اَلْخَبَرُ يَأْتِيْ عَلَى الْقَلِيْلِ وَ الْكَثِيْرِ یعنی حدیث کے معنے خبر کے ہیں خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ (اقرب)

تفسیر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ایک صاحب شریعت نبی تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے واقعہ کو یہ بتانے کے لئے پیش کیا ہے کہ ان کے ذریعہ بھی اللہ تعالیٰ نے عرش سے دنیا پر روحانی حکومت کی تھی اور ان پر بھی کلام الٰہی نازل ہوا تھا۔

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ

(یعنی) جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اس نے اپنے اہل سے کہا (اپنی جگہ) ٹھہرے رہو میں نے ایک آگ دیکھی

اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ﴿۱۱﴾

ہے ممکن ہے کہ میں وہاں جا کر اس آگ میں سے کوئی انگارہ تمہارے لئے بھی لے آؤں یا آگ پر (اپنے لئے کوئی روحانی) ہدایت حاصل کروں۔

حلّ لُغَات۔ اُمْكُثُوْا اُمْكُثُوْا امَكَثَ۔ يَمْكُثُ سے امر کا جمع کا صیغہ ہے اور مَكَثَ بِالْمَكَانِ کے معنے ہیں لَبِثَ وَ اَقَامَ ۔کسی جگہ پر ٹھہرا (اقرب) مفردات میں ہے المکث۔ ثُبَاتٌ مَعَ اِنْتِظَارٍ ۔کسی جگہ پر ٹھہر کر کسی کا انتظار کرنا مکث کہلاتا ہے۔ پس اِمْكُثُوْا ۔ کے معنے ہوں گے تم ٹھہرو اور انتظار کرو۔

اٰنَسْتُ اٰنَسْتُ اٰنَسَ سے واحد متکلم کا صیغہ ہے۔اور اٰنَسَ الشَّیْءَ کے معنے ہیں اَبْصَرَهٗ اس کو دیکھا (اقرب) پس اٰنَسْتُ نَارًا کے معنے ہوں گے میں نے آگ دیکھی ہے۔

قبس قَبَسٌ شُعْلَةُ نَارٍ تُؤْخَذُ مِنْ مُعْظَمِ النَّارِ (اقرب) آگ کا وہ انگارہ جو بڑی آگ سے لیا جاتا ہے۔

تفسیر ۔اس آیت میں جو یہ فرمایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ''ایک آگ'' دیکھی اس سے روحانی اور کشفی نظارہ مراد ہے نہ کہ کوئی ظاہری آگ۔ کیونکہ جسمانی آگ دیکھنے والا یہ نہیں کہا کرتا کہ میں نے ''ایک آگ'' دیکھی ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے آگ دیکھی ہے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوئی جسمانی آگ دیکھی ہوتی تو عربی محاورہ کی رو سے انہیں النار یعنی آگ کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ مگر یہاں نارًا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے ایک آگ کے ہیں۔ پس ''ایک آگ'' کہہ کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ ایک روحانی نظارہ تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی سمجھتے تھے کہ یہ جسمانی لکڑیوں یا کوئلوں کی آگ نہیں ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ میں شاید وہاں سے تمہارے لئے کوئی انگارہ لاؤں۔ اس میں اس طرف اشارہ تھا کہ روحانی جلوے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جلوے وہ ہوتے ہیں جو صرف اسی کی ذات تک محدود نہیں ہوتے جس پر وہ ظاہر ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے دوستوں اور قوم کے لئے بھی ہوتے ہیں جیسا کہ جلوۂ نبوت اور جلوہ نزول شریعت اور ایک جلوہ وہ ہوتا ہے جو صرف دیکھنے

والے کی ذات تک محدود ہوتا ہے۔ جیسے جلوۂ ولایت۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر واپس آتے ہوئے جب راستہ میں ایک روحانی نظارہ دیکھا تو انہوں نے اپنے اہل سے کہا کہ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کوئی جلوہ دکھانے والا ہے۔ اگر تو وہ ہدایت نبوت ہوئی اور وہ جلوہ شریعت والا ہوا اور مجھے حکم ہوا کہ دوسروں کو بھی تعلیم دو تو میں اس میں سے کوئی انگارہ یعنی کوئی تعلیم اپنے خاندان یا اپنی قوم کے فائدہ کے لئے بھی لے آؤں گا اور اگر یہ جلوہ شریعت والا نہ ہوا بلکہ صرف ہدایت ولایت ہوئی اور میری ذات تک محدود ہوئی تو کم سے کم میں اپنی جان کے لئے ہی کوئی ہدایت اس سے حاصل کروں گا اور اس سے فائدہ اٹھا کر واپس چلا آؤں گا۔

زیر تفسیر آیت سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعض واقعات کو بیان کرنا شروع کیا ہے۔ اور ابتداءً بتایا ہے کہ کس طرح ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں پیدا ہوئے اور عمر کا ابتدائی حصہ آپ نے مصر میں ہی گزارا لیکن پھر بعض واقعات سے مجبور ہو کر مدین تشریف لے گئے اور دس سال وہاں قیام کیا اور وہیں شادی کی دس سال وہاں ٹھہرنے کے بعد اہل وعیال سمیت واپس مصر تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں آپ نے خدا تعالیٰ کی تجلی کا مشاہدہ آگ کی صورت میں کیا۔ بائیبل میں بھی اس واقعہ کا ذکر آتا ہے۔ مگر بائیبل نے اس واقعہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس میں اور قرآن کریم کے اس بیان کردہ واقعہ میں کچھ اختلاف ہے جس کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

اس اختلاف کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین سے مصر کی طرف واپس تشریف لا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کی وحی ان پر نازل ہوئی اور بائیبل بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا واقعہ پہلے پیش آیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین تشریف لے گئے اور پھر مدین سے اپنے اہل وعیال کو لے کر مصر روانہ ہوئے۔ چنانچہ خروج باب ۳ آیت ۱، ۲ میں لکھا ہے۔

''اور موسیٰ اپنے خسر یترو کی جو مدیان کا کاہن تھا بھیڑ بکریاں چراتا تھا اور وہ بھیڑ بکریوں کو ہنکاتا ہوا ان کو بیابان کی پرلی طرف سے خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک لے آیا اور خداوند کا فرشتہ ایک جھاڑی میں سے آگ کے شعلہ میں اس پر ظاہر ہوا''

اور آخر میں لکھا ہے۔

''تب موسیٰ لوٹ کر اپنے خسر یترو کے پاس گیا اور اسے کہا کہ مجھے ذرا اجازت دے کہ اپنے بھائیوں کے پاس جو مصر میں ہیں جاؤں اور دیکھوں کہ وہ اب تک جیتے ہیں کہ نہیں یترو نے موسیٰ سے

کہا۔سلامت جا۔اور خداوند نے مدیان میں موسیٰ سے کہا کہ مصر کو لوٹ جا کیونکہ وہ سب جو تیری جان کے خواہاں تھے مر گئے ۔تب موسیٰ اپنی بیوی اور بیٹوں کو لے کر اور ان کو ایک گدھے پر چڑھا کر مصر کو لوٹا'' (خروج باب ۴ آیت ۱۸ تا ۲۰)

گویا بائیبل یہ بتاتی ہے کہ مدین میں ہی ایک دن جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بھیڑ بکریوں کو چراتے ہوئے حورب کی چٹان کی طرف گئے تو وہاں ایک جھاڑی میں انہیں خدائی جلوہ دکھائی دیا۔اس کے بعد وہ اپنے خسر کے پاس آئے اوران سے اجازت حاصل کر کے اپنی بیوی اور بچوں کو مصر لے گئے لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ واقعہ انہیں مدین سے مصر جاتے ہوئے پیش آیا جبکہ ان کے اہل وعیال بھی ان کے ہمراہ تھے۔

اس اختلاف کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ بائیبل کا غور سے مطالعہ کرنے والے یہ امر اچھی طرح جانتے ہیں کہ بائیبل میں آدمیوں کی تعداد اور وقت کے اندازے بالکل غلط دیئے گئے ہیں جن پر کوئی معقول انسان اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جہاں تاریخی طور پر ہزاروں کی تعداد ہوتی ہے بائیبل اس تعداد کو لاکھوں بیان کرتی ہے اور جہاں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہوتا ہے بائیبل اسے قریب کا مقام ظاہر کرتی ہے۔اس وجہ سے بائیبل کا بیان ایسا نہیں ہوسکتا کہ اسے اس واقعہ کے متعلق یقینی اور قطعی قرار دیا جاسکے۔مثلاً اسی واقعہ میں خدائی تجلی ظاہر ہونے کا مقام حورب کا پہاڑ قرار دیا گیا ہے جو دشت سینا میں ہے اور مدین سے سینکڑوں میل کے فاصلہ پر ہے (قاموس الکتاب جلد ۴ زیر لفظ حورب) مگر اسے بیان اس رنگ میں کیا گیا ہے کہ گویا مدین سے میل آدھ میل کے فاصلہ پر کوئی مقام تھا جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی بکریوں کو چرانے لے گئے ۔اور وہاں ان پر خدائی کلام نازل ہوا اور اس کے بعد وہ پھر اپنے خسر کے مکان پر آئے اوران سے اجازت چاہی کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو مصر لے جائیں۔حالانکہ اول تو یہ عقل کے بالکل خلاف ہے کہ سینکڑوں میل پر کوئی بکریاں چرانے کے لئے لے جائے اور اسی شام کو واپس آجائے پھر اگر انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو ساتھ ہی لے جانا تھا۔تو وجہ کیا تھی کہ وہ پہلی دفعہ ہی ان کو ساتھ نہ لے گئے اور اتنا لمبا فاصلہ طے کرنے کے بعد دوبارہ واپس آئے اوران کو ساتھ لے گئے ۔اگر انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو لے جانا تھا تو عقلاً انہیں پہلی دفعہ ہی ساتھ لے جانا چاہیے تھا۔نہ یہ کہ سینکڑوں میل اکیلے چلے جاتے اور پھر واپس آتے اور بیوی بچوں کو ساتھ لے جاتے لیکن قرآن کریم بتاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اہل وعیال ان کے ساتھ ہی تھے ۔یہ غلط ہے کہ وہ دوبارہ آئے اور اپنے بیوی بچوں کو لے گئے ۔پس بائیبل کا بیان عقل کے بالکل خلاف ہے لیکن جو بات قرآن نے کہی ہے وہ عقل کے مطابق ہے۔اسی طرح بائیبل کا بیان جغرافیہ

کے بھی خلاف ہے۔ جہاں دو مقامات میں سینکڑوں میل کا فاصلہ ہو وہاں یہ کہنا کہ وہ بکریاں چراتے ہوئے وہاں چلا گیا کسی طرح درست نہیں مانا جاسکتا۔ پس قرآن کریم نے جو کچھ کہا عقل اور جغرافیہ کے مطابق ہے اور بائیبل جو کچھ کہتی ہے وہ عقل اور جغرافیہ کے خلاف ہے۔

پھر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اس نظارہ کے دوران میں ان کے بیوی بچوں کے متعلق کوئی بات نہیں کہی گئی۔ اگر تو انہیں یہ کہا جاتا کہ تمہارا اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جانا ضروری ہے تب تو سمجھا جاسکتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سینکڑوں میل کا فاصلہ دوبارہ اس لئے طے کیا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کریں مگر اس قسم کا کوئی اشارہ بائیبل میں نہیں پایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ کہا ہو کہ اپنے بیوی بچوں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ پس اس نظارہ کے بعد ان کے مدین میں واپس آنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ ان کے اہل و عیال اس وقت ساتھ ہی تھے کیونکہ وہ سینکڑوں میل کے سفر پر جا رہے تھے اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو مدین میں ہی چھوڑ جاتے۔ پس قرآن کریم کا بیان عقل اور جغرافیہ کے بالکل مطابق ہے مگر بائیبل کا بیان کسی طرح بھی درست نہیں سمجھا جاسکتا۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ؕ﴿۱۲﴾

پھر جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچا تو اسے آواز دی گئی کہ اے موسیٰ۔

تفسیر۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس بظاہر آگ نظر آنے والی چیز کے پاس پہنچے۔ تو ان کو الہام ہوا کہ اے موسیٰ! میں تیرا رب ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آگ موسیٰ کا رب تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس جلوہ کو ظاہر کرنے والا موسیٰ ؑ کا رب تھا کیونکہ آگ نہیں بولا کرتی۔ خدا بولا کرتا ہے۔

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ؕ﴿۱۳﴾

میں تیرا رب ہوں۔ پس تو اپنی دونوں جوتیاں اُتار دے کیونکہ تو اس پاک وادی طوٰی میں ہے۔

حلّ لُغات۔ طُوًی طَوٰی (یَطْوِی) الصَّحِیْفَةَ کے معنے ہوتے ہیں۔ کاغذ کو لپیٹا (اقرب) اور تاج العروس میں طُوًی کے معنے الشَّیْءُ الْمَثْنِیُّ۔ کے بھی لکھے ہیں یعنی ایسی چیز جو ٹیڑھی ہو سیدھی نہ ہو۔ مفردات

میں ہے۔ قِيْلَ هُوَ اِسْمُ الْوَادِي کہتے ہیں طویٰ اس وادی کا نام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا تھا۔ وَقِيْلَ اِنَّ ذٰلِكَ جُعِلَ اِشَارَةً اِلٰى حَالَةٍ حَصَلَتْ لَهٗ عَلٰى طَرِيْقِ الْاِجْتِبَاءِ فَكَاَنَّهٗ طَوٰى عَلَيْهِ مَسَافَةً لَوِ احْتَاجَ اَنْ يَنَالَهَا فِي الْاِجْتِهَادِ لَبَعُدَ عَلَيْهِ اور بعض ماہرین لغت کے نزدیک طویً کے لفظ میں اس مفہوم کو ادا کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چن کر اس رُوحانی مقام پر پہنچا دیا جہاں عام حالات میں مجاہدات سے پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ (مفردات)

تفسیر۔ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ کے لفظی معنے تو یہی ہیں کہ اپنی جوتیاں اتار دے مگر مراد یہ ہے کہ اپنے ہر قسم کے دنیوی تعلقات کو خدا کی خاطر توڑ دے اور کلی طور پر اپنے خدا کا ہو جا کیونکہ رویا یا کشف کی حالت میں اگر جوتی دیکھی جائے۔ تو علم تعبیر الرویا کے لحاظ سے اس سے مراد انسان کے متعلقین کا وجود ہوتا ہے جیسے اس کی بیوی ہوئی۔ یا بچے ہوئے یا دوست اور رشتہ دار وغیرہ ہوئے (تعطیر الانام از عبد الغنی النابلسی زیر لفظ نعل) اور چونکہ یہ ایک کشفی نظارہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ فرما کر انہیں یہ ہدایت دی کہ اپنے تمام مادی تعلقات کو اب خدا کی خاطر توڑ دے کیونکہ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى اب تو ایک ایسی روحانی وادی میں داخل ہو چکا ہے جو دو طرف چکر کھاتی ہے یعنی ایک طرف تو اس کا خدا سے تعلق ہے اور دوسری طرف اس کا بندوں سے تعلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھے نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا گیا ہے اور یہ ایسا مقام ہے جہاں پر کھڑا ہونے والا انسان دنیا سے کٹ کر خدا تعالیٰ کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور انسانی فطرت کا رخ مادیات کو چھوڑ کر روحانیات کی طرف پھرتا ہے اس لئے تیرا فرض ہے کہ اب تو اپنے تمام دنیوی تعلقات اور محبتوں کو ترک کر کے کامل طور پر اپنے خدا کا ہو جا اور اسی سے اپنا تعلق استوار رکھ۔

وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۴﴾

اور میں نے تجھے (اپنے لئے) چن لیا ہے پس تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے اس کو تو سن (اور اس پر عمل کر)

حلّ لُغَات۔ اِخْتَرْتُكَ اِخْتَرْتُكَ اِخْتَارَ سے متکلم کا صیغہ ہے اور اِخْتَارَهٗ مِنَ الرِّجَالِ اِخْتِيَارًا کے معنے ہیں اِنْتَقَاهُ وَاصْطَفَاهُ مِنْ بَيْنِهِمْ۔ کہ اس کو تمام لوگوں میں سے کسی کام کے لئے چن لیا اور خاص کر لیا۔ (اقرب) پس اِخْتَرْتُكَ کے معنے ہوں گے میں نے تجھے تمام دوسرے لوگوں میں سے اپنے کام کے لئے چن

لیا ہے اور خاص کر لیا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ آگ میں سے کوئی چیز نہیں بولی بلکہ خدا کی طرف سے وحی ہوئی تھی کیونکہ یہاں وضاحتاً اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ اے موسیٰ! میں نے تجھے چن لیا ہے پس جو تیری طرف وحی کی جاتی ہے تو اس کو سن اور اس پر عمل کر۔

اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ

میں یقیناً اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس تو میری ہی عبادت کر۔ اور میرے

لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۵﴾

ذکر کے لئے نماز قائم کر

حلّ لُغَات۔ اَقِمۡ اَقِمۡ اَقَامَ سے امر کا صیغہ ہے اور اَقَامَ الشَّیۡءَ کے معنے ہوتے ہیں اَدَامَہٗ کسی چیز کو ہمیشہ کے لئے رکھا اور اَقَامَ الصَّلٰوۃَ کے معنے ہیں اَدَامَ فِعۡلَھَا ہمیشہ نماز پڑھتا رہا۔ اور اَقَامَ لِلصَّلٰوۃِ کے معنے ہوتے ہیں نَادٰی لَھَا نماز کے لئے دوسروں کو بلایا۔ (اقرب)

تفسیر۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ کے یہ معنے ہیں کہ خود بھی نماز پڑھ اور دوسروں سے بھی پڑھوا۔ گویا اقامت صلوٰۃ کے معنے باجماعت نماز ادا کرنے کے ہیں۔ اور باجماعت نماز سوائے اسلام کے اور کسی مذہب میں ادا نہیں کی جاتی ہاں رسمی طور پر لوگ عبادت کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں جیسے عیسائی گرجا میں اور یہودی صومعہ میں اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ میں لِذِکۡرِیۡ کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ چونکہ میں نے تجھے یاد کیا ہے اس لئے تو میرے شکر کے طور پر نماز پڑھ۔ اور دوسرے یہ کہ میرے ذکر کے لئے نماز پڑھ۔ یعنی تیری نماز دکھاوے کے لئے نہ ہو بلکہ صرف میرے ذکر کے لئے ہو۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۶﴾

قیامت یقیناً آنے والی ہے۔قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کردوں۔تا کہ نفس کے اپنے اعمال کے مطابق جزا دی جائے

حلّ لُغَات۔ أُخْفِيْ اَخْفٰى سے متکلم کا صیغہ ہے اور اَخْفٰى خَفٰى سے باب افعال ہے جو اپنے اندر متضاد معنے رکھتا ہے یعنی اس کے معنے ظاہر کرنے کے بھی ہیں اور چھپانے کے بھی ہیں چنانچہ خَفَاهُ کے معنے ہوتے ہیں اَظْهَرَهُ اس کو ظاہر کردیا اور اس کے ایک معنے سَتَرَهُ کے بھی ہوتے ہیں یعنی چھپادیا ۔(اقرب) اسی طرح اَخْفَى الشَّيْءَ کے معنے کرتے ہوئے لکھا ہے اَزَالَ خَفَاءَهُ اس کے پردے کو دور کردیا۔(اقرب) یعنی اس کو ظاہر کردیا۔

تفسیر ۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا میں اُخْفِيْهَا کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں یہ بھی کہ عذاب کی گھڑی آنے والی ہے قریب ہے کہ میں اسے چھپادوں اور یہ بھی کہ عذاب کی گھڑی آنے والی ہے قریب ہے کہ میں اسے ظاہر کردوں ۔ چنانچہ حل لغات میں بتایا جاچکا ہے کہ أَخْفَى الشَّيْءَ کے ایک معنے یہ بھی ہوتے ہی کہ اَزَالَ خَفَائَهُ اس کے پردہ کو دور کردیا یعنی اسے ظاہر کردیا عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب کسی مجرد فعل کو باب افعال میں لے آئیں تو اس میں سلب کے معنے پیدا ہوجاتے ہیں جیسے کہتے ہیں شَكَانِيْ فَاَشْكَيْتُهٗ کہ اس نے شکایت کی تو میں نے اس کی شکایت کا ازالہ کردیا پس اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا کے دونوں معنے ہوسکتے ہیں یہ بھی کہ اسے چھپائے رکھوں اور یہ بھی کہ اسے ظاہر کردوں اگر اس کے معنے چھپائے رکھوں کے کئے جائیں تو اس آیت کا یہ مفہوم ہوگا کہ یہ مخالف اتنے گندے لوگ ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سے اس عذاب کی گھڑی کو پوشیدہ رکھوں تا کہ عذاب ان پر اچانک آجائے اور انہیں اس کے ازالہ کا کوئی موقعہ نہ مل سکے اور اگر اس کے معنے ظاہر کرنے کے ہوں تو مراد ہوگی کہ وہ گھڑی جو تیری ترقی اور تیرے دشمنوں کی تباہی کے لئے مقدر ہے وہ آرہی ہے اور قریب ہے کہ میں اس کو ظاہر کردوں یعنی عنقریب ایسے حالات پیدا ہونے والے ہیں کہ تیرے دشمنوں کی تباہی کے آثار ظاہر ہونے لگ جائیں گے اور میری ان آثار کو ظاہر کرنے سے غرض یہ ہوگی کہ ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق جزا پالے جو ماننے

والے ہیں وہ انعام حاصل کرلیں اور جو منکر ہیں وہ سزا پالیں بِمَا تَسْعٰی میں باء کے معنے مطابق کے ہیں اور مَا مصدریہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ تاہر نفس اپنے عمل کے مطابق جزا پالے۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ

پس جو (شخص) قیامت پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتا ہے تجھے قیامت پر ایمان لانے

فَتَرْدٰى ﴿۱۷﴾

سے روک نہ دے جس کے نتیجہ میں تو ہلاک ہو جائے۔

حلّ لُغَات۔تَرْدٰی رَدِیَ یَرْدٰی سے مخاطب کا صیغہ ہے اور رَدِیَ کے معنے ہوتے ہیں هَلَكَ وہ ہلاک ہوگیا (اقرب) پس فَتَرْدٰی کے معنے ہوں گے تو ہلاک ہو جائے۔

تفسیر۔فرماتا ہے اے موسیٰؑ تجھے کسی ایسے شخص کی مخالفت خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ فرائض سے نہ روکے جو اس ساعت پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خوہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے ورنہ تو بھی مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔اس آیت میں بھی سورۃ کے اس پہلے حصہ کی تصدیق کی گئی ہے کہ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى یعنی قرآن اس لئے نازل نہیں ہوا کہ تجھے تباہی میں ڈالے اور کہا گیا ہے کہ اے موسیٰ جو تیری تعلیم پر عمل کرے گا وہ تباہ نہیں ہوگا بلکہ جو اس کو چھوڑے گا وہ تباہ ہوگا۔چنانچہ بائبل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو یہی پیغام دیا کہ

''اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جانفشانی سے مان کر اس کے ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ہوگا۔تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے چوپایوں کے بچے یعنی گائے بیل کی بڑھتی اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے مبارک ہوں گے۔تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی (یعنی اٹا گوندھنے کا برتن) دونوں مبارک ہوں گے اور تو اندر آتے وقت مبارک ہوگا اور باہر جاتے وقت بھی مبارک ہوگا۔۔۔۔۔۔۔لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے

خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ہوگا۔ تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی دونوں لعنتی ٹھہریں گے۔ تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے گائے بیل کی بڑھتی اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے لعنتی ہوں گے۔ تو اندر آتے لعنتی ٹھہرے گا اور باہر جاتے بھی لعنتی ٹھہرے گا۔'' (استثناء باب ۲۸ آیت ۱ تا ۲۰)

گویا وہی مضمون جو قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے تورات میں بھی موجود ہے۔

اس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مثیل تھے اس لئے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہا کہ اگر تو تورات کی تعلیم پر عمل کرے گا تو ''تو اندر آتے وقت مبارک ہوگا اور باہر جاتے وقت بھی مبارک ہوگا'' اسی طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دعا سکھائی گئی کہ وَ قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (بنی اسرائیل: ۸۱) یعنی اے میرے رب میرا دوبارہ مکہ میں داخل ہونا بھی مبارک ہو اور میرا مکہ سے نکلنا بھی مبارک ہو گویا اس آیت کی رو سے بھی آپ کا مثیل موسیٰ ہونا ثابت ہے۔

وَ مَا تِلْكَ بِیَمِیْنِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۱۸﴾ قَالَ هِیَ عَصَایَ ۚ

اور (ہم نے اس وقت موسیٰ سے کہا کہ) اے موسیٰ یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ (اس نے) کہا۔ یہ میرا سونٹا

اَتَوَكَّؤُا عَلَیْهَا وَ اَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَ لِیَ فِیْهَا

ہے۔ میں اس پر سہارا لیتا ہوں اور اس کے ذریعہ سے اپنی بکریوں پر (درختوں کے) پتے جھاڑتا ہوں اور

مَاٰرِبُ اُخْرٰی ﴿۱۹﴾

اس کے سوا بھی اس میں میرے لئے اور کئی فائدے پوشیدہ ہیں۔

حلّ لُغات۔ اَتَوَكَّؤُا اَتَوَكَّؤُا تَوَكَّاَ سے متکلم کا صیغہ ہے اور تَوَكَّاَ عَلَی الْعَصَا کے معنے ہوتے ہیں تَحَمَّلَ وَ اَعْتَمَدَ عَلَیْهَا سونٹے پر سہارا لیا (اقرب) پس اَتَوَكَّؤُا کے معنے ہوں گے میں سہارا لیتا ہوں۔

اھشُّ ھَشَّ سے ہے اور ھَشَّ الْوَرَقَ کے معنے ہوتے ہیں خَبَطَهٗ بِعَصًا لِيَتَحَاتَّ درخت کے پتوں کو سونٹے سے مارا تا کہ وہ گر پڑیں۔(اقرب) پس اَھُشُّ کے معنے ہوں گے میں جھاڑتا ہوں۔

مآٰرب اِرْبٌ کی جمع ہے اور اَلْاِرْبُ کے معنے ہیں اَلْحَاجَةُ ضرورت۔(اقرب)

تفسیر۔ یہ عصا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ہاتھ میں دیکھا یہ بھی ایک کشفی نظارہ تھا۔اور عصا سے مراد درحقیقت بنی اسرائیل تھے جو انہیں دکھائے گئے۔ چنانچہ لغت میں عصا کے ایک معنے جماعت کے بھی لکھے ہیں۔(اقرب)

جب اللہ تعالیٰ نے ان سے پوچھا کہ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طبعاً اس طرف توجہ پیدا ہوئی کہ مجھ سے عصا کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا ہے اور انہوں نے اس کی خوبیاں بیان کرنی شروع کردیں کہ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى میں اس پر سہارا لیتا ہوں اور اس کے ذریعہ سے میں اپنی بکریوں پر درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں اور اس کے سوا بھی اس میں میرے لئے کئی قوم کے فوائد اور منافع ہیں۔

سہارا لینے کا یہ مفہوم ہے کہ میں ان لوگوں پر اعتماد رکھتا ہوں اور اشاعت دین کے کاموں میں ان کی معاونت اور امداد چاہتا ہوں۔اور اَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ کے یہ معنے ہیں کہ میں ان کے ذریعہ اپنے توابع کے فوائد کی نگرانی کرتا ہوں غنم قوم کا حصہ نہیں ہوتی بلکہ ایک تابع چیز ہوتی ہے پس جب عصا کے معنے قوم کے ہوئے تو اس آیت کے یہ معنے بنے کہ میں اپنی قوم کے ذریعہ سے اپنے توابع کے فوائد کی بھی نگرانی کرتا ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ تمام نبی اپنے متبعین سے چندہ لیتے آئے ہیں اور اس کے ذریعہ سے اپنی قوم کے غریبوں کے علاوہ دوسری قوم کے غرباء اور شریف لوگوں کی بھی مدد کرتے رہے ہیں۔جیسا کہ گلہ بان اپنی بھیڑوں کی حفاظت کرتا ہے چنانچہ قرآن کریم میں بھی مسلمانوں کے لئے زکوٰۃ کا حکم ہے اور زکوٰۃ کے جہاں اخرجات گنائے گئے ہیں ان میں غریب اور مصیبت زدہ مسلمانوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔اور مسافروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے خواہ وہ کسی مذہب کا ہو اور مؤلفة القلوب کا بھی ذکر کیا گیا ہے(التوبة:۶۰) جو یقینا غیر مذاہب کے لوگ ہونے ہیں۔اور اس طرح موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو سو فیصدی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں کر دیا گیا ہے۔ان کو بھی حکم دیا گیا ہے کہ اپنی قوم سے زکوۃ لو۔یعنی اپنی قوم کے سونٹے کے ساتھ درختوں کے پتے جھاڑو لیکن وہ پتے تمہاری قوم کے ہی کام نہ آئیں بلکہ ان لوگوں کے بھی کام آئیں جو تمہاری قوم سے باہر ہیں۔اور جانور کھلانے کے مستحق ہیں۔

قَالَ اَلۡقِهَا يٰمُوۡسٰى ۝۲۰

(اس پر) اس (یعنی خدا تعالیٰ) نے فرمایا۔ اے موسیٰ! اس عصا کو زمین پر پھینک دے۔

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے موسیٰ: اس عصا کو زمین پر پھینک دے۔ یعنی دیکھ کہ اگر تو اپنی قوم کی نگرانی چھوڑ دے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسۡعٰى ۝۲۱

سو اس نے اسے زمین پر پھینک دیا جس کے بعد اس نے اچانک دیکھا کہ وہ سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔

تفسیر ۔ فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسۡعٰى انہوں نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ تو اچانک کیا دیکھا کہ وہ ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں دیکھ لیا کہ قوم کی ذرا سی بھی نگرانی چھوڑنے پر وہ سانپ کی طرح زہریلی بن گئی مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام چند دنوں کے لئے ہی پہاڑ پر گئے تو اسی عرصہ میں وہ وہ قوم بت پرست ہوگئی۔ اسی طرح جب کبھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نگرانی میں رخنہ پڑا تو وہ قوم خراب ہوگئی۔

قَالَ خُذۡهَا وَلَا تَخَفۡ ٚ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى ۝۲۲

اس پر اس (یعنی اللہ تعالیٰ) نے فرمایا۔ اس کو پکڑ لے اور ڈر نہیں ہم اس کو پھر اس کی پہلی حال کی طرف لوٹا دیں گے۔

حل لغات ۔ السیرۃ کے معنے ہیں اَلۡهَيۡئَةُ ہیئت۔ (اقرب)

تفسیر ۔ سونٹے کو سانپ کی شکل میں دیکھ کر حضرت موسیٰؑ گھبرائے تو اللہ تعالیٰ نے کہا۔ ڈرو نہیں۔ یہ تمہاری قوم ہی ہے۔ اس کو اچھی طرح پکڑ لو۔ یہ پھر اصل حالت۔ کی طرف لوٹ آئے گی۔ اور ایک مفید وجود بن جائے گی۔ یعنی تیری قوم تیری زندگی میں مستقل طور پر خراب نہیں ہوگی بلکہ جب بھی تو اس کی طرف توجہ کرے گا وہ ٹھیک ہو جائے گی۔

چنانچہ دیکھ لو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بے شک آپ کی قوم کا ایک حصہ شرک میں مبتلا

ہو گیا۔مگر جب آپ واپس آئے تو آپ کے ذریعہ اس قوم کی پھر اصلاح ہوئی اور اس نے اپنے فعل سے توبہ کی۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ان کی اس توبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ فَتَابَ عَلَيْكُمْ (البقرۃ:۵۵) اس واقعہ کے بعد پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوشش سے قوم درست ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے اس سے رحمت اور عفو کا سلوک کیا ۔گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے علیحدگی نقصان دہ ثابت ہوئی لیکن جونہی آپ نے قوم کی طرف توجہ کی وہ پھر درست ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہر قسم کی قربانیاں کرنے لگ گئی۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ

اور اپنے ہاتھ کو بغل میں دبالے۔جب تو اسے نکالے گا تو وہ سفید ہوگا۔مگر بغیر کسی بیماری کے

اٰيَةً اُخْرٰى ﴿۲۳﴾

یہ ایک اور نشان ہوگا۔

حلّ لُغَات۔اَلْيَدُ کے معنے ہیں اَلْکَفُّ ۔ہاتھ نیز اس ایک معنے الجماعۃ کے بھی ہیں یعنی جماعت (اقرب)تعطیر الانام میں ہے کہ اَلْيَدُ تَدُلُّ عَلَى الْوَلَدِ وَ الْاَخِ وَالْمَالِ وَالزَّوْجَةِ وَالشَّرِيْكِ وَالصَّدِيْقِ اگر کوئی شخص ہاتھ دیکھے تو اس سے مراد لڑکا بھائی مال۔بیوی۔شریک اور دوست ہوتا ہے۔

اَلْجِنَاحُ اَلْجَنَاحُ کے معنے ہیں اَلْعَضُدُ بازو اَلْاِبْطُ بغل۔اَلْجَانِبُ پہلو نَفْسُ الشَّیْءِ کسی چیز کی ذات اور جب اَنَا فِیْ جُنَاحِ فُلَانٍ کا فقرہ کوئی شخص کہے تو معنے ہوں گے اَیْ فِیْ ذَرَاہُ وَ ظِلِّہٖ میں اس کی پناہ اور سایہ تلے ہوں (اقرب)

تفسیر۔خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے ہاتھ کو اپنے پہلو کے ساتھ لگالو عربی زبان میں ید کے معنے بھائی کے بھی ہوتے ہیں اور جب اس کے معنوں کو وسیع کیا جائے تو اس کے معنے قوم کے بھی ہوتے ہیں۔کیونکہ قوم کے افراد بھی اعیان و مددگار کے طور پر کام آتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ کہہ کر توجہ دلائی کہ تیری قوم میں سے جو کارآمد لوگ ہیں اور تیرے ساتھ ملنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو اپنے ساتھ چمٹالو۔وہ بڑے نورانی وجود بن جائیں گے۔اور بڑے بڑے روحانی کمالات ان سے ظاہر ہوں گے۔

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنے ہاتھ کو سینہ سے لگاؤ اور آپ نے اس حکم کی تعمیل کی تو اس وقت وہ بالکل سفید اور نورانی تھا۔ اور یہ سفیدی کسی بیماری کے نتیجہ میں نہیں تھی۔ درحقیقت یہ ایک کشفی نظارہ تھا جو آپ نے دیکھا اور ایک عظیم الشان تعبیر کا حامل تھا، لیکن بائیبل اس کے متعلق یہ کہتی ہے کہ۔

''اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا۔'' (خروج باب ۴ آیت ۶)

گویا نعوذ باللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ اس وقت کوڑھ کی وجہ سے سفید ہو گیا تھا۔ حالانکہ کوڑھ کی وجہ سے سفید ہونا ایک عذاب ہے اور یہ مقام الٰہی تجلی اور اس کی نشان نمائی کا تھا۔ ایسے موقعے پر کسی عذاب کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ پس بائیبل کی یہ بات بالبداہت غلط ہے اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت اپنے آپ کو کوڑھی دیکھا تھا تو ان کا ایمان کیا بڑھا ہوگا۔ وہ تو غمزدہ ہوئے ہوں گے کہ مجھے کوڑھ ہو گیا۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اس کا ہاتھ سفید تو تھا مگر کوڑھ سے اسے کوئی مشابہت نہ تھی۔

ہم نے بتایا ہے کہ یہ ایک کشفی نظارہ تھا اور اس کی تعبیر یہ تھی کہ اپنی قوم کے کارآمد لوگوں کو اپنے ساتھ ملاؤ ان معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ ان لوگوں میں جو نیکی پائی جائے گی وہ ایسی کامل ہوگی کہ اس میں کسی قسم کی خرابی نہیں ہوگی۔ بعض لوگ ظاہر میں اچھے نظر آتے ہیں لیکن اندرونی طور پر نہایت خراب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ جب تم ان لوگوں کو اپنے قریب رکھو گے تو یہ کامل طور پر روحانی وجود بن جائیں گے خرابیاں اس میں اسی وقت پیدا ہوں گی جب یہ تجھ سے دور ہو جائیں گے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۚ﴿۲۴﴾

(اور ہم یہ اس لئے کریں گے) تا کہ اس کے نتیجہ میں ہم تجھ کو اپنے بڑے بڑے نشانات دکھائیں۔

تفسیر۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہم نے یہ نشان تجھے یہ یقین پیدا کرنے کے لئے دکھائے ہیں کہ ہم تیرے ہاتھ پر اور بھی بڑے بڑے نشانات ظاہر کریں گے جن سے تیرا مشن کامیاب ہو جائے گا۔ چنانچہ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے ان نشانات کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ کے ہاتھ پر دکھائے گئے۔ وہ فرماتا ہے فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ

الطُّوۡفَانَ وَ الۡجَرَادَ وَ الۡقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۟ فَاسۡتَکۡبَرُوۡا وَ کَانُوۡا قَوۡمًا مُّجۡرِمِیۡنَ (الاعراف: ۱۳۴) یعنی جب فرعون اور اس کی قوم نے ہماری بات ماننے سے انکار کیا تو ہم نے ان پر کئی قسم کے عذاب بھیجے جن میں طوفان۔ ٹڈیوں جوؤں۔ مینڈکوں اور خون کا عذاب شامل تھا۔ اور یہ ایسے نشانات تھے جن کو ہر ایک مشاہدہ کر سکتا تھا لیکن ان نشانوں کے باوجود فرعون اور اس کی قوم ہماری بات ماننے پر آمادہ نہ ہوئی۔

اسی طرح فرماتا ہے وَ اَدۡخِلۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ ۟ فِیۡ تِسۡعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ قَوۡمِہٖ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ (النمل: ۱۳) یعنی ہم نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈالو اور پھر نکالو تو وہ بغیر کسی بیماری کے سفید نظر آئے گا۔ یہ معجزہ ان نو معجزات میں سے ایک ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر فرعون اور اس کی قوم کے لئے دکھائے گئے لیکن انہوں نے ان معجزات سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔

بائیبل میں بھی ان نشانات کا ذکر آتا ہے۔ چنانچہ پہلا نشان عصا کا ہے جس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے کہا لاٹھی پھر اس نے کہا کہ اسے زمین پر ڈال دے۔ اس نے اسے زمین پر ڈالا اور وہ سانپ بن گئی۔ اور موسیٰ اس کے سامنے سے بھاگا۔ تب خداوند نے موسیٰ سے کہا ہاتھ بڑھا کر اس کی دم پکڑ لے اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے پکڑ لیا وہ اس کے ہاتھ میں لاٹھی بن گیا''۔ (خروج باب ۴ آیت ۲ تا ۴)

(۲)۔ پھر دوسرا نشان ہاتھ کی سفیدی کا ہے اس کے متعلق لکھا ہے۔

''پھر خداوند نے اسے یہ بھی کہا کہ تو اپنا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ کر ڈھانک لے۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر اسے ڈھانک لیا اور جب اس نے اسے نکال کر دیکھا تو اس کا ہاتھ کوڑھ سے برف کی مانند سفید تھا'' (خروج باب ۴ آیت ۶، ۷)

(۳)۔ تیسرا نشان دریا کے لہو ہو جانے کا ہے چنانچہ لکھا ہے۔

''موسیٰ اور ہارون نے خداوند کے حکم کے مطابق کیا اور اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس کے خادموں کے سامنے دریا کے پانی پر مارا اور دریا کا پانی سب خون ہو گیا۔ اور دریا کی مچھلیاں مر گئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا۔ اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے۔'' (خروج باب ۷ آیت ۲۰، ۲۱)

(۴)۔ چوتھا نشان مینڈکوں کا ہے اس کے متعلق لکھا ہے۔

''خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور

جھیلوں پر بڑھا۔اور مینڈکوں کو ملک مصر پر چڑھا لا ۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔'' (خروج باب ۸ آیت ۵ تا ۶)

(۵)۔ پانچواں نشان جوؤں کا ہے اس کے متعلق آتا ہے:۔

''تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کی گرد کو مارتا کہ وہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائے ۔انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کی گرد کو مارہ ۔اور انسان اور حیوان پر جوئیں ہوگئیں اور تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔'' (خروج باب ۸ تا آیت ۱۶ تا ۱۸)

(۶)۔ چھٹا نشان مچھروں کے عذاب کا ہے چنانچہ لکھا ہے:۔

''خداوند نے ایسا ہی کیا اور فرعون کے گھر اور اس کے نوکروں کے گھروں اور سارے ملک مصر میں مچھروں کے غول کے غول بھر گئے ۔اور ان مچھروں کے غولوں کے سبب سے ملک کا ناس ہوگیا۔'' (خروج باب ۸ آیت ۲۴)

(۷)۔ساتواں نشان مری کا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

''اور خداوند نے ایک وقت مقرر کر دیا اور بتا دیا کہ کل خداونداس ملک میں یہی کام کرے گا۔ اور خداوند نے دوسرے دن ایسا ہی کیا اور مصریوں کے سب چوپائے مر گئے لیکن بنی اسرائیل کے چوپایوں میں سے ایک بھی نہ مرا۔'' (خروج باب ۹ آیت ۵ تا ۶)

(۸)۔آٹھواں نشان جسموں پر پھوڑے نکلنے کا ہے چنانچہ لکھا ہے:۔

''اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ تم دونوں بھٹی کی راکھ اپنی مٹھیوں میں لے لو اور موسیٰ اسے فرعون کے سامنے آسمان کی طرف اڑا دے اور وہ سارے ملک مصر میں باریک گرد ہوکر مصر کے آدمیوں اور جانوروں کے جسم پر پھوڑے اور پھپھولے بن جائے گی ۔سو وہ بھٹی کی راکھ لے کر فرعون کے آگے جا کھڑے ہوئے اور موسیٰ نے اسے آسمان کی طرف اڑا دیا اور وہ آدمیوں اور جانوروں کے جسم پر پھوڑے اور پھپھولے بن گئی'' (خروج باب ۹ آیت ۸ تا ۱۰)

(۹)۔نواں نشان اولوں کا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ:۔

''اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا کہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے اولے گریں۔ اور موسیٰ نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے۔ اور آگ زمین تک آنے لگی۔ اور خداوند نے ملک مصر پر اولے برسائے۔ پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے''۔

(خروج باب ۹ آیت ۲۲، ۲۳، ۲۴)

(۱۰)۔ دسواں نشان ٹڈیوں کا ہے۔ چنانچہ لکھ ہے۔

''تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تا کہ ٹڈیاں ملک مصر پر آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی۔ اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پُروا آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پُروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک مصر پر چھا گئیں۔ اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دَل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں۔ نہ ان کے بعد پھر آئیں گی۔ کیونکہ انہوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا۔ ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انہوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا۔''

(خروج باب ۱۰ آیت ۱۲ تا ۱۵)

(۱۱)۔ گیارھواں نشان تاریکی کا نشان ہے چنانچہ لکھا ہے۔

''پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا۔ تا کہ ملک مصر میں تاریکی چھا جائے۔ ایسی تاریکی جسے ٹٹول سکیں اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھایا اور تین دن تک سارے ملک مصر میں گہری تاریکی رہی۔ تین دن تک نہ تو کسی نے کسی کو دیکھا اور نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔'' (خروج باب ۱۰ آیت ۲۱ تا ۲۳)

(۱۲)۔ بارھواں نشان پلوٹھے بچوں کا مرنا ہے چنانچہ لکھا ہے۔

''اور آدھی رات کو خداوند نے ملک مصر کے سب پلوٹھوں کو فرعون جو اپنے تخت پر بیٹھا تھا اس کے پلوٹھے سے لے کر وہ قیدی جو قید خانہ میں تھا اس کے پلوٹھے تک بلکہ چوپایوں کے پلوٹھوں کو بھی

ہلاک کر دیا اور فرعون اور اس کے سب نوکر اور سب مصری رات ہی کو اٹھ بیٹھے اور مصر میں بڑا کہرام مچ گیا کیونکہ ایک بھی ایسا گھر نہ تھا جس میں کوئی نہ مرا ہو۔'' (خروج باب ۱۲ آیت ۲۹ تا ۳۰)

(۱۳)۔ تیرھواں نشان سمندر سے پار گذرنے کا ہے چنانچہ لکھا ہے۔

''پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا۔ اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔ اور ان کے داہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا۔''

(خروج باب ۱۴ آیت ۲۱، ۲۲)

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے قرآن کریم نے صرف نو نشانات کا ذکر کیا ہے۔ یعنی

۱۔ عصا کا نشان۔

۲۔ ید بیضاء کا نشان۔

۳۔ طوفان کا نشان۔

۴۔ ٹڈیوں کا نشان۔

۵۔ جوؤں کا نشان۔

۶۔ مینڈکوں کا نشان۔

۷۔ خون کا نشان۔

۸۔ قحط کا نشان جیسے فرمایا۔ وَ لَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَ نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (الاعراف: ۱۳۱)

۹۔ سمندر سے پار گذرنے کا نشان۔

ان نشانات کے بیان کرنے میں قرآن کریم اور بائیبل میں اختلاف نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بائیبل نے ان نشانات کے بارے میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ ورنہ قرآن کریم نے جن نشانوں کا نو کی تعداد میں ذکر کیا ہے اس میں بائیبل کے بیان کردہ تمام کے تمام نشانات آ جاتے ہیں۔ چنانچہ طوفان میں اولوں اور تاریکی کا نشان شامل ہے لیکن بائیبل میں اس کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم نے خون کا نشان بیان کیا ہے لیکن بائیبل نے اسے دریا کے لہو ہو جانے اور جسموں پر پھوڑے اور پھنسیاں نکلنے میں تقسیم کر دیا ہے۔ حالانکہ

دریا کے پانی کے خون ہوجانے کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ دریا کا پانی اس قدر خراب ہوگیا تھا کہ جو کوئی اس کو پیتا تھا اس کا خون خراب ہوجاتا تھا۔ اسی طرح پلوٹھے بچوں کی موت کا نشان بائیبل نے علیحدہ بیان کیا ہے حالانکہ اسے علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا تو یہ نشان دم کے نشان کے ماتحت آجاتا ہے اور یا پھر قمّل کے نشان کے ماتحت آجاتا ہے کیونکہ جوؤں، مکھیوں اور مچھروں سے بیماری پھیلتی ہے اور ان سے موت واقع ہوجاتی ہے۔ اسی طرح قمّل کے ماتحت مچھروں کا نشان بھی آجاتا ہے کیونکہ عربی زبان میں قمّل کے معنے ان چھوٹے کیڑوں کے بھی ہوتے ہیں جن کے چھوٹے چھوٹے پر ہوتے ہیں (اقرب) غرض ان نشانات کے بارے میں قرآن کریم کا بیان بالکل صحیح اور درست ہے۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ

توفرعون کی طرف جا۔ کیونکہ اس نے سرکشی اختیار کی ہے (اس پر موسیٰ نے) کہا اے میرے رب میرا سینہ

صَدْرِيْ ﴿۲۶﴾ وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۲۷﴾ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ

کھول دے۔ اور جو فرض مجھ پر ڈالا گیا ہے اس کو پورا کرنا میرے لئے آسان کر دے اور اگر میری زبان میں کوئی

لِّسَانِيْ ﴿۲۸﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۹﴾

گرہ ہو تو اسے بھی کھول دے (حتیٰ کہ) لوگ میری بات کو آسانی سے سمجھنے لگیں

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ یہ نشان دکھا کر ہم نے موسیٰ سے کہا۔ کہ اب فرعون کی طرف جا۔ کیونکہ وہ سرکش ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا الٰہی میں جاتا تو ہوں لیکن آپ میرے سینہ کو کھول دیجیئے اور میرے کام کو آسان کر دیجیئے اور میری زبان کو چلا دیجئے اور اس کی ساری گرہیں کھول دیجئے تاکہ فرعون اور اس کے ساتھی میری بات کو سمجھ سکیں۔ کیونکہ جو پیغام مجھے دیا گیا ہے اس کا ان لوگوں کے لئے سمجھنا بڑا مشکل ہے۔

اس دعا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے یہ کہا ہے کہ اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے یعنی میرے اندر اس کام کے لئے ایک قسم کی دیوانگی جوش اور ولولہ پیدا فرما دے۔ اور میرے معاملہ میں میرے لئے آسانیاں پیدا کر دے۔ یعنی ایسی تعلیم اور ایسے احکام مجھے دے کہ لوگ اس کو ماننے کے لئے تیار ہوں۔ اور اسی طرح وہ تعلیم

ایسی اعلیٰ درجہ کی ہو کہ جس کا پھیلانا آسان ہو اور پھر مجھے اس کے بیان کرنے کی بھی توفیق عطا فرما تا میں اسے عمدہ طریق سے پیش کر سکوں۔ اور اس کے بعد اے میرے خدا لوگوں کی طبائع اس طرف پھیر دے تا کہ وہ اس تعلیم کی طرف توجہ کرنے لگیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا سے ظاہر ہے کہ ہدایت در حقیقت خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے۔ تقریروں اور دلیلوں سے نہیں آتی اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ الٰہی جو تعلیم میں دوں اس پر خود بھی عمل کروں اور دوسرے لوگ بھی اس کو آسانی سے مان لیں۔

ان آیات میں تبلیغ کا یہ گر بتایا گیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دعا کرتا رہے۔ پس ہمارے مبلغین کو یہ دعا بار بار مانگتے رہنا چاہیے۔

وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۳۰﴾ هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۱﴾ اشْدُدْ

اور میرے اہل میں سے میرا ایک نائب تجویز کر (یعنی) ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ سے میری طاقت کو

بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۲﴾ وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۳۳﴾

مضبوط کر۔ اور اس کو میرے کام میں شریک کر۔

حلّ لُغات۔ **وزیر** وزیر کے معنے مُعَاوِنٌ کے ہیں (اقرب) اَلْاَزْرُ کے معنے ہیں الظَّهْرُ ۔ پیٹھ اَلْقُوَّةُ۔ طاقت اور قوت۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرق ظاہر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی وحی ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے کوئی ساتھی بھی دے۔ اور اس کے ذریعہ سے میری طاقت کو بڑھا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گو تھوڑے سے وقفہ کے لئے انکساراً یہ ظاہر کیا کہ میں اتنا بڑا بوجھ اٹھانے کے نا قابل ہوں۔ مگر پھر اکیلے ہی اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے (فَدَاہُ اَبِیْ وَ اُمِّیْ وَ جَسَدِیْ وَ رُوْحِیْ) تبھی قرآن کریم فرماتا ہے ۔ وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا (الجن: ۲۰) یعنی جب ہمارا بندہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑا ہوتا ہے تا کہ خدا کی عبادت کو دنیا میں قائم کرے تو لوگ اس پر حملہ کرنے کے لئے دوڑے چلے آتے ہیں۔ پس محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری عمر اکیلے کھڑے رہے اور ساری قوم کے حملے سہتے رہے۔ چنانچہ تاریخ میں آتا ہے کہ جب اُحد کے موقعہ پر کفار کا ایک

تجربہ کار جرنیل آگے بڑھا اور صحابہؓ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس کے آگے کھڑے ہوگئے تو اس نے کہا۔میرا صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ ہے آپ نے فرمایا میرے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ پھر جب وہ حملہ کرتے ہوئے آپ کے قریب پہنچا تو آپ نے صرف اپنا نیزہ بڑھا کر اسے چھوڑ دیا۔قتل کرنے کی پھر بھی کوشش نہیں کی اس پر وہ شخص یہ چلاتا ہوا دوڑ گیا کہ ہائے میں مر گیا۔ہائے میں مر گیا۔جب اس کی قوم کے لوگوں نے کہا کہ تم تو اتنے بڑے جرنیل ہو اس تھوڑے سے زخم سے کیوں چلا رہے ہو تو اس نے کہا تم کو معلوم نہیں اس شخص کے نیزہ کی انی میں سارے جہنم کی آگ بھری ہوئی تھی مجھے یوں معلوم ہو رہا ہے کہ میرا سارا جسم جل رہا ہے۔(سیرۃ الحبیبہ جلد ۲ صفحہ ۲۴۴)

اسی طرح غزوہ حنین کے موقعہ پر جب دشمن دائیں بائیں کے ٹیلوں پر چڑھ کر تیر برسا رہا تھا اور مکہ کے نو مسلموں کے بھاگ جانے کی وجہ سے صحابہؓ کے پاؤں بھی اکھڑ گئے تھے۔آپ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔اور اکیلے کافروں کے دورویہ لشکروں میں گھس گئے۔اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے آگے بڑھ کر آپ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور کہا۔یا رسول اللہ مسلمانوں کو لوٹنے دیجئے وہ تھوڑی دیر میں ہی آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے اس پر آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو سختی سے ہٹا دیا اور فرمایا میرے گھوڑے کی باگ چھوڑ دو اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے کہ۔

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

(بخاری کتاب المغازی باب قول اللہ تعالیٰ ویوم حنین اذأعجبتکم کثرتکم)

اے لوگو میں موعود نبی ہوں۔میں جھوٹا نہیں۔تم مجھے مار نہیں سکتے مگر میرے اس نشان کو دیکھ کر مجھے خدا نہ بنا لینا میں عبدالمطلب کا بیٹا اور انسان ہوں۔

کتنا عظیم الشان فرق ہے مسیحؑ میں اور مرے آقا میں وہ ساری رات یہ دعائیں مانگتا رہا کہ ’’اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے‘‘ (متی باب ۲۶ آیت ۳۹) مگر پھر بھی اس کو لوگوں نے خدا بنا دیا وہ صرف دو گھنٹے صلیب پر لٹکا رہا اور اتنے عرصے میں ہی خدا تعالیٰ سے شکایت کرنے لگا کہ ’’اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا‘‘ (متی باب ۲۷ آیت ۴۶) مگر میرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسے دشمن کے نرغہ میں گھر گیا جو دو طرف پہاڑیوں پر چڑھا ہوا تھا۔اور دونوں طرف سے اس پر تیر اندازی کر رہا تھا۔اور اس کے ساتھی ایک فریب میں آ کر بھاگ گئے تھے۔مگر پھر بھی وہ اپنے خدا سے مایوس نہیں ہوا۔اور پھر بھی اس نے یہی کہا کہ میں انسان

ہوں خدا نہیں کیسی اندھی ہے وہ دنیا جو ان واقعات کے بعد بھی مسیح کو آسمان پر چڑھاتی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین میں دفن کرتی ہے۔ اگر آسمان پر کوئی چڑھ سکتا تھا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اگر زمین میں دفن ہونے کا کوئی مستحق تھا تو مسیح ناصری۔ مگر یہ طاقت اللہ ہی کو ہے کہ وہ لوگوں کو آنکھیں دے کہ وہ ہر ایک کا مقام پہچانیں۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿۳۵﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا

تا کہ ہم (دونوں) کثرت سے تیری تسبیح کریں اور کثرت سے تیرا ذکر کریں۔ تو ہمیں

بَصِيْرًا ﴿۳۶﴾

خوب دیکھ رہا ہے۔

تفسیر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو کثرت سے تسبیح کرنے کے لئے ایک ساتھی مانگ رہے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے ہی اس کام کو کرتے تھے۔ جیسا کہ سوۃ مزمل میں آتا ہے اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ (المزمل:۲۱) یعنی تیرا رب اس بات کو خوب جانتا ہے کہ تو کبھی دو تہائی رات کے قریب۔ کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات نماز میں کھڑا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بجالاتا ہے اور تیری اقتدا میں مومنوں کا ایک بڑا گروہ بھی تیرے ساتھ عبادت اور ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے پس اس آیت سے بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقام کا فرق ظاہر ہے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ

(اللہ تعالیٰ) نے فرمایا۔ اے موسیٰ جو تو نے مانگا تجھے دیا گیا۔ اور ہم (اس سے پہلے) ایک بار اور بھی تجھ پر احسان

مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿۳۸﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿۳۹﴾ اَنِ

کر چکے ہیں۔ جب ہم نے تیری ماں پر وحی کے ذریعہ وہ سب کچھ نازل کر دیا جو (ایسے موقعہ) پر نازل کرنا ضروری

اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ

تھا۔(جس کی تفصیل یہ ہے) کہ اس (یعنی موسیٰ) کو تابوت میں رکھ دے پھر اس (تابوت) کو دریا میں رکھ دے پھر

بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ

(اس کے بعد یوں ہو کہ) دریا (ہمارے حکم سے) اس (تابوت) کو ساحل تک پہنچا دے (تاکہ) اس کو وہ شخص لے

مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۟ اِذْ تَمْشِيْۤ اُخْتُكَ

جائے جو میرا بھی اور اس (یعنی موسیٰ) کا بھی دشمن ہے اور تجھ پر میں نے اپنی طرف سے محبت نازل کی (یعنی تیرے

فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى

لئے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کی) اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے پالا گیا۔(یہ اس

اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا

وقت ہوا) جب تیری بہن (ساتھ ساتھ) چلتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی کہ اے لوگو کیا میں تمہیں اس عورت کا پتہ

فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫ۥ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ

بتاؤں جو اس کو پال لے گی۔اور اس طرح ہم نے تجھ کو تیری ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی

اَهْلِ مَدْيَنَ ۬ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۟ وَ

ہو جائیں اور وہ غم نہ کرے۔اور (اے موسیٰ) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا پھر ہم نے تجھ کو اس غم سے نجات بخشی

اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۟ۚ

اور ہم نے تجھ کو اور کئی امتحانوں میں ڈال کر اچھی طرح آزمایا (جس کے بعد) تو کئی سال مدین کے لوگوں میں رہا پھر اے موسیٰ (ہوتے ہوتے) تو اس عمر کو پہنچ گیا جو ہمارے کام کے قابل ہوتی ہے۔اور میں نے تجھ کو اپنی ذات کے لئے (روحانی ترقی دیتے دیتے) تیار کیا۔

حلّ لُغات۔لِتُصْنَعَ الصُّنْعُ کے معنے ہیں اِجَادَةُ الْفِعْلِ کسی کام کو اچھی طرح سے کرنا۔(مفردات)

اور عَلٰی عَیْنِیْ کا محاورہ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی کی حفاظت اور شفقت مطلوب ہو۔(اقرب) پس لِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ کے معنے ہوں گے تا کہ تو ہماری خاص شفقت اور رحمت میں پرورش پائے۔

اِصْطَنَعَ فُلَانًا لِنَفْسِہٖ کے معنے ہیں اِخْتَارَہٗ لِنَفْسِہٖ اس کو اپنے لئے چن لیا۔(اقرب) پس اِصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِی کے معنے ہوں گے میں نے تجھ کو اپنے کام کے لئے چن لیا۔

تفسیر ۔اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اے موسیٰ! جو کچھ تو نے مانگا ہے وہ سب کچھ ہم نے تجھے دیا۔اس میں اشارۃً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی وعدہ ہے کہ آپ کو بھی وہی کچھ دیا جائے گا جو آپ مانگیں گے۔

پھر ہم نے اسے کہا کہ یہ ہمارا دوسری دفعہ احسان ہے پہلی دفعہ وہ احسان تھا جب تیری ماں نے تجھے ہمارے حکم کے مطابق دریا میں پھینک دیا تھا اور ہم نے ایسا ذریعہ اختیار کیا تھا کہ جس کی وجہ سے تو پھر اپنی ماں کی طرف لوٹا دیا گیا اور یہ نشان جو دریا سے بچانے کا تھا اس لئے ظاہر کیا گیا تا کہ تو میرے فضل کے نیچے پرورش پائے۔

اس جگہ بائیبل کے اس بیان کی طرف اشارہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں نے ٹوکرے میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا اور وہ بہتے ہوئے اس جگہ پر جا لگے جہاں فرعون کی بیٹی سیر کر رہی تھی اور اس نے آپ کو دیکھا تو اسے رحم آیا اور کہنے لگی کہ یہ کسی عبرانی کا بچہ ہے۔اور اس نے کہا لاؤ ہم اس بچے کو پال لیں مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پالیں کس طرح اتنے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن بہناپے کی محبت سے بے تاب ہو کر دریا کے کنارے آتی ہوئی نظر آئی اور اس نے دیکھ لیا کہ موسیٰ کو فرعون کی لڑکی نے پسند کر لیا ہے اور اس کی پرورش کرنا چاہتی ہے مگر حیران ہے کہ کس طرح پرورش کرے تب وہ آگے بڑھی اور اس نے اپنی ماں کا پتہ بتایا کہ وہ اس بچہ کو پال لے گی۔اور اس طرح بیٹا اپنی ماں کی گود میں آ گیا۔

بائیبل نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ چونکہ فرعون کا حکم تھا کہ اسرائیلی بچوں کو مار دیا جائے (خروج باب ۱ آیت ۱۶ تا ۲۲) اس لئے اس خوف سے موسیٰ کی ماں نے

’’سرکنڈوں کا ایک ٹوکرا لیا اور اس پر چکنی مٹی اور رال لگا کر لڑکے کو اس میں رکھا اور اسے دریا کے کنارے جھاؤ میں چھوڑ آئی‘‘ (خروج باب ۲ آیت ۳)

بائیبل کے اس بیان اور قرآن کریم کے اس بیان میں ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم تو بتاتا ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کو یہ وحی کی کہ اَنِ اقْذِفِیْهِ فِی التَّابُوْتِ یعنی اسے تابوت میں رکھ دے اور پھر اس کو دریا

میں ڈال دے لیکن بائیبل میں سرکنڈوں کے ٹوکرے میں ڈالنے کا ذکر ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اختلاف کوئی حقیقت نہیں رکھتا کیونکہ مختلف ملکوں میں سامان رکھنے کے لئے مختلف چیزوں سے برتن بنائے جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے کے لوگ جھاڑیوں کی شاخوں سے ایسے بکس بنا لیتے ہیں جن میں وہ چیزیں رکھتے ہیں عربی زبان میں ہم اس کو تابوت کہہ دیں گے۔ یہ ضروری نہیں کہ تابوت سے مراد لکڑی کا بنا ہوا بکس ہو۔ پس یہ اختلاف کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ لیکن پھر بھی قرآنی الفاظ زیادہ درست ہیں اس لئے کہ جس چیز کو دریا میں ڈالا جائے گا وہ بہرحال ایسی ہی ہوگی جس کے اندر پانی داخل نہ ہو سکے اسی لئے بائیبل بھی بتاتی ہے کہ سرکنڈے کے ٹوکرے پر چکنی مٹی اور رال لگا کر اس کے سوراخوں کو بند کیا گیا اور جب سرکنڈے کے ٹوکرے پر مٹی اور رال وغیرہ لگا کر اسے اچھی طرح بند کیا گیا تو وہی ٹوکرا تابوت بن گیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کے واقعہ سے بھی ایک مشابہت حاصل ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ موسیٰؑ کو دودھ پلوانے کے لئے اس کی بہن نے کوشش کی لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلانے والی عورت کو خدا تعالیٰ خود پکڑ کر آپ کے پاس لے آیا۔ چنانچہ تاریخوں میں لکھا ہے کہ مکہ کے اردگرد کے گاؤں کی عورتیں ایک خاص موسم میں مکے میں جمع ہو جاتی تھیں تا کہ امیروں کے بچے دودھ پلانے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چند ماہ کے ہو گئے اور وہ وقت آیا جب عورتیں باہر سے آتی تھیں تو باہر سے کچھ عورتیں آئیں جن میں آپ کی ہونے والی دائی حلیمہ بھی تھی۔ حلیمہ کا خاندان غریب تھا۔ اس لئے جن امیر گھروں میں بھی وہ گئی انہوں نے اپنا بچہ اسے دینے سے انکار کر دیا یہ سمجھ کر کہ یہ غریب عورت بچے کو اچھی طرح سے پال نہیں سکے گی۔ حلیمہ سارا دن مکہ کے گھروں میں پھرتی رہی اور ردّ ہوتی رہی اور میرے آقا کی ماں بیوہ آمنہ اپنے گھر میں کسی مناسب دایہ کا انتظار کرتی رہی لیکن کسی مناسب دایہ نے اس گھر میں جھانکنا تک پسند نہ کیا۔ اس خیال سے کہ آمنہ کے یتیم بچے کے پالنے کا بدلہ کون دے گا جب سارا دن مکہ کے ہر گھر سے حلیمہ دھتکاری گئی تو اس نے خیال کیا کہ اگر میں بغیر بچے کے گئی تو بدنام ہو جاؤں گی۔ چلو اگر کسی امیر گھرانے کا بچہ نہیں ملتا تو غریب گھرانہ کا یتیم محمد ہی ساتھ لیتی جاؤں (السیرۃ الحلبیہ جلد اول باب ذکر الرضاعۃ صلی اللہ علیہ وسلم وما اتصل بہ) گویا ساری دائیوں کا رد کردہ بچہ اس دایہ نے لیا جسے سب مکہ والوں نے رد کر دیا تھا۔ اور اس طرح وہ پیشگوئی پوری ہوئی جو صحف سابقہ میں آچکی ہے کہ

’’جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا‘‘ (متی باب ۲۱ آیت ۴۲)

دایہ بھی معمار ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی بچہ کی پرورش کرتی اور اسے کھڑا ہونے کے قابل بناتی ہے۔غرض وہ تمام دائیوں کا رد کیا ہوا بچہ حلیمہ کے گھر گیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک صحت افزا مقام پر پرورش کا انتظام فرما دیا۔مگر خدا تعالیٰ کی غیرت دیکھو کہ جس یتیم بچے کے لے جانے سے حلیمہ ڈرتی تھی اسی یتیم بچے کو خدا تعالیٰ نے ایک دن اس کی قوم سے لڑوا دیا اور اس کو غالب کر دیا۔حلیمہ کی قوم کے بہت سے افراد غزوہ حنین میں قید ہوئے اور بہت سے جانور پکڑے گئے۔حلیمہ کی قوم کے مالدار فرعون حلیمہ کے غریب بچوں سے سفارش کی خواہش کرنے سے گھبراتے تھے لیکن آخر مجبور ہو کر ان کے پاس گئے۔اور جا کر کہا کہ قوم کی نظر تو تمہیں پر ہے۔جاؤ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی قوم کی سفارش کرو۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک ان کا انتظار کرتے رہے تھے۔آخر مجبور ہو کر آپ نے حلیمہ کی قوم کے اموال غنیمت کو فوجیوں میں تقسیم کر دیا تھا۔صرف غلام رہنے دیئے تھے جب حلیمہ کی ایک بچی آپ کے پاس سفارش کے لئے آئی تو آپ نے فرمایا میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔آخر تنگ آ کر مال تقسیم کر دیا۔اب تم خود ہی پسند کرلو۔آیا میں مال واپس لے کر تم کو دے دوں یا قیدی تم کو دے دوں اس نے قوم سے مشورہ کیا اور کہا ہمیں قیدی چاہئیں مال نہیں چاہیے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر اسلام کے سامنے یہ معاملہ رکھا انہوں نے کہا۔یارسول اللہ ہم خوشی سے اپنے اپنے قیدی آزاد کرنے کے لئے تیار ہیں چنانچہ اسی وقت بنو ہوازن کا چھ ہزار قیدی رہا کر دیا گیا۔(السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ باب ذکر مغاذیۃ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۃ الطائف)

اب موسیٰ ؑ کی پرورش کے واقعہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برورش کے واقعہ کا مقابلہ کر کے دیکھو یہ دونوں واقعات آپس میں مشابہ بھی ہیں لیکن پھر بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کا واقعہ موسیٰ ؑ کی پرورش کے واقعہ سے اپنی شان میں ہزاروں گنا زیادہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۳﴾ج

(پس جب تو اس عمر کو پہنچ گیا تو میں نے تجھے کہا کہ) تو اور تیرا بھائی میرے نشان لے کر جاؤ

اِذْهَبَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۴﴾صلے

اور میرے ذکر میں کوئی کوتاہی نہ کرو۔ تم دونوں ہی فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔

حلّ لُغات۔ لَا تَنِيَا لَا تَنِيَا وَنِیَ سے نہی کا صیغہ ہے اور وَنَى الرَّجُلُ فِي الْاَمْرِ کے معنے ہیں فَتَرَ وَ ضَعُفَ کمزور ہو گیا اور سست ہو گیا۔ (اقرب) پس لَا تَنِيَا کے معنے ہو نگے۔ تم دونوں سستی نہ کرنا۔

تفسیر۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت ہے۔ چنانچہ آپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے فرعون کی مشابہ قوم کی طرف بھیجا اور فرمایا۔ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل:۱۶) یعنی ہم نے تمہاری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح تمہارا نگران بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف موسیٰؑ کو بھیجا تھا۔ مگر فرق یہ ہے کہ گو فرعون کی طرح آپ کی قوم نے بھی آپ کو قتل کرنے کی دھمکی دی مگر آپ ڈرے نہیں بلکہ بڑی جرات سے خدا تعالیٰ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچاتے رہے اس کے بعد جب مکہ کے رؤساء نے دیکھا کہ ان کے اپنے گھروں میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں جو بتوں میں خدائی طاقت تسلیم نہیں کرتے اور وہ کھلے طور پر خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں تو یہ بات ان کی برداشت سے بالکل باہر ہو گئی اور وہ اکٹھے ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ہم نے آپ کی خاطر اب تک آپ کے بھتیجے کو کچھ نہیں کہا مگر اب معاملہ حد سے نکل چکا ہے اور یہ ہمارے بتوں کی تذلیل کر رہا ہے اس لئے آپ یا تو اسے سمجھائیں اور اس طریق سے اسے باز رکھنے کی کوشش کریں ورنہ ہم صرف اس کا نہیں بلکہ آپ کا بھی مقابلہ کریں گے اور آپ کو اپنی قوم کی سرداری سے الگ کر دیں گے۔ ابو طالب کے لئے اپنی ریاست کو چھوڑنا ایک نہایت ہی تلخ گھونٹ تھا۔ انہوں نے سرداران قریش سے وعدہ کر لیا کہ میں اپنے بھتیجے کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ ان کے چلے جانے کے بعد ابو طالب نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلوایا اور ان سے کہا کہ اے میرے بھتیجے اب تیری قوم تیرے خلاف سخت مشتعل ہو چکی ہے اور قریب ہے کہ وہ تجھے بھی اور ساتھ ہی مجھ کو بھی ہلاک کر دیں۔ میں تجھے خیر خواہی اور ہمدردی سے کہتا ہوں کہ تو بتوں کو

برا بھلا نہ کہہ۔ ورنہ میں اپنی ساری قوم کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ جب ابو طالب نے یہ بات کہی تو اس وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے انہیں غمزدہ دیکھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلمکی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ مگر آپ نے فرمایا۔ خدا کی قسم اگر یہ لوگ سورج کو میرے دائیں اور چاند کو میرے بائیں بھی لا کر کھڑا کر دیں تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا جس کے لئے خدا نے مجھے کھڑا کیا ہے۔ اور اے میرے چچا اگر آپ کو اپنی کمزوری اور تکلیف کا احساس ہے تو بے شک مجھے اپنی پناہ میں رکھنے سے دست بردار ہو جائیں۔ میں خدا تعالیٰ کی توحید کی اشاعت سے کسی صورت میں بھی نہیں رک سکتا۔ میں اس کام میں مشغول رہوں گا یہاں تک کہ خدا مجھے موت دے دے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جواب کا ابو طالب پر اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے کہا۔ اے میرے بھتیجے جا اور اپنے کام میں مشغول رہ اگر قوم مجھے چھوڑنا چاہتی ہے تو بے شک چھوڑ دے۔ میں تجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ (سیرۃ ابن ہشام وفد قریش یعاقب اباطالب جلد اول صفحہ ۸۸)

اسی طرح اُحد کی جنگ میں جب آپ زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر گئے اور لوگوں میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو اس سے دشمنوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اور ابو سفیان نے سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر بلند آواز سے کہا کہ بتاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہاں ہے؟ چونکہ اس وقت بہت سے مسلمان زخمی پڑے تھے اور لشکر منتشر ہو چکا تھا اور خطرہ تھا کہ کفار پھر لوٹ کر مسلمانوں پر حملہ نہ کر دیں اس لئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی جواب نہ دے۔ جب اس نے دیکھا کہ مسلمان بالکل خاموش ہیں اور وہ کوئی جواب نہیں دے رہے جس کے معنے یہ ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ میں شہید ہو چکے ہیں۔ تو پھر اس نے کہا ابو بکرؓ کہاں ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ کوئی نہ بولے جب اس سوال پر بھی ابو سفیان نے مسلمانوں کو خاموش دیکھا تو اس نے سمجھا کہ ابو بکرؓ بھی مارے گئے ہیں اس پر پھر اس نے بلند آواز سے کہا کہ بتاؤ عمرؓ کہاں ہے؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا کہ کوئی جواب نہ دے اس سے ابو سفیان کو یقین ہو گیا کہ عمرؓ کو بھی ہم نے مار ڈالا ہے اور اس نے بڑے جوش سے کہا اُعْلُ هُبَلُ۔ اُعْلُ هُبَلُ یعنی ہبل جو ہمارا بڑا بت ہے اس کی شان بلند ہو کیونکہ آج اس نے اپنے مخالفوں کو چن چن کر ہلاک کر دیا ہے۔ جب اس نے یہ نعرہ لگایا تو چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار صحابہؓ کو یہ ہدایت دے چکے تھے کہ خاموش رہو۔ اس لئے صحابہؓ پھر بھی خاموش رہے اور وہ بولے نہیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے جوش سے فرمایا جواب کیوں نہیں دیتے۔ کہو اللہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ اللہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ یعنی اللہ ہی اعلیٰ اور بلند شان والا ہے اللہ ہی اعلیٰ اور بلند شان والا ہے۔ صحابہؓ

نے یہ جواب دیا تو ابوسفیان کہنے لگا لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ ہمارے پاس تو عزیٰ ہے مگر تمہارے پاس کوئی عزیٰ نہیں اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہو اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ ہمارا اللہ ہمارا حافظ و ناصر ہے مگر تمہارا کوئی حافظ و ناصر نہیں (السیرۃ الحلبیہ جلد ۲ باب ذکر مغازیہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۃ احد) اب دیکھو باوجود اس کے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے کہ یہ موقعہ انتہائی طور پر نازک ہے اور اگر اس وقت دشمن کو جواب دیا گیا تو ممکن ہے کہ وہ دوبارہ حملہ کر دے۔ جب ابوسفیان نے اللہ تعالیٰ کی توحید پر حملہ کیا تو آپ سے برداشت نہ ہو سکا اور آپ نے بڑے جوش سے فرمایا تم غلط کہتے ہو ہبل اور عزیٰ میں کیا طاقت ہے اصل طاقت تو زمین و آسمان کے خدا میں ہے جس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ غرض خطرناک سے خطرناک مواقع پر بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک نڈر اور بہادر پہلوان کی طرح دشمن کے مقابلہ میں کھڑے ہو جاتے تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی ڈر اور خوف کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے تھے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۵﴾ قَالَا

اور تم دونوں اس سے نرم نرم کلام کرو۔ شائد کہ وہ سمجھ جائے یا (ہم سے) ڈرنے لگے۔ دونوں نے عرض کیا۔ اے

رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۶﴾ قَالَ

ہمارے رب ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے یا ہم پر حد سے زیادہ سختی نہ کرے۔ (اللہ تعالیٰ نے)

لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰى ﴿۴۷﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا

فرمایا تم دونوں بالکل نہ ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں (تمہاری دعائیں بھی) سنتا ہوں اور (تمہاری حالت بھی)

رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ وَ لَا

دیکھتا ہوں پس دونوں اس کے پاس چلے جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے رسول ہیں۔ پس

تُعَذِّبْهُمْ ؕ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰى

ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے اور ان کو تکلیفیں مت دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف

مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٨﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى

سے ایک بڑا نشان لیکر آئے ہیں اور (تجھے بتاتے ہیں کہ) جو (شخص ہماری لائی ہوئی) ہدایت کے پیچھے

مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٩﴾

چلے گا (خدا کی طرف سے) اس پر سلامتی نازل ہوگی۔ ہم پر یہ وحی نازل کی گئی ہے۔ کہ جو کوئی (خدا کے نشان کو) جھٹلائے گا۔ اور پیٹھ پھیر لے گا۔ اس پر عذاب نازل ہوگا

حلّ لُغات۔ یفرط یَفْرُطُ فَرَطَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور فَرَطَهٗ کے معنے ہوتے ہیں اٰذَاهُ۔ اس کو تکلیف دی۔ پس اَنْ یَّفْرُطَ کے معنے ہوں گے کہ وہ ایذاء یا دکھ دے فَرَطَ فِي الْاَمْرِ کے معنے قَصَّرَ فِيْهِ کے بھی ہیں یعنی کسی معاملہ میں کمی کی (اقرب) پس اَنْ یَّفْرُطَ کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ وہ کمی کرے یعنی ہماری بات ہی نہ سنے۔

تفسیر۔ اس میں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مشابہت پائی جاتی ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ فرعون سے نرم نرم باتیں کرنا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ نڈر ہو کر خدا کے متعلق باتیں سناتے ہیں بلکہ ان کے مرید بھی ایسے ہی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم:۱۰) یعنی اے محمد رسول اللہؐ کفار چاہتے ہیں کہ تو اپنے دین کے متعلق ذرا نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کرنے لگ جائیں مگر تو ایسا نہیں کرتا۔ اور مومنوں کے متعلق فرمایا۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:۳۰) یعنی دشمن کتنا ہی ان سے نرمی کر کے ان کو دین کے معاملہ میں نرم کرنا چاہے وہ کبھی دین کے معاملہ میں کوئی لچک نہیں دکھاتے۔ ہاں مومن اگر سختی بھی کریں تو اس کو بھلا دیتے ہیں۔

لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى میں اللہ تعالیٰ فرعون کے متعلق کہتا ہے کہ شاید وہ نصیحت پکڑے اور ڈرے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ کو علم تھا یا نہیں کہ وہ مانے گا یا نہیں اگر تھا تو شاید کا لفظ کیوں رکھا اور اگر یہ شاید یقین کے معنوں میں آیا ہے تو یہ بات غلط نکلی کیونکہ فرعون نے مانا نہیں پھر شاید کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لعل بے شک شک پر دلالت کرتا ہے لیکن ماہرین لغت کہتے ہیں کہ لعل میں امید کے معنے بھی پائے جاتے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ یہ امید قائل کی طرف سے ہو بلکہ کبھی قائل کی طرف سے ہوتی ہے کبھی سامع کی طرف سے اور کبھی

اس شخص کی طرف سے جس کے متعلق بات کہی گئی ہو(اقرب) آیت لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی میں لعل کا لفظ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے لئے ہے یعنی قُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَیِّنًا رَاجِعِیْنَ اَنْ یَّتَذَکَّرَ یعنی اس امید کے ساتھ فرعون کو تبلیغ کرنا کہ شاید وہ ہدایت پا جائے پس لعل کے لفظ سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ خدا تعالیٰ کا کلام جو کسی پیشگوئی پر مشتمل ہوتا ہے اس میں بالعموم یہی طریق اختیار کیا جاتا ہے کہ اگر دوسرا شخص اپنی اصلاح کر لے گا تو بچ جائے گا اور اگر نہیں کرے گا تو ہلاک ہوگا۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۵۰﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ

(اس پر فرعون نے) کہا اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ (موسیٰ نے) کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر

شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۱﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۲﴾

چیز کو (اس کی ضرورت کے مطابق) اعضاء عطا کئے ہیں اور پھر ان (اعضاء) سے کام لینے کا طریقہ سکھایا ہے۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا

(فرعون نے) کہا (اگر یہ بات ہے) تو پہلے لوگوں کا کیا حال تھا (یعنی وہ تو ان باتوں کو نہیں مانتے تھے ان سے کیا

يَنْسَى ﴿۵۳﴾

سلوک ہوگا؟ (موسیٰ نے) کہا ان (پہلے لوگوں) کا علم تو میرے رب کو ہے (ان سب کے حالات اس کی) کتاب میں محفوظ (ہیں) میرا رب نہ بھٹکتا ہے اور نہ بھولتا ہے۔

تفسیر ۔ جب خدا تعالیٰ کی صفات اور اس کی وحی نازل کرنے کی عادت کا ذکر فرعون نے سنا تو چونکہ وہ ان باتوں سے ناواقف تھا اس نے حیران ہو کر موسیٰؑ سے پوچھا کہ اے موسیٰ! یہ کیسا خدا تو نے پیدا کر لیا ہے جو پہلے لوگوں سے کبھی سنا نہ تھا۔ اس پر موسیٰؑ نے کہا کہ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ دنیا میں ایک کامل نظام پایا جاتا ہے اور ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کے مطابق اعضاء ملے ہیں اور ان اعضاء سے کام لینے کا طریق بھی وہ پیدائش سے سیکھ کر آتی ہے اس پر فرعون نے کہا کہ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى اگر یہ بات ہے تو ہمارے باپ دادے جو ان باتوں سے ناواقف تھے ان

کا تو بُرا حال ہوگا۔ اس طرح اس نے لوگوں کو اشتعال دلانا چاہا اور وہی حربہ استعمال کیا جو ہمیشہ سے انبیاء کے مخالف استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں دنیا میں عام طور پر سچائی کے مقابلہ میں لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر ہمارے باپ دادے تو جھوٹے اور جہنمی ہوئے اور جب کسی بات کے ساتھ جذبات مل جاتے ہیں تو دلیل لوگوں کی نگاہ سے غائب ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب توحید کی تبلیغ کی جا رہی ہو تو ایک بت پرست فوراً کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے سنو یہ توحید کے پرستار کیا کہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں تمہارے باپ دادے بڑے جاہل تھے بڑے احمق اور نادان تھے جو بتوں کے آگے سر جھکاتے رہے اب کون شخص یہ ماننے کے لئے تیار ہو سکتا ہے کہ اس کے باپ دادا واقعہ میں جاہل تھے آخر کافر کو بھی اپنے ماں باپ سے محبت ہوتی ہے اس لئے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ انہیں برا بھلا کہا جائے پس جب وہ ان کے سامنے شرک کو اس رنگ میں پیش کرتا ہے کہ تمہارے باپ دادے اسے مانتے تھے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جاہل اور بے ایمان تھے۔ تو لوگوں میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں یہ ہمارے باپ دادا کو برا بھلا کہتے ہیں انہیں قتل کر دو۔ ان کا مال و اسباب لوٹ لو اور انہیں اپنے ملک سے نکال دو ہم اپنے ماں باپ کی ہتک برداشت نہیں کر سکتے۔ غرض مخالف ہمیشہ اس اشتعال انگیز حربہ سے کام لیتے رہے ہیں۔ مگر یہ حربہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوا فطرت صحیحہ ہمیشہ غالب آتی رہی ہے اور یہ حربہ ناکامیاب ہوتا رہا ہے۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے جواب میں کہا کہ باپ دادوں کا حال تو خدا کو معلوم ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر شخص سے اس کے حالات کے مطابق معاملہ کرتا ہے مجھے کیا معلوم ہے کہ تمہارے باپ دادوں تک کون سی سچائی پہنچی تھی اور کون سی سچائی نہیں پہنچی یا یہ کہ ان پر حجت تمام ہوئی تھی یا نہیں۔ جزا سزا تو پورے حالات کے علم کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور وہ صرف خدا کو ہے پھر میں اس بارہ میں کیا کہہ سکتا ہوں جو حقیقت سے بے خبر ہوں۔

اسی امر کے متعلق بانی سلسلہ احمدیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ جزا سزا اتمام حجت سے تعلق رکھتی ہے اور اتمام حجت کا تعلق خدا تعالیٰ سے ہے۔ بندہ اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ جب آپ پر بعض شریروں نے الزام لگایا کہ آپ اپنے نہ ماننے والوں کو جہنمی قرار دیتے ہیں۔ تو آپ نے اس سے صاف انکار کیا اور فرمایا کہ میں تو خادم ہوں میرا عقیدہ تو اپنے آقا حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہی ہے کہ ان کے نہ ماننے والوں میں سے بھی وہی دوزخی ہوں گے جن پر حجت تمام ہو چکی ہوگی۔ چنانچہ آپ نے اپنی کتاب حقیقۃ الوحی میں تحریر فرمایا کہ۔

’’ڈاکٹر عبدالحکیم خان اپنے رسالہ المسیح الدجال وغیرہ میں میرے پر یہ الزام لگاتا ہے کہ گویا میں نے اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ جو شخص میرے پر ایمان نہیں لائے گا گو وہ میرے نام سے بھی بے خبر ہوگا اور گو وہ ایسے ملک میں ہوگا جہاں تک میری دعوت نہیں پہنچی تب بھی وہ کافر ہو جائے گا اور دوزخ میں پڑے گا۔ یہ ڈاکٹر مذکور کا سراسر افتراء ہے۔ میں نے کسی کتاب یا کسی اشتہار میں ایسا نہیں لکھا۔ اس پر فرض ہے کہ وہ ایسی کوئی میری کتاب پیش کرے جس میں یہ لکھا ہے۔ یاد رہے کہ اس نے محض چالاکی سے جیسا کہ اس کی عادت ہے یہ افتراء میرے پر کیا ہے۔ یہ تو ایسا امر ہے کہ بالبداہت کوئی عقل اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ جو شخص بکلی نام سے بھی بے خبر ہے اس پر مواخذہ کیونکر ہو سکتا ہے۔۔۔۔ ایسا ہی عقیدہ میرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بارہ میں بھی ہے کہ جس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچ چکی ہے اور وہ آپ کی بعثت سے مطلع ہو چکا ہے اور خدا تعالیٰ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارہ میں اس پر اتمام حجت ہو چکا ہے وہ اگر کفر پر مر گیا تو ہمیشہ کی جہنم کا سزاوار ہوگا اور اتمام حجت کا علم محض خدا تعالیٰ کو ہے۔ ہاں عقل اس بات کو چاہتی ہے کہ چونکہ لوگ مختلف استعداد اور مختلف فہم پر محمول ہیں اس لئے اتمام حجت بھی صرف ایک ہی طرز سے نہیں ہوگا۔‘‘ (حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵)

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّ سَلَکَ لَکُمۡ فِیۡهَا

(وہی ہے) جس نے تمہارے لئے اس زمین کو فرش کے طور پر بنایا ہے۔ اور اس میں تمہارے لئے راستے بھی

سُبُلًا وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ

نکالے ہیں۔ اور آسمان سے پانی اتارا ہے۔ پھر (تو ان سے یہ بھی کہہ دے کہ) ہم نے اس پانی کے ذریعہ سے

نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴿۵۴﴾ کُلُوۡا وَ ارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ

مختلف قسم کی روئیدگیوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں۔ (پس) تم بھی کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ اس میں

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّہٰی ﴿۵۵﴾ ع

عقل والے لوگوں کے لئے بہت سے نشان ہیں۔

حل لغات۔ شَتّٰی شَتّٰی الشَّتِیْت کی جمع ہے جس کے معنے ہیں اَلْمُفَرَّقُ۔ مختلف اور متفرق۔ (اقرب)

تفسیر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یہ جواب دینے کے بعد کہ جزا سزا دینے والا تو صرف خدا ہے جس کو سب باتوں کا علم ہے پھر میں تمہیں کیا بتا سکتا ہوں اسے سمجھانے کی کوشش کی اور فرمایا کہ دیکھو۔ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو ایسا بنایا ہے کہ اس سے انسان زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور پھر سفر کے ایسے طریق نکالے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک تک جا سکتا ہے اور اس نے آسمان سے پانی اتارا ہے تا کہ زمین اپنی روئیدگی نکالے۔ پھر اس پانی سے وہ مختلف قسم کی روئیدگیاں نکالتا ہے۔ تا کہ تم بھی کھاؤ اور تمہارے جانور بھی کھائیں۔ پھر تم کیوں نہیں سمجھتے کہ اسی طرح خدا تعالیٰ آسمان سے روحانی پانی بھی اتارتا ہے یعنی وحی اور اس سے مختلف روحانی علوم پیدا کرتا ہے تا کہ جو اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور جو ادنیٰ یعنی چارپایوں کی طرح ہیں وہ بھی اپنے ظرف کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اگر کوئی سوچنے والا ہو تو اس مثال سے وہ بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے یعنی جس طرح مادی پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے اسی طرح روحانی پانی یعنی الہام الٰہی بھی آسمان سے نازل ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے بھی آدمیوں اور جانوروں کی غذا مہیا کی جاتی ہے یعنی ان لوگوں کی غذا بھی جو اعلیٰ روحانی طاقتیں رکھتے ہیں اور ان لوگوں کی غذا بھی جن کی روحانی حالت کمزور ہوتی ہے۔

فَاَخْرَجْنَا بِہٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نباتات کے جوڑے ہیں۔ اس مسئلہ کا سوائے چند ایک چیزوں مثلاً کھجور کے آج سے سو سال قبل کسی کو علم نہیں تھا مگر اب بے شمار نباتی چیزوں کے جوڑے ثابت ہو چکے ہیں جو قرآن کریم کی صداقت کا ایک عظیم الشان ثبوت ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۶﴾

ہم نے اسی (زمین) سے تم کو پیدا کیا ہے اور اسی میں تم کو لوٹا دیں گے۔ اور اسی میں سے تم کو دوسری دفعہ نکالیں گے۔

تفسیر۔ گذشتہ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مکالمہ کا ذکر ہے جو ان کا فرعون کے ساتھ ہوا

۔اس مکالمہ کے دوران میں انہوں نے خدا تعالیٰ کے متعلق اپنا عقیدہ نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا تھا اب اس کے بعد فرماتا ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى یعنی ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی زمین میں تمہیں مرنے کے بعد لوٹائیں گے اور پھر اسی زمین سے تم کو دوبارہ نکال کر کھڑا کریں گے۔ یہ وضاحت اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرمائی کہ فرعون کی قوم ستارہ پرست تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ ستاروں سے روحیں اترتی اور جنم لیتی ہیں اور پھر وہیں چلی جاتی ہیں (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس زیر لفظ The Eygptian Religion)۔ اسی عقیدہ کے ماتحت ہندوستان میں سورج بنسی اور چندر بنسی قومیں بنیں جن کے ناموں میں اس طرف اشارہ تھا کہ چاند اور سورج سے جن روحوں نے اتر کر جنم لیا ان کے خاندانوں کے یہ نام ہیں۔ پس چونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ دنیا کے کاروبار کا تعلق ستاروں سے ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے خدا ہی سب کچھ کرتا ہے اور اسی کے قبضہ و تصرف میں تمام ارواح ہیں۔

اس آیت سے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی زندگی اس کی موت اور اس کا دوبارہ بعث اسی زمین سے وابستہ ہے۔ پس جب یہ ایک مسلّمہ قانون ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر کیسے جاسکتے ہیں۔

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۷﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا

اور ہم نے اس (یعنی فرعون) کو اپنے ہر قسم کے نشان دکھائے مگر (باوجود ان کے) وہ جھٹلانے پر مصر رہا اور انکار

لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۸﴾

کرتا چلا گیا اور کہنے لگا اے موسیٰ کیا تو اس لئے ہمارے پاس آیا ہے تاکہ اپنی سحر بیانی کے ذریعہ سے ہم کو ہماری زمین سے نکال دے۔

تفسیر۔ اس میں فرعون موسیٰ کی ایک اور چالاکی کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ موسیٰ مجھ کو تخت حکومت سے الگ کر کے خود اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ اسے ایک قومی سوال بنا کر کہتا ہے کہ کیا تو اس لئے آیا ہے کہ اپنی چالوں سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال دے۔ گویا اس نے چاہا کہ ملک کے تمام باشندوں کو موسیٰؑ کے خلاف بھڑکا دے اور انہیں جوش دلائے کہ موسیٰ تمہیں نکال کر اپنی قوم کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اس وقت فرعون کی حکومت مصر

پر اسی طرح تھی جس طرح انگریز ایک مدت تک ہندوستان پر حکمران رہے ہیں۔اس لئے اس نے اصل باشندوں کو بھی بھڑکانا ضروری سمجھا تا کہ موسیٰ ؑ کی مخالفت ایک قومی مسئلہ بن جائے۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا

(اگر یہ بات ہے) تو ہم بھی تیرے مقابلہ میں ویسا ہی جادو لائیں گے۔پس ہمارے درمیان اور اپنے درمیان ایک

لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۹﴾

وقت اور مقام موعود مقرر کرنہ اس سے ہم پیچھے ہٹیں اور نہ تو ہٹے۔وہ (ایک ایسا) مکان (ہو جو) ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہو۔

حلّ لُغات۔لَا نُخْلِفُهٗ اَخْلَفَ سے ہے اور اَخْلَفَهٗ مَا وَعَدَهٗ کے معنے ہیں قَالَ شَيْئًا وَلَمْ يَفْعَلْهُ یعنی کسی بات کے کرنے کا وعدہ کیا اور پھر نہ کیا (اقرب) پس لَا نُخْلِفُهٗ کے معنے ہوں گے۔ہم وعدہ کے خلاف نہیں کریں گے۔

سُوًى کے معنے ہیں اَلْعَدْلُ ۔برابر۔الوسط۔درمیانہ (اقرب) اور لَا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَا اَنْتَ مَكَانًا سُوًى میں مَكَانًا سُوًى کے معنے ہیں مُعْلَمًا اَیْ ذَا مَعْلَمٍ ۔یعنی ایسی جگہ جس تک پہنچنے کے نشانات کا سب کو علم ہو گویا ایسی مشہور جگہ جس کو سب جانتے ہوں۔(اقرب)

تفسیر۔معلوم ہوتا ہے فرعون موسیٰ مکہ کے لوگوں کی نسبت زیادہ منصف تھا۔اسی طرح آجکل کے بعض مولویوں کی نسبت بھی اس میں زیادہ انصاف پایا جاتا تھا۔کیونکہ وہ موسیٰ ؑ کے مشورہ سے مقابلہ کے لئے ایسی جگہ مقرر کرتا ہے جہاں فساد کا کوئی خطرہ نہ ہو اور موسیٰ ؑ اور فرعون کو ایک جیسے حقوق حاصل ہوں۔لیکن آج کل کے مولوی یا پادری جس سے اختلاف ہوتا ہے اسے ایسی مجلس میں بلاتے ہیں جس میں ان کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہو تا کہ فساد ہو اور وہ اپنے دشمنوں کو مار پیٹ سکیں۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٦٠﴾

(اس پر موسیٰ نے) کہا کہ تمہارے (ہمارے) اکٹھے ہونے کا دن (تمہاری) عید کا دن ہو۔ اور نیزہ بھر سورج چڑھے سب لوگوں کو جمع کیا جائے۔

تفسیر ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہی چاہتے تھے کہ کوئی ایسی جگہ تجویز ہو جو فریقین کے لئے مساوی ہو اس لئے انہوں نے کہا مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى کہ زینت یعنی عید کا دن ہونا چاہیے۔ یہ ان کا ایک مقدس دن تھا جس میں کسی پر کوئی زیادتی نہیں کی جاتی تھی جیسے عربوں میں حج کے ایام مقدس سمجھے جاتے ہیں پھر صبح کا وقت مقرر کیا گیا یہ بھی بہت اچھا وقت تھا کیونکہ دن میں کام کرنے کی وجہ سے لوگوں کے دماغ تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور اچھی طرح توجہ پیدا نہیں ہو سکتی لیکن صبح کے وقت دماغ تازہ ہوتا ہے اس لئے بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦١﴾ قَالَ لَهُمْ

اس پر فرعون پیٹھ پھیر کر چلا گیا اور جو تدبیریں اس سے ممکن ہو سکتی تھیں انکو مہیا کیا۔ اور پھر (موسیٰ کی طرف) لوٹا۔

مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ

(تب) موسیٰ نے ان سے کہا اے لوگو! تم پر ہلاکت ہو۔ اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ تم کو عذاب کے

بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦٢﴾ فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ

ذریعہ سے پیس ڈالے۔ اور جو کوئی (خدا پر) افتراء کرتا ہے وہ ناکام ہو جاتا ہے۔ یہ سن کر (فرعون اور اس کے ساتھی)

بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٣﴾ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ

آپس میں جھگڑنے لگے اور خفیہ منصوبے کرنے لگے۔ (اور) انہوں نے کہا یہ دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون) اور کچھ

يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ

بھی نہیں صرف جادوگر ہیں (جو) یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہاری زمین سے اپنے جادو کے زور سے نکال دیں۔

يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۴﴾

اور تمہارے اعلیٰ درجہ کے مذہب کو تباہ کر دیں۔

حلّ لُغَات۔ یُسْحِتَکُمْ اَسْحَتَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور اَسْحَتَ کے معنے ہوتے ہیں اِسْتَأْصَلَهٗ اس کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔(اقرب) پس یُسْحِتَکُمْ کے معنے ہوں گے تم کو ہلاک کر دے گا۔ جڑ سے اکھیڑ دے گا۔

اَلْمُثْلٰی کے معنے افضل۔ اعلیٰ۔(اقرب)

تفسیر۔ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ یہ فرعون کے ساتھیوں کا قول ہے جنہوں نے لوگوں کو جوش دلانے کے لئے کہا کہ یہ تو چاہتے ہیں کہ تم کو اپنے فریب سے ملک سے نکال دیں اور تمہارا مذہب جو سب سے افضل ہے اس کو مٹا دیں گویا دنیوی اور مذہبی دونوں طریق سے انہوں نے لوگوں کو اشتعال دلانا چاہا۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ

پس چاہیے کہ تم بھی اپنی تدبیریں سوچ لو پھر سب کے سب ایک جماعت کی شکل میں آؤ اور جو (شخص) آج جیتے گا

اسْتَعْلٰى ﴿۶۵﴾

وہ ضرور بامراد ہوگا۔

تفسیر۔ آج کل دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اچھے مقصد کے لئے خواہ کیسے ہی ناجائز ذرائع استعمال کرنے پڑیں جائز ہوتے ہیں حالانکہ ناجائز ذرائع کے ساتھ کسی چیز کے حصول کی کوشش ہی اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس چیز کا صداقت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں یہی حربہ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے استعمال کیا اور لوگوں کو اکسایا کہ تم سے جو کچھ دھوکا اور فریب ممکن ہو اس سے کام لو اور جس قدر چالبازی کر سکتے ہو کر و تمہارا مقصد یہ ہے کہ تم نے موسیٰ پر غلبہ حاصل کرنا ہے پس یہ مت دیکھو کہ تمہاری تدابیر کیسی ہیں یہ دیکھو کہ تم نے کامیاب

ہونا ہے پس جس قدر تدابیر اختیار کر سکتے ہو اختیار کرو۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ

(اس پر ان لوگوں نے جن کو موسیٰ کے مقابلہ کے لئے فرعون نے جمع کیا تھا) کہا کہ اے موسیٰ یا تو (اپنی تدبیر) پھینک

اَلْقٰى ﴿۶۶﴾

یعنی ظاہر کر یا ہم تجھ سے پہلے پھینکیں۔

تفسیر۔ ساحر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لئے تو تیار ہو گئے۔ مگر باوجود اس کے کہ فرعون ان کے ساتھ تھا اور اس وجہ سے ان کے اندر کبر اور غرور ہونا چاہیے تھا انہوں نے نہایت ادب کے ساتھ کہا کہ اے موسیٰ بتائیے آپ ابتدا کریں گے یا ہم ابتداء کریں۔ مثنوی رومی والوں نے اس کے متعلق ایک نہایت ہی لطیف بات لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا یہی ادب تھا جو ان کے کام آیا اور اللہ تعالیٰ نے جو نکتہ نواز ہے انہیں دولت ایمان سے بہرہ ور فرما دیا۔ (مثنوی مولوی معنوی صفحہ ۱۸۵)

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ

(تب موسیٰ نے) کہا (بہتر یہ ہے) کہ تم اپنی تدبیر پھینکو (یعنی ظاہر کرو) پس انہوں نے جو تدبیر کی اس کے نتیجہ

مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿۶۷﴾

میں ان کی رسیاں اور ان کے سونٹے موسیٰ کو ان کے فریب کی وجہ سے یوں نظر آئے گویا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

تفسیر۔ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى سے معلوم ہوتا ہے کہ جادوگروں کی ان رسیوں اور سونٹوں میں یا تو پارہ تھا یا لچک دار پیچ تھے جن کے دبانے کی وجہ سے وہ ہلنے لگ جاتے تھے۔ یورپ سے آجکل ایسی چیزیں بہت کثرت سے آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں بھی ایسی صنعت جاری تھی اور اسی کو جادوگروں نے مقابلہ کے لئے اختیار کیا۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ﴿۶۸﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ

اور موسیٰ اپنے نفس میں پوشیدہ طور پر ڈرا۔(تب) ہم نے وحی کی (اے موسیٰ) مت ڈر۔ کیونکہ تو ہی غالب آئے گا۔

اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴿۶۹﴾ وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ

اور جو کچھ تیرے دائیں ہاتھ میں ہے اس کو زمین پر ڈال دے جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس سب کو وہ نگل جائے گا

اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی ﴿۷۰﴾

(یعنی اس کا بھانڈا پھوڑ دیگا) انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ تو فریب کاروں کا ایک فریب ہے اور فریب کار جس طرف سے بھی آئے (خدا کے مقابلہ میں) کامیاب نہیں ہوسکتا۔

حلّ لُغات۔ اَوْجَسَ الرَّجُلُ اِیْجَاسًا کے معنے ہوتے ہیں اَحَسَّ وَاَضْمَرَ۔ محسوس کیا اور چھپایا۔(اقرب) خِیْفَةً کے معنے ہیں اَلْحَالَةُ الَّتِیْ یَکُوْنُ عَلَیْهَا الْاِنْسَانُ مِنَ الْخَوْفِ وہ حالت جو خوف کی وجہ سے انسان پر طاری ہوتی ہے۔(اقرب)

تَلْقَفْ لَقِفَ سے ہے اور لَقِفَ الشَّیْءَ کے معنے ہوتے ہیں تَنَاوَلَه بِسُرْعَةٍ کسی چیز کو جلدی سے لے لیا (اقرب) پس تَلْقَفْ کے معنے ہوں گے جلدی سے نگل لے گا۔

تفسیر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الہام کے ذریعہ بتادیا کہ ان چیزوں کے اندر پیچ ہیں اور کچھ نہیں۔ ان پر زور سے سونٹا مارو وہ پیچ ٹوٹ جائیں گے اور ان کی حرکت بند ہوجائے گی اور اس طرح معنوی طور پر تیرا سونٹا ان کی رسیوں اور سانپوں کی نگل جائے گا۔ یعنی ان کا فریب لوگوں پر ظاہر کردے گا۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰی ﴿۷۱﴾

پس (جب موسیٰ کے سونٹا ڈالنے کے بعد فرعون کے لائے ہوئے) چالباز (اپنی کمزوری سمجھ گئے تو وہ اپنی ضمیر کی آواز سے) سجدہ میں گرائے گئے اور کہنے لگے ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر۔ اُلْقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا بڑا معنے خیز فقرہ ہے۔ جو بتاتا ہے کہ جادوگروں کی شکست اتنی واضح تھی کہ

یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی خفیہ طاقت نے ان کے پاؤں تلے سے زمین نکال لی ہے۔ چنانچہ وہ سجدہ میں گر گئے۔ اور چونکہ اپنی شکست سے ان کو یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا رب ان کی تائید میں ہے اس لئے فوراً کہہ اٹھے کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى۔ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لاتے ہیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ

(اس پر فرعون نے) کہا کیا تم میرے حکم سے پہلے ہی اس پر ایمان لاتے ہو (معلوم ہو گیا کہ) وہ تمہارا سردار ہے

الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ

جس نے تم کو یہ چالاکیاں سکھائی ہیں پس (اس فریب کی سزا میں) میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں (اپنی) اپنی خلاف ورزی

مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ٘ وَ لَتَعْلَمُنَّ

کی وجہ سے کاٹ دونگا۔ اور (میں تم کو) کھجور کے تنوں سے باندھ کر صلیب دے دوں گا۔ اور تم کو معلوم ہو جائے گا

اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ﴿۷۲﴾

کہ ہم میں سے کون زیادہ سخت اور دیرپا عذاب دے سکتا ہے۔

حلّ لُغَات۔ مِنْ خِلَافٍ۔ مِنْ خِلَافٍ کے معنے ہیں اِحْدٰاهُمَا مِنْ جَانِبٍ وَالْاُخْرٰى یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں (مفردات) اور مِنْ خِلَافٍ کے معنے مخالفت کی وجہ سے بھی ہو سکتے ہیں۔ (مفردات)

تفسیر۔ فرعون کا دعویٰ تو یہ تھا کہ ہم ایسے لوگ بلائیں گے جو موسیٰ ؑ سے بڑے ہوں گے مگر جب ساحر شکست کھا کر موسیٰ کے قدموں میں گر گئے تو فرعون کو سخت غصہ آیا اور اس نے اپنی ذلت چھپانے کے لئے ان سے کہا کہ تم میرے کہنے سے پہلے ہی کیوں ایمان لے آئے۔ اب میں تمہیں اس کی سزا دوں گا۔

مِّنْ خِلَافٍ کے یہ معنے ہیں کہ خلاف ورزی کی وجہ سے یا یہ کہ ایک ہاتھ اور ایک پاؤں مختلف اطراف سے کاٹوں گا۔ مثلاً دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ انسان بالکل ناکارہ ہو جائے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِىْ

اس پر انہوں نے (یعنی فرعون کے پہلے ساتھیوں یا ساحروں نے) کہا ہم تجھ کو ان نشانات پر فوقیت نہیں دے سکتے

فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِىْ هٰذِهِ

جو (خدا کی طرف سے) ہمارے پاس آئے ہیں اور نہ اس (خدا) پر جس نے ہم کو پیدا کیا۔ پس جو تیرا زور لگتا ہے

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۞ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ

لگالے۔ تو صرف اس دنیا کی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ ہم (اب) اپنے رب پر ایمان لا چکے ہیں تا کہ وہ ہمارے گناہوں کو

اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۞ اِنَّهٗ

معاف کر دے اور اس دھوکا بازی (کے مقابلہ) کو بھی معاف کر دے جس کے لئے تو نے ہم کو مجبور کیا تھا۔ اور اللہ

مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا

سب سے بہتر اور سب سے زیادہ قائم رہنے والا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی شخص اپنے رب کے پاس مجرم کی

وَلَا يَحْيٰى ۞ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ

حیثیت سے حاضر ہوتا ہے اسے یقیناً جہنم ملتی ہے۔ نہ وہ اس میں مرتا ہے اور نہ زندہ رہتا ہے۔ اور جو شخص

فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۞ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِىْ

مومن ہونے کی حالت میں جبکہ وہ ساتھ ساتھ مناسب حال عمل بھی کرتا ہوگا اس (یعنی خدا تعالیٰ) کے پاس آئے گا

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ

تو ایسا ہر شخص اعلیٰ درجے پائے گا۔ (وہ درجے) ہمیشہ رہنے والے باغات (ہوں گے) جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی

تَزَکّٰی ﴿۷۷﴾ ع

(اور) وہ ان میں رہتے چلے جائیں گے اور یہ ان شخص کا مناسب بدلہ ہے جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے۔

تفسیر ۔ وہی جادوگر جو پہلے فرعون سے بھیک مانگ رہے تھے ایمان نصیب ہوتے ہی اتنے دلیر ہو گئے کہ فرعون کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اسے کہہ دیا کہ ہم تیری بات سننے کے لئے تیار نہیں ہم تو اسی بات کو مانیں گے جو ہمارے خدا کی طرف سے آئے گی تو اگر کچھ کر سکتا ہے تو یہی کہ دنیا کی زندگی کو منقطع کر دے سو بے شک کر دے ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہمیں خوشی ہے کہ خدا نے اپنے فضل سے ہمیں حق کی شناخت کی توفیق عطا فرما دی ہے اب دنیا کی کوئی طاقت ہمیں کفر کی طرف واپس نہیں لوٹا سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ایمان کامل کسی کو نصیب ہو جائے تو پھر دنیا کی مشکلات اور دنیا کی تکالیف اس کی نگاہ میں بالکل بے حقیقت ہو جاتی ہیں احادیث میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ ایمان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور جب وہ کسی شخص کو سچے طور پر حاصل ہو جائے تو اس کی نگاہ میں دنیا کتنی بے حقیقت ہو جاتی ہے احد کی جنگ میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس کے نتیجہ میں لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ تمام مدینہ میں ایک کہرام مچ گیا۔ اور عورتیں اور بچے بلبلاتے اور چیختے ہوئے میدان جنگ کی طرف دوڑ پڑے شہر سے نکلنے والی عورتوں میں ایک ستر سالہ بڑھیا بھی تھی اس کی بینائی اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ دور کی چیز کو وہ نہیں دیکھ سکتی تھی اور قریب آجانے پر بھی وہ زیادہ تر دوسرے کو اس کی آواز سے ہی پہچانتی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس وقت میدان جنگ سے بخیرت واپس تشریف لا رہے تھے اور آپ کی خاص طور پر حفاظت کرنے کے لئے ایک انصاری صحابیؓ آپ کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ اور وہ اس فخر میں آپ کے اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے تھے کہ ہم خدا کے رسول کو میدان جنگ سے زندہ وسلامت لے آئے ہیں۔ ان کے ایک دوسرے بھائی اسی جنگ میں شہید ہو چکے تھے جب مدینہ سے عورتوں اور بچوں کا ایک ریلا روتا اور بلبلاتا ہوا نکل رہا تھا تو اس صحابیؓ نے دیکھا کہ ان کی ستر سالہ بڑھیا ماں بھی بے تابی کے ساتھ چلی آ رہی ہے اس نابینا بڑھیا کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اسے رستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اور وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ جب اس صحابیؓ نے اپنی ماں کو دیکھا تو انہوں نے کہا۔ یارسول اللہ! میری ماں یارسول اللہ! میری ماں! مطلب یہ تھا کہ اس کا جوان بیٹا اس بڑھاپے کی عمر اور کمزوری میں مارا گیا ہے۔ آپ اس کی طرف توجہ فرمائیں تا کہ اس کے دل کو تسکین حاصل

ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس بات کو سمجھ گئے ۔ وہ بڑھیا قریب آئی تو آپ نے فرمایا ۔ میری اونٹنی کو کھڑا کرو۔ پھر آپ نے اس عورت کو مخاطب کیا اور فرمایا۔ اے خاتون! میں تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں ۔ کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے بیٹے کو شہادت کا مرتبہ دیا وہ تمہیں صبر دے اور تمہارے اس غم کو دور کرے۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے وہ عورت حیران ہوئی کہ یہ آواز مجھے کہاں سے آ رہی ہے وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں اور آواز تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیکھتے دیکھتے اس کی نظر آپ کے چہرہ پر پڑ گئی ۔ اور اس نے پہچان لیا کہ آپ ہی ہیں اور آپ ہی اس وقت مجھ سے بول رہے ہیں۔ تو جیسے عورت خفگی میں بولتی ہے بڑی تنک کر کہنے لگی ۔ یا رسول اللہ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں یا رسول اللہ آپ زندہ آ گئے میرے بیٹے کا یہاں کیا ذکر ہے ۔ سوال تو آپ کی زندگی کا تھا۔ سو الحمد للہ کہ آپ خیریت سے آ گئے ۔ (سیرۃ النبی الابن ھشام جلد ۳ شأن المرأۃ الدیناریۃ)

تو حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم کو خدا مل جائے اور اگر اپنے ایمان کے نتیجہ میں اور ہر قسم کے خطرات کو مول لینے کے بعد خدا کا دامن ہمارے ہاتھ میں آجائے تو ہمیں بڑی سے بڑی مصیبت کی بھی پرواہ نہیں ہو سکتی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو سچے دل کے ساتھ حلاوت ایمان نصیب ہو جائے تو وہ اس کے بعد اگر اس کو آگ میں بھی ڈال دیا جائے تو وہ اس کو بہت زیادہ پسند کرے گا بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنے عقیدہ کو چھوڑ دے۔ (بخاری کتاب الایمان باب من کرہ ان یعود فی الکفر)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ پرانے زمانہ کی امتوں میں سے جن کو ایمان نصیب ہوتا تھا لوگ ان کے سروں پر آرے رکھ کر انہیں چیر دیتے تھے اور وہ کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتے تھے لیکن اپنے ایمان پر قائم رہتے تھے (مسند احمد بن حنبل مسند البصر بین)۔ صحابہؓ میں بھی اس کی نظیریں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ حضرت بلالؓ کو ہی دیکھ لو۔ انہیں بھوکا رکھا جاتا تھا اس کے بعد ان کو تپتی ہوئی ریت پر لٹاتے ۔ بڑا سا گرم پتھر ان کے سینہ پر رکھتے اور پھر ایک آدمی ان کے سینہ پر چڑھ جاتا اور کودتا اور کہتا کہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جھوٹے ہیں اور لات منات اور عزیٰ خدا کے شریک ہیں ۔ زبان ان کی لٹک جاتی تھی گلا ان کا خشک ہو جاتا تھا مگر وہ یہی کہتے جاتے تھے کہ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور جب بالکل ہی بے دم ہو جاتے تو فرماتے اَحَدٌ اَحَدٌ یعنی خدا ایک ہی ہے (اسد الغابۃ معرفۃ الصحابۃ حضرت بلال بن رباح)۔ غرض اس قربانی کا صحابہؓ نے جو نمونہ دکھایا تاریخ اس کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔ یہی نمونہ ان جادوگروں نے دکھایا اور فرعون سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تیری بات سننے کے لئے تیار

نہیں۔ہم تو اسی بات کو مانیں گے جو ہمارے خدا کی طرف سے آچکی ہے اور جس کی صداقت کا ہم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔

وَ لَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی ۙ۬ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی تھی کہ میرے بندوں (یعنی اپنی قوم) کو رات کے اندھیرے میں نکال کر لے جا پھر

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا

ان کو سمندر میں ایک راستہ بتا جو خشک ہو۔ نہ تم کو یہ ڈر ہو گا کہ کوئی (شخص) آ کر پیچھے سے پکڑ لے اور نہ تم

وَّ لَا تَخْشٰی ﴿۷۸﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِیَهُمْ

(سمندر کی تباہی سے) ڈرو گے۔(اس پر موسیٰ اپنی قوم کو لے کر سمندر کی طرف گئے) اور فرعون اپنے لشکر لے کر ان کے

مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ ﴿۷۹﴾ؕ وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا

پیچھے پیچھے چلا اور سمندر نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو بالکل ڈھانپ لیا۔اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا

هَدٰی ﴿۸۰﴾

اور ہدایت کا طریق نہ بتایا۔

تفسیر ۔فرماتا ہے ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ ہمارے بندوں یعنی بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے نکال لے جاؤ۔اور سمندر میں سونٹا مار کر ان کے لئے خشک راستہ بنا دو تم اس طرح اس کو پار کر لو گے اور تعاقب سے اور ڈوبنے سے نہ ڈرو گے۔ پھر فرعون نے اپنے لشکروں سمیت بنی اسرائیل کا تعاقب کیا لیکن سمندر کا ایسا ریلا آیا کہ وہ غرق ہو گئے اور یوں فرعون نے اپنی قوم کو تباہی میں ڈالا اور اس سے بچ نہ سکا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو فرعونیوں نے ان کا تعاقب کیا۔جب وہ قریب پہنچے تو بنی اسرائیل گھبرا گئے خدا تعالیٰ نے ان کو تسلّی دی اور موسیٰؑ سے کہا کہ سمندر پر سونٹا ماریں۔ان کے سونٹا مارنے سے سمندر میں ایک راستہ ہو گیا اور دونوں طرف پانی اس طرح معلوم ہوتا تھا جس طرح ریت کے ٹیلے

جب وہ اس میں سے گذر گئے تو ان کے بعد فرعونیوں نے بھی گذرنا چاہا مگر اتنے میں پانی واپس آ گیا اور وہ سمندر میں غرق ہو گئے۔

قرآن کریم میں اس واقعہ کے متعلق دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ ایک فَرَقَ (البقرۃ:۵۱) اور ایک اِنْفَلَقَ (الشعراء:۶۴)۔ جس کے معنے جدا ہو جانے کے ہیں پس قرآن کریم کے الفاظ کے مطابق اس واقعہ کی یہی تفصیل ثابت ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کے گذرنے کے وقت سمندر کنارہ سے ہٹ گیا تھا اور جو خشکی نکل آئی تھی اس میں سے بنی اسرائیل گذر گئے تھے۔ اور بحیرۂ احمر کے اس کنارہ پر جس پر سے موسیٰؑ گذرے یہ نظارہ عموماً نظر آتا رہتا ہے چنانچہ لائف آف نپولین میں بیان کیا گیا ہے کہ جب نپولین مصر گیا تو وہ اس جگہ کو دیکھنے گیا جس کی نسبت روایت میں ہے کہ وہاں سے مصری گزرے تھے اس وقت لہر پیچھے کو ہٹی ہوئی تھی۔ وہ ایشائی کنارہ کی طرف چلا گیا۔ اور مختلف چیزوں کے دیکھنے میں اس کا بہت سا وقت لگ گیا۔ جب وہ واپس لوٹنے لگا تو رات آ گئی اور یہ جماعت راستہ بھول گئی۔ رات کی تاریکی بڑھ گئی اور گھوڑے زیادہ سے زیادہ پانی کی اونچی ہونے والی لہروں میں دھنسنے لگے۔ حتیٰ کہ پانی گھوڑوں کے تنگوں تک پہنچ گیا۔ اور ہلاکت یقینی ہو گئی۔ اس مصیبت سے نپولین نے اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو اسی نہ گھبرانے والی طبیعت کے ذریعے سے نکالا جو اسے کسی موقعہ پر بھی چھوڑتی نہ تھی۔ گھوڑے آدھی رات کے وقت جا کر کہیں پانی سے باہر نکلے جب کہ وہ چھاتی تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کنارہ پر لہر بائیس فٹ تک اونچی اٹھتی ہے۔ نپولین نے باہر نکل کر کہا کہ۔

’’اگر میں اس طریق پر فرعون کی طرح غرق ہو جاتا تو تمام مسیحی پادریوں کو میرے خلاف وعظ کرنے کا ایک اچھا مصالحہ مل جاتا۔‘‘

(The History of Napoleon Bonaparte by John S.C. Abbott pg.96 97)

اس واقعہ میں معجزہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایسے وقت میں سمندر کے سامنے پہنچایا جبکہ جزر کا وقت تھا اور اس نے مصریوں کے راستہ میں اس قسم کی رکاوٹیں ڈالنی شروع کر دیں جن سے ان کی رفتار سست ہو گئی۔ یہاں تک کہ پانی کے لوٹنے کا وقت آ گیا۔ بائیبل میں لکھا ہے کہ خدا نے

’’ان کے رتھوں کے پہیئوں کو نکال ڈالا سو ان کا چلانا مشکل ہو گیا‘‘ (خروج باب ۱۴ آیت ۲۵)

معلوم ہوتا ہے کہ فرعون جب سمندر پر پہنچا ہے اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر کے اس خشک ٹکڑے کا جس سے وہ گذر رہے تھے اکثر حصہ طے کر چکے تھے۔ فرعون نے ان کو پار ہوتے دیکھ کر جلدی سے اس میں اپنی

رتھیں ڈال دیں مگر سمندر کی ریت جو گیلی تھی اس کی رتھوں کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ اور اس کی رتھیں اس میں پھنسنے لگیں اور اس قدر دیر ہو گئی کہ مد کا وقت آ گیا۔ اور پانی بڑھنے لگا اب نہ وہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ اور نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سمندر نے اسے درمیان میں آلیا اور وہ اور اس کے ساتھی سمندر میں غرق ہو گئے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ

اے بنی اسرائیل! ہم تم کو تمہارے دشمن سے نجات دے چکے ہیں اور اس کے بعد ہم تم سے طور کے دائیں طرف

وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ

ایک بالمقابل وعدہ کر چکے ہیں۔ اور ہم نے تم پر ترنجبین اور بٹیر بھی اتارے تھے (تاکہ تمہارے لئے خوراک مہیا

السَّلْوٰى ﴿۸۱﴾ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ

کریں) (اور کہا تھا کہ) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاک چیزیں کھاؤ اور اس (رزق) کے بارے میں ظلم

فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ

سے کام نہ لینا تا ایسا نہ ہو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائے اور جس پر میرا غضب نازل ہو وہ (بلندی سے)

هَوٰى ﴿۸۲﴾ وَ اِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا

گر جاتا ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور پھر مناسب حال عمل (بھی) کرے اور ہدایت پا جائے

ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۳﴾

تو میں اس کے (بڑے سے بڑے) گناہ معاف کر دیا کرتا ہوں۔

حلّ لُغات۔ اَلْمَنُّ مَنَّ يَمُنُّ کا مصدر ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں مَنَّ عَلَيْهِ بِالْعِتْقِ وَ غَيْرِهٖ يَمُنُّ مَنًّا اَیْ اَنْعَمَ عَلَيْهِ بِهٖ مِنْ غَيْرِ تَعَبٍ وَ لَا نَصَبٍ وَ اصْطَنَعَ عِنْدَهٗ صَنِيْعَةً وَ اِحْسَانًا یعنی دوسرے کو اس کے کسی محنت طلب کام کے بغیر انعام دینا اور اس کے ساتھ نیکی اور احسان کا سلوک کرنا اسی طرح المن کے معنے ہیں

كُلُّ مَا يَمُنُّ اللّٰهُ بِهٖ مِمَّا لَا تَعَبٌ فِيْهِ وَلَا نَصَبٌ یعنی ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کسی شخص کو محنت اور مشقت کے بغیر محض اپنے فضل سے عطا فرمائے۔ وہ مَنّ کہلاتی ہے۔ اسی طرح لکھا ہے۔ كُلُّ طَلٍّ يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ عَلٰى شَجَرٍ اَوْ حَجَرٍ وَ يَحْلُوْ وَ يَنْعَقِدُ عَسَلًا وَ يَجِفُّ جَفَافَ الصَّمْغِ كَالسِّيْرَ خُشْت وَالتَّرَنْجَبِيْنِ یعنی ہر وہ رطوبت جو آسمان سے درختوں اور پتھروں پر گرتی ہے اور وہ میٹھی ہوتی ہے اور پھر شہد کی طرح گاڑھی ہو جاتی ہے اور گوند کی طرح سوکھ جاتی ہے جیسے شیر خشت اور ترنجبین اسے بھی مَن کہتے ہیں۔ (اقرب)

السلوٰی کے معنے ہیں اَلْعَسَلُ ۔شہد۔ كُلُّ مَا سَلَّاكَ ہر وہ چیز جو انسان کی تسلی کا موجب ہو۔ طَائِرٌ اَبْيَضُ مِثْلُ السُّمَانٰى بٹیر یا تلیر کی مانند سفید پرندے وَقِيْلَ السَّلْوٰى اللَّحْمَ اور بعض نے کہا ہے کہ سلوٰی گوشت کو کہتے ہیں (اقرب)۔ مفردات میں لکھا ہے کہ السَّلْوٰى اَصْلُهَا مَا يُسَلِّى الْاِنْسَانَ یعنی سلویٰ کے اصل معنے اس چیز کے ہیں جو انسان کو تسلی دلا دے۔

تفسیر ۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر کنعان کی طرف آئے تو جس علاقہ میں سے انہیں گذرنا پڑا وہ بہت غیر آباد تھا اور دور دراز فاصلہ پر بعض شہر آباد تھے۔ اب تک یہ علاقہ ایسا ہی ہے اور اب بھی اس علاقہ سے گذرنا کوئی آسان کام نہیں بے شک اس علاقہ میں اب ریل جاری ہوگئی ہے اور سفر میں سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں لیکن اس کی غیر آبادی میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ کیونکہ یہ علاقہ آبادی کے قابل زمینوں سے خالی ہے۔ اور بے آب و گیاہ میدانوں پر مشتمل ہے۔ ترکوں نے جنگ عظیم میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح مصر میں داخل ہو کر انگلستان اور ہندوستان کے تعلقات قطع کر دیں لیکن پانی کی دقت اور سامان خورد و نوش کی کمی کی وجہ سے عقلوں کو حیرت میں ڈال دینے والی قربانی کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ انگریزوں نے بھی شروع میں بہت زور مارا لیکن خشک اور چٹیل میدانوں کی وجہ سے وہ بھی سویز کے راستہ سے فلسطین میں داخل نہ ہو سکے۔ آخر جنرل ایلنبی نے نیل سے پانی لے کر سویز کے اوپر سے نلوں کے ذریعہ سے پانی گذارا اور اس علاقہ کو جو بڑے شہروں کے لئے ناقابل تھا قابل سکونت بنا دیا۔ صلیبی جنگوں کے وقت جب فلسطین اور شام کے محاذ پر یورپ کی تمام اقوام کے منتخب بہادر اس نیت سے ڈیرے ڈالے پڑے تھے کہ اسلام کے بڑھنے والے سیلاب کو روک دیں اس وقت بھی دشت سینا مسلمانوں اور مسیحیوں سے راستہ دینے کا ٹیکس لیتا رہا تھا۔ نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں نہ معلوم کتنے اسلامی اور مسیحی لشکر پانی نہ ملنے اور کھانے کی کمی کے سبب اس دشت میں تباہ ہو گئے تھے۔

پانی کی کمی کے سبب گذرنے والے قافلوں کو لازماً ان چشموں یا تالابوں کے پاس سے گذرنا پڑتا تھا جو کہیں

کہیں اس دشت میں پائے جاتے تھے اور اس وجہ سے جو فریق بھی غالب ہوتا تھا۔ اسے دوسرے فریق کے آدمیوں کو مارنے کا ایک آسان بہانہ مل جاتا تھا۔ کیونکہ تھوڑے سے آدمی ان چشموں یا تالابوں پر مقرر کر دینے سے بھی اس بات کی کافی ضمانت ہو جاتی تھی کہ حریف کے آدمی نقصان اٹھائے بغیر مصر سے فلسطین کی طرف نہیں جا سکتے۔ چنانچہ اسامہ بن منقذ اپنی کتاب الاعتبار میں لکھتے ہیں کہ **الجعفر** نامی چشمہ جو مصر اور فلسطین کے درمیان تھا کسی وقت فرنگیوں سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اس جگہ سے لوگوں کو بچ کر جانا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ انہیں سیف الدین ابن سالار وزیر مصر نے شاہ نورالدین کے پاس بھیجا کہ وہ طبریہ پر حملہ کریں تو ہم مصر سے غزہ پر حملہ کر کے فرنگیوں کو وہاں قلعہ بنانے سے روک دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم **الجعفر** چشمہ پر پہنچے تو اتفاقاً اس وقت فرنگی وہاں موجود نہ تھے۔ لیکن طے قبیلہ میں سے بنوابی خاندان کے کچھ لوگ وہاں تھے جن کے جسم پر چمڑے کے سوا گوشت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور بالکل بدحال ہو رہے تھے وہ کہتے ہیں میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں کس طرح گذارہ کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ مردار کی ہڈیاں ابال کر اس پر گذارہ کرتے ہیں اور کوئی چیز کھانے کی یہاں نہیں ہے۔ ان کے کتے بھی اسی پر گذارہ کرتے تھے۔ ہاں گھوڑے چشمے کے اردگرد کی گھاس پر گذارہ کرتے تھے۔ اسامہ لکھتے ہیں کہ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں اس حالت میں کیوں پڑے ہو۔ دمشق کی طرف کیوں نہیں چلے جاتے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس خیال سے کہ وہاں کی وباؤں سے ہمیں نقصان نہ پہنچے۔ اسامہؔ حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کیسے بیوقوف لوگ تھے ان کی اس وقت کی حالت سے بڑھ کر وباء کیا نقصان پہنچا سکتی تھی۔ (کتاب الاعتبار لابن منکز ۷ ۰ ۶)

غرض دشت سینا ایک ایسا خطرناک علاقہ ہے کہ بڑی جماعتوں کے لئے بھی بغیر خاص انتظام کے اس میں سے گذرنا مشکل ہے اور اس میں قیام کرنا تو اور بھی مصیبت ہے۔ پھر بنی اسرائیل جن کے بیس سال سے زائد عمر کے نوجوانوں میں سے جنگی خدمت کے قابل مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ بتائی گئی ہے (خروج باب ۱۲ آیت ۳۷) (یہ تعداد بائیبل کی رو سے ہے ورنہ ہم اس کو صریح غلط سمجھتے ہیں۔ قرآن کریم اس بارہ میں یہ فرماتا ہے کہ وَهُمْ أُلُوفٌ (البقرۃ: ۲۴۴) وہ ساری قوم اس وقت ہزاروں کی تعداد میں تھی اور قرآنی بیان ہی عقل کے مطابق اور سچا ہے) اور جو بے سروسامانی کی حالت میں مصر سے بھاگے تھے اس علاقہ میں سے کس طرح گذرے اور کس طرح اڑتیس سال تک اس علاقہ میں انہوں نے بسر کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو صدیوں سے دنیا کو حیرت میں ڈال رہا ہے۔ بائیبل نے اس کا جواب من کے نزول اور حورب کی چٹان میں بارہ چشموں کے پھوٹنے کے معجزہ سے دیا ہے۔ وہ بتاتی ہے

کہ اس مظلوم قوم کی خدا تعالیٰ نے مدد کی اور اپنے فضل سے اس نے ان کے لئے کھانے اور پینے کا سامان مہیا کیا۔
میں اس وقت پانی کی تحقیقات کو چھوڑتا ہوں اور صرف من کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

بائیبل کا بیان پڑھنے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ (۱) من کیا چیز تھی؟ (۲) کیا اس کا وجود معجزانہ تھا؟ (۳) کیا بنی اسرائیل اسے کھا کر ایک طویل مدت تک زندگی بسر کر سکتے تھے پہلے۔سوال کا جواب دیتے وقت خود بخود یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا۔کہ اس غذا کو من کا نام بنی اسرائیل نے دیا تھا۔یا پہلے سے اس کا یہ نام تھا۔اگر بنی اسرائیل نے اسے اس نام سے پکارا تو کیوں؟ کیا اس غذا کی کسی اندرونی خاصیت کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے خروج باب ۱۶ آیت ۱۵ میں من کا سب سے پہلے ذکر ہے اس میں لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل ایلیم روانہ ہوئے تو راستہ میں خوراک نہ ملنے کے سبب انہوں نے شور مچایا۔چنانچہ خدا تعالیٰ نے ان سے گوشت اور روٹی کا وعدہ کیا شام کو بے شمار بٹیر جنگل میں آ گئے جنہیں پکڑ کر انہوں نے گوشت کھایا اور صبح کے وقت ایک چیز زمین پر پڑی ملی جو چھوٹی چھوٹی سفید رنگ کی تھی جسے دیکھ کر بنی اسرائیل آپس میں کہنے لگے ’’من‘‘ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ (عربی میں من کے معنے کون کے ہیں پس درحقیقت یہ بھی عربی لفظ ہے جو عبرانی نے استعمال کر لیا ہے فرق صرف یہ ہے کہ عربی میں من جاندار کے لئے بولا جاتا ہے غیر جاندار کے لئے نہیں مگر معلوم ہوتا ہے عبرانی میں یہ لفظ بے جان کے لئے بھی استعمال ہونے لگ گیا تھا)۔تب موسیٰؑ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے (خروج باب ۱۶ آیت ۱۳ تا ۱۵)

اس آیت کی بنا پر بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ من کا لفظ اس جگہ بطور استفہام استعمال ہوا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ کیا چیز ہے بعد میں یہ لفظ نام کے طور پر بنی اسرائیل میں استعمال ہونے لگا۔چنانچہ اسی بات کو آیت ۳۱ میں لکھا ہے۔

’’اور بنی اسرائیل نے اس کا نام من رکھا‘‘

بعض محققین جارج ایبرز کی اتباع میں اس تشریح کو غلط سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ لفظوں کی مشابہت سے مغالطہ ہو گیا ہے اصل میں یہ لفظ ’’منو‘‘ ہے اور قبطی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنے قبطی زبان میں کھانے کے ہیں۔ اس لئے بنی اسرائیل نے من سوال اور استفہام کے طور پر نہیں کہا بلکہ چونکہ خدا تعالیٰ نے کہا تھا کہ یہ موعودہ روٹی ہے انہوں نے اس کا نام منا (یعنی خوراک) رکھ دیا۔کیونکہ اس کا کوئی اور نام انہیں معلوم نہ تھا۔ان کا خیال ہے کہ من استفہامیہ کا استعمال ارمیک زبان میں نہیں اور یہ قابل تعجب امر ہے کہ اس مفہوم میں جس میں ارمیک زبان کا کوئی اور

لفظ استعمال نہیں ہوا یہ لفظ مستعمل ہو جاتا۔مگر مسٹر فیلڈ نے اس حیرت کو بائیبل کے ایک قدیم یونانی نسخہ سے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔نیز اس نسخہ میں خروج باب ۱۶ آیت ۱۵ کے الفاظ ''من'' کی بجائے ''کیا یہ من ہے'' کے الفاظ ہیں۔اور اگر یہ فرق صحیح تسلیم کر لیا جائے تو من خوراک کے معنوں میں درست ثابت ہوتا ہے۔اور استفہام کے الفاظ کا علیحدہ موجود ہونا ثابت کر دیتا ہے کہ من کا لفظ اس جگہ استفہام کے طور پر استعمال نہیں ہوا تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبرانی کا لفظ جو اس جگہ استعمال ہوا ہے اس کے معنے استفہام کے بھی ہوتے ہیں لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ لفظ بنی اسرائیل کی جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں ان معنوں میں صرف عزرآ اور دانیال کی کتب میں استعمال ہوا ہے۔جلاوطنی سے پہلے کے زمانہ میں اس کا استعمال ان معنوں میں نظر نہیں آتا اور اس وجہ سے بعض اہل نظر نے اسے ارمیک قرار دیا ہے۔

ہم جب اس لفظ کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے تورات کے دوسرے مقامات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ بے جان چیزوں کے متعلق سوال کرنے کا کیا طریق ہے تو وہاں ہمیں ایک ایسی بات مل جاتی ہے جو اس سوال کو ہمارے لئے قطعی طور پر حل کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ تورات میں جہاں بے جان چیزوں کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہاں ''مَنہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے نہ کہ من کا اور جہاں جاندار چیزوں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہاں ''ذی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔چنانچہ خروج باب ۴ آیت ۲ میں ہے۔

''خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے اس نے کہا لاٹھی'' (آیت ۲)

اس جگہ عبرانی میں لفظ ''مَ زِہ'' ہے۔یعنی یہ کیا ہے۔یہ الفاظ عربی کے الفاظ ''ماذا'' سے ملتے ہیں ''م زہ'' کا یہ استعمال غیر معمولی ہے ورنہ احبار باب ۲۵ آیت ۲۰۔ا۔سیموئیل باب ۳ آیت ۱۷۔زبور باب ۱۲۰ آیت ۳ امثال باب ۳۰ آیت ۴ اور دیگر مقامات میں پرانی عبرانی زبان میں کیا کے لئے لفظ ''مَنہ'' استعمال کیا گیا ہے۔اس کے مقابلہ میں جاندار کے متعلق سوال کے موقع پر کون کے لئے پیدائش ۱۸/۲۷ و پیدائش ۵ / ۳۳ وخروج ۱۵/۱۱ اسموئیل ۲۵/۱۰ زبور ۴ / ۶ وغیرہ عبرانی کا لفظ ''زی'' استعمال ہوا ہے اس فرق کو دیکھ کر صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ خروج باب ۱۶ میں جو ''من'' کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ کیا کے معنوں میں نہیں۔کیونکہ پرانی عبرانی زبان میں کیا کے لئے ''من'' نہیں بلکہ ''منہ'' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانہ میں جب ''من'' کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا تو اس سے بے جان نہیں بلکہ جاندار کے متعلق سوال کیا جاتا تھا جیسا کہ عربی زبان میں ہے۔چنانچہ عزرا ۵

اور دانیال ۲ میں ’’من‘‘ کا لفظ سوال کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن وہاں سوال جانداروں کے متعلق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اول تو تورات کے نزول کے وقت من کا لفظ سوال کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ دوم بنی اسرائیل کی جلاوطنی کے زمانہ سے جب یہ لفظ سوال کے لئے استعمال ہونے لگا اس وقت بھی یہ لفظ قاعدہ کے طور پر جاندار چیزوں کے متعلق سوال کرنے کے لئے استعمال ہوتا تھا نہ یہ کہ بے جان چیزوں کے متعلق (معلوم ہوتا ہے اس وقت بنی اسرائیل عربوں سے خلط ملط کرنے لگ گئے تھے اور عربی زبان کے صحیح محاورات ان میں استعمال ہونے لگ گئے تھے) اور استثناء کے طور پر اگر کہیں اس کے خلاف استعمال ہوا ہے تو اسے بطور سند پیش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا خروج باب ۱۵ آیت ۱۶ میں ’’من‘‘ کے معنے کیا ہے کے کرنا اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ’’من‘‘ کو من اس لئے کہا گیا تھا کہ بنی اسرائیل نے اسے پہچاننے کی وجہ سے من کے لفظ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا درست نہیں۔ یہ غلط فہمی یوروپین مصنفین کو اس لئے ہوئی ہے کہ وہ عبرانی جیسی مردہ زبان کی تحقیق کرتے وقت اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کہ عبرانی کی ماں عربی زبان زندہ موجود ہے۔ عبرانی الفاظ کی حقیقت کے سمجھنے میں جب مشکلات ہوں تو انہیں عربی زبان سے مدد لینی چاہیے۔ اس موقعہ پر اگر وہ عربی سے مدد لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ عربی زبان میں ما بے جان کے لئے اور من جاندار کے لئے استعمال ہوتا ہے اور پھر اس علم کی روشنی میں بائبل کے الفاظ کو دیکھتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ یہی قاعدہ بائبل کی عبرانی میں بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور اس طرح اس لغزش سے بچ جاتے مگر اتنی تعریف ان کی ضرور کرنی پڑتی ہے کہ انہوں نے یہ فرق ضرور محسوس کیا ہے کہ مَن کا لفظ سوال کے معنوں میں جلاوطنی کے زمانہ اور اس کے بعد استعمال ہوا ہے (دیکھو انسائکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۳ زیر لفظ منا) پہلے نہیں۔ اور اس کی بنا پر بعض نے من کے معنے استفہام کے سوا کچھ اور لینے کی کوشش کی ہے چنانچہ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں جارج ایبرز نے اس لفظ کو قبطی لفظ منو سے ماخوذ قرار دیا ہے جس کے معنے خوراک کے ہیں۔ اسی طرح جی سنیس (Jesenius) نے اپنی لغت میں من کی وجہ تسمیہ عربی لفظ من سے بیان کی ہے جس کے معنے فضل اور احسان کے ہیں اس مصنف کے خیال کے مطابق اس چیز کا نام من اس لئے رکھا گیا تھا کہ وہ خدا تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوئی تھی اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ وجہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

اب میں اس سوال کو لیتا ہوں کہ من کیا چیز تھی؟ بائبل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبنم کے ساتھ گرتی تھی اور سفید سفید گول دھنیئے کے بیجوں کی طرح ہوتی تھی اور لوگ اسے چکی میں پیس کر یا اوکھلی میں کوٹ کر توے پر پکاتے تھے یا پھلکیاں بناتے تھے اور اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا۔ جب دھوپ نکل آتی تو من پگل جایا کرتا تھا۔

(خروج باب ۱۶ آیت ۲۱ و ۳۱ و گنتی باب ۱۱ آیت ۷ تا ۱۰) یہ چیز سبت کے دن نہیں گرتی تھی اور اگر لوگ جمع کرتے تھے تو سڑ جاتی تھی۔ سوائے اس کے جو سبت کے دن کے لئے جمع رکھی جاتی تھی۔ یہ من برابر چالیس سال تک بنی اسرائیل پر نازل ہوتا رہا (خروج باب ۱۶ آیت ۳۵) اور اس وقت بند ہوا جب انہوں نے موعودہ زمین میں قدم رکھا اور وہاں کا دانہ کھایا (یشوع باب ۵ آیت ۱۲)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی ایسی چیز ہے جو بائیبل کی بیان کردہ صفات کے مطابق ہو اور سینا مقام میں پائی جاتی ہو۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر معجزانہ امور کو نظر انداز کر دیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقعہ ایک ایسی چیز سینا کے علاقہ میں پائی جاتی ہے جو شبنم کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے اور دھوپ کی گرمی میں پگل جاتی ہے اور تیل کا سا اس کا مزہ ہوتا ہے اور سفید رنگ کی ہوتی ہے جس کی ایک قسم کو ہمارے ملک میں شیر خشت کہتے ہیں۔ اور دوسری کو ترنجبین اور ہندی میں اسے یورس شرط کڑا یعنی جوانسہ کی شکر کہتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں یہ چیز جوانسے کے درخت سے نکالی جاتی ہے (کتاب المفردات خواص الادویۃ زیر لفظ Manna)۔ لاطینی میں اسے منّا کہتے ہیں اور اس چیز کی ماہیت پوری طرح طبی کتب میں بھی درج ہے اور انسائیکلو پیڈیا برٹینکا میں بھی بیان ہے۔ یوروپین سیاحوں نے شہادت دی ہے کہ اب تک اس علاقہ میں من ملتا ہے۔ گو وہ شبنم کے ساتھ نہیں گرتا۔ بلکہ ٹیمر کس گیلیکا نامی درخت کا رس ہوتا ہے جس کی چھال کو جب ایک کیڑا چھید تا ہے تو اس سے یہ رس ٹپکتا ہے۔ بغیر کیڑے کے انسانی طریقوں سے درخت کی چھال میں شگاف کرنے سے بھی یہ رس گر کر جم جاتا ہے۔ اور مختلف مما لک میں اس درخت سے مختلف طریقوں سے اس کو جمع کیا جاتا ہے۔ سسلی اور خراسان کا من مشہور ہے۔ ہندوستان میں بھی جوانسہ کے درخت سے وید من بناتے ہیں۔ مصر سے مصنوعی من بنا ہوا آتا ہے لیکن اطباء اسے پہچان لیتے ہیں برنارڈٹ جرمن سیاح کا بیان ہے کہ سینا میں موجودہ درختوں کی تعداد کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ سالانہ اڑھائی تین سو سیر تک من تیار ہوسکتا ہے (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا زیر لفظ Manna) مگر خیال کیا جاتا ہے کہ پہلے زمانہ میں جنگل زیادہ وسیع ہوتا تھا اور اس سے بہت زیادہ من تیار ہوسکتا تھا۔ بائیبل میں بنی اسرائیل کی جو تعداد لکھی ہے اس کے مطابق انہیں روزانہ چھبیس ہزار سات سو پچاس (۲۶۷۵۰) منّ کے قریب من کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ اور سالانہ ایک کروڑ من کے قریب لیکن اڑہائی تین سو سیر سالانہ جواب وہاں پیدا ہوتا ہے اور ایک کروڑ من جس کی انہیں ضرورت ہوتی تھی ان دونوں اندازوں میں اس قدر فرق ہے کہ خواہ قوت واہمہ کو کتنا ہی آزاد چھوڑ دیا جائے خیال بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی زمانہ میں اس علاقہ میں اس قدر جنگل تھا کہ ایک کروڑ من، مَن پیدا ہو جاتا تھا خصوصاً جب ہم اس امر کو مدنظر رکھیں

کہ اس علاقہ کا اکثر حصہ ایسا ہے کہ اس میں درخت پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔

اس مشکل کا ایک حل تو یہ ہے کہ ہم سمجھ لیں کہ بائیبل میں جو تعداد بنی اسرائیل کی لکھی ہے۔ وہ مبالغہ آمیز ہے (خروج باب ۱۲ آیت ۳۷)۔ گنتی باب ۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے بیس سال سے زائد عمر کے لڑنے کے قابل مردوں کی تعداد بارھویں قبیلہ کو چھوڑ کر جن کی گنتی نہیں کی گئی چھ لاکھ تین ہزار اور پانچ سو پچاس تھی۔ اگر بارھویں قبیلہ کا اندازہ کرلیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کل لڑنے کے قابل مرد ساڑھے چھ لاکھ تھے عورتوں بچوں اور جنگ کے ناقابل بوڑھوں کی تعداد کا اندازہ لگانے کے لئے ہم اس تعداد کو دس گنا زیادہ کر لیتے ہیں کیونکہ یہ ایک عام اندازہ ہے کہ چھ فیصدی سے لے کر دس فیصدی تک ملک کی آبادی جنگی خدمت کے قابل ہوتی ہے۔ ہم خیال کر لیتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے سختی سے جنگی خدمت لی جاتی تھی اور کل تعداد بنی اسرائیل کی جنگی سپاہیوں سے صرف دس گنا تھی یعنی ساٹھ لاکھ مگر عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تھے کیونکہ اتنے آدمی مصر سے اتنے قلیل عرصہ میں نکل ہی نہیں سکتے تھے پھر یردن پار کی بستی جس میں آ کر وہ بسے ہیں اس قدر آبادی کی حامل نہیں ہوسکتی فلسطین کی آبادی کا اندازہ ۱۹۲۶ء میں آٹھ لاکھ باون ہزار دوسو اڑسٹھ (۸۵۲۲۶۸) تھا (انسائکلو پیڈیا برٹینیکا چودھواں ایڈیشن زیر لفظ Palestine) اور اس ملک کا کل رقبہ ۹ ہزار مربع میل ہے اور پھر اس کا ایک بڑا حصہ ناقابل سکونت ہے۔ صرف ریت کے میدان ہیں جنہیں آباد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اب بھی جبکہ یہودیوں نے امریکہ کی مدد سے اسے آباد کیا ہے اس کی کل آبادی پندرہ لاکھ ہے۔ پس اس ملک میں جو پہلے سے آباد تھا ساٹھ لاکھ آدمیوں کا آ کر بس جانا بالکل خلاف عقل ہے۔

ایک اور دلیل سے بھی یہ امر خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل ساٹھ لاکھ تو درکنار چند لاکھ بھی ہوں اور وہ اس طرح کہ حضرت اسحاقؑ کی پیدائش سے لے کر حضرت یعقوبؑ کے مصر میں داخل ہونے تک قریباً دوسو سال کا عرصہ بائیبل کے بیان کے مطابق گذرا ہے اس عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے افراد ۱۲ تک پہنچتے ہیں عیسو کی اولاد کو بھی اگر اس قدر فرض کر لیا جائے تو دوسو سال میں چوبیس افراد تک ان کی نسل پہنچتی ہے اس کے بعد مصر سے نکلنے کے زمانہ تک دوسو سال گذرے ہیں پس عام اندازہ تو یہی ہوسکتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کی نسل اس دوسو سال میں چھ سات سو افراد تک پہنچ گئی ہو گی لیکن اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ وہ بہت شادیاں کرتے تھے اور اولاد زیادہ ہوتی تھی تب بھی پندرہ بیس ہزار سے زائد تو کسی صورت میں بھی ان کی تعداد نہیں ہوسکتی اور اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ کہ بنی سرائیل اپنے سفر کے دوران میں معمولی شہر کے آدمیوں سے بھی ڈرتے تھے اور ان

کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ امر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دو اڑہائی ہزار سپاہیوں سے زیادہ نہیں تھے اس اندازہ کے ماتحت من کی وہ مقدار جو بنی اسرائیل کے لئے ضروری ہوتی ہوگی بہت کم رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ کیا بنی اسرائیل من پر گذارہ کر سکتے تھے؟ من جیسا کہ بتایا جاچکا ہے ایک گوند ہے جو ہے بھی مسہل۔ اس غذا پر انسان چند دن سے زیادہ گزارا نہیں کرسکتا پھر بنی اسرائیل نے اڑتیس سال تک اس پر کیونکر گذارا کیا؟ نئے یوروپین محققین بھی اس سوال کی معقولیت کے قائل ہو گئے ہیں اور اب ان کا یہ خیال ہے کہ من کی جو ماہیت بائیبل میں بتائی گئی ہے اس میں مبالغہ اور تداخل ہوگیا ہے۔ من ان کے نزدیک لچن Lichen کے دانوں کا نام ہے جو قحط کے دنوں میں لوگ کھانے لگتے ہیں۔ لچن ایک بوٹی ہے جو سطح کے اوپر ہی اگ آتی ہے جڑ کے لئے اسے زمین کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے چٹانوں کی سطح اور درختوں کی چھال پر بھی اگ آتی ہے اس کی بعض قسمیں پتھروں پر اگتی ہیں خصوصاً چونسے کے پتھروں پر اور جب اسے پتھر سے الگ کیا جائے تو جوار کے کچلے ہوئے دانے کے مشابہ ہوجاتی ہے جب یہ بوٹی پک جائے تو اس کے چھلکے جڑ سے الگ ہوکر گول شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہلکا ہونے کی وجہ سے ہوا انہیں اڑا کر دور دور لے جاتی ہے (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۳ زیر لفظ Manna)۔

علماء نباتات کے نزدیک یہ بوٹی کھمب کی قسموں میں سے ہے (انسائیکلو پیڈیا ببلیکا جلد ۳ زیر لفظ Lichen)۔ اگر نئے یوروپین محققین کی رائے تسلیم کرلی جائے تو پھر یہ سوال حل ہوجاتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس کھانے پر گذارہ کس طرح کیا؟ لیکن وہ سوال پھر پیدا ہوجاتا ہے کہ بائیبل کی بیان کردہ من کی ماہیت کے ساتھ اس بوٹی کی کوئی مناسبت نہیں نہ یہ بوٹی میٹھی ہوتی ہے نہ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا ہوتا ہے اور نہ یہ بوٹی دوپہر کو پگل جاتی ہے۔

میرے نزدیک اس سوال کا جواب بائیبل اور اس کی متعلقہ کتب سے نہیں مل سکتا۔ یوروپین محققین خواہ کتنا ہی زور لگائیں وہ اس سوال کا پوری طرح جواب نہیں دے سکتے کیونکہ وہ اس سرچشمہ سے دور ہیں جس سے حقیقی علم عطا ہوتا ہے۔ پس اگر ہمیں صحیح جواب کی ضرورت ہے تو ہمیں چاہیے کہ قرآن اور حدیث سے مدد حاصل کریں۔

قرآن کریم اور حدیث میں من کے متعلق مندرجہ ذیل حقائق بیان ہوئے ہیں۔ (۱) اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاهُمْ (البقرۃ: ۲۴۴) کیا تجھے ان لوگوں کا حال معلوم نہیں جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے اس حال میں نکلے تھے کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے اس پر اللہ نے انہیں کہا کہ مرجاؤ پھر اس نے انہیں زندہ کر دیا۔

(۲) وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰی ؕ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ (البقرۃ:۵۸) اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ اتارا تھا اور کہا تھا کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے اعلیٰ اور پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ۔

(۳) بخاری میں سعید بن زیدؓ کی روایت ہے قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسلّم اَلْکَمْأَۃُ مِنَ الْمَنِّ (بخاری کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ وظللنا علیکم الغمام) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کھمب بھی من کی اقسام میں سے ہے ترمذی میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔اِنَّ نَاسًا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالُوْا اَلْکَمْأَۃُ جُدَرِیُّ الْاَرْضِ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْکَمْأَۃُ مِنَ الْمَنِّ (ترمذی ابواب الطب باب ما جاء فی الکمأۃ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے بعض لوگ اعراب کے توہمات کے مطابق باتیں کر رہے تھے کہ کھمب زمین کی چیچک ہے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سن کر فرمایا کہ کھمب من کی اقسام میں سے ہے۔

اوپر کی آیات واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نہیں نکلے بلکہ ہزاروں کی تعداد میں نکلے تھے۔

(۲) جو چیز ان کے کھانے کے لئے مہیا کی گئی تھی وہ غذا کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی تھی اور ایسی نہ تھی جو غذائیت یا مزے کے لحاظ سے تکلیف دہ ہو۔

(۳) جو چیز بنی اسرائیل کو کھانے کے لئے ملی تھی وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزیں تھیں اور ان کئی چیزوں میں سے ایک کھمب بھی تھی۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ من کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہ پر آیا ہے۔ایک سورۃ بقرۃ میں ایک سورۃ اعراف میں اور ایک سورۃ طٰہٰ میں اور تینوں جگہ اس کے ذکر کے بعد کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ کا فقرہ ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کی تردید کرنا مقصود ہے کہ وہ کھانا ایک ہی تھا اور طبیعت پر بوجھ ڈالنے والا تھا یا غذایت کے لحاظ سے ادنیٰ قسم کا تھا۔

جب ہم لچن کی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کھمب کی قسم کا پودا ہے چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں لکھا ہے۔

''لچن اور کھمب کے اقسام بالکل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔اور یہ امر ان اقسام کی مشابہت سے جو ایک دوسرے کی طبعی سرحد پر واقع ہیں بالکل ظاہر ہو جاتا ہے'' (زیر لفظ Lichen)

لیکن یہ امر ظاہر ہے کہ لچن خود کوئی اچھا کھانا نہیں ہے بلکہ قحط کے ایام میں مجبوراً اسے لوگ کھاتے ہیں۔اس کے برعکس کھمب اعلیٰ درجہ کے کھانوں میں سے ہے اور گراں قیمت پر فروخت ہوتی ہے اور خاص طور پر اسے امراء کے لئے بویا جاتا ہے۔اور فرانس میں تو اس کی اس قدر کھپت ہے کہ پیرس میں ایک زمیندار دن میں تین ہزار پونڈ تک کھمب منڈی میں فروخت کرنے کے لئے بھیجتا ہے اور پھر ہے بھی یہ جلد اگنے والی چیز چنانچہ انگریزی میں اس چیز کو جو جلد ہو جانے والی ہو مشروم گروتھ یعنی کھمب کی طرح پیدا ہونے والی کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کے لئے جو کھانے سے تنگ ہوں ایسی ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جو جلد اگ آئیں اور جلد استعمال میں آسکیں اب کیا یہ صاحبان بصیرت کے لئے عجیب بات نہیں کہ بائیبل کے کثیر نسخوں اور علم طبیعات کے ماہروں کی امداد کے باوجود یورپ بیسویں صدی میں جس نتیجہ پر من کے متعلق پہنچا ہے اور وہ بھی ناقص صورت میں۔اس کی قرآن کریم میں آج سے تیرہ سو سال پہلے نہایت جامعیت کے ساتھ توضیح کر دی گئی تھی۔

میں جہاں تک مندرجہ بالا آیات اور احادیث سے سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دشت سینا میں کھمب ترنجبین اور ایسی ہی اور چیزیں جو جلد تیار ہو جاتی تھیں پیدا کر دیں جن سے بنی اسرائیل کو بآسانی غذا ملنے لگی اسی طرح تلیئر وغیرہ کثرت سے آ گئے کیونکہ ان علاقوں میں ٹڈی بہت ہوتی ہے اور تلیئر زیادہ تر ان مقامات کو پسند کرتا ہے جن میں ٹڈی ہو کیونکہ وہ ٹڈی بڑے شوق سے کھاتا ہے اور چونکہ اس کے لئے انہیں کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی تھی اس غذا کا نام من یعنی احسان الٰہی سے ملنے والی غذا رکھا گیا۔وہ ایک قسم کی غذا نہ تھی بلکہ کئی قسم کی غذائیں تھیں۔کیونکہ حدیث کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ کئی طرح کا من تھا۔ہاں سب میں ایک مشابہت تھی اور وہ یہ کہ غذائیں ہل چلا کر اور محنت کر کے بنی اسرائیل کو پیدا نہیں کرنی پڑتی تھیں۔لیکن چونکہ غذائیں اور تلیئر وغیرہ جو اس وقت کثرت سے جنگل میں آ گئے تھے شکم میں قبض پیدا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ترنجبین بھی کثرت سے پیدا کر دی جسے دوسری غذاؤں میں ملا کر کھانے سے ان کی صحت درست رہتی تھی۔پس یہ ایک حقیقت ہے کہ من جس کا کثرت سے ان ایام میں پیدا ہونا ایک معجزہ تھا لیکن خود اس کا وجود اس دنیا کی چیزوں میں سے تھا۔وہ ایسی غذا تھی جسے ایک عرصہ تک کھایا جا سکتا تھا۔اور اس کی مصلح ترنجبین بھی ساتھ ہی پیدا کر دی گئی تھی تا کہ جنگل کی خشک غذا صحت کو نقصان نہ پہنچائے۔

اس تشریح کے ساتھ سب سوال حل ہو جاتے ہیں یہ بھی کہ من کو لوگ دیر تک کس طرح کھاتے رہے؟ اور یہ بھی کہ وہ سال بھر کس طرح ملتی رہتی تھی اور یہ بھی کہ وہ تیل کی طرح تھی اور اس سے روٹیاں بھی پکتی تھیں اور پھلکیاں

بھی بنائی جاتی تھیں کیونکہ وہ ایک چیز نہ تھی بلکہ کئی چیزوں کا نام من تھا۔اوراس تشریح کو تسلیم کر کے کوئی خلاف عقل بات بھی تسلیم نہیں کرنی پڑتی کیونکہ تلییٔر وغیرہ کی قسم کی چیزوں پر ایک ایسی قوم جس کا اہم سیاسی اغراض کے لئے جنگل میں رہنا ضروری ہو گذارا کرسکتی ہے اور قرآن کریم کی بتائی ہوئی تعداد کے مطابق قوم کا اس جنگل میں آسانی سے بسر اوقات کرسکنا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

سلوٰی کے معنے بھی من کی طرح ایک عام ہیں اور ایک خاص۔اس کے عام معنے تو ہر اس چیز کے ہیں جو تسلی دینے والی ہو۔اور خاص معنوں کے لحاظ سے وہ ایک پرندے کا بھی نام ہے جو تلییٔر کے مشابہ ہوتا ہے۔اور شہد کو بھی سلوٰی کہتے ہیں بائیبل میں اس کا ذکر گنتی باب ۱۱ آیت ۳۰ تا ۳۲ میں اس طرح آتا ہے۔

''پھر موسیٰ اور وہ اسرائیلی بزرگ لشکر گاہ میں گئے اور خداوند کی طرف سے ایک آندھی چلی اور سمندر سے بٹیریں اڑا لائی اور ان کو لشکر گاہ کے برابر اور اس کے گردا گرد ایک دن کی راہ تک اس طرف اور ایک ہی دن کی راہ تک دوسری طرف زمین سے قریباً دو دو ہاتھ اوپر ڈال دیا اور لوگوں نے اٹھ کر اس سارے دن اور اس ساری رات اور اس کے دوسرے دن بھی بٹیریں جمع کیں۔''

غرض سلوٰی میں پرندے شہد اور تمام ایسی غذائیں جو قلب کو تسکین دیتی ہیں شامل ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کو جنگل میں آزاد رکھ کر ان میں جرأت اور بہادری کے اخلاق پیدا کرے اس لئے اس نے اپنے فضل سے ان کے لئے ایسی غذائیں مہیا فرمادیں جو بغیر محنت کے ملتی تھیں اور جن میں گوشت بھی شامل تھا۔اور پھل اور سبزی ترکاری کی قسم کی غذائیں بھی شامل تھیں تا کہ ان کی غذئی ضرورت بھی پوری ہو اور ان کی صحت بھی اچھی رہے۔

اس کے بعد فرمایا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِیْہِ فَیَحِلَّ عَلَیْکُمْ غَضَبِیْ کہ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے پاک چیزیں کھاؤ اور اس رزق کے بارے میں تم ظلم سے کام نہ لو یعنی چونکہ تمہیں جنگل میں رزق مل رہا ہے ایسا نہ ہو کہ زبردست سارا رزق جمع کر لے اور غریب کو محروم کر دے اگر ایسا کرو گے تو تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ

(اور ہم نے کہا) اے موسیٰ تم اپنی قوم کو چھوڑ کر کس لئے جلدی جلدی آ گئے ہو؟ (موسیٰ نے جواب میں) کہا کہ وہ

عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۵﴾

(لوگ) میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں اور اے میرے رب میں اس لئے تیرے پاس جلدی سے آیا ہوں تا کہ تو (میرے اس فعل پر) خوش ہو جائے۔

تفسیر۔ پاک لوگ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کس طرح بیتاب رہتے ہیں اس کا ایک نمونہ ان آیات میں دکھائی دیتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ایک وقت مقرر کیا تا کہ اس وقت میں ان سے کلام کرے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے آگے آگے تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! تیز تیز کیوں چل رہے ہو؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ حضور مجھ پر اظہار خوشنودی فرمانے والے تھے ایسے وقت میں میں تیزی سے آگے نہ بڑھتا تو کیا کرتا اور میری قوم تو میرے نقش قدم پر ہی چل رہی ہے اس لئے میرا ان کے ساتھ رہنا کوئی ضروری نہ تھا۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ

(اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا) ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد ایک آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے

السَّامِرِيُّ ﴿۸۶﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ۬

ان کو گمراہ کر دیا ہے۔ اس پر موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصے سے بھرے ہوئے افسردہ لوٹ گئے

قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ

(اور اپنی قوم سے) کہا اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے ایک اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا اس وعدہ کے

عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ

پورا ہونے میں کوئی دیر ہو گئی تھی؟ یا تم چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی غضب نازل ہو۔

مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۷﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا

سو تم نے میرے وعدے کو رد کر دیا انہوں نے کہا ہم نے تیرے وعدہ کو اپنی مرضی سے رد نہیں کیا۔

مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ

بلکہ (فرعون کی) قوم کے زیورات کا جو بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا اس کو ہم نے پھینک دیا۔ اور اسی طرح سامری

الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۸﴾

نے بھی اس کو پھینک دیا پھر اس نے ان کے لئے (یعنی ہمارے لئے) ایک بچھڑا تیار کیا جو محض جسم ہی تھا

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ

اس سے ایک بے معنی آواز نکلتی تھی (یعنی حقیقی بچھڑا نہیں تھا) پھر (اس نے اور اس کے ساتھیوں نے) کہا کہ یہ تمہارا بھی

اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۵ فَنَسِيَ ﴿۸۹﴾ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ

اور موسیٰ کا بھی خدا ہے اور وہ اسے بھول (کر پیچھے چھوڑ) گیا ہے۔ (بیشک سامری اور اس کے ساتھیوں نے ایسا کیا)

اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۵ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۹۰﴾

مگر کیا وہ خود نہیں دیکھتے تھے کہ وہ (بچھڑا) ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا۔ اور نہ ان کو کوئی ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے

تفسیر ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کو تو ہماری ملاقات کا اتنا شوق ہے مگر تمہاری قوم کا یہ حال ہے کہ ادھر تم ہماری طرف آئے اور ادھر وہ سامری کے بہکانے سے بہک گئی اس پر موسیٰ غصہ اور افسوس کی حالت میں واپس لوٹے اور اپنی قوم سے کہا کہ کیا تمہارے رب نے نہایت اعلیٰ اور شاندار وعدہ تم سے نہیں کیا تھا۔ یعنی تمہارے نبی کو ہم کلام ہونے کے لئے نہیں بلایا تھا۔ کیا تم اتنے بے ایمان ہو کہ اتنی تھوڑی سی دیر میں تمہارا ایمان ضائع ہو گیا یا تم کو اپنے رب کے غضب کے نازل ہونے کی خواہش ہے۔ جس کی وجہ سے اتنے تھوڑے عرصہ میں ہی تم خدا کو بھول گئے اور میری اطاعت کا جو تم نے اقرار کیا تھا اس کی تم نے خلاف ورزی شروع کر دی۔ انہوں نے کہا ہم نے تیرے

وعدے کو اپنی مرضی سے نہیں جھٹلایا بلکہ فرعون کی قوم کے زیورات چلتے ہوئے ہم پر لاد دیئے گئے تھے تیرے جانے کے بعد وہ زیورات ہم نے اٹھا کر ایک جگہ رکھ دیئے اور سامری نے بھی ایسا ہی کیا۔ پھر اس نے ان زیورات کو پگھلا کر ایک بے جان بچھڑا بنا دیا جس میں سے ایک بے معنے آواز نکلتی تھی۔ جس پر موسیٰ ؑ کی سب قوم بول اٹھی کہ اے لوگو! یہ تمہارا معبود ہے۔ اور موسیٰ کا بھی یہی معبود تھا۔ جو پہاڑ پر جانے کے شوق میں اسے بھول گیا۔

حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات مصریوں نے خود دیے تھے مگر بائیبل کہتی ہے کہ بنی اسرائیل نے مصریوں سے سونے چاندی کے برتن عاریۃً لئے اور ان کو خوب لُوٹا اور وہ بھی دیتے چلے گئے کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے نکل جائیں تا کہ ان کے سبب سے وہ ہلاک نہ ہو جائیں۔ چنانچہ خروج باب ۱۲ آیت ۳۵۔۳۶ میں لکھا ہے۔

’’اور بنی اسرائیل نے موسیٰ کے کہنے کے موافق یہ بھی کیا کہ مصریوں سے سونے چاندی کے زیور اور کپڑے مانگ لئے اور خداوند نے ان لوگوں کو مصریوں کی نگاہ میں ایسی عزت بخشی کہ جو کچھ انہوں نے مانگا انہوں نے دے دیا سو انہوں نے مصریوں کو لوٹ لیا۔‘‘

گویا بائیبل حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ الزام لگاتی ہے کہ ان کے کہنے کے مطابق بنی اسرائیل نے مصریوں سے سونے چاندی کے زیورات اور کپڑے مانگ لئے اور انہوں نے مصریوں کو خوب لُوٹا۔ لیکن قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ انہوں نے وہ زیورات نہیں مانگے بلکہ مصریوں نے آپ ان کو دیئے۔ اور انسانی عقل اس کی تائید کرتی ہے کیونکہ نبی ڈاکو نہیں ہوتا مگر بائیبل ایک طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا نبی قرار دیتی ہے اور دوسری طرف انہیں ڈاکو ثابت کرتی ہے۔ حالانکہ خود بائیبل کی ایک اندرونی شہادت بتا رہی ہے کہ موسیٰ ؑ پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ چنانچہ گو بائیبل نے یہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل نے مصریوں سے خدا کے حکم سے زیورات مانگے مگر خروج باب ۱۲ میں ہی لکھا ہے کہ جب مصریوں پر عذاب آیا اور سارے مصر میں پلوٹھے بچوں کی ہلاکت سے ایک کہرام مچ گیا تو فرعون نے موسیٰ اور ہارون کو بلوا کر کہا کہ تم بنی اسرائیل کو لے کر میری قوم کے لوگوں میں سے نکل جاؤ اور

’’مصری ان لوگوں سے بضد ہونے لگے (یعنی ان کے پیچھے پڑ گئے) تا کہ ان کو ملک مصر سے جلد باہر چلتا کریں کیونکہ وہ سمجھے کہ ہم سب مر جائیں گے۔‘‘ (خروج باب ۱۲ آیت ۳۳)

اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مصری خود دل سے چاہتے تھے کہ وہ لوگ مصر سے نکل جائیں پس قرین قیاس یہی

ہے کہ انہوں نے خود ان کو زیورات دیئے تا کہ وہ عبادت کے لئے باہر جائیں اور ان کا عذاب ٹل جائے۔ اور یہی بات قرآن کریم نے بیان کی ہے بلکہ ممکن ہے سامری نے بھی ان لوگوں سے یہی کہا ہو کہ اگر یہ لوگ باہر نکلیں گے تو میں ان کے لئے سونے کا بچھڑا بنا دوں گا اور ان سے اس کی پوجا کرواؤں گا اور یہ لوگ تمہارے مذہب میں واپس آجائیں گے۔

فَقَذَفْنٰهَا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ان زیورات سے نفرت کر کے اسے پھینک دیا تھا مگر سامری نے اس سے بچھڑا تیار کر لیا اور بچھڑا بھی ایسا جو بولتا تھا۔ چونکہ وہ مصر میں بچھڑے کی پرستش ہوتی دیکھ آئے تھے اور فرعون بھی اس کے آگے سجدہ کرتا تھا۔ اس لئے ان کے خیال میں اس سے زیادہ اعلیٰ چیز اور کیا ہو سکتی تھی پس وہ کہتے ہیں کہ ایک تو بچھڑا دوسرا سونے کا اور تیسرا بولنے والا اس کے بعد بھی اگر ہم اس کی عبادت نہ کرتے تو کیا کرتے۔ گویا وہ اپنی مجبوری کا اظہار کر رہے ہیں۔ اور موسیٰ ؑ سے کہتے ہیں کہ آپ ہماری بھی تو مجبوری دیکھیں اگر اتنی باتوں کے بعد بھی ہم اس کی پرستش نہ کرتے تو کیا کرتے۔ ان کی یہ مجبوری بالکل ویسی ہی تھی جیسا کہ استاذی المکرم حضرت مولوی نورالدین صاحب ؓ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مولوی کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ اس نے ایک شادی شدہ عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح پڑھ دیا ہے۔ فرماتے تھے مجھے اس سے سخت حیرت ہوئی اور میں نے اس مولوی کو بلوا کر کہا کہ مولوی صاحب میں نے آپ کے متعلق ایک بات سنی ہے۔ مجھے اعتبار تو نہیں آتا کہ وہ درست ہو مگر چونکہ میرے پاس اس کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے آپ سے بھی میں بیان کر دینا چاہتا ہوں میں نے سنا ہے کہ آپ نے ایک عورت کا نکاح پر نکاح پڑھ دیا ہے۔ وہ سن کر بڑے جوش سے کہنے لگا۔ مولوی صاحب آپ پہلے تحقیق تو کر لیا کریں۔ یونہی سنی سنائی باتوں میں نہ آجایا کریں۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ میری مجبوری کیا تھی آپ نے فرمایا اسی لئے تو میں نے آپ کو بلوایا ہے تا کہ آپ سے سارے حالات کا علم ہو جائے۔ وہ کہنے لگا مولوی صاحب دوسرے فریق نے جب چڑے جتنا روپیہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا تو پھر میں نکاح نہ پڑھتا تو اور کیا کرتا یہی مثال موسیٰ ؑ کی قوم کی ہے وہ کہتے ہیں ہم نے تیرے عہد کو اپنی مرضی سے نہیں ٹلایا۔ ہم تو اس پر مجبور کر دیئے گئے تھے اور وہ مجبوری یہ تھی کہ فرعون کی قوم کے زیورات کا جو بوجھ ہم پر لاد دیا گیا تھا۔ وہ ہم نے پھینک دیا اور اسی طرح سامری نے بھی اس کو پھینک دیا مگر اس کے بعد سامری نے انہی زیورات کو ڈھال کر ایک عجیب و غریب بچھڑا تیار کر دیا جس میں سے آواز بھی نکلتی تھی اب بتایئے ہم اس کی کس طرح پرستش نہ کرتے۔ اس بچھڑے کو دیکھنے کے بعد ہمارے لئے انکار کی کوئی صورت ہی نہ رہی۔ سامری کا یہ واقعہ ساحروں کے واقعہ کی حقیقت بھی کھول دیتا ہے اور اس سے یہ پتہ لگ

جاتا ہے کہ مصریوں میں اس قسم کی کرتب بازی کا رواج تھا اور وہ مکینیکل کھلونے بنایا کرتے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم مصر سے آ رہی تھی اور فرعون کی قوم میں بیل کی پوجا کا عام رواج تھا بلکہ سب سے بڑا مندر مصر کا وہی تھا جس میں ایک بے عیب بیل بطور دیوتا کے رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ا صفحہ ۵۰۷ (زیر لفظ Animal) میں لکھا ہے کہ مصریوں میں جانور کی پوجا کرنے کا جو رواج تھا اس میں سب سے اہم مقام بیل کو حاصل تھا جب کوئی پرانا بیل مر جاتا تھا تو ایک نئے بیل کی تلاش کی جاتی تھی۔ اور جس گلّے میں سے یہ بیل ملتا تھا اس کے مالک کو بڑی عزت دی جاتی تھی اور جو شخص اس کو تلاش کرتا تھا اس کو بھی بہت بڑا انعام دیا جاتا تھا۔ اسی طرح نیو سٹنڈرڈ ڈکشنری میں ایپس کے لفظ کے نیچے لکھا ہے کہ یہ ایک مقدس بیل ہوتا تھا۔ جس کی مصری لوگ قدیم زمانہ میں پوجا کرتے تھے اس کی پیدائش کے دن کو ایک عام چھٹی کے طور پر ملک میں منایا جاتا تھا۔ اور اس کی موت پر تمام ملک میں ماتم کیا جاتا تھا۔ اور یہ ماتم اس وقت تک جاری رہتا تھا جب تک کہ ایک نیا ایپس ان علامتوں کے مطابق نہ مل جاتا جن سے اس کے خدا کے مظہر ہونے کا ثبوت حاصل ہو جاتا (نیو اسٹینڈرڈ ڈکشنری زیر لفظ Apis)۔ غرض فرعون کی قوم چونکہ بیل کی پرستش کی عادی تھی۔ اس لئے محکوم قوم ہونے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں بھی مشرکانہ خیالات پیدا ہو گئے اور موسیٰؑ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر سامری نے انہیں پھر شرک کے راستہ پر ڈال دیا اور وہ بچھڑے کو بڑے ادب کی نگاہ سے دیکھنے لگ گئے۔ سامری جو درحقیقت دل سے کافر انسان تھا اس نے قوم کی اس کمزوریٔ ایمان سے فائدہ اٹھایا اور ان سے کہا کہ اپنے زیورات لاؤ اور میں بھی اپنا سونا ڈالتا ہوں اس سے میں فرعونیوں کی طرح کا ایک بچھڑا تمہیں بنا دوں گا۔ وہ سامری کی یہ بات سن کر خوش ہو گئے۔ کیونکہ بچھڑے کا ادب فرعونیوں سے ان کو ورثہ کے طور پر ملا تھا۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ مصر کا بڑا بت بچھڑا ہی ہوتا تھا۔ اور تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ زمیندار ملکوں میں عام طور پر گائے کو خدا سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں سب ہندو گائے کو خدا سمجھتے ہیں اور ایک گائے کے ذبح کرنے پر ہزاروں مسلمانوں کا قتل جائز اور درست جانتے ہیں۔ بلکہ ہندوؤں کے کئی مندر ایسے ہیں جن میں گائے یا بچھڑے کی شکل پر بت بنایا جاتا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ گائے کو ایک جانور نہیں بلکہ دیوتا سمجھتے ہیں (انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس زیر لفظ Animal)۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سامری نے جو بچھڑا بنایا تھا اس میں ایسی ترکیب رکھی تھی کہ اس میں سے ایک بے معنے آواز نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سیٹیاں بنائی جاتی ہیں سامری نے بچھڑا اسی طرح بنایا تھا۔ کہ اگر پیچھے سے

ہوا داخل ہوتو منہ کی طرف سے آواز نکلتی تھی۔ بے وقوف یہودی جو قوم فرعون کے غلام تھے اور اس کے دین سے متاثر وہ اس دھوکا میں آ گئے اور انہوں نے سمجھا کہ موسیٰؑ جو کہتا تھا کہ مجھ سے خدا کلام کرتا ہے تو درحقیقت اس کے پاس کوئی ایسا ہی بچھڑا تھا جس کی بات سے وہ فال نکال لیا کرتا تھا۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ

اور ہارون نے (موسیٰ کے واپس آنے سے بھی) پہلے ان سے کہہ دیا تھا کہ اے قوم تم کو اس (بچھڑے) کے ذریعہ

بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۱﴾

آزمائش میں ڈالا گیا ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن (خدا) ہے پس میری اتباع کرو اور میرے حکم کو مانو (اور شرک نہ کرو)

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا

(مگر اس ضدی قوم نے) کہا جب تک موسیٰ ہماری طرف واپس نہ آئے ہم برابر اس کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔

مُوْسٰى ﴿۹۲﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ

(جب موسیٰ واپس آئے تو انہوں نے ہارون سے) کہا اے ہارون جب تو نے اپنی قوم کو گمراہ ہوتے دیکھا تھا تو

ضَلُّوْٓا ﴿۹۳﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۴﴾

تجھے کس نے منع کیا تھا کہ تو میرے نقش قدم پر نہ چلے؟ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔

تفسیر۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام شرک میں شامل نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنی قوم کو شرک سے سختی کے ساتھ روکا تھا لیکن بائیبل کہتی ہے کہ وہ شرک میں شامل تھے چنانچہ تورات میں لکھا ہے۔

''اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر لگائی تو وہ ہارون کے پاس جمع ہو کر اس سے کہنے لگے کہ کہ اٹھ ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ ہارون نے ان سے کہا تمہاری بیویوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے کانوں میں جو سونے کی بالیاں ہیں ان کو اتار کر میرے پاس

لے آؤ چنانچہ سب لوگ ان کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار اتار کر ان کو ہارون کے پاس لے آئے اور اس نے ان کو ان کے ہاتھوں سے لے کر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی تب وہ کہنے لگا اے اسرائیل یہی تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا‘‘

(خروج باب ۳۲ آیت ۱ تا ۴)

پھر لکھا ہے کہ ہارون نے اس بچھڑے کے لئے قربان گاہ بنائی اور اسے بنی اسرائیل کا معبود قرار دیا چنانچہ لکھا ہے۔

’’یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربان گاہ بنائی اور اس نے اعلان کر دیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہوگی اور دوسرے دن صبح سویرے اٹھ کر انہوں نے قربانیاں چڑھائیں۔اور سلامتی کی قربانیاں گذرانیں ۔پھر ان لوگوں نے بیٹھ کر کھایا پیا اور اٹھ کر کھیل کود میں لگ گئے۔‘‘

(خروج باب ۳۲ آیت ۶،۵)

ایک ادنیٰ سی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس سے خدا بولا کرتا تھا وہ ایک بچھڑے کو خدا کس طرح قرار دے سکتا ہے۔ایک شخص جو اپنے بھائی سے ہم کلام ہوتا ہے وہ کبھی ایسی غلطی کر سکتا ہے کہ ایک گیدڑ کو اپنا بھائی سمجھ لے مگر بائیبل جو دعویٰ کرتی ہے کہ وہ موسیٰ پر نازل ہوئی تھی وہ کہتی ہے کہ ہارون شرک میں شامل ہو گیا تھا۔

لیکن عقل سلیم نے جب بھی اس پر غور کیا یہی فیصلہ کیا کہ اس بارہ میں موسیٰؑ پر نازل ہونے والی بائیبل جھوٹی تھی ۔لیکن دو ہزار سال بعد نازل ہونے والا قرآن سچا ہے ۔ بلکہ اگر بائیبل کو ہی غور سے دیکھا جائے تو اس کی اندرونی شہادت بھی اس واقعہ کو غلط قرار دیتی ہے۔چنانچہ بائیبل بتاتی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ لوگوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی ہے تو وہ سخت غیظ وغضب کی حالت میں پہاڑ سے واپس تشریف لائے اور بچھڑے کو آگ میں جلا کر اسے خاکستر کیا اور اس کی خاک پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلوائی۔ چنانچہ بائیبل میں لکھا ہے۔

’’اس نے اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا لیا اور اسکو آگ میں جلایا۔اور اسے باریک پیس کر پانی پر چھڑکا اور اس میں سے بنی اسرائیل کو پلوایا۔‘‘

(خروج باب ۳۲ آیت ۲۰)

پھر موسیٰؑ نے اس کی سزا میں حکم دیا کہ ہر شخص اپنے قریبی کو قتل کرے اور اس طرح تین ہزار آدمی مارے گئے

چنانچہ بائیبل کہتی ہے۔

''اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریباً تین ہزار مرد کھیت رہے ۔'' (خروج باب ۳۲ آیت ۲۷، ۲۸)

پھر موسیٰؑ نے خدا سے درخوست کی کہ۔

''ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لئے سونے کا دیوتا بنایا اور اب اگر تو ان کا گناہ معاف کردے تو خیر ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے جو تو نے لکھی ہے مٹا دے۔'' (خروج باب ۳۲ آیت ۳۲)

مگر

''خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔'' (خروج باب ۳۲ آیت ۳۳)

اس فتنہ کو فرو کرنے کے بعد وہ پھر پہاڑ پر گئے تو خدا تعالیٰ نے ان کو حکم دیا کہ

''ہارون کو مقدس لباس پہنانا اور اسے مسح اور مقدس کرنا۔ تاکہ وہ میرے لئے کاہن کی خدمت کو انجام دے اور اس کے بیٹوں کو لاکر ان کو کرتے پہنانا اور جیسے ان کے باپ کو مسح کرے ویسے ہی ان کو بھی مسح کرنا تاکہ وہ میرے لئے کاہن کی خدمت کو انجام دیں۔ اور ان کا مسح ہونا ان کے لئے نسل در نسل ابدی کہانت کا نشان ہوگا۔ اور موسیٰ نے سب کچھ جیسا خداوند نے اس کو حکم کیا تھا اس کے مطابق کیا۔'' (خروج باب ۴۰ آیت ۱۳ تا ۱۶)

اسی طرح گنتی باب ۳ میں بھی ذکر آتا ہے کہ ہارون اور اس کے بیٹوں کو بنی لاوی کی کہانت سپرد کرکے ان کا نام ہمیشہ کے لئے قائم کر دیا گیا۔

بائیبل کے ان حوالہ جات سے ظاہر ہے کہ جہاں اور لوگوں پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا گیا اور مجرموں کو قتل کی سزائیں دی گئیں وہاں حضرت ہارون علیہ السلام پر بجائے کسی ناراضگی کا اظہار کرنے کے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ ہارون کو مقدس لباس پہنایا جائے اور نہ صرف اس کی عزت افزائی کی جائے بلکہ اس کی تمام اولاد کو بھی قابل اعزاز سمجھا جائے اور عبادت گاہوں کی نگرانی کا کام ان کے سپرد کیا جائے اب کیا ایک مشرکانہ فعل کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے اور

کیا ہارون علیہ السلام اگر اسی فعل کے مرتکب ہوتے جس کا بائیبل انہیں مرتکب قرار دیتی ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ان سے یہی سلوک کیا جاتا۔ جب اس شرارت کے تمام سرغنے قتل کر دیئے گئے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو کیوں قتل نہ کیا گیا۔ اور جب خدا نے موسیٰ سے کہا تھا کہ ’’جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اس کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹاؤں گا۔‘‘ (خروج باب ۳۲ آیت ۳۳) تو اگر حضرت ہارونؑ قصور وار تھے تو ان کا نام کیوں نہ مٹایا گیا۔ بلکہ بائیبل تو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے ہارون پر اظہار ناراضگی کرنے کی بجائے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور حکم دیا کہ آئندہ تمام عبادت گاہوں کا انتظام ہارون اور اس کے بیٹوں کے سپرد کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ انعام اور اس کی طرف سے خوشنودی کا اظہار بتا رہا ہے کہ بچھڑا بنانا تو الگ رہا حضرت ہارون اس کے پجاریوں میں سے بھی نہیں تھے بلکہ جیسا کہ قرآن کریم بتاتا ہے انہوں نے بنی اسرائیل کو شرک سے روکا اور انہیں توحید پر قائم رکھنا چاہا مگر انہوں نے ہارونؑ کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ حقیقت اتنی واضح ہے کہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا والا بھی ہارونؑ کے شرک کرنے کے واقعہ کو غلط قرار دیتا ہے اور اس سے یہ استدلال کرتا ہے کہ بائیبل میں کئی واقعات بعد میں بڑھا دیئے گئے ہیں (انسائکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۴ زیر لفظ Calf the Golden وجلد ۱۵ زیر لفظ موسیٰ)۔

تورات کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہاڑ پر جاتے ہوئے بنی اسرائیل سے وقت کی کوئی تعیین نہیں کی تھی۔ بلکہ صرف اتنا کہا تھا کہ

’’جب تک ہم لوٹ کر تمہارے پاس نہ آ جائیں تم ہمارے لئے یہیں ٹھہرے رہو۔‘‘

(خروج باب ۲۴ آیت ۱۴)

اور پھر وہ

’’پہاڑ پر چالیس دن اور چالیس رات رہا۔‘‘　　(خروج باب ۲۴ آیت ۱۸)

لیکن موسیٰؑ کے پہاڑ پر جانے کے بعد جب بنی اسرائیل نے ان کے آنے میں دیر محسوس کی تو انہوں نے ہارون سے اپنے لئے بچھڑا بنوالیا۔ قرآن کریم اس کے خلاف یہ کہتا ہے کہ موسیٰ تیس راتوں کے وعدہ سے گئے تھے مگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرما کر دس راتیں اور اپنے ساتھ ہم کلام ہونے کا شرف عطا فرما دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (الاعراف: ۱۴۳) یعنی ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ مگر پھر ہم نے دس راتیں اور بڑھا کر انہیں تکمیل تک پہنچا دیا۔ اور

یوں اس کے رب کا چالیس رات کا وعدہ اس سے پورا ہوا۔

ان دونوں بیانات میں سے قرآنی بیان صاف طور پر سچا معلوم ہوتا ہے ۔کیونکہ تبھی تو بنی اسرائیل ان کی غیر حاضری میں گھبرا گئے ۔ورنہ اگر غیر معین وقت ہوتا تو ایک مہینہ کچھ زیادہ وقت نہیں تھا کہ اس عرصہ میں وہ گھبرانے لگ جاتے ۔ان میں گھبراہٹ اسی لئے پیدا ہوئی کہ موسیٰؑ تیس راتوں کا وعدہ کر گئے تھے مگر تیس راتیں گذرنے کے بعد واپس نہیں آئے ۔معلوم نہیں وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔سامری نے موسیٰؑ کی اس غیر حاضری سے فائدہ اٹھایا اور قوم میں فتنہ کھڑا کر دیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے اس موقعہ پر جو یہ کہا کہ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ یعنی اے میری قوم تمہیں اس بچھڑے کے ذریعہ ایک آزمائش میں ڈالا گیا ہے ۔اس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری اصل آزمائش کا وقت اب آیا ہے گویا فرعون کے عذاب اس آزمائش کے مقابل پر بالکل ہیچ تھے کیونکہ وہ آزمائش دشمن کی طرف سے تھی جس میں قدرتاً سب لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں لیکن جب اندرونی فتنہ کھڑا ہو تو کئی کمزور طبائع ڈانواں ڈول ہو جاتی ہیں ۔پس حضرت ہارون علیہ السلام اپنی قوم کو توجہ دلاتے ہیں کہ بے شک پہلے بھی تمہارے سامنے مختلف آزمائشیں آتی رہی ہیں مگر اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ تمہاری آزمائش کا اصل وقت اب آیا ہے اور اب دنیا پر ظاہر ہو جائے گا کہ تم میں سے کون سچے دل سے ایمان لایا تھا اور کون اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹا تھا۔اس سے معلوم ہوا کہ اندرونی فتنوں کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ پوری تندہی سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے ۔کیونکہ خطرے والا فتنہ وہی ہوتا ہے ۔خواہ قوم کتنی بھی تھوڑی ہو اگر اندرونی فتنہ اس میں نہ ہو تو دشمن اسے مٹا نہیں سکتا لیکن اگر اندرونی فتنہ پیدا ہو تو پھر تباہی کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس جگہ ایک مختصر سا نوٹ سامری کے متعلق بھی دے دینا ضروری معلوم ہوتا ہے میرے نزدیک سامری کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک صفاتی نام ہے جو اب آہستہ آہستہ علَم بن گیا ہے ۔سمر اصل میں کیل ٹھونکنے کو کہتے ہیں ۔اور سامر اس شخص کو کہتے جو کیل ٹھونکتا ہے چنانچہ لغت میں لکھا ہے سمر کے معنے ہوتے ہیں اَوْثَقَهٗ وَشَدَّهٗ بِالْمِسْمَارِ اس نے کسی چیز کے بناتے وقت اس کی مضبوطی کا خاص خیال رکھا۔اور اسے کیلوں سے جڑ دیا پس لوہار ترکھان سنار اور معمار وغیرہ سب سامر کہلائیں گے۔معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل میں آہن گری نجاری معماری اور سنار وغیرہ کا کام کرنے والے کچھ لوگ تھے جن کو اپنے پیشہ کی مناسبت کے لحاظ سے سامرہ کہنے لگ گئے تھے انہی پیشہ وروں میں سے یہ کوئی فتنہ پرداز شخص تھا جس نے توحید کے خلاف ایک خطرناک فتنہ کھڑا کر دیا۔اس تحقیق کے

مطابق سامرہ اس قبیلے کا نام تھا جو یہ کام کرتے تھے اور سامرا سے کہا جاتا تھا جو اس قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اب تو مختلف پیشے مختلف قوموں اور افراد میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اس زمانہ میں چونکہ ابھی میل جول کے ذرائع بہت محدود تھے اور پیشہ وروں کو کام کے حصول میں بہت دقت پیش آتی تھی اس لئے معلوم ہوتا ہے کئی کئی پیشے ایک ہی قوم میں اکٹھے ہوتے تھے گویا یہ ایک پیشہ ور قبیلہ تھا جو لوہار ترکھان سنار اور معمار وغیرہ کا کام جانتے تھے اور انہی کے ایک فرد سے اس فتنہ کی ابتداء ہوئی بلکہ اگر تاریخ کا زیادہ گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہی لوگوں سے خفیہ سوسائٹیاں شروع ہوئی ہیں بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں بھی اسی قوم نے فتنہ اٹھایا تھا اور اس وقت ان کے ایک لیڈر ہیرام نے جو حضرت سلیمانؑ کے تعمیر کردہ معبد کا سب سے بڑا کاریگر تھا آپ کا مقابلہ کیا تھا۔ فری میسنز اپنے آپ کو اسی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی طرح ہماری جماعت میں مستریوں کا فتنہ ایک مشہور فتنہ ہے۔ پس سامری ایک پیشہ ور قبیلہ کا فرد تھا جسے اپنے کام کی مناسبت کے لحاظ سے سامرہ کہا جاتا تھا اور سامری اس کا صفاتی نام تھا مگر آہستہ آہستہ یہی نام اس کا علم کے طور پر مشہور ہو گیا۔

معلوم ہوتا ہے یہودیوں میں یہ قبیلہ دیر تک طاقتور رہا ہے۔ چنانچہ تاریخوں سے پتہ لگتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی مدینہ منورہ میں بنو قریظہ سنار اور لوہار کا ہی کام کرتے تھے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَأْسِيْ ۚ اِنِّيْ

(ہارون نے) کہا اے میری ماں کے بیٹے نہ میری داڑھی (کے بال) پکڑ اور نہ میرے سر کے بال پکڑ میں تو اس

خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ

بات سے ڈر گیا تھا کہ تو یہ نہ کہے کہ تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا اور میری بات کا خیال نہیں رکھا

تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۵﴾

(کہ قوم کی تنظیم قائم رہے۔)

حل لغات۔ ترقب تَرْقُبْ رَقَبَ سے ہے اور رَقَبَهٗ کے معنے ہوتے ہیں اِنْتَظَرَهٗ۔ اس کا انتظار کیا اور جب رَقَبَ الشَّیْءَ کہیں تو معنے ہوں گے حَرَسَهٗ اس کی نگہبانی کی۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس جگہ حضرت ہارون علیہ السلام نے حقیقی عذر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ میں نے ان لوگوں کو روکا تو تھا لیکن زیادہ سختی اس لئے نہیں کی کہ کہیں یہ مقابل پر کھڑے نہ ہو جائیں اور تو یہ الزام نہ دے کہ قوم میں بغاوت پیدا کردی اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا۔ یا تو نے میرے اس حکم کا کہ امن رہے خیال نہیں رکھا رقب کے دونوں معنے ہوتے ہیں رَقَبَ کے معنے اِنْتَظَرَ کے بھی ہوتے ہیں اور رَقَبَ کے معنے حَرَسَ کے بھی ہوتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں اَنَا اَرْقُبُ لَكَ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ آج رات میں تیری نگہبانی کروں گا پس حضرت ہارونؑ کہتے ہیں کہ میں نے صرف اس خیال سے ان پر زیادہ سختی نہیں کی کہ مبادا آپ یہ کہہ دیں کہ تو نے قوم میں تفرقہ پیدا کردیا اور میرے حکم کا انتظار نہیں کیا۔ یا تو نے میرے اس حکم کا کہ امن رکھا جائے خیال نہیں رکھا۔

بعض لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کسی دوسرے نبی کا مطیع نہیں ہوسکتا وہ صرف مطاع ہوتا ہے (محمدیہ پاکٹ بک صفحہ ۱۸۲)۔ حالانکہ یہ تو درست ہے کہ نبی مطاع ہوتا ہے مگر ان لوگوں کا جن کی طرف وہ مبعوث کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اور کسی کا مطیع نہیں ہوتا۔ اس طرح تو کہنا پڑے گا کہ نعوذ باللہ نبی خدا تعالیٰ کا بھی مطیع نہیں ہوسکتا حالانکہ یہ بات بالبداہت باطل ہے انہی آیات کو دیکھ لو۔ حضرت ہارونؑ اپنی قوم کو کہتے ہیں کہ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ تم میری اطاعت اختیار کرو اور میرے حکم کی نافرمانی مت کرو گویا انہوں نے اپنے آپ کو قوم کا مطاع قرار دیا۔ مگر دوسری طرف جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پہاڑ سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے حضرت ہارونؑ سے کہا کہ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ اپنی قوم کے تو مطاع تھے لیکن حضرت موسیٰؑ کے مطیع تھے اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ میں نے صرف اس خیال سے ان لوگوں پر زیادہ سختی نہیں کی کہ کہیں آپ مجھے یہ الزام نہ دیں کہ میں نے آپ کے حکم کا انتظار نہ کیا۔ اور بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کردیا۔ گویا وہ ہر اہم بات میں ان کے حکم کے منتظر رہتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ کہیں موسیٰؑ کی اطاعت میں کوئی فرق نہ آجائے۔ یہ بات بتاتی ہے کہ عوام الناس کا یہ خیال کہ نبی کسی دوسرے نبی کا مطیع نہیں ہوتا قرآن کریم کے رو سے بالکل غلط ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۶﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ

(اس پر موسیٰ سامری سے مخاطب ہوئے اور) کہا۔اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے اس نے کہا میں نے وہ کچھ دیکھا

يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ

جوان لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔اور میں نے اس رسول (یعنی موسیٰ) کی باتوں میں سے کچھ اختیار کرلیں (اور

فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۷﴾ قَالَ فَاذْهَبْ

کچھ اختیار نہ کیں) پھر (جب موقعہ آیا تو) میں نے ان (اختیار کی ہوئی باتوں) کو بھی پھینک دیا اور میرے دل نے

فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَكَ

یہی چیز مجھے اچھی کر کے دکھائی تھی۔(موسیٰ نے) کہا اچھا تو جا تیری اس دنیا میں یہی سزا ہے کہ تو اس (دنیا) میں ہر

مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ

ایک سے یہ کہتا رہے کہ (مجھے) چھوؤ نہیں (یعنی مجھ کو موسیٰ نے گندہ قرار دے دیا ہے) اور (موسیٰ نے سامری سے

عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۸﴾

یہ بھی کہا کہ) تیرے لئے ایک وقت مقرر ہے (یعنی سزا کا) جس کو تو ٹلا نہیں سکے گا۔اور تو اپنے معبود کی طرف دیکھ جس کے سامنے بیٹھ کر تو اس کی پرستش کیا کرتا تھا۔ہم اس کو جلائیں گے اور پھر اس کو سمندر میں پھنک دیں گے۔

حلّ لُغَات۔ اَثَرٌ کے معنے حدیث کے ہیں یعنی بات (اقرب) اور اَلرَّسُوْلُ میں الف لام معہود ذہنی کا ہے یعنی وہ رسول جس کو سب مخاطب لوگ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں یعنی موسیٰ علیہ السلام۔

نَسَفَهٗ کے معنے ہوتے ہیں عَضَّهٗ اس کو کاٹا (اقرب) اور نَسَفَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں غَرْبَلَهٗ (لسان العرب) کسی چیز کو چھلنی سے چھانا۔پس لَنَنْسِفَنَّهٗ کے معنے ہوں گے ہم اس کو کاٹیں گے اور پھر اس کو چھلنی میں چھانیں گے۔

تفسیر۔اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ سامری نے کہا کہ اے موسیٰ تیری قوم تو بے وقوف تھی میں عقلمند تھا میں نے تیرے وہ حالات دیکھے جو تیری قوم نے نہیں دیکھے۔یعنی وہ تو اندھا دھند تجھے نبی مان رہی تھی میں نہیں مان

رہا تھا۔ سو میں نے تیری باتوں میں سے کچھ اختیار کر لیں اور کچھ پر ایمان نہ لایا اور جس باتوں پر میں ایمان لایا وہ بھی اس لئے تا کہ تیری قوم دھوکا میں آکر مجھے اپنا لیڈر بنالے۔ اس کے بعد جب میں نے مصلحت اس کے خلاف دیکھی اور تیرے پہاڑ پر جانے کے بعد تیری قوم کو میں نے ڈگمگاتے پایا تو وہ تعلیم جو پہلے میں نے اختیار کر لی تھی اسے میں نے پھینک دیا اور جس طرح پہلے تجھ پر ایمان لانا میرے نفس نے پسند کیا تھا اب اس نے مجھے یہ صلاح دی کہ اسے چھوڑ دوں کیونکہ جب میں نے دیکھا کہ تیری قوم شرک کی طرف جھکی ہوئی ہے تو ایک بچھڑا بنا کر ان کے آگے پیش کر دیا تا کہ وہ مجھے اپنا لیڈر بنالیں۔ یہ سب باتیں سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تو نے قوم میں عزت حاصل کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا تھا۔ اب تیری سزا یہی ہے کہ تجھے قوم میں ذلیل کیا جائے۔ پس جب تک تو زندہ رہے تیرا فرض ہے کہ جب بھی بنی اسرائیل کے پاس سے گذرے تو کہتا جائے مجھے کوئی نہ چھوئے کیونکہ موسیٰ نے مجھ سے تعلق رکھنے سے منع کر دیا ہے مگر یہ سزا بہرحال دنیوی ہے۔ تیرے لئے ایک اور سزا بھی مقرر ہے جو ضرور پوری ہو کر رہے گی۔

لوگ کہتے ہیں کہ اپنی قوم کے نظام کے لئے بھی کسی سے کلام کرنے کو روکنا جائز نہیں۔ حالانکہ اگر اپنی قوم کا نظام قائم رکھنے کے لئے کسی سے کلام کرنے کو روکنا جائز نہیں تو سب سے پہلے مجرم حضرت موسیٰؑ ہیں جنہوں نے سامری کو حکم دے دیا کہ تو جب بھی بنی اسرائیل کے پاس سے گذرے تو یہ کہا کر کہ موسیٰ کے حکم کے مطابق میرے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قومی نظام کے مطابق قطع تعلقی ایمان کے مظاہرہ کا نام ہے۔ اور اسے مقاطعہ نہیں کہا جا سکتا اگر یہ مقاطعہ ہے تو چاہیے کہ ہر مسلمان اپنے بچوں کو پنڈتوں کے پاس پڑھنے کے لئے بھیجا کرے تا کہ وہ وید کی باتیں سیکھیں یا عیسائی پادریوں کے پاس بھیجا کرے تا کہ وہ ان سے انجیل کی باتیں سیکھیں۔ سارے پاکستان اور مصر میں شور مچا ہوا ہے کہ عیسائی سکولوں میں استادوں کو انجیل پڑھانے کی اجازت نہ ہو۔ ورنہ ایسے سکولوں میں مسلمان بچوں کو داخل کرنے سے منع کر دیا جائے۔ اگر جوش ایمان کے ماتحت ان لوگوں سے جو ظاہر میں قوم کے ساتھ شامل ہو کر فریب کرتے ہیں کسی قوم کا اپنی مرضی سے انقطاع کرنا ناجائز ہے تو پھر تو کوئی قوم اپنے ایمان کی حفاظت کر ہی نہیں سکتی اگر کسی کے باپ کو کوئی گالی دیتا ہے تو وہ اس سے کلام نہیں کرتا۔ کیا اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ مقاطعہ کر رہا ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ غیرت کا ثبوت دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گروہ میں شامل ہو کر اس گروہ کے عقاید کے خلاف آہستہ آہستہ اس کے نوجوانوں کو ورغلائے اور والدین اپنے بچوں کو اس سے ملنے سے روکیں تو یہ بھی

بائیکاٹ نہیں غیرت ایمانی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے کہا کہ انقطاع تعلق کے علاوہ اس دنیا میں تجھے یہ روحانی سزا بھی ملے گی کہ جس معبود کی تو پوجا کرتا تھا ہم اس کو جلا دیں گے اور اس کی راکھ کو دریا میں پھینک دیں گے تا کہ تجھ پر یہ بات کھل جائے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اس جگہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ بت تو سونے کا تھا اس کو جلا کر اس کی راکھ سمندر میں پھینکنا ایک بے معنے بات ہے۔ سونا جل کر راکھ نہیں ہوا کرتا اور اگر کشتہ بنا کر اس کو راکھ کی طرح بھی کر دیتے ہیں تب بھی اس میں بہت سی دوائیں پڑتی ہیں اسی وجہ سے لوگ دو تین تولہ سونے کا کشتہ بناتے ہیں لیکن یہ سونا فرعون کے دارالخلافہ کے امراء کا سونا تھا اس کا کشتہ بنانا آسان کام نہیں تھا۔ عیسائی جو کہ یہودیت کے قائم مقام ہیں اور جن کی کتابوں میں ابتداءً یہ باتیں درج ہیں وہی یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں لغو قصے درج ہیں (ینابیع الاسلام فصل سوم صفحہ ۴) حالانکہ قرآن کریم نے ان کی کتابوں کا لکھا ہوا واقعہ درج کیا ہے اور اس صورت میں درج کیا ہے کہ وہ معقول ہو گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آواز نکالنے کے لئے لکڑی کو استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں آسانی کے ساتھ انسانی گلے کے مشابہ پردے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ جیسے مرلی میں۔ پس قرآن نے صرف اس طرف اشارہ کیا ہے کہ بت میں سے اس نے کس طرح آواز پیدا کر لی یعنی اس کے منہ کی طرف اس نے کچھ لکڑی استعمال کی جس میں مرلی کی طرح کے پردے بنائے جب ہوا اس میں سے نکلتی تو آواز پیدا ہوتی جب بت کو آگ میں ڈالا گیا۔ تو سونا تو پگھلا مگر لکڑی جل کر راکھ ہو گئی جس راکھ کو بت سمیت اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا گیا۔ لیکن چونکہ نسف کے معنے کاٹنے کے بھی ہیں اور دھاتوں کو ریتی کے ساتھ رگڑ کر کاٹا جاتا ہے اور اسی طرح نسف کے معنی چھلنی میں ڈال کر چھاننے کے بھی ہیں اس لئے اس آیت کا یہ مفہوم بھی ہے کہ ہم پہلے تو اس بت کو ریتی کے ذریعہ سے رگڑ کر اس کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔ پھر لکڑی کی راکھ سمیت اس کو چھلنی میں ڈالیں گے اور اس کے بعد راکھ اور باریک ذرات تو سمندر میں پھینک دیں گے اور سونے کے ریزے جو اب بت کی شکل میں نہیں رہے اور جن سے شرک پیدا نہیں ہو سکتا ان کو قومی ضرورت کے لئے استعمال کر لیں گے کیونکہ ہماری غرض صرف خدا کی واحدانیت ثابت کرنا ہے۔

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ

تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ وہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے۔

عِلْمًا ﴿۹۹﴾ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ

اسی طرح ہم تیرے سامنے پہلے لوگوں کی خبریں بیان کرتے ہیں۔ اور ہم نے تجھے اپنے پاس سے

وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۱۰۰﴾ ۚۖ

ذکر (یعنی قرآن) عطا فرمایا ہے۔

تفسیر۔ اس آیت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس واقعہ کی جو تفصیل ہم نے بیان کی ہے وہ صحیح ہے اور جو تفصیل اسرئیلی روایات میں آتی ہے وہ جھوٹی ہے کیونکہ قرآن کو خدا نے نازل کیا ہے اور خدا تعالیٰ ہی ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ واقعہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے مسلمان مفسرین نے اسرائیلی روایات کے مطابق یوں بیان کیا ہے کہ ''الرسول'' سے مراد موسیٰؑ نہیں تھے بلکہ جبرائیل تھے۔ اور ''اثر'' سے مراد ''بات'' نہیں تھی جیسا کہ لغت میں لکھا ہے بلکہ قدموں کے نشان تھے (الدر منثور زیر آیت طٰہٰ ۸۳ تا ۸۹) اور سامری نے یہ کہا تھا کہ جب جبرائیل ترے پاس آیا کرتا تھا تو تیری قوم کو تو وہ نظر نہیں آتا تھا لیکن مجھے نظر آتا تھا۔ میں نے ایک دن جبرائیل کے پاؤں تلے کی مٹی اٹھالی پھر جب بچھڑا بنایا تو سونا پگھلا کر اس میں وہ مٹی ڈال دی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بچھڑا بولنے لگ گیا۔

یہ قصہ بالبداہت باطل اور غلط ہے اول تو یہ کہ اگر یہ صحیح ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ اس طرح ہم تجھے پرانی باتیں بتاتے ہیں اور تجھے اپنے پاس سے حقیقت کی تفصیل عطا کرتے ہیں پھر تو ساری کی ساری حقیقت پرانی کتابوں میں موجود تھی۔ کسی ایسے دعویٰ کی کیا ضرورت تھی دوسرے اس بات کے ماننے کے لئے ہمارے مفسرین جیسے سادہ لوح آدمی چاہئیں کہ موسیٰؑ کے اعلیٰ درجہ کے متبعین نے تو جبرائیل کو نہ دیکھا لیکن سامری جو کافر ہی تھا اس نے دیکھ لیا۔

پھر اس بات کو ماننا بھی بڑی سادگی کی بات ہے کہ جبرائیل کے پاؤں کی مٹی ڈالنے سے سونے کا بچھڑا بولنے لگ گیا۔ حالانکہ معمولی سنار بھی جانتے ہیں کہ اگر خول دار بت بنایا جائے اور اس کے منہ کی طرف ایک سوراخ کیا جائے اور اس میں مرلی کی طرح لکڑی کے پردے بنا دئے جائیں اور ایک سوراخ اس کی پیٹھ کی طرف کیا جائے

تو جب پیٹھ کی طرف سے ہوا آئے گی تو منہ میں سے آواز نکلے گی۔ جیسا کہ مرلی اور سیٹیوں میں ہوتا ہے۔ پس واقعہ وہی صحیح ہے جو ہم نے لکھا ہے اور قرآن کے الفاظ کے مطابق ہے مفسرین کو یہ غلطی لگی ہے کہ ایک تو انہوں نے اسرائیلی روایتوں کو سچ سمجھ لیا۔ دوسرے انہوں نے لغت پر غور نہیں کیا۔ اگر وہ لغت پر غور کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اثر کے معنے بات کے بھی ہیں اور الرسول کے معنے لغت کے مطابق معلوم رسول کے بھی ہیں نہ کہ جبرائیل کے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۱﴾

جو اس سے منہ پھیرے گا وہ قیامت کے دن ایک بہت بڑا بوجھ اٹھائے گا ایسے لوگ اس حالت میں

خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۲﴾ يَّوْمَ

بڑی دیر تک رہیں گے اور قیامت کے دن یہ بوجھ اور بھی تکلیف دہ ہوگا۔ جس دن کہ بگل میں پھونکا جائے گا

يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۳﴾

اور اس دن مجرموں کو ہم اس حالت میں اٹھائیں گے کہ ان کی آنکھیں نیلی ہونگی وہ آپس میں

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۴﴾

آہستہ آہستہ باتیں کرینگے کہ تم تو صرف دس (صدیاں اس دنیا میں حاکم) رہے ہو۔

تفسیر۔ یوم القیامۃ قرآن و حدیث سے دو ثابت ہوتے ہیں ایک مرنے کا دن جس کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (مجمع الانوار جلد ۳ صفحہ ۱۸۳) یعنی جو شخص مر گیا اس کی قیامت کا دن آ گیا اور ایک قیامت کا دن وہ ہوگا جس دن سب اگلے پچھلے لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔

اس آیت میں جو پہلا یوم القیامۃ آیا ہے اس سے مراد انسانی موت کا دن ہے اور جو دوسرا یوم القیامۃ آیا ہے اس سے مراد تمام قوموں کے زندہ ہو کر اٹھائے جانے کا دن ہے جب مشرکین کے انجام کا ساری قوموں کو پتہ لگ جائے گا اور سب قومیں شرک سے نفرت کرنے لگ جائیں گی۔

یہ موجودہ زمانہ کے متعلق خبر ہے کہ اس میں ہر مشرک قوم دعویٰ کرنے لگ گئی ہے کہ درحقیقت وہ موحد ہے۔ کیا ہندو اور کیا عیسائی سب کہنے لگ گئے ہیں کہ ہم تو ایک خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارے متعلق لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔

فرماتا ہے یہ پیشگوئی اس وقت پوری ہوگی جب تمام اقوام میں بیداری پیدا ہو جائے گی۔ اور مشرک لوگ خصوصیت کے ساتھ نیلی آنکھوں کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے مطلب یہ کہ اس دن شرک زیادہ تر نیلی آنکھوں والی قوموں میں ہوگا یعنی یوروپین اور امریکن لوگوں میں سے اور گو وہ پہلے اپنی طاقت کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں گے کہ ہم ہمیشہ دنیا پر حکومت کریں گے لیکن اس دن ان میں یہ کانا پھوسی شروع ہو جائے گی کہ تمہاری عمر تو صرف دس تھی یعنی دس صدیاں مراد یہ ہے کہ تمہاری ترقی کا زمانہ صرف ایک ہزار سال تھا۔ تم اسی پر اترا گئے اور خدا تعالیٰ کی توحید کو بھول گئے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ

ہم خوب جانتے ہیں اس کو جو وہ کہیں گے جب ان میں سے سب سے زیادہ ان کے مذہب پر چلنے والا کہے گا۔

لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۵﴾ ع

کہ تم ایک تھوڑی سی مدت ٹھہرے ہو۔

تفسیر۔ فرماتا ہے نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ہم ان کی باتوں کو خوب جانتے ہیں جس وقت ان میں سے سب سے بڑا لیڈر یہ کہے گا کہ اگر حقیقت دیکھی جائے تو تم نے بہت تھوڑا عرصہ اس دنیا میں بادشاہت کی ہے۔

لفظی طور پر تو اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ تم نے ایک دن بادشاہت کی ہے لیکن یوم کے معنے چونکہ عربی زبان میں وقت کے بھی ہوتے ہیں اور یوم کے متعلق قرآن کریم میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج:۴۸) خدا کا ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے اور اس سے پہلے یہ بھی فرمایا ہے کہ تم ''دس'' رہے ہو اور دس سے مراد دس صدیاں بھی ہو سکتی ہیں جو ہزار سال کے برابر بنتی ہیں اس لئے اِلَّا يَوْمًا کے بھی دو معنے ہو سکتے ہیں کہ تم ''یوم'' خداوندی رہے ہو یعنی دس صدیاں اور یہ بھی کہ جب آخر میں سزا مل گئی تو عیش کا زمانہ بہت چھوٹا ہو گیا۔ اور یہی کہنا ٹھیک ہے کہ تم نے بہت تھوڑی دیر دنیا میں ترقی حاصل کی اور آخر میں تم کو ہلاک کر دیا گیا۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۶﴾

اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں تو کہہ دے کہ ان کو میرا رب اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ اور ان

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۷﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ

کو ایک ایسے چٹیل میدان کی صورت میں چھوڑ دے گا کہ نہ تو تو اس میں کوئی موڑ دیکھے گا اور نہ کوئی اونچائی

اَمْتًا ﴿۱۰۸﴾ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ

اس دن لوگ پکارنے والے کے پیچھے چل پڑیں گے جس کی تعلیم میں کوئی کجی نہ ہوگی اور رحمٰن (خدا کی آواز)

خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۹﴾

کے مقابلہ میں (انسانوں کی) آوازیں دب جائیں گی۔ پس تو سوائے کھسر پسر کے کچھ نہ سنے گا اس دن شفاعت

يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ

سوائے اس کے جس کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت رحمٰن (خدا) دے گا اور جس کے حق میں بات

رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۱۰﴾

کہنے کو وہ پسند کرے گا کسی کو نفع نہ دے گی۔

حلّ لُغات۔ يَنْسِفُ نَسَفَ سے مضارع کا صیغہ ہے اور نَسَفَ کے معنے ہوتے ہیں قَلَعَهٗ مِنْ أَصْلِهٖ جڑھ سے اکھیڑ دیا۔ (اقرب) چنانچہ کہتے ہیں نَسَفَ الرِّيْحُ الشَّيْءَ یعنی ہوا نے چیزوں کو جڑوں سے اکھیڑ دیا۔

الجبل کے معنے ہوتے ہیں كُلُّ وَتِدٍ لِلْاَرْضِ، عَظُمَ وَطَالَ۔ پہاڑ سَيِّدُ الْقَوْمِ وَعَالِمُهُمْ۔ قوم کا سردار اور عالم۔ (اقرب)

الاَمْتُ کے معنے ہیں اَلْمَكَانُ الْمُرْتَفِعُ بلند مکان۔ (اقرب)

هَمْسٌ کے معنے ہیں اَلصَّوْتُ الْخَفِيُّ۔ بالکل نیچی آواز۔ (اقرب)

تفسیر۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب نیلی آنکھوں والے یعنی یوروپین لوگ یہ

پیشگوئی پڑھیں گے تو کہیں گے کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ عیسائی حکومتیں تباہ ہو جائیں گی۔لیکن اگر یہ صحیح ہے تو ہمارے ڈیوک اور ایمپرر اور کنگ کہاں جائیں گے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس تباہی کے آنے سے پہلے ہی ان کو ختم کر دیا جائے گا۔اور تمام ملکوں میں ڈیما کرسی قائم ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ لوگ قرآن لانے والے کی آواز سننے لگ جائیں گے جس کی تعلیم میں کوئی کجی نہیں۔اور رحمن خدا کی آواز بلند ہونے لگ جائے گی اور شرک کی آواز دھیمی پڑنے لگ جائے گی اور یا تو ترقی کے لیئے عیسائی ہونا بڑی سفارش سمجھا جاتا تھا اور یا اس زمانہ میں ترقی کے لئے مسلمان ہونا سفارش سمجھا جائے گا۔

مسلمان ہونے کا نتیجہ ہم نے اس بات سے نکالا ہے کہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ شفاعت اسی کو فائدہ دے گی جس کے لئے رحمن خدا اجازت دے گا۔اور جس کے متعلق بات کہنے پر وہ راضی ہوگا اور قرآن کریم میں مسلمانوں کے متعلق آتا ہے کہ ''رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ '' (المجادلة:۲۳) کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔پس وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا میں مسلمانوں کا ذکر ہے کہ اس وقت مسلمان ہونا ہی ترقی کا سب سے بڑا معیار سمجھا جائے گا۔

یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ

وہ جو کچھ ان کے آگے آنے والا ہے اس کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گذر چکا ہے اس کو بھی جانتا ہے اور

عِلۡمًا ﴿۱۱۱﴾

وہ اپنے علم کے ذریعہ سے اس (یعنی خدا) کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

تفسیر ۔اس جگہ دعویٰ کی گیا ہے کہ یہ پیشگوئی ضرور پوری ہو کر رہے گی کیونکہ یہ خدائے علیم کی طرف سے ہے۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ

اور (اس دن) زندہ اور قائم رہنے اور قائم رکھنے والے (خدا) کے سامنے سب بڑے لوگ (ادب سے) جھک

ظُلْمًا ﴿۱۱۲﴾

جائیں گے۔ اور جو ظلم کرے گا وہ ناکام رہے گا۔

حلّ لُغَات۔ وَجْهٌ کے معنے ہوتے ہیں سَيِّدُ الْقَوْمِ۔ قوم کا سردار (اقرب)

الْقَيُّوْمُ کے معنے ہوتے ہیں اَلْقَائِمُ الْحَافِظُ لِكُلِّ شَيْءٍ وَ الْمُعْطِي لَهٗ مَا بِهٖ قِوَامُهٗ (مفردات) یعنی ایسا وجود جو خود قائم ہے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے۔ (مفردات)

تفسیر۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ آخر وہ وقت آجائے گا جبکہ سب بڑے بڑے لوگ اور قومیں اور حکومتیں خدا تعالیٰ کے سچے دین کے سامنے جھک جائیں گی اور اسلام میں داخل ہو جائیں گی۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ

اور جس نے وقت کی ضرورت کے مطابق عمل کئے ہوں گے اور وہ مومن بھی ہوگا وہ نہ تو کسی قسم کے ظلم سے ڈرے گا

ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۳﴾

اور نہ کسی قسم کی حق تلفی سے

حل لغات۔ هَضْمٌ هَضَمَ کا مصدر ہے۔ اور هَضَمَ الشَّيْءَ کے معنے ہوتے ہیں كَسَرَهٗ اس کو توڑ دیا اور هَضَمَ فُلَانًا کے معنے ہوتے ہیں ظَلَمَهٗ وَغَصَبَهٗ اس پر ظلم کیا اور اس کی اشیاء اور جائیداد پر قبضہ کر لیا۔

تفسیر۔ فرماتا ہے۔ اس زمانہ کے آنے سے پہلے وہ زمانہ تھا کہ مسلمان ظلم اور حق تلفی سے ڈرتے تھے مگر پھر وہ زمانہ آجائے گا جبکہ خود عیسائی بھی مسلمان ہو جائیں گے اور مسلمان ظلم اور حق تلفی سے محفوظ ہو جائیں گے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ

اور اسی طرح ہم نے اس (کتاب) کو عربی زبان کے قرآن کی صورت میں اتارا ہے اور اس میں ہر قسم کے انذار

الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۴﴾

کو کھول کھول کر بیان کیا ہے تا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں یا (یہ قرآن) ان کے لئے (خدا کی) یاد کا سامان (نئے سرے) سے پیدا کرے۔

تفسیر ۔عیسائیوں کے اسلام لانے کی یہ ترکیب کی گئی ہے کہ قرآن کو ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے کہ ہر غیر متعصب اس کو سمجھ سکتا ہے پس جب عیسائیوں کی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ اس کو ماننے لگ جائیں گے۔ اور جو ضدی ہوں گے وہ اگر عقل سے نہیں مانیں گے تو عذابوں سے گھبرا کر مان لیں گے۔ یا قسم قسم کے عذابوں سے تباہ کر دیئے جائیں گے اور قرآن کریم خدا کی یاد پیدا کرنے کے لئے نئے نئے مضامین عیسائیوں کے سامنے رکھے گا جو ان کی ہدایت کا موجب ہوں گے۔ اور ان کے دلوں میں نیکی کا مادہ پیدا کر دیں گے۔

اس آیت میں قرآن کا لفظ استعمال فرما کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ کتاب کثرت سے پڑھی جائے گی اور عربیاً کہہ کر یہ بتایا ہے کہ اس کے مفہوم کا سمجھنا بھی آسان ہوگا کیونکہ یہ ہر بات دلیل کے ساتھ بیان کرے گی۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ

پس اللہ (تعالیٰ) جو بادشاہ ہے بڑی شان والا ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اور تو قرآن کی وحی اترنے سے پہلے

قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ

اس کے بارے میں جلدی سے کام نہ لے اور (مجملاً) یہ کہتا رہ کہ اے میرے رب میرے علم کو بڑھا اور

عِلْمًا ﴿۱۱۵﴾ وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ

ہم نے اس سے پہلے آدم کو (ایک امر کی) تاکید کی تھی مگر وہ بھول گیا۔ اور ہم نے خوب جانچ لیا کہ اس کے دل

نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿١١٦﴾

ع ۱۱-۱۵

میں ہمارا حکم توڑنے کے متعلق کوئی پختہ ارادہ نہیں تھا۔

تفسیر ۔اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان بہت سے امور میں اپنی عقل استعمال کرے لیکن وہ شخص جو اس حکمت کو نہیں سمجھتا وہ چاہتا ہے کہ جھٹ خدا کی وحی نازل ہو کر تمام تفصیلات بیان کر دے اور مجھے سوچنا نہ پڑے ۔فرماتا ہے یہ ٹھیک نہیں وحی جب مکمل ہو جائے گی تو جتنی ضروری باتیں ہیں اس میں بیان ہو جائیں گی ۔اور جن باتوں کے متعلق خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان خود سوچ کر فیصلہ کرے وہ اس میں بیان نہیں ہوں گی ان باتوں کے متعلق ہدایت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان مجملاً یہ دعا کرتا رہے کہ الٰہی جن جن شخصی یا قومی کاموں کے لئے مجھے ہدایت کی ضرورت ہو تو میرے دل پر ان کے متعلق روشنی نازل کر دیا کر۔تا کہ میں اور میری قوم گمراہ نہ ہوں اور میرے علم کو ہمیشہ بڑھاتا رہ۔

دنیا میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بچپن سیکھنے کا زمانہ ہوتا ہے جوانی عمل کا زمانہ ہوتا ہے اور بڑھاپا عقل کا زمانہ ہوتا ہے لیکن قرآن کریم کی رو سے ایک حقیقی مومن ان ساری چیزوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے اس کا بڑھاپا اسے قوت عمل اور علم کی تحصیل سے محروم نہیں کرتا اس کی جوانی اس کی سوچ کو ناکارہ نہیں کر دیتی بلکہ جس طرح بچپن میں جب وہ ذرا بھی بولنے کے قابل ہوتا ہے ہر بات کو سن کر اس پر فوراً جرح شروع کر دیتا ہے اور پوچھتا ہے کہ فلاں بات کیوں ہے اور کس لئے ہے۔اور اس میں علم سیکھنے کی خواہش انتہا درجہ کی موجود ہوتی ہے اسی طرح اس کا بڑھاپا بھی علوم سیکھنے میں لگا رہتا ہے اور وہ کبھی بھی اپنے آپ کو علم کی تحصیل سے مستغنی نہیں سمجھتا۔اس کی موٹی مثال ہمیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات میں ملتی ہے آپ کو پچپن چھپن سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ الہاماً فرماتا ہے کہ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔یعنی اے محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے ساتھ ہمارا سلوک ایسا ہی ہے جیسے ماں کا اپنے بچہ کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے بڑی عمر میں جہاں دوسرے لوگ بے کار ہو جاتے ہیں اور زائد علوم اور معارف حاصل کرنے کی خواہش ان کے دلوں سے مٹ جاتی ہے اور ان کو یہ کہنے کی عادت ہو جاتی ہے کہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے تجھے ہماری ہدایت یہ ہے کہ تو ہمیشہ خدا تعالیٰ سے دعا کرتا رہ کہ خدایا میرا علم اور بڑھا۔میرا علم اور بڑھا۔ پس مومن اپنی زندگی کے کسی مرحلہ میں بھی علم سیکھنے سے غافل نہیں ہوتا بلکہ اس میں وہ ایک لذت اور سرور محسوس کرتا ہے۔اس کے مقابلہ میں جب انسان پر ایسا دور آجاتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ میں نے جو کچھ سیکھنا تھا سیکھ لیا

ہے اگر میں کسی امر کے متعلق سوال کروں گا تو لوگ کہیں گے کیسا جاہل ہے اسے ابھی تک فلاں بات کا بھی پتا نہیں۔ تو وہ علم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ دیکھ لو حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑی عمر کے آدمی تھے مگر پھر بھی کہتے ہیں رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (البقرۃ:۲۶۱) دنیا کے لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ احیاءِ موتیٰ پر کبھی غور ہی نہیں کرتے نہ انسانی زندگی انہیں اعجوبہ معلوم ہوتی ہے۔ نہ حیوانی زندگی انہیں اعجوبہ معلوم ہوتی ہے۔ ہزاروں سال سے زندگی کا دور چلا آ رہا ہے مگر انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ انسان کی زندگی کس طرح شروع ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں صرف ڈارون کی ایک مثال ہے جس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ زندگی کس طرح ظاہر ہوئی ہے اور وہ کیا کیا مدارج ہیں جن میں سے انسان گذرا ہے اس کی تحقیق غلط تھی یا صحیح بہرحال اس کے دل میں خیال پیدا ہوا اور اس کے بعد ساری دنیا میں ایک رو چل گئی کہ دیکھیں دنیا کس طرح پیدا ہوئی ہے؟ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی (البقرۃ:۲۶۱) گویا وہی خیال جو دنیوی اور مادی لوگوں کے دلوں میں ڈارون کے زمانہ میں پیدا ہوا آج سے ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں بھی پیدا ہوا اور انہوں نے کہا اے میرے رب یہ بے جان مادہ کس طرح زندہ ہو جایا کرتا ہے؟ ڈارون نے تو مادی احیاء کے متعلق جستجو کی تھی مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مادی زندگی سے کوئی غرض نہیں تھی انہیں روح کی زندگی مطلوب تھی اور انہوں نے چاہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے یہ پتہ لگاؤں کہ ارواح کس طرح زندہ ہوا کرتی ہیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ابراہیم تو تو پچاس ساٹھ سال کا ہو چکا ہے۔ اب یہ بچوں کی سی باتیں چھوڑ دے۔ بلکہ اس نے بتایا کہ ارواح کس طرح زندہ ہوا کرتی ہیں۔ پس ہر عمر میں علم سیکھنے کی تڑپ اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے۔ اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ الٰہی میرا علم بڑھا۔ کیونکہ جب تک انسانی قلب میں علوم حاصل کرنے کی ہر وقت پیاس نہ ہو اس وقت تک وہ کبھی ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔

پھر آدم کی مثال دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ تم نسل آدم میں سے ہو۔ آدم تم سے بڑا تھا چھوٹا نہ تھا۔ وہ تمہارا باپ تھا اور مامور من اللہ تھا۔ اور اپنے دل میں خدا تعالیٰ کی اطاعت کا جوش رکھتا تھا جب ہم نے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اس پر احکام نازل کئے تو گو وہ دل سے خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری کا ارادہ کر چکا تھا مگر پھر بھی بعض باتوں کو وہ بھول گیا یعنی ان کے بارہ میں اس سے غفلت ظاہر ہوئی تو تم جو آدم کے بیٹے ہو اور اس سے چھوٹے درجہ کے ہو کیوں ہر معاملہ میں خدا تعالیٰ کے یقینی احکام مانگتے ہو۔ جو احکام آجائیں ان پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ اور جو نہ آئیں ان پر خود غور کرو اور خدا تعالیٰ کی مدد مانگتے رہو۔ اور اس سے ہمیشہ یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ جو سچا علم ہے اور ہمارے لئے

مفید ہے وہ ہم کو عطا کرتا کہ ہم اس کی روشنی میں ہدایت کے راستہ پر گامزن ہوسکیں۔

اس آیت میں لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا کے الفاظ بتاتے ہیں کہ آدم سے صرف ایک اجتہادی غلطی ہوئی تھی جس میں اس کے عزم اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن کریم نے سورۂ اعراف میں بتایا ہے کہ جب شیطان اخلاص کا جبہ پہن کر آدم کے پاس گیا تو قَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ (الاعراف:۲۲) وہ آدم اور اس کے ساتھیوں کے سامنے قسمیں کھا کھا کر کہنے لگا کہ میں تو آپ لوگوں کا بڑا خیر خواہ ہوں۔ گویا ظاہری مخالفت کو چھوڑ کر وہ منافقانہ رنگ میں آدم کی جماعت کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اور اس نے اپنے اخلاص کا انہیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا جیسا کہ سورۂ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے منافقوں کا یہی طرق بتایا ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ خدتعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ درست تو ہے کہ تو اللہ کا رسول ہے مگر خدا تعالیٰ اس بات پر بھی گواہ ہے کہ یہ منافق اپنی قسموں میں بالکل جھوٹے ہیں۔ اس لئے ان منافقوں سے ہمیشہ بچتے رہو۔ یہی طریق زمانہ آدم کے منافقین کے سردار نے اختیار کیا۔ اور آدم کو اپنے اخلاص اور فدائیت کا یقین دلایا اس پر آدم نے یہ اجتہاد کیا کہ گو یہ شخص پہلے ابلیسی روح اپنے اندر رکھتا تھا مگر اب تو یہ مخالفت کا راستہ ترک کر چکا ہے اس لئے اب اس سے تعلق رکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔

چنانچہ اس اجتہادی غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس حالت امن میں وہ رہتے تھے اس سے انہیں نکلنا پڑا اَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا میں ان کی اسی اجتہادی غلطی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شیطان نے آدم کو بغیر اس کے کہ اس کا اپنا ارادہ ہوتا پھسلا دیا۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ

اور (یہ بھی یاد کرو کہ) جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم (کی پیدائش کے شکریہ میں خدا کو) سجدہ کرو۔

اَبٰى ﴿۱۱۷﴾

تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر دیا۔ اس نے انکار کیا۔

تفسیر۔ بعض لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ سجدہ کا حکم تو ملائکہ کو دیا گیا تھا۔ اگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تو اس کا قصور کیا ہوا؟ اس سوال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بالکل حل کر دیتی ہے آپ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو وہ جبریل کو کہتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس

سے محبت کر۔ چنانچہ وہ اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔ پھر جبریل آسمان والوں میں منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس پر تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْاَرْضِ اس بندے کے لئے زمین میں بھی قبولیت پھیلادی جاتی ہے (بخاری جلد ۲ کتاب بدءالخلق باب ذکر الملائکۃ) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبین سے محبت کرنے کا حکم فرشتوں کو دیتا ہے اور پھر وہ اس حکم کو دنیا میں جاری کر دیتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم فرشتوں سے مخصوص نہیں ہوتا بلکہ اہل زمین بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اس حکم کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ سوائے ابلیس کے اور سب نے میرے حکم کی اطاعت کی اور وہ آدم کی تائید میں مشغول ہو گئے۔

اس تشریح سے قرآن کریم کی وہ آیت بھی حل ہو جاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ ابلیس سے فرماتا ہے کہ۔ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: ۱۳) کہ باوجود اس کے کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ تو آدم کی فرمانبرداری کر۔ پھر تجھے میرے اس حکم کی اطاعت سے کس چیز نے روکا؟ اس جگہ بھی امر لمۂ ملکی کا ہی نام رکھا گیا ہے۔ ورنہ یہ مراد نہیں کہ ابلیس کو کوئی علیحدہ حکم دیا گیا تھا۔

فَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا

اس پر ہم نے آدم سے کہا۔ اے آدم یہ (ابلیس) یقیناً تیرا اور تیرے ساتھیوں کا دشمن ہے پس تم دونوں (گروہوں)

مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۸﴾ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا

کو یہ جنت سے نہ نکال دے کہ اس کے نتیجہ میں تو (اور تیرا ہر ساتھی) مصیبت میں پڑ جائے۔ یقیناً اس (جنت) میں

تَعْرٰى ﴿۱۱۹﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۲۰﴾

تیرے لئے یہ (مقدر) ہے کہ تو بھوکا نہ رہے (اور نہ تیرے ساتھی) اور تو ننگا نہ رہے اور نہ تو پیاسا رہے۔ اور نہ دھوپ

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى

میں جلے اس پر شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا (اور کہا) اے آدم کیا میں تجھے ایک ایسے درخت کا پتہ

شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۱﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ

دوں جو سدا بہار ہے۔ اور ایسی بادشاہی (کا پتہ دوں) جو کبھی فنا نہ ہوگی۔ پس ان دونوں نے (یعنی آدم اور اس کے

لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ

ساتھیوں نے) اس درخت میں سے کچھ کھایا (یعنی اس کا مزہ چکھا) جس پر ان دونوں کی کمزوریاں ان پر کھل گئیں

الْجَنَّةِ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ

اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کی زینت کے سامان (یعنی اعمال نیک) لپیٹنے لگ گئے۔ اور آدم نے اپنے رب کی

فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴿۱۲۳﴾

نافرمانی کی پس وہ صحیح راستہ سے بھٹک گیا۔ اس کے بعد اس کے رب نے اس کو چن لیا اور اس پر رحم کی نظر ڈالی اور اسے صحیح طریق کار بتایا۔

تفسیر ۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ ہم نے آدم کو جنت میں رکھا تو شیطان ان کا مد مقابل بن کر کھڑا ہو گیا اس پر اللہ تعالیٰ نے آدم سے فرمایا کہ اے آدم! یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری بیوی یا تیرے ساتھیوں کا بھی دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں جنت سے نکال دے اور تم تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ۔ تیرے لئے خدا تعالیٰ کا یہی فیصلہ ہے کہ تو اس جنت میں نہ بھوکا رہے نہ ننگا نہ پیاسا رہے اور نہ گرمی کی تکلیف تجھے ستائے۔ اگر تو نے اس کی بات مانی تو یہ جنتی گھر جو مومن کے لئے مقرر ہے اس میں سے وہ تجھے نکال دے گا۔ یعنی اس کی بات ماننے سے تو جنت سے محروم رہ جائے گا۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ اس وقت اس جنت میں تھے جس کا موت کے بعد مومنوں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اگلی آیات اس امر کو بالکل واضح کر دیتی ہیں۔ کیونکہ شیطان بھی آدم سے جنت کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر وہ اس وقت جنت میں تھے تو اس وعدہ سے دھوکا کیونکر کھا سکتے تھے؟ صاف ظاہر ہے کہ شیطان کے قول سے انہوں نے یہی دھوکا کھایا کہ یہ ہمارے مقصد میں مد ہے۔ پس اس جگہ جنت سے اخروی جنت مراد نہیں بلکہ دنیوی جنت مراد ہے۔ اور یہ جو بعض دوسرے مقامات پر آتا ہے کہ انہیں جنت میں رکھا گیا تو درحقیقت اس سے مراد بھی دنیوی جنت ہے جو اخروی جنت کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور جس کے ملے بغیر انسان کو اخروی جنت بھی

نہیں مل سکتی۔

بہر حال جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہا۔ کہ شیطان تمہارا دشمن ہے تو شیطان نے اپنا بھیس بدلا اور اس نے آدم کے پاس آ کر کہا۔ کہ کیا میں آپ کو ایک ایسے درخت کا پتہ دوں جس کا پھل کھانے سے آپ کو دائمی حیات مل سکتی ہے اور ایسی حکومت کا آپ کو پتہ دوں جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔ جب اس طرح کی چکنی چپڑی باتیں اس نے کیں تو آدم کو دھوکا لگ گیا۔ اور انہوں نے اور ان کی جماعت نے یا آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت کا پھل کھا لیا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں منع کیا تھا یعنی انہوں نے وہ کام کر لیا جس سے انہیں روکا گیا تھا۔ اور چونکہ آدم کا یہ فعل خدائی منشاء کے خلاف تھا۔ اس لئے یکدم اس فعل کے برے نتائج ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور آدم کی آنکھیں کھل گئیں کہ اس نے خدائی منشاء کی خلاف ورزی کر کے سخت غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا درخت کا پھل کھانے سے ان کا ننگ ظاہر ہونا شروع ہو گیا اور اس فعل کے برے نتائج ان پر روشن ہو گئے اور انہوں نے سمجھا کہ ہم ایک عیب کے مرتکب ہوئے ہیں جب آدم کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ انہوں نے اس غلطی کے ازالہ کے لئے جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آدم نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی تھی جس سے وہ تکلیف میں مبتلا ہوا۔ مگر پھر خدا نے اسے بزرگی دی۔ اور جب اس نے ورق الجنۃ سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا تو خدا تعالیٰ نے اسے وہ راستہ دکھا دیا جو اسے اور اس کی جماعت کو کامیابی کی منزل کی طرف لے جانے والا تھا۔ عربی زبان میں ورق کے معنے زینت کے بھی ہوتے ہیں۔ اور ورق کے معنے نسل کے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ لغت میں لکھا ہے اَلْوَرَقُ جَمَالُ الدُّنْيَا وَ بَهْجَتُهَا یعنی دنیا کی خوبصورتی اور اس کی رونق کو ورق کہتے ہیں۔ اسی طرح عربی زبان کا محاورہ ہے اَنْتَ طَيِّبُ الْوَرَقِ اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ تو طیب النسل ہے ان دونوں محاوروں کے لحاظ سے طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ کے یہ معنے ہوئے کہ آدم نے جنت کی زینت اور اس کے جمال سے اپنے آپ کو ڈھانکنا شروع کر دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جنت کا جمال اس کے مومن اور پاکباز ساکن ہوتے ہیں اسی طرح دوسرے معنوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ آدم نے ایک پاکیزہ نسل کے ذریعہ شیطانی فریب کا ازالہ کرنا شروع کر دیا اور وہ کامیاب ہو گیا۔

بائیبل نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

’’سانپ کل دشتی جانوروں میں سے جن کو خداوند خدا نے بنایا تھا چالاک تھا اور اس نے عورت

سے کہا۔کیا واقعی خدا نے کہا ہے کہ باغ کے کسی درخت کا پھل تم نہ کھانا۔عورت نے سانپ سے کہا کہ باغ کے درختوں کا پھل تو ہم کھاتے ہیں پر جو درخت باغ کے بیچ میں ہے اس کے پھل کی بابت خدا نے کہا ہے کہ تم نہ تو اسے کھانا اور نہ چھونا۔ورنہ مر جاؤ گے تب سانپ نے عورت سے کہا کہ تم ہرگز نہ مرو گے بلکہ خدا جانتا ہے کہ جس دن تم اسے کھاؤ گے۔تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم خدا کی مانند نیک و بد کے جاننے والے بن جاؤ گے۔عورت نے جو دیکھا کہ وہ درخت کھانے کے لئے اچھا اور آنکھوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے۔اور عقل بخشنے کے لئے خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا۔اور اس نے کھایا تب دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کو معلوم ہوا کہ وہ ننگے ہیں اور انہوں نے انجیر کے پتوں کو سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں۔'' (پیدائش باب ۳ آیت ۱ تا ۷)

اس جگہ بائیبل نے ورق الجنۃ کی بجائے انجیر کے پتوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے انجیر کے پتے سی کر اپنے لئے لنگیاں بنائیں۔اب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا انجیر اور ورق الجنۃ دو مختلف چیزیں ہیں یا ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں اس غرض کے لئے ہم علم تعبیر الرؤیا کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تعطیر الانام میں یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ اَلتِّیْنُ یُفَسَّرُ بِالصُّلَحَاءِ وَاَخْیَارِ النَّاسِ یعنی جب کوئی شخص رؤیا یا کشف کی حالت میں انجیر دیکھے تو اس کے معنے صالح اور نیک لوگوں کے ہوتے ہیں۔اور یہی ورق الجنۃ کے معنے ہیں کیونکہ ورق پاکیزہ نسل کو کہتے ہیں اور ورق الجنۃ کے معنے تھے جنت کی پاکیزہ نسل۔پس قرآن اور بائیبل میں اس بارہ میں کوئی اختلاف نہ رہا۔دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ شیطان جب آدم کو دھوکا دے چکا تو آدم نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے مومنوں کی جماعت کو اپنے ساتھ ملا کر شیطانی تدابیر کو ناکام کر دیا۔شیطان نے چاہا تھا کہ اس ذریعہ سے وہ آدم کو شکست دے دے مگر بجائے اس کے کہ آدم کا یہ فعل ان کے لئے کسی مستقل نقصان یا خرابی کا باعث بنتا ان کے اندر ایک نئی بیداری پیدا ہو گئی اور انہوں نے مومنوں کی پاکیزہ جماعت کو اپنے ساتھ ملا کر شیطان کے پھیلائے ہوئے فتنہ کو کچل کر رکھ دیا۔چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کو چن لیا اور اس پر رحم کی نظر ڈالی اور اسے صحیح طریقۂ کار بتا دیا اور اس نے شیطان کی تمام تدابیر کو خاک میں ملا دیا۔

لوگوں نے غلطی سے قرآن کریم کی آیت اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى۔ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى کے یہ معنے لئے ہیں کہ آدم ایسے مقام پر رکھا گیا تھا جہاں نہ اسے بھوک ہی لگتی تھی نہ پیاس۔حالانکہ اگر انہیں بھوک ہی نہیں لگتی تھی تو وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (البقرۃ:۳۶) کے کیا معنے ہوئے؟ جب خدا نے ان کی بھوک ہی

اڑا دی تھی تو اس کے بعد یہ کہنا اب خوب کھاؤ پیو عقل کے بالکل خلاف ہے۔پس کلا کے لفظ نے بتا دیا کہ انہیں بھوک اور پیاس لگتی تھی مگر پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت کے کیا معنے ہوئے؟ سو یاد رکھنا چاہیے کہ پہلا دور انسانی جو آدم کے ذریعہ قائم ہوا وہ صرف تمدنی ترقی تک محدود تھا اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی معلومہ دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے ایک تمدنی حکومت قائم کی اور اس حکومت کی غرض یہ بتائی کہ (۱)۔ایک دوسرے کی کھانے کے معاملہ میں مدد کی جائے گی (۲)۔ایک دوسرے کی پینے کے معاملہ میں مدد کی جائے گی۔(۳)۔ایک دوسرے کی عریانی کو دور کرنے کے معاملہ میں مدد کی جائے گی (۴)۔ایک دوسرے کی رہائش کے معاملہ میں مدد کی جائے گی۔گویا کھانا۔پانی۔کپڑا اور مکان یہ چار چیزیں انہیں اس تعاونی حکومت میں حاصل ہوں گی۔پس اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَ لَا تَعْرٰی۔وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَ لَا تَضْحٰی میں اللہ تعالیٰ نے دور تمدن کے حکومتی نظام کا ڈھانچہ بیان کر دیا اور بتایا کہ اے آدم! اگر لوگ اعتراض کریں۔تو تو انہیں کہہ دے کہ اس حکومت کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ تم بھوکے نہیں رہو گے گویا تمہاری خوراک کی حکومت ذمہ دار ہوگی۔دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تم ننگے نہیں پھرو گے کیونکہ تمہارے کپڑوں کی بھی حکومت ذمہ دار ہوگی۔تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تم پیاسے نہیں رہو گے کیونکہ تمہیں پانی مہیا کرنے کی بھی حکومت ذمہ دار ہوگی اور چوتھا فائدہ یہ ہوگا کہ تم بے گھر بھی نہیں رہو گے کیونکہ تمہارے لئے مکانات مہیا کرنے کی بھی حکومت ذمہ دار ہوگی۔غرض اس آیت میں اس نئے نظام کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ قائم کیا گیا۔اور لوگوں کو بتایا گیا کہ اگر اس نئے نظام کے ماتحت تم رہو گے تو تمہیں یہ یہ سہولتیں حاصل ہوں گی۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًۢا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا

(اور خدا تعالیٰ نے) کہا تم دونوں (گروہ) اس میں سے سارے کے سارے نکل جاؤ تم میں سے بعض بعض کے

یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی ۙ۬ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا

دشمن ہوں گے۔پس اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے۔تو جو میری ہدایت کی اتباع کرے گا

یَشْقٰی ﴿۱۲۴﴾

وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا اور نہ کبھی ہلاکت میں پڑے گا۔

حلّ لُغَات۔ هَبَطَ هَبَطَ الْوَادِیَ کے معنے ہوتے ہیں نَزَلَهٗ اس وادی میں اترا اور هَبَطَ مِنْ مَوْضِعٍ اِلٰی مَوْضِعٍ اُخَرَ کے معنے ہوتے ہیں اِنْتَقَلَ۔ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا گیا (اقرب) پس اِهْبِطَا کے معنے ہوں گے تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔

تفسیر۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے کہا۔تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے اس جگہ دونوں سے آدم اور حوا مراد نہیں۔کیونکہ اس صورت میں آیت کے یہ معنے بنیں گے کہ آدم اور حوا آپس میں دشمن رہیں گے اور یہ بات بالبداہت باطل ہے دونوں سے مراد درحقیقت دو گروہ ہیں یعنی ایک وہ گروہ جو آدم کے ساتھ تعلق رکھنے والا تھا اور ایک وہ گروہ جو شیطان کے ساتھ تعلق رکھنے والا تھا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم اور شیطان سے تعلق رکھنے والے گروہو! تم دونو اس جگہ سے چلے جاؤ۔اب تم دونوں گروہ آپس میں ہمیشہ دشمن رہو گے۔چنانچہ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اهبطا کے ساتھ جمیعًا کا لفظ بھی آتا ہے حالانکہ دو کے لئے عربی زبان میں جمیعًا کبھی نہیں آتا۔یہ جمیعًا کا لفظ اسی لئے بڑھایا گیا ہے کہ آدم کے بھی کئی ساتھی تھے اور شیطان کے بھی کئی ساتھی تھے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم سب اس جگہ سے چلے جاؤ اسی طرح بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ میں بھی کُم کا لفظ جو تین یا تین سے زیادہ افراد کے لئے بولا جاتا ہے بتا رہا ہے کہ جن کو نکلنے کا حکم دیا گیا تھا وہ ایک جماعت تھی نہ کہ دو افراد۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ

اور جو شخص میرے یاد دلانے کے باوجود اعراض سے کام لے گا اسے تکلیف والی زندگی ملے گی۔اور قیامت

نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ﴿۱۲۵﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْٓ

کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔(جس پر) وہ کہے گا۔اے میرے رب تو نے مجھے کیوں اندھا اٹھایا؟

اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۶﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا

حالانکہ میں تو خوب دیکھ سکتا تھا۔(اس پر خدا تعالیٰ) فرمائے گا تیرے پاس بھی تو ہماری آیات آئی تھیں جن کو

فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۷﴾ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ

تو نے بھلا دیا تھا سو آج تجھ کو بھی (خدا کی رحمت کی تقسیم کے وقت) ترک کر دیا جائے گا۔اور جو خدائی قانون سے

مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ

باہر چلا جاتا ہے اور اپنے رب کی آیات پر ایمان نہیں لاتا اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے (اور یہ تو دنیوی سلوک ہے)

الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ﴿۱۲۸﴾

آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت اور بہت مدت تک جانے والا ہے

حلّ لُغَات۔ الضَّنْكُ اَلضِّيْقُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ یعنی ضَنْكٌ تنگی کو کہتے ہیں (اقرب) پس مَعِيْشَةً ضَنْكًا کے معنے ہوں گے تنگ زندگی۔

تفسیر۔ اس آیت میں منکروں کے لئے پہلے تو ایک دنیوی سزا کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کو اس دنیا میں ایک تکلیف دہ زندگی ملے گی اور پھر اخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ اندھے اٹھائے جائیں گے یہاں تک کہ ان میں سے ہر شخص چلا اٹھے گا کہ اے خدا میں تو اس دنیا میں اچھا سوجھ بوجھ والا آدمی تھا اس دنیا میں تو نے کیا کیا کہ مجھے اندھا اٹھایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اندھا اٹھانا اگلے جہان کا عذاب ہے اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے کہ دنیا میں تو بھی ہمارے نشانوں کے پاس اندھا ہو کر آتا تھا۔اور ان کو بھول جاتا تھا۔ اس لئے آج اس دنیا میں تجھ کو بھی بھلا دیا گیا ہے اور جو بھی اپنے رب کی آیات پر ایمان نہ لائے اور حد سے بڑھ جائے اس کو ہم ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں اور آخرت کا عذاب تو اس اندھے اٹھائے جانے کے عذاب سے بھی زیادہ ہوگا۔

اس آیت کے مفہوم میں ایک الجھن ہے جس کو اس جگہ دور کرنا ضروری ہے۔اور وہ یہ کہ پہلے حصہ میں تو یہ کہا گیا ہے کہ مجھے تو نے اندھا کر کے کیوں اٹھایا جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ اخروی زندگی کا ذکر ہے اس دنیا کی زندگی

کا ذکر نہیں قرآن بھی کہتا ہے وَ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی اور کافر بھی کہتا ہے کہ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰی وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ بھی اور کافر بھی دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اخروی زندگی کے عذاب کا ذکر ہے لیکن ان آیات کے معاً بعد پھر یہ فرمانا کہ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰی کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی سخت ہوگا ایک بالکل بے جوڑ فقرہ معلوم ہوتا ہے اور انسان حیران ہوتا ہے کہ جب پہلے بھی عذاب آخرۃ کا ذکر آ چکا ہے تو پھر دوبارہ عذاب آخرۃ کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ اور یہ کون سا عذاب آخرت ہے جو پہلے عذاب آخرت سے بھی زیادہ سخت ہوگا؟ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ قرآن و احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم آخرت ایک لمبا وقت ہے جس میں مختلف اوقات میں کفار کی مختلف حالتیں ہوں گی۔ چنانچہ سورۃ انعام رکوع ۱۱ (آیت ۹۵) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَ مَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ یعنی آج تو تم ہمارے پاس اس طرح اکیلے آئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا تھا اسے تم اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ اور پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان شفعاء کو نہیں دیکھتے جن کے بارہ میں تم بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہ تم میں خدا کے شریک ہیں بات یہ ہے کہ آج تمہارے آپس کے رشتے بالکل کٹ گئے ہیں اور جو کچھ تم کیا کرتے تھے وہ سب کچھ تم سے کھویا جا چکا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یوم آخرت میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کافروں اور ان کے معبودوں کے درمیان تعلق منقطع ہو جائے گا اور وہ اپنے شرک کے دعویٰ کو بھول جائیں گے۔ یعنی دنیا میں تو ان کو اصرار تھا کہ جن بتوں کو ہم پوجتے ہیں وہ واقعہ میں خدا کے شریک ہیں اور ہم اس دعوٰی میں سچے ہیں یعنی اپنے مذہب کی سچائی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ایک وقت آئے گا کہ وہ سب دعوے ان کو بھول جائیں گے اور وہ بت جن کو وہ دنیا میں پوجتے تھے ان کے دماغ سے اوجھل ہو جائیں گے گویا وہ ان کی خدائی سے منکر ہو جائیں گے اس وقت وہ اپنی دنیوی حالت کا مقابلہ اخروی حالت سے کریں گے اور کہیں گے کہ اے خدا یہ کیا ہو گیا کہ ہم دنیا میں تو اپنے بتوں کی خدائی دیکھ رہے تھے اور اسی لئے ان پر ایمان لائے تھے لیکن اب وہ سب دلیلیں غائب ہو گئیں اور اب ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ گویا ہم دنیا کے مقابلہ میں بالکل اندھے ہو گئے ہیں۔ یہ حالت بھی ایک عذاب کی ہوگی کیونکہ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں جس چیز کو صحیح سمجھتے تھے وہ غلط تھی اس احساس کا پیدا ہو جانا خود ایک عذاب پیدا کرتا ہے۔ اور اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے کہ مرنے کے بعد پہلا عذاب کافروں کو یہ ملے گا کہ ان کو یقین ہو جائے گا کہ جن کو ہم خدا کا

شریک قرار دیتے تھے وہ اس کے شریک نہیں اور وہ یقین کرلیں گے کہ شاید ہماری روحانی بصیرت ماری گئی ہے کہ معبودان الٰہی اب ہمیں معبودان الٰہی نظر نہیں آتے ۔فرماتا ہے ضمیر کا یہ عذاب بھی بڑا عذاب ہے اور خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ دنیا کے عقیدہ کے بطلان کو صحیح سمجھیں گے اور دنیا کے عقیدہ کو غلط سمجھیں گے اور حیران ہوں گے کہ ہم ایسی بات کو کس طرح صحیح سمجھتے رہے۔ جب یہ بات اتنی واضح تھی تو کیا اب ہم اندھے ہو گئے ہیں کہ ہم کو اپنے معبودوں کی سچائی تک نظر نہیں آتی ۔اس کے بعد آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ عذاب تو کچھ بھی نہیں اصل عذاب تو وہ ہے جو بعد میں آنے والا ہے یعنی جہنم کا عذاب یہ ضمیر کا عذاب بھی بے شک گھبراہٹ پیدا کرتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا تم اب اندھے ہو گئے ہو اور پہلے سوجاکھے تھے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ تم پہلے اندھے تھے اور اب بینا ہو۔اور جب اس حقیقت کے مطابق تم پر عذاب آئے گا تب تم کو معلوم ہوگا کہ تم اندھے دنیا میں تھے کہ غلط چیز کو صحیح سمجھتے تھے لیکن بینا اب ہو کہ غلط کو غلط سمجھنے لگ گئے ہو اور صحیح کو صحیح ۔پس درحقیقت اس آیت میں ایک طنزیہ کلام کیا گیا ہے جس سے کفار کے عقیدہ پر طنز کی گئی ہے کہ وہ بے وقوف شرک کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بینا سمجھتے ہیں ۔حالانکہ آخرت میں اس شرک کے منکر ہو جائیں گے اور حیران ہوں گے کہ کیا اب ہم اندھے ہیں یا پہلے اندھے تھے۔ یہ کیا حماقت ہے کہ جب ہم اندھے تھے تو اپنے آپ کو بینا سمجھتے تھے۔

اس آیت کے متعلق ایک اور سوال بھی قابل حل ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا جو شخص میرے ذکر سے اعراض کرے گا اسے ایک تنگ زندگی میں سے گذرنا پڑے گا۔ مگر ہمیں تو یہ دکھائی دیتا ہے کہ غیر مذاہب والوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہیں بلکہ ان میں سے اکثریت ایسی ہے جن کی مالی حالت مسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہے اور ہر قسم کے عیش اور آرام کے سامان انہیں میسر ہیں اس سوال کے متعلق یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ معیشت کے معنے اس چیز کے ہوتے ہیں جس سے انسانی زندگی قائم رہے(اقرب) اور انسانی زندگی کے قیام کے لئے صرف کھانا پینا یا مال و دولت کا میسر آ جانا ہی ضروری نہیں ہوتا بلکہ اور بھی ہزاروں چیزیں ہیں جو انسان کی مذہبی ۔تمدنی ۔اور روحانی زندگی کو سنوارنے والی ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو الٰہی تعلیم سے اعراض کرنے والوں کو میسر نہیں آتیں اور اس لحاظ سے ان کی معیشت ان پر شدید طور پر تنگ ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وسعت عمل خدا تعالیٰ کی صفات پر ایمان لانے اور ان کے مطابق اپنے اندر تغیر پیدا کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے اور جو شخص صفات الٰہیہ پر ایمان نہ رکھتا ہو اس کا دائرۂ عمل نہایت محدود ہوتا ہے۔ دائرۂ عمل ہمیشہ اعلیٰ مطمح نظر سے وسیع ہوتا ہے اور جب کوئی اعلیٰ مطمح نظر سامنے نہ ہو تو اعمال بھی محدود ہو جاتے ہیں ۔یہی وجہ ہے

کہ انبیاء کے مقابلہ میں فلاسفروں کے اخلاق بالکل ہیچ ہوتے ہیں اور پھران کے اندر جو تھوڑے بہت اخلاق پائے بھی جاتے ہیں۔ان کا دائرہ عمل محدود ہوتا ہے۔مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی دیکھا جائے تو ہمیں آپ کے اندر تمام اخلاق دکھائی دیں گے آپ میں سچائی بھی شاندار طور پر نظر آئے گی آپ میں امانت بھی شاندار طور پر نظر آئے گی آپ میں سخاوت بھی شاندار طور پر نظر آئے گی۔آپ میں رحم بھی شاندار طور پر نظر آئے گا۔آپ میں غریبوں کی پرورش کا مادہ بھی شاندار طور پر نظر آئے گا۔آپ میں انصاف بھی شاندار طور پر نظر آئے گا آپ میں توکل بھی شاندار طور پر نظر آئے گا۔اسی طرح تحمل۔بردباری۔دوسروں کے جذبات کا احترام۔عورتوں سے حسن سلوک۔ بنی نوع انسان کی خدمت صبر چشم پوشی۔تعاون باہمی۔بہادری وفائے عہد اور اسی قسم کے سینکڑوں اخلاق آپ کے اندر شاندار طور پر دکھائی دیں گے۔لیکن کوئی فلاسفر ایسا نہیں نکل سکتا جو تمام اخلاق فاضلہ کا جامع ہو بلکہ کسی میں کوئی ایک خوبی ہوگی اور کسی میں دو اور پھر ان کا دائرہ بھی محدود ہوگا۔اس کی وجہ یہی ہے کہ جب تک کوئی اعلیٰ مطمح نظر نہ ہو اور جب تک کوئی ایسا کامل نمونہ سامنے نہ ہو جس کی نقل کی جاسکے اس وقت تک اعمال ایک محدود دائرہ میں ہی چکر کھاتے رہتے ہیں اور ان میں وسعت پیدا نہیں ہوسکتی اور چونکہ کلام الٰہی کا منکر خدا تعالیٰ سے اعراض کرنے کی وجہ سے صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا نہیں کرتا اس لئے قیامت کے دن بھی جب خدا تعالیٰ کی صفات کا ظہور ہوگا تو وہ ان کو پہچان نہیں سکے گا اور اندھوں کی طرح کھڑا رہے گا۔جس طرح وہ شخص جس نے کبھی خربوزہ نہیں دیکھا۔خربوزے کو دیکھ کر بھی اسے پہچان نہیں سکتا اسی طرح وہ شخص جس نے صفات الٰہیہ کو اپنے اندر پیدا نہیں کیا وہ صفات الٰہیہ کے ظہور کو بھی پہچان نہیں سکے گا۔اور نابینا ہونے کی حالت میں اٹھے گا اس پر وہ گھبرا کر کہے گا کہ میں تو بڑا بصیر تھا مجھے آج اندھا کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى دنیا میں ہم نے اپنے رسولوں کے ذریعہ بیسیوں نشانات و معجزات ظاہر کئے تھے مگر تم نے ان کی طرف کبھی توجہ نہ کی اگر تم بینا ہوتے تو ہماری آیات کا انکار کیوں کرتے۔پس چونکہ تم پہلے بھی اندھے تھے اس لئے آج بھی اندھے ہی اٹھے۔اس سے معلوم ہوا کہ اخروی نابینائی درحقیقت روحانی ہی ہوگی۔کیونکہ فرماتا ہے جس طرح اب تم روحانی امور کو نہیں دیکھ سکتے اسی طرح تم دنیا میں روحانی امور کو نہ دیکھ سکے تھے اگر روحانی نابینائی مراد نہ ہوتی تو کذالك کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔دوسری دفعہ کذالك اس لئے استعمال کیا کہ پہلے جہان میں بھی تیرے عمل کی وجہ سے ہم نے تجھے چھوڑ دیا تھا اور اب بھی چھوڑ دیا ہے تجھے ہم نے بینا کبھی قرار نہیں دیا۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ

کیا ان لوگوں کو (اس بات سے) ہدایت حاصل نہ ہوئی کہ ان سے پہلی گذری ہوئی قوموں میں سے بہتوں

يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي

کو ہم نے ہلاک کر دیا یہ (لوگ) ان کے گھروں میں چلتے پھرتے ہیں اس میں عقل والے لوگوں کے لئے

النُّهٰى ﴿۱۲۹﴾ ع

بڑے نشان ہیں۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے تاریخ شاہد ہے کہ جن گذری ہوئی قوموں کی وادیوں اور علاقوں میں یہ لوگ رہتے ہیں وہ بھی شرک میں مبتلا تھیں لیکن آخر تباہ ہو گئیں پھر یہ کیوں اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ

اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے نہ گذر چکی ہوتی اور مدت بھی مقرر نہ ہوتی تو عذاب (ان قوموں

مُّسَمًّى ﴿۱۳۰﴾ ط

کے لئے) دائمی بن جاتا۔ (اور ایک لمبے عرصہ تک جاری رہتا)۔

تفسیر ۔ لَوْلَا كَلِمَةٌ سے مراد اس جگہ پر رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (الاعراف: ۱۵۷) والا قانون ہے۔ یعنی ہم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہمارا رحم ہماری گرفت پر غالب رہتا ہے اگر ہمارا یہ فیصلہ نہ ہوتا اور گناہوں کی وجہ سے فوراً عذاب آجایا کرتا تو جس ملک پر عذاب آتا وہ اس کے لئے دائمی بن جاتا اور ایک لمبے عرصہ تک جاری رہتا اس عذاب سے نجات پانے کی کوئی راہ انہیں نظر نہ آتی۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ

پس جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں تو اس پر صبر کر (کیونکہ تیرے رب کی سنت یہی ہے کہ رحم سے کام لیا جائے) اور

الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ

سورج کے چڑھنے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بھی کیا کر اور رات کے مختلف حصوں

اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۱﴾

اور (اسی طرح) دن کے سب حصوں میں بھی اس کی تسبیح کیا کر (تا کہ اس کے فضل کو حاصل کر کے) تو خوش ہو جائے۔

تفسیر۔ مفسرین کا قول ہے کہ اس جگہ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا سے صبح اور عصر اور اٰنَآئِ الَّيْلِ سے مغرب اور عشاء اور اَطْرَافَ النَّهَارِ سے ظہر اور ضحٰی یعنی چاشت کی نمازیں مراد ہیں۔ کیونکہ وہ بھی نصف کے کناروں پر ہوتی ہیں ایک زوال سے پہلے اور ایک زوال کے بعد یا خالی ظہر کہ وہ دونوں نصف کے کناروں پر واقع ہے۔ (درمنثور زیر آیت ھذا)

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ

اور ہم نے جو کچھ ان میں سے بعض لوگوں کو دنیوی زندگی کے زیبائش کے سامان دے رکھے ہیں تو اس کی

زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ

طرف اپنی دونوں آنکھوں کی نظر کو پھیلا پھیلا کر مت دیکھ (کیونکہ یہ سامان ان کو اس لئے دیا گیا ہے) کہ ہم اس کے

خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۲﴾

ذریعہ سے ان کی ازمائش کریں اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق سب سے اچھا اور باقی رہنے ولا ہے۔

حل لغات۔ زَهْرَةٌ زَهْرَةُ الدُّنْيَا کے معنے ہوتے ہیں بَهْجَتُهَا وَ غَضَارَتُهَا وَ حُسْنُهَا دنیا کی خوبصورتی اور حسن (اقرب)

لِنَفْتِنَهُمْ نَفْتِنُ فَتَنَ سے بنا ہے اور فِتْنَةٌ کے معنے ہیں خِبْرَةٌ۔ اس کی آزمائش کی نیز اس کے معنے ہیں اَضَلَّهٗ۔ اس کو گمراہ کیا اسی طرح جب یہ کہیں کہ فَتَنَ الصَّائِغُ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ تو معنے ہوتے ہیں اَذَابَهٗ بِالْبُوْتَقَةِ وَ اَحْرَقَهٗ بِالنَّارِ لِيُبَيِّنَ الْجَيِّدُ مِنَ الرَّدِيْءِ وَ يُعْلَمَ اَنَّهٗ خَالِصٌ اَوْ مَشُوْبٌ (اقرب) یعنی جب سنار کے لئے فتن کا لفظ استعمال ہو تو معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس نے سونے کو آگ میں ڈال کر اس پر آگ تپائی تا کہ سونا پگھل جائے اور خالص سونا علیحدہ ہو جائے اور کھوٹ علیحدہ ہو جائے پس لِنَفْتِنَهُمْ کے معنے ہوں گے (۱) ہم معلوم کرلیں (۲) ہم اچھے اور برے کی تمیز کر دیں۔

تفسیر ۔ انسان بعض دفعہ دوسرے کی دولت دیکھ کر لالچ میں آجاتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ دولت اس کو مل جائے لیکن اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب یوروپین قومیں ترقی کریں اور بہت دولت سمیٹ لیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کی دولت دیکھ دیکھ کر لالچ میں نہ آئیں کیونکہ یہی دولت آخر ان کی تباہی کا موجب ہو گی جیسا کہ موجودہ زمانہ میں ہو رہا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی دولت کو دیکھ کر روس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے بھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ایجاد کر لئے تا کہ ان کی مدد سے مغربی ممالک کی دولت چھین لے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے فرماتا ہے کہ تم اپنی دولت خدا کے ہاں جمع کرو۔ کیونکہ جو دولت خدا کے ہاں جمع ہوتی ہے اسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ اور وہ بہتر بھی ہوتی ہے اور ہمیشہ قائم بھی رہتی ہے۔

وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ

اور تو اپنے اہل کو نماز کی تاکید کرتا رہ۔ اور تو خود بھی اس حکم یعنی نماز پر قائم رہ ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے بلکہ ہم

رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۳﴾

تجھے رزق دے رہے ہیں اور انجام تقویٰ ہی کا بہتر ہوتا ہے۔

تفسیر ۔ فرماتا ہے کہ یہ قانون قدرت ہے کہ بچے ماں باپ کے پیچھے چلتے ہیں اس لئے عیسائیوں کی ترقی کے زمانہ میں ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنی اولاد کو نماز کی تاکید کرتا رہے اور خود بھی نمازوں کا پابند رہے تا کہ اس کی اولاد بھی اسی رنگ میں رنگین ہو کیونکہ جو شخص عبادت پر قائم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضرور حلال رزق دیتا ہے اور اس سے رزق مانگتا نہیں۔ بظاہر یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ تمام انبیاء دین کی خدمت کے لئے چندے مانگتے چلے آئے

ہیں اور اسلام نے بھی زکوٰۃ اور صدقات پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ یا صدقہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں انکا مال کم نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ بڑھتا ہے۔اور اس کا فائدہ خود لوگوں کو ہی پہنچتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم:۴۰) یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔وہی اپنے مالوں کو بڑھانے والے ہوتے ۔پس چندے لینا یا صدقہ وزکوٰۃ وغیرہ اس آیت کے خلاف نہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ

اور وہ کہتے ہیں کہ کیوں وہ ہمارے پاس اپنے رب کی طرف سے کوئی نشان نہیں لاتا۔کیا ان کے پاس ویسا

بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۴﴾

نشان نہیں آیا جیسا کہ پہلی کتابوں میں بیان ہو چکا ہے۔

تفسیر ۔فرماتا ہے نشان جادوگری کا نام نہیں بلکہ پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں بھی نشان ہوتی ہیں اور محمدؐ رسول اللہ کے حق میں پہلے انبیاء کی پیشگوئیاں موجود ہیں۔ پھر یہ کیوں ایمان نہیں لاتے ۔اگر محمدؐ رسول اللہ نہ آتے تو ان کا اعتراض ہوتا کہ ہماری طرف تو کوئی نبی آیا ہی نہیں ورنہ ہم مان لیتے لیکن نبی آ گیا ہے اس لئے اب سزا کا انتظار کرنے کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہیں آخر میں حق کھل جائے گا مگر اس وقت ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ

اور اگر ہم ان کو اس (رسول) سے پہلے کسی عذاب کے ذریعہ سے ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے اے ہمارے رب

اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ

تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا (اگر تو ایسا کرتا) تو ہم تیرے نشانون کے پیچھے چل پڑتے قبل اس کے

نَخْزٰی ﴿۱۳۵﴾

کہ ہم ذلیل اور رسوا ہو جاتے۔

تفسیر ۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ بنی نوع انسان کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کرتا ہے کہ اگر رسول کی بعثت سے پہلے ہم ان پر عذاب نازل کر دیتے تو یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے کہ جب ہم گمراہ تھے اور ہدایت کے محتاج تھے تو تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تا کہ ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے ہی تیرے احکام کو قبول کر لیتے اللہ تعالیٰ ان کے اس اعتراض کو رد نہیں کرتا۔ بلکہ اسے تسلیم کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے انبیاء و رسل کی بعثت کا انتظام نہ ہوتا تو بندوں کا حق تھا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرتے کہ جب اس نے ان کے پاس کوئی ہادی ہی نہیں بھیجے تو وہ ان سے جواب طلبی کیوں کرتا ہے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ دنیا میں خواہ کتنی گمراہی پھیل جائے اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح کے لئے کسی مامور کو مبعوث نہیں کر سکتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان آیات میں اسی بات کی تردید کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ اگر ہم دنیا میں اپنے مامور نہ بھیجیں تو لوگ بجا طور پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جب اس نے ہدایت کا کوئی سامان ہی نہیں کیا تو وہ انہیں عذاب کیوں دیتا ہے گویا مسلمان اپنے عمل سے اس اعتراض کو تقویت دے رہے ہیں جس اعتراض کو مٹانے کے لئے اس کی طرف سے ہمیشہ مامورین آتے رہے ہیں۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ

تو کہہ دے ہر ایک شخص اپنے انجام کی انتظار میں ہے پس تم بھی اپنے انجام کا انتظار کرتے رہو۔ اور تم جلدی

الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۶﴾ ع

ہی معلوم کر لو گے کہ کون شخص سیدھے راستہ پر چلنے والوں اور ہدایت پانے والوں میں سے ہے اور کون نہیں

تفسیر ۔اس جگہ سیدھے راستہ کے لئے سَوِیٌّ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے معنے ایسے راستہ کے ہیں جو افراط اور تفریط سے منزہ ہو (مفردات) اسی طرح سَوِیٌّ کا لفظ کامل اور مضبوط کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے (لسان العرب)۔ پس اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں جلدی پتہ لگ جائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جو تعلیم لوگوں کے لئے لائے ہیں وہ افراط اور تفریط سے منزہ ہے اور ایسی کامل درجہ کی تعلیم ہے کہ خواہ زمانہ کے حالات کتنے بھی بدلیں۔ وہ کبھی متروک قرار نہیں دی جاسکتی یعنی دائمی اور غیر متبدل قانون ہے۔ اور تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ کون شخص ہدایت پانے والوں میں سے ہے اور کون نہیں یعنی جس شخص کو ایسی شریعت ملے جو کبھی منسوخ نہ ہوسکتی ہو اور نہ زمانہ کے حالات سے کبھی بدل سکتی ہو۔ وہی شخص اور اس کے متبعین کامل ہدایت یافتہ کہلا سکتے ہیں۔ اور جو لوگ اس سے الگ ہوتے ہیں وہ کبھی بھی ہدایت یافتہ نہیں کہلا سکتے۔ کیونکہ جس شخص کو زمانہ کے بدلے ہوئے حالات کو دیکھ کر ہمیشہ اپنا ایمان اور عمل بدلنا پڑتا ہے اس کے متعلق یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے وہی ہدایت ہوتی ہے جو قابل عمل ہو سوائے اس کے کہ وہ خود اس کو کسی زمانہ میں ایک نئے الہام کے ذریعہ سے بدل دے بہرحال انسان اسکو نہیں بدل سکتا کیوں کہ کوئی انسان خدا کی تعلیم کا قائم مقام نہیں بنا سکتا۔

انڈیکس

جلد ہفتم

۞۞۞۞۞۞

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اشاریہ کلید مضامین

گ

مقامات

حل اللغات

☆☆☆☆☆

کلیدِ مضامین

مرتبہ : سید عبدالحیٔ ایم۔اے

خ

د

ر

ز

س

نجات

نشان

نظام

نماز

و

والدین

وحی۔ (نیز دیکھئے الہام اور کلام الٰہی)

ہ

ہجرت

ہندو مذہب۔ (نیز دیکھئے آریہ مذہب)

ی

یاجوج و ماجوج

یوم القیامتہ۔ (نیز دیکھئے قیامت)

☆☆☆☆☆

اسماء

آ

ا

ب

☆☆☆☆☆

مقامات

ع

غ

ف

ق

ک

☆☆☆☆☆

حَلّ اللّغات

☆☆☆☆☆

کتابیات

BIBLIOGRAPHY

تفسیر

تفسیر ابن کثیر
جامع البیان للطبری
روح المعانی للعلامہ آلوسیؒ
تفسیر فتح البیان
تفسیر القرطبی
الکشاف للزمخشری
اِمْلَاءُ مَا مَنَّ بِهِ الرَّحْمٰنُ
● A Comprehensive Comentary on the Qur`an
القرآن جارج سیل

حدیث

صحیح البخاری
صحیح مسلم
شمائل ترمذی
سنن ابی داؤد
مسند للامام احمد بن حنبل
شرح العلامۃ الزرقانی المواھب اللدنیۃ

کتب حضرت مسیح موعودؑ وخلفاء سلسلہ

براہین احمدیہ
آئینہ کمالاتِ اسلام
حقیقۃ الوحی
مواہب الرحمٰن
اسلامی اُصول کی فلاسفی
مسیح ہندوستان میں
دعوۃ الامیر

سیرت وتاریخ

سیرۃ ابن اسحاق
السیرۃ النبویۃ لابن ھشام
سیرۃ الحلبیۃ
طبقاتِ ابن سعد
الکامل فی التاریخ لابن اثیر
● Life of Napoleon Bonaparte by John S.C. Abbot.
حی حنوک Hayye Hanok
● Rise of Christianity

اسلامیات

کتاب الشفا لقاضی عیاض
مکتوبات امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ
مثنوی مولانا روم

عیسائیت

بائیبل (عہدنامہ قدیم وجدید)

اپوکریفا

پیکس کی تفسیر بائبل

شہادۃ القرآن الکتب انبیاء الرحمٰن مصنفہ سر ولیم میور

بہت بیش قیمت عطر کی شیشی مصنفہ پادری ٹسڈل

ستم ہامان منظومہ منشی کیدار ناتھ

قاموس کتاب المقدس ترجمہ وتالیف ڈاکٹر جارج ای پوسٹ ایم۔ڈی

متفرق

السبع المعلقات

کتاب الاعتبار لاسامہ بن منقذ

لغات اور دائرۃ المعارف

اقرب الموارد

المفردات فی غریب القرآن

فقہ اللغۃ للثعالبی

المنجد

- New Standard Dictionary
- Encyclopaedia Biblica
- Encyclopaedia Britannica
- Encyclopaedia of religion & Ethics
- Jewish Encyclopaedia